وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر:۲۲)

تفسیرِ کبیر

مُصَنِّفَہٗ

حضرت مِرزا بشیرالدّین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثّانی المصلح الموعود

رضی اللہ عنہ

جلد سوم

سُورۃ یُونس، سُورۃ ہُود، سُورۃ یُوسف، سُورۃ رعد، سُورۃ ابراہیم

نظارت نشر واشاعت قادیان

نام کتاب	:	تفسیر کبیر جلد سوم۔ چہارم
تصنیف لطیف	:	حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہ
سن اشاعت	:	فروری تبلیغ 2004
باہتمام	:	نظارت نشر و اشاعت قادیان
تعداد	:	2000 (دو ہزار)
مطبع	:	پرنٹ ویل امرتسر

ISBN- 81-7912-051-1

نوٹ : تفسیر کبیر حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف ہے اس کے چار ایڈیشن ربوہ اور لندن سے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک عرصہ سے ہندوستان میں تفسیر کبیر کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ اب حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے از راہ شفقت مکمل سیٹ کو پانچ جلدوں میں قادیان سے شائع کرنے کی منظوری عنایت فرمائی ہے۔ الحمد للہ۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اسے ہر لحاظ سے مبارک اور بابرکت کرے اور لوگوں کے ایمانوں کو جلا بخشنے کا باعث ہو۔ آمین۔

ناظر نشر و اشاعت قادیان

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

خُدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھُوَ النّـــاصِر

کچھ "تفسیر کبیر" کے متعلّق

سورۂ یونس سے سورۂ کہف تک کے تفسیری نوٹ شائع ہو رہے ہیں۔ مَیں نے اپنی طرف سے پُوری کوشش کی ہے کہ قرآن کریم کا صحیح مفہوم پیش کروں اور مجھے یقین ہے کہ اس تفسیر کا بہت سا مضمون میرے غور کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطیّہ ہے مگر بہر حال چونکہ میرے دماغ نے بھی اس کام میں حصّہ لیا ہے اسلیے ممکن ہے کہ کوئی بات اس میں ایسی ہو جو قرآن کریم کے منشاء کو پُوری طرح واضح نہ کرتی ہو۔ اس لیے مَیں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے کلام کی خوبیوں سے اپنے بندوں کو نفع پہنچائے اور انسانی غلطیوں کے نقصان سے محفوظ رکھّے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق عطاء فرمائی تو انشاء اللہ اگلی جلد سورۂ فاتحہ سے شروع کی جائے گی۔ یہ جلد پہلے اس لیے شائع کی گئی ہے کہ ان سورتوں کے متعلّق میرے ایک درس کے نوٹ اڑھائی سو صفحات تک چھپ چکے تھے اور ان کے ضائع ہونے کا ڈر تھا۔ پس مناسب سمجھا گیا کہ پہلے سورۂ یونس سے سورۂ کہف تک تفسیری نوٹوں پر مشتمل جلد شائع ہو۔ اور اگر اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے تو بعد میں قرآن کریم کی بقیہ سورتوں کے تفسیری نوٹ شروع سے ترتیب وار شائع کیے جائیں۔

مَیں نے تفسیری نوٹوں کو لکھتے ہوئے اس امر کو مدِّ نظر رکھا ہے کہ آیات اور سورتوں کی ترتیب اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ جہاں تک مَیں سمجھتا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے معانی کا ایک سلسلہ پوری ترتیب کے ساتھ پڑھنے والے کی سمجھ میں آجائے گا۔ اور وہ کسی سورۃ یا کسی آیت کو بے جوڑ نہ سمجھے گا۔ ترتیب کا مضمون ان مضامین میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے خاص طور پر سمجھائے ہیں وَلَا يُحِيْطُ اَحَدٌ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِ اللّٰهِ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں قرآن کریم کے سات بطن ہیں۔ اور ہر بطن کے کئی کئی معانی ہیں۔ اس

صورت میں قرآن کریم کی کوئی ایسی تفسیر لکھنا جو سب معانی پر مشتمل ہو نا ممکن ہے اور جو شخص کہے کہ اُس نے قرآن کریم کی مکمل تفسیر لکھ دی ہے دیوانہ ہے یا جاہل۔ جو شخص میرے ان نوٹوں کی نسبت کوئی ایسی بات منسوب کرے مَیں اس سے بَری ہوں۔

میرے نزدیک ان نوٹوں کی خوبی یہی بہت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فضل فرما کر موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے متعلق بہت کچھ انکشاف فرمایا ہے۔ مگر ہر زمانہ کی ضرورت الگ ہوتی ہے اور ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق قرآن کریم میں علوم موجود ہیں۔ جو اپنے موقعہ پر کھولے جاتے ہیں پہلے مفسّرین نے اپنے زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق بہت بڑی خدمت قرآن کریم کی کی ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ دو غلطیاں نہ کرتے تو ان کی تفاسیر دائمی خوبیاں رکھتیں۔ (۱) منافقوں کی باتوں کو جو انہوں نے مسلمانوں میں مل کر شائع کیں ان تفاسیر میں جگہ دے دی گئی ہے اور اس وجہ سے بعض مضامین اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات کے لیے ہتک کا موجب ہو گئے ہیں۔ (۲) انہوں نے یہودی کُتب پر بہت کچھ اعتبار کیا ہے اور ان میں سے بھی مصدقہ بائبل پر نہیں بلکہ یہود کی روایات پر، اور اس طرح دشمنوں کو اعتراض کا موقعہ دے دیا ہے۔ اگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا فرمانا کہ لَا تُصَدِّقُوْهُمْ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ ان کے ذہن میں رہتا تو یہ شکل پیش نہ آتی۔ بہر حال ان دو غلطیوں کو چھوڑ کر جو محنت اور خدمت ان لوگوں نے کی ہے اللہ تعالیٰ ہی ان کی جزاء ہو سکتا ہے۔

دو اور غلطیاں بھی ان سے ہوئی ہیں۔ مگر مَیں سمجھتا ہوں وہ زمانہ کے اثر کے نیچے تھیں۔ ایک بعض آیات کو منسوخ قرار دینا۔ دوسرے مضامینِ قرآن کی ترتیب کو خاص اہمیّت نہ دینا۔ مگر میرے نزدیک باوجود زمانہ کی رَو کے خلاف ہونے کے اس بارہ میں انہوں نے مفید جدّ وجہد ضرور کی ہے اور بالعموم (گو اصولی طور پر نہیں) آیات زیرِ بحث کو غیر منسوخ ثابت کرنے کے لیے محقق مفسّرین نے ضرور کوشش کی ہے۔ اسی طرح معانی کی ترتیب کے متعلق بھی بہت زور لگایا ہے۔

میرے نزدیک ان محقق مفسّرین میں علّامہ ابنِ کثیر۔ علّامہ ابو حیّان صاحب محیط اور علّامہ زمخشری صاحب کشّاف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں گو آخر الذکر پر اعتزال کا داغ ہے۔ طبری نے تفسیر کے متعلق روایات جمع کرنے میں خاص کام کیا ہے اور علّامہ ابو البقاء نے اعرابِ قرآن کے متعلق اِمْلَاءُ مَا مَنَّ بِهِ الرَّحْمٰنُ لکھ کر ایک احسانِ عظیم کیا ہے۔

گذشتہ صدی کی کوششوں میں سے تفسیر رُوح المعانی علوم نقلیہ کی جامع کتاب ہے مگر تجربہ سے معلوم ہُوا ہے کہ بالعموم وہ روایت کو اپنے الفاظ میں درج کر دیتے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سی تفاسیر کا خلاصہ اس میں آجاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم - نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

قرآن کریم میں حکم ہے کہ اس کے پڑھنے سے پہلے اعوذ پڑھ لینی چاہیئے - اللہ تعالیٰ فرماتا ہے - فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ (نحل- ع- آیت ۹۹) کہ جب تو قرآن پڑھنے لگے تو اس کے پہلے اللہ سے استعاذہ کرلیا کر یعنی ہر قسم کے شرور کے مقابلہ کے لئے خدا تعالیٰ کی مدد اور اس کی پناہ مانگ لیا کر - پناہ دو قسم کی ہوا کرتی ہے - ایک پناہ ہوتی ہے اس بات سے کہ کوئی شر ہمیں نہ پہنچ جائے - اور ایک پناہ ہوتی ہے اس بات سے کہ کوئی خیر ہمارے ہاتھوں سے نہ نکل جائے - فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ کے حکم میں دونو قسم کی پناہ شامل ہے - یعنی ایسا نہ ہو کہ اپنے دل کی کسی بیماری کی وجہ سے یا کسی بدصحبت کی وجہ سے یا کسی گناہ کی سزا کی وجہ سے یہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم جو قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے - یا یہ کہ اس تعلیم کے صحیح طور پر سمجھنے سے تم قاصر رہو - اور کوئی شر کا پہلو تمہارے لئے پیدا ہو جائے - اس استعاذہ کو عملی صورت دینے کے لئے جو دعا سکھلائی گئی ہے - وہ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم - کی دعا ہے -

استعاذہ کا حکم
تقدیم استعاذہ

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس حکم سے آخر میں اعوذ پڑھنے کا حکم نکلتا ہے نہ کہ شروع میں - چنانچہ قرآن کریم کے آخر میں ہی اعوذ کی دونو سورتیں یعنی سورۃ الفلق اور سورۃ الناس رکھی گئی ہیں - اس میں کوئی شک نہیں - کہ اگر انسان آخر میں بھی اعوذ پڑھے - تو اور بھی اچھی بات ہے - مگر سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ابتدا میں اعوذ کا پڑھنا چونکہ ثابت ہے - اس لئے اس حکم سے زیادہ تر قرآن کریم کے شروع کرنے سے پہلے اعوذ پڑھنا مراد لیا جائیگا - چنانچہ جبیر بن مطعم رضؓ سے بیہقی اور ابن ابی شیبہ نے روایت کی ہے - ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما دخل فی الصلوۃ کبّر ثم قال اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم - یعنی تکبیر کے بعد تلاوت سے پہلے آپؐ اعوذ پڑھا کرتے تھے - ابو داؤد نے ابو سعیدؓ سے روایت کی ہے کہ نماز کی ابتدا میں تسبیح وتحمید کے بعد تلاوت سے پہلے آپؐ اعوذ پڑھتے تھے - ابو داؤد میں حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ آیات افک کی تلاوت سے پہلے آپ نے اعوذ پڑھا (درمنثور) - الفاظ قرآنی بھی اس کے مخالف نہیں - کیونکہ قرأ کے معنی پڑھنا شروع کرنے اور ختم کرنے دونوں کے ہو سکتے ہیں -

سُوْرَۃُ یُوْنُسَ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ مِائَۃٌ وَّتِسْعُ اٰیَاتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ وَاَحَدَ عَشَرَ رُکُوْعًا

یہ سورۃ مکی ہے

(ا) یہ سورۃ مکی ہے۔ گو بعض لوگوں نے اس کی بعض آیتوں کو مدنی قرار دیا ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کی رائے واقعات پر مبنی نہیں۔ بلکہ صرف مضامین پر قیاس کرکے ہے۔ اور اس قسم کی رائے یقینی نہیں ہوتی۔

وجہ تسمیہ

(ب) اس سورۃ کا نام یونس ہے۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے خیال کیا ہے۔ کہ اس میں حضرت یونس کا ذکر ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس سورۃ کا مضمون یونس کے واقعہ پر مبنی ہے۔ قرآن کریم میں جو بعض انبیاء یا اشیاء کے ناموں پر سورتوں کا نام ہوتا ہے تو بلاوجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہوتا ہے۔ کہ اس سورۃ کا مضمون اس خاص شخص کے ذکر، واقعہ پر یا اس چیز کے حالات پر مبنی ہے۔ جس کے نام پر اس کا نام رکھا گیا ہے۔

تعداد آیات و رکوعات

(ج) سورتوں کے شروع میں جو رکوعوں کی یا آیتوں کی تعداد دکھائی ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ رکوع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنائے ہیں۔ یا یہ کہ آیتوں کی تعداد آپ نے بتائی ہے۔ رکوع بہت بعد میں بنائے گئے ہیں اور آیات کی گنتی کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ اور اس کی بنیاد نحوی قواعد پر ہے۔ کسی شخص نے کسی مقام پر مضمون کو مکمل قرار دے لیا ہے اور کسی نے کسی جگہ پر۔ اور اس کی وجہ سے آیتوں کی تعداد میں اکثر میں اختلاف ہو گیا ہے۔ اور یہ اختلاف تین قسم کا ہے۔ بعض نے سورۃ کی آیتوں کی تعداد میں تو اتفاق کیا ہے۔ مگر آیتوں کی حد بندی میں اختلاف کیا ہے۔ یعنی جسے ایک نے دو آیتیں قرار دیا ہے دوسرے نے ایک قرار دے لیا ہے۔ اور جسے دوسرے نے دو قرار دیا ہے اسے اس نے ایک قرار دے لیا ہے۔ دوسرا اختلاف یہ ہے۔ کہ بعض نے بعض سورتوں کی آیتوں کی معروف تعداد سے کم تعداد بتائی ہے۔ اور تیسرا یہ اختلاف ہے۔ کہ بعض جگہ بعض علماء نے آیتوں کی معروف تعداد سے زیادہ تعداد بتائی ہے۔ اس وجہ سے قرآن کریم کی کل آیات کے متعلق بھی اختلاف ہو گیا ہے۔ کوئی زیادہ آیتیں بتاتا ہے کوئی کم۔

تعداد آیات پر مسیحی مصنفین کا اعتراض

حقیقت کے نہ سمجھنے کی وجہ سے یا لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے بہت سے مسیحی مصنفوں نے یا دوسرے دشمنان اسلام نے اس امر کو قرآن کریم کے غیر محفوظ ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ مثلاً جنہوں نے آیتوں کی تعداد زیادہ بتائی ہے۔ ان کا حوالہ دیکر وہ کہہ دیتے ہیں۔ کہ دیکھو پہلے اس قدر آیات ہوتی تھیں موجودہ قرآن میں اس قدر لکھی ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس قدر آیات کم ہو گئی ہیں۔ یا کم والی روایت کو لیکر کہہ دیا کہ موجودہ قرآن میں اس قدر آیات ہیں۔ پہلے بزرگوں نے اس قدر لکھی ہیں معلوم ہوا۔ کچھ آیتیں زائد ہو گئی ہیں۔ حالانکہ یہ صریح دھوکا اور غلط بیانی ہے۔ جو لوگ آیتوں کی تعداد زیادہ بتاتے ہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ مضمون موجودہ مضمون سے زیادہ تھا۔ بلکہ صرف یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں حصہ آیت کو جو ایک آیت قرار دیا گیا ہے۔ اُسے ایک آیت نہ سمجھو۔ اور جو کم کہتے ہیں۔ وہ بھی اسی بنا پر کہتے ہیں۔ کہ فلاں فلاں آیتوں کو جو تم دو آیتیں بناتے ہو۔ ان کو دو آیتیں نہ سمجھو۔ ایک ہی آیت سمجھو لیکن وہ یہ ہرگز نہیں کہتے کہ اصل میں قرآن کریم کا مضمون تھوڑا تھا اور اب زیادہ کر دیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ فاتحہ ہے۔ بعض اسے آٹھ آیتیں قرار دیتے ہیں۔ اور بعض سات۔ آٹھ کہنے والے کوئی اور آیت شامل نہیں کرتے۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ بسم اللہ الگ آیت ہے۔ اور الحمد للہ سے سات آیتیں گنتے ہیں۔ اور بسم اللہ کو ملا کر آٹھ قرار دیتے ہیں۔ بعض وہ ہیں جو بسم اللہ کو پوری آیت نہیں قرار دیتے۔ بلکہ الحمد للہ رب العلمین سے ملا کر ایک آیت قرار دیتے ہیں۔ پس

باوجود آیتوں کی تعداد میں اختلاف کے مسلمانوں میں قرآن کریم کے مضمون کے متعلق اختلاف نہیں ہے۔ اور یہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ موجودہ قرآن کریم میں کوئی ٹکڑا ایسا ہے جو قرآن کریم کا جزو نہیں ہے۔ اور کسی نے بنا دیا ہے۔ پس تعداد کا اختلاف کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ ایک ذوقی اختلاف ہے۔ اور اس سے دشمنان اسلام کا فائدہ اٹھانا خود ان کی اپنی بیوقوفی پر دلالت کرتا ہے ؛

دیگر مطالب کے بیان کرنے سے پہلے میں اس تعلق کی نسبت کچھ کہنا چاہتا ہوں جو سورۂ یونس اور اس کے بعد کی سورتوں کو ان سے پہلی سورتوں کے ساتھ ہے۔ میں نے جہانتک فہم کیا ہے۔ قرآن کریم میں نہ صرف ہر آیت کو دوسری آیت کے مضمون کے ساتھ رابطہ ہے۔ بلکہ ہر سورہ اپنی سے پہلی اور پچھلی سورتوں کے مضمون سے وابستہ ہے بلکہ اس سے بھی بڑھکر یہ کمال ہے۔ کہ بعض سورتوں کے مجموعوں کا دوسری سورتوں کے مجموعوں سے بھی تعلق ہے اور اس طرح ایک زبردست اتصال ہے جو سورۂ فاتحہ کی بسم اللہ سے لیکر سورۃ الناس کی آیت من الجنۃ والناس تک پایا جاتا ہے۔ دشمن کہتا ہے۔ کہ قرآن کریم بے ترتیب ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ نہ صرف قرآن کریم کے مضمون میں ایک مکمل ترتیب ہے۔ بلکہ قرآن کریم کی سورتیں ایک سے زیادہ طریق سے باہم وابستہ ہیں۔ اور ان کی ترتیب کو دیکھکر قرآن کریم کے معجزانہ کلام ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہ جاتا۔ اس مضمون کی طرف اس جگہ توجہ دلانے کی یہ ضرورت پیش آئی ہے۔ کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے پہلے دس پاروں کے نوٹ بعد میں شائع کرنے پڑے ہیں پس ضرورت تھی کہ اس جگہ اس مضمون کے متعلق ایک مختصر نوٹ دے دیا جاتا۔ تاکہ پڑھنے والوں کے ذہن میں خلش باقی نہ رہ جائے ؛

یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ سورۂ یونس کو پہلی سورۃ کے مضمون سے تین تعلق ہیں۔ اول اس سورۃ کا تسلسل پہلی سورۃ سے۔ جو یہ ہے۔ کہ سورہ توبہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے دو مضامین کا ذکر فرمایا تھا۔ (۱) واذا ما انزلت سورۃ نظر بعضہم الی بعض ھل یراکم من احد ثم انصرفوا صرف اللہ قلوبہم۔ یعنی جب کوئی سورۃ اترتی ہے۔ تو ان (منافقوں) میں سے بعض دوسروں کی طرف دیکھتے ہیں (یہ اشارہ کرتے ہوئے) کہ کیا کوئی تمہیں دیکھتا تو نہیں پھر اٹھکر (مجلس سے) چلے جاتے ہیں۔ خدا بھی ان کے خیالوں کو حق سے محروم کر دیگا (۲) لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم یقیناً تمہارے پاس تمہی میں سے ایک ایسا رسول آچکا ہے۔ جس پر تمہارا مصائب میں مبتلا ہونا شاق گذرتا ہے۔ غرض سورہ توبہ کے اختتام پر پہلے کتاب کے نزول اور اس کی تکذیب کا اور پھر رسول کی آمد اور اس سے فائدہ اٹھانیکا ذکر تھا۔ اسی طرح سورۂ یونس کے ابتدا میں انہی دونوں امور کا اس ترتیب سے ذکر شروع کیا ہے کہ پہلے کتاب کی اہمیت بتائی۔ کہ تلک ایات الکتاب الحکیم ؎ پھر رسول کا ذکر فرمایا۔ اکان للناس عجبا ان اوحینا الیٰ رجل منہم ؛

ترتیب سور اور ان کا باہم تعلق مضمون

دوسرا تعلق سورۂ یونس کا سورہ توبہ سے یہ ہے کہ سورۂ یونس کا مضمون پورے طور پر سورہ توبہ کے مضمون کو مکمل کرتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ سورۂ توبہ میں جو در اصل الگ سورۃ نہیں ہے۔ بلکہ سورۂ انفال کا حصہ ہے۔ اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ کہ اب اسلام کی ترقی کا وقت آگیا ہے۔ اور خدا تعالے کے وعدے بڑے زور شور سے پورے ہونے لگے ہیں۔ پس چاہیئے۔ کہ لوگ اپنے دلوں کی صفائی کرکے خدا تعالےٰ کے حضور میں جھک جائیں۔ تا ان کی توبہ قبول ہو۔ چونکہ بعض لوگوں کے دلوں میں کثرت گناہ کی وجہ سے یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ شائد ہماری توبہ بھی اب قبول نہ ہو سکے۔ اس لئے سورۂ یونس میں اس مضمون پر بحث کی کہ اللہ تعالیٰ کا رحم غالب ہے۔ وہ ہر صورت میں بندے پر رحم کرتا ہے۔

پہلی سورتوں سے تعلق

ان اسے کامل توبہ کا نمونہ دکھانا چاہیئے ۔

تیسرا تعلق سورہ یونس کو پہلی تمام سورتوں سے یہ ہے کہ سورہ بقرہ سے لیکر سورہ توبہ تک آٹھ یا ہماری تحقیق کے مطابق سات سورتیں ہیں (سورۂ توبہ الگ سورۃ نہیں بلکہ سورہ انفال کا حصہ ہے اور بوجہ عظمت مضمون کے الگ کروائی گئی ہے۔) ان سورتوں کا مضمون ایک قسم کا ہے۔ اس کے بعد سورۂ یونس سے لیکر سورۂ کہف تک ایک سلسلہ مضمون کا ہے۔ اور یہ دونوں سلسلے مضمون کے ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلی آٹھ سورتوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کو پیش کرکے اور آپ کے کام کو دکھا کر اسلام کی صداقت کو ثابت کیا گیا ہے۔ اور اسلام کے پیش کردہ عقائد کی برتری اور اس کی تعلیم کی خوبی اور اس کے وسیع عرفان اور اس کی تعلیم کی حکمتوں اور اس کے غیر معمولی نیک اثر کو سامنے رکھکر لوگوں کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دی گئی ہے مگر سورۂ یونس اور اس کے ساتھ کی سورتوں میں دلائل عقلیہ اور منہاج نبوت پر اور پہلے انبیاء کے دعووں اور ان کے حالات کی طرف توجہ دلاکر نبوت اور اس کی ضرورت۔ مذہب اور اس کی اہمیت اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اس کے اغراض کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ پس سلسلہ مضمون ایک ہی ہے۔ صرف فرق یہ ہے۔ کہ پہلے سلسلے میں ان پیشگوئیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یا اس سے پہلے دیگر انبیاء کیطرف سے کروائی گئی تھیں اور وقت پر پوری ہوئیں۔ اور دوسرے سلسلہ میں اصولی رنگ میں اور منہاج نبوت کے ذریعہ سے اسلام کو پیش کیا گیا ہے ۔

بعض مدنی سورتیں بعض مکی سورتوں سے پہلے کیوں رکھی گئی ہیں

یاد رکھنا چاہیئے:۔ کہ پہلا سلسلہ سورتوں کا مدنی ہے۔ ان میں سے صرف دو مکی ہیں یعنی سورۂ انعام اور سورۂ اعراف۔ لیکن یہ سورتیں ہجرت کے بالکل قریب نازل ہوئی ہیں۔ اور اس وجہ سے مدنی سورتوں کی طرح ہی سمجھنی چاہئیں۔ سورۂ یونس اور اس کے ساتھ کی سورتیں سب کی سب مکی ہیں۔ اور ان میں سے بعض وسطی زمانہ کی اور بعض ہجرت کے قریب کی ہیں پس یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ قرآن کریم میں ان مدنی سورتوں کو پہلے کیوں رکھا گیا ہے۔ اور مکی سورتوں کو بعد میں کیوں رکھا گیا ہے۔ اگر پہلی سورتوں کو مضمون کے لحاظ سے پہلے ہی پڑھنا مناسب تھا تو کیوں خدا تعالیٰ نے ان کو پہلے نازل نہ کیا اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر ایک کام حکمت سے پُر ہوتا ہے۔ چونکہ نبی کے پہلے مخاطبوں اور بعد میں آنیوالوں کی ضرورتوں میں فرق ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے نزول کی ترتیب اور تحریر کی ترتیب میں فرق رکھا گیا ہے۔ نزول کی ترتیب ان لوگوں کے حالات کو مدنظر رکھکر ہے جو قرآن کریم کے پہلے مخاطب تھے اور جمع کی ترتیب ان لوگوں کو مدنظر رکھکر ہے۔ جو بعد میں آنے والے تھے۔ اب یہ امر ظاہر ہے۔ کہ جب کوئی تشریعی نبی دعوٰے کریگا تو اس وقت اس کی تعلیم یا اس کی پیش گوئیوں کا پورا ہونا زیر بحث نہیں ہوگا۔ کیونکہ نہ تو شروع میں تعلیم مکمل صورت میں لوگوں کے سامنے ہوگی۔ نہ ابھی پیشگوئیوں کے پورا ہونے کا وقت آیا ہوگا۔ پس شروع زمانہ میں لوگ ان امور پر بحث نہیں کرینگے۔ بلکہ سب سے پہلے اس کے ساتھ بحث اس امر پر ہوگی۔ کہ وہ کیسا خدا ہے۔ جس کی طرف سے ہونے کا وہ دعوی کرتا ہے۔ اس کی کیا صفات ہیں۔ اس کی کیا طاقتیں ہیں۔ کیا الہام کوئی حقیقت رکھتا ہے۔ انسان کو الہام کی کیا ضرورت ہے۔ اور اس قسم کے اور سوالات ہونگے۔ جن کی طرف لوگ توجہ کرینگے۔ پس کلام الٰہی لازماً انہی امور پر مشتمل ہوگا۔ جن کی طرف اس زمانہ کے لوگوں نے توجہ کرنی ہے۔ اور نیز پیش گوئیوں پر جو آئندہ اس کے صدق دعوی پر دلیل ہوں اسی طرح شریعت کے بعض ابتدائی مسائل بتائے جائیں گے (۲) دوسرا زمانہ ایسا آئیگا۔ کہ لوگ اس کے دعوی کی حقیقت کو سمجھ کر اس کی مخالفت پر آمادہ ہونگے۔ اور اس کی آمد کو بعث

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(میں) اللہ کا نام لیکر (شروع کرتا ہوں) جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے [۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ) قرار دینگے۔ اور اس کے عقائد جو وہ خدا تعالیٰ کے متعلق یا ایک مذہبی نظام کے متعلق بیان کرتا ہو۔ اُسے رد کرینگے۔ اور کچھ لوگ مان بھی لینگے۔ اسوقت اس امر کی ضرورت ہوگی کہ اس کی آمد کی غرض کو بتایا جائے اور پہلی تاریخ کی شہادت سے اس کے دعوی کو سنتہ اللہ کے مطابق بتایا جائے۔ اور عام عقلی دلائل اس کے دعوی کی تائید میں بتائے جائیں۔ اور پہلے انبیاء کے حالات سے سبق لینے کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی جائے اور شریعت کی بعض تفصیلات بتائی جائیں۔ اور ماننے والوں کو ان کے فرائض سے اور کامیابی کے لئے جدوجہد کے اصول سے آگاہ کیا جائے۔

(۳) پھر اس کے بعد تیسرا زمانہ وہ ہوگا۔ کہ اس میں شریعت مکمل کر کے اس کو بطور حجت کے پیش کیا جائے۔ اور جو پیش گوئیاں پوری ہو چکی ہوں۔ ان کو پیش کر کے مخالفین کو قائل کیا جائے۔ غرض خود اس نبی کے اپنے کام پیش کر کے بتایا جائے کہ یہ سچا ہے جھوٹا نہیں۔ اور جو کام کر چکا ہے وہی اس امر کا ثبوت ہے۔ کہ اسے ماننے میں دنیا کی بہتری ہے۔

لیکن پہلے زمانہ کے بعد جو لوگ آئینگے۔ وہ مذہب سے ایسے ناواقف نہ ہونگے۔ جیسے کہ پہلے زمانہ کے لوگ۔ ان کے سامنے ایک قائم شدہ جماعت ہوگی۔ جس کے دعوی سے ایک مدت تک وہ واقف ہونگے انکے سامنے سب سے پہلا سوال یہی ہوگا۔ کہ اس مدعی کے دعوی کو کیوں تسلیم کیا جائے اسکی تعلیم دوسری تعلیموں کے مقابلہ میں کیوں قابل قبول ہے اور اس کے کیا کام ہیں۔ جب ان امور کو سمجھ کر کوئی شخص مذہب کی حقانیت کو سمجھ جائیگا۔ تو دوسرے نمبر پر علم کی زیادتی کے لئے اسے یہ ضرورت ہوگی۔ کہ منہاج نبوت کی بنا پر اصولی رنگ میں بھی وہ صداقت کو سمجھ لے اور اس کے بعد پھر دوسرے امور کیطرف اسکی توجہ پھرے گی۔

پس اس طبعی تقاضا کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن کریم کے نزول کی ترتیب اور ہے اور اسکے جمع کی ترتیب اور۔ نزول کی ترتیب پہلے زمانہ کے لوگوں کی ضرورت کو مدنظر رکھکر ہے۔ اور جمع کی ترتیب بعد میں آنیوالوں کی ضرورت کو مدنظر رکھکر ہے۔ اور یہ بات خود ایک ایسی بین فضیلت ہے۔ جو صاحب بصیرت کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہے۔

بسم اللہ کے متعلق حضرت موسیٰ کی ایک پیشگوئی

[۱] یہ آیت جو ہر سورت کے پہلے آتی ہے۔ ایک پیشگوئی کو یاد دلاتی ہے۔ وہ پیشگوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ اور کتاب استثنا باب ۱۸ آیت ۱۸ میں بیان کی گئی ہے۔ اور اس کی تفصیل کتاب خروج باب ۱۹ و ۲۰ میں مذکور ہے۔ خروج میں لکھا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ ؑ سے کہا کہ بنی اسرائیل کو پاک کر کے سینا کے نیچے لا کھڑا کر۔ تاکہ وہ سُنیں کہ میں تجھ سے کلام کرتا ہوں۔ پہلے تو وہ پہاڑ کے پاس کھڑے رہیں۔ لیکن جب قرنا کی آواز بہت بلند ہو۔ تو ادھر آ جائیں حضرت موسیٰؑ جب وہاں گئے۔ اور خدا کا کلام نازل ہوا۔ تو ساتھ اس کے بجلی چمکی۔ اور دھواں اٹھا اور گرج ہوئی۔ تو لوگ ڈر کر دور کھڑے ہو گئے۔ جب موسیٰ ان کے پاس واپس گئے۔ تو انہوں نے انہیں کہا۔ کہ "تو ہی ہم سے بول اور ہم سنیں لیکن خدا ہم سے نہ بولے کہیں ہم مر نہ جائیں"۔ موسیٰ ؑ نے لوگوں کو کہا۔ کہ تم مت ڈرو۔ اس لئے کہ خدا آیا ہے کہ تمہیں امتحان کرے۔ اور تاکہ اس کا خوف تمہارے سامنے ظاہر ہو کہ تم گناہ نہ کرو۔ تب وے لوگ دور ہی کھڑے رہے۔ اور موسیٰ ؑ کالی بدلی کے جس میں خدا تھا۔ نزدیک گیا (خروج باب ۲۰ آیت ۱۹ تا ۲۱) حضرت موسیٰ ؑ نے خدا سے جا کر عرض کی

ابھی میری قوم تو تیرے پاس نہیں آتی تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو وحی ہوئی یہ انہوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا۔ میں اُن کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا۔ اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے فرماؤنگا وہ سب اُن سے کہیگا۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہیگا۔ نہ سنے گا۔ تو میں اس کا حساب اس سے لونگا۔ (استثنا $\frac{18}{19}$)

اس پیشگوئی میں بتایا گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک نبی ان کا مثیل ہوکر آئیگا۔ اور وہ جب خدا کا کلام سنائیگا تو کہیگا کہ میں خدا کا نام لیکر یہ کلام سُناتا ہوں۔ "خدا کا نام لیکر" سناتا ہوں کا ترجمہ عربی زبان میں بسم اللہ ہے۔ پس بسم اللہ ہر یہودی اور عیسائی کو توجہ دلاتی ہے کہ اگر تم اس کتاب کو رد کروگے۔ تو موسیٰؑ کی پیشگوئی کے بموجب پکڑے جاؤگے۔ اتنے واضح لفظوں میں یہ پیشگوئی تھی۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اسے نہ یہودیوں نے سمجھا نہ عیسائیوں نے۔ یہانتک کہ قرآن کریم میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نازل ہوئی۔ تب پتہ لگا کہ اس کا مفہوم کیا تھا۔ موسیٰ کی پیشگوئی کے الفاظ " اور ایسا ہوگا۔ کہ جو کوئی میری باتوں کو جو وہ میرا نام لے کے کہیگا نہ سنیگا۔ تو میں اس کا حساب اس سے لونگا" صاف بتلاتے ہیں کہ بسم اللہ کے الفاظ اس کے ہر نئے کلام کے پہلے ہونگے۔ پس بسم اللہ کا ہر سورۃ سے پہلے آنا اس پیشگوئی کے مطابق ہے۔ اور اس پر تکرار کا اعتراض خصوصاً ان اقوام کے منہ سے جو موسیٰؑ کی پیرو ہیں۔ بالکل زیب نہیں دیتا۔

کیا بسم اللہ پہلی کتب سے لی گئی ہے

مسیحیوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا ہے۔ کہ یہ آیت پہلی کتب سے نقل کی گئی ہے۔ راڈول لکھتا ہے۔ کہ یہ کلمہ یہودی الاصل ہے (ویری صفحہ ۲۸۶ جلد اول) ویری لکھتا ہے۔ کہ "یہ امر قریباً یقینی ہے۔ کہ یہ کلمہ محمدؐ (صلعم) نے یہودیوں اور صابیوں سے مستعار لیا ہے۔ آخر الذکر ہمیشہ اپنی تحریروں سے پہلے یہ لکھا کرتے تھے " بنام یزداں بخشائش گر دادگر" (ویری صفحہ ۲۸۹ جلد اول) پادری سنٹ کلیر ٹسڈل صاحب نے اپنی کتاب ینابیع الاسلام میں اس عبارت کو زردشتیوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور لکھا ہے۔ کہ کتاب دساتیر میں ہر نبی کے صحیفے سے پہلے یہ عبارت ہے۔ کہ بنام ایزد بخشائش گر مہربان دادگر (اردو ترجمہ ینابیع الاسلام صفحہ ۱۲۱) اب یہ عجیب بات ہے کہ تین مسیحی مصنف اس آیت کو مسروقہ ثابت کرنے کے لئے تین سرچشمے اس کے بیان کرتے ہیں۔ ایک یہودیوں کو اس کا سرچشمہ بناتا ہے دوسرا صابیوں کو۔ تیسرا زردشتیوں کو۔ اس قدر کوشش ان لوگوں کی اس آیت کو مسروقہ ثابت کرنے کی بتاتی ہے کہ اس آیت کی عظمت کے تو یہ لوگ بھی قائل ہیں۔ ورنہ صرف اس قدر لکھ دیتے کہ اس آیت کے مضمون میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ تینوں سرچشموں میں سے اصل سرچشمہ کونسا ہے۔ جب تین سرچشمے ہیں۔ تو ان میں سے کونسے چور ہیں اور کونسا اصلی ہے۔ آیا یہودیوں نے زردشتیوں یا صابیوں سے چرایا ہے۔ یا برعکس معاملہ ہے سب سے بڑھکر لطیفہ یہ ہے۔ کہ یہودیوں میں اس کلمہ کے استعمال کا ایک بھی حوالہ نہیں دیا گیا اور نہ وہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں۔ کہ جن میں یہودی اس آیۃ کو استعمال کرتے تھے بلکہ باوجود اس کے کہ مسیحیت یہودیت کی شاخ ہے۔ اور یہودی کتب گویا مسیحیوں کی اپنی مذہبی کتب ہیں۔ پھر بھی مسیحی مصنف یہودی کتب کا تو حوالہ نہیں دے سکے اور نہ ان کے الفاظ نقل کر سکے۔ لیکن زردشتیوں اور صابیوں کی کتب کے حوالے انہوں نے نقل کر دئے ہیں۔ مگر یہ حوالے خود مشکوک ہیں۔ کیونکہ زردشتی ان کتب کو وضعی قرار دیتے ہیں۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ وہ سب یا ان کے بعض حصے اسلام کے بعد بنالئے گئے ہوں۔

لیکن اگر انہیں صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے۔ تب بھی قرآن کریم پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کا یہ

سورۃ الرعد

(بقیہ صٓ) دعویٰ ہی نہیں کہ یہ آیت پہلی دفعہ قرآن کریم میں نازل ہوئی ہے بلکہ وہ خود تسلیم کرتا ہے۔ کہ یہ آیت اس سے پہلے بھی دنیا میں موجود تھی۔ چنانچہ سورۃ نمل میں اللہ فرماتا ہے۔ کہ حضرت سلیمان نے جو خط ملکۂ سبا کو لکھا تھا اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی درج تھا۔ پس اگر یہ ثابت ہو جائے۔ کہ یہود یا زردشتیوں یا صابیوں یا کسی اَور قوم میں یہ آیت پہلے سے موجود تھی۔ تو بھی کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم خود تسلیم کرتا ہے۔ کہ یہ آیت حضرت سلیمان کو معلوم تھی اور جو آیت حضرت سلیمان کو معلوم تھی۔ وہ اور انبیاء اور ان کے متبعین کو بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ قرآن کریم میں یہ آیت عربی میں نازل ہوئی اور پہلی قوموں میں ان کی اپنی زبانوں میں مگر باایں ہمہ قرآن کریم میں اس آیت کی موجودگی نقل نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ قرآن کریم میں اس آیت کا وجود ایک پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ اور جو کلام کسی نئی غرض کے لئے دوہرایا جائے اور کسی خاص فائدہ کے لئے لایا جائے۔ وہ نقل یا چوری ہرگز نہیں کہلاتا۔ موسیٰ ؑ کی پیشگوئی تھی کہ (۱) بنی اسمٰعیل میں سے ایک نبی آئیگا (۲) اسکو موسیٰ کی طرح شریعت دی جائیگی (۳) وہ جو نیا مضمون بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے پاکر دنیا کے سامنے پیش کریگا۔ اس سے پہلے یہ کہہ لیگا۔ کہ میں خدا تعالیٰ کا نام لیکر اس کلام کو شروع کرتا ہوں۔ (۴) اگر کوئی جھوٹا انسان اس پیشگوئی کو اپنے پر چسپاں کرنا چاہیگا۔ تو وہ ہلاک ہو جائیگا (۵) اور جو اس پیشگوئی کے مصداق کا انکار کریگا۔ وہ بھی ہلاک کیا جائیگا۔ اب بتاؤ اس پیشگوئی کا مصداق سوائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سوائے قرآن کریم کے اور کون ہے۔ پس قرآن کریم میں ہر سورت سے پہلے بسم اللہ موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ مگر کیا یہ امر دساتیر کے متعلق ثابت کیا جا سکتا ہے۔ کیا ان کے مصنف بنی اسمٰعیل میں سے تھے۔ یا موسیٰ کی طرح شریعت لائے تھے یا ان کی وحی سے پہلے بسم اللہ لکھا ہوا ہوتا تھا۔ وہ تو ایک تاریخ کی کتاب ہے۔ جس میں انبیاء کا حال ہے۔ اور موسےٰ کی پیشگوئی میں یہ شرط ہے۔ کہ اس نبی کے ہر مستقل حصۂ وحی سے پہلے بسم اللہ ہو۔ غرض باوجود اس کے کہ بسم اللہ پہلے انبیاء کی امتوں میں مروج تھی۔ قرآن کریم میں اس کا وجود تکرار یا چوری نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ وہ خود تسلیم کرتا ہے۔ کہ اس سے پہلے بسم اللہ تھی اور اس لئے کہ اس میں بسم اللہ موسیٰ ؑ کی پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے آئی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی جھوٹی جاتی۔

مقطعاتِ قرآن کریم

۲ ۵ حروف مقطعات اپنے اندر بہت سے راز رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض راز بعض ایسے افراد کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ جن کا قرآن کریم سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ ان کا ذکر قرآن کریم میں ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کے علاوہ یہ الفاظ قرآن کریم کے بعض مضامین کے لئے قفل کا بھی کام دیتے ہیں۔ کوئی پہلے ان کو کھولے۔ تب ان مضامین تک پہنچ سکتا ہے۔ جس جس حد تک ان کے معنوں کو سمجھا جائے۔ اسی حد تک قرآن کریم کا مطلب کھلتا جائیگا۔

مقطعات میں تبدیلی کیوں ہوتی ہے

میری تحقیق یہ بتاتی ہے کہ جب حروف مقطعات بدلتے ہیں۔ تو مضمون قرآن جدید ہو جاتا ہے۔ اور جب کسی سورت کے پہلے حروف مقطعات استعمال کئے جاتے ہیں۔ تو جس قدر سورتیں اس کے بعد ایسی آتی ہیں۔ جن کے پہلے

مقطعات معنی نہیں ہوتے

مقطعات نہیں ہوتے۔ ان میں ایک ہی مضمون ہوتا ہے۔ اسی طرح جن سورتوں میں وہی حروف مقطعات دہرائے جاتے ہیں۔ وہ ساری سورتیں مضمون کے لحاظ سے ایک ہی لڑی میں پروئی ہوئی ہوتی ہیں۔

الم سے شروع ہونیوالی سورتیں

سے میں بتا چکا ہوں کہ میری تحقیق میں سورہ بقرہ سے لیکر سورہ توبہ تک ایک ہی مضمون ہے۔ یہ سب سورتیں الٓمٓ سے تعلق رکھتی ہیں۔ سورۂ بقرہ الٓمٓ سے شروع ہوتی ہے۔ پھر سورۂ آل عمران بھی الٓمٓ سے شروع ہوتی ہے۔ پھر سورہ نساء، سورۂ مائدہ اور سورہ انعام حروف مقطعات سے خالی ہیں۔ اور اس طرح گویا پہلی سورتوں کے تابع ہیں۔ جن کی ابتدا الٓمٓ سے ہوئی ہے۔ ان کے بعد سورۂ اعراف الٓمٓصٓ سے شروع ہوتی ہے اس میں بھی وہی الٓمٓ موجود ہے۔ ہاں حرف ص کی زیادتی ہوئی ہے۔ اس کے بعد سورہ انفال اور براءة حروف مقطعات سے خالی ہیں۔ پس سورۂ براءة تک الٓمٓ کا مضمون چلتا ہے۔ سورہ اعراف میں جو ص بڑھایا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ حرف تصدیق کی طرف لیجاتا ہے۔ سورہ اعراف انفال اور توبہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی اور اسلام کی ترقی کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۂ اعراف میں اصولی طور پر اور انفال اور توبہ میں تفصیلی طور پر تصدیق کی بحث ہے۔ اس لئے وہاں صٓ کو بڑھا دیا گیا ہے۔

الر سے شروع ہونے والی سورتیں

سورہ یونس سے الٓمٓ کی بجائے الٓرٰ شروع ہو گیا ہے۔ الٓ تو وہی رہا اور مٓ کو بدل کر رٰ کر دیا۔ پس یہاں مضمون بدل گیا۔ اور فرق یہ ہوا کہ بقرہ سے لے کر توبہ تک علمی نقطہ نگاہ سے بحث کی گئی تھی۔ اور سورۂ یونس سے لیکر سورہ کہف تک واقعات کی بحث کی گئی ہے۔ اور واقعات کے نتائج پر بحث کو منحصر رکھا گیا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ الٓرٰ یعنی انا اللہ اریٰ۔ میں اللہ ہوں جو سب کچھ دیکھتا ہوں۔ اور تمام دنیا کی تاریخوں پر نظر رکھتے ہوئے اس کلام کو تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔ غرض ان سورتوں میں رؤیت کی صفت پر زیادہ بحث کی گئی ہے اور پہلی سورتوں میں علم کی صفت پر زیادہ بحث تھی۔

سے میں فی الحال اس جگہ اختصاراً اتنی بات کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ حروف مقطعات کے متعلق بعض لوگوں کا یہ خیال ہے۔ کہ یہ بے معنی ہیں۔ اور انہیں یونہی رکھ دیا گیا ہے۔ مگر ان لوگوں کی تردید خود حروف مقطعات ہی کر رہے ہیں۔ چنانچہ جب ہم تمام قرآن پر ایک نظر ڈالکر یہ دیکھتے ہیں۔ کہ کہاں کہاں حروف مقطعات استعمال ہوئے ہیں۔ تو ان میں ایک ترتیب نظر آتی ہے۔ سورہ بقرہ الٓمٓ سے شروع ہوتی ہے پھر سورۂ آل عمران الٓمٓ سے شروع ہوتی ہے۔ پھر سورہ نساء سورۂ مائدہ سورۂ انعام حروف مقطعات سے خالی ہیں پھر سورۂ اعراف الٓمٓصٓ سے شروع ہوتی ہے۔ اور سورہ انفال اور براءة خالی ہیں۔ ان کے بعد سورۂ یونس۔ سورۂ ہود۔ سورۂ یوسف الٓرٰ سے شروع ہوتی ہیں۔ اور سورۂ رعد میں مٓ بڑھا کر الٓمٓرٰ کر دیا گیا ہے۔ لیکن جہاں الٓمٓصٓ میں صٓ آخر میں رکھا۔ یہاں مٓ کو رٰ سے پہلے رکھا گیا ہے۔ حالانکہ اگر کسی مقصد کو مد نظر رکھے بغیر زیادتی کی جاتی۔ تو چاہیئے تھا۔ کہ میم کو جو زائد کیا گیا تھا۔ راء کے بعد رکھا جاتا۔ میم کو الٓرٰ کے درمیان رکھ دینا بتاتا ہے۔ کہ ان حروف کے کوئی خاص معنی ہیں۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ پہلے الٓمٓ کی سورتیں ہیں۔ اور اس کے بعد الٓرٰ کی۔ تو صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ مضمون کے لحاظ سے میم کو راء پر تقدم حاصل ہے۔ اور سورۂ رعد میں میم اور راء جب اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔ تو میم کو راء سے پہلے رکھنا اس امر کو بالکل واضح کر دیتا ہے۔ کہ یہ سب حروف خاص معنی رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان حروف کو جو معنی تقدم رکھتے ہیں ہمیشہ مقدم ہی رکھا جاتا ہے۔ سورۂ رعد کے بعد ابراہیم اور حجر میں الٓرٰ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن نحل بنی اسرائیل اور کہف میں مقطعات استعمال نہیں ہوئے۔ اور یہ سورتیں گویا پہلی سورتوں کے مضامین کے تابع ہیں۔ ان کے بعد سورۂ مریم ہے جس میں کٓھٰیٰعٓصٓ کے حروف

استعمال کئے گئے ہیں۔ سورہ مریم کے بعد سورہ طٰہٰ ہے اور اس میں طٰہٰ کے حروف استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد انبیاء۔ حج۔ مومنون۔ نور اور فرقان میں حروف مقطعات چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ گویا یہ سورتیں طٰہٰ کے تابع ہیں۔ آگے سورۂ شعراء طٰسٓمٓ سے شروع کی گئی ہے گویا طاء کو قائم رکھا گیا ہے۔ اور ھاء کی جگہ س اور میم لائے گئے ہیں۔ اس کے بعد سورۂ نمل ہے۔ جو طٰسٓ سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں سے میم کو اڑا دیا گیا ہے۔ اور طاء اور س قائم رکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد سورہ قصص کی ابتدا پھر طٰسٓمٓ سے کی گئی ہے۔ گویا میم کے مضمون کو پھر شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کے بعد سورۂ عنکبوت کو پھر الٓمٓ سے شروع کیا گیا ہے۔ اور دوبارہ علم الٰہی کے مضمون کو نئے پیرایہ اور نئی ضرورت کے ماتحت شروع کیا گیا ہے۔ (اگرچہ میں ترتیب پر اس وقت بحث نہیں کر رہا۔ لیکن اگر کوئی کہے۔ کہ الٓمٓ دوبارہ کیوں لایا گیا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سورہ بقرہ سے الٓمٓ کے مخاطب کفار تھے اور یہاں سے الٓمٓ کے مخاطب مومن ہیں) سورہ عنکبوت کے بعد سورہ روم۔ سورہ لقمان۔ اور سورہ سجدہ کو بھی الٓمٓ سے شروع کیا گیا ہے۔ ان کے بعد سورہ احزاب۔ سبا۔ فاطر۔ بغیر مقطعات کے ہیں اور گویا پہلی سورتوں کے تابع ہیں۔ ان کے بعد سورہ یٰسٓ ہے۔ جسکو یٰس کے حروف سے شروع کیا گیا ہے اس کے بعد سورہ صافات بغیر مقطعات کے ہے۔ اس کے بعد سورہ صٓ حرف صٓ سے شروع کی گئی ہے۔ پھر سورۂ زمر حروف مقطعات سے خالی اور پہلی سورت کے تابع ہے اس کے بعد سورہ مومن حٰمٓ سے شروع کی گئی ہے۔ اس کے بعد سورہ حم سجدہ کو بھی حٰمٓ سے شروع کیا گیا ہے۔ پھر سورہ شوریٰ کو بھی حٰمٓ سے شروع کیا گیا ہے لیکن ساتھ حروف عٓسٓقٓ بڑھائے گئے ہیں۔ اس کے بعد سورۂ زخرف ہے اس میں بھی حٰمٓ کے حروف ہی استعمال کئے گئے ہیں۔

پھر سورہ دخان۔ جاثیہ اور احقاف بھی حٰمٓ سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کے بعد سورہ محمد۔ فتح اور حجرات بغیر مقطعات کے ہیں۔ اور پہلی سورتوں کے تابع ہیں۔ سورہ قٓ حرف قٓ سے شروع ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم کے آخر تک ایک ہی مضمون چلا جاتا ہے۔

یہ ترتیب بتا رہی ہے کہ یہ حروف یونہی نہیں رکھے گئے۔ پہلے الٓمٓ آتا ہے۔ پھر الٓمٓصٓ آتا ہے جس میں صٓ کی زیادتی کیجاتی ہے۔ پھر الٓرٰ آتا ہے۔ اور پھر الٓمٓرٰ آتا ہے۔ کہ جس میں میم کی زیادتی کی جاتی ہے۔ پھر کٓھٰیٰعٓصٓ آتا ہے جس میں ص پر چار اور حروف کی زیادتی ہے۔ پھر طٰہٰ لایا جاتا ہے۔ اور پھر اس میں کچھ تبدیلی کر کے طٰسٓمٓ کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ہی قسم کے الفاظ کا متواتر لانا اور بعض کو بعض جگہ بدل دینا بعض جگہ اور رکھ دینا بتاتا ہے کہ خواہ یہ حروف کسی کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں۔ جس نے انہیں رکھا ہے کسی مطلب کے لئے ہی رکھا ہے۔ اگر یونہی رکھے جاتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ کہیں ان کو بدل دیا جاتا۔ کہیں زائد کر دیا جاتا۔ کہیں کم کر دیا جاتا۔

مقطعات کی دلالت کا اعتراف مخالفین اسلام کی طرف سے

علاوہ مذکورہ بالا دلائل کے خود مخالفین اسلام کے ہی ایک استدلال سے یہ مستنبط ہوتا ہے۔ کہ مقطعات کچھ معنی رکھتے ہیں۔ مخالفین اسلام کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب ان کی لمبائی اور چھوٹائی کے سبب سے ہے۔ اب اگر یہ صحیح ہے۔ تو کیا یہ عجیب بات نہیں کہ باوجود اس کے کہ سورتیں اپنی لمبائی اور چھوٹائی کے سبب سے آگے پیچھے رکھی گئی ہیں۔ ایک قسم کے حروف مقطعات اکٹھے آتے ہیں۔ الٓمٓ کی سورتیں اکٹھی آگئی ہیں۔ الٓرٰ کی اکٹھی۔ طٰہٰ اور اس کے مشترکات کی اکٹھی پھر الٓمٓ کی اکٹھی۔ حٰمٓ کی اکٹھی اگر سورتیں ان کے حجم کے مطابق رکھی گئی ہیں۔ تو کیا یہ عجیب بات نہیں معلوم ہوتی کہ حروف مقطعات ایک خاص حجم پر دلالت کرتے ہیں۔

اگر صرف یہی تسلیم کیا جائے۔ تب بھی اس کے معنی یہ ہونگے کہ حروف مقطعات کے کچھ معنی ہیں۔ خواہ یہی معنی ہوں کہ وہ سورت کی لمبائی اور چھوٹائی پر دلالت کرتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ ایک قسم کے حروف مقطعات کی سورتوں کا ایک جگہ پر جمع ہو جانا بتاتا ہے۔ کہ ان کے معنوں میں اشتراک ہے۔ اور یہ حروف سورتوں کے لئے بطور کنجیوں کے ہیں۔

حروف مقطعات کے معانی کا استنباط قرآن کریم سے

میرے نزدیک حروف مقطعات کے معنوں کے لئے ہمیں قرآن کریم ہی کی طرف دیکھنا چاہیئے۔ پہلی سورتوں میں الٓمّٓ آیا تھا۔ چنانچہ سورہ بقرہ کے پہلے یہی حروف تھے اور ان کے بعد ذٰلِکَ الکتب لاریب فیہ ھدًی للمتقین کا جملہ تھا۔ اس کے بعد آل عمران میں الٓمّٓ آیا۔ جس کے بعد اللہ لا الٰہ الاھو الحیّ القیوم۔ نزل علیک الکتب بالحق آیا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ حق اور لاریب کے دراصل ایک ہی معنی ہیں

الٓمّٓ کے معنی

پس بقرہ میں بھی الٓمّٓ کے بعد ایسی کتاب کا ذکر تھا۔ جس میں ریب نہ ہو اور اس جگہ بھی۔ پھر اعراف میں الٓمّٓصٓ آیا اور اس کے بعد کتاب انزل الیک فلا یکن فی صدرک حرج منہ لتنذر بہ وذکرٰی للمؤمنین۔ کی آیت رکھی گئی۔ گویا یہاں بھی لاریب فیہ والی کتاب کا ذکر ہؤا ہے۔ کیونکہ فلا یکن فی صدرک حرج لاریب فیہ کتاب پر ہی دلالت کرتا ہے ان ابتدائی سورتوں کے بعد وقفہ دیکر عنکبوت الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہے۔ فرماتا ہے۔ الٓمّٓ اَحَسِبَ الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنّا وھم لا یفتنون ولقد فتنّا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین ان آیات میں بھی ایک یقینی کتاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ امتحان شک اور ریب کے دور کرنے پر ہی دلالت کرتا ہے۔ پس اس سورت میں بھی وہی مضمون ہے جو سورہ بقرہ وغیرہ میں تھا۔ مگر بقرہ میں انسان بحیثیت مجموعی مخاطب تھے۔ اور یہاں مومنوں سے کہا گیا ہے۔ کہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ ابھی شک تمہارے دلوں میں باقی ہو۔ اور ہم تم سے معاملہ کاملین والا کرنا شروع کر دیں۔ سورۂ روم میں بھی یہی مضمون ہے۔ گو بہت باریک ہو گیا ہے۔ فرماتا ہے الٓمّٓ۔ غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون۔ خدا تعالیٰ کا کلام روم کے متعلق نازل ہوا ہے۔ اور وہ ضرور پورا ہو کر رہیگا۔ گویا بجائے سب کتاب کی طرف اشارہ کرنے کے ایک خاص حصہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس کے یقینی ہونے پر زور دیا ہے جیسا کہ مِن اور س کے حروف سے ظاہر ہے۔

سورہ روم کے بعد سورہ لقمان الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں فرماتا ہے۔ الٓمّٓ۔ تلک آیات الکتاب الحکیم۔ ھدًی ورحمۃ للمحسنین الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم بالاٰخرۃ ھم یوقنون۔ اولٰئک علیٰ ھدًی من ربھم واولٰئک ھم المفلحون۔ اس سورۃ میں بھی حکیم کا لفظ استعمال کر کے ایک یقینی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور گویا بقرہ کے ابتدائی مضمون کو دہرا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد سورۂ سجدہ ہے۔ اس میں آتا ہے۔ الٓمّٓ تنزیل الکتب لا ریب فیہ من رب العلمین۔ یہاں بھی ایک بے ریب کتاب کا ذکر ہے۔ پس ان سب آیات سے ظاہر ہے کہ جہاں الٓمّٓ آتا ہے۔ اس کے بعد ایک خاص مضمون آتا ہے اور ایک یقینی علم کے نزول کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ اب اس امر کی موجودگی میں کس طرح سمجھ لیا جائے۔ کہ یہ الفاظ یونہی رکھ دیئے گئے ہیں۔ پس حق یہی ہے۔ کہ الٓمّٓ کے حروف ازالہ شک اور یقین پر دلالت کرنے کے لئے آتے ہیں۔ اور وہ چیز جس سے شک دور ہوتا اور یقین پیدا ہوتا ہو کامل علم ہی ہوتا ہے۔ پس الٓمّٓ کے معنی یہی ہیں۔ کہ انا اللہ اعلم۔ میں اللہ ہوں۔ جو سب سے زیادہ جاننے والا

ہوں۔ پس اگر شک کو دور کرنا اور یقین حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو میرے کلام کی طرف توجہ کرو۔ اور میری کتاب کو پڑھو

اب میں الٓرٰ کو لیتا ہوں۔ ان حروف سے جو سورتیں شروع ہوتی ہیں۔ اگر ان پر غور کیا جائے۔ تو وہ بھی ایک ہی مضمون سے شروع ہوتی ہیں۔ سورۂ یونس میں آتا ہے۔ الٓرٰ۔ تلك اٰيات الكتٰب الحكيم ٭ اكان للناس عجبا ان اوحينا الىٰ رجل منهم ان انذر الناس وبشر الذين اٰمنوا ان لهم قدم صدق عند ربهم قال الكٰفرون ان هٰذا لساحر مبين۔ پھر سورہ ہودؔ میں آتا ہے۔ الٓرٰ۔ كتٰب اُحكمت اٰياته ثم فُصّلت من لدن حكيم خبير۔ اَلّا تعبدوا الا الله انّنى لكم منه نذير وبشير وان استغفروا ربكم ثم توبوآ اليه يمتعكم متاعًا حسنا الىٰ اجلٍ مسمّىً ويؤت كل ذى فضل فضله وان تولّوا فانّى اخاف عليكم عذاب يومٍ كبير پھر سورہ یوسف میں آتا ہے الٓرٰ تلك اٰيات الكتاب المبين۔ انا انزلناه قرءٰنًا عربيا لعلكم تعقلون نحن نقص عليك احسن القصص بمآ اوحينآ اليك هٰذا القراٰن وان كنت من قبله لمن الغٰفلين۔ پھر سورہ رعد میں آتا ہے۔ الٓمّٓرٰ۔ تلك اٰيٰت الكتٰب والذى انزل اليك من ربك الحق ولكن اكثر الناس لا يؤمنون ٭ الله الذى رفع السمٰوٰت بغير عمدٍ ترونها ثم استوىٰ على العرش وسخر الشمس والقمر كل يجرى لاجلٍ مسمًّى يدبّر الامر يفصّل الاٰيٰت لعلكم بلقآء ربكم توقنون یہاں میم کا بھی اور راؔ کا بھی مضمون آگیا۔ پھر سورۂ ابراہیم میں آتا ہے۔ الٓرٰ۔ كتاب انزلناه اليك لتخرج الناس من الظلمات الى النور باذن ربهم الىٰ صراط العزيز الحميد الله الذى له ما فى السمٰوٰت وما فى الارض وويل للكافرين من عذاب شديد پھر سورۂ حجر میں آتا ہے۔ الٓرٰ تلك اٰيٰت الكتاب وقراٰن مبين۔ ربما يود الذين كفروا لو كانوا مسلمين۔ وما اهلكنا من قرية الا ولها كتاب معلوم۔ ما تسبق من امة اجلها وما يستاخرون۔ ان سب مقامات پر مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں دو مضامین پر زور دیا گیا ہے ایک پرانی تاریخ پر۔ جس میں سے خاص طور پر شریروں کو سزا ملنے کے مضمون کو منتخب کر لیا گیا ہے۔ اور دوسرے پیدائش عالم کے مضمون پر سورۂ یونس میں استفہام انکاری کے استعمال سے بتایا گیا ہے۔ کہ نذیر و بشیر انبیا ہمیشہ ہی آتے رہے ہیں۔ سورہ ہود میں اول تو یہ قاعدہ بتایا ہے کہ کوئی قوم ایک ہی حالت پر قائم نہیں رہتی۔ بلکہ ایک دائرہ کے اندر چکر لگاتی ہے۔ اور پیدائش عالم کا ذکر کرکے بتایا۔ کہ دنیا کی ترقی قانون ارتقا کے ماتحت ہے۔ اس کے بعد سورۂ یوسف میں صاف الفاظ میں تاریخ عالم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سورۂ رعد میں چونکہ میم زائد تھا۔ اس میں الٓمٓ اور الٓرٰ دونوں مضمونوں کو جمع کر دیا ہے اور پہلے تو میم کی مناسبت سے ایک یقینی کلام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس کے بعد پیدائش عالم کا مطالعہ کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ سورہ ابراہیم میں پھر قانون قدرت کا مطالعہ کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور بتایا ہے کہ اسے دیکھو اس میں تمہیں ایک بیدار آقا کا ہاتھ نظر آئیگا۔ سورۂ حجر میں پھر پچھلی تاریخ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اب یہ امر ظاہر ہے۔ کہ واقعات اور قانون کا تعلق دیکھنے سے ہے۔ حقیقت تک وہی پہنچ سکتا ہے جس کی آنکھوں کے سامنے واقعات ہوں۔ یا جس کی آنکھوں کے سامنے کوئی قانون ظاہر ہو رہا ہو پس ان سورتوں کا رویت کے ساتھ تعلق ہے۔ غرض الٓرٰ میں بھی دعویٰ کیا گیا ہے۔ کہ میں اللہ دیکھتا ہوں۔ نہ تو پرانی تاریخ میری نظر سے پوشیدہ ہے اور نہ قانون قدرت کا اجرا۔

الٓرٰ کے معنی

۲ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ○

یہ کامل (اور) پر حکمت کتاب کی آیتیں ہیں ۔ ؎

یا پیدائشِ عالم میری نگہ سے مخفی ہے ۔پس روئیت سے تعلق رکھنے والے امور میں بھی میری ہی ہدایت کافی ہو سکتی ہے۔

ایک اور بات بھی حروف مقطعات کے متعلق یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ گو حروفِ مقطعات کے مضامین حروف کے اختلاف سے بدلتے رہتے ہیں۔لیکن ایک امر میں سب حروف مشترک ہیں۔ اور وہ یہ کہ جو سورتیں حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہیں۔ان کے مضمون کی ابتدا وحی الٰہی کے ذکر سے ہوتی ہے۔ اکثر میں تو صاف الفاظ میں کتاؔ یا قرآن کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے۔ اور چند ایک میں کسی پرانی کتاب کی طرف اشارہ ہے ۔جیسے سورۂ مریم میں۔ یا کسی خاص کلام کی طرف اشارہ ہے ۔ جیسا سورۂ روم میں

مقطعات والی سورتوں میں ایک اشتراک

کتاب

حلّ لغات تلک۔ اسم اشارہ ہے ۔اور دور کی چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے آتا ہے ۔ اَل حرفِ تعریف ہے اور اس کے مختلف معنوں میں سے ایک یہ بھی ہے ۔کہ جس لفظ پر یہ آئے ۔اُس کے متعلق یہ بتاتا ہے ۔کہ وہ اپنی جنس میں سے کامل وجود ہے۔

تلک ۔ اَل حکیم

آیات۔ آیۃ کی جمع ہے جس کے معنی علامت نشان اور دلیل کے ہوتے ہیں ۔قرآن کریم کے ہر ایک ایسے ٹکڑے کو جسے کسی لفظی نشان کے ساتھ دوسرے سے جدا کر دیا گیا ہو۔ آیۃ کہتے ہیں (تاج)

آیۃ

آیت کی وجہ تسمیہ

میرے نزدیک قرآنِ کریم میں وارد فقروں کا نام اٰیۃ اسی حکمت سے رکھا گیا ہے ۔کہ تا لوگ یہ سمجھ لیں ۔کہ قرآن کریم کے مضامین میں کمل ترتیب ہے۔ اور ہر فقرہ دوسرے فقرہ کے معانی کے لئے بطور دلیل ہے ۔بغیر اس کے مدنظر رکھے مطلب پوری طرح نہیں سمجھ میں آ سکتا۔ دوسرے اس لئے بھی کہ ہر ہر ٹکڑہ خدا تعالیٰ کا ایک نشان ہے عیسائی اعتراض کرتے ہیں ۔کہ قرآن نے معجزات کا دعوےٰ نہیں کیا۔ حالانکہ قرآن کریم تو اپنے ہر فقرہ کا نام آیت رکھکر اسے معجزات پر مشتمل بلکہ خود معجزہ قرار دیتا ہے ۔

الکتابُ ۔ مصدرٌ یہ لفظ دراصل کتب کا مصدر ہے) کَتَبَ الْکَتِیْبَۃَ جمعھا۔ لشکر کو جمع کر لیا۔ کَتَبَ السقاء ۔ خرزہ بسیرَیْن ۔ چمڑے کی تینوں سے ساتھ اسے سی دیا۔ (تاج) انہی معنوں کی رو سے کتاب کتاب کہلاتی ہے۔ کیونکہ اس میں مضامین کو جمع کر دیا جاتا ہو اور مختلف اوراق کو ایک جگہ اکٹھا کر کے سی دیا جاتا ہے کتاب کے معنی اس خالی کاغذوں کے مجموعہ کے بھی ہوتے ہیں ۔جس پر کچھ لکھا جائے اور کتاب تحریر کو بھی کہتے ہیں اور کتاب کے معنی فرض اور حکم اور اندازہ کے بھی ہوتے ہیں۔ اور کتاب خط کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب)

حکیم ۔ عالم۔ صاحب الحکمۃ ۔یعنی حکمت والا۔ المُتقِنُ للامور۔ تمام کاموں کو اچھی طرح کرنے والا ۔جس کے کاموں کو کوئی بگاڑ نہ سکے (اقرب) المحکم ۔یعنی مضبوط۔ (مفرد) **حکمۃ** کے معنی ہیں۔ عدل ۔ علم ۔ حلم ۔ نبوت مایمنع من الجہالۃ ۔یعنی ہر وہ بات جو جہالت سے روکے۔ کل کلام موافق للحق۔ ہر وہ کلام جو سچائی کے مطابق ہو۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی وضع الشیٔ فی موضعہ کے ہیں ۔یعنی ہر امر کو اس کے مناسب حال طور پر استعمال کرنا۔ اور صواب الامر وسداد؟ بات کی حقیقت اور اس کا مغز (اقرب)

حکم ۔ جو حکیم کا مادہ ہے ۔ اس کے معنی ہیں مَنَعَ منعًا لاصلاحٍ ۔ اصلاح کی خاطر کسی کو کسی کام سے روکنا ۔ اور اسی وجہ سے جانور کی لگام کو حَکَمَۃ کہتے ہیں ایک

شاعر کہتا ہے۔ ؎

ابنی حنیفۃ احکموا سفہاءکم

اے بنی حنیفہ اپنے بیوقوفوں کو سمجھاؤ اور بری باتوں سے روکو۔ (مفردات)

تفسیر۔ اس آیت میں خیر الکلام ما قل و دل کا پورا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ لفظ تھوڑے ہیں۔ لیکن اس قدر وسیع معانی پر مشتمل ہیں۔ کہ قرآن کریم کے کمالات کا خاکہ کھینچ دیتے ہیں۔ الفاظ کے جو معنی اوپر لکھے گئے ہیں۔ ان پر غور کرو۔ اور دیکھو کہ کس قدر وسیع مطالب کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ یہ آیتیں ایسی کتاب کی ہیں۔ جو اپنے اندر علوم رکھتی ہے۔ عدل کی تعلیم دیتی ہے جہالت سے روکتی ہے۔ تمام سچائیاں اس میں پائی جاتی ہیں۔ محل اور موقع کے لحاظ سے تعلیم دیتی ہے۔ لوگوں کی اصلاح کی غرض سے تعلیم دیتی ہے۔ اس میں بڑی پکی باتیں ہیں عربی زبان کی وسعت دیکھو۔ ایک لفظ میں کتنے دعوی کر دئے ہیں۔ اور بتایا ہے۔ کہ یہ ہیں ہمارے کام۔ پس اب تم کو یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ واقع میں اس میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں۔ یا نہیں۔ اگر پائی جاتی ہیں۔ تو پھر اس کا انکار خلاف عقل و دانش ہوگا۔ مگر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ قرآن کریم میں یہ امور نہیں پائے جاتے۔

تلک کے متعلق کہا گیا ہے۔ کہ اس کے ساتھ بعید کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ اور آیٰت الکتٰب تو بعید نہیں۔ جن کی طرف بظاہر اشارہ ہے۔ پس سوال یہ ہے۔ کہ تلک کا لفظ جو اشارہ بعید کے لئے ہے۔ یہاں پر کیوں لایا گیا ہے۔ بعض نے اس کے متعلق کہا ہے۔ کہ تورات وغیرہ پہلی کتابوں میں اس کتاب کی نسبت پہلے سے خبر دی ہوئی تھی۔ پس تلک کے ساتھ ان مبشر آیات کی طرف اشارہ ہے۔ جن میں اس کلام پاک کی خبر دی گئی تھی۔ اور بتایا ہے۔ کہ وہ مبشرات اس کتاب کی آیتیں ہیں۔ یعنی ان کا وجود اس کتاب کی آیتوں کے ذریعہ سے پورا ہوتا ہے۔ اور بعض کا یہ خیال ہے۔ کہ خدا نے پہلے مکمل کتاب لکھ چھوڑی تھی۔ اس میں سے وہ وقتاً فوقتاً آیتیں اتارتا رہتا ہے۔ پس ان کے نزدیک تلک کا اشارہ اس پہلی مکمل شدہ کتاب کی آیتوں کی طرف ہے بعض کہتے ہیں کہ جس طرح مشار الیہ کے بُعد مکانی کے بتانے کے لئے تلک آتا ہے۔ ایسا ہی اس کے درجہ کے بُعد کے اظہار کے لئے بھی آتا ہے۔ اور یہاں پر درجہ کے بُعد اور تعظیم کے لئے اس لفظ کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ سب مفہوم اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں۔ مگر میرے نزدیک ایک اور مفہوم بھی ہے۔ جو درجہ والی بات سے ملتا ہے۔ مگر اس سے کسی قدر الگ بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ آگے آتا ہے اکان للناس عجبًا کیا لوگ اسے عجیب بات یعنی انہونی بات سمجھتے ہیں۔ انہونی یا عجیب بات اسی کو کہتے ہیں۔ جسے انسان بعید از قیاس سمجھتا ہے۔ پس اگلی آیت سے معلوم ہوا۔ کہ کفار قرآن کریم کے مضمون کو بعید از قیاس باتیں قرار دیا کرتے تھے۔ اسلئے مخاطبین کے عقیدہ کے مطابق تعریضاً فرمایا کہ وہ انہونی بات (یعنی جسے تم انہونی خیال کرتے ہو۔) ایک نہایت ہی پختہ کتاب کی آیتیں ہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ انہونی ہوں ان سے زیادہ کوئی اور بات یقینی ہو ہی نہیں سکتی۔ پس تلک کا لفظ ان کے استبعاد کو مدنظر رکھتے ہوئے استعمال کیا گیا ہے۔

اشارہ بعید کا لفظ اختیار کرنے کی وجہ

ایک دوسری جگہ قرآن کریم میں آتا ہے انهم یرونه بعیدًا و نرٰىه قریبًا (معارج ع ۱) جس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وہ لوگ اسے مستبعد خیال کرتے ہیں اور ہمارے نزدیک وہ امر یقینی ہے۔ غرض جس چیز کے متعلق تعجب اور استبعاد ہو۔ وہ بھی دور کی سمجھی جاتی ہے۔ پس ان لوگوں کے خیالات کے مطابق فرمایا۔ کہ وہ چیز جو تمہیں دور کی نظر آتی ہے۔ اور جسے تم بعید از عقل سمجھتے ہو۔ اسے دور کی نہ سمجھو۔ وہ تو اس کتاب حکیم کی آیتیں ہیں۔ اور بہرحال پوری ہو کر رہینگی۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ

کیا لوگوں کے نزدیک ہمارا ان میں سے ایک شخص پر (یہ) وحی کرنا کہ لوگوں کو ہوشیار

النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ

کر اور جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں بشارت دے کہ انکے لئے ان کے رب کے حضور میں ایک ظاہر و باطن

عِنْدَ رَبِّهِمْ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ۳

طور پر کامل درجہ ہے (ایسا عجیب (امر تھا کہ) ان کافروں نے کہہ یا کہ یہ شخص یقیناً یقیناً کھلا کھلا دھوکہ باز ہے۔ ۵۴

عجب

انذار

حل لغات) العجب۔ انکار ما یرد علیک یعنے جب کوئی ایسا امر پیش آئے کہ اس کے ماننے میں طبیعت کو انقباض اور انکار ہو تو اس حالت انکار کو عجب کہتے ہیں۔ استطرافہ۔ پیش آمدہ امر کو پسند کرنے کو بھی عجب کہتے ہیں۔ روعة تعتری الانسان عند استعظام الشئ۔ یعنی اس حالتِ رعب کو بھی عجب کہتے ہیں جو انسان پر کسی چیز کو بہت ہی بڑا سمجھنے کے وقت طاری ہوتی ہے۔ ومن الله۔ الرضی اور جب الله کی طرف اس لفظ کو منسوب کیا جاوے۔ تو اس کے معنی پسندیدگی کے ہوتے ہیں (اقرب)

رجل

الرَّجُل :۔ خلاف المرأة یعنی مرد۔ الکامل فی الرجولیة وہ شخص جس میں مردوں والے کمالات بدرجۂ اتم پائے جائیں (اقرب)

وحی

قدم

اَوْحَيْنَا :۔ وحی سے ہے وحی کے معنی مفردات راغب میں لکھے ہیں۔ اصل الوحی۔ الاشارة السريعة وحی کے اصل معنی تیزی سے اشارہ کرنے کے ہیں لفظ وحی کلام الٰہی کی ان تمام قسموں کے لئے بولتے ہیں جن کے ذریعہ سے الله تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنی مرضی سے مطلع فرماتا ہے ہمارے نزدیک وحی کا لفظ اس کلام کے لئے اسی بنا پر چنا گیا ہے۔ کہ علوم روحانیہ الفاظ میں پوری طرح بیان نہیں ہو سکتے۔ صرف ان کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے پس خود اس نام سے ہی کلام کی رفعت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ أَنْذِرْ۔ أَنْذَرَ کا صیغۂ امر ہے۔ اس کی مصدر إِنْذَار ہے اور الفاظ۔ نَذْر۔ نُذْر۔ نُذُر اور نَذِير بھی اس معنی میں آتے ہیں کہتے ہیں أَنْذَرَهٗ بِالْاَمْرِ۔ أَعْلَمَهٗ وَحَذَّرَهٗ مِنْ عَوَاقِبِهٖ قبل حلوله یعنی کسی امر کی حقیقت سے اُسے آگاہ کیا۔ اور اس امر کے نتائج کے ظاہر ہونے سے پہلے اسے ہوشیار کر دیا۔ اور کہتے ہیں أَنْذَرَهٗ خَوَّفَهٗ فِیْ اِبْلَاغِهٖ يُقَالُ اَنْذَرْتُ القوم سَيْرَ العدوّ اليهم فنذروا یعنی أَنْذَرَهٗ کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ خبر پہنچاتے ہوئے خوب ہوشیار کیا چنانچہ جب کہتے ہیں۔ انذرت القوم سير العدو تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہ میں نے قوم کو دشمن کی پیشقدمی سے خوب ہوشیار کیا۔ اور اس کا فعل لازم یا مطاوع نَذَرَ ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ وہ ہوشیار ہو گیا (اقرب)

اَلْقَدَمُ :۔ الرِّجْل۔ پاؤں۔ السابقة فی الامر خیرا کان او شرًّا۔ کسی بات میں کمال کا حاصل ہونا۔ خواہ بری بات ہو یا اچھی۔ کہتے ہیں لفلان فی کذا قدم صدق او قدم سوء۔ فلاں شخص کو فلاں اچھی بات میں کمال حاصل ہے۔ یا فلاں بری بات میں کمال حاصل ہے۔ القَدَم۔ الرجل له مرتبة فی الخير۔ قدم اس شخص کو بھی کہتے ہیں جسے کسی اچھی بات میں کوئی خاص درجہ حاصل ہو

القدّم ۔ الشجاع ۔ قدم بہادر (مرد یا عورت) کو بھی کہتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں وضع القدم فی عمله اس نے اس کام کو شروع کر دیا ۔ (اقرب) الصّدق :۔ یعبرعن کل فعلٍ فاضلٍ ظاهرًا او باطنًا بالصدق فیضاف الیه ذلك الفعل الذی یوصف به نحو قوله تعو فی مقعدِ صدق و اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ (مفرد) صدق سے مراد ہر وہ فعل ہوتا ہے ۔ جو ظاہر و باطن میں خوبی رکھتا ہو ۔ اور جس فعل کی صدق کو صفت بنانا ہو اس کو صدق کا طرف مضاف کر دیتے ہیں ۔ جیسے کہ قرآن کریم میں ہے ۔ فی مقعد صدق (قمر ۶) فلاں شخص ظاہر و باطن طور پر اچھی جگہ میں ہے ۔ یا ان لهم قدم صدق انہیں ظاہر و باطن طور پر اچھا درجہ حاصل ہے ۔ یا واجعل لی لسان صدق فی الاخرین (شعراء ۵م) مجھے ظاہرو باطن طور پر اچھی تعریف حاصل ہو ۔ یعنی میرا ذکر خیر کے ساتھ صرف لوگوں کی زبان پر ہی نہ ہو ۔ بلکہ واقع میں بھی میرے نیک کام دنیا میں قائم رہیں اور میری تعریف جھوٹی نہ ہو یعنی لوگ غلو کر کے مجھ سے شرک نہ کرنے لگ جائیں ۔ یا فرمایا ہے کہ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ (بنی اسرائیل ۹۶) مجھے اس طرح کا داخلہ عطا ہو جو ظاہر و باطن میں اچھا ہو اور میں اس طرح اپنے شہر سے نکلوں کہ جو ظاہر و باطن میں اچھا ہو ۔ یعنی اس میں بزدلی اور کمزوری ایمان کا کوئی شائبہ نہ ہو ۔ اور اس کے نتائج نہایت اعلیٰ ہوں ۔ سٰحِر ۔ اسم فاعل ہے ۔ اور سَحَرَ سے نکلا ہے ۔ اس کے مصدر سِحْر کے معنی ہیں ۔ کُلُّ ما لَطُفَ مأخذه و دقّ ۔ ہر وہ چیز جس کا ماخذ یا جڑ نہایت باریک اور پوشیدہ ہو ۔ الفساد فساد ۔ اِخراج الباطل فی صورة الحق ۔ جھوٹ کو سچ کی شکل میں پیش کرنا واطلاقه علی ما یفعله من الحیل حقیقة لغویة ومنه ان من البیان لسحرًا اور اس لفظ کا استعمال حیلوں اور فریبوں پر لغت کے اصلی معنوں کے مطابق ہے ۔ اور اسی کے مطابق کہتے ہیں کہ بعض کلام بھی سحر ہوتا ہے (اقرب)

۱ صدق

۲ سبب نزول

مفسرین نے لکھا ہے اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے ۔ کہ کفار نے طنزًا کہا ۔ کہ لم یجد الله رسولا الا یتیم ابی طالب کہ خدا تعالیٰ کو ابو طالب کے یتیم کے سوا اور کوئی رسول نہ ملا ۔ کہتے ہیں اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل کی اور بتایا کہ یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں ؟

۳ کفار کا ایک طنز

نزول کے اسباب مقرر کرنا تو خیر ایک ذوقی امر ہے ۔ قرآن کریم کی آیات تو بہرحال اترنی ہی تھیں ۔ مگر اس تاریخی واقعہ سے یہ بات ضرور معلوم ہوجاتی ہے ۔ کہ کفار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کس نظر سے دیکھتے تھے ۔ اور آپ کی تحقیر کرنے کے لئے کیسے کیسے مضمون ایجاد کرتے تھے ۔ ابوطالب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے ۔ اور دادا کی وفات کے بعد آپ ان کی کفالت میں آگئے تھے ۔ ان کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منسوب کرنا اور آپ کے والد کی طرف منسوب نہ کرنا اس کے صرف یہ معنی تھے ۔ کہ آپ پر طعن کریں ۔ کہ ایسا غریب آدمی جس کو ایک اور شخص نے پالا تھا ۔ بھلا خدا کا رسول ہو سکتا ہے ۔ نادانوں نے یہ تو نہ سوچا کہ حضرت ابوطالب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے ۔ کوئی غیر نہ تھے ۔ باپ کی عدم موجودگی میں چچا کے گھر پلنے کا بچہ کو استحقاق ہوتا ہے ۔ کیونکہ اہلی زندگی کی بنیاد ہی اس قدیم عہد پر ہے ۔ کہ ایک دوسرے کا مصیبت کے وقت میں نائب بنے گا ۔ چنانچہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رض کو پالا ۔ اگر ابوطالب کا کوئی بیٹا رہ جاتا اور عبداللہ زندہ ہوتے تو وہ اُن کے گھر پلتا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ بھی غریب تھے ۔ اور صرف غربت کا اظہار ان کی طرف آپ کو منسوب کر کے بھی ہو سکتا تھا ۔ مگر انہوں نے ابوطالب کا یتیم کہہ کر اس امر کا اظہار کرنا چاہا ۔ کہ یہ شخص دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے والا ہمیں بادشاہت کے وعدے دلاتا ہے ۔

۱ سحر

کفار کے تعجب کا ایک باعث

تفسیر۔ کفار کو اس پر تعجب تھا۔ کہ انہی میں سے ایک آدمی پر کس طرح وحی آگئی۔ گری ہوئی قوموں میں یہ احساس ہمیشہ ہی ہوا کرتا ہے۔ کہ ہم میں سے بڑے آدمی نہیں پیدا ہو سکتے گویا کفار اپنی حالت سے ایسے مایوس ہو گئے تھے۔ کہ وہ یقین ہی نہیں کر سکتے تھے۔ کہ ان کا علاج ان کے اندر موجود ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کو بڑھانے اور ترقی دینے اور ان کا علاج کرنے کے لئے باہر سے کسی کو آنا چاہئے۔ یہی حال آج کل بہت سے مسلمانوں کا ہے۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ ہی آسمان سے آکر ہمیں ذلت اور ادبار سے نکالینگے۔ ہم میں سے ایسا شخص نہیں پیدا ہو سکتا جو ہمارا علاج کرے۔ اس امر میں انہیں پہلی قوموں سے کس قدر موافقت حاصل ہے۔ وہی مایوسی ہے اور وہی طریق علاج۔

ایک اور موجب تعجب

وہ لوگ جو قومی ترقی کے لئے یا تو امنگ ہی نہ رکھتے تھے یا یہ سمجھتے تھے۔ کہ خارجی علاج کے بغیر کچھ نہیں بن سکتا جب ان میں سے ان کے بھائی نے دعوے کیا۔ کہ میں ہی تمہارا علاج کرونگا۔ اور ترقی کی طرف لیجاؤنگا تو ان کی حیرت کی حد نہ رہی۔ وہ حیران ہو گئے۔ کہ جو بات ناممکن تھی۔ اُسے ممکن کرنے کا اس نے کیونکر دعوے کر لیا۔

دوسرا باعث

دوسری بات جو ان کے لئے حیرت انگیز بن گئی یہ تھی۔ کہ اس مدعی کا دعویٰ ہے کہ مجھے لوگوں کو ہوشیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی بعض پرانی باتوں کو چھوڑ دو اور بعض نئی باتوں کو اختیار کرو۔ ایسے لوگوں کے لئے ہمیشہ یہ بات قابل تعجب ہوا کرتی ہے۔ کہ رسول کہتے ہیں کہ موجودہ نظام کو توڑ دو۔ اور نیا نظام اختیار کرو۔

کفار کی یہ دونوں باتیں متضاد ہیں۔ ایک طرف تو ان میں اتنی مایوسی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہمارے علاج کے لئے ہم میں سے کوئی نہیں آسکتا اور دوسری طرف وہ اس بات پر لڑتے ہیں۔ کہ ہمارا نظام کیوں بدلتے ہو۔ یہ گری ہوئی قوموں کی حالت ہوتی ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ نہ کچھ چھوڑنا پڑے اور نہ کچھ کرنا پڑے۔ ایک شخص باہر سے آکر ان کے موجودہ نظام کو قائم رکھتے ہوئے انہیں ترقی کی طرف لیجائے۔ انہیں نہ تعلیم حاصل کرنی پڑے نہ محنت و مشقت کرنی پڑے نہ بری باتوں کو چھوڑنا پڑے۔ بلکہ ایک شخص باہر سے آئے۔ اور دوسروں کو مار دے اور سب کچھ انہیں حاصل ہو جائے۔ وہ یہ نہیں خیال کرتے۔ کہ اگر ان کا پہلا نظام درست ہوتا۔ تو ذلت اور ادبار میں وہ پڑتے ہی کیوں؟ پس ان کا موجودہ نظام توڑ کر ہی کام چل سکیگا۔

تیسری بات قابل تعجب ان کے لئے یہ تھی۔ کہ و بشر الذین امنوا ان لھم قدم صدق عند ربھم میں دعویٰ کیا گیا ہے۔ کہ میرے کہنے پر چلکر جو لوگ اس نظام کو بدلینگے۔ وہ ترقی کر جائینگے۔ حالانکہ ان کے نزدیک اول تو وہ لوگ بہترین دماغ کے نہ تھے۔ بلکہ ادنیٰ درجہ کے تھے۔ دوم وہ لوگ قوم کی مخالفت پر کھڑے تھے۔ سوم ناممکن بات کو ممکن بنا دینے کا دعوے کرتے تھے۔ چونکہ کوئی قوم اسی وقت ترقی کر سکتی ہے۔ کہ اس کے کام کرنیوالے لوگ بہترین دماغ کے ہوں۔ اس کا آپس میں اتحاد ہو۔ اور وہ ایسے مقاصد کے لئے کھڑی ہو۔ جن کا حاصل کرنا ممکن ہو۔ اور مسلمانوں کو وہ ان سب باتوں سے محروم سمجھتے تھے۔ اس لئے تعجب کرتے تھے کہ یہ کس طرح کامیاب ہو جائینگے۔ یہ کیونکر پہلے نظام کو توڑ دینگے۔ اور اس کی جگہ ایک اور نظام ایسا قائم کرینگے۔ جو ظاہر اور باطن طور پر اچھا ہوگا۔ جس سے یہ بادشاہ بن جائینگے۔ اور روحانی طور پر ان کا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہو جائیگا۔ عند ربھم اس لئے فرمایا کہ روحانی اور جسمانی دونوں ترقیاں ضروری ہوتی ہیں۔ پس اس ہستی کی طرف نسبت دیکر جس کے قبضہ میں یہ دونوں ترقیاں ہیں کامل کامیابی کی طرف اشارہ کر دیا۔ ان ھذا لسحر مبین۔ کفار نے اوپر کی بات کو سنکر کہا۔ کہ یہ شخص باتیں خوب بناتا ہے۔ حتیٰ کہ جھوٹ کو سچ کر دکھاتا ہے۔ اور انسانی فطرت کو

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ

تمہارا رب یقیناً اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو

فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ

چھ وقتوں میں پیدا کیا پھر عرش پر قرار فرما ہوا - وہ ہر امر کا انتظام کرتا ہے

مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ ۚ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ

(اسکے حضور میں) کوئی بھی (کسی کا) شفیع نہیں (ہو سکتا) مگر ہاں اسکی اجازت کے بعد - وہ (مذکورہ بالا صفات والا)

رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ ۴

ہے (اور وہی ہے) تمہارا رب اسلیئے تم اُسکی عبادت کرو - کیا تم پھر ابھی باوجود ان باتوں کے) نصیحت حاصل نہیں کرو گے ۵

اپیل کر کے جوڑنے والے ہیں ان کو ڈرا کر جو لالچی ہیں انہیں لالچ دلا کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا ہے - یہی اعتراض آجکل مسیحی مصنف کرتے ہیں - اور کہتے ہیں کہ عرب کے جاہلوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوف دلا کر یا لالچ دلا کر اپنے ساتھ ملا لیا - حالانکہ کفار کا اعتراض بتاتا ہے - کہ یہ نکتہ ان عرب کے جاہلوں کو بھی معلوم تھا - پھر وہ کس طرح دھوکہ میں آگئے - حق یہ ہے کہ تشابهت قلوبهم دونو کے دل مل گئے ہیں - ورنہ وہ کونسا مذہب ہوگا - جو یہ کہے کہ جو مجھے مانیگا دوزخ میں جائیگا اور جو نہ مانیگا جنت حاصل کریگا - اگر سچائی کے ماننے کے انعامات کا ذکر لالچ ہے تو کوئی سچائی بغیر لالچ کے نہیں ہوسکتی - یہ لوگ حضرت مسیحؑ کے متعلق کیا کہینگے - جنہوں نے جنت کی کنجیوں کا وعدہ پطرس کو دیا اور اعلان کیا - کہ ہر ایک کو جو اس کی تعلیم پر نہیں چلتا وہ خدا کی بادشاہت سے محروم رہیگا - اور ماننے والوں کے لئے انعامات کے وعدے کئے - (متی ۱۹ ب ۱۶ و ۱۸ و ۱۹)

حلِ لغات الرَّبُّ - مالک - آقا یا مطاع مستحق یا صاحب الشئ یعنی کسی چیز والا - رَبَّ الشیئَ - جَمَعَهُ اس چیز کو جمع کیا مَلَكَهُ اس کا مالک ہوا - القومَ ساسهم وکان فوقهم قوم پر حکومت اور سیاست کی - النِّعْمَةَ: زادها نعمت کو بڑھایا - الامرَ: اَصْلَحَهُ وَاَتَمَّهُ کام کو درست اور مکمل کیا - الدُّهْنَ: طَيَّبَهُ وأَجَادَهُ تیل میں عمدگی اور خوبی پیدا کی - الصبيَّ: رَبَّاهُ حَتّٰى اَدْرَكَ بچہ کی تربیت کی حتی کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ گیا (اقرب)

اَللّٰهُ - اسم باری الوجود (اقرب) تمام موجودات کو ہستی بخشنے والی ذات کا نام - خَلَقَ: الاَدِيمَ: قَدَّرَهُ قبل ان يقطعه - کھال کو کاٹنے سے پہلے اس کی اس شکل کا اندازہ کیا جس کے مطابق اسے کاٹنے کا ارادہ ہے - الشئ: اَوجَدَهُ وَاَبْدَعَهُ على غير مثالٍ سبق - پیدا کیا - عدم سے وجود بخشا - ایجاد کیا - اختراع کیا الأفك: - افتراه اپنے پاس سے بات گھڑ لی - الكلامَ وغيرَهُ: - صَنَعَهُ تیار کیا - الشئ: مَلَّسَهُ وَلَيَّنَهُ ہموار اور صاف کیا - العُود: سَوَّاهُ درست اور ہموار کیا (اقرب) اَلسَّمٰوٰت - سماء کی جمع السَّماء - آسمان - کل ما علاك فاظلك - ہر اوپر

اللہ
خلق
ربّ
سما

سے سایہ ڈالنے والی چیز۔ سقف۔ کل شیئ و بیتٍ چھت
رواق البیت برآمدہ۔ ظہر الفرس گھوڑے کی پیٹھ۔
السحابُ۔ بادل۔ المطرُ بارش۔ المطرۃ الجیّدۃ

أمر

ایک دفعہ کی برسی ہوئی عمدہ بارش۔ العشب سبزہ وگیاہ

الأرض

(اقرب) الأرض :۔ کرۂ زمین۔ کلّ ما سفل

یوم

برنیچے کی چیز (اقرب) ایّامٌ۔ یوم کی جمع ہے۔ الیوم
من طلوع الفجر الی غروب الشمس۔ دن کا وقت

اذن

الوقت مطلقاً۔ مطلق وقت جو بھی اور جتنا بھی ہو (اقرب)

استوٰی

استوٰی: اعتدل۔ اعتدال اختیار کیا۔ الطعامُ۔

عبادۃ

نَضِجَ پک کر تیار ہوگیا۔ العودُ من اعوجاجٍ۔
استقام کجی دور ہو کر سیدھا اور درست ہوگیا۔
الرجلُ: انتھی شبابہٗ وبلغ اشدّہٗ او اربعین
سنۃً و استقام امرہٗ نشوونما کے کمال کو پہنچ گیا۔
اپنی جسمانی ترقی کا کمال پایا۔ اس کے امور کو درستی حاصل

تذکر

ہوگئی۔ علی ظھر دابّتہٖ: استقرّ قرار پذیر ہوگیا۔
متمکن ہوگیا۔ علیہ: استولٰی وظھر استیلا اور غلبہ
پایا۔ لہ والیہ: قصد۔ متوجہ ہوا (اقرب)

عرش

عَرَشَ عرشا: بنیٰ بناءً من خشب لکڑی
کی عمارت بنائی۔ البیتَ: بناہٗ تعمیر کیا۔ الکرمَ: رفعَ
دوالیہ علی الخشب۔ بیل کو قرینے سے لگائی ہوئی
لکڑیوں پر چڑھایا (اقرب) العرش سریر الملک
اورنگ شاہی۔ العِزّ۔ عزت وغلبہ۔ قوام الامر
معاملات اور امور کی درستی کا ذریعہ اور مدار۔ رکن الشیئ
سہارا۔ من البیت سقفہ چھت۔ الخیمۃ خیمہ۔
البیت الذی یستظلّ بہ سایہ کا کام دینے والا گھر

تدبیر

شبہ بیتٍ من جرید یجعل فوقہ الثمام
جھونپڑی (اقرب) یُدَبِّرُ۔ تدبیر سے فعل
مضارع ہے۔ دبّر الأمرَ: نظر فی عاقبتہ و
تفکّر انجام اندیشی کی اور سوچا۔ اعتنی بہ اس
کی طرف توجہ دی اور اس کا اہتمام کیا۔ رتّبہ ونظّمہ
ترتیب دی۔ الوالی اقطاعہ: اَحْسَنَ سیاستھا
عمدہ نگرانی اور انتظام کیا۔ الحدیث: نقلہ عن غیرہٖ
نقلاً بیان کیا۔ علی ھلاکہٖ: احتال علیہ وسعٰی
فیہ۔ ہلاک کرنے کی کوشش کی (اقرب) اَلْاَمْرُ: طلب
احداث شیئٍ۔ طلب انشاء شیئٍ او فعلہ کسی چیز
یا کسی کام کو وجود میں لانے یا کرنے کا مطالبہ کرنا۔ الحال
حالت۔ الشأن: معاملہ۔ بات۔ الشیئ چیز۔ بات
(اقرب) اذنٌ مصدر ہے۔ اَذِنَ بِہٖ: عَلِمَ جانا
بہ ولہٗ: اباحہٗ اجازت دی (اقرب)
اُعْبُدُوْا۔ فعل امر ہے۔ اس کی مصدر عبادۃ۔ عبودۃ
عبودیۃ ہے۔ عَبَدَ لہ تالہ تمام ترکوشش کے ساتھ
پرستش میں لگ گیا۔ عَبَدَ اللّٰہَ طاع لہ وخضع
وذلّ وخدمہ والتزم شرائع دینہ ووحّدہٗ
اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بن گیا۔ اپنے آپ کو اسی ایک کا بنا کر
اس کے احکام کا پابند ہوگیا۔ (اقرب) تذکّرون
صیغہ جمع مذکر مخاطب فعل مضارع معروف ہے۔ تذکّر
الشیئ: یاد کیا۔ (اقرب) نصیحت اور تعلیم کو قبول
کیا (تاج)

ترتیب قرآن کریم کی عادت ہے کہ جس آیت کے
مضمون کے متعلق کوئی سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس کا جواب
اگلی آیت یا اگلی آیات میں دیدیتا ہے۔ اور بسا اوقات
اس اعتراض کو بیان بھی نہیں کرتا۔ صرف جواب ہی دیدیتا
ہے۔ گویا وہ پڑھنے والے کے ذہن کے افکار میں اور
قرآن کریم کے مضامین میں ایک کڑی بنا دیتا ہے۔ اور
اس طرح پڑھنے والا یوں محسوس کرتا ہے۔ کہ جو سوال
اس کے ذہن میں آتا ہے۔ قرآن کریم اس کا جواب ساتھ
کے ساتھ دیتا جاتا ہے۔ جو لوگ اس کے اس لطیف پیرایہ
سے ناواقف ہیں۔ وہ ایسے مقامات پر کہہ دیا کرتے ہیں
کہ اس کی آیات میں ترتیب نہیں۔ حالانکہ اصل نقص ان
کے تدبر کا ہوتا ہے۔ اس آیت میں بھی ایک سوال کا جواب

دیا گیا ہے۔ جو پہلی آیت سے پیدا ہوتا تھا۔ اور وہ یہ کہ مسلمان ترقی کس طرح کرینگے۔ ان کی ترقی کے سامان تو کوئی نظر نہیں آتے +

تفسیر۔ چونکہ پہلی آیت میں مسلمانوں کے لئے ایک پائدار کامیابی کی بشارت دی تھی اور ایسے وقت میں دی تھی۔ جبکہ مسلمانوں کے لئے ان کے گھروں میں بھی امن نہ تھا۔ اور سب ملک دشمن تھا اسلئے قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ ایسے حالات میں مسلمان کس طرح ترقی کرسکتے ہیں پس یہ وعدے صرف دھوکا دینے کے لئے ہیں۔ چنانچہ یہ سوال کفار کے دلوں میں پیدا ہوا اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر کہا۔ یعنی فریب کی باتیں کرنے والا۔ پس اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا۔ کہ ضروری نہیں کہ ہر امر کی ابتداء ہی میں اس کی ترقی کے سامان اپنی مکمل صورت میں نظر آجائیں روحانی عالم بھی جسمانی عالم کی طرح ہوتا ہے۔ آخر زمین و آسمان کو بھی تو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اگر اس کی طرف سے آنے والے کلام کے لئے ضروری ہے۔ کہ اس کی تکمیل کے سامان فوراً پیدا ہو جائیں۔ تو چاہیئے تھا۔ کہ زمین و آسمان بھی فوراً پیدا ہو جاتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ان کی پیدائش چھ دوروں میں ہوئی ہے۔ (علم طبقات الارض سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر ایک دور لاکھوں کروڑوں سال کا تھا) پس جس طرح آسمان و زمین کا باریک اور غیر مرئی ذرات سے ایک لمبے عرصہ میں پیدا ہونا اس بات کی علامت نہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا نہیں کیا۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے کے ساتھ ہی اسلام کی تکمیل کے سامانوں کا پیدا نہ ہونا اس امر کی علامت نہیں۔ کہ اس کی تکمیل مشکوک ہے۔ اور اس کی بنیاد خدا تعالیٰ نے نہیں ڈالی۔ الٰہی کاموں کی بنیاد ہمیشہ ایسے سامانوں سے رکھی جاتی ہے۔ جو انسانی نظر سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ کہہ کر یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت جو کن فیکون کے الفاظ آتے ہیں۔ یعنی وہ کہتا ہے ہو جا پس ہو جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ وہ اپنے حکموں کو فوراً پورا کرواتا ہے وقت کی حد بندی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے احکام بھی تدبیر پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یعنی باریک اور مخفی تدابیر سے کام لیکر وہ نتائج پیدا کرتا ہے۔ اور تدبیر کے معنی ہی یہ ہیں کہ اسباب میں ایسا تغیر کیا جائے۔ کہ طبعی نتائج منشا کے مطابق پیدا ہو جائیں۔

تدریج تکمیل

مَا مِنْ شَفِيعٍ میں اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنیوالا وجود صرف اس کے حکم سے ہی کھڑا ہو سکتا ہے۔ اپنے پاس سے کوئی شخص اس رتبہ کو نہیں پا سکتا۔ پس یہ کس طرح ممکن تھا۔ کہ ایسے تاریک زمانہ میں اللہ تعالیٰ کسیکو اپنا اذن دیکر نہ کھڑا کرتا اور اپنے بندوں کو یونہی چھوڑ دیتا۔ اس آیت میں بعض امور قابل تشریح ہیں۔ ان کی تشریح میں ذیل میں کرتا ہوں +

اصلاح عالم کا مقام اذن پر موقوف ہے

فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ میں یوم سے مراد یہاں سورج سے تعلق رکھنے والا دن نہیں۔ مجاہد۔ احمد بن حنبل۔ ابن عباس بروایت ضحاک (تفسیر ابن کثیر سورہ اعراف زیر آیۃ فی ستۃ ایام) اور زید بن ارقم (روح المعانی سورہ اعراف زیر آیۃ فی ستۃ ایام) کا مذہب ہے۔ کہ ایک ایک دن سے مراد ہزار ہزار سال ہے۔ گویا ان کے نزدیک زمین و آسمان چھ ہزار سال میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ بات انہوں نے اس آیۃ سے اخذ کی ہے۔ ان یوما عند ربك كالف سنة مما تعدون۔ (حج ع ۶) خدا کے نزدیک ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہے۔ یوم کے معنی جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے عربی میں مطلق وقت کے بھی ہوتے ہیں۔ اور یہی معنی یہاں نکلتے ہیں کیونکہ دن رات زمین کے سورج کے سامنے گھومنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس آیۃ میں سورج اور چاند اور زمین کی پیدائش کا ذکر ہے۔ پس اُس وقت یہ دن رات ہوتے ہی نہ تھے۔ اس لئے یہاں مراد وقت ہے

یوم سے مراد

نہ کہ صبح و شام والا دن ۔ پس ان کا یہ استدلال صحیح معلوم ہوتا ہے ۔ مگر یہ جو انہوں نے کہا ہے ۔ کہ یہ یوم ہزار ہزار سال ہی کا تھا ۔ یہ صحیح نہیں ۔ قرآن مجید نے تو یہ بھی کہا ہے کہ

تعرج الملٰئکة والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنة (سورہ معارج ع ۱) کہ خدا کا ایک دن پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے ۔ اگر یہ دن یہاں مراد لیں ۔ تو زمین و آسمان کی پیدائش کا عرصہ تین لاکھ سال بنتا ہے ۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ کیا یہ ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے سارے دن ہمیں بتائے ہوں ۔

پیدائش عالم کا ذکر بائبل میں

اگر ہزار سال کا یا پچاس ہزار سال کا اس کا دن ہوتا ہے ۔ تو ممکن ہے ۔ لاکھ یا پچاس لاکھ یا کروڑ یا ارب سال کا بھی اس کا کوئی دن ہوتا ہو ۔ سائنس سے پتہ لگتا ہے کہ اربوں سال زمین و آسمان کے بننے میں لگے ۔ اور حضرت محی الدین صاحب ابن عربی کے ایک کشف سے بھی ایسا ہی پتہ لگتا ہے ۔ پس حق یہی ہے کہ ہم اس عرصہ کی حد بندی ابھی پوری طرح نہیں کر سکتے ۔ صرف یہ کہہ سکتے ہیں ۔ کہ بعض تغیرات ہزار ہزار سال میں ہوئے ۔ بعض پچاس پچاس ہزار سال میں ۔ بعض اس سے بھی بہت زیادہ عرصہ میں ۔

پیدائش عالم کی تفصیل حدیث میں

حدیث میں پیدائش عالم کی ایک تفصیل آتی ہے ۔ اس کا ذکر کر دینا بھی یہاں ضروری ہے ۔ حضرت ابوہریرۃ رضؓ کی روایت ہے کہ اخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدی و قال خلق اللہ التربة یوم السبت وخلق

ستۃ ایام کی تفصیل قرآن کریم میں ۔

الجبال فیہا یوم الاحد وخلق الشجر فیہا یوم الاثنین وخلق المکروہ یوم الثلاثاء وخلق النور یوم الاربعاء وبث فیہا الدواب یوم الخمیس وخلق ادم بعد العصر یوم الجمعة اخر الخلق فی اخر الساعة من ساعات الجمعة فی ما بین العصر الی اللیل ۔ (تفسیر ابن کثیر زیر آیۃ فی ستۃ ایام سورۃ اعراف)

نسائی نے بھی اس کو بیان کیا ہے ۔ مگر دوسرے راویوں کی روایت سے ۔ بخاری اور بعض دوسرے محققین کے نزدیک یہ حدیث مرفوع نہیں ۔ بلکہ ابوہریرہ رضؓ نے اسے کعب الاحبار سے سنا ہے ۔ اس حدیث کی رو سے ہفتہ کے دن زمین کو پیدا کیا ۔ اتوار کے دن پہاڑ پیدا کئے ۔ پیر کے دن درخت ۔ منگل کے دن مصیبتیں اور بلائیں ۔ بدھ کو نور اور برکتیں ۔ جمعرات کو حیوان ۔ جمعہ کے دن عصر سے شام تک دن کی آخری گھڑی میں آدم کو ۔ حضرت مسیح موعود ؑ نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ آدم جمعہ کے دن عصر کے بعد پیدا ہوئے ۔ اور اس سے اپنے متعلق استدلال کیا ہے ۔ (خطبہ الہامیہ ضمیمہ ب) و ص ۱۲۳

بائبل میں پیدائش عالم کا ذکر اس طرح ہے ۔ خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی ۔ اس کے بعد خدا نے اُجالا پیدا کر کے اندھیرے اور اُجالے کو جدا کیا اور یہ پہلا دن ہوا ۔ اور پھر خدا نے پانیوں کے درمیان فضا بنائی اور فضا کو آسمان کہا اور یہ دوسرا دن ہوا ۔ پھر پانی سب اکٹھے ہو گئے ۔ اور خشکی نکل آئی ۔ تو وہ زمین ہو گئی ۔ اور جمع شدہ پانی سمندر ہو گئے ۔ اور پھر سبزیاں و نباتات بنائیں اور یہ تیسرا دن ہوا ۔ پھر چاند اور سورج اور ستارے پیدا کئے اور یہ چوتھا دن ہوا ۔ پھر رینگنے والے جانور اور پرندے پیدا کئے اور یہ پانچواں دن ہوا ۔ اس کے بعد مویشی ۔ کیڑے مکوڑے اور جنگلی جانور پیدا کئے اور سب سے آخر انسان کو اپنی صورت پر اور اپنی مانند پیدا فرمایا ۔ اور یہ چھٹا دن ہوا ۔ (پیدائش باب اول)

قرآن کریم میں سورۂ حٰم سجدہ ع ۲ میں چھ دنوں کی تشریح اس طرح کی گئی ہے ۔ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۚ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ۚ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ ۚ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا

بِمَصَابِيْحَ وَحِفْظًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝

ان آیات کا یوں ترجمہ بنتا ہے۔ کیا تم انکار کرتے ہو۔ اس خدا کا جس نے زمین کو دو دنوں میں بنایا۔ اور اس کے شریک قرار دیتے ہو۔ وہ ہے رب العلمین اور اُسنے پہاڑ بنائے ہیں زمین کے اوپر اور برکتیں ڈالیں اس میں اور رزق رکھا یہ سب کچھ اس نے چار دن میں کیا اور یہ جواب سب قسم کے سائلوں کے لئے برابر تسلی دینے والا ہے۔ (یعنی ایسے الفاظ میں جواب دیا گیا ہے۔ کہ ایک عامی آدمی بھی اس کو سمجھ سکتا ہے۔ اور ایک علم طبقات الارض کا ماہر بھی اس سے تسلی پا سکتا ہے۔) اور آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو کہ دخانی حالت میں تھا۔ اور اسے اور زمین کو کہا کہ ہمارے حضور میں حاضر ہو جاؤ۔ پسند ہو یا ناپسند۔ انہوں نے کہا ہم خوشی سے حاضر ہوتے ہیں۔ پس کامل طور پر بنایا ان کو دو دنوں میں سات آسمانوں کی صورت میں اور ہر آسمان میں اس کے مفوضہ کام کی قابلیت رکھی اور سب سے ورلے آسمان کو روشن ستاروں کے ساتھ مزین کیا۔ یہ اس خدا کا اندازہ ہے جو غالب اور خوب جاننے والا ہے۔

اس آیت میں ثمّ واو کے معنی میں آیا ہے اور اس کے معنی "اور" کے ہیں اور اس کے پہلے جو مضمون بیان ہوا ہے وہ درحقیقت بعد کا ہے۔ ثمّ کے ذریعہ سے پہلی بات کی صرف تشریح کی ہے۔ بعض لوگوں نے ان آیات پر اعتراض کیا ہے۔ کہ یہاں آٹھ یوم بنتے ہیں۔ خلق الارض دو دن میں خزانوں اور غذاؤں کا پیدا کرنا چار دن میں اور سات آسمانوں کا بنانا دو دن میں۔ اس کا جواب مفسرین نے یہ دیا ہے کہ جہاں فی اربعۃ ایام فرمایا ہے اس جگہ چار نئے دن مراد نہیں۔ بلکہ زمین کی پیدائش میں جو دو دن زمانے تھے ان کو ملا کر چار دن فرمائے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ خزانے اور غذائیں دو دن میں پیدا کیں۔ اور پہلے دن ملا کر یہ کل چار دن ہوئے۔

میرے نزدیک یہ معنی گو زبان کے قواعد کے لحاظ سے درست ہیں۔ مگر اس آیت کے مطالب کے لحاظ سے درست نہیں معلوم ہوتے۔ اسجگہ زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنیکا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ پیدائش کے مدارج بیان کئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے۔ کہ زمین دو وقتوں یعنی دو دَوروں میں پیدا ہوئی ہے۔ اور اس کے بعد چار وقتوں یعنی دوروں میں اس کے اندر کی وہ قابلیتیں پیدا ہوئی ہیں جو انسان کے بقاء اور ترقی کے لئے ضروری تھیں۔ اور یہ ذکر نہیں کہ اس زمانہ میں اس کے ساتھ ساتھ اور کوئی چیز نہیں بنی۔ اور آسمان کے متعلق جو آیا ہے کہ وہ دو وقتوں میں بنا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے چھ دنوں کے بعد بنا۔ بلکہ اس میں صرف یہ بتایا گیا ہے۔ کہ اس کے مکمل ہونے پر بھی دو دَور گذرے تھے گو وہ الگ دَور نہ تھے بلکہ زمین کی پیدائش کا جو زمانہ تھا۔ وہی آسمانوں کا بھی تھا۔ پس کل روز چھ ہی رہے۔ آٹھ نہ ہوئے۔ علم طبقات الارض سے بھی یہی ثابت ہے کہ پیدائش عالم ایک ہی وقت میں ہوئی ہے۔ زمین بھی اور باقی سیارے بھی ایک ہی وقت میں تکمیل کے مدارج طے کر رہے تھے۔ یہ نہیں کہ زمین پہلے بنی اور پھر دوسرے سیارے یا یہ کہ سیارے پہلے بنے اور پھر زمین۔ پس جو ہر زمین کے بننے کا وقت تھا اسیوقت اس کا آسمان بھی بن رہا تھا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اسجگہ اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا۔ کہ آسمانی اجرام کی اندرونی قابلیتیں کس قدر عرصہ میں بنیں۔

فی اربعۃ ایام سواءً

اب رہا یہ سوال کہ یہ یوم یعنی وقت کس کس قدر عرصہ کے تھے۔ سو اس کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اس کی تعیین خدا تعالےٰ نے نہیں کی اور اس وجہ سے ہم بھی نہیں کرتے۔ علم طبقات الارض اور علم ہیئت سے جو امور یقینی طور پر معلوم ہوں ان سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں یا اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کشف کے ذریعہ سے کچھ بتا دے تو وہ ایک اندازہ کر سکتا ہے۔ ورنہ ہم صرف یہ یقین رکھینگے کہ دو عظیم الشان دَور آسمان و زمین کی پیدائش پر گذرے ہیں۔

فی ستۃ ایام میں یوم کی مقدار

اور یہ سوال کہ ان میں سے ہر ایک دور کس قدر عرصہ کا تھا۔
اسے ہم خدا تعالیٰ پر چھوڑ دیںگے۔ اصل بات یہ ہے کہ علم
ہیئت اور علم طبقات الارض میں بھی قرآنی اصطلاح کے
مطابق ایک عظیم الشان تغیر کو عرصہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور
انگریزی میں اسے (PERIOD) کے نام سے
موسوم کرتے ہیں جو مفہوم (PERIOD.) یعنی
عرصہ کا علم ہیئت اور علم طبقات الارض میں ہوتا ہے
وہی مفہوم یوم کا قرآنی آیات میں ہے۔

روحانی عالم کی تکمیل کے سات مدارج

اس آیت سے اور بعض دوسری آیات سے
معلوم ہوتا ہے۔کہ اللہ تعالیٰ نے پیدائش عالم میں سنت
مقرر کی ہے۔کہ ہر چیز کی تکمیل ساتویں درجہ پر ہوتی ہے
چھ درجے خلق کے ہوتے ہیں اور ساتواں تکمیل کا۔ رسول
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ
اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے۔کہ یہ روحانی عالم بھی
چھ دوروں میں تکمیل کو پہنچیگا۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔آپ
کے دعویٰ کے بعد پہلی حالت دخان کی تھی یعنی سوائے
تاریکی اور دُھند کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔اور یوں معلوم
ہوتا تھا۔کہ آپ کی بعثت سے بجائے دنیا کو کچھ فائدہ پہنچنے
کے اُلٹا کچھ نقصان ہی ہوا ہے اور تفرقہ اور جنگ زیادہ ہو گیا
ہے۔سب دعاوی بھی مثل دخان کے تھے۔کہ کوئی ٹھوس
چیز ابھی نظر نہ آتی تھی۔اس کے بعد دوسرا دَور آیا کہ وہ

شفاعت

دخان کچھ کچھ سمٹنے لگا۔کچھ آدمی آپ پر ایمان لے آئے
اور لوگوں کو معلوم ہونے لگا کہ یہ سلسلہ بھی ایک علیحدہ
ہستی بن رہا ہے۔اس کے بعد اندرونی تغیرات شروع
ہوئے۔اور جس طرح زمین میں زلازل وغیرہ آتے ہیں ایسے ہی
اسلام کے خلاف جوش پیدا ہوا۔اور زلازل کا ایک لمبا
سلسلہ شروع ہو گیا۔اور پھر اس کے بعد اسلام کے پہاڑ یعنی
ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم وغیرہم لوگ تیار ہوئے یہ لوگ انہی
زلازل کے سبب سے ممتاز ہوئے۔اگر زلازل نہ آتے۔
تو ان کے جوہر ہی نہ کھلتے اور یہ بھی اس مقام کو نہ پہنچتے

اس کے بعد پانچواں دَور یہ آیا کہ جس طرح زمین میں نباتات
پیدا کرنے کی قابلیت پیدا ہوئی تھی آپ کی تعلیم بھی سرسبز
و شاداب نظر آنے لگی اور لوگ محسوس کرنے لگے کہ یہ ایک
خوشگوار تعلیم ہے۔اور مختلف علاقوں میں پھیلنے لگی۔اس
کے بعد جس طرح زمین میں حیوانات پیدا ہونے لگے تھے
اسلام کے اندر قوت و طاقت پیدا ہو گئی۔اور پھر اس نے
دشمنوں کے حملوں کا دفاع شروع کر دیا۔آخر ساتواں
یعنی تکمیل کا دَور یہ آیا کہ جس طرح زمین پر انسان پیدا ہوا
تھا اور اس نے کل عالم پر حکومت شروع کی تھی۔خدا تعالیٰ
نے اسلام کو غلبہ اور طاقت بخشی اور اس کی شریعت جاری
ہو گئی۔اور دنیا پر اس نے حکومت کرنی شروع کر دی۔
گویا انسان کامل کا دَور شروع ہوا۔ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى
الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ سے اس طرف اشارہ کیا
کہ جس طرح وہاں پیدائش عالم کے بعد خدا تعالیٰ عرش
پر قرار فرما ہوا تھا۔اسی طرح یہاں ہو گا۔یعنی اسلام کے
قیام کے بعد اللہ تعالیٰ مقام تنزہ کی طرف رجوع کریگا۔
اور صرف اسلام ہی کے ذریعے سے آئندہ روحانی ترقیات
حاصل ہونگی جس طرح عالم مادی کے پیدا کرنے کے بعد ہر ایک
کام قوانین نیچر کی وساطت سے ہوتا ہے اور عام حالات
میں خدا تعالیٰ براہ راست کوئی تغیر نہیں
فرماتا۔

دوم مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ کا
حصہ قابل تشریح ہے۔شفیع شفع سے نکلا ہے۔اس
کے معنی ہیں دو کر دینا۔چنانچہ کہتے ہیں۔شفع العدد
والصلوٰۃ۔ایک کو دو کر دیا یا ایک رکعت پڑھ کر ایک اور
پڑھی۔اور اسے دو رکعت بنا دیا۔اور ناقۃ شافعۃ
اس اونٹنی کو کہتے ہیں۔کہ جس کے پیٹ میں بھی بچہ ہو۔
اور اس کے ساتھ بھی بچہ ہو۔گویا وہ اپنے پہلے بچہ کو دو بنا
دیتی ہے۔لیکن صرف ایک کو دو بنا دینا اس لفظ سے نہیں
نکلتا۔بلکہ یہ شرط بھی ہے۔کہ ضم الشئ الی مثلہ ہو۔

یعنی اسی قسم کی چیز ملائی جائے یہ نہیں کہ کوئی اونٹ کے ساتھ ایک گھوڑا کھڑا کردے۔ اور کہہ دے کہ شفعت الناقۃ اونٹ کے ساتھ اونٹ ہی ملایا جاوے۔ تب ہی شفع کا لفظ استعمال ہوگا۔ ان معنوں کو مدنظر رکھنے سے شفاعت کا مسئلہ بالکل حل ہوجاتا ہے۔ اور ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوجاتی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ شفاعت سے گنہ میں ترقی ہوتی ہے اور لوگ عمل چھوڑدیتے ہیں۔ کیونکہ شافع یا شفیع کے تو معنی ہی یہ ہیں۔ کہ وہ ہم جنس کو آپس میں ملائے۔ پس گنہ گار اور بدکار کو نیکوں سے ملانا تو اس کے مفہوم میں شامل ہی نہیں۔ بلکہ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جسے خدا تعالیٰ نے شفیع بنایا ہو۔ وہ بدکاروں کو نیک بنا بنا کر پہلی نیک جماعتوں کے ساتھ ملائے یہ معنی اس دنیا کے لحاظ سے ہیں۔ دوسرے معنی اس کے یہ ہیں۔ کہ آخری فیصلہ کے دن جو لوگ ایک بڑی حد تک نیک ہوں صرف بعض خامیاں ان میں ہوں جو ان کو کاملین میں شامل ہونے سے روک رہی ہوں اور اللہ تعالیٰ کا فضل چاہتا ہو کہ ان کی ان چھوٹی چھوٹی خامیوں کو نظر انداز کرکے اور ان کی اس جدوجہد کو مدنظر رکھ کر جو وہ اپنی تکمیل کے لئے کرتے رہے ہیں انہیں کاملین میں ہی شامل کردے۔ تو خدا تعالےٰ سے اذن پاکر اُمت کا نبی خدا تعالےٰ سے سفارش کرے کہ ان کی تھوڑی تھوڑی خامیوں کو نظر انداز کرکے ہمارے ساتھ ہی شامل سمجھا جائے۔ یہ معنی اگلے جہان کے متعلق ہیں۔ اور شفاعت کے لئے شرط ہے۔ کہ اذن سے ہو۔ اور اذن بھی اسی شخص کے متعلق ملیگا۔ جو شخص دل سے تو کاملین کے ساتھ ہو اور اس نے کامل بننے کی پوری کوشش کی ہو۔ مگر بعض خامیاں اس میں رہ گئی ہوں ایسے شخص کے حق میں شفاعت ہرگز گنہ کو بڑھاتی نہیں۔ بلکہ کامل ہونے کی خواہش کو تیز کرتی ہے۔ اور اس پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا +

سوم۔ عرش کا لفظ تشریح طلب ہے۔ عرش کے متعلق لوگوں میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ بعض لوگ اسے ایک جسم قرار دیتے ہیں۔ بعض اس کی حقیقت سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں اور صرف لفظ پر ایمان لانا کافی سمجھتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے چشمۂ معرفت میں عرش کی حقیقت پر ایک لطیف بحث کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ عرش درحقیقت صفات تنزیہیہ کا نام ہے جو ازلی اور غیر مبدل ہیں ان کا ظہور صفات تشبیہیہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اور وہ حامل عرش کہلاتی ہیں جیسے کہ قرآن کریم میں آتا ہے وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ قیامت کے دن تیرے رب کا عرش آٹھ (افراد) اپنے اوپر اٹھائے ہونگے۔ یعنی آٹھ صفات کے ذریعہ سے اُن کا ظہور ہورہا ہوگا۔ جیسا کہ اسوقت چار صفات سے ہوتا ہے یعنی رب العالمین۔ رحمٰن۔ رحیم۔ اور مالک یوم الدین کے ذریعہ سے۔ چونکہ صفات الٰہیہ کا ظہور فرشتوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں ھُم کی ضمیر استعمال کی گئی ہے) جس طرح بادشاہ اپنی جلالت شان کا اظہار عرش پر بیٹھ کر کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی اصل عظمت ذوالعرش ہونے میں ہے۔ یعنی صفات تنزیہیہ کے ذریعہ سے جن میں کوئی مخلوق اس سے ایک ذرہ بھر بھی مشابہت نہیں رکھتی۔ بعض لوگوں نے قرآن کریم کی بعض آیات سے یہ دھوکا کھایا ہے کہ عرش مخلوق ہے۔ جیسے مثلاً یہ آیت ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ الآيۃ (سورۃ مومن ع) وہ کہتے ہیں کہ عرش کو جب کسی نے اٹھایا ہوا ہے تو معلوم ہوا وہ ایک مخلوق شئے ہے۔ لیکن یہ استدلال درست نہیں۔ کیونکہ حمل کے معنی صرف کسی مادی چیز کے اٹھانے کے ہی نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کے معنی اس کی حقیقت کے اظہار کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا

مسئلہ شفاعت کا حل[1]

عرش سے مراد صفات تنزیہیہ ہیں۔[1]

عرش کوئی مخلوق چیز نہیں[2]

حمل عرش سے خلق عرش ثابت نہیں ہوتا[2]

عرش[1]

جَهُولًا (احزاب ۹۴) یعنی ہم نے اس امانت (شریعت) کو آسمان اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا۔ مگر اُنہوں نے اس کے اُٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اُٹھا لیا۔ وہ یقیناً اپنے نفس پر ظلم کرنے والا۔ اور نتائج سے بے پروا ہے۔ اس جگہ امانت کے اُٹھانے کا ذکر ہے۔ جس کے صرف یہ معنی ہیں کہ وہ اس پر عمل کر کے اس کے نتائج اور اس کی خوبیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح عرش کے اُٹھانے کے یہ معنی ہیں کہ عرش کی حقیقت کو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات تنزیہیہ کو انسان نہیں پہنچ سکتا۔ سوائے اس طریق کے کہ اس کی صفات تشبیہیہ کے ذریعہ سے اس کا علم ہو۔ پس صفات تشبیہیہ صفات تنزیہیہ کی حامل ہیں۔ اور ان کی حقیقت سے انسان کو آگاہ کرتی ہیں۔ مثلاً خدا تعالیٰ کے سب خوبیاں کے جامع ہونے کا علم ہمیں صرف ان صفات کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ جو انسانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ جیسے اس کا رب ہونا۔ رحمٰن ہونا۔ رحیم ہونا۔ مالک یوم الدین ہونا۔ اور یہ سب صفات تشبیہیہ ہیں۔ کہ انسانی اخلاق بھی ان کے ہم شکل پائے جاتے ہیں۔ اور پھر یہ صفات مخلوق سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اس لئے ان کے جلوے عارضی ہوتے ہیں لیکن اگر یہ صفات نہ ہوتیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے کامل الصفات ہونے کا کسی قسم کا ادراک بھی خواہ کتنا ہی ادنیٰ ہو ہمیں حاصل نہ ہو سکتا۔

عرش سے مراد صفات تنزیہیہ ہیں۔

رب العرش اور ذو العرش کے مفہوم میں فرق۔

ایک اور آیت بھی ہے جس سے عرش کے مخلوق ہونے کا استدلال کیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ قل من رب السمٰوٰت السبع ورب العرش العظیم۔ سیقولون لِلّٰہِ الآیۃ (مومنون ۵) یعنی پوچھو کہ ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا رب کون ہے۔ وہ ضرور جواب میں کہینگے کہ اللہ۔ اس سے یہ استدلال کیا جاتا ہے۔ کہ جب خدا تعالیٰ رب العرش ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ عرش کا خالق ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ رب کے صرف خالق کے ہی معنی نہیں ہوتے بلکہ صاحب کے معنی بھی ہوتے ہیں۔ جیسے ربّ المال۔ پس رب العرش کے معنی والے کے ہیں یعنی عرش والا۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ دوسری جگہ فرماتا ہے ذوالرحمۃ (کہف ۸) خدا تعالیٰ رحمت والا ہے۔ اور اسی طرح فرمایا ہے۔ قل لِلّٰہِ العزۃ جمیعا (فاطر ۲) حالانکہ رحمت اور عزت دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ اور نہ ذوالرحمت کہنے سے رحمت مخلوق ثابت ہوتی ہے۔ اور نہ لِلّٰہِ العزۃ کہنے سے عزۃ مخلوق ثابت ہوتی ہے۔ پس رب العرش کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ صفات تنزیہیہ بھی رکھتا ہے۔ جس طرح کہ وہ صفات تشبیہیہ رکھتا ہے۔ صفات تشبیہیہ کی طرف سمٰوٰت کی پیدائش سے اشارہ کیا ہے +

رب العرش کے لفظ سے خلق عرش ثابت نہیں ہوتا۔

رہا یہ سوال کہ رب کا لفظ ذو یا صاحب کی جگہ کیوں استعمال کیا ہے۔ سو اس میں بھی ایک حکمت ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض نادان فلسفی اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ علت العلل ہے۔ اس کی صفات اپنے طور پر اضطراری رنگ میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کے مجموعہ کی نسبت رب کا لفظ استعمال کر کے جو تصرف پر دلالت کرتا ہے بتایا ہے کہ اس کی صفات اضطراری نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے ارادے کے ماتحت ہیں۔ جس رنگ میں اس کا کامل ارادہ اور بے عیب مشیّت چاہتی ہے۔ ان کا اظہار ہوتا ہے۔ پس اس لفظ کے استعمال سے اس نے ایک بہت بڑے اعتراض کا رد کر دیا ہے۔ اور اسلامی عقیدہ کو ظاہر کر دیا ہے +

کان عرشہ علی الماء سے بھی خلق عرش ثابت نہیں ہوتا۔

تیسری آیت جس سے استدلال کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وھو الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایام وکان عرشہ علی الماء لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (ہود ۱) یعنی وہ خدا ہی ہے۔ کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ

اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے (یہ) اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے (جو) پورا ہو کر رہنے والا (ہے) وہ یقیناً

يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر اُسے لوٹاتا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لائے

چھ دنوں میں پیدا کیا ہے۔ اور اس کا عرش پانی پر ہے تاکہ وہ یہ ظاہر کرے کہ تم میں سے کون عمل میں سب سے بہتر ہے۔ چونکہ اس جگہ پانی پر عرش بتایا ہے۔ اس لئے معلوم ہوا۔ کہ عرش مخلوق ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ پانی سے مراد اس جگہ پانی نہیں ہے کیونکہ خلق السمٰوٰت والارض سے پہلے عرش کا پانی پر ہونا درست نہیں اس لئے کہ پانی تو سمٰوٰت وارض کا ایک جزو ہے۔ اور ان کی پیدائش کے بعد کی شئے ہے۔ اور اگر خلق السمٰوٰت کے بعد سمجھا جائے کہ ادنیٰ طور پر عرش پانی پر ہے تو اس کا بھی کوئی مطلب نہیں معلوم دیتا۔ ہمیں عرش پانی پر نظر آتا ہو نہ اس کی کوئی علامت نظر آتی ہے۔ حالانکہ حکیم ہستی کا ہر کلام حکمت پر مشتمل ہوتا ہے اور جس چیز کا نہ ہم سے کوئی تعلق ہے اور نہ اس سے ہمیں کوئی واسطہ ہے۔ اس کے ذکر سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے اس کے بیان سے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کا بھی کوئی اظہار نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کی حقیقت سے ہمیں بیخبر رکھا گیا ہے۔ پس نہ پانی سے مراد یہاں پانی ہے اور نہ عرش سے مراد کوئی مخلوق شئے بلکہ پانی سے مراد الہامی زبان کے مطابق کلام الٰہی ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا عرش کلام الٰہی پر رکھا ہوا ہے۔ یعنی اس کی عظمت شان کو انسان نہیں سمجھ سکتا۔ مگر اس کی صفات تنزیہیہ جب کلام الٰہی کے ذریعہ سے تشبیہی رنگ اختیار کرتی ہیں تب انسان اس کی شان کا ایک اندازہ لگا سکتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کے بعد فرمایا کہ یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ تا ہم یہ دیکھ لیں کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔ الہام سے نزول اور صفات تشبیہیہ کا تو تعلق انسان کے اعمال سے ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ایک نظر نہ آنے والا تخت اگر پانی پر رکھا ہوا ہو۔ تو اس سے ہمارے اعمال کے اچھے یا بُرے ہونے کا کوئی امتحان ہو سکتا ہے یا اس بیان سے ہم کسی قسم کا کوئی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس جگہ پانی سے مراد حقیقی پانی نہیں ہو سکتا

بطلان خلق عرش عقلاً

عقلاً بھی یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کہ عرش کوئی مخلوق چیز ہو کیونکہ یہ بات بالکل خلاف عقل ہے کہ دنیا کی پیدائش کے بعد خدا تعالیٰ کو کسی تخت کی ضرورت پیش آگئی۔ جو خدا ہمیشہ سے بغیر تخت کے حکومت کر سکتا تھا وہ آئندہ بھی بغیر تخت کے حکومت کر سکتا تھا۔ اگر اظہار شان مراد ہو تو اظہار شان تو نظر آنیوالی چیز سے ہو سکتی ہے جسکو انسان دیکھتا ہی نہیں نہ اس کی علامت ہی کو دیکھتا ہے اس سے اظہار شان ہو ہی نہیں سکتا۔

عرش کے مراد صفات تنزیہیہ ہونے کا ایک اور ثبوت

اس امر کا ثبوت کہ عرش سے مراد صفات تنزیہیہ ہیں۔ یہ آیت بھی ہے۔ کہ لا الٰہ الا ھو ربّ العرش الکریم (مومنون ع ۶) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش کریم کو توحید باری کے ثابت کرنے میں ایک خاص تعلق ہے اور یہ امر ظاہر ہے کہ توحید کا اصلی اور حقیقی ثبوت اللہ تعالیٰ کی صفات تنزیہیہ ہی ہیں کیونکہ صفات تشبیہیہ میں مخلوق شریک ہو جاتی ہے۔ اور ایک کمزور عقل والے انسان کے لئے بہت سے ابہام و تفہیم کی ضرورت پیش آتی ہے۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ

اور انہوں نے نیک (اور مناسب حال) کام کئے انہیں (ان کا) پورا حصہ دے۔ اور جن لوگوں نے کفر (اختیار) کیا انکے لئے ایک تو پینے کی

مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝ ۵

ایک چیز یعنی کھولتا ہوا پانی ہوگا اور (دوسرا) ایک دردناک عذاب ہوگا۔ کیونکہ وہ کفر کرتے (چلے جاتے) تھے ۵۵

حل لغات مَرْجِع رَجَع سے نکلا ہے اور اس کا مصدر ہے اور اس کے معنی لوٹنے کے ہیں۔ دوسرا مصدر اس کا رجوع ہے۔ جو عام طور پر اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ يَبْدَءُ بَدَءَ سے ہے۔ اور اس کے مختلف معنے ہیں۔ بَدَءَ بالشئ افتتحہٗ۔ کسی چیز کا افتتاح کیا۔ بَدَءَ بفلان قدّمہ فلاں شخص کی طرف پہلے متوجہ ہوا یا اس کا کام پہلے کیا۔ بَدَءَ الشئ اخذ فیہ او قدمہ فی الفعل۔ یعنی اس کام کو کرنے لگا یا اس کو اور کاموں سے پہلے کرنا شروع کیا۔ بَدَءَ الشئ اَنْشَأَہٗ واخترعہٗ۔ اس چیز کو پیدا کیا اور اس کو ایجاد کیا۔ بدء اللہ تعالیٰ الخلق خَلَقَہم مخلوق کو پیدا کیا بدء من ارضہ۔ خرج منہا و تغرّب اپنی زمین سے نکل گیا اور دوسرے ملکوں میں چلا گیا (اقرب)

الخلق۔ الفِطْرۃ۔ پیدا کرنا۔ الناس۔ لوگ (اقرب) المخلوق۔ خلق کے معنی مخلوق کے بھی ہوتے ہیں (مفردات) يُعِيْدُهٗ اعادہٗ کے اس کے معنے ہیں ارجعہٗ اسے لوٹا دیا۔ الکلام کرّرہٗ۔ جب کلام کے متعلق آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں اسے دہرایا فلان لا یعید ولا یُبْدِئُ اذا لم تکن لہ حیلۃ۔ کہتے ہیں فلاں کا یعید ولا یبدی جب وہ بالکل بے بس ہو (اقرب) الصالحات صالح کی جمع ہے۔ جو صَلَحَ سے نکلا ہے۔ صالح کے معنی ہوتے ہیں فساد سے پاک اور با مصلحت مناسب حال القسط العدل۔ قسط کے معنی عدل و انصاف کے ہوتے ہیں اور یہ ان مصادر میں سے ہے۔ جنہیں صفت کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں رجل قسط انصاف والا آدمی اور یہ لفظ مفرد اور جمع دونوں کی صفت کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے۔ الحصۃ والنصیب۔ اس کے معنی حصہ اور نصیب کے بھی ہوتے ہیں۔ اور نصف صاع کے وزن کو بھی قسط کہتے ہیں (اقرب)

الشراب کل ما یشرب من المائعات حلالا کان او حراما (اقرب) ہر پینے کی چیز خواہ حلال ہو یا حرام الحمیم القریب الذی تہتم بامرہٖ وہ قریبی جس کی ضروریات کے تم کفیل ہوتے ہو الصدیق۔ دوست۔ احمّاء اس کی جمع ہے۔ اور اس کے معنی الماء الحار اور الماء البارد کے بھی ہوتے ہیں یعنی گرم پانی کے بھی ہوتے ہیں۔ اور سرد پانی کے بھی۔ اس وقت اس کی جمع حمائم آتی ہے۔ اسی طرح اس کے معنی القیظ یعنی سخت گرمی اور المطر الذی یاتی بعد اشتداد الحر۔ وہ بارش جو سخت گرمی کے بعد آئے۔ اور العرق پسینہ بھی ہیں (اقرب)

تفسیر۔ وعد اللہ حقا اصل میں وعد کم اللہ وعدا حقا ہے۔ فعل کو محذوف کر کے مصدر کو فاعل کی طرف مضاف کر دیا گیا ہے۔ پس اس کے اصل معنی یہ ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے ایک پختہ وعدہ کیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ایک تو انسان کو اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ اُسے اپنی ظاہری آزادی دیکھ کر دھوکا نہیں کھانا چاہیئے آخر اس کا واسطہ اللہ تعالیٰ سے پڑیگا۔ دوسرے یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء ہی آخر میں کامیاب ہونگے۔ کیونکہ

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ

وہی ہے جس نے سورج کو ذاتی روشنی (والا) اور چاند کو نور (والا) بنایا ہے اور ایک اندازہ کے

مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ

مطابق اسکی منزلیں بنائی ہیں تاکہ تمہیں سالوں کی گنتی اور حساب معلوم ہو اس (سلسلہ) کو اللہ (تعالیٰ) نے حق

ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ ۶

(و حکمت) کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے وہ ان آیات کو علم والے لوگوں کے لئے تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے ؏

اللہ تعالیٰ نے انسان کو قرب کے لئے پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون جن و انسان کو میں نے صرف اپنا عبد بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسی وعدہ کیطرف وعد اللہ حقًا میں اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ آخر کار سب انسان اللہ تعالیٰ کو پالینگے اور نبیوں کی بعثت کی اصل غرض پوری ہو کر رہیگی ؛ انہ یبدء الخلق ثم یعیدہ میں بھی دونو طرف اشارہ ہے اس طرف بھی کہ مرنے کے بعد انسان کو اللہ تعالیٰ پھر زندگی دیگا۔ اور اس طرف بھی کہ اللہ تعالیٰ نئی نئی مخلوق پیدا کرتا چلا جاتا ہے تاکہ نیکوں کے کام ضائع نہ ہوں۔ کیونکہ اگر کوئی خیر کا کام کرے اور اسکے بعد کوئی مخلوق نہ ہو تو اس کے کام سے کون فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ مخلوق پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ اور پچھلے لوگ پہلوں کے کام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور پہلوں کے لئے ثواب کا موجب بنتے ہیں ؛

اس آیۃ میں جو عمل صالح کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں فردی اور قومی ترقی کا ایک بہت بڑا نکتہ ہے۔ لوگ اس کا ترجمہ نیک عمل کرتے ہیں۔ مگر اس کے معنی نیک عمل کے نہیں ہیں۔ بلکہ نیک اور مناسب حال عمل کے ہیں۔ یعنی عمل نیک بھی ہو۔ اور موقع کے مطابق۔ مثلاً یہ نہ ہو کہ جہاد کے لئے جارہا ہو۔ اور روزے رکھنے لگے۔ روزے ایک نیک عمل ہیں۔ مگر جہاد کو جاتے وقت مناسب حال عمل نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جہاد کے موقع پر فرمایا کہ آج بے روزہ روزہ داروں سے بڑھ گئے۔ کیونکہ روزہ دار بوجہ روزہ کی تکلیف کے کیمپ کا انتظام نہ کرسکے اور بے روزہ داروں نے فوراً کیمپ کو تیار کرلیا۔ اور حق یہ ہے کہ فردی اور قومی ترقی ہر عمل خیر سے نہیں ہوتی بلکہ عمل صالح سے ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے اس نکتہ کو نہیں سمجھا اور جس وقت اسلام کو سخت جہاد عقلی کی ضرورت تھی۔ اس وقت ان کے مذہبی آدمی مصلے بچھا کر اور تسبیحیں پکڑ کر گھروں میں بیٹھے رہے اور ان اعمال سے غافل رہے جو کہ قومی ترقی کے لئے ضروری تھے۔ ان کا کام تھا کہ مسلمانوں میں عملی قوت پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور ان کے اخلاق کو درست کرتے اور علوم جدیدہ کے حاصل کرنے کی ترغیب دیتے اور ان میں اتحاد عمل پیدا کرتے۔ مگر انہوں نے ایسا نہ کیا اور نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان کی نمازیں اور روزے اسلام اور مسلمانوں کو ہلاکت سے نہ بچا سکے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ تھا کہ عمل صالح کے نتیجہ میں کامیابی ملتی ہے۔ اور ان لوگوں کے اعمال گو مذہب کے مطابق تھے۔ مگر مناسب حال نہ تھے پس خدا تعالیٰ کا قانون توڑنے کی وجہ سے انہوں نے بھی اور دوسرے سب مسلمانوں نے بھی نقصان اٹھایا ؛

؏ صالح کے معنی اور ایک اہم نکتہ

حل لغات ؏ - ضیاء کو عربی محاورہ کے لحاظ سے نور سے زیادہ طاقتور سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے ضیاء اور ضوء اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی ذات میں روشن ہوتی ہے اور نور کا لفظ اس چیز پر بولا جاتا ہے۔ جس کی روشنی غیر سے حاصل شدہ ہو (اقرب) ضیاء ضاء کا مصدر بھی ہے جس کے معنی روشن کردینے یا روشن ہونے (متعدی و لازم) کے ہوتے ہیں۔ اور ضیاء جمع بھی ہے ضوء کی جیسے سوط کی جمع سیاط (اقرب) نور کے معنی اس فرق کے علاوہ جو اوپر ذکر

گردش کی حرکت ہی مقدار فعل اور زمانہ کے علم کا ذریعہ ہے۔

ہو چکا ہے۔ یعنی وہ روشنی جو کسی چیز سے مکتسب ہو اور بھی کئی آتے ہیں (۱) ظلمت کے خلاف کا نام نور ہے۔ اور کبھی یہ لفظ ضیاء کے معنوں میں بھی استعمال ہوجاتا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا ہے۔ وسراجًا منیرًا (احزاب ع) (۲) نور ضیاء کی شعاع کو بھی کہتے ہیں۔ یعنی جو چیز اپنی ذات میں روشن ہے اس کی روشنی کے انعکاس کو بھی نور کہتے ہیں (۳) اور نور ہر اس چیز کو کہتے ہیں۔ جس کے ذریعہ سے دوسری چیزیں نظر آنے لگ جائیں۔ یعنی منوّر۔ جیسے فرمایا۔ اللہ نور السمٰوٰت و الارض (۴) ہر وہ چیز جس سے دوسری چیزوں کی پوری حقیقت کھل جائے۔ اس کو بھی نور کہہ دیتے ہیں (۵) اور نور کے معنی وسم کے بھی ہیں یعنی رونق کے۔ ہمارے ملک میں بھی کہتے ہیں۔ کہ فلاں کے چہرہ پر بڑا نور ہے۔ یعنی آثار برکت و عزت ہیں (اقرب) یفصّل فصل کا مضارع ہے جس کے معنی ہیں۔ جعلہ فصولا متمایزۃ کسی چیز کو الگ الگ ٹکڑوں میں کردیا۔ اور جب یہ لفظ کلام کے متعلق استعمال ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں۔ بیّنہ یعنی اسے اچھی طرح کھول کر بیان کردیا۔ اور فَصَّلَ اَجْمَلَ کی ضد بھی ہوتا ہے یعنی اس میں کسی قسم کا اخفاء یا اجمال نہ رہنے دیا۔ (اقرب) فرمایا ھوالذی جعل الشمس ضیاء والقمر نورًا۔ وہ خدا ہی ہے جس نے سورج کو ضیاء بنایا یعنی ذا ضیاء (روشنی والا) بنایا اور چاند کو نور یعنی ذا نور (نور والا) بنایا۔ قدّرہ اصل میں لام کے صلہ کے ساتھ آتا ہے۔ اور قدرلہٗ بولتے ہیں۔ یعنی اس کے لئے یہ چیز اندازہ کردی یا اس کے لئے یہ چیز مقرر کردی تو قدّرہ کے معنی قدّرلہٗ کے ہونگے یعنی چاند کے لئے منازل مقرر کردیں۔ مگر کبھی کبھی محاورہ میں قدّر کا لفظ جعل اور صیّر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ الفاظ آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ اور اس صورت میں ہم لام مقدر نہ نکالینگے۔ بلکہ جیسے وہاں ذا ضیاء اور ذا نور مراد ہے۔ اسی طرح یہاں ذا منازل مراد ہوگا۔ یعنی اس (ذا منازل) کو جعل کا مفعول ثانی قرار دینگے۔ اور معنی یہ ہو جائینگے۔ کہ ان میں سے ہر ایک کو منزلوں والا بنایا ہے۔ ہٗ کی ضمیر دونوں طرف جاتی ہے۔ یعنی سورج اور چاند دونوں کے لئے منازل مقرر ہیں۔ سورج بھی درحقیقت حرکت کرتا ہے۔ گو زمین کے گرد گول حرکت نہیں کرتا جیسا کہ پہلے زمانے کے لوگ سمجھتے تھے۔ تحقیقات جدیدہ سے یہ ثابت ہے کہ سورج نہیں بلکہ زمین گھومتی ہے لیکن تاہم سورج اپنے سیاروں سمیت کسی طرف کو جارہا ہے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ یہ حرکت کتنی لمبی ہے۔ ممکن ہے۔ کہ یہ حرکت ایک نہایت وسیع دائرہ کی صورت میں ہو۔ جس کا اندازہ لاکھوں سالوں میں بھی نہ کیا جاسکتا ہو۔

تفصیل

تقدیر

تفسیر۔ فرمایا لتعلموا عدد السنین و الحساب۔ دیکھو یہاں کیسی لطیف بات بیان فرمائی ہے۔ ہر حرکت کا اندازہ کرنے کے لئے اس کے مقابل کی چیزوں کی نسبت ہی معیار ہوا کرتی ہے۔ مثلاً ہم ریل میں سفر کریں۔ اور جس رفتار سے ریل چل رہی ہو۔ اسی رفتار سے تمام اردگرد کی چیزیں بھی حرکت کریں۔ تو ہمیں ذرا بھی محسوس نہ ہوگا۔ کہ ہم نے حرکت کی ہے۔ بلکہ جہاں بیٹھے تھے وہیں اپنے آپ کو سمجھینگے۔ تو گویا چلنے کی کیفیت نسبت ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ اگر نسبت موجود نہ ہوتی۔ تو کیفیت بھی معلوم نہ ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لتعلموا عدد السنین والحساب کہ ہم نے سورج اور چاند کی منازل اس لئے مقرر کی ہیں۔ تاکہ تم عدد سنین اور حساب کو جان سکو۔ یعنی ان خارجی وجودوں کی حرکت کو دیکھ کر معلوم کرسکو۔ کہ تم پر ایک زمانہ گذر گیا ہے۔ اور تم اس جگہ پر نہیں رہے۔ جہاں پہلے تھے اگر یہ فرق نہ ہوتا یعنی زمین سے باہر کوئی اور کرہ نہ ہوتا جو حرکت کرتا اور کبھی کہیں اور کبھی کہیں نظر آتا۔ تو کبھی بھی ہم میں زمانہ کا احساس پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ اور اگر وہ کرہ

خود ایک خاص قانون کے ماتحت حرکت نہ کرتا یا اس کے گرد دوسرے کرہ جات ایک خاص قانون کے ماتحت حرکت نہ کرتے تو وقت کے احساس کو خاص اندازوں میں تقسیم کرنا ناممکن ہو جاتا۔ پس تمام تاریخ اور حساب کا معاملہ سورج اور چاند سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک کی اپنی گردش سے۔ اور دوسرے کے گرد دوسرے سیاروں کی گردش سے۔ چاند زمین کے گرد گھومتا ہے۔ اور اس سے مہینوں اور ہفتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور سورج کے گرد زمین گھومتی ہے۔ اور اسی طرح اس کے سامنے گھومتی ہے۔ اس سے دنوں اور سالوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ حساب کا تعلق بھی ستیاروں کی گردش سے نہایت گہرا ہے ؛

ایک لطیف نکتہ

اس میں ایک لطیف مذہبی نکتہ بیان فرمایا ہے اور وہ یہ کہ سنین سے محنت کے اندازے معلوم ہوتے ہیں اور حساب سے نتیجہ کا پتہ لگتا ہے۔ ہر کام میں دو اندازے ہوا کرتے ہیں۔ اول یہ کہ کتنی محنت کی۔ دوسرے یہ کہ کیا نتیجہ نکلا ہے۔ اگر یہ دو اندازے مد نظر نہ رکھے جائیں۔ تو لوگ مقابلہ میں پورے نہیں اُتر سکتے۔ مثلاً ایک شخص ایک سال میں ایک کپڑا بُنتا ہے۔ اور دوسرا دو گھنٹے میں۔ تو پہلا دوسرے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ غرض محنت اور نتیجے کے توازن سے ہی کسی کام کی کامیابی یا ناکامی کا حال معلوم ہوتا ہے اور یہ دونوں باتیں سورج اور چاند سے متعلق ہیں پھر جس طرح جسمانی طور پر سورج اور چاند مقرر ہیں تاکہ عدد سنین اور حساب کو ظاہر کریں۔ اسی طرح روحانی طور پر بھی سورج اور چاند ہوتے ہیں یعنی انبیاء۔ وہ مذہبی طور پر عدد سنین و حساب ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی ان کے ذریعہ سے روحانی دنیا میں محنت اور اس کے نتائج کا احساس پیدا ہوتا ہے اور وقت کی قیمت قوم کو معلوم ہوتی ہے۔ نبیوں کے بغیر مذہبی دنیا میں کوئی حقیقی احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اور روحانی ترقیات کے اندازوں سے دنیا بالکل بےخبر رہتی ہے۔ بعینہ جس طرح سورج اور چاند کے بغیر ظاہری دنیا وقت کے احساس سے اور اس کے اندازوں سے واقف نہیں ہو سکتی۔ چوڑھوں کو دیکھ لو یا اسی قسم کی دوسری ادنیٰ قوم کو۔ ان میں انسانی پیدائش کی غرض و غایت کا احساس ہی مٹ گیا ہے۔ ہزاروں سال سے وہ اسی حالت میں ہیں۔ لیکن روحانیت بلکہ دنیوی ترقی تک کا احساس ان میں نہیں ہے۔ انہیں کہا بھی جائے۔ تو کہتے ہیں۔ کہ قسمت ہے۔ گویا وہ ایک نہ ختم ہونے والی رات کے اثر کے نیچے غافل پڑے ہیں پس انبیاء دنیا کے لئے بطور سورج کے اور بطور چاند کے ہوتے ہیں۔ وہ فطرۃ انسانی کی مخفی ترقی کو اور اس کے ارتقاء کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور ان سے علم حاصل کرکے لوگ روحانی دنیا کی ترقی کی خبر پاتے اور اس کے مطابق عمل کرتے اور نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اور ان کے بغیر روحانی دنیا میں کوئی ترقی نہیں ہو سکتی ؛

الا بالحق یعنی اس نے زمین و آسمان کو فضول اور یونہی بے فائدہ نہیں پیدا کیا۔ اس کو شوق نہ تھا۔ کہ کرہ پر کرہ بناتا چلا جائے اس نے یہ سب کچھ باقاعدہ مقصد کے لئے پیدا کیا ہے پس جسمانی سورج کی طرح روحانی سورج بھی چاہیئے تھا۔

یفصل الآیات لقوم یعلمون۔ وہ اپنی آیات بیان فرماتا ہے۔ اس سے فائدہ صرف وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں۔ جو اس نظام عالم کا علم رکھتے ہیں۔ جو سورج چاند کے منازل کو جانتے ہیں۔ کیونکہ جس شخص کو ان تغیرات کا علم ہی نہیں۔ وہ عدد سنین اور حساب کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جس چیز کا انسان کو علم نہ ہو۔ اس سے وہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ اسی طرح روحانی دنیا میں بھی کوئی شخص فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ جب تک روحانی علوم کو نہیں سیکھتا اور اُن کی حقیقت پر غور نہیں کرتا ؛

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي

رات اور دن کے آگے پیچھے آنے میں اور جو کچھ اللہ (تعالیٰ) نے آسمانوں اور

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝ ۷

زمین میں پیدا کیا ہے ۔ اس میں متقی لوگوں کے لئے یقیناً یقیناً بہت سے نشان ہیں شہ

اختلاف

شہ **حل لغات** ۔ اختلاف کے دو معنے ہوتے ہیں (۱) ضد اتفاق ۔ یعنی عدم اتفاق (۲) اختلف زیدٌ عمراً کان خنیفتہ ۔ زید عمرؓ کا خلیفہ ہوا ۔ اس آیت میں پچھلے معنی ہیں ۔ یعنی رات کے بعد دن کا آنا اور دن کے بعد رات کا آنا ۔

یعلمون کے مقابل پر یتقون لانے کی وجہ

تفسیر ۔ پہلی آیت اور اس آیت میں یتقون اور یعلمون کا فرق کر دیا گیا ہے ۔ پہلی آیت میں بتلایا تھا کہ علم والے لوگوں کے لئے نشان ہیں ۔ اور اس میں فرمایا ہے کہ تقویٰ رکھنے والوں کے لئے آیات ہیں ۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ دن اور رات کے اختلاف کو جاننا تو ہر شخص ہے ۔ ایک چوہڑے کو بھی معلوم ہے کہ یہ دن ہے ۔ اور یہ رات ہے ۔ مگر اس سے فائدہ اُٹھانا تقویٰ پر موقوف ہے متقی ہی اس تغیر اور اختلاف سے فائدہ اُٹھاتا ہے ۔ مگر پہلی آیت میں منازل شمس و قمر کا ذکر ہے ۔ اور ان کا جاننا علم سے تعلق رکھتا ہے پس فائدہ بھی عالم ہی اُٹھا سکتا ہے ۔ اسیئے وہاں یعلمون رکھا اور اس جگہ یتقون فرمایا ۔ اور فرماتا ہے کہ رات اور دن بیشک دونوں مفید چیزیں ہیں ۔ اور ان کا سلسلہ بھی چل رہا ہے کبھی رات آتی ہے اور کبھی دن ۔ یہی حال قوموں کا ہوتا ہے ۔ کہ ان پر کبھی رات آتی ہے اور کبھی دن ۔ مگر جس قوم پر رات ہی رات رہے ۔ وہ ترقی نہیں کر سکتی ۔ اور اسی طرح یہ بھی اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے ۔ کہ کسی قوم پر ہمیشہ دن ہی دن رہے ۔ کیونکہ انسان اپنے اعمال میں کبھی یکساں نہیں رہ سکتا ۔ جوں جوں نبیوں سے بُعد ہوتا جائیگا اور زیادہ زمانہ گذرتا جائیگا ۔ تاریکی ہوتی جائیگی جیسے سورج سے دُور ہونے کی وجہ سے ہم پر رات پڑ جاتی ہے ورنہ سورج کہیں چلا نہیں جاتا ۔ پس کوئی قوم اس بات سے خوش نہ ہو جائے ۔ کہ رات اور دن کا آنا جانا لازمی ہے ۔ کیونکہ روحانی دنیا میں بھی گو رات کا آنا لازمی ہے مگر اس کا دُور کرنا بھی انسان کے اختیار میں ہے ۔ بیشک ترقی اور تنزل قوموں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں ۔ مگر تنزل کو دور کرنا اور ترقی کے حصول کے لئے کوشش کرنا بھی ضروری ہے ۔ زندگی پیدا کرنے کے لئے جدوجہد کا چھوڑ دینا اور رات کو ایک طبعی اور خود بخود دور ہو جانے والی چیز سمجھ لینا غلطی ہے ۔ متقی انسان رات کے وقت کو دیکھ کر کوشش کرتے ہیں ۔ کہ ان کی قوم پر سورج چڑھے ۔ اور نبی آکر یہی تعلیم دیتے ہیں ۔ کہ اپنے دروازے کھولو ۔ اور سورج چڑھاؤ ۔ اس بات پر مطمئن نہ ہو جاؤ ۔ کہ تنزل قوموں کے ساتھ لگا ہی ہوا ہے ۔ کسب کا تعلق نہار سے ہے ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ ماجرحتم بالنہار (انعام ع ۷) پس اگرچہ رات قدرتی اور مفید چیز ہے مگر بغیر دن کے ماخلق اللہ فی السمٰوٰت والارض سے فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا ۔ تمام کام دن سے تعلق رکھتے ہیں ۔ کانوں کا کھودنا زراعت تجارت وغیرہ سب کسب دن سے ہی تعلق رکھتے ہیں ۔ اور وہ سورج سے پیدا ہوتا ہے پس اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں سے فرماتا ہے کہ تم بھی اس روحانی سورج (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) سے تعلق پیدا کرو تا تمہاری قوم پر دن چڑھے اور رات دُور ہو ۔ کیونکہ سورج سے تعلق پیدا کئے بغیر یہ بات ناممکن ہے ۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيٰوةِ

جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے اور اس ورلی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں

الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُونَ ۝ ٨

اور اس پر انہوں نے اطمینان پکڑ لیا ہے اور (نیز) جو لوگ ہمارے نشانوں (کی طرف) سے غافل ہو گئے

أُولٰئِكَ مَأْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ ٩

ہیں ان (سب) کا ٹھکانا ان کی (اپنی) کمائی کی وجہ سے یقیناً (دوزخ کی) آگ ہے۔ ع٥

حل لغات - يرجون۔ رجاء میں سے فعل مضارع ہے۔ عربی زبان میں رجاء کا لفظ دو معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ امّل بہ۔ اس کی امید رکھی۔ خافہ۔ اس سے ڈرا (اقرب) عام طور پر امید کے معنوں میں آتا ہے۔ اور خوف کے لئے کم۔ مگر آتا ضرور ہے۔ لقاء لقی یلقی اور لاقی یلاقی ہر دو باب کا مصدر ہے۔ پہلے باب میں اس کے معنی ہونگے۔ استقبلہ آگے ہو کر ملا۔ راٰہ اسے دیکھا۔ اور دوسرے باب میں اس کے معنے ہونگے قابلہ اس کے آمنے سامنے ہوا (اقرب) وفی المغرب وقد غلب اللقاء فی الحرب اور مغرب میں لکھا ہے کہ لقاء کا لفظ زیادہ تر جنگ کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے (اقرب) اطمأن الی کذا۔ سکن وامن لہ۔ ٹھہر گیا اور شیع و منقاد ہو گیا۔ (اقرب) مأوی اوی یاوی اویًا سے نکلا ہے۔ اور اس کا اسم ظرف ہے۔ اوی الی کذا۔ انضم الیہ۔ اس سے چمٹ گیا (مفردات) ماوی اس مقام کو کہتے ہیں کہ جہاں انسان اترے اور اسے اپنی حفاظت کی جگہ سمجھے۔ کیونکہ ایسی جگہ سے انسان گویا لپٹ جاتا ہے۔ کسب الشیء۔ جمعہ اس چیز کو جمع کر لیا۔ الاثم تحملہ گناہ کو جان بوجھکر اختیار کر لیا۔ مالا وعلما طلبہ و ربحہ مال یا علم کو طلب کیا اور نفع بخش بنایا (اقرب)

رجاء

امید و بیم

تفسیر - قرآن کریم کا یہ کمال ہے کہ وہ ایسے الفاظ استعمال فرماتا ہے۔ جو باوجود اختصار کے وسیع مطالب پیدا کر دیتے ہیں۔ اور چونکہ اس غرض کو پورا کرنے میں عربی زبان بہت کچھ ممد ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس زبان کو قرآن کریم کی زبان ہونے کا شرف بخشا ہے۔

لقاء

اس آیت میں دیکھو کہ عذاب میں مبتلا ہونے کے اسباب لا یرجون لقاءنا کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ رجاء کے دو معنے ہیں امید اور خوف اسی طرح لقاء کے دو معنی ہیں۔ شوق سے آگے ہو کر ملنا۔ یا جنگ و جدال۔ اب فطرۃ انسانی پر غور کر کے دیکھو تمام انسانی ترقیات یا امید سے وابستہ نظر آئیں گی یا خوف سے۔ کل عمل یا خوف سے پیدا ہوتا ہے یا امید سے بعض لوگ اس لئے کام کرتے ہیں۔ کہ انہیں کچھ مل جائے۔ اور بعض اس لئے کہ وہ دُکھ نہ پائیں۔ قرآن مجید نے ایک ہی فقرہ میں دونوں فطرتوں کو مخاطب کر لیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اے وہ فطرۃ جو امید کے لئے کام کرتی ہے۔ تو ہمارے ملنے کی امید کیوں نہیں رکھتی اور اس امید کے مطابق کیوں عمل نہیں کرتی۔ اگر تو امید سے دور رہیگی تو بجائے ترقی کرنے کے تنزل کے عمیق گڑھوں میں گر جائے گی۔ اور انہی الفاظ میں دوسری فطرت کو بھی مخاطب کر لیا ہے کہ اے وہ فطرت جو ڈر سے کام کیا کرتی ہے۔ تو ہماری سزا

مأوی

سے بچنے کے لئے کیوں کوشش نہیں کرتی۔ اور اس سے کیوں نہیں ڈرتی۔ ورنہ یاد رکھ کہ ایسے ایسے ابتلا تیرے سامنے ہیں۔ کہ جن کی برداشت تیری طاقت سے زیادہ ہوگی گویا قرآن مجید نے ایک ہی لفظ سے پیار سے ماننے والی اور خوف سے اطاعت کرنے والی دونوں فطرتوں کی تسلی کردی۔

دنیوی ترقی اور اسلام کا نقطۂ نگاہ

اس آیت میں رضوا بالحیوۃ الدنیا واطمأنوا بہا فرما کر دنیوی ترقیات کے متعلق اپنا نقطۂ نگاہ واضح کردیا ہے۔ کہ اسلام دنیوی ترقیات کا مخالف نہیں جس امر کا وہ مخالف ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ انسان دنیا پر اکتفا کرے اور خدا تعالیٰ کی محبت اس کے دل سے نکل جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ دنیا کے حصول کے بعد مزید ترقی کا خیال ترک کردے اور اس پر ٹھہر جائے اور اطمینان پکڑ لے جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔ اطمینان کے معنی سکون کے ہوتے ہیں

گناہ اور سزا کی حقیقت

یعنی حرکت کے ترک کردینے کے مطمئن اسے کہتے ہیں جو خیال کرتا ہے کہ اس نے اپنے مقصد کو پالیا۔ اور اس نے جہاں پہنچنا تھا وہاں پہنچ گیا۔ اور آگے چلنا اس نے بند کردیا۔ اور مزید ترقی کی کوششیں اس نے چھوڑ دیں اصل بات یہ ہے کہ رضا دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک رضا وہ ہوتی ہے۔ جس کے بعد انسان کو آئندہ کوشش کا بھی خیال رہتا ہے۔ وقتی طور پر تو وہ راضی ہوجاتا ہے لیکن آئندہ زیادہ کے حصول کی کوشش کا مادہ اس میں باقی ہوتا ہے۔ دوسری وہ رضا جس کے بعد آئندہ کسی کوشش کا خیال اس کے دل میں نہیں رہتا۔ اس جگہ واطمأنوا بہا فرما کر دوسری رضا کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور بتایا ہے۔ کہ جو دنیا پر اطمینان کے ساتھ راضی ہوجاتا ہے۔ اور ہمیں بھول جاتا ہے اور اخروی ترقیات کو نظر انداز کردیتا ہے۔ وہ ہمارے الزام کے نیچے ہے۔ نہ کہ مجرد دنیوی ترقیات کرنیوالا۔ کیونکہ دنیوی ترقیات تو خود انعامات الٰہیہ میں سے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دعا سکھائی ہے۔ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔ جو دنیوی ترقیات اخروی ترقیات سے وابستہ ہوں وہ انعامات الٰہیہ میں سے ہیں۔ اور ان کو مانگنا مومن کے فرائض میں سے ہے ٭

اس سے آگے چل کر مضمون کو اور بھی واضح کردیا ہے اور والذین ھم عن اٰیاتنا غافلون فرما کر بتایا ہے کہ یہ لوگ جن پر ہم ناراض ہیں وہ ہیں کہ جو دنیا میں اس قدر منہمک ہوجاتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ کے کلام اور اس کے نبیوں اور اس کی شرائع کی تحقیر کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور ان سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی ہدایت کے دروازے بند کرلیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے دلوں کے زنگ خدا ہی کی ہدایت سے دور ہوسکتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ان سے بالا سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اور اس طرح آئندہ کے لئے بھی ان کے ہدایت پانے کی امید نہیں رہتی ٭

تیسرا نکتہ جو اس آیت میں یاد رکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ اس میں گناہ اور سزا کی حقیقت پر ایک لطیف روشنی ڈالی گئی ہے۔ گناہ کے متعلق تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حقیقی گناہ جس کی سزا ملتی ہے۔ وہ ہی جو مکسوب ہو۔ اور کسب کے معنی جیسا کہ لغت سے ثابت کیا جاچکا ہے جمع کرنے اور جان بوجھ کر کرنے کے ہیں۔ پس کسب کے لفظ سے دو اشارے کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ گناہ گار وہ ہے جو جان بوجھ کر گناہ کی آلائش میں گرتا ہے۔ اگر خطا اور نسیان سے کوئی بُرا فعل انسان سے صادر ہوجاتا ہے۔ تو وہ حقیقی گناہ نہیں۔ اور ایسا انسان شریعت اسلامیہ کی اصطلاح میں گنہگار نہیں کہلائیگا۔ اور دوسرا اشارہ یہ کیا گیا ہے۔ کہ گنہگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ گناہ کو جمع کرے یعنی تواتر سے گناہ میں مبتلا ہو۔ اگر تواتر نہ ہو۔ یعنی انسان گو دیدہ و دانستہ ہی گناہ کرے۔ مگر اس کے فعل کے بعد پشیمان ہو کر اسے چھوڑ دے اور توبہ کرے تو وہ بھی گناہگار نہیں ہوگا۔ کیونکہ کسب کے معنوں میں جمع کرنا بھی شامل ہے۔ اور تواتر پر یہ لفظ

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک (اور مناسب حال) عمل کئے انہیں اُن کا رب ان کے

رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ

ایمان کی وجہ سے (کامیابی کے راستہ کیطرف) ہدایت دیگا (اور) آسائش والی جنتوں میں انہی کے

فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝ ۱۰

(تصرف کے) نیچے نہریں بہتی ہونگی لے

دلالت کرتا ہے۔ پس ان معنوں کی رُو سے اسلامی شریعت میں سزا کے قابل مجرم وہی ہوگا۔ جو دیدہ و دانستہ جرم کرے اور بعد میں اس سے تائب نہ ہوا ہو۔ چنانچہ ایک دوسری آیت میں اس کی تشریح ان الفاظ میں ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ (نجم ع۲) جو لوگ بڑے گناہوں اور کھلے عیبوں سے بچتے ہیں سوائے اس کے کہ وہ مرتکب ہوکر بعد میں اس کو چھوڑ بیٹھے ہوں (انہیں اللہ تعالیٰ جزا دیگا) تیرا رب یقیناً وسیع مغفرت والا ہے۔ سزا کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مأوٰهم النار۔ ان کا ماویٰ نار ہوگا۔ ماویٰ جیساکہ بتایا گیا ہے پناہ کی جگہ اور اس مقام کو کہتے ہیں۔ جس سے انسان چمٹ جاتا ہے۔ اب یہ عجیب بات ہے۔ کہ آگ کو پناہ کی جگہ اور چمٹ رہنے کا مقام قرار دیا جائے۔ مگر تھوڑے سے غور سے معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ اس جگہ الٰہی سزا کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کی سزا دکھ دینے کے لئے نہیں بلکہ علاج کیلئے ہوتی ہے۔ اور جس طرح علاج کی تکلیف کو انسان برا سمجھتا ہے۔ مگر آخر اسی میں اپنی بہتری سمجھ کر اسے قبول کرتا ہے۔ اسی طرح جب عذاب کی حقیقت کا انکشاف گناہگاروں پر پوری طرح ہوجائیگا۔ تو وہ اس نار کو جس میں ان کو ڈالا جائے گا۔ اپنا ماویٰ خیال کرینگے یعنی حقیقی عذاب سے نجات کا ذریعہ جو کہ خداوند تعالیٰ کی ناراضگی اور اس سے دوری ہے۔ پس ماویٰ کا لفظ استعمال کرکے بتایا ہے کہ عذاب دکھ میں ڈالنے کا ذریعہ نہیں بلکہ پاک کرنے کا ذریعہ ہے اور صرف وہی ایک ذریعۂ نجات و تطہیر ہے۔

عذاب آخرۃ کو نار سے تعبیر کرنے کی وجہ

عذاب اُخروی کا نام نار اس لئے رکھا گیا ہے۔ کہ دنیا دو مظاہر کا مجموعہ ہے ناری اور نوری۔ خدا تعالیٰ سے تعلق نور کیطرف لیجاتا ہے۔ جو ٹھنڈک اور خوشی کا موجب ہوتا ہے۔ اور دنیا کیطرف جھک جانا نار کی طرف لیجاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی ایک آگ ہے۔ جو اُسے اختیار کرلیتا ہے اس کے لئے اسی کے مشابہ مقام تجویز کیا گیا ہے۔

جہنم مجرموں کے لئے پناہ کی جگہ ہے

تحت

لے حل لغات تحت کا لفظ فوق کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اس کے معنی نیچے کے ہوتے ہیں اور اسفل کا لفظ بھی نیچے کے معنوں میں آتا ہے۔ مگر ان دونوں میں ایک فرق ہے۔ اسفل اس کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا نچلا حصہ ہو مگر تحت اسی چیز کے نچلے حصہ کو نہیں کہتے۔ بلکہ اس حصہ کو کہتے ہیں۔ جو کسی دوسری چیز کے نیچے کی ہو۔ ہاں کبھی کبھی اسفل کا لفظ تحت کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے۔ نیز یہ لفظ رذیل اور ماتحت لوگوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ حدیث میں آیا ہے۔ لا تقوم الساعۃ حتے یظھر التحوت۔ یعنی قیامت نہیں آئیگی۔ جب تک غربا اور مزدور لوگ غالب آکر حکومتوں پر قابض نہ ہوجائیں۔ قرب قیامت کا زمانہ مسیح موعود علیہ السلام کا زمانہ ہے۔ پس

آخری زمانہ میں مزدوروں کے سرمایہ داروں پر حکومت کرنے کی پیشگوئی

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ج

ان (جنتوں) میں (خدا تعالیٰ کے حضور) انکی پکار اے اللہ (ہم) تیری تسبیح (کرتے ہیں) ہوگی۔ اور (انکی) ایکدوسرے

اس حدیث میں بالشویک حکومت کی طرف اشارہ ہے یعنی مسیح موعودؑ کے کامل ظہور کا زمانہ نہ آئیگا۔ جب تک کہ محنتی لوگ سرمایہ داروں پر اور مزدور لوگ حکومتوں پر غالب ہوجائینگے یعنی وہ بادشاہ نہ بنجائینگے۔ اور سرمایہ داران کے ماتحت نہ ہوجائینگے۔ ان معنوں کے رو سے من تحتھم الانھار کے یہ معنی ہوئے۔ کہ ان کے قبضہ میں نہریں ہونگی اور وہ ان کی اپنی ملکیت ہونگی۔ کیونکہ عمل ان کے اپنے تھے۔ جس طرح اس دنیا میں افسران انہار زمینداروں کو لوٹتے ہیں۔ یا انہیں سرکاری ٹیکس ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وہاں ایسا نہ ہوگا۔ بلکہ نہریں ان کی اپنی ملکیت ہونگی۔ **النعیم**۔ عام طور پر لوگ اس کے معنی غلط سمجھتے ہیں۔ اور وہ اسے نعمت کی جمع قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ النعیم کے معنی (۱) عطیہ (اترہ) یا (۲) النعمۃ الکثیرۃ یعنی بہت سی نعمت کے ہوتے ہیں (مفردات)

نعیم

جزا ایمان کے مطابق ہوگی

ایمان کے تبع عمل کی شرط

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اصل ہدایت ایمان کے سبب سے ملتی ہے۔ خالی عمل کچھ چیز نہیں۔ جبتک اس کے ساتھ دل کی اصلاح نہ ہو۔ ایک شخص چوری کا پورا ارادہ رکھتا ہو۔ مگر اسے چوری کا موقع نہ ملے۔ تو وہ دیانتدار نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح دل تو غیر اللہ کے خوف سے پر ہو۔ مگر ظاہر میں اسے سجدہ نہ کرے۔ تو وہ شخص موحد نہیں کہلا سکتا۔ بعض نادان یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ اسلام عمل پر زور نہیں دیتا۔ بلکہ صرف ایمان کو پیش کرتا ہے۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ اسلام جس بات پر زور دیتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ عمل کے ساتھ دل کی پاکیزگی بھی ضروری ہے۔ اگر دل پاک نہیں اور عمل کا ساتھ نہیں دیتا۔ تو ایسا ایمان کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اور کون عقل مند اس امر کا انکار کر سکتا ہے۔ کہ اصل پاکیزگی دل کی اور خیالات کی پاکیزگی ہے۔ جب دل پاک ہو جاتا ہے۔ تو ممکن ہی نہیں ہوتا کہ اعمال اس کی اتباع نہ کریں۔ یہ تو ہو سکتا ہے۔ کہ انسان لوگوں کے خوف سے عمل اور قسم کے کرے مگر یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ انسان لوگوں کے خوف سے اپنے خیالات کو بدل لے۔ دل پر دوسرے انسانوں کا تصرف نہیں ہوتا۔ زبردست بادشاہوں کے قبضہ سے بھی دل بالا ہے۔ پس ایسی چیز پر اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا مدار رکھا ہے۔ جو خود انسان کے قبضہ میں ہے۔ اور دوسری لوگوں کا اس میں دخل نہیں ؛

بایمانھم کہکر اس امر کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ جزاء ایمان کے مطابق ہوگی۔ یعنی ظاہری عمل میں گو دو شخص برابر ہوں۔ لیکن وہ اخلاص اور وہ محبت جو عمل کے پیچھے ہو اس سے جزاء میں فرق آجائیگا۔ یہ بھی ایک زبردست نکتہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکر کو تم پر فضیلت اس چیز کے سبب سے ہے۔ جو اس کے دل میں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص نمازیں زیادہ پڑھتا ہے اور روزے بھی زیادہ رکھتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے فضلوں کو ایک دوسرا شخص جذب کر لیتا ہے۔ اس کی وجہ اس کے دل کی حالت ہوتی ہے۔ حقیقی پاکیزگی اور اخلاص جسے زیادہ حاصل ہوتا ہے اس کے تھوڑے عمل زیادہ فوائد کو کھینچ لیتے ہیں۔ درحقیقت اس شخص کے سب اعمال ہی عبادت بن جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بظاہر دنیوی نظر آنے والے اعمال بھی خدا ہی کے لئے ہوتے ہیں۔ اور بنی نوع انسان کی ہمدردی اس کی ہر حرکت کا موجب ہوتی ہے۔

—✣—

وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ع ۱۱

۵۹ کیلئے) دعا (تمہارے لئے ہمیشہ کی) سلامتی (ہو) ہوگی اور انکی دعا کا آخری حصہ یہ ہوگا کہ ہر (قسم کی) تعریف اللہ (تعالیٰ) ہی کو سزاوار ہے۔

۵۹ **حل لغات۔** دعوٰی۔ پکار اور آواز کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تحیۃ کے معنی ہیں سلام۔ جیسے ہم آپس میں السلام علیکم کہتے ہیں۔ بقاء السلامۃ من الآفات۔ بلاؤں سے محفوظ رہنا۔ الملک بادشاہت یہ معنی اس وجہ سے پیدا ہوگئے ہیں۔ کہ جب کوئی شخص بادشاہ بنایا جاتا تھا۔ تو لوگ کہتے تھے۔ نال فلان التحیۃ۔ کہ فلاں شخص کو سلام کا مقام حاصل ہوگیا ہے یعنی وہ سلام جو بادشاہوں سے مخصوص تھا۔ اور وہ ابیت اللعن کے الفاظ تھے۔ جاہلیت کے زمانہ میں جو بادشاہ ہوتا۔ اس کے ساتھ کلام کرتے وقت یہ الفاظ بولے جاتے تھے۔ جن کے معنی یہ ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ تجھے ہر قسم کے اعتراض اور شکست سے بچائے۔ التحیۃ من اللہ الاکرام والاحسان۔ یعنی جب کہا جائے۔ کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کسی مخلوق کو تحیہ حاصل ہوا ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اسے عزت دی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس پر احسان کیا ہے (اقرب)

سلام کے کئی معنی ہیں اسم من التسلیم۔ باب تفعیل سے اسم مصدر ہے اور اس کے معنی سلامتی دینے کے ہیں۔ انقیاد یعنی فرمانبرداری۔ سلام خدا کا نام بھی ہے کیونکہ وہ تمام عیبوں اور نقصوں سے پاک ہے (الحشر ع ۳)

تفسیر۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ مومن جب اخروی انعامات پائینگے۔ تو پہلے تو بے اختیار ان کے منہ سے سبحانک اللھم نکلیگا۔ یعنی اے اللہ تو ہر عیب سے پاک ہے۔ (۲) دوسرے وہ آپس میں سلام کریں گے یا ان کو خدا کی طرف سے سلام ملیگا (۳) تیسرے ان کا آخری کلام یہ ہوگا۔ کہ وہ الحمد للہ رب العٰلمین کہیں گے۔ یہ جو فرمایا کہ وہ جنت میں جاتے ہی سبحانک اللھم کہیں گے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ان پر حقائق اشیاء کھل جائیں گے۔ مومن دنیا میں سبحانک اللھم کہتا ہے۔ مگر اس جگہ یہ صرف اعتقادی رنگ میں ہوتا ہے۔ وہ کئی دفعہ آم کا چھلکا پڑا دیکھتا ہے اور اسے فضول سمجھتا ہے۔ یا رات کو ایک کیڑا اس کے بستر میں آگھستا ہے وہ اس کی حکمت نہیں جان سکتا۔ لیکن تاہم وہ سبحانک اللھم کہتا ہے۔ ایسا ہی وہ جنگل میں جھاڑیاں دیکھتا ہے جن میں بعض کانٹے دار ہیں۔ اور بعض بے کانٹے ایسا ہی بعض درخت ان کے پتے ان کی شاخیں دیکھتا ہے اور ان کی حکمت نہیں جانتا۔ وہ یہ سمجھ کر کہ کوئی حکمت ہوگی سبحان اللہ کہہ دیتا ہے۔ کیونکہ ہم اس دنیا میں قیاس کر لیتے ہیں۔ کہ جب بعض چیزوں میں اس کی حکمت نظر آتی ہے۔ تو باقی چیزوں میں بھی ضرور حکمت ہوگی۔ نیز خدا کا سچا کلام بتلاتا ہے۔ کہ خدا نے جیسے ہم ایمان لاتے ہیں اگرچہ کروڑوں چیزیں ایسی ہیں جن کی حکمت ہمیں معلوم نہیں مگر باوجود اس کے سبحان اللہ کہتے رہتے ہیں۔ لیکن جنت میں جو سبحانک اللھم کہا جائیگا۔ وہ علم کی بنا پر ہوگا۔ وہاں انسان پر کھل جائیگا کہ دنیا میں ہر ایک حقیر سے حقیر چیز یا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ ایک سبب اور ایک اثر رکھتا تھا۔ اور دنیا اور دنیا والوں کی ترقی یا تنزل یا فائدہ یا نقصان پر اثر کر رہا تھا۔ اور چونکہ اس دنیا کے اعمال اگلے جہان میں مجسم ہونگے اس لئے اس دنیا کی ہر اک چیز کی حقیقت انسان کو معلوم ہو جائیگی۔ اور وہ علم کی بنا پر جان لیگا کہ اس دنیا میں کوئی چیز بھی بے حقیقت نہ تھی۔ بلکہ کوئی حرکت بھی بے حقیقت نہ تھی۔ پس بے اختیار ہو کر سبحانک اللھم اس کے منہ سے نکل جائیگا۔ اور چونکہ دنیا کی تمام تکالیف حقائق اشیاء کے عدم علم کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ حکمت نہ جاننے کی وجہ سے سنکھیا کی مقررہ مقدار سے زیادہ استعمال کر کے لوگ تکلیف اٹھاتے ہیں۔ یا مثلاً آگ کھانا پکانے کے لئے بنائی گئی ہے۔ لیکن ایک بچہ اسے اپنے کپڑوں میں لگا لیتا

دعوٰی

تحیۃ

سلام

جنت میں یہ کلمات علم وبصیرت کی بنا پر صادر ہونگے۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ

اور اگر اللہ (تعالیٰ) لوگوں پر (انکے اعمال کی) بدی (کا نتیجہ) ان کے مال کو جلد چاہنے کی طرح جلد وارد کرتا تو ان کی

بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا

(زندگی کے اختتام کی) میعاد ان پر لائی جا چکی ہوتی (مگر چونکہ ہم نے ایسا پسند نہیں کیا) اسلئے ہم ان لوگوں کو جو ہماری

يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○ ۱۲

ملاقات کی امید نہیں رکھتے اس حالت میں چھوڑ رہے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں سرگردان پھر رہے ہیں ۳۲؎

ہے اور مر جاتا ہے۔ غرض تمام بیماریاں اور تکلیفیں چیزوں کی حکمتوں کے نہ جاننے کی وجہ سے آتی ہیں۔ لیکن جنت میں چونکہ سب حقیقتیں کھل جائیں گی اور حکمتیں معلوم ہو جائینگی اسلئے حقیقی سلام یعنی کامل سلامتی بھی حاصل ہو جائیگی۔ کیونکہ حکمتوں کے جان لینے کی وجہ سے وہ چیزوں کی مضرت سے بچ جائینگے۔ اور مصیبت اور آفت سے چھوٹ جائیں گے۔ اس لئے سُبحان اللہ کے بعد جو کشف الحقائق ہو جانے پر فوراً اُن کے منہ سے علی وجہ البصیرۃ نکلیگا۔ وہ یہ بھی پکار اُٹھینگے کہ یہاں تو سلامتی ہی سلامتی ہے۔ کیونکہ وہ علم کامل کی وجہ سے چیزوں کے غلط استعمال سے بچ جائینگے۔ اور ان کا صحیح استعمال کرکے فائدہ اٹھائینگے بعد جب یہ حالت حاصل ہو جائیگی تو بے اختیار الحمد للہ کہینگے کہ خدا تعالیٰ نے یہ مرتبہ اور یہ مقام ہمیں عطا فرمایا کہ ہر قسم کے کمالات ہمیں مل گئے۔ اور ہمارے سب اعمال کے سب نتائج اب اچھے ہی اچھے نکلتے ہیں۔

اس جگہ اگر یہ سوال ہو۔ کہ انہوں نے الحمد للہ رب العلمین کیوں کہا۔ خالی الحمد للہ کیوں نہ کہہ دیا۔ حالانکہ یہ کافی تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ رب العلمین ساتھ لگانے کی مختلف وجوہ ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ تمام چیزوں کی حکمتوں کو جاننا اور اُن سے فائدہ پہنچانا رب العلمین کا ہی کام ہے۔ جو تمام دنیائی ضروریات کو جانتا ہے۔ مثلاً ایک گرم ملک میں گرمی کی تکلیف کو دیکھکر اگر کوئی کہے کہ یہ بڑی مصیبت ہے اور شکایت کرے تو یہ اس لئے ہوگا کہ وہ نہیں جانتا کہ اس گرمی سے ہی ہزاروں چیزوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ان حکمتوں کو رب العلمین ہی سمجھ سکتا ہے جس کا ہر چیز سے تعلق ہے اور ہر چیز کی حاجتوں کو پورا کرنا جس کا کام ہے۔ پس اگلے جہان میں جانے پر جب مومنوں کو تمام حقیقتوں اور حکمتوں سے آگاہی ہو جائیگی۔ تو وہ کہیں گے الحمد للہ رب العالمین۔ بیشک ہم اپنے محدود علم کی وجہ سے دنیا کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے تھے کیونکہ رب العلمین خدا ہی ہے جس کی نظر میں سب کچھ ہے۔ باریک در باریک حقیقت سے واقف ہو سکتا ہے سو ہم اسی کی حمد کرتے ہیں

(حاشیہ: استعجل — خیر — رب العلمین کا لفظ بڑھانے کی وجہ — قضی الیہ)

۳۲؎ **حل لغات**۔ استعجلہ۔ حثّہ۔ اسے کام پر آمادہ کیا۔ امرہ ان یعجل۔ اسے جلدی کرنے کے لئے کہا۔ طلب عجلتہ ولم یصبر الی وقتہ۔ کسی کام کے لئے کوشش کی کہ وقت سے پہلے ہو جائے۔ مثلاً فلان یستعجل ای یکلف نفسہ العجلۃ۔ یعنی اپنی طبیعت پر زور ڈالکر تیزی سے چلا۔ استعجل فلانا سبقہ وتقدمہ۔ فلاں شخص سے آگے نکل گیا۔ (اقرب) **الخیر** وجدان الشیٔ علی کمالاتہ اللائقۃ۔ کسی چیز کا اس کے مناسب حال کمالات کے ساتھ پایا جانا۔ المال مطلقاً۔ خالی مال کو بھی بعض وقت خیر کہہ لیتے ہیں۔ الخیل۔ بہت سے گھوڑوں کو بھی خیر کہہ دیتے ہیں۔ خیر اس شخص کو بھی کہتے ہیں کہ جس میں ہر قسم کے کمالات بکثرت پائے جائیں (اقرب) **قضی الیہ الامر۔ انہاہ**

وَ اَبْلَغَہٗ اس تک اس چیز کو پہنچا دیا (اقرب) اور جب کسی بات کے
متعلق ہو۔ تو اس بات کے سنا دینے کے معنی ہونگے۔ اور جب کسی
چیز کے متعلق ہو۔ تو اس کے معنی اس چیز کے پہنچا دینے کے ہونگے
پس اقضی الیھم الاجل کے معنی ہونگے۔ ان تک ان کی
موت پہنچا دی۔ یعنی انہیں ہلاک کر دیا۔ الاجل۔ مدۃ الشیٔ
ووقتہ الذی یحل فیہ۔ اجل اس وقت کو کہتے ہیں جس
میں کوئی کام ہونا ہو۔ کہتے ہیں۔ ضربت لہٗ اجلًا۔ میں نے
اس کے واسطے فلاں کام کے لئے ایک مدت مقرر کر دی ہے (اقرب)
طغیان مصدر ہے طَغٰی یَطْغٰی یا طَغِیَ یَطْغٰی کی۔ مگر
اس کے علاوہ طغیٌ اور طُغْیانًا کی صورت پر بھی اس کا مصدر
آتی ہے۔ طغٰی کے معنی ہیں جاوز القدر والحد۔ اندازہ
اور حد سے باہر ہوگیا۔ طغی الکافر غلا فی الکفر۔ کفر میں
زیادہ بڑھ گیا۔ فلانٌ۔ اسرف فی المعاصی والظلم
گناہ اور ظلم میں حد سے بڑھ گیا۔ الماءُ۔ ارتفع۔ پانی
اونچا ہوگیا۔ طغیانی اور سیلاب آگیا (اقرب) **یعمھون**۔ عَمَہ
سے مضارع کا صیغہ ہے۔ کہتے ہیں عمہ الرجل۔ جس کے
معنی ہیں۔ تردد فی الضلال وتحیّر فی منازعۃ او
طریقٍ۔ وہ شخص گمراہی کی حالت میں حیران پھرتا رہا۔ یا جھگڑے
میں یا راستہ میں حیران رہ گیا۔ کہ اصل حقیقت یا اصل راستہ
کون سا ہے۔ اور یہ بھی محاورہ ہے کہ جب کسی کو دلیل نہ سوجھے
یا بات نہ آئے۔ تو اس حالت کو بھی عَمَہٌ کہتے ہیں جیسا کہ
لکھا ہے۔ العمہان لایعرف الحجۃ۔ عمہ کے معنی یہ ہیں
کہ انسان کو دلیل نظر نہ آئے۔ اس کا اسم فاعل عامِہٌ ہے
اور اس کی جمع عُمّہٌ اور صیغہ مبالغہ عَمِہٌ ہے۔ جس کی جمع
عَمِہون ہے۔ عَمٰی کا لفظ جو قرآن کریم میں آتا ہے۔ اور جس
سے اَعْمٰی کا لفظ بنا ہے اس کے معنی بھی اندھے پن کے ہیں
مگر زمخشری کا قول ہے کہ وہ عمہ سے عام ہے۔ اعمٰی اس شخص کو کہتے ہیں
جو آنکھ کا یا عقل کا اندھا ہو۔ مگر عامِہٌ صرف اس کو کہتے ہیں
جو عقل کا اندھا ہو۔ آنکھ کے اندھے کو عامِہٌ نہیں
کہتے (اقرب) پس معنی یہ ہوئے۔ کہ اپنی ظالمانہ زیادتیوں میں
سرگردان پھرتے ہیں اور پھرتے رہیں گے۔ اور ان کی

عقلیں ماری ہوئی ہیں۔ اور ماری رہینگی +

استعجالھم بالخیر کے معنی

تفسیر اس آیت کے پہلے حصہ کے متعلق بہت اختلاف
ہے۔ کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ اور جلدی سے شر پہنچانے
اور خیر طلب کرنے کا کیا مطلب ہے۔ بعض لوگوں نے
استعجالھم بالخیر کے یہ معنی کئے ہیں۔ کہ جس طرح وہ شر طلب
کر رہے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم بھی جلدی سے انہیں شر
پہنچا دیں۔ تو ان کا فیصلہ ہو جائے۔ لیکن یہ معنی عقل کے
خلاف ہیں۔ اگر خیر سے مراد شر ہوتی۔ تو اللہ تعالیٰ شر ہی کا
لفظ استعمال نہ فرما دیتا۔ اصل دقت مطلب کے بیان کرنے
میں یہ پیش آتی ہے۔ کہ ان کے خیر کو طلب کرنے پر خدا تعالیٰ
انہیں شر پہنچانے کا ذکر کیوں فرماتا ہے۔ نیکی کے طلب کرنے پر تو انعام
ملنا چاہیئے تھا۔ مگر یہ دقت اس لئے پڑی ہے۔ کہ خیر کے
سب معنوں پر غور نہیں کیا گیا۔ اور نہ استعجال کے سب
معنوں پر۔ اگر خیر کے معنی متعلق مال کے لئے جاتے۔ تو یہ دقت
نہ ہوتی۔ کیونکہ اس صورت میں اس آیت کے یہ معنی بنتے کہ
جس طرح یہ لوگ دنیوی اموال کے جمع کرنے میں ہی لگے ہوئے
ہیں۔ اور خدا تعالےٰ کی طرف توجہ نہیں کرتے اگر اللہ تعالیٰ بھی اس کے بدلہ
میں انکو سزا دیتا چلا جاتا۔ تو انکا فیصلہ ہو جاتا۔ مگر خداوند تعالےٰ انہیں
ڈھیل دیتا اور توبہ کا موقعہ دیتا ہے۔ تاکہ جو اصلاح کرنا چاہیں
کرلیں۔ اور ان معنوں پر کوئی اعتراض نہیں پیدا ہوتا۔ جو
شخص اپنی تمام توجہ دنیا کے اموال کے جمع کرنے پر ہی خرچ کرتا
ہے۔ وہ یقینًا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو بھڑکاتا ہے۔ دوسرے
معنی اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ان
لوگوں سے خیر کے معاملہ میں بڑھا ہوا۔ اور آگے نکلا ہوا ہے
اگر اسی طرح وہ لوگوں کو عذاب بھی دیتا چلا جاتا۔ تو ان کا فیصلہ
ہو جاتا۔ مگر وہ خیر میں تو انسانوں سے آگے نکلا ہوا ہے
اور عذاب پہنچانے میں دھیما ہے۔ ان معنوں کے رو سے
ھُمْ کی ضمیر فاعل کی ضمیر نہیں۔ بلکہ مفعول کی ضمیر سمجھی جائیگی
بخلاف پہلے معنوں کے کہ ان میں استعجالھم میں ھُمْ
کی ضمیر فاعلی ضمیر تسلیم کی گئی تھی۔ اور یہ دونوں باتیں عربی

اجل

طغیان

عمہ

عمہ اور عمی میں فرق

استعجالھم کی ضمیر مجرور ہے۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا

اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے۔ تو وہ اپنے پہلو کے بل (لیٹا ہوا) یا بیٹھا یا کھڑا ہمیں

أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ

پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس کی تکلیف کو اس سے دور کر دیتے ہیں۔ تو وہ (اس طرح سے کترا کر) گذر جاتا ہے

يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَسَّهُ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ

کہ گویا اسنے کسی تکلیف کے دور کرنے کیلئے جو اسے پہنچی تھی ہمیں نہیں پکارا (تھا)۔ اسی طرح تمام حد سے بڑھ جانیوالوں کو جو کچھ وہ کیا کرتے ہیں

مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ ۱۳

خوبصورت کر کے دکھلایا گیا ہے ۱۳ ۵

زبان کے لحاظ سے جائز ہیں۔

مہلت کیوں دی جارہی ہے۔ [۲] استعجالھم بالخیر میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ وہ اپنی ساری توجہ دنیا کے اموال کے جمع کرنے میں ہی صرف کر رہے ہیں۔ کیونکہ جب کسی کو کسی کام کے لئے جلدی ہوتی ہے۔ تو وہ دوسرے کام کیطرف مطلقاً توجہ نہیں کرتا۔ اور اگر کوئی اسے کسی اور کام کی طرف توجہ دلائے بھی۔ تو وہ یہی جواب دیکر چلا جائیگا۔ کہ مجھے جلدی ہے۔ یہ آیت درحقیقت ان کے اس سوال کا جواب ہے کہ اگر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کیطرف سے ہیں۔ تو ہم لوگ عذاب سے جلد کیوں تباہ نہیں کردیئے جاتے۔ فرمایا عذاب تو آئیگا۔ مگر اس مہلت کی غرض یہی ہے کہ تا کچھ اور لوگ مان لیں۔

اسراف [۲]

ترتیب جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ قرآن کریم اکثر اوقات سوال کو حذف کر جاتا ہے۔ اور جواب سے ہی سوال کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ اس آیت نے صاف طور پر واضح کر دیا کہ کہ اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ والی آیت میں کفار کے جلد فیصلہ کرنے کا ہی جواب تھا۔ پس یہ سب آیات بالکل ترتیب کے ساتھ ایک ہی سوال کے جواب کے لئے آئی ہیں +

صدمہ رسیدہ کی مختلف حالتیں [۲]

فنذر الذین سے یہ بتایا ہے۔ کہ اگر ہم عذاب دینے میں عجلت کرتے تو لازماً لوگ گمراہی پر خاتمہ ہونے کے سبب سے طغیان اور گمراہی میں پڑے رہتے۔ مگر ہمارا یہ طریق نہیں ہے۔ ہم تو ہدایت دینا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے فوراً نہیں پکڑتے۔ تاکہ جس قدر لوگ بچ سکیں بچ جائیں۔

۱۳ **حل لغات**۔ مسرف۔ اَسْرَفَ کا اسم فاعل ہے۔ کہتے ہیں اسرف المال۔ بذّرہ۔ مال کو یونہی بکھیر دیا۔ ضائع کر دیا۔ جاوز الحدّ وافرط فیہ اس کے خرچ میں حد سے بڑھ گیا۔ اور زیادتی سے کام لیا۔ اور اسرف کے معنی خَطَأَ کے بھی ہیں۔ یعنی غلطی کی۔ اور جَھِلَ کے بھی۔ یعنی اس سے اس طرح علیحدگی کی کہ گویا جانتا ہی نہیں۔ اور غَفَلَ کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی اس سے غفلت کی (اقرب)

تفسیر۔ دعانا لجنبہ الآیۃ میں صدمہ کی مختلف حالتوں کا ذکر کیا ہے۔ لجنبہ کو سجدہ یا شدت خوف سے گر جانے کی حالت کا قائم مقام رکھا ہے۔ کیونکہ جب انسان کو سخت تکلیف ہو تو اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگ جاتے ہیں۔ اور وہ گر

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ

اور یقیناً یقیناً ہم تم سے پہلے قوموں کے بعد قوموں کو جبکہ انہوں نے ظلم کیا اور ان کے

وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۚ

پاس ان کے رسول کھلے نشان لیکر آئے اور (پھر بھی) وہ بالکل ایمان نہ لائے ہم ہلاک کر چکے ہیں

جاتا ہے۔ اسیطرح قاعدًا او قائمًا ان کی سخت گھبراہٹ اور پریشانی بتانے کے لئے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ ایسے وقت میں انسان کبھی اُٹھکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور کبھی بیٹھ جاتا ہے اور اسے کسی ایک حالت پر قرار نہیں آتا۔ اور ایک جگہ ٹک نہیں سکتا۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ وہ فی الواقع کھڑا ہو یا بیٹھا ہو +

اس آیت میں فرماتا ہے کہ یہ لوگ یوں تو زور دیتے رہتے ہیں۔ کہ اگر یہ رسول سچا ہے۔ تو ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا۔ لیکن اگر کبھی عذاب چھو بھی جائے۔ تو سخت گھبرا جاتے ہیں۔ اور سب صبر و قرار جاتا رہتا ہے۔

مرّ کان لم یدعنا میں اللہ تعالےٰ نے کفار کی حالت بتاکر ہمیں اسلامی اخلاق سکھائے ہیں۔ کہ جب کسی کو مدد کے لئے بلاؤ۔ تو اس سے جدا ہوتے وقت پہلے اس سے اجازت طلب کرو۔ پھر شکریہ ادا کرو۔ پھر جاؤ۔ کیونکہ یہ بڑی بدتہذیبی ہے کہ کسی کو مدد کے لئے بلایا جائے۔ مگر اس کا شکریہ بھی ادا نہ کیا جائے۔

زُیّن للمسرفین میں اخلاق کے کئی نکتے بیان کئے ہیں۔ اول یہ کہ کسی کی نیت پر حملہ نہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کفار کے متعلق فرماتا ہے ان کو ان کے اعمال خوبصورت کرکے دکھائے گئے۔ ان کو مسرف قرار دیکر بھی ان کی نیت پر حملہ نہیں کرتا۔ بلکہ فرماتا ہے۔ کہ ان کو نظر ہی ایسا آتا ہے۔ ان کی عقل ہی کمزور ہوگئی ہے۔ پس کیا ہی تعجب ہے ان مسلمانوں پر جو قلیل سے قلیل اختلافات پر فوراً دوسرے کی نیت پر حملہ کر دیتے ہیں۔ اس جگہ اگر یہ سوال ہو۔ کہ جب ان کی عقل میں ہی ایسا آتا ہے۔ تو ان کو سزا کس بات کی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سزا کی وجہ بھی انہی الفاظ میں موجود ہے۔ کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ ہر ایک کو بُرے اعمال خوبصورت کرکے دکھائے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ فرمایا ہے۔ کہ مسرف کو اس کے بُرے اعمال خوبصورت کرکے دکھائے جاتے ہیں۔ پس اسراف کی صفت چونکہ انہوں نے خود پیدا کی تھی اس لئے اسکے نتائج کے بھی وہ خود ذمہ دار ہیں۔ خواہ وہ نتائج ان کی مرضی کے مطابق ہوں یا نہ ہوں۔ اور اس وجہ سے وہ سزا سے بھی بچ نہیں سکتے۔

نیّت ہر جگہ قابل قبول نہیں ہوتی

دوسرا نکتہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نیّت کی دلیل ہر جگہ قابل قبول نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ نیّت کی درستی اور شرارت کی عدم موجودگی کے وقت بھی سزا دیجاتی ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ذکر ہے۔ کہ نیّت کو درست تسلیم کرتے ہوئے سزا کا اعلان کیا ہے۔ یہ بات اس وقت ہوتی ہے۔ جب نیت اپنے ہی اعمال کی وجہ سے خراب ہوگئی ہو۔ یا یہ کہ نیت کا بدلنا اپنی طاقت میں ہو اور نہ بدلے۔ جیسے کم علمی اگرچہ ایک عذر ہے۔ لیکن اگر صرف سستی کی وجہ سے ہو تو قابل سزا ہے۔ ایسے شخص سے کہا جائے گا۔ کہ کیوں سستی کی۔ اور علم حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہ کی۔ طبعی قانون میں تو نیت کا بالکل دخل ہی نہیں ہوتا۔ خواہ کسی نیت سے کوئی شخص زہر کھائے۔ وہ ضرور ہلاک ہو جائیگا۔ شریعت میں ایک حد تک لحاظ رکھا جاتا ہے +

بڑے وقت پر دستگیری کرنیوالے کی ناشکری

کسی کی نیت پر حملہ کرنا

---

۱۴ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ○

ہم مجرم لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں ۱۴

قرنٌ

۱۴ حل لغات - القرون - القرن کی جمع ہے - اس کے کئی معنی ہیں - کل امۃ ھلکت فلم یبق منھم احد ہر ایسی قوم جو تمام کی تمام ہلاک ہوئی اور اس میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا - الوقت من الزمان زمانہ کے ایک حصہ کو بھی قرن کہتے ہیں اھل زمان واحدٍ ایک زمانہ یا ایک نسل کے لوگوں کو بھی قرن کہتے ہیں - امۃ بعد امۃ - زمانہ کے دَور کو بھی کہتے ہیں - اور اس سے یہ بتایا جاتا ہے - کہ ایک قوم دوسری قوم کے بعد آرہی ہے - عربی کا ایک محاورہ قرن الشیطان بھی ہے - اور اس کے بھی دو معنی ہیں - المتبعون لرأیہ - شیطانی لوگ - تسلطہ - شیطان کا تسلط (اقرب) فما کانوا لیؤمنوا کا جو جملہ اس آیت میں ہے - اس کے معنی اردو زبان کے محاورہ کے مطابق یہ ہونگے - کہ انہوں نے ایمان لانے کی طرف توجہ بھی نہ کی -

عذاب کا آنا پچھلے کی دلیل ہے۔

قوموں پر قوموں کی ہلاکت دیکھنے کے باوجود اپنی طاقت پر گھمنڈ کرنا نادانی ہے

تفسیر - شروع دنیا سے قوموں کے بعد قومیں ہلاک ہوتی چلی آئی ہیں - ایک مثال نہیں دو نہیں تین نہیں کہ لوگ بھول جائیں - قوموں کے بعد قومیں آئیں اور ہلاک کی گئیں پھر کس قدر نادانی ہے - کہ کوئی قوم اپنی ترقی اور ثروت پر نازاں ہو اور اپنی تباہی کی ساعت کو بھول جائے۔

عذاب کی دو قسمیں

عذاب الٰہی ظالم پر آتا ہے۔

اس آیت سے بعض الٰہی قانون معلوم ہوتے ہیں - اول یہ کہ عذاب الٰہی ظالم پر آتا ہے - بغیر ظلم کے عذاب نہیں آتا - کیونکہ فرماتا ہے - کہ جس قدر قومیں پہلے ہلاک ہوئی ہیں - ظالم ہو جانے کے سبب سے یعنی دینی یا دنیاوی احکام کو نظر انداز کر دینے کے سبب سے ہلاک ہوئی ہیں - دوسرے یہ کہ باوجود ظالم ہونے کے بھی کوئی قرن ہلاک نہیں ہوتی - جب تک اس کے پاس رسول نہ آجائیں - اور اسے اس کی غلطیوں پر متنبہ نہ کر دیں - کیونکہ فرمایا - کہ سب قوموں کو ہم نے اسی وقت ہلاک کیا جبکہ ظالم ہو جانے کے بعد ان کے پاس رسول بھی آگئے - اور انہوں نے ان کی بات ماننے سے بھی انکار کر دیا۔

شرعی عذاب کی علامات

كذٰلك نجزى القوم المجرمين - یعنی جب تک کوئی قوم ظلم نہ کرے - اور پھر اسے نبی بھیج کر متنبہ نہ کر دیا جائے اس وقت تک ہم کسی قوم پر عذاب نہیں بھیجا کرتے - پس اس جگہ بھی رحم پر زور دینا مقصود ہے نہ کہ عذاب پر - کیونکہ فرمایا ہم تو کسی قوم کو بدیوں میں مبتلا دیکھکر ان پر اپنا رحم نبی کی صورت میں نازل کرتے ہیں - تاکہ وہ اپنی بدکرداریوں کے بد نتائج سے محفوظ ہو کر اس نبی کی اتباع کر کے ہمارے انعامات کے وارث ہوں - لیکن وہ اس کی مخالفت کے خطرناک جرم کے مرتکب ہو کر اپنے آپ کو عذاب کا مستحق بنا لیتے ہیں - تعجب آتا ہے کہ اس زمانہ کے لوگ اپنے مُنہ سے عذاب کا اقرار کرتے ہیں - مگر نبی کے آنے کو تسلیم نہیں کرتے۔

عذاب دو طرح کے ہوتے ہیں (۱) طبعی (۲) شرعی - شرعی عذاب کے لئے یہ شرطیں ہیں - کہ لوگ ظلم کریں - اور نبی مبعوث ہو - تب عذاب آوے - مگر طبعی عذاب کے لئے یہ شرط نہیں - بلکہ جو قوم دنیوی طور پر کمزور اور ترقی کے اسباب سے غافل ہوگی - اس کو ہلاک کر دیا جائیگا - ان کی ہلاکت کا موجب ان کی دنیوی کمزوری ہوگی نہ کہ خدا کی محبت کی کمی -

شرعی عذاب کی پہچان اس طرح ہو جاتی ہے - کہ اس کے اندر بعض غیر معمولی باتیں پائی جائیں - مثلاً عذاب کی صورت اور اس کا رنگ ڈھنگ ایسا ہو - جو عام طور

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ

پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین میں (ان کا) جانشین بنایا

لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ ۱۵

تاکہ ہم دیکھیں۔ کہ تم کیسے عمل کرتے ہو ؏

سے کبھی طبعی عذاب کی صورت میں نہ پایا جائے مثلاً اس کے متعلق پہلے سے پیشگوئیوں کے ذریعہ سے خبر دیجائے۔ یا غیر معمولی طور پر قانون قدرت میں انقلاب پیدا ہو مثلاً یکدفعہ زلزلے پر زلزلے شروع ہو جائیں۔ بیماریاں قحط اور دوسری قسم کے مصائب ایک ہی وقت میں جمع ہو جائیں۔ ان صورتوں میں ماننا پڑیگا۔ کہ وہ تغیرات جو دنیا میں ہو رہے ہیں شرعی عذاب ہیں اور ضرور کوئی رسول مبعوث ہوا ہے ۔

ان شرعی عذابوں کے علاوہ طبعی عذاب ہمیشہ دنیا پر آتے رہتے ہیں۔ پس ان لوگوں کے دھوکے میں نہیں آنا چاہیئے۔ جو کہتے ہیں کہ فلاں وقت فلاں قوم تباہ ہوئی۔ ان کی بادشاہت جاتی رہی۔ اس وقت ان میں کونسا نبی آیا تھا۔ حالانکہ قوموں کی تباہی اور بادشاہوں کی بربادی ایک طبعی امر ہے۔ ان لوگوں کا جواب یہ ہے کہ پہلے تم یہ ثابت کرو۔ کہ یہ عذاب غیر طبعی تھا۔ اور پھر بتاؤ کہ اس وقت کوئی نبی نہ تھا۔ مگر یہ بات وہ ہرگز ثابت نہیں کر سکتے۔ یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ عذاب کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ قرن پر آئے۔ یعنی ایک پوری اُمت پر نازل ہو۔ نہ کہ بعض حصۂ قوم پر۔ افراد یا مجموعہ افراد پر تو ہر زمانہ میں عذاب آتا رہتا ہے۔ حتی کہ نبی کے زمانہ میں بھی اس کی جماعت کے بعض افراد پر عذاب آتا رہتا ہے ۔

۱۵ حل لغات۔ خلائف اور خلفاء لفظ خلیفہ کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں۔ من یخلف غیرہ ویقوم مقامہ۔ جو کسی کے پیچھے آئے اور اس کی جگہ لے۔ السلطان الاعظم الذی لیس فوقہ امام (اقرب) سب سے بڑا بادشاہ جس پر اور کوئی حکمران نہ ہو۔

لننظر پر ایک سوال

تفسیر۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعمال تو قائم مقام بنانے وقت ہی دیکھ لئے گئے تھے۔ کیونکہ ہر قوم جو دوسری قوم کے بعد آئیگی۔ اور اس کی خلیفہ بنائی جائیگی۔ وہ لازماً پہلوں کی نسبت اچھی ہوگی۔ تبھی تو وہ خلیفہ بنائی گئی۔ اور پہلی کو تباہ کیا گیا۔ یہ تو ہو سکتا ہے۔ کہ قائم مقام قوم بعض اور باتوں میں پہلی سے ادنیٰ ہو۔ مثلاً پہلی قوم فن معماری میں کمال رکھتی ہو۔ بعد میں آنیوالی قوم ویسی نہ ہو۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ جس امر میں اسے قائم مقام بنایا گیا ہے اس میں وہ پہلی سے کمزور ہو۔ پس جب ایک قوم کو قائم مقام بنایا ہی اس لئے گیا تھا۔ کہ وہ عمل میں پہلی سے اچھی تھی۔ تو اس کا مطلب کیا ہوا۔ کہ ہم اس لئے جانشین بناتے ہیں۔ کہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو۔

اعمال کی دو قسمیں

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عمل دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ عمل جو انسان کو نعمت کا مستحق بناتے ہیں۔ اور دوسرے وہ عمل جو نعمت کے ملنے کے بعد اسکو قائم رکھنے کے لئے کرنے ضروری ہوتے ہیں۔ کئی طالبعلم طالبعلمی میں ہوشیار ہوتے ہیں مگر جب زندگی کی کشمکشوں میں پڑتے ہیں۔ تو بالکل نکمے ثابت ہوتے ہیں یہی قوموں کا حال ہوتا ہے۔ بعض قومیں شان و شوکت کے ملنے سے پہلے بہت اچھا نمونہ دکھاتی ہیں۔ مگر جب حکومت ملجاتی

خلیفہ

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا

اور جب انہیں ہماری روشن آیات پڑھکر سنائی جاتی ہیں۔ تو جو لوگ ہمارے

يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ

ملنے کی امید نہیں رکھتے۔ وہ کہدیتے ہیں کہ (اے محمد) تو اسکے سوا کوئی اور قرآن لے آیا اسمیں (ہی کچھ) تغیر و تبدل کردے

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ

تو (انہیں) کہہ (کہ یہ) میرا کام نہیں کہ میں اسمیں اپنی طرف سے (کوئی تغیر و تبدل) کر دوں۔ میں (تو) جو

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ

(کچھ) مجھ پر وحی (کے حکم نازل) کیا جاتا ہے (فقط) اسکی پیروی کرتا ہوں۔ اور اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو (اس صورت میں)

ہے۔ تو نیکی کے معیار کو قائم رکھنا ان کے لئے مشکل ہوجاتا ہے۔ دوسرے اس جملہ کو اس لئے بھی بڑھایا گیا ہے۔ کہ انسانی اعمال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک خود عمل صالح اور ایک وہ عمل جو عمل صالح کو قائم رکھتے ہیں اس جملہ کے بڑھانے سے یہ بھی مطلب ہے۔ کہ تمہاری ذاتی نیکیوں کی وجہ سے ہم نے تم کو خلفاء فی الارض بنایا تھا۔ اس کے بعد ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے۔ کہ تم ان اعمال کو کس طرح بجالاتے ہو۔ جو نیکی کے محافظ ہوتے ہیں حق یہی ہے کہ نیک اعمال سے بہت زیادہ مشکل وہ اعمال ہوتے ہیں۔ جو نیکی کو قائم رکھنے والے ہوتے ہیں۔ قوموں کی تباہی کا باعث ہی یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ ترقی کے لئے تو کوشش کرتی ہیں۔ مگر اس کو قائم رکھنے کے لئے کوشش نہیں کرتیں۔ اپنے تنزل کا خیال رکھتی ہیں۔ مگر اولاد کے اخلاق کی طرف پوری توجہ نہیں کرتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ان کا نیکی کا معیار گرنے لگتا ہے۔ حتی کہ آخر میں لفظ رہ جاتے ہیں اور حقیقت مفقود ہوجاتی ہے۔ اور چونکہ یہ تغیر کئی نسلوں میں ہوتا ہے۔ اس کا احساس بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اور آخر قوم تباہی کے گڑھے میں گر جاتی ہے۔ پس اس جملہ میں اسی طرف توجہ دلائی ہے۔ کہ اب ہم دیکھینگے۔ کہ تم اپنی خلافت کو کتنی دیر تک قائم رکھتے ہو۔

مسلمانوں کا اپنی اولاد کی تربیت سے تغافل

اگر مسلمان اس بیش نکتہ کا خیال رکھتے۔ تو آج ان کا یہ حال نہ ہوتا۔ انہوں نے ایک وقت اپنی اولادوں کی تربیت کے فرض سے کوتاہی کی۔ اور ان کی ناجائز محبت ان پر غالب آگئی۔ یا انہوں نے شادیوں میں احتیاط سے کام نہ لیا۔ اور ایسی عورتوں کو اپنے گھروں میں لائے جو اسلامی تربیت کی قابلیت نہیں رکھتی تھیں۔ اور وہ عظیم الشان عمارت جو صحابہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں تیار ہوئی تھی اپنی بنیادوں پر گر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگر آگے ہی وہ قوم جسے خدا تعالیٰ نے اسلام کی ترقی کے لئے چنا ہے۔ اس امر کا خیال رکھے۔ تو انشاء اللہ دنیا میں ایک زبردست تغیر پیدا ہو سکتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس فرض کیطرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔ تم میں سے ہر ایک شخص علاوہ اپنی ذات کی ذمہ داری کے بعض دوسرے وجودوں کا بھی ذمہ دار ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے صرف یہی نہیں پوچھیگا۔ کہ تم نے کیا عمل کئے۔ بلکہ یہ بھی پوچھیگا۔ کہ جن کی ذمہ داری تمہارے سر پر تھی۔ انہیں تم نے کس قابل بنایا۔ پس خالی اپنے نفس کی طہارت انسان کے کام نہیں آسکتی +

۱۶

رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝

میں ایک بڑے (ہولناک) دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں لـ۱۶ـہ

لـ۱۶ـہ **حل لغات** ۔ تلا الکلام تلاوۃ قرءہٗ ۔ یعنی کسی اور کا کلام یا اپنا لکھا ہوا کلام یاد سے یا تحریر سے پڑھکر سنایا (اقرب) ان الفاظ کا ترجمہ "ان پر پڑھی جاتی ہیں" کرنا اردو محاورہ کے خلاف ہے اور پڑھنے والا اس کا صحیح مطلب نہیں سمجھ سکتا ۔ لا یرجون لقآءنا کے معنی کے لئے دیکھو ۔ یونس آیت ۸ ما یکون لی ۔ میرے لئے کیسے ممکن ہو سکتا ہے ۔ التلقاء اسم من اللقاء ویتوسع فیہ فیستعمل ظرفا لمکان اللقاء والمقابلۃ فینصب علی الظرفیۃ یقال توجّہ تلقاء النار وجلس تلقاء فلان ای حذاءہ (اقرب) یعنی تلقاء لقاء کا اسم ہے ۔ لیکن اس کے معنوں کو وسیع بھی کر لیا جاتا ۔ اور اسے مقابل کی جگہ کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس وقت اسے ظرف قرار دے کر نصب دیتے ہیں ۔ کہتے ہیں ۔ توجہ تلقاء النار اُسنے آگ کی طرف مُنہ کیا ۔ یا جلس تلقاء فلان ۔ فلاں شخص کے سامنے بیٹھا ۔ جب یہ لفظ نفس کی طرف مضاف ہو ۔ تو عِنْد کے معنوں میں آتا ہے کہتے ہیں ۔ من تلقاء نفسی ای من عند نفسی ۔ یعنی اپنی مرضی سے کام کیا ۔ کسی کے مجبور کرنے سے نہیں کیا (اقرب)

تفسیر ۔ اس آیت میں بینات کا لفظ آیات کا حال مؤکدہ ہے ۔ جس کا ترجمہ نعت کی طرح کیا جاتا ہے ۔ اور اکثر مقامات پر انبیاء کے ذریعہ سے جو نشانات یا کلام دنیا کو سنایا جاتا ہے ۔ اس کے لئے بینات کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے ۔ کہ آیات دو قسم کی ہوتی ہیں ۔ ایک محض آیات ۔ دوسری آیات بیّنات دنیا کا ہر ذرہ ایک آیت ہے ۔ کیونکہ عقلاً وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے ۔ کہ میرا پیدا کرنے والا موجود ہے ۔ لیکن ہم

تلاؔ یہ امر اپنے قیاس سے معلوم کرتے ہیں ۔ وہ دلیل خود اس امر کی طرف اشارہ نہیں کرتی ۔ کہ میں اس غرض سے پیدا کی گئی ہوں ۔ مگر وہ آیات جو انبیاء کی معرفت آتی ہیں ۔ ان کے ساتھ یہ امر بھی واضح کر دیا جاتا ہے ۔ کہ وہ امور غیبیہ پر بطور دلالت کے نازل کی گئی ہیں ۔ اور اصل مقصود ان کا ہستی باری کا ثبوت ۔ نبیوں کی شہادت ۔ صفات الٰہیہ کے ظہور کی حقیقت ۔ بعث مابعد الموت کا انکشاف ہے پس چونکہ ان آیات کے متعلق صاف کہدیا جاتا ہے ۔ کہ وہ ایمانی امور کے لئے بطور گواہ کے ہیں ۔ ان کا نام برخلاف قانون قدرت کی آیات کے آیات بیّنات رکھا جاتا ہے ۔ مثلاً دبائیں ایک آیت ہیں ۔ لیکن وہ وباء جس کی نبی پہلے سے خبر دیتا ہے اور لوگوں کو ہوشیار کر دیتا ہے ۔ کہ وہ میری صداقت کے ثبوت کے طور پر ظاہر ہوگی ۔ آیت ہی نہیں بلکہ آیۃ بیّنہ ہے ۔ کہ عام وبا کی نسبت زیادہ وضاحت سے اپنے مقصد کو ظاہر کر رہی ہے ۔

مایکون لی
تلقاء

قرآن کریم کے بدلنے کا مطالبہ ۲

منکر لوگ ان آیات بینات کو سنکر بجائے فائدہ اٹھانے کے دو مطالبے کرتے ہیں ۔ ایک یہ کہ اس قرآن کی بجائے اور قرآن لے آؤ ۔ دوسرا یہ کہ اگر یہ نہ کر سکو ۔ تو کم سے کم اس میں تبدیلی کر دو ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ کہ یہ مطالبات ان کے دل کی سختی اور زنگ آلودگی کے سبب سے ہیں کیونکہ ان کے پاس نشانات تو آچکے ہیں مگر باوجود ان نشانات کے انہوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ۔ پس معلوم ہوا ۔ کہ ان کا مقصد فائدہ اٹھانا نہیں ہے ۔ بلکہ بوجہ اس کے کہ دل ایمان سے خالی ہیں ۔ ہنسی اور شرارت مقصود ہے ۔ اور چاہتے ہیں کہ نشانات کا جو اثر پبلک پر پڑا ہے ۔ اس کو دور کر دیں ۔

بعض آیات غیر بیّن بھی ہوتی ہیں ۳

اس مطالبہ کی غرض لوگوں کو نبی کے خلاف بھڑکانا ہے ۴

الذین لا یرجون لقاءنا کے جملہ سے صاف ثابت

ہے۔ کہ نشانات کو دیکھکر عوام میں سے بعض کے دل نرم ہوگئے ہیں۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر ائمۃ الکفر کو فکر پڑتی ہے۔ اور وہ ایسی چال چلنا چاہتے ہیں۔ جس سے لوگوں کے جذبات پھر مخالفت میں اُبھر پڑیں۔ اور آخر مصلح کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ انسانی فطرت صلح کے طریق کو پسند کرتی ہے۔ اور صلح کے مطالبہ پر امور متنازعہ فیہا کی اہمیت کو بسا اوقات نظر انداز کر کے صرف اس امر کو اپنے ذہن میں جما لیتی ہے کہ خواہ کچھ قربانی کرنی پڑے صلح کر لینی چاہیئے۔ وہ لوگ بھی یہی چال چلتے ہیں۔ اور درمیانی راہ پر آجانے کی دعوت دیتے ہیں اور اول تو مطالبہ یہ پیش کرتے ہیں کہ اس قرآن کی بجائے کوئی اور قرآن لے آؤ۔ یعنی تم بڑے کام کرنیوالے ہو اپنی نئی تعلیم پیش نہ کرو۔ قوم کے لیڈر بنکر اسی کے خیالات کے مطابق کام کرو۔ تو ہم سب لوگ تمہارے پیچھے چلنے کو تیار ہیں۔ اسطرح ملک کا فساد دور ہو جائیگا۔ اور بھائی سے بھائی جدا نہ ہوگا۔ اور اگر تم ایسا پسند نہیں کرتے۔ تو دوسری تجویز ہم یہ پیش کرتے ہیں۔ کہ کم سے کم ایسے مضامین کو بیچ میں سے اڑا دو۔ جن سے تمہاری قوم کو رنج ہوتا ہے۔ مثلاً شرک کے خلاف تعلیم یا قومی رسوم کے خلاف تعلیم۔ اس تجویز کے پیش کرتے وقت آئمۃ الکفر خوب جانتے ہیں کہ آپ ان امور کو تو مان نہیں سکتے۔ پس لوگوں کے جذبات پھر بھڑک اُٹھینگے۔ کہ کیس قدر تنگ خیال آدمی ہے۔ کہ قوم اور ملک میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے اپنے بعض خیالات چھوڑنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا۔ اور یہ بھول جائینگے کہ بیشک قوم اور ملک ایک اہم چیز ہیں۔ لیکن سچائی ان سے بھی اہم ہے۔ اور یہ بھی خیال نہ کرینگے۔ کہ قوم کا تنزل تو ان سچائیوں کے انکار کی وجہ سے ہے۔ پس وہ صلح کس فائدہ کی۔ جس میں ان سچائیوں کو چھپایا جائے جن پر قومی ترقی کا انحصار ہے۔ اور اس طرح قوم کو ہمیشہ کے لئے کامیابی کے راستہ سے پھرا دیا جائے۔ آہ یہ خیال ہمیشہ تنزل کی طرف جانے والی اقوام میں راسخ ہوتا ہے۔ کہ انہیں ان کے موجودہ نظام کو بدلے بغیر ترقی نصیب ہو جائے۔ اور وہ ہمیشہ مصلحین کے خلاف یہی رویہ اختیار کرتی ہیں۔ کہ قومی صلح کو باقی سب امور پر ترجیح دیتی ہیں۔ حالانکہ اس سے زیادہ جھوٹ اور کوئی نہیں ہوتا۔ کہ ایک گری ہوئی قوم میں حقیقی صلح ہو۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ قلوبہم شتّٰی۔ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں اس کے باوجود وہ سب فساد کا الزام اپنے وقت کے مصلحوں پر لگاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ انہوں نے فساد ڈالدیا۔ اور قومی صلح کے نام سے صداقتوں کی قربانی میں اخفاء کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جسے کوئی راست باز انسان قبول نہیں کر سکتا۔ اور اس سے دشمنانِ حق کو اس کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے کا موقع مل جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح آج کل مسلمانوں میں ہو رہا ہے۔ مگر افسوس کہ باوجود قرآن کریم میں اس حقیقت کے واضح کر دینے کے وہ اپنی حالت کو سمجھتے نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔

اس مطالبہ کا جواب

اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ائمۃ الکفر کی اس تدبیر کے جواب میں ارشاد فرماتا ہے۔ کہ تو ان سے کہدے۔ کہ میں اپنی طرف سے اس تعلیم کو کیسے بدل سکتا ہوں۔ تم جانتے ہو۔ کہ میرا یہ دعویٰ نہیں۔ کہ میں اپنی عقل سے اس تعلیم کو پیش کرتا ہوں۔ اگر میری عقل کا سوال ہوتا۔ تو بیشک کہا جا سکتا۔ کہ ایک فرد کی عقل کو قوم کی عقل کے تابع کر دیا جائے۔ مگر یہ تو اللہ تعالیٰ کا تجویز کردہ نسخہ ہے۔ اس میں تبدیلی نسخہ کی غلطی کی وجہ سے تو ہو نہیں سکتی ہاں صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ تم لوگ اپنی حالتوں کو بدل لو۔ اس فقرہ میں اس بات کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ فرمایا ہے کہ الٰہی تعلیم انسانی حالت کے مطابق ہوتی ہے۔ اور مذہبی اصلاح اور علاج کا بہترین ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لئے فرمایا۔ کہ اگر میں اسے اپنے پاس سے بدل دوں۔ تو اس بات کا بہت بڑا نقصان ہوگا کیونکہ صرف یہی تعلیم تمہاری اصلاح کر سکتی ہے۔ پس اس میں تبدیلی کرنا یقیناً اصلاح نہیں ہوگا۔ بلکہ تکلیف دہ ہوگا دوسرے اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے۔ کہ اس میں جو

تمہاری تباہی۔ بربادی اور عذاب کی خبریں دی جاتی ہیں۔ اور تم انہیں ناپسند کرتے ہو۔ اور انہیں بدلنے کے لئے کہتے ہو۔ جب تم میں تبدیلی پیدا ہو جائیگی۔ تو یہ تمام خبریں خودبخود بدل جائینگی۔ اور اسوقت تم کو ترقی۔ کامیابی اور غلبہ کی بشارات کا وارث بنا دیا جائیگا۔ گویا یہ خبریں تب ہی بدلیں گی۔ جب تمہاری حالت بدلے گی۔ میرا کام نہیں کہ ان کو خود بدلوں۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ میں اپنے پاس سے نہیں بدل سکتا۔ جب تک خدا نہ بدلے۔ کیونکہ میں تو صرف وحی الٰہی کی پیروی کرنے والا ہوں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ کیا نبی وحی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بغیر وحی کے کرتا بھی ہے۔ اور نہیں بھی کرتا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ وہ بغیر وحی کے کوئی کام نہیں کرتا۔ تو اسکے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہ وہ محبت الٰہی میں اس قدر گداز ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے وحی الٰہی سے ہی بعض کاموں میں عقل سے کام لینے کا حکم نہ دے۔ تو وہ کچھ بھی بغیر وحی کے نہ کرے۔ لیکن چونکہ وحی الٰہی ہی اسے کہتی ہے۔ کہ وہ استنباط اور استخراج کے طریقے کو جاری رکھے۔ اس لئے وہ عقل سے بھی کام لیتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ نبی استنباط سے کام نہیں لیتا صرف وحی کا ہی تابع ہوتا ہے اور چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت استنباط بھی کرتا ہے۔ اس لئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ استنباط سے بھی کام لیتا ہے۔ لیکن یہ ہرگز درست نہ ہوگا۔ کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ نبی جو کچھ کہتا یا کرتا ہے۔ صرف وحی سے کہتا اور کرتا ہے۔ کیونکہ اس طرح ان اجتہادی غلطیوں کا جو انبیاء سے ہوتی رہتی ہیں کوئی جواب نہ ہوگا۔ اور نبی کو نعوذ باللہ من ذالک خدا تعالیٰ کی وحی کے خلاف عمل کرنے والا سمجھنا پڑیگا۔ جیسے مثلاً یہ آیت عفا اللہ عنك لم اذنت لھم حتی یتبین لك الذین صدقوا و تعلم الکاذبین (توبہ ع ۷) اللہ تعالیٰ تجھ پر فضل کرے تو نے کیوں (تبوک کے غزوہ میں جانے سے) اجازت مانگنے والوں کو اجازت دی جب تک کہ تجھ پر سچوں کی حقیقت نہ ظاہر ہو جاتی۔ اور جھوٹوں کا جھوٹ نہ کھل جاتا۔ اب اگر یہ سمجھا جائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر اک کام خدا تعالیٰ کی وحی سے کرتے تھے۔ تو نعوذ باللہ یہ بھی ماننا پڑیگا۔ کہ اس موقع پر آپ نے وحی الٰہی کے خلاف کام کیا۔

ہاں اس آیت کے ایک اور معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اس جگہ قرآن مجید کا ذکر ہے۔ اور انہوں نے ائت بقرآن غیر ھذا ہی کہا ہے۔ اس لئے الا ما یوحی الی بھی قرآن مجید سے ہی متعلق ہوا اور مطلب یہ ہے کہ میں قرآن مجید کے متعلق تمام باتیں وحی الٰہی سے کرتا ہوں اور اس میں خود کوئی دخل نہیں دیتا۔ لہذا میں کوئی تبدیلی یا تغیر نہیں کر سکتا۔ اس آیت سے ان لوگوں کا رد بھی ہو جاتا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ہر سورۃ سے پہلے لکھنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہے۔ نہ کہ وحی سے۔ یا ترتیب قرآن اور سورتوں کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود رکھے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کی طرف سے فرماتا ہے۔ کہ قرآن مجید کے متعلق میں ہر بات کو وحی سے ہی طے کرتا ہوں۔ اور یہ کہنا کہ بیشک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو وحی الٰہی سے ایسا کرتے تھے مگر صحابہ نے اپنی مرضی سے بعض تغیرات کر دیئے۔ بالکل ہی عقل کے خلاف ہے۔ کیونکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حق نہیں تھا۔ تو صحابہ کو کیسے یہ حق حاصل ہو سکتا تھا۔ اور وہ سوائے اس کے کہ نعوذ باللہ انہیں مرتد قرار دیا جائے۔ کب ایسا کر سکتے تھے۔

اس آیت پر بعض مسیحی مصنف اعتراض کرتے ہیں کہ ان اتبع الا ما یوحی الی اور ما یکون لی ان ابدله میں نسخ قرآن کے مسئلہ پر جو اعتراض پڑتا تھا اس سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور جواب یہ دیا گیا ہے۔ کہ اس کا مجھ پر الزام نہیں آ سکتا۔ یہ تو جو

قرآن کریم کے جمع وغیرہ کا تمام کام بھی وحی الٰہی کے ماتحت ہی ہوا ہے

کیا نبی وحی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا

قرآن کریم کا کوئی حصہ یا کوئی آیت منسوخ نہیں

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ ت۱۵

(اور) تو (انہیں) کہہ کہ اگر اللہ (تعالیٰ) کی (یہی) مشیت ہوتی (کہ اسکی جگہ کوئی اور تعلیم دیجائے) تو میں اسے پڑھکر تمہیں نہ سناتا اور نہ وہ (ہی) تمہیں اس

۱۷ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(تعلیم) سے آگاہ کرتا۔ چنانچہ اس سے پہلے میں ایک عرصہ دراز تم میں گذار چکا ہوں۔ کیا پھر (بھی) تم عقل سے کام نہیں لیتے ۱۶

کچھ ہوتا ہے خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ خیال بالکل فضول ہے۔ کیونکہ اس جگہ پر نسخ کا جواز نہیں نکلتا۔ بلکہ یہ آیت تو بتاتی ہے کہ نسخ قرآن مجید میں کبھی ہوا ہی نہیں کیونکہ کفار جو بَدِّلْهُ کا مطالبہ کرتے تھے ان کی غرض اس سے یہ تو نہ تھی کہ وہ تبدیلی کے بعد مان لیں گے۔ بلکہ ان کی صرف یہ غرض تھی کہ بعد میں اعتراض کریں کہ یہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام ہے۔ جبھی تو حسب منشاء تبدیلی کر لیتے ہیں۔ اور اگر نہ بدلیں گے تو قوم کو اکسائینگے کہ یہ شخص قوم کی صلح اور اتحاد کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن اگر پہلے ہی قرآن کریم میں نسخ ہوا کرتا تھا۔ تو انہیں اس مکارانہ تدبیر کے اختیار کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ پہلے نسخ جو قرآن کریم میں ہو چکے تھے۔ ان پر اعتراض کر دیتے پس یہ آیت اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ قرآن مجید میں نسخ بالکل نہیں ہوا۔

یہ عجیب بات ہے کہ وضاعوں نے ایسی روایات تو بنا لیں کہ فلاں آیت اب نہیں ملتی یا فلاں سورۃ کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن ایسی روایات بنانے کی طرف کسی کا ذہن ہی نہیں گیا۔ کہ قرآن مجید کی فلاں آیت منسوخ ہو گئی اور اس کی جگہ فلاں آیت رکھی گئی ہے۔

کسی حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ فلاں آیت کی جگہ فلاں آیت رکھی گئی

انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم کے یہ معنی نہیں کہ اگر مجھے ڈر نہ ہوتا کہ عذاب عظیم پہنچے گا تو میں تبدیلی یا تغیر کر دیتا۔ کیونکہ آیت کے یہ الفاظ نہیں کہ مجھ پر عذاب نازل ہوگا۔ اس سے میں ڈرتا ہوں بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اگر میں ایسا کروں تو یوم عظیم کا عذاب آجائیگا۔ اور یوم عظیم کا عذاب قومی عذاب ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ وسیع ہوتا ہے۔ اور دنیا پر ایک مستقل اثر چھوڑ جاتا ہے۔ پس اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو تعلیم آتی ہے وہ خود لوگوں کے فائدہ کے لئے ہوتی ہے۔ اور تمام ترقی اس سے وابستہ ہوتی ہے۔ پس اگر اس تعلیم میں تبدیلی کر دی جائے۔ تو اس کا نقصان خود ملک اور قوم کو پہنچیگا۔ اور قوم کی تباہی کا دن آجائے گا۔ پس اس کے بدلنے میں قوم کی خیر خواہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے قائم کرنے میں قوم اور ملک کی خیر خواہی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے۔ جیسے کوئی بیمار ڈاکٹر سے کہے کہ اس نسخہ کی فلاں دوائی بدل دو تب میں کھاؤنگا۔ تو ڈاکٹر کہے کہ میں ڈرتا ہوں کہ یہ نسخہ بدلنے سے تکلیف ہوگی۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا۔ کہ اگر تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو میں اس کو بدل دیتا۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ نسخہ یہی مفید ہے ۔

دری

بث قد

قرآن کریم میں کوئی تبدیلی یا منسوخی نزول قرآن کریم کے منافی ہے۔

۱۷ حل لغات دَرٰى يَدْرِیْ دَرْيًا و درایۃً علمہ۔ دری کے معنی ہوتے ہیں۔ اسے جان لیا (اقرب) ادری بہ اعلمہ بہ۔ اسے اس کا علم دیا۔ (اقرب) لبث بالمکان یَلْبَثُ لَبْثًا ولُبْثًا و لباثًا۔ مکث و اقام۔ مکان میں رہا یا ٹھہرا۔ قد کا لفظ جب ماضی پر آئے تو اس کے معنی کو حال کے قریب کر دیتا ہے۔ پس اس آیت کے یہ معنی ہوئے کہ میں تم میں نبوت کے زمانہ تک رہتا چلا آیا ہوں۔ کہیں غائب نہیں ہوا۔

تفسیر - یعنی جیسا کہ تم اس کے بدلنے کے لئے کہتے ہو اگر اس کا بدلنا مفید ہوتا۔ اور دوسرا نسخہ کام آ سکتا تو وہ نسخہ پہلے ہی کیوں نہ آ جاتا۔ اس کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس آیت سے نسخ کے عقیدہ پر سخت حملہ ہوتا ہے نسخ صرف احکام میں ہو سکتا ہے۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ بعض اوقات ایک حکم مفید ہوتا ہے۔ بعض اوقات دوسرا لیکن اگر حالات کے بدلنے کے بغیر نسخ ہو جائے۔ تو ماننا پڑیگا کہ وہ پہلی تعلیم اپنی ذات میں مفید نہ تھی۔ اور اس کا پیش کرنا ہی غلط تھا۔ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلواتا ہے کہ تو ان سے کہہ دے کہ اگر یہ تعلیم مفید نہ ہوتی۔ بلکہ کوئی اور تعلیم تمہاری حالت کی اصلاح کر سکتی۔ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم پا کر میں اس تعلیم کو کیوں تمہیں سناتا اور خدا تعالیٰ کیوں یہ تعلیم بھیجتا۔

فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ - میں ایک بہت بڑا اصل مدعی نبوت کی صداقت کے پہچاننے کا بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ ہر شخص کے حالات کی پرکھ اس اصل پر ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کے معنوں کو ناجائز وسعت نہ دیدی جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہ وہ نبوت یا قرآن کریم کے نزول کے زمانہ سے پہلے زمانہ کو بطور شہادت کفار کے سامنے پیش کریں۔ کہ اس میں میری زندگی صداقت کا ایک اعلیٰ نمونہ رہی ہے۔ اور اس زمانہ اور نبوت کے زمانہ میں کوئی وقفہ نہیں پڑا۔ میں تمہاری نظروں سے غائب نہیں رہا۔ کہ تم خیال کرو۔ کہ اس عرصہ میں میں بگڑ گیا ہونگا۔ جب تم تسلیم کرتے ہو۔ کہ عمر بھر میں پکا راستباز رہا ہوں۔ اور امین کہلاتا رہا ہوں۔ تو ان اعمال کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے انعام ملنا چاہیئے تھا۔ نہ یہ کہ میں یکدم ایک ہی رات میں جھوٹا اور فریبی ہو جاتا۔ کس طرح ممکن ہے کہ جو شخص کل شام تک سب سے بڑا سچا ہو۔ صبح ہوتے تک دنیا کا سب سے بڑا جھوٹا ہو جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والے سے زیادہ جھوٹا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جو شخص بندوں پر جھوٹ نہیں باندھتا۔ وہ خدا پر کس طرح جھوٹ باندھ سکتا ہے ۔

۱ بطلان عقیدہ نسخ فی القرآن۔

انسانی فطرت کا قاعدہ ہے۔ کہ اس میں انتہائی تغیر خواہ نیکی کی طرف ہو یا بدی کی طرف۔ یک لخت نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسے تغیر کے لئے ایک عرصہ چاہیئے۔ لیکن آیت کے الفاظ بتا رہے ہیں۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے۔ اور آپ کی تمام عمر آپ کے ہم وطنوں کے لئے ایک کھلی کتاب کی طرح تھی۔ پس اللہ تعالیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ کہ تم ہمارے رسول کی طرف جھوٹ تو وہ منسوب کرتے ہو۔ جو سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ یعنی خدا پر افترا کرنا۔ لیکن اس کے نشوونما کے لئے کسی عرصہ کا ثبوت نہیں دے سکتے بلکہ اس کے برخلاف تم خود تسلیم کرتے ہو۔ کہ یہ رسول دعوئی نبوت کی گھڑی تک تمہارے درمیان رہتا رہا ہے۔ اور اس گھڑی تک تم اس کو نیک پاک امین اور راستباز ہی قرار دیتے رہے ہو۔ پھر تم کس طرح کہہ سکتے ہو۔ کہ یہ شخص اپنے پاس سے جھوٹ بنا کر تم کو یہ تعلیم دے رہا ہے ۔

۲ انتہائی تغیر یکلخت نہیں ہوا کرتا۔

۳ دعوی نبوت سے قبل کی زندگی ایک بہت بڑا معیار صداقت ہے

من قبلہ کہہ کر یہ بتایا گیا ہے۔ کہ دعوائے نبوت کے بعد کے اعتراض قابل التفات نہیں۔ کیونکہ اس وقت مخالفت کے باعث دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نکتہ کو ہرقل بادشاہ روم نے بھی خوب سمجھا تھا۔ کیونکہ جب اس نے ابو سفیان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چال چلن کے متعلق شہادت طلب کی۔ تو اس سے یہی مطالبہ کیا تھا۔ کہ آپ کا چال چلن اس دعوے سے پہلے تمہارے نزدیک کیسا تھا۔

۴ دعوے کے بعد کے اعتراضات قابل التفات نہیں

افلا تعقلون - کہہ کر بتایا ہے۔ کہ اس کے خلاف

۵ فوری تغیر کے اسباب

بات کتنا عقل کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہ بات علم النفس سے

ابوجہل کی شہادت

ثابت ہے کہ فوری تغیر دو اسباب کے بغیر نہیں ہوتے یا تو جسمانی تغیر کے سبب سے۔ جیسے کہ کسی انسان کے دماغ کو چوٹ وغیرہ کے ذریعہ سے کوئی صدمہ پہنچ جائے جس سے اس کا حافظہ جاتا رہے۔ یا اخلاق بگڑ جائیں۔ یا اخلاق کی اصلاح ہو جائے۔ یا پھر کسی عظیم الشان روحانی تغیر سے یکدم تغیر ہوتا ہے۔ جیسا کہ مثلاً بعض دفعہ کسی انسان کو کوئی عظیم الشان صدمہ پہنچتا ہے۔ تو اس کی وجہ سے مایوسی کا پہلو اختیار کر کے بدی کی طرف جھک جاتا ہے۔ یا کسی

نضر بن حارث کی شہادت

عظیم الشان صداقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ تو اس کی وجہ سے یکدم نیکی کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ ان دو تغیرات کے بغیر انسان میں فوری تغیر نہیں ہوتا۔ بلکہ تدریجی تغیرات ہوتے ہیں۔ لیکن تاریخ سے ہرگز ثابت نہیں۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آیا ہو نہ جسمانی طور پر نہ روحانی طور پر۔ کیونکہ نبوت سے ایک عرصہ پہلے آپ دنیا کو ترک کر کے علیحدہ عبادت کرنے کے عادی تھے۔ اور اپنے اہل وطن سے مایوس نہ تھے۔ بلکہ اُن کے ہمدرد اور خیر خواہ تھے۔ اور ان کی ترقی کے لئے کوشش کرتے تھے۔ پس ان حالات میں بالکل خلاف عقل ہو گا اگر یہ کہا جائے کہ کل تک تو بے شک یہ شخص نیکی کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ مگر آج بدترین جھوٹا انسان ہو گیا ہے۔

حضرت مسیح موعود کا اس معیار کو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کرنا

اس زمانہ کے مامور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ اور افسوس کہ آپ کے مخالف بھی ویسی ہی باتوں میں مشغول رہے ہیں۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف۔ کاش لوگ غور کرتے کہ وہی شخص جو بدترین دشمنوں کے نزدیک بھی دعوائے مسیحیت سے پہلے اسلام کا سب سے بڑا خادم اور راستبازی کا ایک بےنظیر نمونہ تھا۔ وہ یکدم اس قدر کیوں بگڑ گیا۔ کہ اس نے خدا تعالیٰ پر افترا کرنا شروع کر دیا۔

اس دلیل کے متعلق بعض تاریخی حالات

قرآن شریف کی اس دلیل کے متعلق بعض تاریخی واقعات حسب ذیل ہیں۔ ترمذی۔ کتاب التفسیر میں آتا ہے۔ کہ ابوجہل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو ہوئی جس میں ابوجہل نے کہا۔ انا لا نکذبک بل نکذب بما جئت بہ۔ ہم تجھ کو جھوٹا قرار نہیں دیتے۔ بلکہ اس تعلیم کی تکذیب کرتے ہیں۔ جو تو لیکر آیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ نبوت کے دعوے کے بعد بھی مخالفین کو یہ دلیری نہ تھی۔ کہ بعثت سے پہلے زمانہ کے متعلق آپ پر کوئی الزام لگائیں۔ بلکہ شروع شروع میں آپ کو جھوٹا کہنے سے پرہیز کرتے تھے۔ بعد میں آہستہ آہستہ جھوٹا کہنے لگ گئے۔

نضر ابن الحارث کا واقعہ لکھا ہے (اور یہ ان نو دشمنوں میں سے ہے۔ جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ کیا تھا۔) کہ ایک دفعہ کفار آپس میں مشورہ کر رہے تھے۔ کہ حج کے موقعہ پر باہر سے آنے والے لوگوں کو ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا کہیں گے۔ ایک نے ان میں سے کہا۔ کہ ہم کہہ دینگے۔ یہ شخص جھوٹا ہے۔ تو النضر بن الحارث کھڑا ہو گیا۔ اور جوش کے ساتھ کہا۔ قد کان محمد فیکم غلاما حدثا ارضاکم فیکم واصدقکم حدیثا واعظمکم امانۃ حتی اذا رأیتم فی صدغیہ الشیب وجاءکم بما جاءکم بہ قلتم ساحر لا واللہ ما ھو بساحر۔ یعنی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے درمیان جوان ہوا۔ اس کے اخلاق پسندیدہ تھے تم سب سے زیادہ سچا تھا۔ نہایت امین تھا۔ وہ اسی حالت میں رہا۔ یہاں تک کہ تم نے اس کی کنپٹیوں میں سفید بال دیکھے۔ یعنی وہ ادھیڑ عمر کو پہنچ گیا اس وقت جب اس نے اپنی تعلیم کو تمہارے سامنے پیش کیا۔ تو تم کہنے لگے جھوٹا ہے جھوٹا ہے۔ خدا کی قسم وہ جھوٹا نہیں ہے۔ یعنی لوگ ہرگز تسلیم نہیں کرینگے۔ کہ وہ جھوٹا ہے۔ (شفاء قاضی عیاض)

اس روایت میں کئی لطیف باتیں بیان ہوئی ہیں اول یہ کہ اس میں ساری عمر پر بحث کی گئی ہے۔ یعنی جوانی

سے لیکر ادھیڑ عمر تک بچپن کے زمانہ کو چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ اس پر کوئی عقلمند اعتراض ہی نہیں کیا کرتا۔ دوسری خوبی اس میں یہ ہے کہ آپ کے اخلاق اور آپ کی خصوصیات تفصیلاً بیان کی گئی ہیں۔ تیسری خوبی یہ کہ ایک ایسے دشمن کی طرف سے روایت ہے کہ جو اس کے بعد آپ کے قتل کے واقعہ میں شامل ہوا اور کفر کی حالت میں ہی مارا گیا۔ چوتھی خوبی اس میں یہ ہے کہ اس سے ظاہر ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا کیسا گہرا نقش ان کے دلوں پر تھا۔ کہ ایک دشمن اپنے گھر میں ایسا فقرہ کہتا ہے۔ کہ جو حقیقت کے لحاظ سے ابوبکر رضؓ جیسے انسان کے مُنہ سے نکلنا چاہیئے۔ یعنی لا واللہ ماھو بساحر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاقی نقش اس کے دل پر غالب آ گیا۔ اور اس کی عداوت دب گئی۔ اور وہ مجبور ہو گیا۔ کہ اس صداقت کا اس قدر پُرزور الفاظ میں علانیہ اقرار کرے۔

بخاری باب بدء الوحی میں حضرت خدیجہ رضؓ کا قول آتا ہے۔ کلا واللہ ما یخزیک اللہ ابداً انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق۔ کہ اللہ تجھکو رسوا نہ کریگا کیونکہ تو صلہ رحمی کرتا اور لوگوں کے بوجھ اٹھاتا۔ نایاب خوبیوں کو پیدا کرتا مہمان نوازی کرتا اور مصیبت زدوں کی مدد کرتا ہے۔ یہ شہادت آپ کی پہلی زندگی کے متعلق آپ کی بیوی کی ہے۔ جو انسان کے اخلاق کی بہترین گواہ ہوا کرتی ہے۔

پھر بخاری میں ابوسفیان سے روایت آتی ہے کہ جب ہرقل کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی خط پہنچا۔ تو اس نے تلاش کروایا۔ کہ عرب کا کوئی آدمی ملے۔ جس سے ہم اس مدعی کے حالات دریافت کریں۔ آخر ابوسفیان اور اس کا قافلہ جو تجارت کے لئے وہاں گیا ہوا تھا دربار میں حاضر کیا گیا۔ ہرقل نے ابوسفیان کے ساتھیوں کو اس کے پیچھے کھڑا کر دیا اور کہا کہ اگر یہ جھوٹ بولے تو فوراً بتا دینا۔ اس سلسلہ گفتگو میں ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا فھل کنتم تتھمونہ بالکذب قبل ان یقول ما قال قلت لا۔ کہ کیا تم لوگ اس کے دعوے سے پہلے اُسے جھوٹا سمجھتے تھے۔ ابوسفیان کہتا ہے۔ میں نے کہا۔ نہیں۔ ایک روایت میں ابوسفیان نے ذکر کیا ہے۔ کہ میرا دل چاہتا تھا۔ کہ اس جگہ کچھ جھوٹ بول دوں۔ مگر پھر ڈرا کہ ساتھی اس جھوٹ کا اظہار کر دینگے۔ (بخاری باب بدء الوحی)

قریش کی شہادت۔ اسی طرح جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ انذر عشیرتک الاقربین (شعراء آیت ۲۱۴) کا حکم ہوا۔ تو آپ پہاڑ کے اوپر چڑھ گئے۔ اور تمام قبائل کو جمع کر کے فرمایا ارئیتکم لو اخبرتکم ان خیلا بالوادی ترید ان تغیر علیکم اکنتم مصدقیّ قالوا نعم ما جربنا علیک الا صدقاً (بخاری کتاب التفسیر سورہ شعراء) آپ نے فرمایا کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ کوہ ابوقبیس کے پیچھے ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ تو کیا تم میری بات مان لوگے؟ انہوں نے کہا ہاں کیونکہ ہم نے جب بھی آپ سے معاملہ کیا ہے آپ کو سچا ہی پایا ہے۔ مکہ کے حالات سے باخبر لوگ جانتے ہیں۔ کہ آپ کا یہ مطالبہ بڑا سخت تھا۔ کیونکہ مکہ کے لوگوں کے جانور وادی میں چرا کرتے تھے۔ اور وہ ایسا علاقہ ہے۔ کہ اس میں لشکر کا چھپ رہنا ناممکن ہے۔ پس کفار کا کہنا کہ اس ناممکن بات کو بھی تم اگر ہم سے بیان کرو گے۔ تو ہم تمہیں سچا ہی قرار دینگے۔

حضرت خدیجہؓ کی شہادت

ابوسفیانؓ کی شہادت

بتاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف کفار سچا کہا کرتے تھے۔ بلکہ وہ آپ کی طرف جھوٹ منسوب کرنا ناممکن قرار دیتے تھے۔ ایسا ہی ایک اور شدید دشمن آپ کا امیہ بن خلف تھا۔ اس کا یہ قول ہے۔ واللہ ما یکذب محمد اذا حدث خدا کی قسم جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتے ہیں۔ تو سچ ہی کہتے ہیں۔ جھوٹ نہیں

امیہ بن خلف کی شہادت

بولتے (بخاری باب علامات النبوۃ) یہ بعض روایات ہیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فقد لبثت فیکم عمرا کا دعویٰ واضح ہو جاتا ہے۔

پادری ویری کا اعتراض کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

بعض مسیحی مصنفوں نے اس آیت پر اعتراض کیا ہے۔ چنانچہ ریورنڈ ویری صاحب جو ان میں سے قرآن کریم کے مفسر ہیں اس آیت کے نیچے سیل (ایک دوسرا انگریز جو قرآن کا مترجم تھا) کا حوالہ دیکر لکھتے ہیں۔ کہ اس نے لکھا ہے۔ کہ جب اس عمر تک میں نہایت اندر رہا ہوں۔ اور نہ میں نے کسی سے پڑھا نہ علماء کی مجلس میں بیٹھا۔ اور نہ کبھی شعر یا خطبہ کہا۔ تو اب اس بڑھاپے کی عمر میں میری نسبت کس طرح خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ عبارتیں میری اپنی تصنیف ہیں۔ اسپر پادری ویری صاحب اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ (۱) کیا یہ عجیب بات نہیں کہ علیؓ کے ساتھ ایک ہی گھر میں پل کر علی تو تعلیم پائے مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ پائیں۔ دوم۔ کیا یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ سالوں تک ایک اہم تجارتی کام کرنے کے باوجود انہیں لکھنا نہ آتا ہو۔ سوم آخری سالوں میں آپؐ یقیناً پڑھنا جانتے تھے۔ کیونکہ حدیث میں آتا ہے۔ کہ آپؐ نے حضرت معاویہؓ کو جو آپ کے کاتبوں میں سے ایک کاتب تھے۔ حکم دیا کہ "ب" سیدھی ڈالو۔ اور "س" کے دندانوں کو واضح کرو۔ چہارم انہوں نے اپنی وفات سے پہلے قلم دوات منگائی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھنا جانتے تھے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ فن کتابت انہوں نے کب سیکھا تھا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں۔ کہ خدا نے انہیں اسیطرح سکھایا تھا۔ جس طرح الہام سکھایا تھا یعنی الہاماً لکھنا پڑھنا بتایا تھا۔ اور وہ اس کی سند میں اِقرأ باسم ربك الذی خلق کو پیش کرتے ہیں۔

اس آیت میں لکھنے یا نہ لکھنے کا سوال نہیں۔

ویری کا بحث کہ آپ نے لکھنا پڑھنا کب سیکھا تھا

یہ لکھ کر ویری صاحب کہتے ہیں۔ کہ یہ رائے کہ وہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے تو ان کی رائے ہے اور اس آیت سے ثابت ہے کہ آپ کو پڑھنا لکھنا آتا تھا۔ لیکن یہ امر یہاں سے نہیں نکلتا کہ ان کو یہ علم معجزانہ طور پر سکھایا گیا تھا۔ اور نہ یہ نکلتا ہے کہ اس سے پہلے وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے۔

پھر ویری صاحب لکھتے ہیں۔ اگر کوئی یہ پیش کرے۔ کہ آپ لکھنے کے لئے کاتب رکھا کرتے تھے۔ تو اس دلیل سے ثابت نہیں ہوتا۔ کہ آپ کو لکھنا نہ آتا تھا۔ کیونکہ کا تبوں کا رکھنا اسوقت کے بڑے بڑے عالموں میں رائج تھا۔

پھر پادری ویری صاحب خود ہی سوال اٹھاتے ہیں۔ کہ پھر یہ خیال کہاں سے پیدا ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنا نہ آتا تھا۔ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں۔ کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن مجید میں النبی الامی آتا ہے۔ اس الامی کے لفظ سے مسلمانوں کو دھوکا لگا ہے۔ کہ آپ اَن پڑھ تھے۔ حالانکہ اس لفظ کے استعمال کی وجہ یہ تھی۔ کہ یہود عربوں کو اُمّی کہا کرتے تھے۔ اس لئے النبی الامی کے معنی قرآن میں یہ تھے کہ غیر اسرائیلی اور غیر یہودی نبی۔ پھر وہ لکھتے ہیں۔ کہ یہ جو غلط فہمی ہوئی کہ آپ امی (اَن پڑھ) ہیں۔ اس سے آپکے دعویٰ کے پھیلنے میں بڑی مدد ملی۔ کیونکہ یہ قرآن کریم کے معجز نما ہونے کی دلیل بن گیا۔ حالانکہ مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بچپن سے ہی پڑھے لکھے تھے۔

یہ ویری صاحب کے اعتراضات کا خلاصہ ہے۔ اب ان کا جواب حسب ذیل ہے۔ (۱) آیت کی تفسیر میں میں بتا چکا ہوں کہ اس آیت میں آپ کے پڑھنے لکھنے کی طرف اشارہ نہیں۔ بلکہ پاکیزہ زندگی کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ سیاق وسباق سے ظاہر ہے۔ کفار کا یہ سوال نہ تھا۔ کہ آپ اس کتاب کی تحریر کو بدل دیں۔ بلکہ یہ مطالبہ تھا۔ کہ اسکی تعلیم کو بدل دیں۔ اور جواب میں خدا تعالیٰ نے یہ نہیں کہا۔ کہ اسے لکھنا نہیں آتا۔ بلکہ یہ کہا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ چاہتا۔ تو اس تعلیم کو یہ رسول پیش نہ کرتا۔ اور خدا تعالیٰ اس تعلیم کو نازل کرتا پس اس جگہ لکھنے یا نہ لکھنے کا سوال ہی نہیں۔ نہ کفار نے اس جگہ یہ سوال کیا ہے۔ کہ یہ تعلیم تم اپنے ہاتھ سے لکھتے ہو۔ کہ اس کے جواب میں لکھنے کا سوال اٹھایا جاتا۔ اور نعلاً

تو یہ تھا کہ اس تعلیم کو بدل دو اور ان کی غرض یہ تھی کہ اگر یہ بدل دیتے تو ان کا جھوٹا ہونا ثابت ہوگا نہ بدلینگے تو ہم قوم کو جوش دلائیں گے۔ کہ دیکھو قومی اتحاد کے لئے یہ اتنی قربانی بھی نہیں کرسکتا۔ پس جب آیت کے وہ معنی ہی نہیں جو پادری صاحب نے سمجھے ہیں۔ تو اعتراض خود بخود ہی باطل ہوگیا۔ لیکن بفرض محال اگر یہی سمجھ لیا جائے۔ کہ اس آیت میں آپ کے علم کتابت کے جاننے یا نہ جاننے کا سوال اٹھایا گیا ہے۔ تو بھی پادری صاحب کے اعتراض فضول اور بودے ہیں۔

پہلی دلیل کہ حضرت علی رضہ کے ساتھ ایک ہی گھر میں پلکر کس طرح ممکن تھا۔ کہ علی تو تعلیم پائیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ پائیں کوئی دلیل نہیں۔ اور صرف اس امر پر دلالت کرتی ہے۔ کہ ریورنڈ ویری صاحب تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ جو لوگ تاریخ کا تھوڑا سا بھی علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر میں قریباً اُنتیس سال کا فرق تھا۔ اس قدر فرق تھا جن کی عمر میں ہو ان کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایک ساتھ ایک گھر میں تربیت پا رہے تھے۔ ایک ایسی بعید از عقل بات ہے۔ کہ جسے غالباً پادری ویری اور ان کی طرح کے چند لوگ ہی جو تاریخ اسلامی سے ناواقف ہیں صحیح سمجھ سکتے ہونگے۔

جس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوچکی تھی اور آپ ان کے گھر میں آچکے تھے۔ اور خدیجہؓ نے اپنا سب مال آپ کے سپرد کر دیا تھا۔ اور آپ ایک مالدار رئیس کی حیثیت پا چکے تھے۔ پس ایک جگہ دونوں کا تربیت پانا ایک بے دلیل اور خلاف عقل دعوے ہے۔ لطف یہ ہے کہ تاریخ ہمیں پادری صاحب کے اس دعوی کے بالکل خلاف بتاتی ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک گھر میں پرورش نہیں پائی۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پرورش پائی تھی۔ کیونکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت ابو طالب کی حالت غربت کو دیکھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کو بچپن میں ہی اپنے گھر میں لے آئے تھے اور حضرت علی رضہ نے آپ ہی کے گھر پرورش پائی تھی (الایام فی خلفاء الاسلام صفحہ ۱۹۲)۔ پس اگر حضرت علی رضہ نے اوائل عمر میں ہی لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ تو یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ اور کوئی عقلمند نہیں کہہ سکتا۔ کہ کس طرح ممکن ہے۔ کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی کو تعلیم دلائی تھی۔ تو آپ کے چچا نے آپ کو تعلیم نہ دلائی ہو۔ تعلیم دلانا تو زمانہ کے حالات اور مربی کے اپنے خیالات پر منحصر ہوتا ہے۔ اور یہاں زمانہ بھی مختلف ہے۔ اور مربی بھی الگ الگ ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم کے رائج کرنے کا شوق تھا۔ آپنے تعلیم دلائی۔ آپ کے دادا اور چچا کو اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق شوق نہ تھا انہوں نے کوشش نہ کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق تعلیم کا یہ حال تھا۔ کہ بڑی عمر میں کئی صحابہ نے تعلیم حاصل کی۔ حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑی عمر میں مدینہ جاکر عبرانی سیکھی۔

حضرت علی رضہ نے آنحضرتؐ کے پاس تربیت پائی تھی نہ کہ آپ کے ساتھ

دوسری دلیل۔ اگر آپ لکھنا نہ جانتے۔ تو اتنے بڑے اہم تجارتی کام کو کس طرح کر سکتے۔ یہ اعتراض بھی یورپ کی موجودہ حالت پر قیاس کرکے کیا گیا ہے ایشیا میں اب بھی ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ کہ بغیر تعلیم کے لوگ بڑے بڑے تجارتی کام کرتے ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ مکہ کے لوگ لکھنے کو زیادہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اور صرف چند لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ لیکن تاجر سینکڑوں تھے تجارت کے لئے قافلے کے قافلے جایا کرتے تھے۔ پس یہ کہنا کہ جو تاجر جانتے تھے۔ پڑھے ہوئے ہوتے تھے غلط اور قیاس مع الفارق ہے۔

تجارتؐ کرنا تعلیم پر موقوف نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے۔ کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا

حضرت نے شروع میں ایک خواندہ غلام آپ کے ہمراہ تھا۔ علم قرأت بھی یہ دعا ثابت نہیں ہوتا۔

ہے۔ کہ حضرت خدیجہ رضہ نے ایک غلام میسرہ نامی جو پڑھا لکھا تھا۔ آپ کے ساتھ کر دیا تھا۔ پس اس سے یہ دلیل اور بھی کمزور ہو جاتی ہے۔

حضرت معاویہ کو دیت لکھنے کی ہدایت کرنے کی روایت مستند نہیں

حضرت معاویہ رضہ کے متعلق جو کہا گیا ہے۔ کہ ان کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے س اور ب ٹھیک لکھنے کے لئے کہا۔ اول تو یہ حدیث ایسی معتبر نہیں۔ بنو امیہ اور بنو عباس میں اس قدر دشمنی تھی۔ کہ بنو عباس کے زمانہ میں بہت سی ایسی روایات گھڑی گئیں ہیں۔ جن میں یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ یہ لوگ علم کی طرف راغب نہ تھے۔ اور کچھ لیاقت و قابلیت نہ رکھتے تھے

لکھنا پڑھنا نہ جاننے کے باوجود بھی ہدایت دی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر یہ حدیث صحیح بھی ہو۔ تو ایک شخص جو ہدایات دے دے اور قرآن لکھوانے کا دیر سے عادی ہو چکا ہو۔ اس کے لئے س اور ب کے لئے ہدایات دینا کچھ مشکل نہیں۔ اور نہ اس کے لئے پڑھنے کی شرط ہے۔ بالکل ممکن ہے کسی شخص نے کسی وقت کسی تحریر کے پڑھنے میں دیر کی ہو اور آپ نے پوچھا ہو کہ دیر کی کیا وجہ ہے۔ تو اس نے عرض کیا ہو۔ کہ س کے دندانے ملے ہوئے تھے یا ب لمبی نہ تھی اسلئے جلدی پڑھا نہ گیا۔ تو آپ نے سمجھ لیا کہ س کے دندانے کھلے ہونے چاہئیں۔ اور ب لمبی ہونی چاہیئے۔

امی کا لفظ دھوکا کا موجب نہیں ہو سکتا

اور اس وجہ سے معاویہ کو آپ نے ہدایت دی ہو۔ تاکہ تحریر مشتبہ نہ ہو جائے۔ ہمارے ملک میں عورتیں روٹی پکاتی ہیں۔ مرد بعض دفعہ انہیں کہہ دیتے ہیں۔ کہ گول دائرہ بناؤ۔ اب کوئی اس سے یہ سمجھے کہ شائد ہم بڑے اچھے روٹی پکانے والے ہیں۔ کیونکہ ہم ہدایت دے رہے ہیں تو یہ اس کی غلطی ہوگی۔ پس س کے دندانوں کو کھلا کرنے اور ب کو لمبا کرنے کا حکم دینے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضور لکھنا جانتے تھے۔

قلم دوات کے منگانے سے لکھنا پڑھنا جاننا ثابت نہیں ہوتا

آپ کے قلم دوات منگانے سے استدلال کرنا بھی غلط ہے۔ کیونکہ قلم دوات حضور ساری عمر منگاتے رہے۔ جب قرآن مجید لکھواتے تھے تو قلم دوات منگواتے تھے۔ اس سے یہ کیونکر ثابت ہو گیا۔ کہ آپ لکھنا بھی جانتے تھے۔

اقرأ باسم ربك کی آیت بھی کوئی دلیل نہیں کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ کیونکہ قرأت کے معنی صرف لکھا ہوا پڑھنے ہی کے نہیں ہیں۔ بلکہ دوسرے کی بات کو دوہرانے کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ جو شخص قرآن مجید کو زبانی اچھی طرح پڑھتا ہو۔ اس کی نسبت خواہ وہ اندھا ہو۔ عربی زبان میں کہیں گے ہو یحسن قراۃ القرآن۔ پس اقرأ سے لکھا ہوا پڑھنے کا استدلال کرنا کسی صورت میں درست نہیں۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی قرآنی وحی ہوئی۔ اور حضرت جبرئیل نے آپ سے اقرأ کہا۔ تو اس وقت اس نے کوئی تحریر آپ کے سامنے نہیں رکھی تھی پس اقرأ کے یہ معنی نہیں کہ دیکھ کر پڑھ۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ جو میں کہتا ہوں اسے دُہرا۔

ریورنڈ ویری صاحب کا یہ استدلال بھی کہ لوگوں کو اُمی کے لفظ سے دھوکا لگ گیا ایک عجیب استدلال ہے۔ حیرت کا مقام ہے۔ کہ ہر وقت آپ کے سامنے رہنے سے تو لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ لیکن ایک امی کے لفظ سے ان کو یقین ہو گیا۔ کہ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ سوال یہ ہے۔ کہ آیا آپ کے سامنے والوں کو دھوکا لگا تھا۔ یا بعد میں آنیوالوں کو۔ اگر کہو سامنے والوں کو۔ تو ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں کیسے دھوکا لگ سکتا تھا اور اگر کہو بعد والوں کو دھوکا لگا تو سوال یہ ہے کہ دلیل تو یہ دی گئی ہے۔ کہ لوگوں نے یہ خیال کر کے کہ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ اور پھر بھی ایسی کتاب بنائی ہے۔ یہ سمجھ لیا کہ یہ ایک معجزانہ کمال ہے اور معجزہ کے طور پر قرآن کریم کو صحابہ کے زمانہ سے پیش کیا جاتا ہے۔ پس اگر اس کے معجزہ ہونے کی یہی دلیل تھی تو

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ

پھر تم ہی بتاؤ کہ) جو اللہ (تعالیٰ) پر بہتان باندھے یا اس کے نشانات کو جھٹلائے۔ اس سے بڑھ کر کون

بِاٰیٰتِہٖ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ ۱۸

ظالم ہوگا۔ (غرض) یہ یقینی بات ہے کہ مجرم لوگ کامیاب نہیں ہوتے ۱۸ؔ۔

صحابہ جو جانتے تھے۔ کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ کس دلیل پر اُسے معجزہ قرار دیا کرتے تھے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ عرب تو آپ کی زندگی میں مسلمان ہو گئے تھے۔ اور وہی عربی زبان کے معجزہ کو سمجھ سکتے تھے۔ پس ان پر تو اس دھوکے کا کوئی اثر نہ ہو سکتا تھا۔ اور بعد میں آنے والے عجمی عربی زبان کے کمالات کو سوائے شاذ و نادر کے سمجھ نہیں سکتے تھے۔ پس اس دھوکے سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا پھر اس غلط فہمی سے قرآن کریم کے معجزہ ہونے کا نتیجہ کس نے نکالا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ امی کے معنی عربی زبان میں ان پڑھ کے بھی ہیں اور اصل معنی ماں سے نسبت رکھنے والے کے ہیں۔ اور اسی وجہ سے اس کے معنی ان پڑھ کے بھی ہیں کیونکہ وہ ویسا ہی رہتا ہے جیسا کہ پیدا ہوا۔ اور میرے نزدیک پاکیزہ کے بھی ہیں۔ کیونکہ نوزائیدہ بچہ پاک ہوتا ہے۔ اور انہی معنوں میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

یہودی لوگ جو عربوں کو امی کہہ کر پکارتے تھے تو حقارت کے طور پر ان کے جاہل ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اب کیا یہ بات کوئی عقلمند تسلیم کر سکتا ہے۔ کہ قرآن کریم میں یہ لفظ اپنے اصلی معنوں میں تو استعمال نہیں ہوا لیکن ان معنوں میں استعمال ہوا ہے جسے ایک دشمن قوم حقارت کے لئے استعمال کیا کرتی تھی۔ قرآن کریم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی کلام سمجھ لو۔ پھر بھی کیا عقل اجازت دیتی ہے کہ آپ اپنی اور اپنی قوم کی نسبت اس لفظ کو ان تحقیر آمیز معنوں میں استعمال کرتے۔ جو یہودیوں میں رائج تھے۔

پادری صاحب کی آخری دلیل کہ اس زمانہ میں علماء کاتب رکھا کرتے تھے۔ ایک اور شدید تاریخی غلطی ہے۔ پادری صاحب نے عباسی خلافت کے زمانہ کا کوئی واقعہ پڑھکر اسے زمانہ جاہلیت پر استدلال کر لیا۔ حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ عرب میں کوئی علماء ہوتے تھے۔ نہ وہ کاتب رکھا کرتے تھے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تائید میں قومی رواج تو الگ رہا۔ ایک مثال بھی مسیحی مورخ نہیں پیش کر سکے۔ مکہ کے ایک ہی عالم کا ذکر تاریخ میں ہے۔ یعنی ورقہ بن نوفل۔ اور وہ خود لکھا کرتے تھے۔ ان کا کوئی کاتب نہ تھا۔ افسوس ہے کہ مسیحی مصنف اپنے تعصب میں تاریخی حقائق بھی اپنے پاس سے بنا لیتے ہیں +

اس زمانہ میں علماء کا اپنے کاتب رکھنا ثابت نہیں

امی کے معنی عربی زبان میں

۱۸ؔ حل لغات۔

افتریٰ۔ فری سے نکلا ہے جس کے معنے کاٹنے کے ہیں۔ افتری علیہ الکذب اختلقہٗ (اقرب) افتری کے معنی یہ ہیں کہ بات اپنے پاس سے بنا کر کسی کی طرف منسوب کر دی۔ اصل معنی یہی کاٹنے کے ہیں۔ یعنی جان بوجھ کر ایک بات کاٹ لیتا ہے

افتراء

افلح۔ فَازَ و ظفر بما طلب۔ اپنے مقصود کو پا لیا۔ افلح بالشیٔ عاش بہ۔ فلاں چیز کے ذریعہ سے خوش زندگی بسر کی۔ افلح زید نجح فی سعیہ واصاب فی عملہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔

افلح

کامیابی کا ذریعہ جماعت نہیں بلکہ اپنے اصل مقصد کو پالینا ہے۔

مجرمون - مجرم کی جمع ہے - اور اَجْرَمَ سے نکلا ہے تَجَرَّمَ کے معنی ہیں اَذْنَبَ گناہ کیا - عَظُمَ جُرْمُہٗ اس کا گناہ بہت بڑا تھا - اَجْرَمَ علیہ الجریمۃ جب کہا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں - اس پر ظلم کیا - (اقرب)

اجرم

دو قانون الٰہی مدعیان نبوت اور ان کے منکرین کے متعلق

تفسیر - اس آیت میں دو حقیقتیں بیان کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ الٰہی قانون میں دو قسم کے لوگ سزا سے نہیں بچ سکتے ایک تو وہ جو اپنے پاس سے کلام بنائیں - اور اسے خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کریں - اور دوسرے وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے کلام لانے والوں کا مقابلہ کریں - دوسرے یہ بتایا ہے کہ اس قسم کے لوگ جو خدا تعالیٰ پر جھوٹ بنانے والے ہوں - اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے یعنی جس امر کو وہ اپنی بعثت کا مدعا قرار دیتے ہیں - اور جو تعلیم لیکر وہ دنیا میں آتے ہیں وہ مدعا پورا نہیں ہوتا - اور وہ تعلیم دنیا میں نہیں پھیلتی -

افتری کے ساتھ کذب کی قید

قرآن کریم میں اکثر جگہ افترا کے ذکر میں کذب کو بطور قید لایا گیا ہے - یعنی جو شخص جھوٹا افترا کرتے ہیں ان کو فلاں فلاں سزا ملتی ہے - حالانکہ افترا خود جرم ہے اس کے متعلق میرا یہ خیال ہے - کہ اگر افترا صحیح ہو - اور اس میں کذبا والی شرط نہ پائی جائے - تو شاید ایسا شخص اس مقررہ عذاب میں گرفتار نہ ہو - جس کا اس آیت میں ذکر ہے - گو مجرم وہ ضرور ہے اور سزا ضرور پائے گا - جیسے مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مجھے رؤیا ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں - تو اگر اسے خواب نہ آئی ہوگی - تو وہ مفتری ہوگا - مگر چونکہ جو بات اس نے بنائی ہے - وہ اپنی ذات میں سچی ہے - اور اس کے خواب بنانے سے دنیا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ یہ اس کا ذاتی جھوٹ ہے - اور اس سے اپنا تقویٰ اس نے برباد کیا ہے - اس لئے اس آیت کے ماتحت اسے سزا نہیں ملے گی - بلکہ جھوٹ بولنے کی جو عام سزا ہے - اس کے ماتحت وہ پکڑا جائیگا -

بہائیت کی ناکامی

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے - کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے - کہ مفتری مفلح نہیں ہوتا - یعنی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا - یہ نہیں فرمایا - کہ اس کے ساتھ کوئی جماعت نہیں ملتی - یا یہ کہ اسے دولت حاصل نہیں ہوتی بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص جو مفتری ہو - دولت مند ہو جائے - یا ایک جماعت اسے قبول کرلے کیونکہ کوئی شخص صرف اس مقصد کو لیکر کھڑا نہیں ہوتا - کہ وہ کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیگا - ہر مدعی کوئی نہ کوئی روحانی مقصد بتاتا ہے - یا شریعت کا چلانا یا پچھلی شریعت کو قائم کرنا - پس جب تک وہ اس حقیقی مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا - نہ کامیاب نہیں کہلا سکتا - یہ معیار ایسا زبردست ہے - کہ کوئی جھوٹا نبی اس سے فائدہ ہی نہیں اٹھا سکتا - اور سچے نبیوں کو بھی یہ معیار ہر اعتراض سے محفوظ رکھتا ہے - مثلاً حضرت یحیٰی مارے گئے - تو یہ امر ان کے مقصد کے خلاف نہیں - اور وہ غیر مفلح نہیں کہلا سکتے - ان کا مقصد حضرت مسیح سے لوگوں کو شناسا کرا دینا تھا - جو پورا ہو گیا - گو وہ مارے گئے - پس ان کی موت ان کے مفلح ہونے کی راہ میں روک نہیں - وہ ایک عالم برزخ تھے - اور لوگوں کی طبائع کو مسیح کی قبولیت کے لئے تیار کرنے کی غرض سے آئے تھے - یہ کام انہوں نے کر دیا - اور یہود اسی زمانہ میں مسیح کی آمد کا انتظار کرنے لگ گئے - چنانچہ ان کی سب جماعت حضرت مسیح ؑ پر ایمان لے آئی - اور ان کا کوئی الگ سلسلہ باقی نہ رہا -

پھر دوسری طرف یہ معیار جھوٹے مدعیوں کے دعوے کو بھی رد کرتا ہے - مثلاً بہاؤاللہ کو لے لو - اگر بالفرض ان کو مدعی نبوت و رسالت مان بھی لیا جائے - اور ان کے مرید بھی لاکھوں ہوں - تب بھی یہ ان کی صداقت کا ثبوت نہیں کیونکہ ان کا مقصد شریعت اسلامی کو ناقص بتا کر بہائی شریعت کو اس کی جگہ قائم کرنا تھا اور یہ مقصد ایک دن کیلئے بھی اور ایک گھر میں بھی پورا نہ ہوا - بلکہ قرآن مجید پہلے سے بھی زیادہ مقبول ہو رہا ہے - اور بہت سے یورپین بھی جو پہلے اسے جھوٹا سمجھتے تھے

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا

اور یہ (لوگ) اللہ (تعالیٰ) کو چھوڑ کر ایسی چیز کی پرستش کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان دیتی ہے اور نہ

يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ

نفع پہنچاتی ہے۔ اور کہتے ہیں (کہ) یہ (ہمارے معبود) اللہ کے حضور میں ہمارے شفیع ہیں

اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ

تو (انہیں) کہہ (کہ) کیا تم اللہ (تعالیٰ) کو وہ (بات) بتاتے ہو جس کے متعلق نہ آسمانوں میں (پایا جائیگا) اسے علم ہو اور

لَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ ۱۹

نہ (ہی) زمین میں (کہیں اس کے وجود کا کوئی پتہ) وہ پاک ہے۔ اور انکے شریک ٹھہرانے سے وہ بالا تر ہے ۱۹ھ

اب اسے سچا کہہ رہے ہیں۔ ہمارا نہ جس شریعت کو منسوخ کرنے آئے تھے۔ وہ تو آج اور بھی زیادہ مقبول ہو رہی ہے مگر انکی اپنی شریعت طاق نسیاں پر پڑی ہے۔ اب اگر سارا امریکہ بھی بہائی ہو جائے۔ تب بھی بہاء اللہ اس وقت تک مفلح نہیں کہلا سکتے۔ جب تک کہ بہائی تعلیم دنیا میں قائم نہ ہو جائے غرض افلح کے لفظ نے سچوں کو اعتراض سے بچا لیا اور جھوٹوں کی کامیابی کی حقیقت کھول دی

۱۹ھ حل لغات دون نقیض فوق نیچے بمعنی اسفل نچلا اور بمعنی امام آگے و بمعنی وراء پیچھے اور بمعنی فوق اوپر و بمعنی غیر سوائے و بمعنی الشریف قابل عزت و بمعنی الخسیس حقیر۔ (اقرب)

ھٰؤُلَاءِ - اسم اشارہ قریب بصیغہ جمع - یہ ذوی العقول کے لئے مخصوص ہے۔ تنبئون باب تفعیل سے فعل مضارع ہے۔ اس کا مادہ نبأ ہے۔ جس کے معنی خبر کے ہیں کلیات ابی البقاء میں ہے کہ یہ لفظ کسی معمولی خبر کے لئے نہیں بولا جاتا۔ بلکہ جس امر کو کسی وجہ سے اہمیت اور فضیلت حاصل ہو۔ اسی کے لیئے اطلاق پاتا ہے۔ دوسری رنگ میں ہر مقام پر قرآن کریم میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے (اقرب)

سبحان

سبحان اللہ ای ابرئ اللہ من السوء براءۃ۔ سبحان کے معنی عیوب سے پاک سمجھنے اور پاک کرنے کے ہیں (اقرب)

اشرک

یشرکون۔ اشرک کا فعل مضارع ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ جعل لہ شریکا۔ کسی کو کسی کا شریک قرار دیا۔ اور حصہ دار ٹھہرایا۔ (اقرب)

شرک کا باعث خدا پر اور اپنے نفس پر بدظنی ہے

دون

تفسیر۔ شرک کا باعث اصل میں انسانی پیدائش کے مقصد کو نہ سمجھنا ہے۔ مشرک خدا پر بھی بدظنی کرتا ہے اور اپنے نفس پر بھی۔ شرک کے عقیدہ کی بنیاد ہی اس اصل پر ہے۔ کہ خدا تعالیٰ تک ہم بغیر واسطہ کے نہیں پہنچ سکتے۔ اور نہ وہ ہم تک بغیر واسطہ کے پہنچ سکتا ہے اسلام اس تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔ وہ نہ خدا پر بدظنی کرنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ اپنے نفس کی طاقتوں سے مایوسی کی۔ خدا تعالیٰ نے بندہ کو اپنے تک پہنچنے کیلئے پیدا کیا ہے۔ اور وہ اپنے اور اس کے درمیان کسی حائل ہونے والی ہستی کو برداشت نہیں کر سکتا۔

ھؤلاء

نبأ

اتنبئون اللہ بما لایعلم میں شرک کے متعلق کیا ہی لطیف جواب فرمایا ہے۔ کہ اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے

ایک لطیف دلیل

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۚ وَلَوْلَا

اور (تمام) لوگ ایک ہی گروہ (بنے ہوئے) تھے پھر انہوں نے آپس میں اختلاف (پیدا) کر لیا۔ اور جو

كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا

بات تیرے رب کی طرف سے پہلے (بصورت وعدہ) آچکی ہے اگر وہ (مانع) نہ ہوتی تو جس (امر) میں وہ اختلاف کرتے

فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۞ ۲۰

ہیں اسکے متعلق انکے درمیان (کبھی کا) فیصلہ (صادر) کیا جا چکا ہوتا ۵۲

امتہ — اختلف — کلمۃ — قضی — لوگوں کے ایک امت ہونے کے معنی — بندہ کو ہدایت کے لئے پیدا کیا گیا ہے نہ جہنم کو بھرنے کے لئے

آسمان میں یا زمین میں کوئی شفیع ہوتا۔ تو اس کا اعلان خدا کی طرف سے ہونا چاہئے تھا۔ عہدہ دار کی تعیین گورنمنٹ گزٹ سے ظاہر کی جاتی ہے۔ فرمایا بجائے اس کے کہ خدا کی طرف سے علم آتا۔ تم لوگ اعلان کرتے ہو۔ کہ فلاں خدا کا شریک ہو گیا ہے۔ جبکہ تمام نبی بھی جو صرف پیغام بر ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیشہ خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کھڑے کئے جاتے ہیں۔ تو شریک جو خدا تعالیٰ کی بادشاہت میں تمہارے نزدیک ساجھی ہیں۔ کس طرح تمہارے ہاتھوں بنائے جا سکتے ہیں۔ اور الہامی دلیل سے ان کا عہدہ قائم نہیں کیا جاتا پس معلوم ہوا کہ شریک کا علم پہلے تم کو ہوتا ہے۔ اور تم اس کا علم خدا تعالیٰ کو دیتے ہو۔ ایک پتھر کو لیتے ہو۔ اور ایک جگہ رکھ کر اُسے خدا قرار دے دیتے ہو۔ یا ایک کمزور آدمی کو لیتے ہو اور اسے خدائی طاقتیں عطا کر دیتے ہو۔ آسمان اور زمین دونوں کو اس لئے شامل کیا۔ کہ بعض شریک آسمان میں قرار دیئے جاتے ہیں اور بعض زمین میں اس کے بعد سبحانہ سے یہ بتایا کہ انسان کو ایک مقصد کے لئے پیدا کر کے پھر راستہ میں ہو کہیں رکھ دینا۔ اور روکیں بھی ایسی کہ ان کو معلوم کرنے کے لئے کوئی الہامی ہدایت ساتھ نہ ہو۔ یہ ایک کامل ہستی کی شان کے خلاف ہے۔ اس کے تو یہ معنی ہونگے۔ کہ وہ اپنا کام آپ باطل کرتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ بے عیب ہے۔ اس لئے وہ اس بات سے بھی بالا ہے اور وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

۵۲ حل لغات - الامّۃ - الجماعۃ (جماعت - مجتمع گروہ) - الجیل من کل حیّ قوم (اقرب) الطریقۃ - طریقہ - الدّین - مذہب - الحین - وقت القامۃ قد - **اختلف** ضدّ اتفق ایک دوسرے سے اختلاف کیا زیدٌ عمرًا کان خلیفتہ جانشین بنا جعلہ خلفہ دوسرے کو اپنے پیچھے کر دیا اخذہ من خلفہ پیچھے سے پکڑا الی الخلاء تردد الیہ اقرب بہ بار گیا اور آیا۔ **الکلمۃ** - اللفظ لفظ کل ما ینطق بہ الانسان جو کچھ بھی کہا اور بولا جائے (اقرب) **قضی یقضی** بین الخصمین حکم وفصل فیصلہ کیا اقرب

تفسیر - لوگوں کے ایک امت ہونے کے کئی معنے ہیں۔ (۱) ہم نے تو لوگوں کو ابتدا میں ایک ہی راہ پر چلایا تھا۔ پھر وہ بگڑ گئے۔ جس کے معنی یہ ہوئے۔ کہ ہم نے تو انسان کے اندر ہدایت کا مادہ رکھا تھا۔ اور صحیح راستہ بھی بتا دیا تھا۔ مگر انسان خود ہی اس راستہ کو چھوڑ کر گمراہی کی طرف چل پڑا۔ ان معنوں سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو ہدایت کے لئے پیدا کیا ہے۔ تبھی تو اسے ہدایت دی۔ اگر دوزخ کے لئے پیدا کیا ہوتا۔ جیسا کہ بعض لوگ آیات قرآنی کو نہ سمجھتے ہوئے خیال کرتے ہیں۔ تو ابتدا میں انسانوں کو جہنمی راہ پر چلانا چاہیئے تھا۔ پھر ان میں سے جو نکل کر

وَيَقُولُونَ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ءَايَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا

اور وہ کہتے ہیں کہ اس (رسول) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشان کیوں نہیں اتارا گیا۔ اسلئے تو (انہیں) کہہ (کہ اس)

ٱلْغَيْبُ لِلَّهِ فَٱنتَظِرُوٓا۟ إِنِّى مَعَكُم مِّنَ ٱلْمُنتَظِرِينَ ۝ ع ۲/۱۰ ۲۱

غیب (کی بات کا علم) اللہ (تعالیٰ) ہی کے پاس ہے۔ اس لئے تم (اسکا) انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ۱۲۵

جنتی بن جاتے انہیں جنت میں داخل کردیا جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ (۲) لوگ ہمیشہ نبیوں کے ذریعہ سے ایک طریقہ پر قائم کئے جاتے ہیں۔ ہم نبی بھیجکر انہیں راہ راست پر لاتے ہیں۔ مگر وہ پھر اختلاف کر بیٹھتے ہیں۔ اگر ہم نے یہ وعدہ نہ کیا ہوتا۔ کہ عذاب بغیر تنبیہ کے نہ آئے گا۔ تو ہم انہیں ہلاک کر دیتے۔ مگر وعدہ ہے۔ اس لئے ہم پھر نبی بھیجتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ان کو مان کر ان کے ہاتھوں پر جمع ہو جاتے ہیں اور پھر کچھ عرصہ کے بعد اختلاف کر بیٹھتے ہیں۔ ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ نبی کے ذریعہ سے قائم شدہ اتحاد کو مٹانے والا دنیا کی تباہی کو بلاتا ہے۔ اسلئے وہ سخت عذاب کا مستحق ہے۔ (۳) لوگ ہمیشہ ایک ہی راہ اختیار کرتے ہیں۔ پہلے لوگوں نے بھی نبیوں کی مخالفت کی۔ اور ان کے ساتھ توافق نہ کیا۔ اب یہ بھی ویسا ہی کرتے ہیں۔ اگر ہمارا یہ فیصلہ نہ ہوتا۔ کہ انسان کو ہدایت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور رحم غالب رہیگا۔ تو اس جرم کی وجہ سے ان کا فیصلہ ہی کر دیتے۔

۱۲۵ حل لغات۔ الغیب کل ما غاب عنک ہر پوشیدہ چیز۔ السر (راز) ما غاب عن العیون (آنکھوں سے پوشیدہ چیز) (اقرب)

تفسیر۔ اس جگہ من ربہ بینۃ کے قائم مقام ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دلیل آتی ہے وہ بینہ ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنے مطلب کی طرف خود بلاتی ہے گویا بولتی ہوئی دلیل ہوتی ہے۔ ہمیشہ سے انبیاء کے دشمن کہتے آئے ہیں۔ کہ ان کے ساتھ کوئی دلیل نہیں اُتری۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے۔ کہ یہ سورۃ تو شروع ہی تلک اٰیات الکتٰب الحکیم سے ہوتی ہے۔ (یعنی یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں)۔ مگر مخالفین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں۔ کہ اس پر کوئی آیت نہیں اُتری۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ آیات ہر شخص کو نظر نہیں آیا کرتیں۔ ان کے دیکھنے کے لئے بھی خشیت اللہ کی آنکھ کی ضرورت ہے۔ ورنہ کس طرح ممکن تھا۔ کہ آیات کے نازل ہونے کے بعد بھی وہ یہ مطالبہ کرتے۔ کہ اس پر اگر آیات نازل ہوتیں۔ تو کیا اچھا ہوتا۔ آج بھی بانئے سلسلۂ احمدیہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مخالف علماء یہی کہا کرتے ہیں کہ اگر ان پر کوئی آیت اترتی۔ تو ہماری عقل ماری تھی کہ نہ مانتے۔ مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کی بھی تو عقل نہ ماری ہوئی تھی۔ کہ انہوں نے نہ مانا۔ ان کے راستہ میں بھی یہی روک تھی۔ کہ انہوں نے خدا تعالےٰ کے خوف سے کام نہ لیا۔ پس ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا

آنحضرت کو نشان عطا ہوئے عذاب کا مستحق ہے

یہ بات بھی یاد رکھنے والی ہے۔ کہ جب کفار کی طرف سے آیت کا مطالبہ ہو۔ تو اس کے معنی عذاب ہی کے ہوتے ہیں بجز اس جگہ کے جہاں وہ آیۃ کی تشریح کر دیں۔ پس اس آیت میں ان کی یہ مراد بھی ہو سکتی ہے۔ کہ خدا کی طرف سے اس کی تائید میں کوئی عذاب کیوں نہیں آتا۔

آیۃ بمعنی عذاب

خدا کے بھیجے سب نشان ہوتے ہیں

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ

اور جب لوگوں کو کسی تکلیف کے بعد جو انہیں پہنچی ہو ہم کسی (قدر اپنی) رحمت (کا مزہ) چکھاتے ہیں تو جھٹ ہمارے نشانوں کے متعلق ان کی

اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ

طرف سے کوئی (نہ کوئی مخالفانہ) تدبیر ہونے لگتی ہے۔ تو (انہیں) کہہ (کہ اس کے مقابل پر) اللہ کی تدبیر (اس سے کہیں)

۲۲ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ○

زیادہ جلد (کارگر) ہوا کرتی ہے۔ (اور) تم جو تدابیر (بھی) کرتے ہو۔ ہمارے فرستادے (اسے) لکھتے (رہتے ہیں) ۲۲

پیشگوئیوں میں وقت کی تعیین ضروری نہیں ہوتی

انما الغیب للہ کے فقرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پیشگوئیوں میں وقت کی تعیین کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ اگر اس کی ضرورت ہوتی تو یہ نہ کہا جاتا۔ کہ عذاب کی پیشگوئی کے وقت کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ بلکہ ان کے سوال کے جواب میں اس وقت سے۔ ان کو آگاہ کیا جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ یہی کہہ دیا ہے کہ وقت کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ جب وہ وقت آئیگا۔ وہ خود حقیقت کو ظاہر کر دے گا۔ اس آیۃ سے ان لوگوں کو اپنے خیالات کی اصلاح کرنی چاہیئے۔ کہ جو یہ ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ پیشگوئی کے ساتھ وقت کی تعیین ہونی ضروری ہے جب ایک امر غیر معمولی طور پر اتفاق اور حادثہ کے شبہ سے بالا رہتے ہوئے پورا ہو جائے۔ تو اس کے ماننے میں کسی سعید انسان کو انکار نہیں ہونا چاہیئے۔ اور وقت کی رٹ لگانا صرف ضد اور ہٹ دھرمی کو ظاہر کرتا ہے۔

اذاق

ضرّاء

مکر

وکھ اٹھیں... ہیں اور عذا... کفار کرتے ہیں۔

انی معکم من المنتظرین۔ کہکر کافروں جو عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ نہایت لطیف جواب ہے۔ کہ عذاب کے جلدی نہ آنے سے گھبراہٹ تو مجھے ہونی چاہیئے تھی۔ جو آئے دن تمہارے ظلموں کا نشانہ بن رہا ہوں۔ نہ کہ تم لوگوں کو جو آرام سے گھروں میں بیٹھے ہو۔ مجھے مارا اور پیٹا جاتا ہے۔ گھر سے باہر نکلنے سے روکا جاتا ہے۔ مگر میں اطمینان سے انتظار کرتا ہوں۔ اور گھبرا تم رہے ہو۔ کہ عذاب کیوں جلدی نہیں آتا۔ نادانو! جب میں انتظار کرتا ہوں تو تمہارے لئے انتظار کرنا کیوں دوبھر ہو رہا ہے۔

۲۲ حل لغات۔ اذقنا۔ اذاقہ سے نکلا ہے۔ جو آگے ذاق سے نکلا ہے۔ ذاق المکروہ۔ نزل بہ فقاساہ۔ اس پر مصیبت نازل ہوئی۔ اور اس نے سہی۔ ویستعمل الذوق فیما یحمد و یکرہ۔ اور ذوق کا لفظ اچھی اور بری دونوں باتوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اذاقہ کے معنی ہیں۔ صیرہ یذوق۔ اسے چکھایا یا پہنچایا (اقرب) الضرّ اء الشدۃ۔ سختی۔ النقص فی الاموال والانفس مال میں یا جانوں میں کمی کا واقع ہونا۔ الزمانۃ یعنی آفت و مصیبت۔ کسی عضو کا کٹ جانا۔ یا ضائع ہو جانا۔ الضراء اسم مؤنث ہے۔ اس کا مذکر کوئی نہیں (اقرب)

المکر۔ الغِرّۃ۔ دھوکہ۔ جزاء المکر۔ یسمی بہ کما سمّی جزاء السیئۃ مجازا علیٰ مقابلۃ اللفظ باللفظ فریب کے بدلہ کو بھی مکر کہتے ہیں۔ اور اس کا نام مکر اسی طرح رکھا گیا ہے۔ جس طرح سیئۃ کے بدلہ کو سیئۃ مجازاً کہتے ہیں۔ عرب کے عام دستور کے مطابق کسی فعل کے مقابل پر اس کے بدلہ کے ذکر کے لئے بھی

اسی فعل کا لفظ استعمال کر لیتے ہیں (اقرب) مَکَرَ اللّٰہ فلاناً جازاہ علی المکر ۔ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو اس کے مکر کا بدلہ دیا قیل المکر صرف الانسان عن مقصدہٖ بحیلۃ ۔ مکر کے اصل معنی یہ بھی بیان کئے گئے ہیں ۔ کہ کسی شخص کو کسی تدبیر کے ذریعہ سے اس کے مقصد سے دور کر دینا اور ہٹا دینا وھو نوعان محمودٌ یقصد فیہ الخیر و مذموم یقصد فیہ الشر اسکی دو قسمیں ہیں ایک محمود جس میں بھلائی مقصود ہوتی ہے ۔ دوسری مذموم جس میں برائی مقصود ہوتی ہے ۔ (اقرب)

تفسیر ۔ اس سے دو آیات پہلے فرمایا تھا کہ چونکہ انسان کو ہم نے رحمت کے لئے ہی پیدا کیا ہے ۔ اس لئے ہم اپنے عہد کی وجہ سے لوگوں پر رحمت ہی کرتے ہیں ۔ اس کے بعد کی آیت میں فرمایا کہ لوگ عذاب مانگتے ہیں مگر باوجود اُن کے مطالبہ کے ہم عذاب فوراً نہیں بھیجتے ۔ بلکہ انتظار کے بعد بھیجتے ہیں تاکہ جنہوں نے ہدایت پانی ہے پالیں اب اِس آیت میں فرماتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ ہم عذاب دیر سے بھیجتے ہیں ۔ بلکہ عذاب بھیجنے کا ہمارا طریقہ بھی یہی ہے کہ عذاب یک دم نہیں آتا ۔ بلکہ کسی قدر عذاب آجاتا ہے پھر ہم اس عذاب کو ہٹا دیتے ہیں ۔ تاکہ لوگ یہ سمجھ جائیں کہ عذاب انکار نبوت کی وجہ سے آسکتا ہے ۔ اور آئے گا اور اپنے ناپسندیدہ رویہ اور بیوجہ ظلم سے باز آجائیں ۔ لیکن شریر طبع لوگ پھر بھی نصیحت نہیں حاصل کرتے ۔ بلکہ عذاب کے وقت تو کسی قدر ڈر جاتے ہیں ۔ مگر جس وقت عذاب میں کمی ہوتی ہے ۔ معاً پھر ہمارے کلام اور ہمارے نشانات کے خلاف تدابیر اختیار کرنے لگتے ہیں ۔ فرماتا ہے کہ اللہ کی تدبیر تو بہت جلد نافذ ہو جاتی ہے ۔ مگر وہ خود ہی اپنی تدبیر کو روکے رکھتا ہے ۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ نہ تو ان لوگوں کے کام مجھے بھول سکتے ہیں ۔ کہ فوراً بدلہ دینے کی ضرورت ہو ۔ اور نہ ان کی سزا پر قابو پانے کا کوئی خاص وقت ہوتا ہے کہ وہ سمجھے کہ اس وقت سزا دیدوں ۔ ورنہ پھر مشکل ہوگی ۔ وہ ہر وقت سزا دے سکتا ہے اور کوئی بات اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہوتی +

انسان کا آرام کی گھڑیوں کو ہمیشہ کے لئے سمجھنا [۲]

اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے ۔ کہ انسانی فطرت ایسی ہے ۔ کہ جب اسے آرام پہنچے ۔ تو وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے ۔ کہ اب رحمت ہمیشہ ہی رہیگی ۔ حالانکہ اگر آرام کے وقت انسان تکلیف کی گھڑیوں کا خیال کرے ۔ تو بہت آرام میں رہ سکتا ہے ۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس گُر کو نہ سمجھا ۔ اور آج اس ذلت کو پہنچ رہے ہیں ۔ بلکہ اب بھی وہ اس اصل کو یاد نہیں رکھتے اور اپنے روپیہ اور مال کا خیال نہیں رکھتے اور اسراف سے کام لیتے ہیں ۔ یا پھر ایسے بخل سے کام لیتے ہیں ۔ کہ جو نتیجہ کے لحاظ سے ویسا ہی تباہ کن ہوتا ہے ۔ جیسا کہ اسراف ۔

عذاب بھیجنے میں تدریج اور لوگوں کا اس سے فائدہ نہ اٹھانا [۱]

عذاب کے بعد رحمت کے آنے سے لوگوں کا اس عذاب کو بھلا دینا [۳]

دوسرے اس آیت میں کفار کے پہلے سوال کا جواب بھی دیا گیا ہے ۔ کفار کا سوال تھا کہ اگر یہ سچا ہے تو آیت یعنی عذاب کیوں نہیں آتا ۔ اس کا جواب دیا ۔ کہ عذاب تو کئی آچکے ہیں ۔ مگر چونکہ ہم اپنی سنت کے مطابق اس کے بعد رحمت بھیج دیتے ہیں ۔ تم لوگ اپنی شقاوت کی وجہ سے عذاب کو بھول جاتے ہو ۔ اور پھر عذاب کا مطالبہ کرنے لگتے ہو ۔ افسوس کہ اس مرض میں اس وقت مسلمان بھی مبتلا ہیں ۔ آفت پر آفت ان پر ٹوٹ رہی ہے ۔ لیکن خدا تعالیٰ کی سنت کے مطابق جب رحمت کی ساعت درمیان میں آجاتی ہے ۔ تو وہ پھر غافل ہو جاتے ہیں ۔ اور اپنی نجات کی فکر سے آزاد ہو جاتے ہیں ۔

اسرع مکرا کے معنی [۲]

قُلِ اللّٰہُ اَسْرَعُ مَکْرًا میں بتایا ہے ۔ کہ تمہاری تدبیروں کا اثر تو نکلتے ہی نکلے گا ۔ مگر خدا کی تدبیریں تمہاری تدبیروں سے پہلے ہی اثر دکھائینگی ۔ تم جو تدابیر کرتے ہو ۔ ان کے نتائج تمہارے خلاف ساتھ ساتھ مترتب ہوتے جاتے ہیں ۔ جوں جوں تم تدبیریں کرتے ہو ۔ ہم ساتھ کے ساتھ ان کے توڑ پیدا کرتے جاتے ہیں ۔ لیکن ہماری تدابیر ایسی سریع ہوتی ہیں ۔ کہ تمہارے

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ

وہ (خدائے کریم) وہی ہے کہ جو تمہیں (توفیق دیکر) خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم (لوگ)

فِي الْفُلْكِ ج وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا

کشتیوں میں (سوار) ہوتے ہو اور وہ عمدہ ہوا کے ذریعہ سے ان (لوگوں) کو (بھی) لیکر چل رہی ہوتی ہیں اور وہ اس پر اترا رہے ہوتے ہیں

بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ

تو ان پر ایک (تند) تیز ہوا آجاتی ہے۔ اور ہر طرف سے موج (پر موج) ان پر (چڑھ) آتی ہے۔

مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ لا دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ

اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ (اب) وہ ہلاکت (کے گھیرے) میں آگئے ہیں تو (ایسے وقت میں) وہ اللہ تعالیٰ کو اسکے لئے (اپنی) اطاعت

لَهُ الدِّينَ ۚ لَئِنْ أَنْجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ

کو خالص کرتے ہوئے پکارتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ اے اللہ) اگر تو نے ہمیں اس (مصیبت) سے نجات دی تو ہم ضرور ہی

مِنَ الشَّاكِرِينَ ○ ٢٣

(تیرے) شکرگذاروں (کے زمرہ) میں (داخل) ہو جائینگے ٢٣

ہوشیار ہونے سے پہلے ان کے نتائج نکل آتے ہیں +

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جب عذاب آتا ہے۔ تو ظالم کے ساتھ نیک کیوں پس جاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ چند لوگوں کی ہدایت کے لئے لاکھوں شریروں کو بھی امن دیا جاتا ہے۔ اگر ظالموں کے ساتھ بعض نیک لوگوں کو بھی تکلیف پہنچتی ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے۔ مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے ایک کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے اور ایک کے دکھ سکھ میں دوسرے کو بھی ایک حد تک شریک ہونا پڑتا ہے۔ پس جب عذاب آتا ہے۔ تو جس قوم پر عذاب آتا ہے اس کے ساتھ رہنے والوں کو ان کی معیت کی وجہ سے کچھ نہ کچھ تکلیف اٹھانی پڑتی ہے +

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں رحمت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن ضرّار کو نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمت خدا کی طرف سے آتی ہے۔ اور ضرّار انسانی اعمال کے نتیجہ میں آتی ہے۔

اذا لهم مكر في اياتنا میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہم ان پر احسان کرتے ہیں۔ اور وہ اسلئے اس احسان کو ہمارے خلاف استعمال کرنے لگتے ہیں مثلاً ہم اموال وغیرہ انہیں دیتے ہیں۔ تو وہ ان اموال کو ہمارے رسول اور ہماری تعلیم کے خلاف استعمال کرتے ہیں +

٢٣ حل لغات سیّر۔ سار کے باب تفعیل سے ہے اور اسکے معنی چلانے کے ہیں۔ اور سار کے معنی ہیں چلا۔ الفلك۔ السفينة۔ کشتی يُؤَنَّثُ وَيُذَكَّرُ۔ یہ لفظ کبھی مونث استعمال ہوتا ہے اور

عذاب کے وقت ظالموں کے ساتھ بعض نیک کیوں پکڑے جاتے ہیں

کفار کا خدا کے احسانات کو اس کی مخالفت کا آلہ بنانا

سیّر

الفلک

اللہ تعالیٰ کا رحمت کو اپنی طرف منسوب کرنا اور ضرار کو نہ کرنا

فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ

پھر جب وہ انہیں (اس سے) نجات دیکر خشکی پر پہنچا دیتا ہے۔ تو جھٹ وہ زمین میں

الْحَقِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ۙ

ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں (اے لوگو) تمہارا صرف ورلی زندگی کو چاہنا تمہارے نفسوں پر

کبھی مذکر اور واحد کے لئے بھی اور جمع کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے (اقرب) عاصِف عَصَفَ يَعْصِفُ عَصْفًا سے نکلا ہے۔ عَصَفَ الزرعَ جزّہ قبل ان یدرك۔ اس نے کھیت کو اس کے پکنے سے پہلے کاٹ دیا۔ عَصَفَتِ الریحُ تَعْصِفُ عَصْفًا وعصوفًا اِشْتدّت۔ ہوا تیز ہوگئی۔ والعاصِفُ المائل من کل شئ ٹیڑھی چیز (اقرب) ظنّ کے معنی یقین کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور گمان کے بھی۔ الظّن هو الاعتقاد الراجح مع احتمال النقیض ویستعمل فی الیقین و الشك (اقرب) یعنی ظن کے معنی عام طور پر غالب خیال کے ہوتے ہیں۔ جس کے ساتھ اس کے خلاف کا احتمال بھی ہوتا ہے۔ اور نیز یہ لفظ یقین کے اور شک کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ احاط بالامر احدق به من جوانبه اسے ہر طرف سے گھیر لیا۔ اُحِیطَ به دنا هلاکه اس کی ہلاکت کا وقت آگیا۔ (اقرب) الدّین۔ الجزاء والمکافات۔ بدلہ الطاعۃ۔ اطاعت۔ الذُّل۔ ذلت ناحق۔ الحساب۔ محاسبہ۔ القهر والغلبة والاستعلاء۔ کامل غلبہ۔ والسّلطان والملك والحكم بادشاہت اور حکومت۔ التدبیر۔ تدبیر۔ انتظام واسمٌ لجمیع ما یعبد به الله۔ تمام وہ طریق جن سے کوئی قوم خدا تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے۔ الملّة مذہب وکیش یعنی شریعت۔ الورَع۔ نیکی۔ القضاء نعبد (اقرب) اس لفظ کے بعض معانی جو یہاں چسپاں نہ ہوتے تھے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

سمندر کے سفر کی تمثیل

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ سلسلہ سزا اور فضل کا برابر چلتا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف سے بھی شرارت کا جب آرام ہو۔ اور ناقص رجوع کا جب سزا کا وقت ہو۔ لیکن یہ لوگ کبھی خیال نہیں کرتے کہ جس طرح نرم ہوا ہی کسی وقت سخت ہوکر ہلاکت کا موجب ہوجاتی ہے کہیں یہ فضل ہی ہماری تباہی کی صورت اختیار نہ کرے۔ در مخترضین کو خشکی اور تری کے حالات کیطرف توجہ دلائی ہے۔ اور پھر مثال کے طور پر سمندر کے سفر کو لیا ہے کیونکہ پانی کو الہام الٰہی سے مناسبت ہے اور بتایا ہے کہ سمندروں میں جسطرح نرم ہوا کسی وقت طوفان بنجاتی ہے اسیطرح انبیاء کے مخالفوں کو جو وقفہ ملتا ہے اسے عذاب کا دور ہوجانا نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ ڈرنا چاہیئے کہ یہ سکون کسی سخت طوفان کا پیش خیمہ نہ ہو اور بتایا ہے کہ جب ایسا عذاب آتا ہے تو تم لوگوں کے دل نرم ہوجاتے ہیں اور تم خیال کرتے ہو۔ کہ تدبیر اللہ تعالیٰ ہی کی چلتی ہے اور آئندہ اصلاح کے بڑے بڑے اقرار کرتے ہو۔ لیکن کیا یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی ہے؟ اس کا جواب اگلی آیت میں دیا ہے۔ آیت کو شروع خطاب کی ضمیر سے کیا تھا۔ لیکن اس جگہ میں غائب کی ضمیر استعمال کی ہے۔ اسمیں ایک لطیف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے حصہ میں چونکہ مومن و کافر سب شامل تھے سب ہی کیلئے خدا تعالیٰ نے خشکی و تری کے سفروں کے سامان پیدا کئے ہیں۔ اس لئے وہاں تو تم کہکر مسلمانوں کو بھی شامل رکھا۔ لیکن اس جگہ یہ بتایا ہے۔ کہ پھر ایک حصہ ناشکر گذاری کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔ اس وجہ سے ضمیر بدل دی اور فرمایا کہ جب انہیں لیکر کشتیاں چلتی ہیں۔ تو پھر وہ یہ نمونہ دکھاتے ہیں کہ عذاب کے وقت تو رجوع دکھاتے ہیں اور فضل کے وقت روگردانی کرتے ہیں ؛

عصف

ظن

احاط

ضمیر خطاب کے بعد ضمیر غائب لانے کی وجہ

الدین

مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ

(وہاں بھگتنا) پڑے گا ۔ پھر ہماری طرف تمہاری واپسی ہوگی

فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ۲۴

تب جو (کچھ کہ) تم کرتے رہے ہوگے۔ ہم اس سے تمہیں آگاہ کریں گے ۲۴

۲۴ حل لغات۔ بَغٰی۔ يَبْغِيْ بَغْيًا وَّبُغَاءً وَّ بُغْيَةً وَّبِغْيَةً۔ طلبہٗ۔ اسے طلب کیا۔ ڈھونڈا۔ الامۃ زنت جب لونڈی کے متعلق آئے۔ تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہ اس نے زنا کیا۔ فلانٌ عَدَا عن الحق۔ واستطال وظلمہ جب کہا جائے۔ فلاں شخص نے بغاوت کی ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ اس نے انصاف کو چھوڑ کر دوسرے شخص پر ظلم کیا (اقرب) المتاع۔ کل ماینتفع بہ من الحوائج کا لطعام و اثاث البیت والسلع وہ تمام اشیاء جن سے ضرورت کے وقت فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ متاع کہلاتی ہیں۔ جیسے کھانا۔ گھر کا سامان فروخت کی چیزیں وغیرہ۔ وقیل ما ینتفع بہ من عروض الدنیا قلیلھا وکثیرھا ماسوی الفضۃ والذھب اور بعض کے نزدیک دنیا کا سب سامان جس سے نفع اٹھایا جاتا ہے۔ وہ متاع ہے۔ خواہ تھوڑا ہو۔ خواہ بہت۔ سوائے سونے چاندی کے۔ وعرفا کل ما یلبسہ الناس ویبسطہ اور عرف عام میں متاع ان کپڑوں کو کہتے ہیں۔ جو انسان پہنتا ہے یا فرش وغیرہ جو بچھائے جاتے ہیں۔ وفی الکلیات المتاع والمتعۃ ما ینتفع بہ انتفاعا قلیلا غیر باق بل ینقضی عن قریب یعنی کلیات میں ہے کہ متاع اور متعہ اس چیز کو کہتے ہیں۔ جس سے قلیل فائدہ حاصل کیا جاتا ہو۔ اور جس کا فائدہ مستقل نہ ہو۔ بلکہ جلد ہی ختم ہو جائے ۔ اصل المتاع ما یتبلغ بہ من الزاد متاع اصل میں وہ زاد ہے کہ جس کے ذریعہ سے منزل مقصود تک پہنچا جائے۔ (اقرب)

بغٰی

۲ شریعت کوئی چٹی نہیں

۱ متاع

۳ اللہ تعالیٰ وہی احکام دیتا ہے جو انسان کے لئے نافع ہوں

۴ انبیاء کے مخالفین کی ظاہری ترقی

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ کہ مصیبت کے وقت تو تم رجوع کا وعدہ کرتے ہو۔ لیکن جب ہم مصائب کو ٹلا دیتے ہیں۔ تو پھر تم فساد اور ظلم کی راہ اختیار کر لیتے ہو۔ مگر اس قدر نہیں سمجھتے کہ وہ فساد اور وہ ظلم خود تمہارے ہی خلاف پڑتا ہے۔ کیونکہ شریعت کے احکام کوئی چٹی نہیں ہیں کہ ان سے بچکر انسان یہ خیال کرلے کہ میں ایک مصیبت سے بچ گیا ہوں۔ بلکہ وہ تو انسان کو ہلاکت سے بچانے کے لئے آتے ہیں۔ پس جو ان سے بچتا ہے اور دور بھاگتا ہے۔ اس کا نقصان خود اسی ہی ہوتا ہے۔ اور جس وقت وہ اپنی کامیابی پر فخر کر رہا ہوتا ہے تو مستقبل اس کے بدانجام پر روتا ہے ÷

انما بغیکم علیٰ انفسکم میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اسلام شریعت کو لعنت نہیں۔ بلکہ رحمت قرار دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ صرف وہی احکام دیتا ہے۔ جو انسان کے نفع کے لئے ہوں۔ پس ان سے بھاگنا خود انسان کے لئے تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ جیسے کوئی شخص طبیب کے نسخہ کے خلاف کرے۔ تو اس کی بیماری بڑھیگی۔ اور وہ تکلیف اٹھائیگا۔

متاع الحیٰوۃ الدنیا سے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ شریعت کو توڑ کر اور نبیوں کی مخالفت کرکے کیوں انسان بعض وقت ترقی بھی کرتا ہے۔ اور اسے فائدہ بھی پہنچ جاتا ہے۔ جواب یہ دیا ہے۔ کہ بعض اعمال

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ

اس ورلی زندگی کی حالت (تو) اس پانی کی طرح ہے جسے ہم نے بادل سے برسایا

فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَ

پھر اس کے ساتھ زمین کی روئیدگی جسے آدمی اور (نیز) چار پائے کھاتے ہیں مل (کر گھُن)

الْأَنْعَامُ حَتّٰى إِذَآ أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَ

ہو گئی یہاں تک کہ جب زمین نے (اسکے ذریعے) اپنی کمال درجہ کی زینت کو پا لیا۔ اور خوبصورت ہو گئی اور

ظَنَّ أَهْلُهَآ أَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ أَتٰهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا

اُس کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ (اب) وہ اس پر قابو یافتہ ہیں۔ تو اس پر دن کو یا رات کو (عذاب کے متعلق) ہمارا

أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ

حکم آ گیا اور ہم نے اسے ایسا کر دیا۔ کہ گویا وہ ایک کٹا ہوا کھیت ہو گیا (ہے اور) کل (کچھ) تھا ہی نہیں (غرض) جو لوگ سوچ سے

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ ۲۵

کام لیتے ہیں۔ ان کے لئے ہم اسی طرح پر (اپنی) آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں ؏۲۵

کرنے کے وقت لذیذ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر جب کچھ عرصہ کے بعد ان کا نتیجہ نکلتا ہے۔ تو وہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک بدپرہیز بیمار جسوقت بدپرہیزی کرتا ہے تو اس وقت تو وہ لذت ہی حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ اگر اسوقت اُسے تکلیف ہو تو وہ بدپرہیزی کرے ہی کیوں۔ لیکن بعد میں جب بیماری بڑھتی ہے۔ تو اسے معلوم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیوی اموال کا نام متاع رکھکر اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ کہ وہ دنیا کے اموال اور سامان درحقیقت زادِ راہ کے طور پر ہیں جس طرح وہ شخص جو زادِ راہ کو ضائع کرنے۔ نقصان اٹھاتا ہے۔ اسیطرح وہ شخص جو ان اموال کو بجائے اس غرض میں استعمال کرنے کے جسکے لئے وہ پیدا کئے گئے ہیں۔ دوسری اغراض میں خرچ کر دیتا ہے۔ نقصان اٹھاتا ہے اور اپنی زندگی کے مقصد یعنی لقاء الٰہی سے محروم رہ جاتا ہے۔

المثل

۲۵ حل لغات۔ اَلْمَثَلُ۔ الشِبہ والنظیر۔ مشابہ اور نظیر۔ الصِّفۃ حالت بیان۔ الحُجَّۃ۔ دلیل ثبوت۔ الحدیث بات۔ القول السائر ضرب المثل (اقرب) اِختلط خلط میں سے باب افتعال کی ماضی ہے۔ اس کے معنی ہیں۔ امتزج مل جل گیا۔ الجمل۔ سمن موٹا ہو گیا۔ الظلام اعتکر سخت تاریک ہو گیا (اقرب) انعام۔ نَعَم کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں۔ الابل۔ اونٹ۔ الشاۃ بکری وقیل خاص بالابل یعنی بعض کے نزدیک نعم صرف اونٹ کے لئے خاص ہے۔ قال ابو عبیدۃ۔ النعم الجمال

اختلط

متاع کے لفظ میں امور ترک کرنے کی تعلیم

انعام

فقط۔ مؤنث و مذکر۔ ابوعبیدہ کا قول ہے۔ کہ نعم صرف اونٹوں کو کہتے ہیں اور یہ لفظ مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے و قیل یطلق الانعام علیٰ ھٰذہ الثلاثۃ الابل والبقر والغنم۔ فاذا انفردت البقر والغنم لم تسم الانعام۔ اور بعض کے نزدیک اونٹ گائے بکری ان تینوں کے متعلق جب اکٹھا ذکر ہو تو نعم بول سکتے ہیں۔ اور اگر اکیلی بکریاں ہوں۔ یا گائے اور بکریاں ہوں یا اکیلی گائے ہوں تو ان کے لئے نعم کا لفظ نہیں بول سکتے۔ (اقرب) الزخرف۔ الذھب سونا کمال حسن الشئی کسی چیز کی خوبصورتی کا کمال۔ الزخرف من الارض الوان نباتھا جب زمین کے متعلق یہ لفظ بولیں تو اس کی سبزیوں کے اقسام اور رنگ مراد ہوتے ہیں (اقرب) الحصید۔ مقطوع بالمناجل۔ جیسے درانتیوں سے کاٹا جائے المستاصل جڑ سے اکھاڑی ہوئی چیز (اقرب) غَنِیَ بالمکان اقام بہ مکان میں ٹھہرا۔ لم تغن نہ ٹھہرا۔ گویا اس کا وجود ہی نہ تھا۔

روحانی کلام کو پانی سے تشبیہ

زخرف

حصید

فائدہ اٹھانا فکر پر موقوف ہے

غنی

تفسیر۔ یہ ایک تمثیل ہے فرمایا۔ کہ ورلی زندگی کی حالت بالکل پانی کی سی ہے۔ جیسے پانی آسمان سے اترتا ہے۔ اور اس سے زمین میں رنگا رنگ کی سبزیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کوئی تو انسانوں کے کھانے کے کام آتی ہے۔ اور کوئی حیوانوں کے۔ اس شادابی کو دیکھ کر انسان بجائے اس کے کہ وہ یہ سمجھے کہ یہ سب کچھ خدا کے فضل سے ہوا ہے یہ خیال کرنے لگتا ہے۔ کہ یہ ہماری ہی طاقت اور ہنر سے پیدا ہوا ہے۔ جس وقت اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ میں ان کے اگانے پر قادر ہوں تو اتاھا امرنا۔ اچانک ہمارا عذاب آجاتا ہے۔ جو اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ وہ تو یہ دعویٰ کرتا تھا۔ کہ میں خود اگاتا تھا۔ لیکن عذاب آنے کے وقت اس کو محفوظ بھی نہیں رکھ سکتا۔ یعنی جب قوم میں کبر اور خود پسندی پیدا ہوتی ہے تو ان کی تباہی کا وقت آجاتا ہے

حیاۃ دنیا کی ایک تمثیل

خدا کے کلام سے لوگوں کا برے اور بھلے دونوں قسم کے نتائج نکالنا

اس آیت میں روحانی کلام کو پانی سے مشابہت دی ہے۔ کلام الٰہی جب نازل ہوتا ہے۔ تو دنیا میں تغیرات پیدا ہونے لگ جاتے ہیں۔ اور قسم قسم کے علوم نکلنے لگتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم کے نزول کے بعد۔ اولیاء محدث۔ فلسفی وغیرہ ہر قسم کے اہل علم انسان پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ جب وہ زمانہ آیا۔ کہ مسلمانوں نے سمجھ لیا کہ انھم قادرون علیھا کہ یہ علوم انہوں نے خود ہی ایجاد کئے ہیں۔ تو وہی مسلمان جو بڑے بڑے ماہر علوم سمجھے جاتے تھے ذلیل ہو گئے۔ حق تو یہ ہے۔ کہ جو موجب بھی خدا کی طرف سے آتا ہے۔ وہی تغیر پیدا کرتا ہے۔ اور جب وہ موجب نظروں سے دور ہو جاتا ہے۔ تو لوگ خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہماری طرف سے ہوا ہے ؎

فکر۔ کے معنی ہیں ماضی کے حالات کے تسلسل کو ذہن میں قائم رکھنا۔ پس فرمایا۔ کہ جو لوگ گذشتہ حالات کو ذہن میں رکھتے ہیں۔ وہی فائدہ اٹھاتے ہیں اور جو اس تسلسل کو قائم نہیں رکھتے۔ وہ فائدہ نہیں اٹھاتے۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے۔ کہ ہر ایک قوم میں خواہ وہ انبیاء سے کس قدر بھی قریب کیوں نہ ہو۔ اچھے برے آدمی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن جب تک خشیت قائم رہتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر توکل رہتا ہے۔ قوم ہلاک نہیں ہوتی۔ مگر جب قوم میں خود پسندی اور کبر پیدا ہو جائے۔ تو وہ تباہ کر دی جاتی ہے۔ پس نبی کا مقابلہ نہ کرو۔ کہ یہ خود پسندی کی علامت ہے۔ اور خود پسند تباہ کر دیا جاتا ہے ؎

اس جگہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو کلام نازل ہوتا ہے اس سے لوگ برے اور بھلے دونوں قسم کے نتائج پیدا کر لیتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی غرض اس کلام کے نازل کرنے سے یہی ہوتی ہے کہ لوگ اس سے حقیقی آرام کی جگہ کو حاصل کریں ؎

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

اور اللہ (تعالیٰ) سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جسے پسند کرتا ہے (اسے) ایک

اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى ٢٦

سیدھی راہ پر چلا کر منزل مقصود پر پہنچا دیتا ہے ٢٦ؐ ان لوگوں کے لئے جنہوں نے نیکوکاری اختیار کی بہترین انجام ہوگا

وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ

اور (اسپر) مزید (انعامات بھی) اور ان کے چہروں پر نہ غبار چھائیگا اور نہ ذلت (کے آثار ہونگے)

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ٢٧

یہ لوگ) جنت (میں رہنے) والے ہیں وہ اس میں رہا کریں گے ٢٧ؐ

٢٦ؐ حلّ لغات - السلام - اس کے معنی پہلے آچکے ہیں - دار السلام جنت کو بھی کہتے ہیں (اقرب)

تفسیر - اللہ پر توکل کرنے والے کی حالت مستقل ہوتی ہے - سب اشیاء اس کی سلامتی چاہتی ہیں کامل مطیع کے لئے لوگ دعائیں کرتے ہیں - کیونکہ وہ دنیا کے لئے مفید ہوتا ہے - سلام کے معنی اطاعت کے بھی ہیں - اس صورت میں معنی یہ ہوئے - کہ اسکو فرمانبرداری کے مقام پر کھڑا کر دیتا ہے یعنے اسے اس حال سے نکال کر مقام تک لے آتا ہے - اور چونکہ سلام کے معنی جنت کے بھی ہیں - اس لئے یہ معنی بھی ہوئے - کہ اس کو جنت کا وارث کر دیتا ہے - اور سلامؔ چونکہ خدا کا نام بھی ہے - اس لئے دار السلام تک پہنچانے کے یہ معنی بھی ہوئے - کہ اس کو اپنے لقا کا وارث کر دیتا ہے -

ويهدی من يشاء الیٰ صراط مستقيم یعنی جلدی جلد اسے کامیاب کر دیتا ہے - کیونکہ سیدھا راستہ سب سے چھوٹا ہوتا ہے - یہ انبیاء اور اولیاء کا مقام ہے - بعض کو آواز دیتا ہے - اور بعض کے پاس آپ آکر انہیں ساتھ لے جاتا ہے - یہ موہبت کا مقام ہے ٭

٢٧ؐ حل لغات - الحسنٰى - ضد السوءٰ بدی کے مقابل کی حالت - العاقبة الحسنة - اچھا انجام الظفر - فتح - الشهادة - چستی اور ہوشیاری النظر الی الله - اللہ تعالیٰ کی معیت (اقرب) -

رَهِقَ يَرْهَقُ - رَهَقًا - سَفِهَ بیوقوفی کی - ركِبَ الشرّ والظلم - برائی اور ظلم کا مرتکب ہوا غشيَ المحارم - ناجائز کام کئے - كَذَبَ جھوٹ بولا - عَجِلَ - جلدی کی - رَهِقَ فلانا غشيه ولحقه - اس کے پاس گیا - اور اس سے جا ملا کہتے ہیں رهقت الكلاب الصيد - کتوں نے شکار کو جا لیا - اور بعض کہتے ہیں دنا منه - سواءٌ اخذه اولم ياخذه - قریب ہوگیا - خواہ اسے پکڑ سکا ہو یا نہ (اقرب)

القتر - الغبرة - غبار (اقرب) - الدخان الساطع من الشواء والعود ونحوهما - جس چیز کو بھونا جائے - اس کا دھواں یا لکڑی کا یا ایسی ہی اور چیزوں کا دھواں (مفردات)

الذلة - ذَلَّ يَذِلُّ ذُلًّا - ضد صَعُبَ

(حاشیہ:) سلام — حسنیٰ — اللہ تعالیٰ پر توکل سلامتی کا موجب ہے — رہق — القتر — صراط مستقیم کے لفظ میں جلد کامیاب ہونے کی طرف اشارہ ہے

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَ

اور جنہوں نے بدیاں کی ہونگی (ان کے لئے) بدی کا بدلہ اس (بدی) کے برابر ہوگا اور

تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ

انہیں ذلت پہنچے گی اور کوئی بھی انہیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا نہیں ہوگا (اور انکی حالت ایسی ہوگی)

اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ

گویا اُن کے مونہوں پر رات کے کئی (کئی) تاریک حصے ڈال دیئے گئے ہیں۔

۲۸ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

یہ (لوگ) آگ (میں رہنے) والے ہیں وہ اس میں رہا کریں گے ۵۲۸

یقال ذلت له القوافی سهلت۔ ذل شکل یا سخن ہو کے مخالف معنی دیتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ ذلت له القوافی یعنی قوافی اس کے ذہن میں آسانی سے آگے گئے (اقرب) ذلیل کو ذلیل اس لئے کہتے ہیں۔ کہ ایسے شخص پر ظلم کرنا لوگوں کے لئے آسان ہوتا ہے۔

(الحسنیٰ کے معنی) **تفسیر۔ للذین احسنوا** کے معنی یہ ہوئے کہ مومنوں کا انجام نیک ہوگا۔ ان کو کامیابیاں ملیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کے اندر چستی اور تیزی پیدا کردے گا۔

(زیادۃ سے مراد) **و زیادۃٌ** یعنی خود خدا ان کو مل جائیگا۔ اور وہ ہر قسم کی ذلت اور بدنامی سے محفوظ ہونگے۔ اور لوگوں سے دبیں گے نہیں۔ یعنی یہ نہیں ہوگا کہ غلاموں کی طرح لوگوں کی نقل کریں۔ بلکہ ان کو اللہ ایسا بنائیگا۔ کہ لوگ ان کی نقل کریں گے +

(عاصم) **۵۲۸ حل لغات۔ عاصم۔** اسم فاعل ہے عصم سے۔ عَصَمَ الشیءَ۔ مَنَعَہٗ روک کر محفوظ کر دیا۔ حَفِظَہٗ حفاظت کرکے بچا لیا۔ (قطع) القطع۔ القطعة من اللیل رات کا ایک حصہ اور قطعة کی جمع بھی ہے جسکے معنی ہیں الحصة من الشیء کسی چیز کا کوئی ایک حصہ۔ (خلد) خالدون۔ خلد سے اسم فاعل کا صیغہ ہے خلد بالمکان والی المکان۔ اقام رہ پڑا۔ (اقرب)

(بدی کی سزا بدی سے زیادہ نہیں ملتی) **تفسیر** ایک تو اس جگہ یہ بتایا ہے کہ گو نیکی کی جزا عمل سے زیادہ ملتی ہے۔ مگر بدی کی جزا اللہ تعالیٰ عمل سے زائد نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے مطابق دیتا ہے۔ دوسرے یہ بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کا قانون

(خدا کے قانون توڑنے کا نتیجہ) توڑنے والے اعلیٰ ہمتوں سے محروم ہوتے ہیں۔ اور صرف نقال رہ جاتے ہیں۔ خود ان میں اقدام اور ایجاد کی طاقت نہیں رہتی۔ ان کے نزدیک تمام ترقیات کی جڑھ دوسرں کی نقل ہوتی ہے۔ ان کی امیدوں میں کبھی اس خیال کو جگہ نہیں ملتی کہ وہ دنیا کی راہ نمائی کریں اور لوگ انکے پیچھے

(ایسا گرا ہوا بغیر دستگیری کے اُٹھ نہیں سکتا) چلیں۔ تیسرے یہ بتایا ہے کہ ایسی گری ہوئی حالت سے انسان خود نہیں اُٹھ سکتا۔ بیرونی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ لوگ چونکہ خدا تعالیٰ کو بھی ناراض کر لیتے ہیں اسلئے بیرونی مدد سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔ چوتھے یہ بتایا کہ بدی آخر ظاہر ہو کر رہتی ہے اور ظلم چھپ نہیں سکتا۔ پس دنیا بھی انکی کمزوریوں سے واقف ہو جاتی ہے نیز اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ کہ اگر یہ لوگ خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے مظالم اور بدیوں سے نہیں بچتے۔ تو کم سے کم اس امر کا ہی خیال کریں۔ کہ یہ اپنی ذلت کا سامان پیدا کر رہے ہیں +

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا

اور (اے لوگو! اس دن کو یاد کرو) جس دن ہم اُن سب کو جمع کرینگے۔ پھر جنہوں نے شرک کیا (ہوگا) انہیں ہم کہینگے (کہ ذرا ٹھہرو)

مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَ

اپنی جگہ پر (کھڑے رہو) تم بھی اور تمہارے (بنائے ہوئے خدائی کے) حصہ دار (بھی) پھر ہم اُن میں آپس میں جدائی ڈال دینگے اور

قَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ○ ۲۹

اُن کے بنائے ہوئے خدا کے) شریک (اُنہیں) کہینگے (کہ) تم ہماری عبادت (تو ہرگز) نہیں کرتے تھے ۲۹ع

۲۹ع حل لغات۔ مکانک۔ یہ محاورہ ہے۔ اس کے معنی ہیں اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو۔ زیّلہ فرّقہ۔ پراگندہ کر دیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم الشان اجتماع کا ذکر فرمایا ہے۔ جو ایک دن سب صداقتوں کے ظاہر کرنے کا موجب ہوگا۔ مگر جس کا سمجھنا اس دنیا میں بھی عقل خداداد سے آسان اور سہل ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اس آیت میں ان شرکاء کا ذکر ہے۔ جنہیں لوگوں نے زبردستی ان کے علم کے بغیر خدا تعالیٰ کا شریک مقرر کر چھوڑا ہے جیسے ملائکہ یا حضرت کرشن سدا مچندر۔ عیسیٰ علیہ السلام اور امام حسن اور امام حسین سید عبد القادر جیلانی وغیرہم رضی اللہ عنہم۔ کیونکہ اگلی آیت سے ثابت ہے۔ کہ وہ شرکاء خدا تعالیٰ کو گواہ کے طور پر پیش کرینگے۔ کہ انہیں اس شریک بنانے کے فعل سے بالکل بے خبری تھی۔ ذیلنا بینھم سے بھی اس جگہ یہی مراد ہے۔ کہ اس موقع پر ثابت ہو جائے گا۔ کہ یہ حضرات ان مشرکوں سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے۔ اور ان کی طرف منسوب ہونے والی جماعتیں جو شرک میں مبتلا تھیں جھوٹ سے کام لے رہی تھیں۔

مکانک — پہلے اپنی اپنی جگہ کھڑا ہونے کا حکم بتایا ہے۔ پھر تفرقہ کا۔

زیّلہ — اس میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ پہلے مشرکوں کو اپنا دعویٰ ثابت کرنے کا موقع دیا جائیگا۔

یوم القیامۃ — جب ان کا دعوےٰ بے دلیل رہے گا۔ تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جن کو معبود بنایا جاتا تھا۔ بری قرار دے کر الگ کر دیگا اور اس وقت وہ لوگ خوشی سے اپنی براءت کا اظہار کریں گے۔ اگر یہ سوال ہو کہ اس جگہ معبودوں سے مراد اگر وہ ہیں جو عبادت سے بے خبر ہیں

اس جگہ شرک کے بانی معبودان باطلہ کا ذکر نہ ہونیکی وجہ — تو ان معبودوں کا ذکر کیوں نہیں کیا جو خود شرک کے بانی ہوتے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ایسے لوگ خود مشرک ہیں۔ اور اس وجہ سے مشرکین میں ان کا ذکر آگیا ہے۔ اس جگہ صرف یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ رسول کریمؐ کے مخالفین جو شرک کے عقیدہ کو اس دلیل کے ذریعہ سے ثابت کرتے ہیں۔ کہ پہلے انبیاء اور اولیاء اس کی تائید میں ہیں۔ درست نہیں۔ اور اس کا رد یوں کیا ہے۔ کہ

زیّلنا بینھم کے معنے — ان کی تائید کا ثبوت تمہارے پاس کوئی نہیں ہے۔ وہ لوگ ہرگز اس کی تائید میں نہیں ہیں۔ یہ تمہارے اپنے مُنہ کے دعوے ہیں ❊

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ

پس تمہارے درمیان اور ہمارے درمیان (خود) اللہ تعالیٰ کافی گواہ ہے۔ ہم تمہاری پرستش سے یقیناً

٣٠ لَغٰفِلِيْنَ ۝ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى

بیخبر تھے ٣٠ھ (تب) وہاں ہر ایک شخص جو کچھ اسنے (اپنے لئے) بویا ہوگا اس کا امتحان کریگا اور انہیں انکے سچے مالک

٣١ اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

اللہ تعالیٰ کی طرف (لوٹا کر) لایا جائیگا۔ اور جو کچھ وہ (اپنے پاس سے) گھڑتے تھے وہ (سب) انہیں بھول جائیگا ٣١ھ

٣٠ھ - یہاں اللہ تعالیٰ نے کیا عجیب نقشہ کھینچا ہے۔ فرماتا ہے ایک دن ایسا آنیوالا ہے کہ ہم سب کو اکٹھا کرینگے اور شرکاء اور مشرکین کو کہیں گے کہ اپنی اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو۔

وفات مسیح — یہ آیت حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات پر بھی دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ اس سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام قیامت تک ان لوگوں کے افعال سے جو انہیں خدا کا شریک قرار دیتے ہیں۔ ناواقف ہونگے لیکن اگر ان کو زندہ تسلیم کیا جائے۔ اور یہ سمجھا جائے کہ وہ اس دنیا میں دوبارہ آئینگے۔ تو کس طرح ممکن ہے۔ کہ وہ قیامت میں نعوذ باللہ من ذٰلک جھوٹ بولینگے۔ کہ مجھے تو خبر بھی نہیں۔ کہ یہ لوگ مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک مقرر کرتے تھے۔

بلاء — ٣١ھ حل لغات بلاہ۔ یبلوہ بلاءً و بلوًا۔ جرّبہٗ واختبرہٗ۔ اس کا تجربہ کیا۔ اور اس کی حقیقت معلوم کی (اقرب)

مولیٰ — المولی۔ المالک۔ مالک۔ المعتق آزاد کرنیوالا۔ الصاحب۔ ساتھی۔ آقا۔ الحلیف۔ معاہد۔ الربّ۔ رب۔ الولیّ کارساز۔ المنعم۔ محسن۔ المحبّ۔ محبت کرنے والا۔ القریب۔ رشتہ دار۔ (اقرب)

حق — الحق۔ ضد الباطل جھوٹ کے خلاف چیز یعنی سچ۔ الامر المقضی۔ ہوکر رہنے والی بات۔ العدل۔ انصاف۔ الملک۔ المیت۔ الموجود الثابت۔ موجود اور ثابت شدہ چیز۔ الیقین بعد الشک۔ شک کے بعد یقین کا آنا۔ الموت۔ موت (اقرب)

ضَلَّ — ضَلَّ یَضِلُّ ضد اِھْتَدٰی۔ یعنی ہدایت کے خلاف حالت پر ہوگیا۔ اور دین اور حق کو نہ پایا۔ ضَلَّ عنہ یَضِلُّ لم یھتد الیہ۔ اس طرف راہ نہیں پائی۔ ضَلَّ یَضَلُّ (ضاد کی زبر سے)۔ فلانٌ الطریقَ۔ وعن الطریق۔ لم یھتد الیہ۔ راستہ نہ پایا۔ یہی معنی ہوتے ہیں۔ جب دار یا منزل یا ہر اپنی جگہ پر قائم رہنے والی چیز کا اس کے بعد ذکر ہو۔ ضلّ الرجل فی الدین ضلالًا و ضلالۃ۔ ضد اھتدٰی۔ اس شخص نے دین کے معاملہ میں درست راہ نہیں پائی۔ ضلّ فلان الفرس۔ اس کا گھوڑا کھو یا گیا۔ ضلّ عن کذا ضاع۔ ضائع ہوگیا۔ ضلّ الماء فی اللبن خفی و غاب۔ پانی دودھ میں مل گیا۔ اور غائب ہوگیا۔ ضلّ فلان فلانًا۔ نسیہ۔ اس شخص کو بھول گیا۔ ضلّ الناسی غاب عنہ حفظ الشیء بھول گیا۔ اس کے ذہن سے بات نکل گئی۔ ضلّ سعیہ۔ عمل عملًا لم یعد علیہ نفعہ۔ ایسا کام کیا کہ جس کا اسے کوئی نفع نہ ہوا (اقرب)

تفسیر بتایا کہ ہر کام کی حقیقت اس کی سب

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ

تو (ان سے) کہ (کہ بتاؤ) آسمان اور زمین سے تمہیں کون روزی دیتا ہے یا (یہ کہ)

السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ

کانوں اور آنکھوں پر کون قابو رکھتا ہے اور کون (ایک) مردہ (چیز) میں سے زندہ (چیز) نکالتا اور

الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ

زندہ (چیز) میں سے مردہ (چیز) نکالتا ہے اور کون (اس) تمام امر کا انتظام کرتا ہے۔ اسپر وہ ضرور کہیں گے

اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ ۳۲

کہ اللہ (تعالیٰ کرتا ہے) تب (انہیں) کہہ (کہ پھر وجہ کیا ہے کہ) پھر (بھی) تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے ۳۲ھ

کیفیات کے ساتھ اسی دنیا میں معلوم نہیں ہوتی۔ بعض اشیاء کی حقیقت بالکل اور بعض کی پورے طور پر اگلے جہان میں ہی کھلے گی۔ اور اس وجہ سے اصل فیصلہ بھی وہیں ہوگا۔ اور جو اصل مالک ہے وہ فیصلہ کریگا۔ اور بوجہ حقیقت کے کھل جانے کے سب جھوٹ بھول جائیں گے۔

مولٰهم الحق کہکر ایک تو ان تمام معانی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ جو اس لفظ مولا کے ہیں۔ اور دوسرے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ عادل قائم بذاتہ اور منعم خدا کو چھوڑ کر کہاں جاسکتے ہیں۔ اور ایسی ہستی کے عذاب سے کیونکر بچ سکتے ہیں۔ جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ ضلّ عنهم میں دو باتیں بتائی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ خود اپنے اعمال کو بھول جائینگے۔ کیونکہ جب انسان کو اپنے قصور کا علم ہوتا ہے۔ تو وہ اسے بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان اعمال کا انہیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا +

۳۲ھ چند ہی ایسی جگہیں ہیں جہاں عیسائی مفسروں نے تعریف کی ہے۔ ان مقامات میں سے ایک یہ بھی ہے۔

ویری صاحب لکھتے ہیں۔ کہ اس آیت میں توحید کی تائید میں بہت زبردست دلیلیں دی گئی ہیں۔ اور لکھا ہے۔ کہ اسلام کی کامیابی کا ایک بہت بڑا ذریعہ یہ تعلیم ہے۔ لیکن تعجب ہے۔ کہ اسی مُنہ سے پھر پادری صاحبان اسلام کی کامیابی کو تلوار اور لالچ کیطرف منسوب کرتے ہیں۔ اور کبھی اُس کی بزعم خود گری ہوئی اخلاقی تعلیم کی طرف۔

زمین اور آسمان دونوں سے رزق آتا ہے

اس آیت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ زمین و آسمان دونوں سے رزق آتا ہے۔ یعنی ایک جگہ کا رزق کافی نہیں ہوتا۔ اگر پانی برستا ہے۔ اور زمین میں اُگانے کی طاقت نہ ہو تو یہ کافی نہیں۔ اسی طرح اگر پانی نہ برسے یا اُس کے برسنے میں دیر ہو جائے۔ تو زمین کی اُگانے کی طاقت کافی نہیں ہوتی۔ اسی طرح خالی عقل انسان کی روحانی ہدایت کے لئے کافی نہیں۔ انسانی دماغ زمین کے مشابہ ہے۔ جبتک اس پر الہام کی بارش نہ برسے وہ کبھی بھی روحانی روئیدگی جو روحانی غذا کا کام دے پیدا نہیں کرسکتا۔ پس تم لوگ کسطرح دعوے کر سکتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے الہام کے بغیر آپ ہی آپ تم خدا کو پالو گے۔ عقل بیشک ضروری شئے ہے۔ مگر جس طرح آنکھ بغیر سورج کی روشنی کے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ بھی بغیر الہام

ضلّ عنهم کے معنے۔

اس آیت میں زبردست دلائل توحید بیان ہوئے ہیں عیسائی مصنفین کیطرف سے اقرار

کے صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔

جس نے کان اور آنکھیں دی ہیں ممکن نہیں اُسنے انکی اصل غرض کو پورا کرنے کا انتظام نہ کیا ہو

پھر فرمایا تمہارے کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے۔ اگر ان کا کوئی اَور مالک ہو۔ اور ہدایت دینا کسی اور کا کام ہو۔ تو بیشک تم کہہ سکتے ہو۔ کہ ہدایت دینے والے نے پرواہ نہیں کی۔ اور روحانی کانوں اور آنکھوں کے لئے ان کا کام مہیا نہیں کیا۔ لیکن جس نے کان اور آنکھیں دی ہیں اگر اُسی کا کام ہدایت دینا ہے۔ تو کیا یہ بیوقوفی کی بات نہیں ہوگی۔ کہ وہ کان اور آنکھیں تو پیدا کرے۔ لیکن جو کام اُن سے لینا ہے۔ اُس کا انتظام وہ نہ کرے۔

خدا تعالیٰ کے رحم سے فائدہ اٹھاؤ

جب مُردوں سے زندہ پیدا کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں مُردہ دلوں کو دوبارہ زندگی حاصل کرنے کا موقع نہ دے

اسی طرح فرماتا ہے۔ دیکھو کون زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ کر رہا ہے۔ یعنی اچھوں سے بُرے اور بروں سے اچھے پیدا ہو رہے ہیں۔ یا مُردوں سے زندہ نکل رہے ہیں۔ زمین میں کھاد ڈالتے ہیں۔ جو فضلہ یعنی مردہ چیز ہوتی ہے لیکن اس سے سبز کھیتی نکل آتی ہے۔ اسی طرح سبز کھیتی فضلہ بنکر مردہ ہو جاتی ہے۔ جب یہ کام تمہیں نظر آ رہا ہے اور تم دیکھ رہے ہو۔ کہ مردوں سے زندے اور زندوں سے مردے نکل رہے ہیں۔ تو تم کس طرح امید کرتے ہو کہ خدا تعالےٰ انکار پر فوراً لوگوں کو سزا دیدے۔ اور اصلاح کا موقع نہ دے جب ایک بظاہر مردہ چیز سے زندگی کے سامان پیدا ہونے لگتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ ایک مردہ دل سے کسیوقت روحانی زندگی کا چشمہ نہ پھوٹ پڑے اور جب یہ امکان باقی ہے تو اللہ تعالیٰ کیوں نہ لوگوں کو ڈھیل دے تاکہ جو لوگ زندہ ہونے والے ہیں وہ زندہ ہو جائیں۔ پھر فرماتا ہے۔ دیکھو ومن یدبر الامر۔ کون تدبیر کر رہا ہے۔ تمام کام کون چلاتا ہے۔ وہ کہینگے اللہ۔ پھر کیا یہ عجیب بات نہیں۔ کہ جس کے سپرد کام کا چلانا ہو وہ اُسے تباہ کردے۔ مشین پر کام کرنے کے لئے جو آدمی مقرر ہوتا ہے۔ وُہ مشین کو چلایا کرتا ہے۔ یا تباہ کرتا ہے۔ کوئی دانا اپنی چیز کو تباہ کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ پس ان سے پوچھو کہ خدا تعالیٰ اس کارخانۂ عالم

رزق سمع بصر۔ موت وحیات اور تدبیر کا تعلق اور ترتیب۔

ان ضروریات اور سامانوں کے پیدا کرنیکا اصل مقصد

کو جس میں اس کی قدرت کا ظہور ہو رہا ہے۔ کیوں جلدی اور عجلت سے تباہ کردے؟ اُسے تو اس کارخانہ کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ نہ کہ تباہ کرنے کی۔ یہ اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ جب انذار کی خبر دی گئی تھی تو کیوں وہ فوراً پوری نہیں کی گئی۔

اتقا کے معنی ہیں کسی کو اپنے بچاؤ کا ذریعہ بنانا پس افلا تتقون کا یہ مطلب ہے۔ کہ صداقت کے ان اصول کو دیکھ کر تم خدا کو اپنا محافظ کیوں نہیں بناتے۔ یعنی جب تمام قانونِ قدرت میں رحم کا اور ڈھیل کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ تو تمہیں چاہیئے تھا کہ تم اس سے فائدہ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے صلح کرنے کی کوشش کرتے نہ یہ کہ بار بار عذاب پر زور دیتے۔

اس آیت کی ترتیب پر غور کرو کیسی بے نظیر ہے۔ اول رزق کا ذکر فرمایا ہے۔ جو بقائے حیات کا موجب ہوتا ہے۔ پھر کان اور آنکھ کا ذکر کیا ہے۔ جو عقل کا ذریعہ ہیں۔ پھر موت اور حیات کا ذکر کیا ہے۔ جو قوت عملیہ پر دلالت کرتی ہے جو عقل کے بعد آتی ہے۔ پھر تدبیر کا ذکر کیا ہے جس کی اعمال کے شروع کرنے پر ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ تدبیر کے معنی ہی یہ ہیں کہ مختلف اعمال میں صحیح نظام قائم رکھا جائے۔ غرض انسان کی پیدایش کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے جن چار ذرائع کی ضرورت ہے۔ ان چاروں کو علی الترتیب پیش کیا ہے۔ اور پوچھا ہے کہ بتاؤ کہ کوئی نادان ایسا ہوگا۔ کہ جو حیات پیدا کرے۔ پھر احساس پیدا کرے۔ پھر قوت عملیہ پیدا کرے۔ پھر اعمال کے لئے ایک نظام مقرر کرے اور پھر یہ سب کچھ پیدا کرکے انسان کو چھوڑ کر الگ ہو جائے اور ان اسباب کو کسی خاص مقصد کے لئے لگانے کی ہدایت نہ دے۔ ہر اک جو ذرہ بھر بھی عقل رکھتا ہو سمجھ سکتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ جو ہستی ان چار امور کو پیدا کرے گی۔ وہ ضرور ان امور کے لئے کوئی خاص مقصد بھی مقرر کرے گی۔ پس یہ

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ

پس وہ اللہ تعالیٰ ہی (کی ہستی) ہے (جو ایسا کرتی ہے) (اور وہی) تمہارا (حقیقی) رب (ہے) پھر حق کو چھوڑ کر

إِلَّا الضَّلٰلُ ۖ فَأَنّٰى تُصْرَفُونَ ○ ۳۲

گمراہی کے سوا کیا (حاصل ہو سکتا) ہے پھر کس طرح تم (اور اور طرف) پھیرے جا رہی ہو ۵۳۳

امر خیال میں بھی نہیں لایا جا سکتا۔ کہ اللہ تعالیٰ بغیر رہنمائی کے بندوں کو چھوڑ دیگا۔ اور الہام اور وحی سے ان کو متمتع نہ کرے گا۔ یا پھر ہدایت کا موقع دینے سے پہلے ہی ان کو ہلاک اور تباہ کر دیگا۔ اگر اس قدر جلد عذاب دینا اسے مطلوب ہوتا۔ تو اس قدر لطیف سلسلہ کو پیدا ہی کیوں کرتا۔

اس آیت میں شرک کا رد بھی ہے اور بتایا ہے۔ کہ جب اصولی طور پر تم تسلیم کرتے ہو۔ کہ رزق دینے والا قوائے انسانیہ پیدا کرنے والا حیات و ممات پیدا کرنے والا اور تدبیر امور کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے تو پھر کن وجوہ پر تم یہ دعوے پیش کرتے ہو۔ کہ فلاں فلاں کام فلاں معبود باطل نے کیا ہے۔ جب یہ تمام امور خدا تعالیٰ ہمیشہ سے کرتا ہے تو ان امور کے خاص خاص ظہوروں کو تم کس طرح کسی اور ہستی کی طرف منسوب کر سکتے ہو۔ خدا تعالےٰ جب ہمیشہ سے مردوں سے زندے پیدا کرتا چلا آیا ہے۔ تو کس طرح یہ کہہ سکتے ہو کہ فلاں بچہ فلاں بت نے یا فلاں معبود نے دیا ہے جو ہمیشہ سے دیتا چلا آیا ہے کیوں نہ کہا جائے کہ اُسی نے یہ بچہ بھی دیا ہے۔ مردہ سے زندہ نکالنے سے اس جگہ یہ مراد نہیں کہ حیات مردہ چیز سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اس جگہ بحث بظاہر مردہ نظر آنے والی چیزوں سے زندگی کے پیدا ہو جانے کی ہے۔

۵۳۳ حل لغات۔ الضلال۔ الھلاک ہلاکت الفضیحۃ رسوائی الباطل جھوٹ ضد الھدی (گمراہی) (اقرب)

علامہ ابو حیان بحر محیط میں لکھتے ہیں۔ الحق والضلال لا واسطۃ بینھما۔ اذھما نقیضان فمن یخطئ الحق وقع فی الضلال (جلد ۵ صفحہ ۱۵۷) حق اور ضلال کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اس لئے جو شخص حق کو چھوڑے گا۔ وہ ضرور باطل میں جا پڑے گا۔ پس بعد الحق کے معنی ہوئے "حق کو چھوڑ کر"

ربکم الحق اور مولیٰھم الحق کے مفہوم میں فرق اور مضمون کی ترتیب۔

تفسیر اس آیت میں ربکم الحق فرمایا ہے۔ اور آیت ۳۱ میں مولیٰھم الحق فرمایا تھا۔ کیونکہ وہاں جزا و سزا کا ذکر تھا اور یہاں تکمیل مدارج کا ذکر ہے۔ اور تکمیل مدارج کے مطابق رب کی صفت ہی ہے۔ کیونکہ اس کے معنی ہیں پیدا کر کے تکمیل تک پہنچانے والا۔ پس اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کی طرف اشارہ کر کے بتایا گیا ہے کہ وہ خدا جو انسان کو اس طرح درجہ بدرجہ ترقی دے کر کمال تک پہنچاتا ہے۔ اس کو چھوڑ کر دوسرے ذرائع کو اختیار کرنا نادانی ہے۔

ربکم کی صفت الحق لانے کی وجہ۔

ربکم کی صفت الحق بیان فرما کر بتایا کہ رب دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ربوبیت تو کرتے ہیں مگر فانی ہوتے ہیں ان کی ربوبیت ناقص ہوتی ہے۔ اور ایک ایسا رب ہو سکتا ہے۔ جو قائم بالذات ہو۔ اور فنا سے پاک وہی اصل ربوبیت کرنیوالا ہے۔

مردہ سے زندہ نکالنے کے معنے۔

پس فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف رب ہے۔ بلکہ ازلی ابدی بھی ہے اسلئے اُس کی ربوبیت جس قدر کامل ہو سکتی ہے۔ اور کسی وجود کی نہیں ہو سکتی۔ اور اسے چھوڑ کر دوسروں کو اختیار کرنا۔ گویا ہلاکت کی طرف جانا ہے

ضلال

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا

اسی طرح جن لوگوں نے فسق اختیار کیا ہے۔ ان پر تیرے رب کا فرمودہ پورا ہوا ہے

۳۴ اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ

کہ وہ ایمان نہیں لاتے ۵۳۴ تو (انہیں کہہ کہ) کیا تمہارے (قرار دادہ) شریکوں میں سے

مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ط قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا

کوئی (بھی ایسا) ہے۔ جو پہلی بار پیدا کرتا ہو (اور) پھر اس (پیدائش) کو دُہراتا ہو۔ تو (انہیں) کہہ (کہ) اللہ (تعالےٰ)

۳۵ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○

۵۳۵ ہی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہے۔ (اور) پھر اس (پیدائش) کو دُہراتا ہے۔ پھر تمہیں کس طرف کو پھرایا جا رہا ہے۔

۵۳۴ حلّ لغات۔ الکلمۃ۔ اللّفظ لفظ کل ما ینطق بہ الانسان مفردا کان او مرکبا جو کچھ بولا جائے۔ خواہ مفرد ہو یا مرکب (اقرب) فسق الرجل فِسقًا۔ ترکَ امر اللہ۔ اسکی نافرمانی کی۔ عصٰی نافرمان ہوگیا۔ جارَ عن قصد السبیل۔ درست راہ سے روگردان ہوگیا۔ فجَرَ بدکردار ہوگیا۔ خرجَ عن طریق الحق۔ حق کی راہ سے الگ ہوگیا۔ الرّطبۃ عن قشرھا خرجت۔ گابھا چھلکے سے باہر آگیا۔ (اقرب)

نسق

تفسیر۔ یعنے جس طرح یہ ثابت ہے کہ حق کے بعد سوائے گمراہی اور ہلاکت کے کچھ نہیں۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہے۔ کہ جو لوگ فسق کرتے ہیں۔ یعنی اطاعت سے نکل جاتے ہیں۔ ان کے متعلق اللہ تعالےٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ اس آیت سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ کہ اللہ تعالےٰ بعض لوگوں کو ہدایت سے محروم کر دیتا ہے۔ بلکہ اس جگہ یہ بتایا گیا ہے۔ کہ یہ الٰہی قانون ہے۔ کہ جو غلط راستہ پر چلے۔ گمراہی میں ترقی کرے اور جو نیک راستہ پر چلے نیکی میں ترقی کرے۔ اور اگر انسانی پیدائش کا کوئی مقصد ہے تو اس قانون کا ہونا بھی

فسق انسان کو ایمان سے محروم کر دیتا ہے۔

خالق وہی ہے جو معید بھی ہے

ہدایت یا ضلالت میں بڑھنے کے متعلق ایک قانون الٰہی۔

ضروری تھا۔ ورنہ دنیا میں اندھیر پڑ جاتا۔ کہ ظلم کرنے والے اعلیٰ مدارج روحانیہ حاصل کر جاتے۔ اور نیک گمراہ ہو جاتے۔ جس شخص کے سامنے دلائل پر دلائل پیش کئے جائیں۔ اور وہ انہیں تسلیم نہ کرے کس طرح جائز ہے۔ کہ اس کو خدا تعالےٰ زبردستی ہدایت دیدے۔ نہ وہ زبردستی ہدایت دیتا ہے نہ زبردستی گمراہ کرتا ہے۔ ہاں اپنے دل کی حالت انسان بدل لے تو خدا تعالیٰ کا معاملہ بھی اس کے ساتھ فوراً بدل جائیگا۔

قرآن کریم کیسا محبت بھرا کلام ہے۔ بات بات کے لئے اول تو دلائل دیتا ہے۔ پھر ساتھ اس کے محبت بھرے جذبات کے ساتھ اپنی حالت کو بدلنے کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

۵۳۵ ...... اس آیت میں شرک کی تردید میں ایک بہت بڑی دلیل پیش کی گئی ہے۔ جسے عام طور پر لوگوں نے سمجھا نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ خلق کا ثبوت اعادہ ہوتا ہے یعنی مخلوق کا دہرانا۔ ورنہ ہر شخص دعویٰ کر سکتا ہے۔ کہ میں خالق ہوں۔ آج اگر کوئی شخص اُٹھے اور کہے کہ میں نے دنیا پیدا کی ہے۔ تو اس کا دا۔ س

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ

تو (اُنسے بھی) کہدو کہ کیا تمہارے (بنائے ہوئے) شرکوں میں سے کوئی (بھی ایسا) ہے جو حق کیطرف (لوگونکی) رہنمائی کرتا ہو (وہ تو اس کا کیا جواب دینگے) تو

يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ

(ہی اُنسے) کہدو کہ اللہ (تعالیٰ) ہی ہے جو حق کیطرف (لوگونکی) رہنمائی کرتا ہے۔ پس کیا وہ (خدا) جو حق کیطرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس

اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ ۳۶

(کے احکام) کی پیروی کی جائے۔ یا وہ (زمینی خدا) جو کہ سوائے اس (صورت) کے کہ اسے (ہدایت کا) راستہ دکھایا جائے (خود بھی) راہ نہیں پاتا۔ پھر تمہیں (یہ کیا

(ہوگیا) ہے؟ تم کیسے فیصلے کرتے ہو ۝۳۶

طرح ہو سکتا ہے۔ کہ اس کو کہا جائے کہ پھر پیدا کر کے دکھاؤ۔ غرض اعادہ ہی عمل پر قدرت رکھنے کا ثبوت ہوتا ہے۔ پس فرماتا ہے کہ ہم صرف خلق کو پیش نہیں کرتے۔ کہ کوئی کہہ دے کہ حضرت عیسیٰ نے یا اور کسی وجود نے بھی پیدا کیا ہے۔ بلکہ ہم اعادہ کو پیش کرتے ہیں۔ اعادہ میں دو باتیں ہوتی ہیں اول اس سے فوری طور پر امتحان ہوتا ہے۔ دوم اعادہ ازلی قانون کو بھی بتاتا ہے۔ مثلاً غلہ سے غلہ پیدا ہوتا چلا آرہا ہے۔ آج اگر زید خدا بن بیٹھے اور خالق ہونے کا دعویٰ کرے۔ تو اسے کہا جائیگا۔ کہ غلہ تو اول سے پیدا ہو رہا ہے اور تم اب پیدا ہوئے ہو۔ غرض معبودانِ باطلہ محدود زمانہ سے چلے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کے قوانین پہلے سے چل رہے ہیں۔ اس سے سوال ہو سکتا ہے۔ کہ وہ کام جو ایک مقررہ قانون کے ماتحت ہمیشہ سے ہوتے چلے آئے ہیں۔ تمہاری طرف کس طرح منسوب ہو سکتے ہیں۔ پس فرمایا کہ یہ خلق اور اعادہ کا سلسلہ کس نے بنایا ہے۔ اگر کہو کہ اللہ تعالیٰ نے۔ تو بتاؤ کہ جب خدا تعالیٰ نے ازل سے پیدائش کے بعض قانون مقرر فرما چھوڑے تھے اور ان کے ماتحت پیدائش عالم ہو رہی ہے۔ تو تمہارے معبودانِ باطلہ کا دخل اس میں کہاں سے ثابت ہوا۔ اور اس کی ضرورت کیا تھی؟

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے۔ کہ جس بادشاہ نے ایک بظاہر غیر متناہی سلسلہ مخلوق کا پیدا کیا ہے وہ اس کی ہدایت دوسروں پر کس طرح چھوڑ سکتا تھا۔ یا ایک زمانہ کے لوگوں کو ہدایت دیکر بعد کی نسلوں کو کس طرح محروم رکھ سکتا تھا۔ اگر پیدا کرنیوالا اور ہوتا اور سلسلہ پیدائش کا جاری رکھنے والا اور۔ تب تو کہہ سکتے تھے۔ کہ پیدا کرنے والے نے ابتداءِ آفرینش میں ہدایت دیدی اور سلسلۂ تناسل کے جاری رکھنے والے نے پرواہ نہ کی۔ مگر جب پیدا کرنے والا اور سلسلۂ پیدائش کو جاری رکھنے والا ایک ہی رب ہے۔ تو بعد میں آنیوالی نسلوں کو وہ ہدایت سے کس طرح محروم کر سکتا تھا۔

سلسلۂ پیدائش کی دلالت سلسلۂ ہدایت پر

۳۶ حل لغات۔ یَہِدِّیْ ہُدًی سے باب افتعال کا فعل مضارع ہے۔ اس میں تؔ کو ساکن کر کے دؔ میں ادغام کیا گیا ہے۔ جو لفظ یہتدی کا دوسرا طریق تلفظ ہے۔ اس کی ماضی اہتدی ہے۔ جس کے معنی ہیں بتائے ہوئے رستہ کو اختیار کیا۔ اقرب میں ہے اِھْتَدٰی اِھْتِدَاءً مطاوعِ ھَدَاہٗ یعنی بتائی ہوئی ہدایت کو قبول کیا (اقرب)

یَہِدِّیْ

تفسیر۔ یعنی اگر خدا تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا۔ تو کیا تمہارے معبود ہدایت دیتے ہیں۔ اگر وہ ہدایت دیتے ہوں تو بیشک تم کہہ سکتے ہو۔ کہ اب خدا تعالیٰ نے ہدایت کا کام ان کے سپرد کر چھوڑا ہے۔ مگر کیا ایک مثال بھی اس کی پیش

معبود حقیقی وہی ہے جو ہادی حقیقی ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ

اور ان میں سے اکثر (اپنے) وہم کے سوا (اور کسی چیز) کی پیروی نہیں کرتے (حالانکہ) وہم

۳۷ الْحَقِّ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ○

حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دیتا۔ جو کچھ یہ (لوگ) کرتے ہیں (اُسے) اللہ (تعالیٰ) یقیناً خوب جانتا ہے ۵۳۷

کر سکتے ہو۔ کہ کسی بت یا معبود باطل کی طرف سے کوئی شریعت یا ہدایت نامہ آیا ہے یہ عجیب بات ہے کہ شرک تو دنیا میں بہت پھیل رہا ہے مگر ایک کتاب بھی دنیا میں موجود نہیں جسے دنیا کی ہدایت کا دعویٰ ہو۔ اور جس کی نسبت یہ کہا گیا ہو۔ کہ کسی بت یا کسی معبود باطل نے اُسے بطور وحی کسی پر اتارا ہے۔ ہر قسم کے جھوٹ بنے ہیں۔ مگر ایسی کتاب کا جھوٹا دعویٰ کسی نے نہیں کیا۔ پس جب جھوٹے طور پر بھی کسی بت کی طرف ہدایت منسوب نہیں تو کیا وجہ ہے کہ مشرک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کے آنے کا انکار کرتے ہیں۔ آخر جس نے پیدا کیا ہے۔ ضرور ہے کہ اپنے بندوں کی ہدایت کا کوئی سامان کرے۔ ساتھ ہی شرک کا بھی رد فرما دیا۔ کہ أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُهْدَى وہ جو حق کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ یا وہ جسے جب تک ہدایت نہ دی جائے۔ خود بھی ہدایت نہیں پا سکتا۔

ظن

اغنی

ہدایت سے مراد

ہدایت سے مراد اس جگہ روحانی امور کی ہدایت بھی ہو سکتی ہے۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پر چلانا بھی اور یہ معنی بتوں پر صادق آتے ہیں۔ کہ جن کو لوگ ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیتے ہیں۔ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ سے مراد میرے نزدیک انبیاء بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ بھی ہدایت دینے کے لئے آتے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا۔ کہ انبیاء اس قابل ہیں۔ کہ ان کی پیروی کی جائے یا وہ بت یا اُن کے پجاری جو خود ہدایت

انبیاء بھی ہادی ہیں

شرک کی جڑھ وہم پرستی ہے۔

کے محتاج ہیں۔ اور نبیوں کی تعلیم کے مقابل پر کوئی ایسی تعلیم نہیں پیش کر سکتے۔ جو ان کے معبودوں نے اتاری ہو۔

۵۳۷ حل لغات - الظن هو الاعتقاد الراجح مع احتمال النقيض - ويستعمل في اليقين والشك - یعنی ظن کے معنی زیادہ تر خیال غالب کے ہوتے ہیں۔ اور بعض وقت یقین کے معنی میں اور بعض دفعہ شک کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ويكون اسمًا ومصدرًا - اور یہ لفظ اسمی معنی یعنی غالب خیال یا یقین یا شک پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور مصدری معنی یعنی غالب خیال رکھنے یا یقین کرنے یا شک کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اغنى عنه غناءَ فلانٍ ناب عنه واجزأه - جو فائدہ فلاں شخص سے حاصل ہونا متوقع تھا وہی فائدہ پہنچایا۔ اور اس کی نیابت کی + ما اغنى شيئًا اي لم ينفع شيئًا في مهم ولم يكف مؤنة - کچھ فائدہ نہ دیا۔ (اقرب)

تفسیر - ظن کے تین معنی ہوتے ہیں (۱) غالب گمان (۲) شک (۳) یقین - اس جگہ ظن شک کے معنوں میں آیا ہے۔ کیونکہ حق اور غالب گمان کبھی ٹکرایا نہیں کرتے غالب گمان جو دلائل پر مبنی ہوتا ہے اسی وقت کام آتا ہے۔ جب حق مخفی ہو۔ جب حق ظاہر ہو۔ تو پھر غالب گمان کا کوئی موقع ہی نہیں ہوتا۔ اس وقت تو صرف ظنون فاسدہ ہی حق کے مقابل پر ڈٹے رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی بنیاد دلیل پر نہیں ہوتی۔ ضد پر یا کمزوری نفس پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اور اس قرآن کا اللہ (تعالیٰ) کے سوا (کسی اور) کیطرف سے جھوٹے طور پر بنا لیا جانا (ممکن ہی) نہیں ہو سکتا

وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ

بلکہ یہ (تو) اس (کلام الٰہی) کی تصدیق (کرتا) ہے جو اسکے سامنے موجود ہے اور کتاب (الٰہی) کی تفصیل (بیان کرتا ہے)

لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۸)

اس میں کچھ بھی شک نہیں ہے (اور یہ) تمام جہانوں کے رب کیطرف سے (نازل شدہ) ہے ۳۸ھ

فرماتا ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ محض اوہام کی بنا پر مشرکانہ خیالات میں مبتلا ہیں۔ ورنہ معبودانِ باطلہ کی طرف سے کوئی ہدایت نامہ تو آیا نہیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ اکثر لوگ اوہام کی وجہ سے شرک میں مبتلا ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں۔ کہ بعض لوگ شرک کو بدلائل مانتے ہیں۔ بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ بعض تو لالچ اور حرص سے یا ضد سے شرک میں مبتلا ہیں۔ گو دل میں خوب جانتے ہیں کہ شرک کا عقیدہ جھوٹا ہے۔ لیکن اکثر لوگ واقعہ میں شرک کو صحیح سمجھتے ہیں۔ مگر ان کا یہ یقین حقیقی نہیں ہوتا۔ جو دلائل پر یا مشاہدہ پر مبنی ہو۔ بلکہ صرف اوہام پر اس کی بنیاد ہوتی ہے۔ اگر وہ اصولی طور پر غور کریں تو اس وہم سے چھٹ سکتے ہیں۔

اس آیت میں پھر قرآن کریم نے اس صداقت کا اظہار کیا ہے۔ کہ اپنے مخالف لوگوں کو بد دیانت اور جھوٹا نہیں کہنا چاہیئے۔ اکثر لوگ واقعہ میں اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہیں گو اس پر یقین کی وجہ بھی ان کے نفس کی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ وہ سچائی کے معلوم کرنے کی پوری کوشش نہیں کرتے اور سستی سے کام لیتے ہیں +

۳۸ھ حل لغات۔ اَنْ حرف یجیئ علی اربعۃ اوجہ۔ احدھا ان تکون حرفا مصدریا ناصبا للمضارع۔ فتکون مع صلتھا علی حسب مایطلبھا العامل (اقرب) یعنی اَنْ چار طرح کا ہوتا ہے۔ اول یہ کہ وہ فعل سے پہلے آکر اسے مصدر کے معنی میں کر دیتا ہے۔ اور حسب موقعہ ومحل جزو کلام بنتا ہے۔ التصدیق لنسبۃ الصدق بالقلب او اللسان الی القائل سچا سمجھنا یا سچا ظاہر کرنا۔ صدقہ۔ ضد کذبہ۔ سچا قرار دیا۔ سچا بنایا (اقرب) فصّل الشیٔ جعلہ فصولا متمائزۃ کسی چیز یا کسی بات کے کئی حصے قرار دیکر انہیں ایک دوسرے سے ممتاز کر کے دکھایا۔ ‌فصّل الکلام بیّنہ واضح اور روشن کیا۔ (اقرب)

تصدیق[۲] تفصیل[۲]

تفسیر۔ اس سے پہلے تو یہ مضمون بیان ہو رہا تھا کہ ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے کلام بھیجے۔ اور یہ کہ اس کے سوا انسان یا معبودان باطلہ میں یہ طاقت نہیں ہے۔ کہ وہ روحانی ہدایت نامہ بنا سکیں۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ کسی معبود باطل نے ایسا ہدایت نامہ نہیں نازل کیا۔ اب اصولی بحث سے سوال زیر بحث کی طرف توجہ کی ہے۔ اور اس مخصوص سوال کو لیا ہے کہ کیا قرآن کریم انسانی کلام ہو سکتا ہے۔ اور جواب یہ دیا ہے کہ نہیں۔ اس آیت میں نہایت لطیف بحث قرآن کریم کے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہونے کے متعلق کی ہے۔ مگر مجھے افسوس ہے۔ کہ مفسرین نے اس کی خوبیوں کی طرف پوری توجہ نہیں کی اور بہت محدود روشنی اس پر ڈالی ہے۔

قرآن انسانی کلام نہیں ہو سکتا

مخالفین کی مخالفت[۱] کو حتی الوسع بدیانتی پر محمول نہیں کرنا چاہیئے۔

اس آیت میں پانچ زبردست ثبوت قرآن کریم کے

قرآن کریم کے مضامین[۳] کی شہادت اسکے منجانب اللہ ہونے پر گواہ ہے

منجانب اللہ ہونے کے متعلق دیئے ہیں۔ اول ثبوت یہ دیا ہے کہ یہ کتاب ایسے مضامین پر مشتمل ہے۔ جو بندہ اپنے طور پر معلوم ہی نہیں کر سکتا۔ صرف خدا تعالیٰ ہی بتا سکتا ہے۔ کیونکہ فرمایا۔ کہ یہ قرآن خدا تعالیٰ کی مدد کے بغیر بنایا ہی نہ جا سکتا تھا۔ جس سے صاف اشارہ کر دیا۔ کہ اس میں وہ مضامین ہیں۔ جو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ اور قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ان امور میں سے جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ایک امور غیبیہ ہیں۔ یعنی آئندہ زمانہ کی پیشگوئیاں۔ چنانچہ اسی سورۃ میں ہے۔ فقل انما الغیب للہ تو کہہ دے کہ غیب کا علم صرف اللہ کو ہے۔ پس جو کلام ایسے امور پر مشتمل ہو۔ جسے خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں بنا سکتا۔ اس کے منجانب اللہ ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

هذا القرآن میں لفظ هذا کا افادہ

تعجب ہے کہ اس حصہ آیت پر ریورنڈ ویری نے بحوالہ برنکمینز نوٹس آن اسلام اپنی تفسیر میں اعتراض کیا ہے۔ کہ یہ بے دلیل دعویٰ ہے۔ صرف یہ کہہ دیا ہے کہ یہ قرآن خدا کے سوا کوئی نہیں بنا سکتا تھا۔ اور یہ نہیں بتایا کہ کیوں۔ مجھے افسوس ہے کہ ریورنڈ ویری زبان کی ان باریک خوبیوں کے علم سے بالکل محروم ہیں۔ جن کے بغیر کوئی زبان زبان کہلانے کی مستحق ہی نہیں ہو سکتی۔ اور خصوصاً عربی زبان تو اس کمال میں خصوصیت رکھتی ہے۔ کہ وہ تھوڑے الفاظ میں زیادہ مضمون بیان کر دیتی ہے۔

کتب سابقہ کی پیشگوئیوں کی شہادت

اس آیت میں هذا کا لفظ اس دعویٰ کو واضح کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔ کہ قرآن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں بنا سکتا تھا۔ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اس قرآن کو۔ حالانکہ قرآن ایک ہی کتاب ہے دو کتابوں کا نام قرآن نہیں کہ "اس" کے لفظ کے لانے کی ضرورت ہوتی۔ "اس" کا لفظ اس اشارہ کے لئے لایا گیا ہے۔ کہ یہ کتاب اپنے مطالب کے لحاظ سے اس قدر بلند ہے۔ کہ اسے کوئی انسان بنا ہی نہیں سکتا۔ اور یہ فقرہ بے دلیل نہیں ہے۔ بلکہ

قرآن کریم کا کتب سابقہ کی تصدیق کرنا

دلیل پر مشتمل ہے اور اس میں صاف بتایا گیا ہے۔ کہ اس کے اندر بعض باتیں ایسی ہیں۔ جو صرف خدا ہی کی طرف سے آ سکتی ہیں۔ اور قرآن کریم کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ وہ باتیں کونسی ہیں۔ پس انہی باتوں کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ ہر زبان میں اس قسم کے جملے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً اردو میں بھی اس قسم کے فقرے بولے جاتے ہیں۔ کہ کیا یہ شخص جھوٹا ہو سکتا ہے یا کیا یہ بات غلط ہو سکتی ہے۔ اور کوئی عقلمند ایسا نہ ہوگا جو یہ کہے کہ یہ فقرہ بے دلیل ہے۔ کیونکہ ایسے فقروں کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہ ان کی بعض مشہور عام خوبیاں جن کے خاص طور پر بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہر شخص انہیں جانتا ہے۔ ایسی ہیں کہ انہیں مدنظر رکھتے ہوئے ممکن نہیں کہ وہ شخص جھوٹا ہو یا وہ بات غلط ہو۔ صرف "اس" کے لفظ سے یہ سب مضمون پیدا کر لیا جاتا ہے۔ غرض هذا کا لفظ اس آیت کے مطلب کو بالکل واضح کر دیتا ہے۔ مگر بعض مسیحی مشنری بغیر عربی زبان کی باریکیوں سے واقف ہونے کے قلم اٹھا لیتے ہیں۔ اور خود بھی غلطیوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان ناواقف لوگوں کو بھی مبتلا کرتے ہیں جو ان پر اعتبار کرتے ہیں۔ کاش کہ وہ بعض غیر متعصب مستشرقین سے ہی مشورہ کر لیا کرتے۔

دوسری دلیل قرآن کریم کے کامل روحانی ہدایت نامہ ہونے کی یہ دی ہے۔ کہ جس طرح اس کی اپنی پیشگوئیاں اس کے من دون اللہ ہونے کے خیال کو غلط ثابت کرتی ہیں۔ اسی طرح پہلے انبیاء کی پیشگوئیاں بھی اس خیال کو غلط ثابت کرتی ہیں۔ کیونکہ پہلے انبیاء کا کلام بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اور اس میں بھی اس کے متعلق بہت سی پیشگوئیاں ہیں۔ اگر اسے تسلیم نہ کرو گے۔ تو سب انبیاء کو جھوٹا قرار دینا ہوگا۔ کیونکہ ان کی وہ پیشگوئیاں جو اس کے متعلق ہیں غلط تسلیم کرنی ہونگی۔

قرآن کریم کا یہ طریق ہے کہ بجائے پہلوں کو جھٹلانے

کا مصدق قرار دینے کے پچھلوں کو پہلوں کا مصدق قرار دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح حضرت یحییٰ وغیرہم انبیاء کی نسبت اسی رنگ میں اس نے ذکر کیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گو پہلوں کی پیشگوئیاں پیچھے آنے والوں کی نسبت ہوتی ہیں۔ مگر بعد میں آنے والے انبیاء ان پیشگوئیوں کو پورا کر کے پہلے انبیاء کی صداقت پر مُہر لگاتے ہیں۔ اس حقیقت کے بیان کرنے کا بہترین طریق وہی ہے۔ جو قرآن کریم نے اختیار کیا ہے۔ کیونکہ یہ کہنا کہ اس نبی کے یا اس کلام کے پہلے انبیاء مصدق ہیں۔ اس قدر مؤثر نہیں ہو سکتا جس قدر یہ کہنا کہ اس کلام کے ذریعہ سے ہی پہلے نبی کی تصدیق ہوتی ہے۔ ورنہ اسے جھوٹا ماننا پڑتا ہے اس دلیل کے آگے پہلے انبیاء کے اتباع کو فوراً دبنا پڑتا ہے۔

مسیحی مشنریوں نے اس قسم کی آیات سے ایک انوکھا استدلال کیا ہے۔ اور وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ کہ ان آیات سے یہ نکلتا ہے۔ کہ قرآن کریم موجودہ توراۃ و انجیل کو انسانی دستبرد سے پاک قرار دیتا ہے۔ حالانکہ یہ کہنا کہ یہ کلام پہلے کلام کا مصدق ہے۔ صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ اب تک محفوظ بھی ہے۔ ایک ایسا نتیجہ ہے۔ جو الفاظ سے زائد ہے۔ اور زائد نتیجہ نکالنا درست نہیں ہوتا۔ قرآن کریم توراۃ اور انجیل کی تحریف کے حوالہ جات سے بھرا ہوا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس پر ایک زبردست شاہد ہے۔ اگر واقعہ میں ان آیات کا وہ مطلب ہوتا جو یہ لوگ بتاتے ہیں۔ تو اس وقت کے مسیحی اور یہودی اس پر اعتراض کرتے۔ لیکن ایسا اعتراض ان کی طرف سے بالکل ثابت نہیں ہے۔ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ کہ آپ نے فرمایا کہ یہود کی کتب میں جو باتیں ہیں ان کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب کرو۔ اگر ان کتب کو غیر محرف سمجھا جاتا۔ تو ان کی تصدیق سے کیوں روکا جاتا۔

کسی کتاب کا حوالہ دینا اس ساری کتاب کی درستی کو تسلیم کرنے کا مستلزم نہیں

باقی رہا یہ کہ قرآن کریم نے ان کتب کا حوالہ دیا ہے سو یہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ کتب محرف نہیں ہیں۔ سب دنیا تاریخی کتب کا حوالہ دیتی ہے۔ اور کوئی عقلمند کسی تاریخی کتاب کو شروع سے آخر تک صحیح نہیں سمجھتا۔ حوالہ سے مراد صرف اس خاص واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ نہ کہ سب کتاب کی۔

پہلی کتب قرآن کریم کی تفصیل کی محتاج ہیں

تیسری دلیل یہ دی ہے کہ قرآن کریم پہلی کتب کی تفصیل کرتا ہے۔ یہ بھی ایک زبردست ثبوت قرآن کریم کی صداقت کا ہے۔ بغیر قرآن کریم کے مضامین سے مدد لینے کے کوئی پہلی کتاب حل نہیں ہو سکتی۔ توراۃ انجیل۔ وید۔ ژند۔ اوستا سب کتب میں توحید صفات باری کے ظہور۔ وحی۔ نبوت۔ بعد الموت امور اخلاق امور روحانیہ وغیرہا کے متعلق بحثیں ہیں۔ لیکن کوئی کتاب بھی ان امور کو واضح کر کے بیان نہیں کرتی بلکہ قرآن کریم کی مدد سے ان کو حل کرنا پڑتا ہے۔ توحید سب سے بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اسی کو لے لو۔ ان کتب میں اس کا ذکر ہوگا مگر بالاجمال۔ چنانچہ قرآن کریم سے پہلے کی جو کتب توحید کے متعلق ان کتب کے پیرووں نے لکھی ہیں یا جو مضامین لکھے ہیں۔ انہیں پڑھ کر دیکھ لو وہ توحید کے متعلق بہت ہی ناقص معلومات دیتی ہیں۔ مگر قرآن کریم کے بعد ان کے پیرووں کی کتب کا رنگ ہی اور ہو گیا ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآنی مطالب کے پھیلنے سے ان لوگوں پر اصل حقیقت کھلی اور ان کی مدد سے انہوں نے اپنے مذہب کے عقائد کی تشریح کی۔ نبوت کا مسئلہ ایسا اہم مسئلہ ہے۔ لیکن توراۃ اور انجیل اور دوسری کتب اس کے متعلق اس حد تک خاموش ہیں۔ کہ ان کے پیرو اب تک نہیں بتا سکتے کہ نبی سے مراد ان کی کتب میں کن لوگوں سے ہے۔ مگر قرآن کریم نے اس مضمون کو بھی خوب واضح کیا ہے۔ یہی دوسرے اہم مسائل کا حال ہے۔ پس اس آیۃ میں بتایا گیا ہے۔ کہ پہلی کتب کے مطالب

کیا قرآن کریم موجودہ توریت و انجیل کو انسانی دستبرد سے پاک قرار دیتا ہے

مسئلہ توحید کی قرآن کریم میں تفصیل۔

مسئلہ نبوت کی تفصیل۔

کی تفصیل اس کتاب سے ملتی ہے۔ اگر تم اس کتاب کا انکار کرو گے۔ تو ماننا پڑے گا۔ کہ خدا تعالیٰ وہ باتیں اپنی کتب میں بیان نہ کر سکا۔ جو اس شخص نے ایک چھوٹی سی کتاب میں بیان کر دیں۔ پس یا اسے سچا ماننا پڑے گا یا پہلی کتب کو بھی جھوٹا ماننا پڑے گا۔

اس کتاب کا عالمین کے لئے ہونا اسکے من جانب اللہ ہونے پر گواہ ہے۔

چوتھی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ یعنی یہ کتاب اپنے دلائل خود بیان کرتی ہے۔ کسی کی مدد کی محتاج نہیں۔ اس میں مضامین ایسے رنگ میں بیان کئے ہیں کہ جو شخص ان پر پورے طور پر تدبر کرے اسے ساتھ کے ساتھ دلائل ملتے جاتے ہیں اور شک اس کتاب کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ خود دلائل بیان کر دیتی ہے۔ بلکہ شک اگر پیدا ہوتا ہے۔ تو انسان کی اپنی غفلت اور سستی کی وجہ سے اور یہ امر بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کتاب خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ کیونکہ یہ بات کسی انسان کی طاقت میں نہیں ہے کہ وہ امور غیبیہ کو پورے طور پر ثابت کر سکے کیونکہ ان میں سے کئی خالی عقلی دلیل سے ثابت نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اس کے ساتھ مشاہدہ کی دلیل کے بھی محتاج ہوتے ہیں۔ اور امور غیبیہ کے لئے مشاہدہ کے سامان پیدا کر دینا انسان کی طاقت سے بالا ہے اور صرف خدا تعالیٰ کے لئے ممکن ہے۔ کہ امور غیبیہ کے لئے ایسے ثبوت بہم پہنچا دے جو مشاہدہ کا رنگ رکھتے ہوں۔

امور غیبیہ کا پورے طور پر بیان۔

مثلاً الہام ایک امر غیبی ہے۔ ایک انسان عقلی دلیلیں تو دے سکتا ہے۔ لیکن الہام کا دروازہ کسی کے لئے نہیں کھول سکتا۔ نہ اس کا وعدہ کر سکتا ہے مگر خدائی کلام یہ کر سکتا ہے۔ وہ یہ دعویٰ بھی کر سکتا ہے کہ میرے ساتھ تعلق رکھنے والوں پر الہام کا دروازہ کھولا جائیگا۔ اور اس کے اس دعویٰ کی تصدیق خدا تعالیٰ کے فعل سے بھی ہو سکتی ہے۔ پس جو کلام کلام الٰہی کے نازل ہونے کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرے کہ یہ عجیب بات نہیں۔ اب بھی کلام الٰہی نازل ہوتا ہے

اپنے متبعین پر الہام کا دروازہ کھولنا۔

اور ہوتا رہے گا۔ اور سینکڑوں لوگ اس کے ذریعہ سے کلام الٰہی کو سنیں گے۔ اس کے خدائی کلام ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بندہ کی طاقت میں نہیں ہے۔ کہ ایسے ثبوت بہم پہنچا سکے اور شک کا اس طرح قلع قمع کر سکے۔

پانچویں دلیل یہ دی ہے کہ یہ کلام رب العٰلمین خدا کی طرف سے ہے۔ یعنی اس کی تعلیم میں خدا تعالیٰ کی طرف سے رب العٰلمین کی صفت ظاہر ہوئی ہے کسی قوم یا کسی زمانہ سے مخصوص نہیں جس طرح کہ پہلی کتب ہوتی تھیں۔ بلکہ سب اقوام اور سب زمانوں کیلئے ہے۔ اور ہر زمانہ کی ضرورتوں اور اس کے مفاسد کا اس میں خیال رکھا گیا ہے۔ اور یہ امر بھی کسی انسان کی طاقت میں نہیں کہ وہ سب اقوام اور سب زمانوں کا خیال رکھ سکے۔ انسان تو اپنے گردو پیش کے حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ اور اپنی اُن ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے جو اس کے سامنے ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ایسی تعلیم آ سکتی ہے۔ جو ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے یکساں مفید ہو۔ اور زمانہ کے تغیرات اس پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں۔ اور انسانی فطرت کے تمام تقاضاؤں اور تمام احساسات کا اس میں خیال رکھا گیا ہو۔ قرآن کریم میں یہ خوبی پائی جاتی ہے۔ وہ یکساں طور پر تمام انسانی طبائع کا لحاظ رکھتا ہے۔ نہ اس میں یہ تعلیم ہے۔ کہ تو صرف رحم ہی کئے جا اور نہ یہ کہ تو معاف ہی نہ کر۔ بلکہ یہ تعلیم ہے۔ کہ تو رحم کے موقع پر رحم کر اور سزا کے موقع پر سزا دے۔ اسیطرح تمام تعلیمات اس کی ایسی ہیں کہ ان میں تمام طبائع اور تمام زمانوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور جاہل اور عالم کا خیال رکھا گیا ہے۔ اور یہ ایک زبردست ثبوت اس کے خدا کا کلام ہونے کا ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین ؀

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا

کیا وہ کہتے ہیں کہ اس (شخص) نے اسے (اپنی طرف سے) گھڑ لیا ہے۔ تو (انہیں) کہہ (کہ) اگر تم (اس بیان میں) سچے ہو تو

مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ۳۹

اس جیسی کوئی ایک (ہی) سورت لے آؤ۔ اور اللہ کے سوا جس کسی کو بھی بلانے کی تمہیں طاقت ہو (اپنی مدد کے لئے) بلا لو ۳۹ھ

۳۹ھ حل لغات السورۃ۔ المنزلة مرتبہ الرفعة بلندی مرتبہ۔ الفضل۔ فضیلت۔ الشرف عظمت وبزرگی۔ ماطال من البناء الی جھة السماء وحسن بلند اور خوبصورت عمارت۔ العلامة دلیل ونشان۔ القطعة المستقلة۔ مستقل حصہ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی باوجود ان خوبیوں کے جو اوپر بیان ہوئیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا افتراء ہے۔ اگر ان خوبیوں والا کلام افتراء ہو سکتا ہے۔ تو پھر کیوں یہ لوگ ایسا کلام بنا کر پیش نہیں کرتے۔ اس آیت میں قرآن کریم نے تحدی کی ہے۔ مگر افسوس کہ مفسرین نے اس کی پوری حقیقت کو نہیں سمجھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ اس دعوٰی میں صرف زبان کو نہیں بلکہ قرآن کریم کی سب خوبیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ اس دعوٰی سے یہ مراد ہے۔ کہ جو کوئی کلام بنا کر اس کے مقابل پر پیش کریگا۔ وہ ہلاک ہو جائیگا۔

میرے نزدیک جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں مفسرین نے اس مضمون کی حقیقت کو جو اس جگہ بیان ہوا ہے نہیں سمجھا یہ مضمون مختلف الفاظ میں کئی مقام پر بیان ہوا ہے۔ اور لوگوں نے غلطی سے یہ خیال کیا ہے کہ مختلف زمانوں میں قرآن کریم نے اپنے دعوٰی کو بدلا ہے۔ کبھی پورے قرآن کریم کی مثال لانیکو کہا ہے۔ کبھی دس سورتوں کی مثال لانے کو۔ اور کبھی ایک سورۃ کی مثال لانے کو۔ مگر میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ان سب جگہوں پر الگ الگ مضمون بیان ہوا ہے۔ اور مختلف طریق پر مثال لانے کا مطالبہ کیا ہے۔ مثلاً اس آیت میں جو یہ دعوٰی ہے۔ کہ فأتوا بسورة مثله اس سے مراد سارا قرآن کریم نہیں ہے بلکہ مراد اوپر کی آیت ہے اور سورت سے مراد اس جگہ علامت ہے یعنی دلیل۔ اور یہ پوچھا گیا ہے کہ جو دلیلیں ہم نے اوپر دی ہیں اگر یہ کلام انسانی کلام ہے۔ تو کسی انسانی کلام میں وہ پانچوں دلیلیں جمع کر کے دکھانا تو بڑی بات ہے تم ایسا انسانی کلام ہی پیش کر دو۔ جس میں ان میں سے ایک دلیل ہی پائی جاتی ہو۔ مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ کہ اوپر کی بیان کردہ دلیلوں اور صداقت کی علامتوں میں سے ایک علامت بھی کسی انسانی کلام میں نہیں پائی جا سکتی۔ اور یہ دعوٰی قرآن کریم کا ایسا ہے۔ کہ اس کا جواب نہ اب تک کوئی دے سکا ہے۔ اور نہ آیندہ دے سکیگا۔ اب بھی یہ تحدی موجود ہے۔ اس زمانہ میں کوئی شخص ان پانچ علامتوں والا کلام تو الگ رہا۔ ان میں سے ایک علامت والا کلام ہی بنا کر قرآن کریم کے مقابل پیش کر دے۔ تو ہم قرآن کریم کے دعوے کو باطل سمجھ لیں گے۔ مگر زمین و آسمان ٹل جائیں۔ کوئی شخص ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ پانچوں علامتیں صرف اور صرف خدا تعالیٰ کے کلام میں پائی جا سکتی ہیں۔ کوئی بندہ ان میں خدا تعالیٰ کی نقل نہیں کر سکتا۔ اگر سورۃ سے مراد سورۃ ہی لی جائے۔ تب بھی اس سے مراد یہ ہوگی۔ کہ جس قسم کا کلام ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔ ایسی کوئی سورۃ بنا کر پیش کرو۔ لیکن اس صورت میں معنوں میں وہ وسعت نہیں رہتی۔ جو اون معنوں میں ہے۔ کیونکہ ان معنوں میں ان مطالب کا پوری سورۃ کا مطالبہ کیا ہے۔ اور پہلے معنوں میں مذکورہ بالا دلیلوں میں سے کسی ایک دلیل کا۔

سورۃ

اس سورۃ کی تحدی میں سورۃ سے مراد ایک دلیل ہے

نظیر لانے کے لئے تحدی

اس تحدی کے بیان میں قرآن کریم میں کوئی اختلاف نہیں

لفظ سورۃ سے مراد پوری سورۃ لینے سے معنوں میں وسعت نہیں رہتی

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ

(مگر ان کا یہ خیال درست نہیں) بلکہ (حقیقت یہ ہے) انہوں نے (ایک) ایسی چیز کو جھٹلا دیا ہے جس کا انہوں نے پورا علم حاصل (ہی) نہیں کیا تھا

تَأْوِيْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ

اور (ابھی) اس کی حقیقت ان پر ظاہر ہوئی تھی۔ جو لوگ ان سے پہلے تھے۔ انہوں نے (بھی) اسی طرح جھٹلایا تھا۔ پھر دیکھ

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۴۰

(کہ) ان ظالموں کا کیا انجام ہوا تھا ۵۴۰

باقی مقامات جن میں اس دعویٰ کو دوسرے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے متعلق انشاء اللہ سورہ ہود میں تفصیل سے بیان کیا جائیگا۔

وادعوا من استطعتم من دون الله کے جملہ سے

وادعوا من استطعتم

اس مضمون کو اور بھی زوردار کر دیا ہے کہ خود ہی زور نہ لگاؤ بلکہ اپنے لیڈروں اور معبودان باطلہ کو بھی بلا لو۔ اور پھر دیکھو کہ تم کیسے ناکام رہتے ہو۔ تا دنیا پر بھی یہ ثابت ہو جائے کہ جس کتاب کو تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہو۔ اسے تم اور تمہارے لیڈر اور تمہارے معبود بھی ملکر نہیں بنا سکتے ✦

تاویل

۵۴۰ حل لغات۔ التاویل۔ الظن بالمراد۔ کسی کلام کے مطلب و مدعا کی نسبت ظن غالب بیان احد محتملات اللفظ۔ کسی لفظ کے کئی احتمالی معانی میں سے کسی ایک کی تعیین کرنا۔ العاقبۃ۔ انجام۔ اوّل الشیٔ رجعہ۔ لوٹایا۔ الکلام دبرہ و قدرہ و فسرہ۔ تدبر کیا اور اس کا صحیح مطلب نکالا الرؤیا عبرھا۔ تعبیر کی۔ (اقرب)

قرآن کریم کو کفار کے افترا قرار دینے کی وجہ۔

تفسیر۔ یعنی یہ جو افترا افترا کہتے رہتے ہیں۔ ان کی بات پر تعجب نہیں کرنا چاہئے۔ انسان جب کسی بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ تو اُسے غلط قرار دیدیا کرتا ہے۔ یہ بھی جب قرآن کریم کے مطالب کو نہ پہنچ سکے اور اپنے متداول علوم اور رائج قانون کے اسے خلاف پایا۔ تو جھٹ اس کا انکار کر بیٹھے۔ زمخشری کا قول ہے۔ بل سارعوا الی التکذیب بالقراٰن وفاجؤہ فی بدیھۃ السماع قبل ان یفھموہ ویعلموا کنہ امرہ (بحر محیط)۔ یعنی انہوں نے قرآن کے جھٹلانے میں جلدی کی اور سمجھنے اور اس کی حقیقت معلوم کرنے سے پہلے ہی اس کا مقابلہ شروع کر دیا۔

ولما یاتھم تاویلہ۔ ابن عطیہ کہتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ابھی انجام ظاہر نہیں ہوا اور وعید پوری نہیں ہوئے کہ پہلے ہی انہوں نے شور مچا دیا۔

یہ شور ان لوگوں کا نیا نہ تھا۔ بلکہ پہلے انبیاء کے مخالفین بھی ایسا ہی کرتے چلے آئے ہیں۔ بلکہ حق کا مقابلہ کرنیوالے ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس وقت کا انتظار نہیں کرتے۔ جب حقیقت کے انکشاف کا وقت آئے۔ اور پہلے ہی انکار شروع کر دیتے ہیں۔

اگر یہ سوال کیا جائے۔ کہ اگر ایک لمبے عرصہ تک انبیاء کی بعض باتوں کی حقیقت کے انکشاف کا انتظار ضروری ہے۔ تو پھر ان پر ابتداء دعویٰ میں ایمان لانا تو درست نہ ہوا۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اس جگہ یہ ذکر نہیں۔ کہ ایسے ثبوت نبیوں کے پاس نہیں ہوتے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ

اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اس پر ایمان لے آئینگے۔ اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائینگے

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ ۴۱ ع ۱۰/۹

اور تیرا رب فساد کرنے والوں کو خوب جانتا ہے ۱۴۱ اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو (انہیں) کہہ (کہ)

لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ

میرا کیا (خود) میرے لئے (مفید یا مضر) ہوگا اور تمہارا کیا تمہارے لئے — جو کچھ میں کرتا ہوں اس سے تم بری (الذمہ) ہو

وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ ۴۲

اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری (الذمہ) ہوں ۱۴۲

جن کی مدد سے انسان ابتداء ہی میں انہیں مان سکے۔ بلکہ یہ ذکر ہے کہ وہ لوگ جو بعض صداقتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ بعض خاص امور کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا کم سے کم فرض یہ ہے۔ کہ وہ اس وقت تک تکذیب تو نہ کریں۔ اگر وہ ثابت شدہ حقائق کو تسلیم نہیں کرتے۔ تو ان کا یہ حق بھی تو نہیں۔ کہ جن امور کے متعلق انہیں شبہ ہے ان کی حقیقت کے اظہار سے پہلے ان پر اعتراض شروع کر دیں۔

کذلک کذب الذین من قبلھم یعنی پہلے لوگ بھی نبیوں سے اسی طرح کرتے چلے آئے ہیں۔ یونہی شور مچا دیتے تھے۔

ریورنڈ ویری صاحب نے بحوالہ مسٹر برنکمین اعتراض کیا ہے کہ جب اہل مکہ کو پورا علم نہیں ہوا تھا۔ اور انہوں نے شور مچا دیا تھا۔ تو پھر ان کا کیا قصور تھا۔ مگر ویری صاحب نے یہ نہیں سمجھا۔ کہ پورا علم حاصل نہ ہونا اور بات ہے اور نہ ہو سکنا اور بات ہے۔ قرآن کریم یہ نہیں کہتا کہ انہیں پورا علم حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ انہوں نے پورا علم حاصل نہ کیا تھا۔ اور جب انہوں نے پیش کردہ باتوں پر غور ہی نہیں کیا۔ اور صرف دجل منھم کہکر انکار کر دیا۔ تو وہ الزام سے کیونکر بری ہو سکتے تھے۔

۱۴۱ — یعنی باوجود ان لوگوں کی اس حالت کے یہ سب لوگ ہدایت سے محروم نہیں رہینگے۔ بلکہ بعض لوگ اپنی حالت کو بدلکر ایمان لائینگے۔ اور صرف وہ لوگ ہدایت سے محروم رہینگے۔ جو آخر تک فساد پر مُصِر رہینگے۔ گویا بتایا کہ ڈھیل کی وجہ موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ صرف عقلی امکان ہی نہیں ہے۔ کہ کفار مکہ میں سے بعض لوگ ڈھیل پا کر ایمان لا سکتے ہیں۔ بلکہ ہمارا علم ہمیں بتاتا ہے۔ کہ فی الواقع بھی ان منکروں میں سے بعض لوگ ایمان لے آئینگے۔ اس وجہ سے ہم فوراً عذاب نہیں دیتے۔ بلکہ ڈھیل دے رہے ہیں۔

یہ کیسی زبردست پیشگوئی ہے جو اپنے وقت پر پوری ہوئی۔ اگر اہل مکہ شروع مخالفت میں ہی تباہ کر دیے جاتے تو خالد بن ولید، عمرو بن عاص، عکرمہ اور اور ایسے ہی جلیل القدر بطل اسلام کہاں سے پیدا ہوتے۔

۱۴۲ حل لغات۔ برئ منه — یبرؤ براءۃ تخلص وسلم بچ گیا۔ بے تعلق رہا۔ محفوظ رہا۔ برئ من المرض برءً بالضم۔ واھل الحجاز یقولون برءَ

براء

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ

اور ان (لوگوں) میں سے (بعض ایسے) ہیں۔ جو تیری (باتوں کی) طرف (ہر وقت) کان رکھتے ہیں۔ (تو) کیا پھر کیا تو

الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ○

ایسے بہروں کو اگرچہ وہ عقل سے کام (بھی) نہ لیتے ہوں (اپنی بات) سنوا لیگا ۵۴۳

بالفتح نفعہ ونفعانی دشمنی۔ صحبت یاب ہوگیا (اقرب)

تفسیر۔ فرمایا۔ کہ اگر تم میری تکذیب کرتے ہو۔ اور مجھے جھٹلاتے ہو۔ تو بیشک ایسا کرو کیونکہ تم میں اور مجھ میں اختلاف ہے۔ تم اور کام کر رہے ہو اور میں اور کام کر رہا ہوں۔ اور اختلاف کی صورت میں ہر فریق کو حق ہے۔ کہ دوسرے کی بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن بات اسی حد تک ہی رہنی چاہیئے۔ ایک دوسرے کو اس کی مرضی کے خلاف اپنی بات منوانے پر مجبور نہیں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ جب میں تمہیں مجبور نہیں کرتا تو تم مجھے کیوں مجبور کرتے ہو۔

لا اکراہ فی الدین

پہلی آیت میں جو اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِیْنَ کہا تھا۔ اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جب تمہاری جماعت الگ اور ہماری جماعت الگ۔ تمہارے کام علیحدہ اور ہمارے کام جدا۔ اور ہر ایک اس بات کو جانتا ہے۔ تو پھر فساد اور جبر تک نوبت کیوں پہنچائی جائے۔ کیونکہ جبر تو اس صورت میں ہو سکتا ہے۔ جبکہ ایک کی وجہ سے دوسرے پر حرف آتا ہو۔ لیکن اس جگہ میرے یا میری جماعت کے کاموں کی وجہ سے تم پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔ اور تمہارے کاموں کی وجہ سے مجھ پر کوئی حرف نہیں آ سکتا پس جبر نا جائز ہے۔

صُمّ

اس جگہ سے ایک مسئلہ نکلتا ہے کہ اپنی قوم کے آدمی پر ایک حد تک جبر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے قوم بدنام ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے ماتحت جب ہم اپنی جماعت کے بعض لوگوں کی غلطی پر جرمانہ وغیرہ کی سزا مقرر کرتے ہیں۔ تو بعض نادان اُسے پیر پرستی قرار دیکر اور شور مچاتے ہیں۔ حالانکہ اس آیت سے ثابت ہے کہ اپنی جماعت کے لوگوں پر ایک حد تک جبر ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص احمدی کہلاتا ہوا ڈاکہ زنی کی وارداتیں کرتا ہے یا نمازیں چھوڑ بیٹھتا ہے۔ تو چونکہ اس سے ساری جماعت کی بدنامی ہوتی ہے۔ اس لئے ہمارا حق ہے۔ کہ اس شخص کو اصلاح کے لئے مجبور کریں۔ ہاں اگر وہ احمدیت سے ہی انکار کر کے جدا ہو جائے۔ یا اپنا کوئی نیا فرقہ بنالے۔ تو پھر ہمارا اس پر کوئی حق نہ ہوگا۔ غرض انتم بریئون مما اعمل میں بتایا ہے۔ کہ میرے اور تمہارے الگ الگ گروہ ہیں۔ میرے کاموں کی وجہ سے تم پر الزام نہیں آئیگا۔ اس لئے جبر یا فساد کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اس آیت کے دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ میرے اور تمہارے عمل بالکل ممتاز ہیں۔ ان میں کوئی تشابہ نہیں ہے۔ نتیجہ خود بتادے گا۔ کہ کس کے عمل صحیح اور خدا کے ہاں مقبول تھے۔ عمل کے متشابہ ہونے کی صورت میں صحیح طور سے نہیں کہہ سکتے۔ کہ خرابی یا ترقی کس سبب سے پیدا ہوئی۔ لیکن جب کوئی تشابہ ہی نہ ہو۔ تو فوراً پتہ لگ سکتا ہے۔ کہ نتیجہ اس قوم کے مخصوص اعمال کا ہے۔

۵۴۳ حل لغات۔ صُمٌّ اَصَمُّ کی جمع ہے۔ صَمَّ الرَّجُلُ صَمًّا وَصَمَمًا انسدت اذنه وثقل سمعه فهو اصمّ۔ بہرہ۔ الاصمّ ایضًا الرجل لا یطمع فیه ولا یرد عن هواه۔ ایسا شخص جس کے راہ راست پر آنے کی امید نہ کی جاسکے۔ اور نہ اسے

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَ

اور ان میں سے بعض ایسے (بھی) ہیں جو تیری طرف (نظریں لگا کر) دیکھتے (رہتے) ہیں (تو) کیا پھر تو ان اندھوں کی اگرچہ وہ بصیرت

لَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ ۴۴

(بھی) نہ رکھتے ہوں راہنمائی کرے گا ۵۴۴ اللہ (تعالیٰ کی شان) یقیناً (ایسی ہے کہ وہ) لوگوں پر

شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ ۴۵

کچھ بھی ظلم نہیں کرتا۔ بلکہ لوگ اپنی جانوں پر (آپ ہی) ظلم کرتے ہیں ۵۴۵

ہوا پرستی سے روکا جا سکے (اقرب)

تفسیر اس آیت اور اگلی آیت میں مخالفین اسلام کے انکار کی حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔ کہ ان کا انکار کسی دلیل یا معقول بات پر مبنی نہیں ہے۔ صرف ضد کی وجہ سے ہے وہ بظاہر تیری باتیں سنتے ہیں۔ مگر درحقیقت ان کی تمام توجہ اعتراض پیدا کرنے کی طرف ہوتی ہے۔ نیز فرمایا کہ بہرہ اگر عقلمند ہو۔ تو اسے بھی اشارہ سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ مگر ان کی حالت تو بیوقوف بہرہ کی سی ہے جو اشارے بھی نہیں سمجھتا۔

۵۴۴ حل لغات۔ عُمْی اَعْمٰی کی جمع ہے۔ اس کا فعل عَمِیَ ہے۔ عَمِیَ ذَھَبَ بَصَرُہٗ کُلُّہٗ مِنْ عَیْنَیْہِ کِلْتَیْھِمَا۔ یعنی آنکھوں سے اندھا ہو گیا۔ دُوْنَ ذَھَبَ بَصَرُ قَلْبِہٖ وَجَھِلَ دل کا اندھا اور بصیرت سے کورا ہو گیا۔ غَوِیَ بے راہ ہو گیا (اقرب)

تفسیر ترجمہ والے عام طور پر یہاں غلطی کر جاتے ہیں۔ اور لا یبصرون کے معنی "نہیں دیکھتے" کر دیتے ہیں حالانکہ جب انہیں پہلے اندھا قرار دیا جا چکا۔ تو پھر لا یبصرون کے معنی نہ دیکھنے والے کرنا۔ کیونکر درست ہو سکتے ہیں۔ بلکہ جس طرح سے کہ پہلے انہیں بہرے قرار دے کر عقل کی نفی کی تھی ایسا ہی یہاں پر انہیں اندھے بنا کر بصارت کی نہیں بلکہ بصیرت کی نفی کی ہے۔ کیونکہ اندھے ہونے کے باوجود بھی اگر ان میں بصیرت ہو۔ تو وہ ہدایت حاصل کر سکتے ہیں۔

مخالفین کے انکار کی حقیقت

اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ محض ظاہر کو دیکھ کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ظاہر پر نظر رکھنے والا بعض اوقات کہہ اٹھتا ہے کہ یہ کافر ہیں۔ ان پر عذاب کیوں نازل نہیں ہوتا۔ حالانکہ ان دشمنوں میں بھی ایسے لوگ ہیں جو عقل رکھتے ہیں اور ان کے ہدایت پانے کی امید کی جا سکتی ہے۔ اور دوسری طرف بعض آدمی ماننے والے خیال کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ ایسے ہیں جو سنتے ہوئے نہیں سنتے اور دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ بلکہ ان کی نظر ہمیشہ اعتراض کی طرف رہتی ہے۔ نہ ان میں عقل ہے نہ بصیرت اسی وجہ سے عذاب اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ دوسرا شخص ظاہر سے دھوکا کھانے کی وجہ سے اس کو غلط طور پر وارد کر سکتا ہے۔ ان معنوں کی رو سے یہ آیتیں وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ کی تفسیر ہیں۔ یعنی انسان ظاہر پر نظر ڈال کر غلطی کر سکتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ حقیقت کو جانتا ہے۔

محض ظاہر پر نظر رکھ کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے

عمی

۵۴۵ اس آیت میں کیا ہی لطیف بات بیان فرمائی ہے جس طرح ٹیپ کا مصرعہ دل پر پڑتا ہے اسی طرح یہ آیت ہے۔ فرمایا۔ ہم جنہوں نے نبی بھیجا۔ ہم تو منکروں کو ڈھیل دے رہے ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ یہ لوگ جلد ہلاک ہوں۔ لیکن یہ لوگ عذاب کی جلدی کرتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ان پر ظلم ہو یعنی ان کے لئے حصول ہدایت کا ابھی موقع باقی ہو۔ اور عذاب آجائے

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً

اور جسدن وہ انہیں ایسی حالت میں جمع کریگا۔ کہ (وہ محسوس کرتے ہونگے کہ) گویا وہ دن کی ایک ساعت کے سوا (دنیا میں)

مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ

نہیں بسے تھے (اس دن) وہ ایک دوسرے (کی حالت) کو معلوم کریں گے (یاد رکھو کہ) جن لوگوں نے اللہ (تعالیٰ) کے حضور پیش ہونے

كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ ۴۶

(کے وعدہ) کو جھٹلایا اور وہ ہدایت کو قبول کرنیوالے نہیں بنے۔ انہوں نے نقصان (ہی) اٹھایا ۴۶

مگر یہ لوگ تو ولایا عملاً عذاب کے لئے شور مچاتے ہیں۔

اس آیت میں ان تمام آیتوں کا جواب دے دیا گیا ہے۔ جن سے لوگ یہ نکالا کرتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ نے ہی بندوں کے دلوں پر مہر کر دی ہے۔ یا تقدیر کے مسئلہ کے ماتحت کر دیتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ نے ہی چور اور ڈاکو بنا دیئے ہیں کیونکہ یہ تمام باتیں ظلم پر مبنی اور ہدایت سے دور لیجانے والی ہیں۔ مگر اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ بالکل ظلم نہیں کرتا۔ بلکہ ہدایت پانے کے لئے جس قدر ممکن ہوسکے موقع دیتا ہے۔

ساعۃ

۴۶ حل لغات۔ الساعة۔ ستّون دقیقةً ایک گھنٹہ یا ساٹھ منٹ۔ الوقت الحاضر اسی وقت۔ عبارةٌ من جزء قلیل من النھار اوالليل۔ دن یا رات کا کچھ تھوڑا سا حصہ۔

تعارف

یتعارفون عَرَفَ میں سے باب تفاعل کا فعل مضارع ہے۔ تعارف القوم عرّف بعضھم بعضا۔ ایک دوسرے کو پہچانا۔ ایک دوسرے کے متعلق آگاہی حاصل کی (اقرب)

تفسیر۔ کذبوا بلقاء اللہ میں یہ فرمایا کہ اگر وہ خوف سے ملنے والے ہوتے۔ تو بھی نفار کی یاد سے ڈر جاتے۔ اور اگر محبت سے ملنے والے ہوتے۔ تو بھی وہ اس میں ترقی کرتے اور ان کی اطاعت پہلے سے زیادہ ہوتی۔

گھڑی سے مراد

ساعۃ من النہار کے معنوں میں لوگوں کو بڑی غلطی لگی ہے۔ اس کے معنی دن کی ایک گھڑی کر کے پھر وہ اس بات کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ کہ کونسی گھڑی اور کتنی بڑی گھڑی۔ اور پھر تطبیق دینے کے لئے انہیں اور بھی مشکل پیش آئی ہے قرآن شریف میں متعدد جگہ کفار کے دنیا میں ٹھہرنے کو ساعۃ من النہار ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن ان تمام جگہوں میں ان کے ٹھہرنے کا وقت بتانا مراد نہیں۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ ان کی زندگی خواب غفلت میں ہی گذری ہے۔ جس کی یہ وجہ ہے۔ کہ نہار یعنی دن کا وقت کام کرنے کا ہوتا ہے اور کفار چونکہ اپنے اوقات کا بیشتر حصہ دنیا کمانے میں ہی گذارتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضاء کو حاصل کرنے سے بالکل غافل رہتے ہیں۔ اس لئے اُن کے متعلق یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔ کہ وہ دن کا نہایت ہی قلیل حصہ دنیا میں رہے ہیں۔ خواہ بظاہر وہ لاکھوں برس ہی دنیا میں کیوں نہ رہے ہوں۔ کیونکہ اس وقت سے انہوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اور جس کام کے لئے وہ دنیا میں آئے تھے۔ اسکو انہوں نے اُسے استعمال نہیں کیا۔ اس لئے ان کے دن بھی راتیں ہی ہوگئے۔ اور وہ گویا دن کی ایک گھڑی بھر ہی دنیا میں رہے ہیں۔

پس ان الفاظ میں لمبے عرصہ تک ٹھہرنے کا رد نہیں بلکہ ان کے کام کے زمانہ کو چھوٹا کر کے بتانا مقصود ہے۔

وَاِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ

اور جس (عذاب کے بھیجنے) کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں اگر ہم اسکا کوئی حصہ (تیری سامنے بھیجکر) تجھے دکھادیں (تو تو بھی دیکھ لیگا) اور (اگر ہم

فَاِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا یَفْعَلُوْنَ ۝ ۴۷

(اس گھڑی سے پہلے) تجھے وفات دیدیں تو تجھے مابعد الموت میں حقیقت معلوم ہوجائیگی کیونکہ بہرحال انہیں ہماری طرف لوٹنا ہی ہے پھر یہ بات بھی ہے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اسے (دیکھ رہا ہے)

اگر مقدار بتانا مدنظر ہوتا۔ تو نہار کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ رات سے بھی وقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غرض یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں تو ان کی آنکھوں پر پردے چھائے ہوئے ہیں لیکن قیامت کو ان پر پورا انکشاف ہوجائیگا۔ کہ وہ نکمے پڑے رہے اور سوئے رہے اور کوئی کام نہیں کیا +

یتعارفون بینہم یعنی وہ ایک دوسرے کی حقیقت سے آگاہ ہوجائینگے۔ اس دنیا میں تو لوگ باوجود آپس کے سخت اختلاف کے انبیاء کے مقابلہ میں جمع ہوجاتے ہیں۔ اور ان کی مخالفت میں بڑا حصہ لینے لگتے ہیں۔ اور انہیں برا بھلا کہنا شروع کردیتے ہیں۔ لیکن قیامت کے دن ان سب پر حقیقت آشکار ہوجائیگی اور وہ سمجھ لینگے کہ ہم آپس میں بھی ایک دوسرے کو دھوکا دیتے رہے ہیں۔ وہ اس دن پھوٹ۔ تفرقہ۔ اور فضیحت کو محسوس کرینگے۔

مفسرین نے اس کے یہ معنی کیئے ہیں کہ آپس میں پہچان لیں گے یعنی بیٹا باپ کو اور باپ بیٹے کو شناخت کرلیگا مگر اس مضمون کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی اصل بات یہ ہے۔ کہ انہوں نے اس آیت پر غور نہیں کیا۔ معرفت کے معنی صرف ظاہری صورت کو پہچان لینے کے نہیں ہوتے بلکہ حقیقت کے جان لینے کے بھی ہوتے ہیں۔ اور یہی اس جگہ مراد ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی کہا کرتے ہیں کہ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے یعنی آپ کی حقیقت جان لی ہے۔ اسی طرح قیامت کو یا جب خدائی فیصلہ اس دنیا میں ظاہر ہوگا۔ اس وقت ان لوگوں کو معلوم ہوگا کہ نبیوں کی خیرخواہی کیسی تھی۔ اور ان کی کیا قدر تھی۔ اور ان کے دوستوں کی حالت اور قیمت کیا تھی۔

تکذیب لقاء الٰہی کے بد نتائج

کذبوا بلقاء اللہ میں یہ بتایا ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی تکذیب کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں نے بھی آج اس بات کو چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے وہ گر رہے ہیں۔ اگر انسان کو یہ مدنظر رہے۔ کہ خدا مل سکتا ہے۔ تو خوف رکھنے والی طبیعت میں ڈر پیدا ہوجاتا ہے اور محبت رکھنے والا دل اپنے محبوب سے ملنے کی امید میں تڑپ جاتا ہے پس ایک زبردست قوت محرکہ یا موٹو پاور ہوجاتی ہے۔ تو نتیجہ بجز غفلت کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

اِمَّا

۴۷ حل لغات۔ اِمّا اصل میں اِن ما ہے۔ ما زائدہ ہے۔ زائدہ ایک اصطلاح ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ حرف یا لفظ پہلے لفظ یا حرف کے معنوں کی تاکید کرتا اور ان میں قوت اور زیادتی پیدا کرتا ہے۔ اور اسکے بڑھنے سے کلام کے اندر ایک نئی خاصیت پیدا ہوجاتی ہے جو اس کے اصل مفہوم کو زیادہ زوردار بنا دیتی ہے۔ اِنْ کے ساتھ مَا کے بڑھنے سے اس کے معنی میں جو زیادتی پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اکیلا اِنْ تو محض ایک احتمال کا اظہار کرتا ہے۔ (خواہ وہ واقعی ہو یا خود پیدا کردہ) جس کے ساتھ توقع کا پایا جانا ضروری نہیں ہوتا اور اِمّا ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں توقع بھی ہو۔ یعنی لفظ ما لفظ اِنْ کے ظاہر کردہ احتمال کو زوردار بنا کر اس کے متعلق توقع کا اظہار بھی کرتا ہے۔

تَوَفّٰی

نَتَوَفَّیَنَّ باب تفعّل سے فعل مضارع ہے جس کا ماخذ وفاۃ ہے۔ چنانچہ کلیات ابی البقاء میں لفظ توفّی کے ذیل میں ہے والفعل من الوفاۃ۔ اور وفات کے معنی موت کے ہیں (اقرب) توفّی اللہ

زیدًا اقبض روحه - اس کی جان نکال لی - اُسے وفات دیدی - اس کی روح کو قبض کر لیا - تُوُفِّیَ فلانٌ مجہولًا قبضت روحہ ومات - اس کی جان نکال لی گئی - اور وہ مرگیا - فا اللہ المتوفّی والعبد المتوفّٰی - غرض ان معنوں میں اس کے استعمال کے وقت اس کا فاعل اللہ اور مفعول بندہ ہوتا ہے - (اقرب)

تفسیر - عام طور پر عربی سے ناواقف لوگ اس آیتہ کا ترجمہ کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں - اصل میں یہ دو الگ الگ جملے ہیں - واما نرینک بعض الذی نعدھم ایک جملہ اور اونتوفینک دوسرا جملہ - پہلے جملہ کے معنی یہ ہیں کہ اگر ہم دکھا دیں تجھے بعض ان میں سے - جو ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں - یعنی وہ غیب کی خبریں جو ہم نے ان کے متعلق تجھے بتائی ہیں - ان کا بعض حصہ تیری زندگی میں پورا کر دیں تو تو ان کو دیکھ لیگا - اس جگہ پر فذاک محذوف ہے - اور اس جملہ میں وعیدی پیشگوئیاں مراد ہیں - جیسا کہ ان کے الفاظ سے ظاہر ہے کیونکہ کافروں سے خدا تعالےٰ نے انعامات کا وعدہ نہیں کیا تھا -

اما نرینک کے معنی

وعدیں وعیدی پیشگوئیاں

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ وعدہ کا لفظ وعدہ اور وعید دونوں کے لئے استعمال ہو جاتا ہے لیکن وعید کا لفظ عذاب کی پیشگوئی کے لئے خاص ہے -

اونتوفینک یا ہم تجھے وفات دیدیں اور وہ وعید تجھے نہ دکھائیں - تو تجھ پر آخرت میں ہم ان کی حقیقت ظاہر کر دینگے - اس جگہ پر فنریک ھذا فی الاٰخرۃ محذوف ہے - یعنی اس صورت میں ہم اُن پیشگوئیوں کا انجام تجھے آخرت میں دکھا دینگے - عربی قاعدہ کے رُو سے ایسے مواقع پر حذف بالاتفاق جائز ہے - باقی رہا یہ سوال کہ کیونکر معلوم ہوا کہ یہی الفاظ محذوف ہیں سو یہ بات اگلے فقرہ فَاِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ سے ظاہر ہے ان الفاظ میں بتایا گیا ہے - کہ اس تبدیلی سے کوئی نقصان نہ ہوگا - کیونکر آخر یہ لوگ ہمارے پاس آئیں گے اور اللہ تعالےٰ ان کے اعمال کی حقیقت کو وہاں ان پر ظاہر کر دے گا -

اس آیت میں کفار کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ تم لوگ تو عذاب کے متعلق جلدی کرتے رہتے ہو - لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت تو یہ ہے - کہ وہ نہ صرف عذاب کے لانے میں دیر کرتا ہے - بلکہ بعض دفعہ وہ عذاب کی خبروں کو ٹلا بھی دیتا ہے -

یہ آیت وعیدی پیشگوئیاں کے ٹل جانے کے ثبوت میں بنیاد کے طور پر ہے - حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام وعیدی پیشگوئیوں کے ٹلنے کے ثبوت میں اس آیت کو سب سے مقدم رکھا کرتے تھے - اور باقی آیات کو اس کی تائید میں پیش کیا کرتے تھے - اس آیت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں - (۱) یہ کہ پیشگوئیاں شرطی بھی ہوتی ہیں - کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے - کہ یا ہم ایسا کرینگے یا ایسا (۲) یہ کہ بعض پیشگوئیاں ٹل بھی جاتی ہیں - کیونکہ فرماتا ہے کہ اگر بعض ہم تجھ کو دکھلائیں گے - تو تو دیکھ لیگا - بعض کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ اس جگہ ان پیشگوئیوں کا ذکر ہے - جن کے پورا ہونے کا وقت آپ کی زندگی میں رکھا گیا تھا - کیونکہ جن پیشگوئیوں کا وقت آپ کی وفات کے بعد تھا - وہ تو آپ کے زمانہ میں پوری ہی نہ ہونی تھیں - اس سے یہ امکان نکلتا ہے کہ کوئی بھی عذاب کی پیشگوئی تیرے وقت میں پوری نہ ہو - کیونکہ ہو سکتا ہے - کہ سب لوگ ایمان لے آئیں - اور عذاب کی ضرورت ہی نہ رہے - یہ خدا تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہے - ورنہ سارے لوگ مانا نہیں کرتے - علاوہ ازیں اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے - کہ پیشگوئیوں کے لئے کوئی خاص وقت مقرر کرنا شرط نہیں - کیونکہ اس جگہ وقت بہت وسیع ہے - بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تک چلا گیا ہے -

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے - کہ اس آیت میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے - کہ ٹلنے والی پیشگوئی وہ ہوتی ہے - جو جزئی ہو - اصولی پیشگوئی نہیں ٹلا کرتی - مثلاً کوئی ہم سے کہے - کہ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ والی پیشگوئی ٹل جائیگی - تو ہم کہینگے کہ نہیں - کیونکہ قرآن کریم نے نعدھم

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ

اور ہر ایک قوم کے لئے ایک (نہ ایک) رسول (کا آنا ضروری ہوتا) ہے پس جب اُن کا رسول آتا ہے۔ تو اُنکے درمیان انصاف کے ساتھ

بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا ۴۸

فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر (کوئی) ظلم نہیں کیا جاتا ۴۸ اور وہ کہتے ہیں (کہ) اگر تم لوگ سچے ہو تو یہ

الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ۴۹

وعدہ کب (پورا) ہوگا ۴۹

کی شرط لگائی ہے یعنی جو ہم اُن سے وعدہ کرتے ہیں۔ پس اس سے مراد صرف وہی وعید ہو سکتا ہے جو کسی خاص نبی کی قوم سے کیا گیا ہو۔ نہ وہ جو سب رسولوں کے ساتھ مجموعی طور پر ہو۔ اور لَاَغْلِبَنَّ والے وعدہ میں سب انبیاء شریک ہیں کسی خاص نبی سے یہ وعدہ مخصوص نہیں ہے۔ غرض تفصیلی پیشگوئی مل سکتی ہے۔ اصولی وعدے یا وعید نہیں ٹلا کرتے۔ اس آیت سے آجکل کے بعض نئے مدعیوں کی تردید ہو جاتی ہے۔ جو پیشگوئی کرتے ہیں کہ ہم غالب آئینگے لیکن جب غلبہ نہیں ہوتا تو کہہ دیتے ہیں کہ وہ پیش گوئی ٹل گئی ہے۔

۴۸ حل لغات۔ امۃ کے کئی معنی ہیں۔ الجماعۃ۔ جماعت۔ الجیل من کل حیّ قبیلہ کا بڑا حصہ۔ الطریقۃ۔ طریقہ۔ الدّین مذہب۔ الحین وقت۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے ولئن اخرنا عنهم العذاب الى امة معدودة۔ (ہود ۱۲) القاموس قد (اقرب)۔ گویا یہ لفظ زمان و مکان دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر۔ اس زمانہ کے بعض بدعتیوں نے اس آیت کے عجیب معنی کئے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ہر امت کے لئے ایک ہی رسول ہوا کرتا ہے۔ اس لئے امت محمدیہ میں کوئی دوسرا رسول نہیں آسکتا۔ یہ بات بالبداہت باطل ہے اس آیت میں رسول کے وجود پر زور دیا گیا ہے نہ کہ تعداد پر یعنی یہ بتایا گیا ہے۔ کہ امت بغیر رسول کے نہیں ہو سکتی نہ یہ کہ امت میں ایک ہی رسول آتا ہے۔ اور یہ بات واقعات کے بھی خلاف ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہی حضرت ہارون بھی رسول تھے اور دونوں کے مخاطب ایک تھے۔

اس آیت کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہر مذہبی جماعت کی ابتدار رسول کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ میرے نزدیک چونکہ اسمیں ابتداءِ امۃ کا ذکر ہے۔ اس لئے رسول سے مراد صاحب شریعت نبی ہے کیونکہ امت کی ابتدار شرعی رسولوں کے ہاتھوں ہی سے کی جاتی ہے۔

امۃ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ
یعنی جو انبیار کی جماعت میں شامل ہونے کے قابل ہوتا ہے وہ شامل کر لیا جاتا ہے۔ اور جو اپنے آپ کو اس قابل نہیں بناتا وہ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اس آیت میں کفار کو یہ بتایا ہے کہ کوئی قوم خدا کے فضلوں اور اسکی برکتوں کی وارث نہیں ہوتی جب تک کہ رسول کے ساتھ وابستگی و تعلق پیدا نہ کرے۔ یہ امید نہ رکھو کہ تم یونہی ترقی کر جاؤ گے۔ اگر ترقی کرنا چاہتے ہو۔ تو اس رسول سے سچی وابستگی اور پکا تعلق پیدا کرو۔ ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

ضروری نہیں کہ ایک امت میں ایک ہی رسول آئے

۴۹ ۔ ضدی آدمی کی بھی عجیب حالت ہوتی ہے۔ پچھلی آیت میں ضمناً یہ ذکر تھا۔ کہ نبی سے

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ

تو (انہیں) کہہ (کہ میں (تو) اللہ (تعالیٰ) کی مشیت کے سوا (خود) اپنے حق میں (بھی) نہ کسی نقصان پر قابو رکھتا ہوں اور نہ کسی

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ

نفع پر (ہاں یہ درست ہے کہ) ہر ایک قوم (کے مستوجب عذاب بننے) کیلئے ایک میعاد مقرر (ہوتی) ہے (اور) جب ان کی میعاد آجاتی ہے تو (اس وقت) وہ کوئی گھڑی (اس سے) پیچھے رہ کر

۵۰ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ

اس سے بچ سکتے ہیں اور نہ (ہی) آگے بڑھ کر اس سے خلاصی پا سکتے ہیں ۵۵۰ تو (انہیں) کہہ (کہ بھلا) بتاؤ (تو سہی کہ) اگر اس کا عذاب رات کو

۵۱ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ○

دفعۃً یا دن کو (تمہارے دیکھتے دیکھتے) تم پر آجائے تو مجرم لوگ اس سے کیونکر بھاگ سکیں گے ۵۵۱

جدا ہونا ہلاکت کا موجب ہوتا ہے۔ مگر باوجود اس کے کہ عذاب کی شرائط اور اس میں ڈھیل پڑنے کی وجوہ تفصیل سے پہلے بیان ہو چکی تھیں وہ اس ضمنی ذکر پر سب پہلی باتیں بھول جاتے ہیں۔ اور جھٹ سوال کر دیتے ہیں کہ اچھا وہ عذاب کب آئیگا۔ وہ سوائے تباہی کے نشان کے اور کسی نشان پر تشفی نہیں پاتے۔ افسوس کہ آجکل مسلمانوں کا بھی یہی حال ہو رہا ہے۔ وہ صداقت کے نشانات کے طور پر ہمیشہ عذاب طلب کرتے ہیں۔

منکرین انبیاء ہمیشہ عذاب پر زور دیتے ہیں۔

۵۰ — اوپر کی آیت میں جو مطالبہ تھا اس کا ایک اور لطیف طریق پر جواب دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ میں تو اپنے نفس کے ضرر اور نفع کا بھی مالک نہیں۔ میں تمہارے اس عذاب کے مطالبہ کو کس طرح پورا کر سکتا ہوں۔

جب میں اپنے نفع و نقصان کا بھی خود مالک نہیں تو تم پر میں کیونکر کوئی عذاب لا سکتا ہوں۔

یہ آیت اور اس قسم کی دوسری آیات کس وضاحت سے ثابت کرتی ہیں کہ قرآن کریم کی غرض صرف توحید کا اثبات ہے وہ کسی انسان کو خدا تعالیٰ کے برابر کھڑا نہیں کرتا۔ خواہ وہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کیوں نہ ہوں +

آیت توحید کا اثبات اور اس کی اہمیت و عظمت

لکل امۃ اجل سے کفر کی امۃ مراد ہے۔ لکل امۃ رسول الی امتہ مراد نہیں۔ اور مطلب اس کا یہ ہے کہ کفر کی جماعتوں پر ایک زمانہ ضرور ایسا آتا ہے کہ ان کا سلسلہ بند کر کے نبی کے ذریعہ سے ایک نیا سلسلہ جاری کر دیا جاتا ہے۔ یعنی گو میرے اختیار میں عذاب دینا نہیں۔ لیکن چونکہ خدا تعالیٰ کا یہ قاعدہ ہے کہ ہر ایک قوم ایک خاص مدت تک ترقی کرتی ہے اور جب وہ اپنی حالت کو بدل لیتی ہے۔ تو تباہ کر دی جاتی ہے۔ اس لئے میں یہ جانتا ہوں کہ تم اس حالت پر قائم نہیں رہ سکتے۔ ضرور ہے۔ کہ تم کو تباہ کر کے صداقت کا دور شروع کر دیا جائے +

اس جگہ آیت سے مراد مطالبہ عذاب کا دوسرا جواب

۵۵۱ حل لغات۔ اَرَاَیتم کے لفظی معنی ہیں کیا تم نے دیکھا۔ لیکن عربی محاورہ میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ اخبرونی مجھے بتاؤ تو سہی (اقرب) البیات اسم من بیّت العدوّ کالکلام من کلّم۔ بیات کے معنی تبییت کے ہیں۔ جو بیّت کی مصدر ہے۔ بیت الامر عمله او دبّره لیلاً۔ بیّت کے معنی ہیں رات کو کام کیا۔ یا رات کو اس کی تدبیر کی۔ القوم والعدوّ اوقع بهم لیلاً من دون ان یعلموا۔ جب قوم اس کی مفعول ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ رات کے وقت بغیر ان کی اطلاع کے ان پر حملہ کر دیا۔ شبخون مارا (اقرب)

بیات

تفسیر۔ اس آیت میں عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے

أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ آلْئٰنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ

کیا پھر (بعد میں یعنی) جب وہ آ جائیگا (تو اسوقت) تم اسپر ایمان لاؤ گے (اسکا کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا اسوقت تو تم سے کہا جائیگا کہ) کیا اب (تم ایمان

تَسْتَعْجِلُونَ ۞ ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ ۵۲

لاتے ہو) حالانکہ (اسکے آنے تک) تم اسکے جلد آنیکا مطالبہ کرتے رہے ہو ۵۲؎ پھر جن لوگوں نے ظلم کیا ہوگا۔ انہیں کہا جائیگا کہ (اب) تم

الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ۞ ۵۳

تا ہم رہنے والا عذاب چکھو۔ تمہیں بدلہ میں اسکے سوا جو تم (خود) کماتے تھے۔ کچھ نہیں دیا جاتا ۵۳؎

کہ تم کو یہ بحث نہ کرنی چاہیئے۔ کہ عذاب آج آئیگا یا کل یا کب آئیگا۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ تم عذاب کے مستحق ہو یا نہیں۔ اگر مستحق ہو تو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ آج نہیں تو کل ضرور عذاب میں مبتلا ہو گے۔ اور اس صورت میں تمہیں اپنی حالت کو بدلکر عذاب دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور اگر تم سمجھتے ہو کہ تم عذاب کے مستحق نہیں ہو تو بجائے یہ کہنے کے کہ عذاب کب آئیگا۔ یہ ثبوت پیش کرنا چاہیئے کہ تمہارے اعمال اور تمہاری حالت عذاب کی مستحق ہی نہیں۔ اس لئے عذاب آ ہی نہیں سکتا۔

بیاتا او نہارا کے الفاظ میں ایک لطیف اشارہ اہل مکہ کی تباہی کی طرف کیا ہے۔ ان کے لئے دن کے وقت بھی عذاب مقدر تھا اور رات کے وقت بھی۔ بدر کے موقع پر وہ دن کے وقت تباہ کئے گئے۔ جو سب سے پہلی اصلی جنگ ہے اور جنگ احزاب کے موقع پر جو حقیقی طور پر آخری جنگ تھی۔ رات کے وقت ان کی تباہی کے سامان پیدا کئے گئے۔ اس آیت میں رات کے عذاب کو مقدم اس لئے کیا گیا ہے کہ اس عذاب سے ان کا بالکل خاتمہ ہو جانیوالا تھا

یستعجل منہ میں ضمیر اللہ تعالےٰ کی طرف بھی پھر سکتی ہے۔ اور عذاب کی طرف بھی۔

۵۲؎ - یعنی نشان کی غرض تو فائدہ اٹھانا ہوتی ہے۔ لیکن تم لوگ جو عذاب طلب کرتے ہو۔ تمہاری کیا غرض ہے۔ کیا عذاب آنے پر ایمان لاؤ گے۔ لیکن اسوقت کا ایمان نفع نہیں دیا کرتا۔ بلکہ اس وقت تو یہ کہا جاتا ہے۔ کہ اب ایمان کا فائدہ نہیں۔ اب تو اس عذاب کے چکھنے کا وقت ہے۔ جس کے جلدی نازل ہونیکا تم مطالبہ کیا کرتے تھے۔

عذاب مانگنے والوں کے رد میں یہ کیسی زبردست دلیل ہے۔ نشان تو فائدے کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن عذاب کا نشان اس کے لئے جو عذاب مانگتا ہے فائدہ کا موجب نہیں ہو سکتا۔ ہاں دوسروں کو نفع دیتا ہے۔ مگر ایک شخص جو خود تباہ ہو جائے۔ اور خدا تعالےٰ کے قرب سے محروم ہو جائے۔ تو اسے دوسروں کے نفع پانے سے جو کہ خود مشکوک ہے۔ کیا فائدہ۔

بلکہ کی تباہی کی طرف اشارہ

۵۳؎ حل لغات - الخلد - خلد کے معنی عربی زبان میں یہ ہوتے ہیں۔ کہ۔ ابتقاء باقی رہنا الدوام چلتے ہی چلے جانا۔ (اقرب) خَلَدَ يَخْلُدُ خُلُودًا دَامَ وَبَقِيَ۔ خلد کا فعل خلد ہے۔ جس کے معنی ہیں رہا۔ دائم رہا۔ باقی رہا۔ الرجل خلدا وخلودا ابطأ عنہ الشیب وقد اسنّ۔ جب اس کا فاعل انسان ہو اور اس کی مصدر خلد یا خلود ہو۔ تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ اس آدمی کی عمر زیادہ ہوگئی اور بڑھاپا نہ آیا۔

خلد

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ

اور وہ تجھ سے دریافت کرتے ہیں (کہ) کیا وہ (عذاب سچ مچ) واقع ہوگا۔ تو (انہیں) کہہ (کہ) ہاں۔ مجھے اپنے رب کی قسم ہے (کہ)

۵۴ ع ۱۲ لَحَقٌّ ؔؕ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ

وہ یقیناً واقع ہونے والا ہے اور تم (ایسا کرنے سے خدا تعالیٰ کو) عاجز نہیں کر سکتے ۵۴ اور اگر ایسا ہوتا کہ جو کچھ زمین میں (پایا جاتا)

ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا

ہے وہ سب کا سب ہر ایسے شخص کا ہوتا جس نے ظلم کیا ہے۔ تو وہ ضرور اس کے ذریعہ سے اپنے آپ کو (عذاب سے) چھوڑاتا۔ اور جب

النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ

وہ (اس) عذاب کو دیکھینگے۔ تو وہ (اپنی) شرمندگی کو چھپائینگے۔ اور ان کے درمیان

دبالمکان ولی المکان اقام بہ اور جب اس کے بعد ب یا الی آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں فلاں مکان میں ٹھہرا ۔ خلد الی الارض لصق بہا و اطمئن الیہا اور اس کے بعد ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وہ زمین سے چمٹ گیا۔ اور اس پر مطمئن ہوگیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ عذاب الخلد کے یہ معنی ہوئے۔ کہ وہ عذاب آئیگا۔ جو چمٹ جائیگا۔ اور تم سے چمٹ جائے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ کبھی ہٹے گا نہیں اور وہ غیر مقطوع ہوگا۔ بلکہ عذاب کے تعلق کی مضبوطی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی جب عذاب آئیگا۔ تو ہٹایا نہ جائے گا۔ جس طرح صاحب مکان جب آجائے تو کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کہ جاؤ یہاں گنجائش نہیں۔ اسیطرح وہ عذاب ہوگا کہ اُسے رد نہ کیا جا سکے گا ؂

صفت رب کی قسم یوں کھائی گئی ہے

۵۴ حل لغات۔ اِی۔ حرف جواب بمعنی نَعَم۔ ہاں۔ ولا تقع الا قبل القسم۔ یہ ہمیشہ قسم سے پہلے واقع ہوتا ہے (اقرب)

اِی

تفسیر۔ جب شریر آدمی بالکل بند ہو جاتا ہے تو ہنسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ فرمایا کہ جب یہ لوگ ان دلائل سے عاجز آجائیں گے تو ہنسی کرنے لگینگے اور بڑی سنجیدہ شکلیں بنا کر پوچھیں گے۔ کہ کیا یہ باتیں سچی ہیں۔ تو ان کی ہنسی کی پرواہ نہ کیجیو۔ اور کہدیجیو کہ ہاں میں اپنے رب کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ باتیں سچی ہیں۔ اس جگہ سوال سے مراد قومی عذاب کے متعلق سوال ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے۔ عم یتساءلون عن النبا العظیم (عم ع)

لفظ ربی میں رب کی صفت کی قسم کھا کر خدا تعالیٰ نے ان لوگوں کے سامنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وقت کی حالت کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ اور وہ اس طرح پر کہ کفار کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کہ دیکھو خدا تعالیٰ نے اُسے رسول بنا کر کس طرح آہستہ آہستہ ترقی دی ہے۔ اور بتدریج وہ اسے بڑھا رہا ہے۔ اور تمہارے زور کو کم کر رہا ہے۔ پس اس سے تم بآسانی سمجھ سکتے ہو۔ کہ ایک وقت آئیگا کہ یہ جیت جائیگا اور تم ہار جاؤ گے۔ اس لئے تمہارا اس پیشگوئی پر تمسخر اڑانا تمہاری کم عقلی پر دلیل ہے۔ ورنہ اگر ذرہ سی بھی عقل سے کام لو تو تم کو اس کے صحیح ہونے میں ذرہ بھی شبہ نہیں ہو سکتا ؂

بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ ۵۵

انصاف سے فیصلہ کردیا جائیگا۔ اور ان پر (کوئی) ظلم نہیں کیا جائیگا ۵۵

۵۵ حل لغات ۔ اسروا الندامۃ کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ ندامت کو چھپائیں گے۔ یا یہ کہ ان کے دلوں میں ندامت پیدا ہو جائے گی۔ اقرب میں ہے۔ اسرّ السرّ کتمہٗ ۔ اسے چھپایا ۔ اظھرہٗ ۔ اسے ظاہر کیا۔ ضدٌّ یہ لفظ دو متضاد معنی دیتا ہے ۔

تفسیر ۔ انسانی فطرت اس قسم کی ہے کہ سزا کا اس پر دو قسم کا اثر ہوتا ہے ۔ بعض شخص سزا پر اکڑ جاتے ہیں اور مقابلہ کرتے ہیں ۔ اور بعض لوگ بالکل گر جاتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ کہ ہماری سزا ایسی نہیں کہ اس کا اثر مشکوک ہو۔ بلکہ اس کا اثر یقینی ہوتا ہے ۔ اور ہر اک شخص خواہ کوئی ہو۔ ہمارے عذاب کی برداشت سے عاجز آجاتا ہے ۔ اور کسی میں بھی تکبر باقی نہیں رہتا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے ۔ کہ انسان جو سزائیں دیتے ہیں۔ ان کا اثر صرف جسم پر پڑتا ہے۔ اور دل کو وہ مرعوب کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ صرف بزدل آدمی اپنی کمزور فطرت کے ماتحت مرعوب ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالےٰ چونکہ دلوں پر بھی قابض ہے ۔ اس کی سزا نہ صرف جسم پر نازل ہوتی ہے بلکہ دلوں پر بھی۔ اور اس طرح دلوں کو پاک کیا جاتا ہے۔ پس فرمایا کہ ہماری سزا جب نازل ہوتی ہے ۔ تو دل بھی مرعوب ہو جاتے ہیں ۔ اور جس پر عذاب نازل ہو وہ ہر قسم کی قربانی کرکے اپنے آپ کو بچانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے ۔ ظاہری سبب بھی خدا تعالےٰ کی سزا سے مرعوب ہونے کا موجود ہوتا ہے۔ جو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی سزا ہمیشہ مناسب موقع پر نازل ہوتی ہے ۔ اور اس وجہ سے اس کی صحت کے دل قائل ہوتے ہیں ۔ انسانی سزا غلط بھی ہوتی ہے ۔ اور ایسے موقع پر ہی دل مقابلہ کے لئے تیار ہوتا ہے۔ جب وہ سزا کو ظالمانہ سمجھے۔ پس خدا تعالیٰ کے عادل ہونے کے سبب سے دل اس کے انصاف کو محسوس کرتے ہیں اور اپنے کئے پر نادم ہوتے ہیں ۔ اور جب ندامت پیدا ہو تو انسان اپنے فعل کے ازالہ کی کوشش کرتا ہے ۔

یہ بھی مطلب اس آیت کا نکلتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کا عذاب انہی پر آتا ہے۔ جو اس کی تعلیم کا مقابلہ کرتے ہیں اور جو لوگ سچائی کا مقابلہ کریں ان کا کوئی ایسا آئیڈیل یا مقصد عالی نہیں ہوتا۔ جس کی خاطر وہ قربانی کر رہے ہوں بلکہ ادنیٰ خواہشات ہی ان کی مخالفت کی محرک ہوتی ہیں ۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جو لوگ کوئی مقصد عالی نہیں رکھتے وہ بڑی قربانی بھی نہیں کرسکتے ۔ اور کمینگی اور دنائت ان کے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے ۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ کہ جن پر ہمارا عذاب آتا ہے ۔ وہ چونکہ ادنیٰ خواہشات کے شکار ہوتے ہیں بلند حوصلگی نہیں دکھا سکتے ۔ اور تکلیف کے وقت ہر اک چیز کو قربان کرکے اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہیں ۔ یعنی وہ چیزیں جنہیں انسان اپنی جان دیکر بھی بچاتا ہے یعنی قومی عزت وغیرہ وہ انہیں بھی قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں ۔ اور یہ ثبوت ہوتا ہے ان کی غلطی پر ہونے کا ۔ اگر وہ حق پر ہوتے تو کبھی ایسا کمینہ فعل نہ کرتے ۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ

سنو۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں (پایا جاتا) ہے وہ سب (کا سب) یقیناً اللہ (تعالیٰ ہی) کا ہے۔ سنو

۵۶ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

اللہ (تعالیٰ) کا وعدہ یقیناً پورا ہونے والا ہے۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے ۵۶

۵۷ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ

وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائیگا ۵۷ اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب

قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی

کیطرف سے یقیناً ایک (ایسی کتاب جو سراسر) نصیحت (ہے) اور (ہر اس (بیماری) کیلئے جو سینوں میں (پائی جاتی) ہو

۵۸ الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○

شفا (کا سامان ہی) اور ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت (ہے) آئی ہے ۵۸

۵۶ — زمین و آسمان اور جو کچھ اس میں ہے سب خدا تعالیٰ کا ہی۔ اُسے یا اس کے نیک بندوں کو فدیئے دے کر خوش کرنے کی کوشش بالکل لغو ہوتی ہی۔ وہ اپنے مقصد کو پورا کرنے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اہل مکہ نے چاہا۔ کہ شرک کے خلاف وعظ کو روکیں۔ اور اس کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر قسم کی لالچ دی۔ لیکن آپ نے یہی جواب دیا۔ کہ خواہ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو بائیں لا کھڑا کرو۔ میں تو شرک کے خلاف وعظ کرنا نہیں چھوڑونگا اور اس طرح توحید کی کامیابی کے دن کو پیچھے نہیں ڈالونگا اسی طرح جب ایران نے مسلمانوں سے جنگ شروع کی اور اس کا جواب دینے کے لئے اسلامی لشکر ایران کے علاقہ میں گھس گیا۔ تو ایرانیوں نے روپیہ دیکر صلح کرنی چاہی لیکن خدا تعالیٰ کے وعدے پورے کرنے کے لئے مسلمانوں نے ان کے اموال کو ٹھکرا دیا۔

اصل بات یہ ہی کہ دنیا کے بادشاہ چونکہ خود محتاج ہوتے ہیں۔ فدیوں پر خوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ تو اموال کا خالق ہی۔ اس کے سامنے فدیئے کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ سوائے اس کے کہ خود اپنے نفس کی قربانی ہو۔ اور وہ بھی اس لئے قبول کی جاتی ہی کہ وہ قربانی انسان کے نفس کو پاک کرنے کا موجب ہوتی ہے۔

۵۷ — یہ تعجب کرتے ہیں کہ ہم میں ایک شخص کھڑا ہو کر کس طرح کامیاب ہو سکتا ہی۔ لیکن نہیں دیکھتے کہ روزانہ دنیا میں ترقی اور تنزل کے نظارے نظر آ رہے ہیں۔ پھر کیا خدا کا رسول ہی کامیاب نہ ہوگا۔ جس کی طرف یہ بھی اور دوسری مخلوق بھی فیصلہ کے لئے پیش کی جاتی ہے۔

۵۸ حل لغات۔ الموعظة نصیحت وعظ کا اسم مصدر ہی۔ وعظه نصحه وذكّره ما يُليّن القلوب من الثواب والعقاب۔ ایسی نصیحت کی جو دل کو نرم کر دے۔ کہیں سزا کی باتیں بتا بتا کر اور کہیں کامیابی کے رستے بتا بتا کر۔ خلیل نحوی ادیب نے

موعظة

وعظ کے معنی ھو التذکیر بالخیر فیما یرق لہ القلب کے ہیں یعنی وعظ ایسی باتوں کے یاد دلانے کو کہتے ہیں۔ جن کے سننے سے دل میں نرمی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ الموعظۃ کلام الواعظ من النصح والحث والانذار موعظۃ اس کلام کو کہتے ہیں جو نہایت اخلاص پر مبنی ہو۔ اور نیک باتوں کی طرف ترغیب دے اور بری باتوں سے ڈرائے۔ (اقرب)

تفسیر۔ پہلے تو ایک لطیف پیرایہ میں نصیحت کی۔ کہ عذاب کی خواہش نہیں کرنی چاہیئے۔ پس تم عذاب نہ مانگو۔ پھر مختلف طریقوں سے انہیں عذاب کی حکمتیں سمجھائی ہیں اور اب فرمایا کہ آؤ ہم تم کو بتائیں کہ یہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کس طرح کامیاب ہو گا۔ اس کی کامیابی کا راز فوجوں میں اور مال میں اور جتھے میں پوشیدہ نہیں ہے بلکہ اس کی کامیابی تمام تر اس کتاب کے کمالات سے وابستہ ہے جو اسے ملی ہے۔ ایسی باکمال کتاب کا مقابلہ دیر تک نہیں کیا جا سکتا آخر انسان اسی کی طرف لوٹنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جو کتاب اسے ملی ہے۔ وہ موعظہ ہے۔ یعنی (ا) اسمیں لوگوں کے فائدے کی باتیں ہیں جو اخلاص سے پر ہیں۔ اور اخلاص کا کلام آخر دل پر اثر کر کے ہی رہتا ہے۔ جس وقت تم غور کرو گے۔ کہ اس کلام میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی فائدہ بالکل نہیں اس کے ذریعے سے مال یا عزت یا دبدبہ یا حکومت کچھ بھی اسے مطلوب نہیں بلکہ اس پر عمل کرنے میں صرف تمہارا ہی فائدہ ہے تو خود بخود اس کی طرف توجہ کرو گے (ب) دوسرے اس کے مطالب ایسے ہیں کہ جو دل کو نرم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی محبت اور اسکی خشیت پر اس قدر زور ہے کہ سنگدل سے سنگدل انسان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا (ج) اس میں تمہاری ترقی اور کامیابی کے گر بتائے گئے ہیں اور انہیں پیش بھی ایسے رنگ میں کیا گیا ہے۔ کہ جس سے نفرت اور ضد نہ پیدا ہو بلکہ دل کو موہ لینے والا طریق اختیار کیا گیا ہے۔

شفاء لما فی الصدور کی تفصیل

(۲) دوسرے یہ کتاب دلی شبہات کے لئے شفاء ہے۔ انسان خواہ کس قدر ہی گر جائے۔ اس کی فطرت کبھی کبھی اس کے دل میں صداقت کے لئے تڑپ پیدا کر ہی دیتی ہے۔ اور حقیقت کے معلوم کرنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ اور خدا تعالیٰ اور الہام اور دعا اور معاد اور ایسے ہی دیگر امور کے متعلق وہ ایک اطمینان چاہتا ہے۔ لیکن جھوٹے مذاہب یا نامکمل اور بگڑے ہوئے مذہب اس کی تسلی نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان سے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اور اس وقت انسان خواہش کرتا ہے کہ کاش کوئی ایسی راہ ہو کہ دل ان شبہات سے پاک ہو سکے۔ اس وقت تم اس کلام میں تسلی پاؤ گے۔ اور دیکھو گے کہ کس طرح امور ایمانیہ کے متعلق تمام شبہات کو یہ دور کرتا ہے۔ اور خود بخود دل اس کی طرف مائل ہونگے۔

آنحضرت کی کامیابی کا راز مادی قوتوں میں نہیں بلکہ ان اعلیٰ کمالات میں مضمر ہے جن پر یہ کتاب مشتمل ہے۔

ہدایت کی حقیقت

(۳) شبہات کے دور کرنے کے علاوہ انسان جب بزرگان دین کے حالات پڑھتا ہے اور معلوم کرتا ہے کہ کس طرح وہ لوگ ایک اعلیٰ یقین اور قرب الٰہی کے مقام پر پہنچے ہوئے تھے اور دین کی باریکیاں ان کو بتائی گئی تھیں۔ اس وقت اس کا دل خواہش کرتا ہے کہ کاش میرا علمی ایمان بھی مشاہدہ کی صورت میں بدل جائے۔ اور میں بھی اپنی آنکھوں سے ان امور کو دیکھوں جن کو پہلے بزرگ دیکھتے چلے آئے ہیں۔ یہ خواہش بھی بہت سے لوگوں کے دلوں کو بیتاب کئے رکھتی ہے۔ پس اس حالت میں مبتلا لوگ بھی اس کتاب میں تسلی پائیں گے۔ اور حقیقی ہدایت انکو ملے گی۔ جو بندہ کو خدا تعالیٰ سے ملا دیتی ہے۔ اور جب لوگ دیکھیں گے۔ کہ اس کتاب پر چل کر خدا مل سکتا ہے۔ بغیر اسکے نہیں تو خود بخود اس کے قبول کرنے کی طرف متوجہ ہونگے۔

موعظۃ ما کی تفصیل

رحمت یعنی خاص فضل

(۴) بعض لوگ ایسی موٹی عقل کے ہوتے ہیں کہ وہ علوم اور وجدان کی باریکیوں کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا

تو (ان سے) کہہ (کہ یہ سب کچھ) اللہ (تعالیٰ) کے فضل سے اور اسکی رحمت سے (وابستہ) ہے پس اسی پر انہیں خوشی منانا

۵۹ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○

چاہیئے۔ جو (مال) وہ جمع کر رہے ہیں اس سے یہ (نعمت کہیں زیادہ بہتر ہے ۵۹

مگر مادی ترقیات ان کی توجہ کو کھینچ لیتی ہیں۔ سو ایسے لوگوں کی ہدایت کے لئے اس کتاب کے ساتھ خدا تعالیٰ کے خاص فضل بھی وابستہ ہیں۔ جو لوگ اس پر ایمان لائینگے ان پر اللہ تعالیٰ خاص فضل کریگا۔ اور ان کو دنیوی ترقیات بھی عطا فرمائیگا۔ پس عوام الناس جو چیز کی حقیقت دیکھنے کے بجائے اس کے اثرات اور نتائج کو دیکھا کرتے ہیں۔ ان ترقیات کو دیکھ کر جو اسلام سے وابستہ ہیں اسلام میں داخل ہونگے۔ اور انہی انعامات کو حاصل کرنے کے خواہشمند ہونگے۔ یہ چار امور ایسے ہیں۔ کہ اگر ان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ اسلام کی ترقی بلکہ کل سچے دینوں کی ترقی انہی کے ذریعہ سے ہوئی ہے۔ جو بہت ہی حساس لوگ تھے۔ انہوں نے محض اس کی مخلصانہ تعلیم کو دیکھ کر ہی فائدہ اٹھالیا۔ جو ان سے سخت تھے۔ انہوں نے عقلی دلائل سے تسلی پائی۔ جو ان سے بھی سخت تھے انہوں نے مسلمانوں کی اخلاقی حالت میں تبدیلی اور تعلق باللہ کیحالت کو دیکھکر نصیحت حاصل کی جو اور بھی سخت تھے انہوں نے اسلام کی ترقیات کو دیکھکر اسکی سچائی کا یقین کیا اور فوج در فوج اسلام میں داخل ہوگئے۔

لما فی الصدور۔ اس پر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ خیالات تو دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ پس سینوں دلی بات یا دل کی بات کو اچھا کرنے کے کیا معنی ہوئے۔ سو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ روحانی امور دل کے ساتھ ایک باریک تعلق رکھتے ہیں۔ اور تمام روحانی لوگوں کا تجربہ ہے کہ دل کا روحانیات کے ساتھ ایک گہرا تعلق ہے۔ جس طرح روح کا علم مادیات سے معلوم نہیں ہوسکتا اور اس کا تعلق جو جسم سے ہے۔ وہ دریافت نہیں ہوسکتا اسی طرح یہ بات بھی مادی قواعد سے دریافت نہیں ہوسکتی کہ دل سے روح کا کیا تعلق ہے۔ پس اس معاملہ میں ہمیں تجربہ کاروں کے مشاہدہ پر یقین کرنا پڑیگا۔ جو بالاتفاق اس امر کے گواہ ہیں کہ دل کا تعلق روحانی امور سے ضرور ہے۔ اور خیالات کا دماغ میں پیدا ہونا اس کے مخالف نہیں۔ کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ خون کے بعض تغیرات خیالات کے اچھے ہونے یا برے ہونے پر خاص اثر رکھتے ہوں۔ اور خون کا تعلق چونکہ دل سے ہے۔ اس طرح دل بھی ایک مخفی اثر خیالات پر ڈالتا ہو۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ خوراک کا اثر انسان کے خیالات پر پڑتا ہے۔ اور وہ اثر خون کے سوا اور کسی طرح نہیں پڑ سکتا۔ پس ان معنوں میں دل بھی خیالات کا ایک منبع کہا سکتا ہے۔ چنانچہ اس مضمون کو قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بیان بھی کیا ہے۔ اور غذا کا نیک اعمال کے ساتھ گہرا تعلق بتایا ہے چنانچہ فرمایا

یایها الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا (مومنون ع ۳)

یعنی پاکیزہ خوراک اعمال صالحہ کی توفیق کا ایک ذریعہ ہے۔

۵۹ - یعنی یہ نعمت جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ صرف خدا تعالےٰ کے فضل سے حاصل ہوسکتی ہے۔ کوئی انسان اپنے زور سے اسے حاصل نہیں کرسکتا پس جو شخص خدا تعالےٰ پر یقین رکھتا ہے۔ اُسے چاہیئے کہ ظاہری دولت اور جتھے پر گھمنڈ نہ کرے۔ کہ یہ چیزیں خدا کے فضل سے حاصل ہونے والی چیزوں کے مقابلہ میں کچھ بھی ہستی نہیں رکھتیں۔ بلکہ اس کا فخر اور اس

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ

تو (ان سے) کہہ (کہ) کیا تم نے اس بات کو (کبھی سوچ کر) دیکھا ہے کہ اللہ (تعالیٰ) نے تمہارے لئے (آسمان سے) رزق اتارا

فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ

پھر تم نے اس میں سے (کچھ) حرام اور (کچھ) حلال ٹھہرا دیا۔ تو (ان سے) کہہ (کہ) کیا اللہ (تعالیٰ) نے تمہیں

لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝ ۶۰

(اس بات کی) اجازت دی ہے یا تم اللہ (تعالیٰ) پر افترا کرتے ہو سلنہ

کی خوشی انہی امور کے متعلق ہونی چاہیئے جن کی صحت اور جن کے فائدے کا خدا تعالیٰ خود ضامن ہو۔

ھو خیر میں ھو کی ضمیر فضل کی طرف بھی جا سکتی ہے اور فضل اور رحمت کے حاصل ہونے کے متعلق بھی ہو سکتی ہے۔ اور اس سے مراد قرآن کریم بھی ہو سکتا ہے۔ جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اور مراد یہ ہے۔ کہ تم اپنے اموال اور جتھوں پر گھمنڈ کر کے پوچھتے ہو۔ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح کامیابی ہوگی۔ مگر یاد رکھو کہ جو تحفہ اسے ملا ہے یعنی قرآن کریم۔ وہ تمہارے سب اموال و اولاد پر بھاری ہے۔ اور ان سے بہتر ہے۔ اور اس کتاب کے مقابل پر تمہاری دولت و حشمت کچھ بھی نہ کر سکے گی یہی جیتے گا۔

کیا ہی عظیم الشان سچائی بتائی ہے کہ سچائیاں مادیات پر غالب ہوتی ہیں۔ ایک وقت میں سچائی سب سے کمزور نظر آتی ہے۔ لیکن آخر وہ سب چیزوں پر غالب ہو کر رہتی ہے۔ اگر لوگ اس نکتہ کو سمجھیں۔ تو مادی اشیاء کو صداقتوں پر کبھی ترجیح نہ دیں۔

سلنہ حل لغات ارءیتم کے بعد ما معدیہ یا موصولہ کا آنا اور اس کے بعد پھر استفہام کا آنا بتاتا ہے کہ اس جگہ ارءیتم معنی اخبرونی نہیں ہے۔ بلکہ اپنے اصلی معنی استفہامی میں ہے۔

تفسیر۔ چونکہ پہلے یہ بتایا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کتاب ملی ہے۔ جو لوگوں کے دلوں کے شکوک کو بدل دیگی۔ اب اس کے ثبوت میں ایک حکم بیان فرماتا ہے۔ جو کفار میں رائج تھا۔ اور جس کو لوگ صرف اس وجہ سے مانتے تھے کہ باپ دادا سے سنتے چلے آئے ہیں ورنہ عقلیں اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھیں۔ اور وہ حلت و حرمت کا حکم تھا۔ کھانا پینا انسان کی پہلی ضرورتوں میں سے ہے۔ اور اس کے متعلق صحیح رہنمائی کرنا مذہب کا پہلا فرض ہے۔ لیکن کفار مکہ کے پاس بلکہ دنیا بھر کے پاس اس کے متعلق کوئی صحیح راہنمائی نہ تھی۔ جس چیز کو چاہا حرام کر دیا اور جس چیز کو چاہا حلال کر دیا۔ نہ کوئی قانون تھا۔ نہ قاعدہ۔ اس بے اصولی تعلیم کو کونسی عقل تسلیم کر سکتی ہے۔ آخر حرمت کے لئے کوئی طبی یا اخلاقی یا مذہبی دلیل چاہیئے۔ کسی چیز کو یا طبی نقائص کی وجہ سے حرام کیا جا سکتا ہے۔ یا اخلاقی نقائص کی وجہ سے یا پھر روحانی امور کے سبب سے لیکن بلا کسی وجہ کے آپ ہی حرام کر دینا۔ اور آپ ہی حلال کر دینا خدا تعالیٰ کی پیدائش کو باطل قرار دینا ہے۔ اور اس حلت و حرمت کے قواعد کے متعلق ضرور انسانوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہوں گے۔ مگر ان شکوک کو سوائے اس مذہب کے کون دور کر سکتا ہے۔ جس نے

قرآن کریم کی تعلیم کے مقابل پر تمہارے حلت و حرمت کے احکام کسی اصل پر مبنی نہیں ہو کی ضمیر کا مرجع

سچائی انجام کار مادیات

کسی چیز پر غالب آ جاتی ہے

ما استفہامیہ

وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

اور جو لوگ اللہ (تعالیٰ) پر جھوٹ باندھتے ہیں - ان کا قیامت کے دن کے متعلق

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ

کیا خیال ہے - اللہ (تعالیٰ) لوگوں پر یقیناً (بہت ہی بڑے) انعام کرنیوالا ہے

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ ع ٦١ ۶

مگر ان میں سے اکثر (لوگ) شکر نہیں کرتے ۶۱ھ

اس فعل کا انکار ظاہر کرتا ہے کہ انہیں قیامت پر بھی ایمان نہیں

حلال و حرام کے قواعد مقرر کئے ہیں اور ان قواعد کے رو سے کہ جن کو ہر عقل سلیم تسلیم کر سکتی ہے - وہ مختلف اشیاء کو حلال یا حرام قرار دیتا ہے - اسلام کو تمام دیگر مذاہب پر یہ بھی فضیلت حاصل ہے کہ حلال و حرام کے اس نے قواعد مقرر کئے ہیں اور بلا وجہ مرف اظہار حکومت کے لئے اس نے چیزوں کو حلال یا حرام نہیں قرار دیا -

قرآن کریم وہی چیزیں چھڑواتا ہے جو بہر حال جیسی چھوڑنی ہی چاہئیں

اس جگہ اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آخر اسلام کی مخالفت کی وجہ کیا ہے - وہ کونسی چیز ہے - جو وہ تم سے چھڑواتا ہے - لیکن وہ منیب ہے اپنی حلال و حرام ہی کی تعلیم سے لو - کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کے چھوڑ دانے پر اس قدر واویلا کیا جائے - اگر قرآن نہ بھی آتا - تب بھی ایسی بیہودہ تعلیم کو تم آخر چھوڑ ہی دیتے - پس اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر تمہیں خوش ہونا چاہیئے - نہ کہ ناراض -

قیامت کا دن عذاب دینے کیلئے نہیں بلکہ انعامات اور ترقی کے لئے ہے -

اس آیت میں دلیتہم متعدی بیک مفعول ہے - جو ما اسے جائز ہے کہ متعدی دو مفعول ہو - اور کہیں عمر اقل اور همزه پہلے قل اور همزه کی تاکید کے لئے آئے ہوں - اور دلیتہم کا مفعول ثانی اذن لکم ہو اور آم منقطعہ ہو -

۶۱ھ حل لغات - یوم القیامة میں یوم ظرف کی وجہ سے منصوب ہے - اور فی اس جگہ محذوف ہے یعنی قیامت کے دن (قیامت کے متعلق) ان کا کیا گمان ہوگا -

تفسیر - یعنی اگر خدا تعالیٰ پر ایمان ہو تو انسان اس پر جھوٹ کب بول سکتا ہے - پس ان امور کو جزوی قرار دیکر حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے - یہ علامتیں ہیں - اس امر کی کہ قیامت پر ایمان نہیں رہا - اور اللہ تعالیٰ کی صفات نظر سے اوجھل ہو گئی ہیں - ورنہ کیا وجہ ہے - کہ خدا تعالیٰ تو ایسے فضل کے سامان پیدا کرے - اور یہ لوگ ان کی ناقدری کریں - اور عقل کے خلاف ڈھکوسلوں کو خدا تعالیٰ کی بھیجی ہوئی تعلیم پر ترجیح دیں -

ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس جگہ ان کے مذہب کی خرابی اور خلاف عقل ہونے کی دوسری دلیل دی ہے - یعنی قیامت کا انکار - اور بتایا ہے کہ قیامت کا انکار محض اس وجہ سے ہوتا ہے - کہ گنہگار فطرت اس دن کا خیال کر کے کانپتی ہے - جب اُسے سزا ملیگی - اس لئے وہ اس کا انکار ہی کر دیتی ہے - حالانکہ انکار سے حقائق نہیں بدل جاتے - لیکن فرماتا ہے - کہ یہ امر بھی عقل کے خلاف ہے کیونکہ قیامت کا وجود تو اللہ تعالیٰ نے ترقیات کے لئے بنایا ہے - نہ دکھ دینے کے لئے - امتحان مدارس میں اس لئے رکھا جاتا ہے - کہ بچے اس کی وجہ سے محنت سے کام کریں بیشک بعض فیل ہو جاتے ہیں مگر امتحان کی غرض فیل کرنا نہیں - بلکہ پاس کرنا ہے - پس جو شخص امتحان کو برا کہتا ہے - وہ نادان ہے - اُسے کس نے کہا ہے - کہ وہ فیل ہو جائے - وہ کوشش کرے

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَّمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا

اور تو نہ (کبھی) کسی کام میں (مشغول) ہوتا ہے اور نہ تو اس (کتاب) میں سے کوئی حصہ قرآن پڑھتا ہے اور نہ (ہی)

تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ

تم (لوگ) کوئی (اور) کام کرتے ہو۔ مگر (اس حال میں کہ) جب تم اسمیں تیزی سے مشغول ہوتے ہو تو

تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ

ہم تمہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اور زمین یا آسمان میں کوئی (ایک) ذرہ بھر چیز (بھی) تیرے رب (کی نظر)

ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَا اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ

سے پوشیدہ نہیں ہوتی۔ اور نہ (ہی) کوئی (ذرہ سے) چھوٹی چیز ہے اور نہ (ہی اس سے) کوئی

وَلَا اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ ۶۲

بڑی چیز ہے جو (ہر ایک حقیقت کو) روشن کر دینے والی ایک کتاب میں (مذکور اور موجود) نہ ہو ۶۲

کہ پاس ہو۔ آپ ہی فیل ہونے کے سامان پیدا کرتا اور پھر امتحان کے نتائج سے ڈر کر اس کا سرے سے ہی انکار کر دیتا تو اور بھی غافل اور سست کر دے گا۔ یونہی تباہی سے بچائیگا نہیں۔ بلکہ تباہی کی طرف دھکیل دے گا۔

۶۲ حل لغات الشأن۔ الخطب

ای ملعظم من الاحوال والامور۔ اہم کام یا اہم بات۔ اہمیت رکھنے والی حالت۔ الحال۔ حالت صورت۔ صورتِ حال۔ الامر۔ معاملہ۔ بات۔ ومن شانہ کذا۔ ای من طبعہ وخلقہ کذا طبعی بات۔ عادت۔ معمول (اقرب)۔ اس آیت میں پہلے معنے زیادہ چسپاں ہوتے ہیں۔ اور اسمیں اہم کاموں سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی اور دینی مشاغل ہیں۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اہم کام یہی تھا۔ تفیضون کی ماضی افاض

ہے۔ افاض الماء علی جسدہ۔ فرغہ انڈیلا ڈالا۔ افاض دمعہ سکبہ بہایا۔ افاض الناس من عرفات۔ اندفعوا ورجعوا۔ تفرقوا واسرعوا منہا الی مکان آخر۔ واپس ہو کر چلے گئے۔ تیزی کے ساتھ منتشر ہو گئے۔ افاض القوم فی الحدیث۔ اندفعوا واسرعوا۔ باتوں میں لگ گئے۔ افاض فلان الاناء۔ ملاہ حتی فاض۔ اس قدر لبریز کر دیا۔ کہ بہ پڑا۔ افاض القداح وبالقداح وعلی القداح۔ ضرب بہا۔ جوا کھیلا۔ افاض بالشئی دفع بہ ورمی پھینکا۔ افاض القوم علی الرجل۔ غلبوہ۔ دبالیا۔ ما افاض بکلمۃ ما افصح بہا۔ خوب وضاحت سے بولا۔ (اقرب) یہ لفظ عام طور پر باتوں کے متعلق آتا ہے۔ مگر یہاں پر عمل اور قول دونوں کے متعلق آیا ہے کیونکہ یہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جب دو چیزوں کیلئے جدا جدا فعل ہوں تو کبھی قاعدہ تغلیب کے ماتحت ایک کو دوسرے کے تابع بنا کر دونوں

شأن

افاض

کے لئے ایک ہی فعل لایا جاتا ہے جیسے چارپائے کو چارہ دینے کے لئے علف آتا ہے۔ اور پانی دینے کے لئے اسقا آتا ہے۔ مگر بجائے علفت الدابۃ تبناً و اسقیتہ ماءً کے علفت الدابۃ تبناً وماءً بول دیتے ہیں۔ پس اسی کے مطابق یہاں قول و عمل ہر دو کے لئے تفیضون ہی استعمال کیا گیا ہے۔

عزب

صغیر بھی غائب ہوتی ہے اور کبیر بھی۔

عزب الشیٔ عنہ یَعْزُبُ وَ یَعْزِبُ عَزُوْبًا۔ بَعُدَ وَغَابَ وَخَفِیَ۔ دور ہوا۔ غائب ہوا۔ چھپا۔ یقال عزب عنہ علمہ۔ ای غاب۔ اس کا علم جاتا رہا۔ غائب ہوگیا۔ عزب الرجل۔ ذھب چلا گیا۔ (اقرب)

مثقال

المثقال مایوزن بہ تولنے کا بٹہ وغیرہ۔ مثقال الشیٔ۔ میزانہ من مثلہ برابر۔

ذرۃ

الذرۃ واحدۃ الذر۔ صغار النمل چھوٹی چیونٹیاں۔ الھباء المنبث فی الھواء ہوا میں اڑا ہوا باریک غبار

ماتتلوا منہ کی ضمیر کا مرجع

تفسیر۔ ماتتلوا منہ میں ضمیر مجرور کا مرجع قرآن کریم بھی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں اس کے معنی یہ ہونگے کہ تو نہیں پڑھتا قرآن کا کوئی حصہ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قد جاء تکم میں جس چیز کی آمد کی خبر دی گئی ہے اس کی طرف منہ ضمیر پھرتی ہو۔ اور مراد یہ ہو کہ جو کلام ان لوگوں کی طرف قرآن کریم کی شکل میں آیا ہے۔ اس میں سے تو جو کچھ پڑھتا ہے۔ اور ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف بھی جا سکتی ہے۔ کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو پڑھتا ہے۔

ایک طرف آنحضرتؐ سے خطاب اور دوسری طرف کفار سے

یہ آیت بہت عجیب ہے۔ اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے خداوند تعالیٰ عرش عظیم سے خطاب فرما رہا ہے۔ ایک طرف تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی جماعت ہے۔ اور دوسری طرف مخالفین بیٹھے ہیں۔ پہلے حصہ آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں کو مخاطب کرتا ہے۔ پھر مخالفین کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے و ماتعملون من عمل الا کنا علیکم شھودًا۔ تم کوئی کام نہیں کرتے جس پر ہم نگران نہ ہوں۔

اصغر کا لفظ تو اس لئے لایا گیا ہے۔ کہ چھوٹی چیز نظر سے غائب ہو سکتی ہے۔ مگر اکبر کا لفظ کیوں لایا گیا ہے۔ سرسری نگہ سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ تابع مہمل ہے۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ کیونکہ کبھی بڑی چیز بھی ادراک سے غائب ہو جاتی ہے۔ مثلاً آنکھ کے سامنے ایک بڑا پہاڑ آجائے۔ تو اس کا صرف تھوڑا سا حصہ نظر آسکتا ہے۔ معلوم ہوا۔ کہ صغیر ہونے کی وجہ سے بھی چیز غائب ہو سکتی ہے۔ اور کبیر ہونے کی وجہ سے بھی۔ اس لئے فرمایا کہ اس کی نظر اس قدر وسیع ہے کہ کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی اس سے غائب نہیں ہو سکتی اور اتنا لطیف ہے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس سے اوجھل نہیں ہو سکتی۔ علمی نظر سے اگر دیکھا جائے تو آنکھ اور کان کی مثال سے یہ امر خوب روشن ہو جاتا ہے علم النفس کے ماہروں کی تحقیق سے ثابت ہے۔ کہ دیکھنا اور سننا کچھ حرکات متوالیہ متواترہ پر منحصر ہے۔ جنہیں وائبریشنز کہتے ہیں۔ آنکھ اور کان دونوں کے لئے ایک حد مقرر ہے۔ ایک حد سے کم حرکات کو آنکھ نہیں دیکھ سکتی اور نہ ایک حد سے زیادہ کو۔ یہی حال کان کا ہے جو حرکت کہ ایک سیکنڈ میں بیس سے کم ہو کان اسے نہیں سن سکتے۔ لیکن جو حرکت کہ سیکنڈ میں چالیس سے بڑھ جائے۔ اسے بھی کان نہیں سن سکتے پس علمی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ بعض چیزیں بڑی ہو کر بھی آنکھ یا کان کے ادراک سے نکل جاتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ ہمارے ساتھ یہ معاملہ نہیں۔ ہر چیز خواہ بڑی ہو یا چھوٹی ہمارے علم میں رہتی ہے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ گو تم دونوں فریق میں سے ایک خدا تعالیٰ کے دین پر ایمان لانیوالا اور

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۶۳

سنو - جو (لوگ) اللہ (تعالیٰ) سے سچی محبت رکھنے والے ہیں - اُن پر نہ کوئی خوف (مستولی ہوتا) ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں ۶۳

ایک مومن ہے - لیکن دونوں فریق کو یاد رکھنا چاہیئے - کہ صرف صداقت کو مان لینا کافی نہیں ہوتا - بلکہ جزائے اعمال کے وقت نیت اور طریق عمل کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے - پس ہر وقت انسان کو اپنے نفس کا معائنہ کرنا چاہیئے - کسی عظیم الشان کام کا کرنا یا خدا تعالےٰ کے کلام کو پڑھکر سنانا اپنی ذات میں کافی نہیں - بلکہ یہ بھی دیکھا جائیگا کہ کس نیت سے اس کام کو کیا جاتا یا کلام کو پڑھکر سنایا جاتا ہے - اور کس طریق پر کیا جاتا یا پڑھا جاتا ہے - ہو سکتا ہے کہ نیت خراب ہو یا ہو سکتا ہے کہ تبلیغ میں کوئی ایسا رنگ اختیار کیا جائے کہ لوگ بجائے قریب آنے کے دور ہو جائیں - اور انہیں ضد پیدا ہو جائے - پس تم یہ خیال نہ کرو کہ ہم دین کا کام کرتے ہیں - کیونکہ یہ بھی دیکھا جائیگا کہ تم اس کام کو کس طرح کرتے ہو - کیا لوگوں کو دین سے اور بھی دُور تو نہیں کر رہے -

یاد رکھنا چاہیئے - کہ گو اس جگہ الفاظ میں ایک شخص مخاطب ہے مگر مراد سب مسلمان ہیں - اور بتایا گیا ہے کہ اسوقت دو قوموں میں مقابلہ شروع ہے - ایک طرف ہماری قائم کردہ جماعت ہے اور دوسری طرف کفار کی جماعت ہے ہم نے اپنی جماعت کا پاس اس لئے نہیں کرنا کہ وہ ہماری ہے - بلکہ نیت کو دیکھنا ہے - پس اے قرآن پڑھنے والو اگر تم نے نیک نیتی اور حکمت سے قرآن اُن کو نہ سنایا اور اس وجہ سے انہوں نے انکار کیا تو ہم تمہیں پکڑینگے - کیونکہ اس انکار کے ذمہ وار تم ہوگے - لیکن اگر تم نے اپنی طرف سے اشاعت قرآن کریم کے فرض کو باحسن وجوہ ادا کیا - تو اسے انکار کرنیوالو ہم تمہیں پکڑینگے - گویا اسی طرف اشارہ فرمایا کہ ہم صرف عمل کو ہی نہیں دیکھتے - بلکہ اسباب اور موجبات کو بھی دیکھتے ہیں -

(حاشیہ: نجات کیلئے صرف ایمان کافی نہیں بلکہ نیت اور طریق عمل کی درستی بھی ضروری ہے۔)

۶۳ حل لغات - آلَا - یہ تنبیہ کے لئے اور ہوشیار کرنے کے لئے آتا ہے - گویا کہ فرماتا ہے کہ اچھی طرح سن رکھو - اس جگہ اسکے معنی خبردار کرنا اردو محاورہ کے لحاظ سے صحیح نہیں - کیونکہ خبردار ڈرانے کے لئے آتا ہے - مگر یہاں تو ایک مبارک مضمون ہے - کیونکہ اولیاء کو خوشخبری دی گئی ہے - اس لئے خبردار رکھنے کا موقع نہیں - اس لئے اس کا ترجمہ "سنو" کیا گیا ہے -

(حاشیہ: لا خوف علیہم کے معنی -)

تفسیر - لاخوف علیہم کے معنوں میں لوگوں نے غلطی کی ہے - اور وہ یہ سمجھتے ہیں - کہ ان پر کوئی خوف نہیں آتا - حالانکہ عربی زبان میں خِفتُ علیک کے معنی ہوتے ہیں کہ میں ڈرا کہ تجھ کو کوئی نقصان نہ پہنچے - اور خفت علیٰ نفسی کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ میں ڈرا کہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے اس جگہ اس محاورہ کے مطابق یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے - صرف فرق یہ ہے - کہ نسبت کو حذف کر دیا گیا ہے - اور مراد یہ ہے کہ لایخافون علیٰ انفسہم یعنی اپنے نفس کے متعلق یقین رکھتے ہیں - کہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچیگا - نہ یہ کہ کوئی خطرہ انہیں پیش نہیں آئیگا -

(حاشیہ: ہ الکون کے خطاب میں مومنین بھی داخل ہیں)

(حاشیہ: ولاہم یحزنون کے معنی)

وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ سے یہ بتایا کہ ان کو ماضی کا بھی صدمہ نہ ہوگا - اس فقرہ میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے - کہ اولیاء اللہ کو اللہ تعالیٰ ان غلطیوں کے صدمات سے بھی محفوظ رکھتا ہے - جو اعلیٰ مقامات کے حصول سے پہلے وہ کر چکے ہوں - کیا ہی محفوظ مقام ہے دنیا کی کوئی طاقت آیندہ اور ماضی کا ذمہ نہیں لے سکتی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس سے تعلق پیدا کرکے انسان کامل چین پا سکتا ہے - مگر افسوس کہ

۶۴ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ؕ

(یعنی وہ لوگ) جو ایمان لائے اور تقوےٰ کو (ہمیشہ) لازم حال رکھتے تھے ۵۱۴

لوگ اسی طرف سب سے کم توجہ کرتے ہیں۔ اور اپنے درد دل کا علاج ان دروازوں سے تلاش کرتے ہیں۔ جہاں سے سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ بعض جگہ جو انبیاء کی نسبت خوف اور حزن کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس جگہ خوف اور حزن ان کی اپنی ذات کے متعلق نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کی نسبت ہوتا ہے۔ اور دوسروں کی نسبت خوف اور حزن کا پیدا ہونا عذاب نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ یہ تو ایک اعلیٰ درجہ کی نیکی ہے۔ کہ انسان دوسروں کی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھے۔ اور اُن کے درد میں شریک ہو۔ انہی معنوں کے رُو سے حزن کا لفظ حضرت یعقوب کے لئے استعمال ہوا ہے۔ وہ حزن اپنی ذات کے متعلق نہ تھا۔ بلکہ اپنی اولاد کی نسبت تھا۔ جو گنہگار ہو کر خدا سے دور جا رہی تھی۔ سو یہ حزن عین رحمت تھا۔ اسی طرح حضرت زکریا کی نسبت آتا ہے۔ اِنی خفت الموالی من ورائی۔ اپنے بعد میں اپنے رشتہ داروں سے ڈرتا ہوں۔ کہ میرے کام کو خراب نہ کر دیں۔ یہ خوف بھی ثواب کا موجب اور نیکی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ کیونکہ یہ خوف اپنی ذات کی نسبت نہیں بلکہ اس امر کے متعلق ہے۔ کہ لوگ گمراہ نہ ہو جائیں ✦

انبیاء کا خوف و حزن

۵۱۴ - اس آیت میں اولیاء کی صفت بتائی ہے۔ کہ وہ ایمان میں کامل اور تقوی کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ولایت کی تشریح فرمائی ہے۔ اور وہ گویا اس آیت کی تفسیر ہے۔ پس میں اُسے بھی اس جگہ بیان کر دیتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں۔ اذا کان یوم القیامۃ یؤتی باھل ولایۃ اللہ فیقومون بین یدی اللہ عز وجل ثلاثۃ اصناف۔ فیؤتی برجل من الصنف الاول فیقول عبدی لماذا عملت فیقول یا رب خلقت الجنۃ واشجارھا وثمارھا وانھارھا وحورھا ونعیمھا وما اعددت لاھل طاعتک فیھا فاسھرت لیلی واظمأت نھاری شوقا الیھا قال فیقول اللہ تعالی عبدی انما عملت للجنۃ ھذہ الجنۃ فادخلھا ومن فضلی علیک انی قد اعتقتک من النار ومن فضلی علیک ان ادخلک جنتی فیدخل ھو ومن معہ الجنۃ قال ثم یؤتی برجل من الصنف الثانی فیقول عبدی لماذا عملت فیقول یا رب خلقت نارا وخلقت اغلالا وخلقت سعیرھا وسمومھا ویحمومھا وما اعددت لاعدائک واھل معصیتک فیھا فاسھرت لیلی واظمأت نھاری خوفا منھا فیقول عبدی انما عملت ذلک خوفا من ناری فانی قد اعتقتک من النار ومن فضلی علیک ان ادخلک جنتی فیدخل ھو ومن معہ الجنۃ ثم یؤتی برجل من الصنف الثالث فیقول عبدی لماذا عملت فیقول حبا لک وشوقا الیک وعزتک لقد اسھرت لیلی واظمأت نھاری شوقا الیک وحبا لک فیقول تبارک وتعالی انما عملت حبا لی وشوقا الی فیتجلی لہ الرب جل جلالہ فیقول ھا انا ذا فانظر الی ثم یقول من فضلی علیک ان اعتقک من النار وابیحک جنتی وازیرک ملائکتی واسلم علیک بنفسی فیدخل ھو ومن معہ الجنۃ۔ یعنی جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ کے اولیاء کو لایا جاویگا۔ اور وہ خدا تعالیٰ کے سامنے پیش ہونگے۔ اور تین قسموں میں انہیں تقسیم کیا جائیگا۔ پہلے ایک قسم کا ایک آدمی لایا جائیگا۔ اُسے اللہ تعالیٰ

اولیاء اللہ کی صفت حدیث میں۔

پوچھے گا۔ کہ اے میرے بندے تونے (نیک) اعمال کس وجہ سے کئے تھے۔ وہ عرض کرے گا۔ کہ اے میرے رب آپ نے جنت پیدا کی اور اس کے درخت اور پھل پیدا کئے اور نہریں پیدا کیں اور اس کی حوریں اور اس کی نعمتیں اور جو کچھ بھی آپ نے اپنی اطاعت کرنے والوں کے لئے طیار کیا ہے۔ سب کچھ بنایا۔ پس میں نے ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے شب بیداری کی اور دن کو روزے رکھے۔ اس پر خدا تعالیٰ فرمائیگا۔ اے میرے بندے تونے صرف جنت کی خاطر نیک اعمال کئے سو یہ جنت ہے۔ اس میں داخل ہوجا۔ اور یہ میرا فضل ہی ہے۔ کہ میں نے تجھ کو آگ سے آزاد کردیا اور یہ بھی فضل ہے۔ کہ میں تجھے جنت میں داخل کرونگا۔ پس وہ اور اس کے ساتھی جنت میں داخل ہوجائینگے۔ پھر دوسری قسم کے آدمیوں میں سے ایک آدمی لایا جائیگا۔ اس سے بھی اللہ تعالیٰ پوچھے گا۔ کہ اے میرے بندے تونے نیک اعمال کس غرض سے کئے تھے۔ وہ جواب دے گا۔ کہ اے میرے رب تونے دوزخ پیدا کی اور اسکی بیڑیاں اور اس کی شعلہ زن آگ اور اس کی بادِ سموم اور گرم پانی۔ اور جو کچھ بھی تو نے اپنے نافرمانوں اور دشمنوں کے لئے تیار کیا ہے۔ پیدا کیا۔ پس میں نے ان چیزوں سے ڈرتے ہوئے شب بیداری کی اور دن کو روزے رکھے۔ اس پر خدا تعالیٰ فرمائیگا۔ اے میرے بندے تونے یہ کام صرف میری آگ سے ڈرتے ہوئے کئے تھے۔ پس میں نے تجھے آگ سے آزاد کیا اور اپنے فضل سے تجھے جنت میں داخل کروں گا۔ پس وہ اپنے ساتھیوں سمیت جنت میں داخل ہوجاوے گا۔ اس کے بعد تیسری قسم کے لوگوں میں سے ایک آدمی کو لایا جائیگا۔ اس سے خدا تعالےٰ پوچھے گا۔ اے میرے بندے تونے (نیک) کام کس وجہ سے کئے تھے۔ وہ جواب دے گا۔ اے میرے رب تیری محبت کی وجہ سے اور تیرے ملنے کے اشتیاق میں۔ تیری عزت کی قسم میں راتوں کو جاگا۔ اور دن کو میں نے روزے رکھے۔ صرف تیرے اشتیاق اور تیری محبت میں پس مبارک اور بلند و بالا خدا اسے فرمائیگا۔ اے میرے بندے تونے یہ تمام نیک کام میری محبت اور میری ملاقات کے شوق کی وجہ سے کئے تھے۔ سو اپنا بدلہ لے۔ اور اللہ جل جلالہ اس شخص کے لئے خاص تجلی فرمائیگا۔ اور سارے پردوں کو اپنے چہرے سے دور کردیگا۔ اور اس کے سامنے آجائیگا۔ اور کہے گا اے میرے بندے۔ لے میں یہ موجود ہوں میری طرف دیکھ۔ پھر فرمائے گا۔ میں نے اپنے فضل سے تجھے آگ سے آزاد کیا۔ اور جنت کو تیرے لئے جائز کرتا ہوں۔ اور فرشتوں کو تیرے پاس بھیجونگا۔ اور میں خود تجھے سلام کہونگا۔ پس وہ اپنے ساتھیوں سمیت جنت میں داخل ہوجائیگا (ابن کثیر ج ۵ صفحہ ۱۲۲ برحاشیہ فتح البیان)

اولیاء اللہ کے سردار آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہونگے

پھر جو اس حدیث میں آتا ہے کہ ہر قسم کے لوگوں میں سے ایک شخص آگے بڑھایا جائیگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کے لوگوں میں سے جو کامل ترین اصناف میں سے ہوگا بس سے اللہ تعالیٰ کلام کریگا۔ اور گویا بطور نمائندہ کے اپنے حضور میں اسے بلائیگا۔ آخری جماعت جو سب سے کامل جماعت اور ولایت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے قائم مقام یقیناً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہونگے۔ کیونکہ آپ ہی وہ شخص ہونگے جنہوں نے وفات کے وقت نہایت بے تابی سے کہا۔ الرفیق الاعلیٰ الرفیق الاعلے۔ یعنی میں اپنے رب سے ملنا چاہتا ہوں۔ اپنے رب سے ملنا چاہتا ہوں۔

اولیاء اللہ پر انبیاء و شہداء کا رشک کرنا

اولیاء اللہ کے مختلف مدارج کے متعلق اور بھی بعض حدیثیں آئی ہیں۔ چنانچہ ایک روایت ابوداؤد میں آئی ہے۔ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ من عباد الله عباد یغبطہم الانبیاء

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا

انکے لئے (اس ورلی زندگی میں بھی خدا تعالیٰ کیطرف سے) بشارت (یاانکا انعام مقرر) ہے اور بعد والی (زندگی) میں بھی۔ اللہ (تعالیٰ) کی (فرمودہ)

۶۵ تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

باتوں میں (قطعاً) کوئی تبدیلی نہیں (ہوسکتی) یہی (وہ کامیابی ہے جو بڑی) عظیم الشان کامیابی (کہلا سکتی) ہے۔ ۵۶۵

والشهداء قیل من هم یارسول الله لعلنا نحبهم قال هم قوم تحابوا فی الله من غیر اموال ولا انسلب۔ وجوههم نور علی منابر من نور لا یخافون اذا خاف الناس ولا یحزنون اذا حزن الناس (ابوداؤد بحوالہ ابن کثیر جلد ۵ زیر آیت ہذا) یہ حدیث تفسیر ابن جریر میں بھی آئی ہے۔ صرف راویوں کا فرق ہے۔ یعنی آنحضرت

نبیوں کے رشک کرنے کے معنی۔

صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ خدا تعالیٰ کے بندوں میں سے بعض ایسے بندے ہیں۔ جن پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کرتے ہیں۔ اسپر صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ وہ کون ہیں تاکہ ہم بھی اُن سے محبت کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ وہ لوگ ہیں۔ جو صرف خدا تعالیٰ کی خاطر آپس میں محبت کرتے ہیں۔ مال یا رشتہ داری اس

بشریٰ کے معنے حدیث میں۔

محبت کا موجب نہیں ہوتی۔ (کیا ہی عجیب زمانہ تھا۔ کہ صحابہ نیکوں سے محبت کی خواہش کرتے تھے۔ لیکن آجکل نیکوں سے لوگ بغض رکھتے ہیں۔) ان لوگوں کی علامت یہ ہے کہ ان کے چہرے منور ہونگے نورانی منبروں پر وہ بیٹھے ہونگے۔ دوسرے ان کی علامت یہ ہے کہ جب لوگوں پر خوف آتا ہے۔ تو وہ نڈر ہوتے ہیں۔ اور جب لوگ اپنی گذشتہ باتوں پر جزع فزع کرتے ہوتے ہیں تو وہ امن میں ہوتے ہیں۔

ولی اللہ بننے کی راہ

اس حدیث میں اولیاء اللہ بننے کا طریق بتایا ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان خدا تعالیٰ کی خاطر نبی کے ہاتھ

بشریٰ سے مراد رؤیا صالحہ ہے۔

پر جمع ہونے والی جماعت سے محبت کرے اور دنیا کی باتوں سے نڈر ہو۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ دعا کرو۔ خدا تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں سے بنائے۔ ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ان جیسے بننے کا یہ طریق ہے۔ کہ آپس میں دلوں کے بغض نکال دیں۔ اور تفرقہ کو چھوڑ دیں۔ اور مسیح موعود علیہ السلام کی جماعت سے رابطۂ اتحاد پیدا کریں۔ دنیا سے نہ ڈریں۔ اور نہ مصائب سے گھبرائیں۔

نبیوں کے رشک کرنے کا جو اس حدیث میں ذکر ہے۔ اس سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ کہ نبی ان لوگوں سے ادنے درجہ کے ہوتے ہیں۔ بلکہ رشک سے مراد یہ ہے۔ کہ نبی چاہتے ہیں۔ کہ ایسے لوگ ہمارے متبعین میں سے بکثرت ہوں۔ نہ یہ کہ وہ خود ایسے ہو جائیں۔ کیونکہ کوئی نبی نہیں ہوسکتا۔ جس میں یہ صفت پہلے ہی سے نہ پائی جائے۔

۵۶۵ - حدیث میں اس بشریٰ کی کئی تشریحیں آئی ہیں۔

اول عن ابی الدرداء عن النبی صلی الله علیه وسلم فی قوله لهم البشری فی الحیٰوة الدنیا وفی الاخرة۔ قال الرؤیا الصالحة یراها المسلم او ترٰی له۔ ترجمہ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت لهم البشری فی الحیٰوة الدنیا وفی الاٰخرة کے متعلق فرمایا۔ کہ اس بشریٰ سے رؤیا صالحہ مراد ہے۔ جسے مومن اپنے متعلق خود دیکھتا ہے۔ یا اس کے حق میں کوئی دوسرا شخص دیکھتا ہے۔

دوم ۔ تفسیر ابن جریر میں ابو الدرداء سے روایت آئی ہے ۔ سالہ رجل عن هذه الآیة فقال سئلت عن شئ ما سمعت احدا سأل عنه بعد رجل سأل عنه رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال هی الرؤیا الصالحة یراها الرجل المسلم او تُرٰی له بشراه فی الحیوٰة الدنیا و بشراه فی الآخرة یعنی ایک شخص نے ابو الدرداء سے اس آیت کے معنی پوچھے ۔ انہوں نے (اس پر خوش ہو کر) کہا ۔ آپ نے ایسی بات پوچھی ہے ۔ جو اس سے پہلے ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی تھی ۔ جس کے بعد میں نے کسی اور سے یہ سوال نہیں سنا تھا ۔ آپ نے جواباً فرمایا تھا ۔ کہ اس سے مراد رویا صالحہ ہے ۔ جو ایک مسلمان شخص (خود) دیکھتا ہے ۔ یا اس کے متعلق کوئی اور دیکھتا ہے ۔ پس یہ اس زندگی میں بھی اس کے لئے بشارت ہے ۔ اور آخرت میں بھی اس کے لئے بشارت ہے ۔

سوم عبادة بن الصامت سے روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق پوچھا ۔ آپ نے فرمایا ۔ کہ تم سے پہلے کبھی کسی نے یہ سوال نہیں کیا تلك الرؤیا الصالحة یراها الرجل او تری له یعنی اس سے مراد رویا صالحہ ہے جسے انسان خود دیکھے یا اسکے متعلق کوئی دوسرا دیکھے ۔

چہارم ۔ ایک اور روایت میں ہے ۔ یراها العبد المؤمن فی المنام او تری له یعنی اس سے مراد رویا صالحہ ہے ۔ جسے خدا کا مومن بندہ خواب میں خود (اپنے متعلق) دیکھتا ہے ۔ یا اس کے متعلق کوئی اور دیکھتا ہے ۔

پنجم عبادة بن الصامت کی ایک اور روایت ہے کہ لقد عرفنا بشری الآخرة الجنة فما بشری الدنیا قال الرؤیا الصالحة یراها العبد او تری له و هی جزء من اربعة و اربعین جزءا او سبعین جزء من النبوة ۔ یعنی ہمیں آخرت کی بشری کے متعلق تو علم ہو گیا ہے ۔ کہ اس سے مراد جنت ہے ۔ مگر دنیا کی بشری کیا ہے ۔ آپ نے فرمایا وہ رویا صالحہ ہے جو بندہ دیکھتا ہے یا اس کی خاطر کسی اور کو دکھائی جاتی ہے ۔ اور وہ نبوت کا چوالیسواں یا سترھواں حصہ ہے (ابن کثیر)

لوگوں میں نیکی کے ساتھ شہرت بھی دنیا میں ایک بشری ہے ۔

ششم اسی طرح صحابہ کے اس سوال پر کہ الرجل یعمل العمل و یحمدہ الناس علیه و یثنون علیه به فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم تلك عاجل بشری المؤمن ۔ یعنی ایک شخص عمل کرتا ہے ۔ اور لوگ اس کی وجہ سے اس کی تعریف اور ثنا کرتے ہیں کیا اسکو اس کی نیکی کا بدلہ سمجھ لیا جائے ۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ کہ مومن کو جو نیک بدلے ملنے والے ہیں ۔ انہی میں سے یہ ایک دنیوی بدلہ ہے ۔

رویا صالحہ نبوت کا انچاسواں حصہ ہے ۔

ہفتم عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے ۔ کہ الرؤیا الصالحة یبشرہ المؤمن من تسعة و اربعین جزءً من النبوة ۔ من رای فلیخبر بها و من رای سوی ذلك فانما هو من الشیطان لیحزنه فلینفث عن یساره (ابن کثیر زیر آیت لهم البشری) یعنی عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ اس سے مراد خواب ہے ۔ اور یہ انچاسواں حصہ نبوت کا ہے ۔ پس جو ایسی خواب دیکھے وہ بیشک دوسرے کو بتا دے ۔ اور جو اس کے سوا یعنی بری خواب دیکھے اس کی وہ خواب شیطان کی طرف سے ہے ۔ تا کہ اس کو غم میں مبتلا کرے ۔ پس اسے چاہیئے ۔ کہ بائیں طرف تھوک دے اس حدیث سے معلوم ہوا ۔ کہ بری خواب کا بیان کرنا ناپسندیدہ ہے ۔

حضرت مسیح موعود کی نبوت اس قسم کی نہیں ۔

بعض لوگوں نے غلطی سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وحی کو بھی اسی قسم کا قرار دیا ہے لیکن یہ غلط ہے ۔ کیونکہ ان خوابوں کے دیکھنے والوں کی بعض خوابوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطانی بھی قرار دیا ہے ۔ مگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو تو خدا تعالیٰ نے مامور کیا تھا جس کی کوئی خواب یا کوئی الہام شیطانی نہیں ہو سکتا ۔ اور آپ نے تحریر فرمایا ہے

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۚ

اور (چاہیئے کہ) ان کی (کوئی مخالفانہ) بات تمہیں غمگین نہ کرنے پائے (کیونکہ) غلبہ بکلی اللہ تعالیٰ کا (ہی حصہ) ہے (اور)

هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○ ٦٦

وہ خوب سننے والا (اور) خوب جاننے والا ہے ۵٦٦

کہ مجھے اپنے الہام پر ایسا ہی یقین ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم پر۔ پس جو لوگ الہام کے منکر ہیں احادیث سے ان کو الہام کی ضرورت کا قائل کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ اس قسم کے الہام سے بالا کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ مبشرات کا لفظ عام ہے۔ اسے انبیاء کے الہامات کے لئے بھی بول سکتے ہیں۔ اور اولیاء کے الہام پر بھی۔ پس یہ آیت سب قسم کے الہاموں کی خبر دیتی ہے۔ ان میں سے جو صحابہ سے تعلق رکھتے تھے۔ رسول کریم صلعم نے بیان کر دیئے۔

لا تبدیل لکلمات اللہ کے معنی

لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ میں دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ اول یہ کہ یہ خدا تعالیٰ کا قدیم قانون ہے اور چونکہ قدیم سے یہ قانون ہے اس لئے اب بھی ایسا ہو گا۔

دوم یہ کہ یہ وعدہ ہمارا ایسا ہے کہ جس کے متعلق ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں۔ کہ وہ بدلے گا نہیں۔ یعنی بعض امور غیبیہ کلمات اللہ میں شامل نہیں ہوتے۔ اور وہ بدل جاتے ہیں۔ لیکن بعض امور غیبیہ کلمات اللہ کہلاتے ہیں اور وہ ہرگز نہیں بدلا کرتے۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ یعنی خدا تعالیٰ کی بشارت کا ملنا ہی بڑی کامیابی ہوتا ہے یا یہ کہ کلمات اللہ کا تبدیل نہ ہونا ہی بڑی کامیابی ہے۔ دونوں معنی لئے جا سکتے ہیں۔ بشارت کا کامیابی ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ کلمات اللہ کا نہ بدلنا بھی کامیابی کا بہت بڑا گر ہے دینی امور میں بھی اور دنیوی امور میں بھی۔ چنانچہ سائنس کی بنیاد ہی ایسے قوانین پر ہے۔ جو نہیں بدلتے۔ قوانین نیچر بدلتے رہتے۔ تو دنیا ہرگز ترقی نہ کر سکتی۔ اور ایجادات کا سلسلہ ہرگز نہ چلتا آگ جلاتی ہے۔ پانی سیراب کرتا ہے۔ بجلی تباہ کرتی ہے ہر ایک چیز کے قوانین علیحدہ علیحدہ ہیں اور یہ بدلتے نہیں

آپ کا غم خدا تعالیٰ پر لوگوں کے اعتراضوں کی وجہ سے تھا۔

ذٰلک کا مشار الیہ

کلمات اللہ کا نہ بدلنا کامیابی کا بہت بڑا گر ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے تسلی

ہیں۔ اگر یہ بدل جاتے اور کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی آگ جلانے لگتا۔ تو آگ جلنے کی بجائے پانی پیدا ہو جاتا۔ اور آٹا ہی بھیگ جاتا۔ یا لوگ پنکھا چلاتے۔ تو آگ پیدا ہو جاتی تو دنیا کبھی قدرت کے ذخیروں سے فائدہ اٹھانے کی طرف توجہ نہ کرتی۔ اور نظام عالم تباہ ہو جاتا۔ پس خدا تعالیٰ کے نہ بدلنے والے قوانین ہی کامیابی کی جڑ ہیں۔ انہی کے راز معلوم کر کے دنیا ترقی کر رہی ہے +

۵٦٦ — پہلے تو فرمایا تھا کہ اولیاء اللہ پر غم ہی نہیں آتا۔ لیکن اب فرمایا۔ کہ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تجھے ان کی بات غم میں نہ ڈالے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حزن آپ کا ذاتی نہ تھا بلکہ آپ کا غم خدا تعالیٰ پر اعتراضوں کی وجہ سے تھا۔ تو فرمایا کہ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجھے ان کی بات غم میں نہ ڈالے۔ عزت تو خدا کی لونڈی ہے۔ جیسا کہ لِلّٰہِ کے لام سے ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ لام ملک پر دلالت کرتا ہے۔ تم کیوں غم کرتے ہو۔ ان کے اعتراض تو فضول ہیں۔

اس آیت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

ایک طرف تو یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزگی پر دلالت کرتی ہے۔ کہ آپ خدا تعالیٰ پر اعتراضوں کی وجہ سے غم کرتے تھے۔ اور دوسری طرف یہ آیت بتاتی ہے۔ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خدا تعالےٰ کو کس قدر محبت ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو خدا تعالےٰ کی ذات پر اعتراض کرنے سے غم کرتے ہیں۔ مگر خدا تعالےٰ

أَلَآ إِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ ط

سنو! جو (بھی مخلوق بھی) آسمانوں کے اندر (پایا جاتا) ہو اور جو (بھی) زمین میں (موجود) ہے (ہر ایک) اللہ (تعالیٰ) ہی کا ہے اور

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ

جو لوگ اللہ (تعالیٰ) کے سوا (اور اور چیزوں) کو پکارتے ہیں وہ (در اصل) شریکوں کی پیروی نہیں کرتے بلکہ

إِنْ يَّتَّبِعُوْنَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ ٦٧

حق یہ ہے کہ وہ (اپنے) وہم کے سوا کسی (چیز) کی (بھی) پیروی نہیں کرتے۔ اور وہ صرف تخمینوں (اور ڈھکوسلوں) سے کام لیتے ہیں ٦٦

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ

وہ (لاشریک ہستی) وہ (ذات پاک) ہے جس نے تمہارے لئے رات کو اس لئے (تاریک) بنایا ہے کہ تم اس میں آرام پاؤ۔ اور (بالمقابل) دن کو کام کاج

کی یہ شفقت ہے۔ کہ تسلی دیتا ہے۔ کہ آپ غم نہ کریں وہ سمیع (بہت سننے والا اور علیم بہت جاننے والا) ہے۔ جب وہ دیکھے گا۔ کہ ان اعتراضوں کا بر نتیجہ نکلتا ہے۔ اور اس کی عظمت کو نقصان پہنچتا ہے۔ تو وہ خود ہی ان اعتراضات کو مٹا دے گا۔ تجھے غم کرنے کی کیا ضرورت ہے

٦٦ **حل لغات** - ما - ای شیٔ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یعنی کیا چیز۔ اور نافیہ ہو کر بھی آتا ہے۔ یعنی نہیں۔ پس اس کے ایک معنی یہ ہوئے کہ کس چیز کی اتباع کرتے ہیں۔ پس لوگ جو خدا تعالےٰ کے سوا اوروں کو پکارتے اور شریک قرار دیتے ہیں اور دوسرے یہ کہ یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے سوا اور چیزوں کو پکارنے والے ہیں۔ یہ شرکاء کی اتباع نہیں کرتے۔ کیونکہ شریک تو کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ تو اپنی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں۔ گویا پہلے معنی کے لحاظ سے ان کے شرکاء کی حقارت کا اظہار ہے۔ اور دوسرے میں نفی کہ ہمارا شریک تو کوئی ہے ہی نہیں۔

خَرَصَ يَخْرُصُ خَرْصًا - کذب جھوٹ بولا - خرص فیہ - حدس وقال بالظن ڈھکوسلا مار دیا۔ یا صرف گمان کی بنا پر ایک بات کہدی۔ یہاں دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ وہ صرف وہموں کی بنا پر بات کرتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلعم کو تسلی

تفسیر اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دو طرح تسلی دلائی ہے۔ اول یہ کہ جب سزا دینا خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ تو پھر تمہیں حد سے زیادہ غم نہیں ہونا چاہیئے۔ بے شک ان لوگوں کی حالت پر غم کرو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی خیال رکھو۔ کہ ان کا فیصلہ ایک قادر خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ سزا دینے پر بھی اور اصلاح کرنے پر بھی قادر ہے۔ دوسرے یہ بتایا ہے کہ جس امر پر یہ لوگ قائم ہیں۔ اس کی تو حقیقت ہی کچھ نہیں۔ پس آج نہیں تو کل ان کے شرکانہ عقائد آپ ہی آپ مٹ جائیں گے۔ بے حقیقت شی حقیقت کے مقابلہ پر آ کر کب تک ٹھہر سکتی ہے۔

۶۸ مُبْصِرًا ۖ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ○

کے لئے روشن (بنایا ہے) جو لوگ (حق بات کو) سنتے (اور اس سے فائدہ اٹھاتے) ہیں انکے لئے اس (نظام) میں یقیناً کئی ایک نشان ہیں ۶۸

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۗ سُبْحَانَهُ ۖ هُوَ الْغَنِيُّ ۖ لَهُ

(اور) انہوں نے (تو یہ بھی) کہدیا ہے (کہ) اللہ (تعالیٰ) نے (بھی اپنے لئے) اولاد اختیار کی ہے۔ اس کی تسبیح (کرو) وہ نہایت (ہی) بے نیاز ہے۔

سکن

۶۸ حل لغات۔ سَکَنَ۔ یَسْکُنُ سُکُوْنًا قرّ۔ ٹھہر ارہا۔ سکن فلان دارہ و سَکَنَ فیہا سَکْنًا وسُکْنًا۔ اِسْتوطنہا واقام بہا۔ رہائش اختیار کی۔ سکن الیہا ارتاح راحت پائی۔ جمعیت خاطر حاصل کی۔ سکن عنہ الوجع۔ فارقہ درد تھم گیا۔ دُور ہو گیا۔ (اقرب)

مبصرا

مُبْصِرًا ابصر سے نکلا ہے۔ جس کے معنی راٰہ کے بھی ہیں۔ یعنی اُسے دیکھا۔ اور جَعَلَہٗ بصیرًا کے بھی ہیں۔ یعنی اُسے دیکھنے والا بنا دیا۔ (اقرب) اس جگہ دوسرے معنی مراد ہیں۔

سکون زیادہ قوۃ کا ذریعہ ہوتا ہے

تفسیر متحرک بالارادہ کا اپنی حرکت کو بند کرنا ہمیشہ مزید طاقت و قوت کے حصول کے لئے ہوتا ہے۔ درحقیقت تکان کو اللہ تعالیٰ نے اسی بات کے بتانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ کہ تا مخلوق کو معلوم ہو جائے کہ اب پھر اسے غذا کی ضرورت ہے۔ جب کسی چیز کو

اگر آنکھوں سے کام نہیں لیتے تو کم از کم کانوں سے ہی سن لو۔

غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو اس کے اندر حرکت سے منافرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ گویا اس کے لئے ایک تنبیہ ہوتی ہے۔ کہ اب تمہیں غذا لینی چاہیئے اور رات چونکہ کام کے چھوڑنے پر ایک رنگ میں مجبور کر دیتی ہے۔ اس لئے وہ گویا باعثِ سکون ہوتی ہے:۔

اس سکون کے ذکر سے مقصود تمثیل ہے۔

رات کا ذکر اس جگہ بطور تمثیل کے لایا گیا ہے۔ رات انسان کی جسمانی قوتوں کو پھر نشو و نما کا موقع دینے کے لئے بنائی گئی ہے۔

اسی طرح قوموں میں جمود اور جہالت کی حالت ان کے قومی اخلاق کو پھر درست کرنے کا موجب ہو جاتی ہے۔ اور ایک عرصہ تک باطل بیٹھنے کے بعد پھر اقوام نئے جوش سے اٹھتی ہیں اسی طرح دن کی تمثیل دی۔ کہ دن بعد میں اس لئے چڑھتا ہے۔ کہ ان حاصل شدہ طاقتوں کو استعمال کیا جائے۔ پس مخاطبین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی چاہیئے۔ کہ اس نکتہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اب جبکہ ان کے لئے دن چڑھایا گیا ہے۔ اپنی حالت کو بدلیں۔ اور سورج کی روشنی سے فائدہ اٹھائیں۔ اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے اس جگہ رات کا ذکر پہلے کیا ہے۔ اور دن کا بعد میں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ آخر میں دن کا ذکر تھا۔ اور اسکے ساتھ مبصرًا فرما کر دیکھنے کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ پھر باوجود اس کے آیت کو ان فی ذلک لآیات لقوم یسمعون پر کیوں ختم کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس لفظ سے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ باوجود اس کے کہ تمہارے لئے روحانی سورج چڑھا دیا گیا ہے۔ تم ابھی تاریکی میں پڑے ہوئے ہو۔ اور دیکھنے کے قابل نہیں ہوئے۔ پس کم سے کم کانوں سے تو سُن لو تاکہ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر ہی زندگی پا سکو۔

مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ

جو کچھ آسمانوں میں (پایا جاتا) ہے اور جو کچھ زمین میں (موجود) ہے (سب) اسی کا ہے۔ اس (دعویٰ) کا تمہارے پاس کوئی بھی ثبوت

سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ٦٩

نہیں ہے۔ کیا تم اللہ (تعالیٰ) کی طرف وہ بات منسوب کرتے ہو جس کی بابت تم (کچھ بھی) علم نہیں رکھتے۔ ع ٦٩

ع ٦٩ حل لغات - السلطان - الحجۃ دلیل محکم - التسلط غلبہ اقتدار - قدرۃ الملک حکومت - الوالی - حاکم الملک - بادشاہ (اقرب)

تفسیر - چونکہ یہ فرمایا تھا - کہ کفار کی تباہی کے سامان تو خود اس تعلیم میں پنہاں ہیں - جس پر وہ چلتے ہیں - اس لئے اب اس کی وضاحت کے لئے شرک کے عقیدہ کا بطلان بھی کر دیا - اور شرک کی اقسام میں سے اس کو چن لیا جو مہذب اقوام میں رائج تھا - اور جس کو سب عقائد سے زیادہ طاقت حاصل تھی یعنی اللہ کے بندہ کو اس کا بیٹا قرار دینا - دوسرے باقی اقسام کے شرکوں میں تو مشرک صرف یہ دعوے کرتے ہیں - کہ یہ ہمارے معبود ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دینگے - مگر بیٹا قرار دینے میں ایک چیز کو الوہیت میں شریک قرار دیا جاتا ہے -

اس عقیدے کے رد میں چار دلیلیں پیش کی ہیں اول سبحانہ دوم - هو الغنی - سوم له ما فى السموت وما فى الارض - چہارم ان عندكم من سلطن بهذا - یعنی شرک کی کوئی دلیل نہ ہونا -

سبحانہ میں یہ بتایا گیا ہے - کہ اللہ تعالیٰ عیب سے پاک ہے - اور ولد کا ماننا اس کو عیب میں ملوث قرار دینا ہے - کیونکہ بیٹے کے ہونے کے لئے شہوات کی ضرورت ہے - اور یہ عیب ہے - دوم بیٹے کے لئے باپ میں موت کی قابلیت کی شرط ہے - اور یہ بھی عیب ہے -

سلطان

اتخاذ ولد اور شرک کی تخصیص کے ذکر کی وجہ

ہم دیکھتے ہیں کہ آیندہ نسل انہی چیزوں کی چلتی ہے جو اپنے وقت سے پہلے فنا ہو جاتی ہیں - زمین اور سورج میں سے آگے کوئی اور وجود نہیں نکلتا - کیونکہ ان کی جس عرصہ تک کے لئے ضرورت ہے - اس وقت تک وہ قائم رہینگے - لیکن درخت انسان حیوان - چونکہ اس وقت سے پہلے فنا ہو جاتے ہیں - جب تک کہ ان کی ضرورت ہے - ان کی نسل کا سلسلہ چلتا ہے - تا کہ فنا ہونے والوں کی جگہ دوسرے وجود لیلیں - پس کسی چیز کی نسل کا ہونا - اس کے فنا ہونے پر دلالت کرتا ہے -

دوسرے سلسلۂ تناسل شہوت پر بھی دلالت کرتا ہے - اور شہوت خود ایک نقص ہے - کیونکہ شہوت جسم کی کسی زیادتی پر دلالت کرتی ہے - جسے جسم میں محفوظ نہ رکھا جا سکے - پس اس سے باہر ایک اور چیز پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - لیکن خدا تعالیٰ سبحان ہے - پس ایسی بات اس کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتی -

ابطال عقیدہ اتخاذ ولد -

صفت غنا کی دلالت

دوسری دلیل یہ دی کہ وہ غنی ہے - کسی کی مدد کا محتاج نہیں - اس لفظ سے ایک دوسری دلیل شرک کے جواز کی رد کر دی - اور وہ یہ ہے - کہ گو نسل کی اصل غرض فنا کے نقصان کو روکنا ہے - لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے - کہ اپنے کاموں میں مدد حاصل کرنے کے لئے اپنی زندگی میں ہی مددگار کی ضرورت ہوتی ہے - لیکن فرمایا - کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے - کسی کی مدد کا محتاج نہیں - پس اس لحاظ سے بھی اس کے

سبحانہ کے معنی

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا

تو (ان سے) کہہ (کہ) جو (لوگ) اللہ (تعالیٰ) پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ ہرگز

۷۰ يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ

کامیاب نہیں ہوتے (ان کا حصہ) دنیا میں (صرف چند روز کے لئے) کچھ سامان ہے پھر ہماری طرف

ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا

انہیں لوٹنا ہوگا پھر اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے (چلے جاتے) ہیں ہم انہیں سخت عذاب کا (مزا)

۷۱ يَكْفُرُوْنَ ۝ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ

چکھائیں گے ۔ اور تو انہیں نوح کا حال (بھی) سنا ۔ کیونکہ اس نے (بھی) اپنی قوم سے کہا تھا (کہ)

يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ

اے میری قوم اگر تمہیں میرا (خداداد) مرتبہ اور اللہ (تعالیٰ) کے نشانوں کے ذریعہ سے میرا تمہیں (تمہارا فرض)

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ

یاد دلانا ناگوار (گذرتا) ہے تو تم اپنے (تجویز کردہ) شریکوں سمیت اپنی بات (کے متعلق سب پختگی کے سامانوں) کو

ہاں بیٹے کا وجود تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔

صفت ملکیۃ[1]

تیسری دلیل یہ دی کہ لہ مافی السمٰوٰت ومافی الارض بعض دفعہ انسان شروع میں کوئی چیز بنا لیتا ہے لیکن بعد میں وہ اسکی طاقت سے نکل جاتی ہے ۔ اور اسے سنبھال نہیں سکتا ۔ لیکن فرمایا کہ اس کو نظام قائم کرنے کے لئے بھی کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ۔

شرک جہالت کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے ۔[1]

شرک کی کوئی دلیل کسیکے پاس نہیں[1]

چوتھی دلیل شرک کے رد میں یہ دی کہ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ۔ کیا تمہارے پاس شرک کی تائید میں کوئی دلیل ہے ہرگز نہیں ۔ پس اس کا بے دلیل ہونا ثبوت ہے اس بات کا کہ خدا تعالیٰ کا کوئی بیٹا نہیں ۔ یہ عجیب بات ہے کہ باوجود ہر قسم کا زور مارنے کے شرک کی کوئی دلیل پیدا نہیں ہوسکی اصولی اور فلسفیانہ بحثیں مشرک کرتے رہتے ہیں ۔ لیکن جن چیزوں کو شریک قرار دیتے ہیں ان کی تائید میں کوئی دلیل پیش نہیں کرسکتے ۔

اتقولون علی اللہ مالا تعلمون والی دلیل کو سورہ رعد میں ام تنبئونہ بمالا یعلم فی الارض کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے ۔ مگر یہاں پر اتقولون علی اللہ مالا تعلمون کے الفاظ میں بیان فرمایا اس اختلاف الفاظ کی وجہ یہ ہے کہ اس سورۃ میں تو اس طرف اشارہ کیا ہے ۔ کہ شرک جہالت کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے ۔ نہ کہ کسی دلیل کی وجہ سے ۔ اور سورہ رعد میں یہ بتایا ہے ۔ کہ شرک کے عقیدہ سے اللہ تعالیٰ پر جہالت کا الزام آتا ہے ۔ کہ گویا وہ تو معبودوں کے وجود کا اعلان نہ کرسکا ۔ ان لوگوں نے اپنے علم کے زور سے ان کے خدا ہونے کا پتہ لگا لیا ۔

وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً

جمع کرلو (اور) نیز چاہیئے کہ تمہاری بات تم پر (کسی پہلو سے) مشتبہ نہ رہے۔

ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝ ۷۲

پھر اسے مجھ پر نافذ کردو۔ اور مجھے (کوئی موقع اور) مہلت نہ دو ۷۲ـہ

۷۲ـہ حل لغات۔ كَبُرَ۔ عَظُمَ وَثَقُلَ بھاری اور گراں ہوا۔ کبر۔ عظم وجسم بڑا اور جسیم ہوا (اقرب) علیہ الامر شق واشتد وثقل گراں اور شاق گذرا (منجد) المقام۔ الاقامۃ رہنا۔ بود وباش کرنا۔ موضع الاقامۃ رہنے کی جگہ زمان الاقامۃ رہنے کا زمانہ یا وقت۔ موضع القدمین۔ جہاں پاؤں رکھے جائیں۔ المنزلۃ مرتبہ وحیثیت (اقرب) اجمعوا۔ فراء کا قول ہے۔ اجمع الامر۔ نواہ وعزم علیہ۔ ارادہ کیا۔ اور پختہ نیت کرلی۔ اجمع القوم علی الامر۔ اتفقوا علیہ اتفاق کرلیا۔ اجمع امرہ بعد تفرقہ وجعلہ جمیعاً۔ پراگندگی کے بعد جمع کرلیا۔ اجمع الامر وعلی الامر۔ عزم۔ پختہ ارادہ کرلیا (اقرب) غُمّہ امر غمۃٌ اے مبہمٌ ملتبسٌ۔ مبہم اور مشتبہ امر (اقرب) اقضوا الی کہتے ہیں۔ قضینا الیہ ذلک الامر۔ ابلغناہ ایاہ اس تک پہنچا دیا (اقرب)

تفسیر چونکہ سورۂ ہود میں انبیاء کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ آتا ہے۔ اس لئے میں وہیں حضرت نوح کا ذکر کرونگا۔ اس جگہ اس آیت کی تشریح پر اکتفا کرتا ہوں میں بتا چکا ہوں۔ کہ الرٰ کی سورتوں میں تاریخی واقعات پر زیادہ بحث ہے۔ اور انہیں سے زیادہ تر استدلال کیا گیا ہے۔ چنانچہ عقلی بحث کے بعد حضرت نوح کے واقعہ کو اللہ تعالیٰ پیش فرماتا ہے۔ کہ اس واقعہ پر غور کرکے دیکھ لو۔ کیا نوح کے دشمنوں نے دشمنی میں کمی کی تھی۔ مگر باوجود اس کے کہ انہوں نے پورا زور لگایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو فوراً تباہ نہیں کیا۔ بلکہ ایک لمبے عرصہ تک ان کو ڈھیل دی۔ لیکن جب شرارت حد تک پہنچ گئی۔ اور جو ایمان لانیوالے تھے۔ ایمان لا چکے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو ہلاک کردیا۔

یتلوا۔ تلاوۃ میں سے نکلا ہے۔ تلاوۃ پڑھ کر سنانے کو کہتے ہیں۔ یعنی لوگوں کی روایات کی طرف مت جاؤ۔ بلکہ وہی سناؤ جو اس کتاب میں اترا ہے۔

عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ بعض دفعہ فعل ایک ہی لایا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ دو اسم استعمال کرکے ان ہر دو اسموں کے مناسب حال اس کے دو معنی لئے جاتے ہیں۔ اس جگہ اجمعوا شرکاءکم کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ ان کو جمع کرلو۔ اور یہ بھی کہ تم اپنے معاملہ کو جمع کرلو اور اپنے شرکاء کو بلا لو۔ اور ادعوا کا فعل حذف کردیا گیا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

یا لیت زوجک قد غدا متقلداً سیفاً ورمحا

جس میں سیف (تلوار) اور رمح (نیزہ) ہر دو کے لئے تقلّد کا لفظ لایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ سیف کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اور رمح کے لئے تقلد کا نہیں بلکہ اعتقال کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اس سورۃ میں تین مثالیں دی ہیں۔ ایک حضرت نوح عم کی۔ دوسری حضرت موسیٰ عم کی اور تیسری حضرت یونسؑ کی حضرت نوح کی مثال کامل تباہی کی ہے اور حضرت موسیٰ عم کی مثال ایک قوم کی تباہی اور دوسری کی

كَبُرَ

المقام

اجمع

اجمعوا کے دو معنی ایک مفعول کے مختلف ہونے کے مطابق۔

غُمّة

قضٰی الیہ

تین مثالوں سے مقصود تین قسم کے معاملہ کیطرف اشارہ ہے۔

نجات کی۔ اور حضرت یونس ؑ کی مثال کامل طور سے بچا لینے
کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق
یہ تین مثالیں بیان فرما کر بتاتا ہے۔ کہ ہم دنیا میں تین قسم
کے معاملات کیا کرتے ہیں (۱) کسی نبی کے ذریعہ سے

حضرت نوح ؑ کی قوم کی خصوصیت

مخالف قوم کو بالکل تباہ کر دیتے ہیں۔ جیسے حضرت نوح
کی قوم ہے۔ ان کے زمانہ میں بجز چند نفوس کے باقی تمام
قوم ہلاک کر دی گئی۔ اور کسی نبی کے زمانہ میں اس کے

لفظ مقام کی تشریح

مخاطبین میں سے ایک حصے کو بچا لیتے اور دوسرے کو تباہ

حضرت موسیٰ ؑ کی قوم کی خصوصیت

کر دیتے ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ ؑ کے مخاطبین کا حال
ہوا۔ کہ بنی اسرائیل اکثر ان پر ایمان لے آئے۔ مگر فرعون
اور اس کی قوم تباہ ہو گئی۔ اور کسی نبی کے زمانہ میں کلی طور

حضرت یونس ؑ کی قوم کی خصوصیت اور ان کے نمونہ سے فائدہ اٹھانے کی تحریص

پر بچا لیا کرتے ہیں۔ جیسے حضرت یونس ؑ کی قوم جو ساری کی ساری
بچا لی گئی تھی۔ ان مثالوں کو بیان فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے
نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کو تحریک دلائی ہے

کھڑے ہو کر تذکیر کرنا انبیاء کی سنت ہے

کہ کیوں تم یونس ؑ کی سی قوم نہیں بن جاتے۔ موسیٰ اور نوح
کی قوموں کی طرح کیوں تباہی چاہتے ہو۔

ان تمام خصوصیات کا آنحضرت کی قوم میں پایا جانا

عام طور پر لوگ نبیوں کے واقعات کو قرآن مجید میں
محض قصہ سمجھتے ہیں۔ مگر ان تینوں واقعات کے نظام اور
ان کی ترتیب پر غور کرو۔ کیا یہ محض قصہ کے طور پر ذکر کئے

کامل تدبیر کے پانچ طریق

گئے ہیں۔ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مختلف
زمانوں میں اور مختلف جگہوں میں یہی واقعات پیش نہیں
آئے۔ کیا آپ مکہ میں نوح۔ مدینہ میں موسیٰ اور دوبارہ ورود
مکہ میں یونس کے مثیل ثابت نہیں ہوئے ہیں۔ یہ قصے
نہیں۔ بلکہ پیشگوئیاں ہیں

نبی کا مقام اور اس کی تذکیر اس کی قوم پر گراں گزرنے کی وجہ

مقامی و تذکیری میں حضرت نوح نے بتلایا کہ
کہ میری دو باتیں ہی تمہیں بری لگ سکتی ہیں۔ اول میرا نبی ہونا
جس سے تم کو یہ خیال ہوگا۔ کہ یہ ہم پر کیوں حاکم ہو گیا۔
کیونکہ نبی کو بھی ایک قسم کی حکومت تو حاصل ہوتی ہی ہے۔

حضرت نوح ؑ کا جواب

دوم میری تعلیم۔ کیونکہ یہ تعلیم تمہارے طرز کے خلاف ہے
فرماتے ہیں کہ اگر یہ دو باتیں تمہیں بری لگتی ہیں۔ تو میں
تمہیں ان دونوں کے متعلق یقین دلاتا ہوں۔ کہ انہیں میرے
نفس نے خود پیدا نہیں کیا۔ بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فعل ہے
اس میں میری اپنی کوئی غرض نہیں ہے۔ میں نے تو اپنے
سب کام اللہ کے سپرد کر دیئے ہیں۔ یعنی میری اپنی خواہش
کوئی نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس
لئے یقین رکھو کہ تمہارا مقابلہ مجھ سے نہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ
سے ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ مقامی و تذکیری کو اکٹھا
سمجھا جائے۔ اور یہ معنی کئے جائیں۔ کہ اگر میرا کھڑے
ہو کر وعظ کرنا تم کو برا معلوم ہوتا ہے۔ تو بھی لوگو میں تو
اس طریق کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ یہ میرا فرض ہے۔
اور اگر اس کے نتیجہ میں تم مجھ سے دشمنی کرو گے۔ تو بیشک
کرو۔ میں خدا تعالیٰ پر توکل کرتا ہوں۔ ان معنوں سے
معلوم ہوتا ہے۔ کہ قدیم سے انبیاء کی یہ سنت ہے۔ کہ وہ
کھڑے ہو کر وعظ فرمایا کرتے تھے۔ ہمارے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم بھی خطبہ کھڑے ہو کر ہی فرماتے تھے۔
حضرت مسیح موعود بھی سوائے بیماری کے کھڑے ہو کر ہی عموماً
لیکچر دیا کرتے تھے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ کامل تدبیر کس
طرح کی جاتی ہے۔ اور اس کے لئے پانچ طریق بتائے۔
(۱) مشورہ کر کے ایک رائے پر جمع ہو جانا چاہیئے۔ جب
تک کوئی قوم ایسا نہ کرے گی۔ وہ کبھی جیت نہیں سکتی
(۲) اپنے ہم خیال لوگوں کو ایک نظام کے ماتحت لے آنا
چاہیئے۔ (۳) اس رائے کے پورا کرنے کے لئے
ایک تفصیلی تجویز سوچ لینی چاہیئے۔ یا دوسرے لفظوں
میں تفصیلی نقشہ تیار کر لینا چاہیئے۔ (۴) بغیر انتشار
طاقت کے ایک ہی وقت میں سب طاقت کو خرچ کرنے
کی کوشش کرنا چاہیئے۔ تاکہ ساری قوم کا زور ایک ہی
وقت میں دشمن پر پڑے (۵) حملہ کرنے کے بعد دشمن
کو سانس لینے کا بھی موقع نہ دینا چاہیئے۔ کیونکہ اس صورت

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ

پھر (بھی) اگر تم پھر جاؤ تو (اس میں میرا کوئی نقصان نہیں۔ بلکہ تمہارا ہی ہے) کیونکہ میں نے تم سے (اسکی بابت) کوئی اجر نہیں مانگا میرا اجر

اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○ ۷۳

اللہ (تعالیٰ) کے سوا (اور) کسی پر نہیں ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں (اسکے) کامل فرمانبرداروں میں سے بنوں ۷۳ع

میں دشمن پھر طاقت پیدا کر لیگا۔ پہلا حملہ ختم نہ ہونے پائے کہ دوسرا شروع ہو جائے۔ تمام انبیاء اسی طریق پر کاربند ہوتے چلے آئے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ و السلام کا بھی یہی طریق تھا۔ آپ ایک اشتہار نکالتے ابھی اس کا چرچا جاری ہوتا کہ دوسرا اور نکال دیتے تھے۔

غرض کامیابی کے لئے یہ پانچ طریق ضروری ہوتے ہیں۔ حضرت نوح ؑ اپنی قوم کو خود ان طریقوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔ تم یہ پانچوں طریق استعمال کر لو۔ مگر پھر بھی کامیاب نہ ہوگے۔ کیونکہ ایک چھٹی چیز جس کے بغیر یہ تمام تدبیریں ناکام رہ جاتی ہیں۔ یعنی **توکل علی اللہ** وہ تمہارے پاس نہیں ہے بلکہ وہ میرے پاس ہے۔ اس وجہ سے خدا تعالیٰ کی مدد مجھے حاصل ہے۔ پس تم تمام کوششیں کر لو۔ غالب میں ہی رہونگا۔

انبیاء ؑ کو اپنی صداقت اور خدا تعالیٰ کے وعدوں پر کیسا یقین ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ مخالفین کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتے۔ بلکہ انہیں اور بھی غیرت دلاتے ہیں۔ اور باوجود اس کے مطمئن ہوتے ہیں۔ کہ آخر ہم ہی جیت کر رہینگے۔ اور آخر ویسا ہی ہوتا ہے۔ دوسرے معجزات کو نظر انداز کر کے چشم حقیقت بین کے لئے یہی ایک معجزہ ان کے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہونے کے ثبوت میں کافی ہوتا ہے۔ مگر افسوس کہ اندھی دنیا دیکھتی نہیں +

۷۳ع — انبیاء کے دشمن اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہ وہ حکومت پسند ہوتے ہیں۔ اور لوگوں پر غلبہ حاصل کرنا ان کا فطرتی تقاضا ہوتا ہے۔ اس آیت میں اس اعتراض کا خوب قلع قمع کیا گیا ہے۔ انبیاء کی زندگی اطاعت اور فرمانبرداری کی ایک بہترین مثال ہوتی ہے۔ اگر وہ حکومت کے خیال سے سب کچھ کرتے ہوتے۔ تو لوگوں پر حکومت کرتے اور خود اپنے نفس کو تکلیف میں نہ ڈالتے مگر وہ تو خود اپنے نفس کو سب سے زیادہ تکلیف میں ڈالتے ہیں۔ لوگوں کو ہی عبادت کا حکم نہیں دیتے۔ بلکہ سب سے زیادہ خود عبادت کرتے ہیں۔ دوسروں کو ہی زکوٰۃ کا حکم نہیں دیتے۔ بلکہ خود سب سے زیادہ صدقہ و خیرات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ حکومت کی خواہش ان پر غالب نہیں ہوتی۔ بلکہ اطاعت و فرمانبرداری کی صفت ان پر غالب ہوتی ہے۔ اور وہ **اول المسلمین** ہوتے ہیں۔ یعنی فرمانبرداروں کے سردار۔

حکومت پسندی اور فرمانبرداری دو متضاد باتیں ہیں۔ — ممکن ہے کسی کے دل میں یہ اعتراض پیدا ہو کہ بعض بڑے بڑے جابر بادشاہ گذرے ہیں۔ جو بڑے عابد اور صدقہ و خیرات بھی کرنے والے تھے۔ لیکن یہ اعتراض درست نہیں۔ بیشک ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ جو جابر بھی ہوں اور عبادت گزار بھی ہوں۔ مگر ایسے لوگ وہی ہونگے۔ جن کا ایمان ورثہ کا ایمان ہو گا۔ جو شخص اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ کہتے ہوئے نئے سرے سے اپنی قوم میں نیکی اور تقویٰ کی عادت ڈالتا ہے۔ اس میں کبھی یہ دونوں باتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ اس کے اندر دونوں باتیں اسی کے نفس سے پیدا ہونی ضروری ہیں۔ اور یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے دل میں ایک ہی وقت میں لوگوں پر حکومت کرنے کا خیال بھی

انبیاء کا یقین خدا تعالیٰ کے وعدوں پر۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ

مگر پھر (بھی) انہوں نے اسے جھٹلایا۔ تب ہم نے اسے اور (نیز) انہیں جو کشتی میں اس کے ساتھ (سوار) تھے بچا لیا اور انہیں

خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ

ہم نے جانشین بنادیا اور جن لوگوں نے ہمارے نشانوں کو جھٹلایا (تھا) انہیں ہم نے غرق کردیا۔ سو دیکھ (کہ)

۷۴ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ○

جن لوگوں کو (اس عذاب سے) آگاہ کردیا گیا تھا ان کا انجام کیسا ہوا ؀۷۴

پیدا ہو اور ساتھ ہی خدا تعالیٰ کی عبادت کرنے اور کرانے کا بھی۔ ہاں یہ بالکل ممکن ہے۔ کہ ایک شخص کو اسکے ماں باپ یا بزرگ عبادت کی عادت ڈال دیں اور اپنی طبیعت کی رو سے وہ جابر اور ظالم بھی ہو۔ پس گو ورثہ کے ایمان والا ان متضاد باتوں کو جمع کرسکتا ہے۔ مگر مذہب کا بانی ایسا نہیں کرسکتا

خلیفہ

فما سألتكم من اجر میں حضرت نوح ؑ کی زبان سے یہ کہلوایا ہے۔ کہ اگر تم نے پیٹھ پھیری۔ اور جیسا کہ پیشگوئی سے ظاہر ہے۔ تم ضرور پیٹھ پھیروگے۔ اور میں تم پر غالب آیا۔ تب بھی میں کوئی مالی ذمہ داری تم پر نہیں ڈالوں گا۔ کیونکہ میں نے یہ کام تمہاری خیرخواہی کے لئے کیا ہے۔ نہ پہلے کوئی اجر مانگا۔ نہ آئندہ کوئی اجر اپنے لئے وصول کرونگا۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا اس معاملہ میں اسوہ

اگرچہ حضرت نوح ؑ کو یہ موقع نہیں ملا کہ دشمن ان کے مقابلہ میں حملہ کرکے شکست کھا گئے ہوں اور پھر حضرت نوح ؑ کو ان سے فاتحانہ معاملہ پڑا ہو اور پھر انہوں نے کچھ نہ لیا ہو۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ موقع ملا۔ آپ کی قوم آپ کے ہاتھوں مفتوح ہوئی اور حضور فاتحانہ طریق سے داخل مکہ ہوئے۔ اور حضور نے ان سے اس حالت میں بھی اپنے نفس کے لئے ایک حبہ بھی وصول نہ کیا۔

امرت ان اکون من المسلمین میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ مجھے تو خدمت ہی کا حکم ہے۔ بادشاہت کے لئے تو میں بنایا ہی نہیں گیا۔ پس اگر میں غالب بھی آگیا۔ تب بھی میرا کام خدمت کرنا ہی ہوگا۔ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔ ؎

منہ از بہر ما کرسی کہ ماموریم خدمت را

؀۷۴ حل لغات۔ خلائف کا واحد خلیفہ ہے۔ الخليفة من يخلف غيره و يقوم مقامه جانشین اور قائم مقام۔ السلطان الاعظم۔ حاکم اعلیٰ۔ شاہنشاہ۔ الامام الذی لیس فوقه امام وہ پیشرو اور حاکم جس کے اوپر اور کوئی حاکم اور پیشرو نہ ہو۔ (اقرب)

تفسیر۔ آخری حصہ آیت سے یہ بتایا ہے کہ ان لوگوں کی سزا میں کہ جن کو پہلے متنبہ نہ کیا گیا ہو اور ان لوگوں کی سزا میں جنہیں متنبہ کردیا گیا ہو۔ فرق ہوتا ہے۔ تبھی تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دیکھو کہ جن لوگوں کو متنبہ کردیا گیا تھا ان کی سزا کیسی تھی۔ یعنی عام لوگوں کی سزا اور ان لوگوں کی سزا میں ایک بین فرق تھا۔ اس آیت میں انبیاء اللہ اور رسولوں کے درجہ کی طرف ہمیں توجہ دلائی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آنیوالے وجود ایسے نہیں ہوتے۔ کہ ان کی بات کی پرواہ نہ کی جائے ؎

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ

پھر اس کے بعد ہم نے اور (بھی کئی) رسول اپنی (اپنی) قوم کی طرف بھیجے اور وہ ان کے پاس

بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ

روشن نشانات لیکر آئے تو وہ (لوگ) اس سبب سے کہ (اس سے) پہلے اس (صداقت) کو جھٹلا چکے تھے

قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ ۷۵

(اس پر) ایمان لانیوالے نہ بنے۔ ہم حد سے بڑھنے والوں کے دلوں پر اسی طرح سے مہر لگایا کرتے ہیں ۳۴ۃ

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ

پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنے نشان دیکر فرعون اور اسکی

مَلَا۠ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ ۷۶

قوم کے بڑے لوگوں کیطرف بھیجا۔ تو انہوں نے تکبر (اختیار) کیا۔ اور وہ (پہلے ہی سے) ایک مجرم قوم تھے ۳۵ۃ

۳۴ۃ حل لغات۔ طَبَعَ الشیءَ مثلہٗ بعلوٰنما اسکی کوئی صورت یا شکل بنائی۔ عَلَیْہِ ختم مہر لگائی۔ اللہ الخلق خلقھم۔ پیدا کیا۔ السَّیف عملہٗ وصاغہٗ بنایا۔ الدرھم نقشہٗ وسکہٗ مضروب کیا (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں مہر لگانے کی حقیقت کو اچھی طرح کھول دیا ہے اور دلوں پر مہر لگانے پر دشمنانِ اسلام جو اعتراض کیا کرتے ہیں۔ اس کا بوضاحت جواب دے دیا گیا ہے۔ فرماتا ہے۔ کہ چونکہ کفار پہلے انکار کر چکے تھے۔ اس واسطے ایمان لانا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ اور اپنے اقوال اور اعمال کی پیچ کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہٹنے سے انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر فرماتا ہے۔ کذٰلک نطبع علی قلوب المعتدین۔ ہم جو کہا کرتے ہیں کہ حدود کو توڑنے والوں کے دلوں پر ہم نے مہر لگا دی ہے۔ اس کا یہی مطلب ہوا کرتا ہے کہ چونکہ وہ ضد کرتے ہیں۔ ہم انہیں ہدایت نہیں دیتے نہ یہ کہ ہم اپنی طرف سے انہیں ہدایت سے روکتے ہیں۔ پس وہ مہر اصل میں بندہ کی طرف سے ہوتی ہے گو بوجہ اس کے کہ نتائج خدا تعالیٰ مرتب فرماتا ہے۔ اسے منسوب خدا تعالیٰ کی طرف کر دیا جاتا ہے۔ ایک دوسری جگہ فرماتا ہے۔ ام علیٰ قلوب اقفالھا (محمد ع ۳) کہ جو تالے کفار کے دلوں پر لگے ہوئے ہیں۔ وہ خود ان کے دلوں سے ہی پیدا شدہ ہیں۔

طبع

دلوں پر مہر لگانیکے معنی

۳۵ۃ حل لغات۔ المَلَأُ۔ ملا یملا سے نکلا ہے۔ جس کے معنی بھر دینے کے ہوتے ہیں۔ الملأ کے معنی ہیں۔ الاشراف۔ وسموا لانہم یملؤن العیون بہجۃً والصدور ھیبۃً۔ معزز لوگ اور ان کا نام ملا اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ آنکھوں کو عظمت سے اور سینوں کو ہیبت سے بھر دیتے ہیں۔ الجماعۃ۔ جماعت۔ التشاور۔ باہم مشورہ کرنا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ ما کان ھذا الامر عن ملاءٍ منا۔ ای تشاور۔ ہمارے مشورہ سے یہ بات نہیں ہوئی۔ استکبر الرجل

الملأ

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○

پھر جب ہماری طرف سے اُن کے پاس حق آیا تو انہوں نے کہدیا (کہ) یہ یقیناً یقیناً ایک (تعلقات کو) کاٹ دینے والا فریب ہے ۵۵

اَبَانَ

کان ذا کبریاء۔ بڑا بنا۔ مغرور ہوا۔ (اقرب)

لوگوں کے انکار انبیاء کے دو باعث

تفسیر۔ جب بھی کوئی نبی دنیا میں آتا ہے۔ تو لوگ دو وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں یا تو اس کے دعویٰ کو بڑا خیال کرتے ہیں۔ اور یا اپنے آپ کو اس امر سے بالا سمجھتے ہیں۔ کہ اسکی بات مان لیں۔ یہی حال حضرت موسیٰؑ کا ہوا۔ بعض نے یہ بات ناممکن سمجھی۔ کہ خدا تعالیٰ بندہ سے کلام کرے۔ اور بعض نے یہ بات خلاف شان سمجھی۔ کہ موسےٰؑ جیسے بے کس انسان کی اطاعت کریں۔

کانوا قوما مجرمین کے دو معنی

وکانوا قوما مجرمین کے دو معنی ہوسکتے ہیں

(۱) وہ پہلے ہی سے مجرم تھے۔ اس لئے حضرت موسیٰ کا انکار کر دیا۔ ان معنوں کے رو سے استکبروا کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے۔ کہ اس لئے نہ مانا کہ اس طرح ان کی آزادی میں فرق آتا تھا۔ اور بُرے کاموں میں روک پیدا ہوتی تھی

(۲) دوسرے معنی اس کے یہ ہو سکتے ہیں۔ کہ وہ انکار کرکے مجرم بنگئے۔ صداقت کے انکار کے ساتھ ان دونوں معنوں کا تعلق ہے۔ بدی بدی کی طرف مائل کرتی ہے۔ پس یہ بھی سچ ہے کہ جو لوگ مجرم ہوتے ہیں۔ وہ صداقت کے قبول کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ صداقت کا انکار کرکے انسان کے تقویٰ کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ اور اگر پہلے اس شخص میں خشیت الٰہی ہوتی بھی ہے۔ تو صداقت کے انکار کے بعد یکدم یا آہستگی سے جاتی رہتی ہے۔ پس صداقت کا انکار کوئی معمولی چیز نہیں۔ جو شخص تقویٰ کی کچھ بھی قدر کرتا ہو۔ اسے اس سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے۔

۵۵ حل لغات۔ مُبِین۔ ابان سے ہے۔ اس کے معنی ہیں۔ فَصَلَ جدا کیا۔ الشیءُ اتضح واضح ہوا۔ الشیءُ اَوْضَحَہٗ۔ واضح کیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ جب کبھی کوئی سچائی اللہ تعالیٰ کیطرف سے آتی ہے تو لوگ اسے سحرٌ مبینٌ کہدیتے ہیں۔ اور ان دو لفظوں میں شرارت کی ساری صورتیں مخفی ہیں۔ دنیا میں ہمیشہ دو ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ مذہبی اور سیاسی۔ سحر یعنی فریب کہکر ان لوگوں کو بھڑکانے کی کوشش کی جاتی ہے جو مذہبی ہوتے ہیں۔ انہیں ڈرایا جاتا ہے۔ کہ یہ فریب ملک کے مذہب کو بگاڑ دے گا۔ اور مبین کہہ کر سیاسی لوگوں کو اکسایا جاتا ہے۔ کہ یہ صرف ایک فریب نہیں۔ بلکہ قوم میں تفرقہ ڈالدینے والا فریب ہے۔ پس اگر قوم کی خیر خواہی منظر ہے۔ تو اس کا مقابلہ کرو۔ ورنہ قوم ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیگی جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے۔ یہ شیطانی حربہ برابر استعمال ہو رہا ہے اور ابھی تک بیکار نہیں ہوا۔ اس زمانہ کے مصلح کے مقابلہ میں بھی یہی حربہ استعمال کیا گیا۔ اور کیا جا رہا ہے۔ اور لوگ ہیں۔ کہ قرآن کریم میں ان سب امور کو پڑھتے ہوئے غور اور تدبر سے کام نہیں لیتے اور نہیں سوچتے کہ قوم تو پہلے ہی سے مٹ چکی تھی۔ تفرقہ کس میں ڈالنا تھا۔ اگر بنانا ہی تفرقہ ہوتا ہے۔ تو تفرقہ نہ معلوم کیسے کہتے ہیں۔

قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ

(اسپر موسیٰ نے (ان سے) کہا (کہ) کیا تم حق کی نسبت (ایسا) کہتے ہو (اور وہ بھی اس وقت) جبکہ وہ تمہارے پاس آگیا ہے۔ کیا یہ فریب (ہو سکتا) ہے

هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا ۷۸

حالانکہ فریب دینے والے کامیاب نہیں ہوتے ؁ انہوں نے کہا کیا تو (اس لئے) ہمارے پاس آیا ہے۔

عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ

کہ جس بات پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے اس سے ہمیں ہٹا دے۔ اور تم (دونوں) کو ملک میں بڑائی حاصل

فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ ۷۹

ہو جائے۔ اور ہم (تو) تم پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے ؁

؁ — اَسِحْرٌ هٰذَا۔ یعنی یہ تعلیم تمہارے سامنے موجود ہے۔ اس کا اثر بھی نمایاں ہے۔ اس کی تفصیلات بھی تم جان چکے ہو۔ کیا پھر بھی تم اس کو سحر قرار دیتے ہو یہ تو جھوٹ کا سر کچلنے والی کتاب ہے۔ یہ سحر کس طرح ہو سکتی ہے۔

وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ فریب کی باتیں کرتے ہیں۔ اور جھوٹ پھیلاتے ہیں۔ وہ نبیوں کے مقاصد کو حاصل نہیں کر سکتے۔ پس میں اگر ساحر ہوں تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ نبیوں کا مقصد قوم کی مذہبی۔ اخلاقی۔ تمدنی اور سیاسی حالت کو بدل ڈالنا ہوتا ہے۔ خواہ جلد خواہ بدیر۔ کوئی نبی اس مقصد کے بغیر نہیں آتا۔ حضرت موسیٰ ؑ کہتے ہیں۔ کہ میں ان مقاصد کو پورا کر رہا ہوں۔ اور ایک دن پورے طور پر پورا کر کے دکھا دونگا۔ پھر تم کس طرح کہہ سکتے ہو۔ کہ جو شخص یہ تغیرات پیدا کر دے وہ فریبی اور جھوٹا ہے +

؁ حل لغات لتلفتنا۔ لفت الشیٔ یلفت لفتًا لواہ و صرفہ الی ذات الیمین والشمال پھیر دیا۔ اور دائیں بائیں کر دیا۔ فلانًا عن رأیہ او صرفہ عن رأیہ۔ رائے بدلوا دی (اقرب) الکبریاء العظمۃ۔ بڑائی والتجبر۔ جبر سے کام لینا۔ جبر و دستی و فی اللسان العظمۃ والملک۔ لسان العرب میں ہے۔ کہ اس کے معنی بڑائی اور حکومت کے ہیں۔ وقیل ھی عبارۃ عن کمال الذات وکمال الوجود ولا یوصف بہا الا اللہ تعالیٰ۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنی ذاتی کمال کے ہیں۔ اور سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو اس لفظ سے موصوف نہیں کیا جا سکتا گو اجب بندے کے لئے یہ لفظ آتا ہے۔ تو ہمیشہ بُرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی تجبر کے معنوں میں۔

فی الارض۔ اُس ملک میں نہ یہ کہ ساری دنیا میں

تفسیر۔ سحر مبین میں جو دو اعتراض مختصر الفاظ میں بتلائے گئے تھے۔ اس آیت میں ان کی تشریح کر دی گئی ہے۔ پہلے حصہ آیت میں کفار کے سرداروں کا یہ اعتراض نقل کیا گیا ہے۔ کہ یہ شخص ہمیں باپ دادا کی تعلیم سے پھرانا چاہتا ہے۔ اور اکثر لوگوں کے نزدیک وہی حق ہوتا ہے جس پر کہ ان کے باپ دادے چلتے آئے ہوں۔ بس دوسرے لفظوں میں انہوں نے یہ اعتراض

الکبریاء

فریبی شخص انبیاء کے مقاصد کو نہیں پا سکتا

سحر مبین میں دو اعتراض

لفت

۸۰ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ○ فَلَمَّا جَآءَ

اور فرعون نے (اپنے لوگوں سے) کہا (کہ) تم میرے پاس (مملکت بھر کے) ہر ایک کامل الفن واقفیت والے ساحر کو لے آؤ ۸۰؎ پس جب

۸۱ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ○

ساحر (لوگ) آئے تو موسیٰ نے انہیں کہا (کہ) جو کچھ تمہیں ڈالنا ہے ڈالو ۸۱؎

فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اسپر جب انہوں نے (جو کچھ ڈالنا تھا) ڈالدیا تو موسیٰ نے کہا (کہ) جو کچھ تم (لوگوں) نے پیش کیا ہے (پورا) پورا فریب ہے (اور) اللہ (تو)

۸۲ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ○

یقیناً یقیناً اُسے مٹا دیگا اللہ (تعالیٰ) فساد کرنیوالوں کی کارروائی کو درست ہرگز نہیں (کیا) کرتا ۸۰؎

کیلئے کہ یہ شخص ہمیں حق سے پھرانا چاہتا ہے۔ مگر اس مضمون کو ایسے رنگ میں بیان کیا ہے۔ کہ عوام الناس میں خوب جوش پھیل جائے۔ دوسرا اعتراض یہ تھا۔ کہ یہ شخص تفرقہ ڈالنا چاہتا ہے۔ اسے اس آیت میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ موسیٰ اور ہارون حکومت چاہتے ہیں۔ اور حکومت حاصل کرنے کا ذریعہ یہی ہوا کرتا ہے۔ کہ موجودہ نظام سے تعلق رکھنے والے افراد میں تفرقہ ڈالوا دیا جائے۔

ایک غلطی سے دوسری غلطی کا ارتکاب

۷۸؎ - دیکھو ایک غلطی سے انسان کس طرح دوسری غلطی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ خدا کے برگزیدہ نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ساحر کہا۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ خود بھی علمی تحقیق سے محروم رہ گئے۔ اور اپنے بچھائے ہوئے جال میں خود پھنس گئے۔ ساحر کہا۔ تو ان کے مقابلہ کے لئے ساحروں ہی کی تلاش ہوئی۔

حضرت موسیٰ کا استغناء

۷۹؎ - جب جادوگر آئے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ جو کچھ تم نے پھینکنا ہے پھینکو یعنی جو کچھ تمہیں کرنا ہے کرو۔ میں تو اسے فضول سمجھتا ہوں۔ گویا اظہار استغناء فرما رہے ہیں۔

مفسدوں کے اعمال کا نتیجہ

لوگ اس آیت کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ بھی ان کے مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ حالانکہ یہ بات نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خوب معلوم تھا۔ کہ وہ جادوگر ہیں۔ اور جو کچھ کرینگے۔ وہ فضول ہی ہوگا۔ انہوں نے تو استغناء کا اظہار کیا ہے۔ موسیٰ ؑ نے فوراً ہی انکار محض اس لئے نہیں کیا کہ انہوں نے سوچا کہ جب وہ مقابل پر آئینگے تو حقیقت خود ہی آشکار ہو جائیگی۔ اور اسی وقت کہنا مناسب بھی ہوگا۔ چنانچہ وقت پر یہ کہدیا۔ کہ ماجئتم بہ السحر۔

۸۰؎ حل لغات۔ اَصْلَحَهٗ ضد اَفْسَدَهٗ ٹھیک کر دیا۔ درست کر دیا مناسب حال کر دیا۔ بعد فسادہ اَقَامَهٗ خرابی کو دور کر کے درست کر دیا۔ بین القوم وفق صلح کروائی۔ الیہ اَحْسَنَ۔ احسان کیا۔ الی دابتہ احسن الیہا وتعہدھا۔ اسے اچھی طرح سے رکھا اور اس کا پورا خیال رکھا۔ اصلح اللہ لہ فی ذریتہ ومالہ۔ اللہ تعالیٰ نے اسکو اولاد اور مال کی بہتری اور درست حالی نصیب کی (اقرب)

تفسیر۔ جھوٹ اور فریب جب صداقت کے مقابلہ پر آتا ہے۔ تو اس کا پول کھل جاتا ہے اور مفسدوں

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ ۸۳ ع ۱۲

اور اللہ (تعالیٰ) اپنے کلمات کے ذریعہ سے حق کو قائم کرتا ہے۔ گو مجرم (لوگ اس بات کو) ناپسند کریں ۵۸۱

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ

پھر (بھی) سوائے اس کی قوم (ہی) کے چند بچوں کے کسی نے (بھی) فرعون (کے ڈر سے) اور (نیز) اپنی

فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ

قوم کے بڑے لوگوں کے خوف سے کہ وہ (خود ہی یا دوسروں کے ذریعہ سے) انہیں (کسی) مصیبت میں (نہ) ڈال دے موسیٰ کی

فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ ۸۴

فرمانبرداری نہ (اختیار) کی اور فرعون یقیناً یقیناً زمین میں چیرہ دستی کرنیوالا تھا اور یقیناً یقیناً وہ حد سے بڑھ جانے والوں میں سے تھا ۵۸۲

کے اعمال فساد ہی پیدا کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کرے تو انسان مفسدوں والے اعمال اور نتیجہ اصلاح نکلے۔ تو تا یکہ وہ مفسدین کے ارادوں اور ان کے عملوں کو آپس میں مناسب حال نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ وہ اپنی حالت بدلتے رہتے ہیں اور اس وجہ سے انہیں کامیابی بھی نصیب نہیں ہوتی۔

۵۸۱ — کلمات میں بشارتیں اور انذار دونوں شامل ہیں۔ ان دونوں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ حق کو ثابت کیا کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس جگہ ایک عجیب لطیفہ بیان فرمایا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ اپنے دین کی اشاعت کے لئے جھوٹ اور فریب کا محتاج نہیں۔ ہر چیز اس کے حکم کے تابع ہے۔ وہ اپنے حکم سے دین کی اشاعت کرتا ہے۔ نہ کہ مفسد کے فریب سے۔ اس میں یہ اخلاقی نکتہ ہے۔ کہ مقصد کی سچائی ہمیں اس بات کا مجاز نہیں بنا دیتی۔ کہ ہم اس کے حصول کے لئے جھوٹے ذرائع اختیار کریں مقصد خواہ کتنا ہی اعلیٰ ہو۔ ذرائع حصول بھی اعلیٰ ہونے چاہئیں افسوس ہے کہ اس زمانہ میں بہت سے لوگ اس صداقت سے نابلد ہو رہے ہیں۔ اور عام طور پر دنیا میں یہ وبا پھیل رہی ہے۔ کہ سچائی کی خاطر جھوٹ بولنا جائز ہے۔ حالانکہ وہ سچائی ہی کیا جو جھوٹ کے بغیر غالب نہ آسکے۔

۵۸۲ حل لغات۔ اٰمَنَ اٰمَنَ۔ امن بخشا۔ بچایا اٰمَنَ بِهٖ صدّقه ووثق به۔ ایمان لایا۔ تصدیق کی اور پورا اعتماد کیا۔ آمن له خضع وانقاد۔ فرمانبرداری اختیار کی۔ مطیع ہو گیا۔ کہنا مان لیا۔ (اقرب)

آمَنَ

الذُّرِّيَّةُ الصِّغَارُ من الاولاد وان کان قد يقع على الصغار والكبار معًا في التعارف۔ یعنی ذریت کے معنی چھوٹی عمر کے بچوں کے ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی عرف عام میں چھوٹے اور بڑے سب بچوں کیلئے مشترک طور پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ويستعمل للواحد والجمع واصله للجمع۔ اور یہ لفظ ایک بچہ کے لئے بھی اور زیادہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ گو اصل میں جمع کے لئے ہی یہ لفظ بنا ہے۔ (مفردات) عَلٰى کے معنی علاوہ اور معانی کے تعلیل یعنی اظہار سبب وعلت کے بھی ہوتے ہیں (اقرب)

ذریّة

حق کو باطل کی تائید کی ضرورت نہیں ہوتی۔

فَتَنَ۔ يَفْتِنُ فَتْنًا وفُتُوْنًا۔ اَعْجَبَهٗ اسے پسند آیا۔ فَتَنَ الْمَالُ النَّاسَ۔ استمالهم

مال نے ان کو اپنی طرف مائل کیا۔ فَتَنَتِ المرأۃُ فلاناً وتَّھتہ اُس عورت نے اس مرد کو اپنا فریفتہ بنا لیا۔ فتن زیدٌ عمرًا۔ اوقعہ فی الفتنۃ فَفُتِنَ ای فوقع زید نے عمرو کو فتنہ میں ڈال دیا اور وہ فتنہ میں پڑ گیا یعنی لازم و متعدی دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے فلانًا فتنہٗ ومَفْتُونًا اَضَلَّہٗ اسے گمراہ کر دیا۔ فتن الرجلُ فُتُنًا للنساء۔ اراد بھن الفجور۔ عورتوں سے بدکاری کا ارادہ کیا۔ فتن الشئَ فَتْنًا۔ احرقہ اس چیز کو جلا دیا۔ اور انہی معنوں میں قرآن کریم کی اس آیت میں یہ لفظ آیا ہے۔ وھو علی النار یفتنون (اقرب) فتن فلانًا عن رائہٖ۔ صدّہ اس کو اس کی رائے سے باز رکھا۔ فتن الصائغ الذھب والفضۃ فتنۃ اذابہٗ بالبوتقۃ واحرقہٗ بالنار یبیّن الجید من الردی ویعلم انہ خالص او مشوب وھو اصل معنی الفتنۃ۔ یعنی چاندی یا سونے کو کٹھالی میں ڈال کر پگھلایا اور آگ میں گرم کیا۔ تاکہ کھوٹے کو کھرے سے جدا کرے اور معلوم ہو جائے کہ وہ خالص ہے یا آمیزش والا ہے۔ اور یہی اصل معنی فتنہ کے ہیں (اقرب)

عَلَا

عالٍ علا کا اسم فاعل ہے۔ علا کے معنی ہیں۔ ارتفع اونچا ہوا۔ فی الارض تکبر و تجبر۔ ملک میں ظالمانہ طریق پر حکومت کی۔ فلانًا غلبہ وقھرہ دبا کر زیر کر لیا (اقرب)

اَسْرَفَ

مُسرف۔ اَسْرَفَ کا اسم فاعل ہے۔ جس کے معنی ہیں جاوز الحد وافرط حد سے بڑھا۔ اخطأ غلطی کی جھل جہالت سے کام لیا۔ غفل۔ غفلت دکھائی (اقرب)

جبر کا لازمی نتیجہ بغاوت ہے

ملأھم کی ضمیر کا مرجع

تفسیر ۔ فما اٰمن لموسٰی الا ذریۃ من قومہ الخ کے یہ معنی ہوئے کہ حضرت موسٰی علیہ السلام کی ان کی قوم کے ہی کچھ آدمیوں نے اطاعت کی۔ اور دوسرے لوگوں نے اس ڈر کے مارے ان کی بات نہ مانی۔ کہ فرعون انہیں تکلیف نہ پہنچائے یا عذاب میں نہ ڈالے یا ان کو جلا نہ دے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ انبیاء کے زمانہ میں لوگوں کے دل تو انہیں مان جاتے ہیں۔ مگر ڈر کے مارے ظاہر میں انہیں نہیں مانتے۔ اور کھلے کھلے طور پر ان پر ایمان نہیں لاتے کئی جابر بادشاہ ہوتے ہیں۔ مگر وہ عقلمند بھی ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کو ایسے طور پر تنگ نہیں کرتے۔ کہ جس سے لوگ ان کی بغاوت پر مجبور ہوں۔ مگر فرعون بیوقوف تھا۔ کہ اس نے ایسا طریق اختیار کیا۔ جس نے لوگوں کو اس کی بغاوت پر مجبور کر دیا۔ حضرت نوحؑ اور اُن کے ساتھیوں پر بھی ظلم و جبر ہوا۔ لیکن حضرت نوحؑ کا زمانہ حقیقۃً استہزاء کا زمانہ تھا۔ کیونکہ ان کی قوم ان کے مخالف تھی انہیں اور ان کے ساتھیوں کو حقیر سمجھ کر ان کے مٹانے کے لئے اس قدر جدوجہد نہ کرتی تھی۔ لیکن فرعون کے زمانہ میں چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم ان کے ساتھ تھی۔ اس لئے اس کو ان کے بڑھ جانے کا اور اپنے کمزور ہو جانے کا خوف تھا۔ اور اس لئے وہ ان پر جبر کرتا تھا مگر یہ اس کی بہت بڑی نادانی تھی۔ ایسے بے وجہ تشدد اور ظلم سے بغاوت کو تقویت پہنچتی ہے۔ اور فائدہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت موسیٰ کی ساری قوم ان پر ایمان نہیں لائی تھی۔ بلکہ اس کا ایک حصہ ایمان لایا تھا جیسا کہ ذُرِّیَّۃٌ مِّنْ قَوْمِہٖ کا لفظ ظاہر کر رہا ہے۔ اور باقی حصہ صرف سیاسی رنگ میں ساتھ لگا ہوا تھا بعض مفسرین نے من قومہ کی ضمیر کو فرعون کی طرف پھیرا ہے۔ اور یہ مراد لی ہے۔ کہ فرعون کی قوم میں سے بھی کچھ لوگ آپ پر ایمان لے آئے تھے۔ لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

اس آیت میں ملأھم کی ضمیر کے متعلق سوال ہے کہ یہ ضمیر کس طرف جاتی ہے۔ بعض کے نزدیک بنی اسرائیل کے سرداروں کی طرف جاتی ہے۔ کیونکہ انہی کا ذکر ہے اور بعض کے نزدیک فرعون کی قوم کے سرداروں کی طرف ان کے نزدیک بنی اسرائیل کا سردار انہیں اس لئے کہا ہے۔ کہ بنی اسرائیل محکوم تھے۔ میرے نزدیک کسی خاص

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ

اور موسیٰ نے (اپنی قوم سے) کہا (کہ) اے میری قوم اگر یہ بات (درست) ہے۔ کہ تم اللہ (تعالیٰ) پر ایمان لائے ہو۔ تو

تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝ ۸۵

اگر (اس کے ساتھ) تم (اُسکے) سچے فرمانبردار (بھی) ہو تو اسی پر بھروسہ کرو ۵۸۳

طرف منہ پھیرنے کی ضرورت نہیں۔ ملک کے بڑے لوگ صرف قوموں کے لحاظ سے بڑے نہیں ہوتے۔ بلکہ حکومت کے لحاظ سے بھی پس حکومت کے جو بڑے لوگ تھے۔ خواہ اسرائیلی ہوں یا فرعونی سب بنی اسرائیل کے بڑے لوگ کہلا سکتے ہیں۔ اور فرعون دونوں ہی کے ذریعہ سے ظلم کیا کرتا تھا۔

۵۸۳ — حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو کہتے ہیں کہ تم کو خدا تعالیٰ پر پورا اعتماد رکھنا چاہیئے۔ تمہیں یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ جس کام کے پیچھے تم لگے ہو۔ وہ خدا تعالیٰ کا کام ہے۔ بہت سے لوگ کہا کرتے ہیں۔ کہ فلاں کام قومی کام ہے۔ اس اصطلاح کو اسلام نے تسلیم نہیں کیا۔ وہ اس کی بجائے دینی کام یا خدا تعالیٰ کے کام کی اصطلاح کو پسند کرتا ہے اس طرح ایک تو خدا تعالیٰ مدِنظر رہتا ہے۔ دوسرے قوم پرستی کے تنگ دائرہ سے انسان آزاد رہتا ہے۔

ان کنتم مسلمین۔ کا جملہ بظاہر زائد معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے فرما چکا ہے۔ اِن کنتم اٰمنتم لیکن درحقیقت یہ زائد نہیں بلکہ ضرورت کے مطابق اور نئے معنی پیدا کرنے کے لئے آیا ہے۔ اسلام جب ایمان کے مقابل آجائے۔ تو اس وقت ایمان کے معنی یقین کامل کے ہوتے ہیں اور اسلام کے معنی ظاہری اطاعت کے ہوتے ہیں۔ گویا اس موقع پر ایمان سے مراد قلبی اطاعت اور اسلام سے مراد ظاہری اطاعت ہوا کرتی ہے۔ پس اس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر تم کو خدا تعالیٰ پر کامل یقین ہو چکا ہے۔ تو اگر تم عملی طور پر بھی اس ایمان کے ثمرات کو پرکھنا چاہتے ہو۔ تو اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔ اور اپنے سب کام اسی کے سپرد کر دو۔

اس آیت میں بتایا ہے۔ کہ قلبی ایمان کے بعد عملی تغیر ہونا چاہیئے۔ کیونکہ مومن کے لئے ایمان کا درجہ پہلے اور اسلام کا درجہ بعد میں آتا ہے۔ لیکن کمزور ایمان والے کے لئے اسلام کا درجہ پہلے اور ایمان کا درجہ بعد میں آتا ہے۔ کیونکہ کمزور ایمان والا پہلے اعمال شروع کرتا ہے۔ پھر اس کی وجہ سے آہستہ آہستہ اس کا دل قوی ہو جاتا ہے۔ اور ایمان بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔

لیکن جس شخص کو پختہ ایمان حاصل ہوتا ہے۔ اس کے اعمال اس کے ایمان کے تابع ہوتے ہیں کیونکہ اسکی ترقی ذاتی ہوتی ہے۔ پس اصلاح کا کام بھی دل سے نکلکر ظاہر کی طرف آتا ہے۔ ادنیٰ درجہ کے آدمی کی اصلاح طفیلی ہوتی ہے اور دوسرے کے سہارے کی محتاج ہوتی ہے۔ اس وجہ سے باہر سے اندر کی طرف آتی ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں۔ کہ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (حجرات ع ۲) یعنی تم لوگوں کو مسلمانوں کی صحبت سے ابھی ظاہری نقل کی توفیق ملی ہے۔ پس یہ تو کہو کہ ہم مسلمان ہوگئے ہیں۔ اور یہ نہ کہو کہ ہم مومن ہوگئے ہیں۔ کیونکہ ابھی قلبی صفائی کا مقام تمہیں طے کرنا ہے۔

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً

اپھر انہوں نے کہا (کہ) ہم اللہ (تعالیٰ) پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں ۔اے ہمارے رب ہمیں (ان) ظالم لوگوں کے لئے

۸۶ لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ

فتنہ (کا موجب) نہ بنا ۵۸۴ اور اپنی رحمت سے ہمیں کافر لوگوں (کے ظلم)

۸۷ الْكٰفِرِیْنَ ۝ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ

سے بچالے اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کیطرف وحی بھیجی کہ تم مصر میں چند

لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ قِبْلَةً

مکانوں (کی جگہ) کو اپنی قوم کے رہنے کے لئے اختیار کرو اور تم (سب لوگ) اپنے (اپنے) گھر آمنے سامنے بناؤ

۸۸ وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

اور (انہیں) عمدگی سے نماز ادا (کیا) کرو اور (یہ وحی بھی کی کہ اے موسیٰ) تو مومنوں کو (کامیابی کی) بشارت دے ۵۸۵

۵۸۴ - اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم ایسے کام ذکریں کہ ظالم لوگوں کو دین پر حملہ کرنے کا موقع مل جائے اور یہ بھی کہ ہمیں ظالم قوم کے ظلموں کا تختہ مشق نہ بنا۔

تَبَوَّاٰ ۵۸۵ حل لغات تبوّأ المكان و بالمكان محلّه وأقام به - یعنی تبوّأ المكان یا تبوأ بالمکان کے معنی ہوتے ہیں۔ اسے اپنی جائے رہائش بنایا اور اس میں ٹھہرا۔

القبلہ القبلة الىنوع - قسم - الجهة عرف بکتے ہیں ما لهذا الامر قبلة - ای جهة صحّة اس بات کی درستی کی اور ٹھیک ہونے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ الكعبة کعبہ کو بھی قبلہ کہتے ہیں۔ کل ما یستقبل من الشئ۔ جس چیز کی طرف منہ کیا جائے اور ماله فی هذا قبلة ولا دبرة کے معنی ہیں۔ اسے اس بات کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ اجعلوا بیوتکم قبلة - ای متقابلة اور اجعلوا بیوتکم قبلة

اجعلوا بیوتکم قبلۃ کے معنی

کے معنی ہیں متقابل یعنی آمنے سامنے۔ (اقرب)

تفسیر مصر میں گھر بنا کر رہو کا یہ مطلب نہیں۔ کہ وہ پہلے جنگل میں رہتے تھے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اکٹھے ہو کر رہو۔ تاکہ ایک دوسرے سے تعاون کر سکو۔ یہ بھی ایک قسم کی ہجرت ہوتی ہے۔ یہ ایک طبعی جذبہ ہے۔ کہ کمزور جماعتیں شہروں میں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ یہاں ہندو لوگ شہروں میں اپنی نسبت آبادی سے زیادہ آباد ہیں۔ یوپی میں مسلمانوں کی آبادی کم ہے۔ وہاں مسلمان اپنی تعداد کی نسبت سے شہروں میں زیادہ آباد ہیں۔

واجعلوا بیوتکم قبلة کے معنی قبلہ کے مختلف معنوں کی وجہ سے کئی ہونگے اور جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ کہ ایک لفظ ہی کئی معانی پر دلالت کردے۔ پس جس قدر معنی سیاق و سباق کے رو سے

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ

اور موسیٰ نے کہا (کہ) اے ہمارے رب تو نے (تو) فرعون (کو) اور اس کی قوم کے بڑے لوگوں کو (اس ورلی) زندگی میں زینت

اَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ

(کے سامان) اور اموال دے رکھے ہیں۔ اے ہمارے رب (لیکن) اس کے نتیجہ میں (وہ) لوگوں کو بھی تیری راہ سے برگشتہ کر رہے ہیں

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا

اے ہمارے رب انکے مالوں کو برباد کر دے اور ان کے دلوں (کی زمین) پر حملہ آور ہو (اور) پھر اس کے نتیجہ میں وہ

يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ○ ۸۹

جب تک کہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں (آئندہ بھی) ایمان نہ لائینگے ۵۸۶

مل سکیں سب ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ پس قبلہ کے متفرق معنوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس آیت کے یہ معنی ہونگے کہ (۱) اکٹھے ہوکر رہنا چاہیئے۔ کیونکہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے گھر تب ہی ہو سکتے ہیں جب سب لوگ اکٹھے ہوکر رہیں (۲) ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیئے کیونکہ آمنے سامنے مکان بنانے کی غرض یہی ہوا کرتی ہے۔ کہ وقت پر آسانی سے مدد کر سکیں (۳) چونکہ قبلہ کے معنی جہت کے بھی ہیں۔ پس یہ بھی مراد ہے کہ ایک ہی طرف سب مکان ہوں یعنی سب جماعت ایک نظام کے ماتحت ہو اور متحدہ مقاصد کی پیروی کی جائے (۴) قبلہ کے معنی نوع کے بھی ہوتے ہیں۔ پس یہ معنی بھی ہونگے کہ ایک قسم کے مکان ہوں اور ان معنوں سے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ قومی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ غریب و امیر میں مضبوط رابطہ ہو۔ اور ساری قوم ایک ہی رنگ میں رنگین نظر آئے تاکہ ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت حاصل ہو۔ اگر ایک شخص محلات میں رہیگا اور دوسرا جھونپڑے میں تو ارتباط پیدا ہونا مشکل ہوگا۔

اقیموا الصلوٰۃ میں دعاؤں کی طرف اور استقلال کے ساتھ کام کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کیونکہ اقامۃ استقلال پر دلالت کرتی ہے۔

ترقی کے سات گُر

خلاصہ یہ کہ اس آیت میں سات گُر ترقی کے بتلائے ہیں جن پر عمل کرکے دنیا کی ہر قوم ترقی کر سکتی ہے۔ یعنی (۱) اجتماع (۲) اتحاد (۳) تعاون (۴) نظام (۵) بڑے چھوٹوں میں ارتباط (۶) دعا (۷) استقلال۔ اور آخری گُر نگران کے لئے بتلایا کہ و بشر المؤمنین کہ جو لوگ اطاعت کے حلقہ میں آجائیں۔ ان کو کامیابی کی خوشخبری دے دے کر ان کا حوصلہ بڑھاتے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ مایوسی اور نا امیدی سب آفتوں سے بڑی آفت ہے۔

طمس

۵۸۶ حل لغات۔ طمس علیہا اهلکہ اسے ہلاک کر دیا۔ طمسہ۔ استاصل اثرہ اس کا نشان مٹا ڈالا (اقرب)

شدّ علیہ

شدّ علیہ۔ حمل علیہ۔ اس پر حملہ کیا (اقرب) اس کے معنی دل کو سخت کرنے کے جو مفسرین نے لکھے ہیں یعنی اُن کے دلوں کو سخت کر دے۔ وہ کسی لغت کی کتاب میں نہیں ملتے۔ لغت کی کتب سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب شَدَّ کے بعد عَلٰی آئے۔ تو اس کے معنی صرف حملہ کرنے کے ہوتے ہیں۔

اقیموا الصلوٰۃ

فلا یؤمنوا کے معنی

زینۃ کے معنی

الزینۃ ما یتزین بہ۔ حسن کے حصول اور عیوب کے زوال اور اظہار کا سامان اور ذریعہ (اقرب) یوں تو قرآن مجید نے ان سب چیزوں کو زینت فرمایا ہے۔ جو زمین پر ہیں جیسا کہ فرمایا انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لھا (کہف ۴) بلکہ حیات دنیا کو بھی زینت فرمایا ہے چنانچہ فرماتا ہے۔ انما الحیٰوۃ الدنیا لعب ولھو و زینۃ و تفاخر بینکم و تکاثر فی الاموال والاولاد (حدید ۳۶) مگر جہاں زینۃ الحیٰوۃ الدنیا کا ذکر فرماتا ہے۔ وہاں پر لفظ زینت کا اطلاق دو ہی چیزوں یعنی مال و اولاد پر ہوتا ہے۔ جیسے کہ سورۂ کہف میں آتا ہے۔ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَۃُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا یعنی مال اور بیٹے دونوں ورلی زندگی کی زینت ہیں۔ اور جہاں اقوام کی گمراہی کے ذکر میں زینت کا ذکر آتا ہے اس سے بھی حیٰوۃ دنیا کی زینت ہی مراد ہوتی ہے۔ جو اموال و اولاد پر مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن یہاں پر زینت کا اطلاق مجرد اولاد پر ہوا ہے۔ کیونکہ یہاں زینت کے ساتھ اموال کا لفظ بڑھا دیا ہے۔ جو کہ حقیقت میں اس کے معنوں کا ایک حصہ تھا اور جب کسی حصہ کو الگ بیان کر دیا جائے تو لفظ صرف بقیہ معنوں پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے اسریٰ رات کے سفر کو کہتے ہیں۔ مگر اسریٰ بعبدہ لیلا میں رات کا ذکر علیحدہ ہو جانے کی وجہ سے اسریٰ کے معنے مجرد سفر کرنے کے رہ گئے ہیں۔

اموال کے معنی

لیضلوا کے لام کے معنی

تفسیر۔ آیۃ کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالےٰ نے اموال اور اولاد۔ آل فرعون کو اس لئے دیا تھا کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرے بلکہ لیضلوا کا لام صیرورۃ اور عاقبۃ کا لام ہے۔ اور اس کے یہ معنی ہیں کہ تو نے تو ان کو مال اولاد دیئے تھے۔ لیکن بجائے شکر گذار رہنے کے نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ گمراہ کرنے لگ گئے ہیں۔ غرض لام اس جگہ علت پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ نتیجہ پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہ ایک طریق اظہار افسوس کا ہے۔ کہ کیسی بدنصیب قوم ہے کہ اس قدر احسانات کے بعد بھی ناشکری کرتی۔ بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کرتی ہے۔ فلا یؤمنوا کا عطف لیضلوا پر ہے۔ یعنی گمراہ کریں گے اور ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ عذاب نہ دیکھ لیں۔ ربنا اطمس علیٰ اموالھم واشدد علیٰ قلوبھم کا جو معترضہ ہے اور اس میں بددعا نہیں بلکہ حقیقت میں دعا کی گئی ہے۔ حضرت موسیٰ بیان فرماتے ہیں کہ خدایا تو نے تو ان کو مال و اولاد دیئے تھے چاہیئے تھا کہ یہ شکر گذار رہتے لیکن یہ الٹے ناشکرے ہو گئے ہیں۔ اور اس قدر ترقی کی ہے کہ لوگوں کو گمراہ کرنے لگ گئے۔ اور اس حالت کو پہنچ گئے کہ عذاب الیم کے سوا ان کے دلوں کو تیری طرف کوئی چیز مائل ہی نہیں کرتی۔ پس میں دعا کرتا ہوں۔ کہ ان کے مالوں کو تباہ کر اور ان کے دلوں کو صدمہ پہنچا۔ یعنی اولاد کی طرف سے تکالیف پہنچا تاکہ انہیں ہدایت حاصل ہو۔ کیونکہ یہ اس حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ کہ سوائے عذاب کے ایمان کی طرف مائل نہیں ہو سکتے پس ان کی ہدایت کی خاطر عذاب ہی لا کہ یہ ہدایت تو پائیں۔ غرض یہ گمراہی کی بددعا نہیں۔ بلکہ ہدایت کی دُعا ہے۔ آیت سے صاف ظاہر ہے۔ کہ ان لوگوں کی حالت اس حد تک پہنچ چکی تھی۔ کہ بغیر عذاب کے وہ ہدایت نہیں پا سکتے تھے۔ جس کی بنا پر حضرت موسےٰ کہتے ہیں کہ مال اور اولاد کا عذاب ان پر آئے تاکہ جو چیزیں ان کی گمراہی کا موجب ہوئی ہیں۔ ان کی طرف سے تکلیف پہنچنے پر یہ لوگ ہدایت کی طرف مائل ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے عذاب کی دعا کی ہے۔ لیکن جو لوگ بغیر سزا کے ہدایت نہ پا سکتے ہوں۔ اُن کے لئے عذاب کی دعا تو رحمت کی دعا ہے۔ جس طرح ایک خراب شدہ عضو کے کاٹنے کی استدعا ایک رحمت کا مطالبہ ہوتا ہے۔ غضب کی دعا تبھی بن سکتی تھی۔ اگر ہدایت سے محروم رکھنے کی دعا ہوتی اور یہ میں ثابت کر چکا ہوں کہ

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ

(اس پر اللہ تعالیٰ نے) فرمایا تمہاری دعا قبول کر لی گئی ہے ۔ پس تم (دونوں) ثابت قدمی دکھاؤ اور جو لوگ علم نہیں

سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَجَاوَزْنَا بِبَنِيْٓ ۹۰

رکھتے ان کی راہ کی پیروی ہرگز نہ کرو ۵۸۷ اور ہم نے بنی اسرائیل کو

اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ

سمندر سے (پار) گذارا تو فرعون اور اسکی فوجوں نے سرکشی اور ظلم

ایسا نہیں ہے ۔

دل پر حملہ کرنے کے معنی اولاد کی طرف سے تکلیف ہے ۔ کیونکہ حملہ کا لفظ اولاد کے مقابلہ پر استعمال ہوا ہے اور یہ حملہ دو طرح ہو سکتا تھا ۔ ایک اس طرح کہ اولاد کو کوئی تکلیف پہنچے ۔ اور ایک اس طرح کہ اولاد کو خدا تعالیٰ ہدایت دیدے ۔ کیونکہ اولاد کا ساتھ چھوڑ کر دشمن سے مل جانا بھی ایک سخت صدمہ کا موجب ہوتا ہے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے دشمنوں پر بھی یہی حملہ ہوا اور یہ حملہ سزا نہیں کہلا سکتا ۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں اس طرح یہ سزا ملی کہ فرعون کے ساتھیوں کے بڑے بیٹے مر گئے ۔

یہ لطیفہ ۔ قرآنی ترتیب پر لطیف روشنی ڈالتا ہے ۔ کہ پہلے حصہ آیت میں زینۃ جو اولاد کا قائم مقام ہے اسے پہلے رکھا ہے ۔ اور اموال کو بعد میں ۔ لیکن سزا کے ذکر میں اموال کے تباہ کر دینے کا پہلے ذکر ہے اور قلوب پر حملہ کرنے کا ذکر بعد میں آیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ انعام کے وقت تو اولاد کا ذکر اس کے درجہ کے لحاظ سے مقدم کیا کیونکہ وہ بڑا انعام تھا ۔ لیکن جس جگہ سزا کی دعا تھی ۔ گو وہ ہدایت کے لئے ہی تھی ۔ وہاں چھوٹی سزا کا مطالبہ پہلے کیا اور بڑی سزا کا بعد میں اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے کہ اگر یہ لوگ صرف مالی ابتلاؤں سے ہدایت پا جائیں تو اولاد کی سزا سے ان کو بچا لیا جائے اولاد کی طرف سے تبھی دکھ دیا جائے جب پہلی قسم کا عذاب بے فائدہ ثابت ہو ۔ اس ترتیب کے فرق میں جہاں قرآن کریم کی ترتیب کی خوبی ظاہر ہوتی ہے ۔ وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل کی رأفت پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔

وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کے معنی

ریورنڈ ویری اعتراض کرتے ہیں کہ یہ دعا بائبل کے مخالف ہے ۔ لیکن اول تو بائبل کی مخالفت کے معنی سچائی کی مخالفت کے نہیں ہوتے ۔ دوسرے پادری صاحب نے چونکہ آیت کے غلط معنی کئے ہیں ۔ اس لئے اختلاف نظر آیا ہے ۔ ورنہ اصل میں کوئی اختلاف نہیں ۔

من قومہ کی ضمیر کا مرجع

۵۸۷ ـ اجیبت دعوتکما پر سوال پیدا ہوتا ہے ۔ کہ دعا تو حضرت موسیٰ نے کی اور جواب یہ دیا جاتا ہے ۔ کہ تم دونوں کی دعا قبول کی گئی تو اس کا جواب یہ ہے ۔ کہ دعا میں ربنا کا لفظ استعمال کیا گیا تھا ۔ جو ایک سے زیادہ پر دلالت کرتا ہے ۔ پس دعا میں موسیٰ اور ہارون دونو شامل تھے ۔ ولا تتبعان فاستقیما کی تشریح ہے اور اسکے یہ معنی نہیں کہ نبی لوگوں کی باتوں کے پیچھے چل پڑتے ہیں بلکہ اُسکے یہ معنی ہیں کہ دشمن ہمیشہ اصل مقصد سے دوسری طرف لیجانے کی کوشش کیا کرتے ہیں ۔ تم ان سے ہوشیار رہنا اور انکی ایسی بحثوں کی طرف توجہ نہ کرنا جو تم کو تمہارے اصل مقصد سے دور لیجائیں ۔

ترتیب الفاظ دعا

[illegible]

ولا تتبعان میں مخالفین کی کوششوں کا اظہار کیا گیا ہے ۔

بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ

(کی راہ) سے ان کا پیچھا کیا۔ حتیٰ کہ جب غرق ہونے (کی آفت) نے اسے آپکڑا تو اُس نے کہا

اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ

میں ایمان لاتا ہوں کہ جس (مقتدر ہستی) پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اس کے سوا کوئی بھی معبود نہیں ہے

وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۹۱

اور میں (بھی) فرمانبرداری اختیار کرنیوالوں میں سے ہوتا ہوں ۱۵۵

جَاوَزَ — **۱۵۵ حل لغات** - جَاوَزَ الموضعَ تعدَّاہ اس مقام سے گذر کر آگے نکل گیا (اقرب)

اتبع — اَتْبَعَ اور تبع میں تفریق کے متعلق اصمعی مشہور ادیب کا قول ہے۔ کہ تبعہ لحقہ واد رکہ جب تبع کا لفظ استعمال کریں۔ تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہ اس کے پیچھے گیا۔ اور اس کو پا لیا۔ و اتبعہ اذا تبع اثرہ۔ اَدْرَكَهٗ اَوْلَمْ يُدْرِكْهُ اور اَتْبَعَ کا لفظ تب استعمال کرتے ہیں جب یہ مقصود ہو کہ وہ اس کے پیچھے گیا۔ خواہ اسے ملا ہو یا نہ مل سکا ہو — اتبعہ تبعہ و ذٰلک

بغیا وعدوا کے معنی — اذا کان سَبَقَهٗ فَلَحِقَهٗ (اقرب) اور اقرب الموارد میں ہے کہ اتبع کے معنی پیچھے چلنے کے ہوتے ہیں بشرطیکہ جس کا پیچھا کیا جائے۔ وہ آگے نکل چکا

فرعون کا آخری وقت میں کمال تذلل — ہو۔ اور پیچھا کرنے والا پیچھے سے جا کر اس سے مل جائے یہ معنی پہلے معنوں کے خلاف ہیں۔ اَدْرَكَ الشیئ۔ بلغ وقتہ اس کا وقت پہنچ گیا۔ (اقرب)

تفسیر - یہاں ایک عظیم الشان سیاسی بات بیان کی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ہمیں حکم ہے

اگر بادشاہ مذہبی امور میں جبر سے کام لے تو اس کے ملک کو چھوڑ دینا چاہیئے — کہ ہم بادشاہ کی فرمانبرداری کریں۔ لیکن اگر وہ ہمارے مذہبی امور میں دخل دے اور جبر سے کام لے۔ تو ہم اس کے ملک سے ہجرت کر جائیں۔ اور اگر وہ ہجرت کرنے سے بھی روکے۔ تو اس وقت وہ بادشاہ باغی سمجھا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ مقابلہ شرعاً جائز ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں ہم حق پر ہونگے اب اس کی قانون شکنی قانون شکنی نہ رہے گی کیونکہ جس طرح کسی کو یہ حق نہیں۔ کہ کسی کے ملک میں رہ کر پھر اس کے قانون کی خلاف ورزی اور قانون شکنی کرے۔ اسی طرح کسی کو یہ حق بھی نہیں۔ کہ وہ باوجود مذہبی اختلاف کے کسیکو اپنے ملک میں رہنے پر مجبور کرے۔

اس آیت میں بَغْيًا کہکر بتایا ہے کہ اس کا قانونی حق بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اور عَدْوًا کہکر ظاہر کیا کہ اس کا اخلاقی حق بھی باقی نہیں رہا تھا۔

فرعون کے ڈوبتے وقت کے کلمات میں کمال تذلل پایا جاتا ہے۔ اگر صرف موسیٰ کا رب کہتا۔ تو بھی کوئی بات نہ تھی۔ کیونکہ حضرت موسیٰ اس کے گھر میں پلے تھے۔ اور ان میں معزز سمجھے جاتے تھے۔ مگر فرعون کہتا ہے کہ میں بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لاتا ہوں۔ گویا اس خدا پر جو اس کے پتھیروں کا خدا تھا۔ کیونکہ بنی اسرائیل کو وہ نہایت ذلیل سمجھتا تھا۔ اور اُن سے پتھیروں کا کام لیتا تھا۔

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ ۹۲

کیا اب (تو ایمان لاتا ہے) حالانکہ پہلے تو نے نافرمانی کی۔ اور تو مفسدوں میں سے تھا ۵۹۵

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ

پس اب ہم تیرے بدن (کے بقا) کے ذریعہ سے تجھے (ایک جزوی) نجات دیتے ہیں۔ تاکہ جو لوگ تیرے پیچھے (آنیوالے)

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝ ۹۳ ع ۹ / ۱۴

ہیں ان کے لئے تو ایک نشان ہو۔ اور لوگوں میں سے بہت (افراد) ہمارے نشانوں سے یقیناً یقیناً بے خبر ہیں ۵۹۶

۵۹۵ - ایمان بھی خاص حالات میں ہی فائدہ دیتا ہے۔ جب حق بالکل کھل جائے۔ تب ایمان کا نفع باقی نہیں رہ جاتا۔ کیونکہ ثواب محنت اور قربانی کے بدلہ میں ملتا ہے۔ اور جس بات کے سمجھنے کے لئے کوئی محنت نہ کرنی پڑے۔ اس کا ثواب بھی کوئی حاصل نہیں ہوتا۔

۵۹۶ - خدا تعالیٰ کی جزائیں بھی عجیب پُر حکمت ہوتی ہیں۔ فرعون ایسے وقت میں ایمان لایا کہ اس کا ایمان صرف ایک بیجان ڈھانچہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے بدن کو بچا لیا۔ اور اس کے ایمان جیسی ہی اسے نجات دے دی۔ یعنی روح کو تو فائدہ نہ پہنچا۔ جسم کو بچا دیا۔ کہ دوسروں کے لئے عبرت ہو۔

نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ فرعون کے جسم کے بچائے جانے کا ذکر قرآن کریم کے سوا دوسری کتب میں نہیں ہے بائبل اس امر میں خاموش ہے۔ اور تاریخیں ساکت ہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ کی باتیں کیسی سچی ہوتی ہیں آج تین ہزار سے زائد سالوں کے بعد فرعون موسیٰ یعنی منفتاح کی لاش مل گئی ہے۔ اور قاہرہ کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ اور میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے۔ چھوٹے قد کا دبلا سا ایک شخص ہے۔ جس کے چہرہ سے حماقت اور غضب دونوں قسم کی صفات ظاہر ہوتی ہیں۔

بعد از وقت ایمان سود مند نہیں ہوتا

کجا وہ زمانہ اور کجا یہ زمانہ۔ خدا تعالیٰ نے اس کے جسم کو نہ صرف بچایا۔ بلکہ پچھلوں کے لئے اسے عبرت کا موجب بنانے کے لئے اس کی لاش کو اس وقت تک محفوظ رکھا ہے۔

صداقت قرآن پر زبردست نشان

یہ آیت قرآن کریم کی سچائی پر کیسا زبردست شاہد ہے۔ اور بائیبل پر اس کی کس قدر فضیلت ثابت کرتی ہے۔ بائبل کا دعویٰ ہے۔ کہ وہ موسیٰ کے وقت کی تاریخ بیان کرتی ہے۔ اور اسی وقت لکھی گئی تھی۔ قرآن کریم اس کے تقریباً دو ہزار سال بعد آتا ہے۔ اور وہ واقعات بیان کرتا ہے۔ جو بائیبل میں بیان نہیں ہیں۔ اور پھر واقعات اسی کی صداقت ثابت کرتے ہیں۔ اور بائیبل ناقص ثابت ہوتی ہے۔

یہ کونسا فرعون تھا

فرعون کے جسم کا بچایا جانا

بعض مفسروں نے اس فرعون کا نام رعمسیس لکھا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ رعمسیس وہ فرعون تھا۔ جس نے حضرت موسیٰ کو پالا تھا۔ لیکن حضرت موسیٰ کی نبوت کا زمانہ وہ ہے۔ جبکہ اس کا دوسرا بیٹا منفتاح تختِ حکومت پر بیٹھا بائیبل سے بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ کیونکہ لکھا ہے کہ موسیٰ کی پیدائش کے وقت بنی اسرائیل رعمسیس نامی شہر بناتے تھے (خروج ب ۱ آ ۱۱) جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس وقت کے بادشاہ کا نام رعمسیس تھا۔ پھر خروج ب ۲ آیت ۲۳ میں لکھا ہے کہ وہ بادشاہ مر گیا۔ اور دوسرے کے پاس موسیٰ آئے۔ پس رعمسیس کا بیٹا منفتاح تھا جس

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ

اور ہم نے یقیناً یقیناً بنی اسرائیل کو ظاہری اور باطنی (ہر قسم کی) خوبی والی جگہ دی تھی۔ اور (ہر قسم کی) پسندیدہ چیزیں

مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ

(بھی) انہیں دی تھیں۔ پھر اس وقت تک کہ ان کے پاس (صحیح) علم آگیا۔ انہوں نے (کسی امر میں) اختلاف نہ کیا

اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا

تیرا رب ان کے درمیان اس (امر کے) بارہ میں جس میں وہ (اب) اختلاف کر رہے ہیں یقیناً قیامت

فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ ۹۳

کے دن فیصلہ کرے گا ۱۹۵

کے پاس سولی آئے تھے اور وہی غرق ہوا۔ (نیز دیکھو جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد آٹھ صفحہ ۵)

ایمان و نماز میں توقف نہ کرنا چاہیئے

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مومن کو ایمان میں جلدی کرنی چاہیئے۔ جب بھی نیک تحریک ہو اُسے جلدی پورا کرنا چاہیئے۔ دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کسی چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی ضائع نہیں کرتا۔ اب دیکھو فرعون موت کے وقت ایمان لاتا ہے تو اس کی لاش کو امن دیا جاتا ہے۔ جب وہ لوگوں کی ہدایت کا موجب ہوگا۔ تو کچھ نہ کچھ تو اسے اس کے ایمان کا فائدہ پہنچیگا۔ حضرت محی الدین ابن عربی کا اسی وجہ سے یہ مذہب ہے۔ کہ فرعون جہنم میں نہیں جائیگا۔

علم سے مراد

اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا

اختلاف سے مراد

۱۹۵ حل لغات

مُبَوَّأ بَوَّءَ میں سے اسم ظرف یا مصدر میمی ہے۔ بَوَّاَهٗ وَبَوَّءَ لَهٗ مَنْزِلًا هَيَّاَهٗ وَمَكَّنَ لَهٗ فِيْهِ (اقرب) جگہ دی۔ ٹھہرایا۔ پس مُبَوَّأ کے معنی ہیں ٹھہرانے کی جگہ یا ٹھہرانا۔ جگہ دینا۔ صِدْق ہر وہ چیز جو ظاہر و باطن طور پر اچھی ہو۔ (دیکھو سورۂ یونس زیر آیت ۳)

بوّأ

صدق

تفسیر۔ الطیبات۔ یعنی پاک چیزیں۔ پاک چیزوں میں سے سب سے مقدم الہام الٰہی ہے۔ کیونکہ وہ تازہ بتازہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے۔ اور دوسری چیزیں بھی مراد ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل فرعون کی اینٹیں مفت بنایا کرتے تھے۔ وہاں ان کو پاکیزہ رزق کہاں میسر آسکتا تھا۔ اس وقت تو وہ چوریاں وغیرہ ہی کرتے ہونگے۔ مگر وہاں سے نکل کر ان کو رزق حلال مل گیا۔ اور العلم سے مراد قرآن کریم ہے۔ نہ کہ تورات۔ کیونکہ تورات کے نزول اور بنی اسرائیل کی قوم کے قیام کے درمیان تو وقفہ ہی نہ تھا۔ کہ جس میں وہ اختلاف کرسکتے۔

اس آیت کے یہ معنی نہیں کہ کلام الٰہی کے ایک سے زیادہ معنی کرنے منع ہیں۔ کیونکہ یہ تو خود قرآن کریم کی دوسری آیات کے خلاف ہے۔ بلکہ اس جگہ اختلاف سے مراد ایک نبی کے متعلق اختلاف ہے۔ بنی اسرائیل سب کے سب متفق تھے۔ کہ ایک نبی آئیگا۔ لیکن جب وہ آگیا۔ تو اختلاف کر دیا جس طرح آج مسلمانوں نے کیا۔ کہ مسیح موعود علیہ السلام کی آمد کو سب مانتے تھے۔ اور آمد کی پیشگوئیاں جو قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ ان کو بھی مانتے تھے۔ لیکن جب موعود آگیا تو انہوں نے قبول نہ کیا۔ اور یہاں تک کہہ دیا۔ کہ مسیح کی آمد کے متعلق پیشگوئیاں ہی وضعی ہیں۔ پس اختلاف سے

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ

پھر اگر تو اس (کلام) کی وجہ سے جو ہم نے تیری طرف نازل کیا ہے کسی شک (و شبہ) میں (مبتلا) ہو تو ان لوگوں

يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ

سے جو تجھ سے پہلے اس کتاب کو پڑھ رہے ہیں دریافت کر (لے) یقیناً یقیناً ایک کامل صداقت تیرے رب کی طرف

مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ ۹۵

سے تیری طرف آئی ہے پس تو شک کرنیوالوں میں سے نہ بن ۹۲ؔ

مراد پیشگوئیوں کے متعلق اختلاف ہے۔ کہ پہلے تو ان کو مانتے رہے۔ لیکن مصداق کے ظہور کے وقت بعض نے اس کا انکار کر دیا۔ اور بعض نے پیشگوئیوں تک کا انکار کر دیا۔

اس امر کا ثبوت کہ اسجگہ مَا اخْتَلَفُوْا سے مراد توراۃ نہیں ہے۔ یہ ہے کہ آگے چلکر فرمایا ہے۔ فان کنت فی شک مما انزلنا الیک الخ۔ کہ اے مخاطب اگر تجھے اس کلام الٰہی میں کوئی شک ہو۔ جو ہم نے تجھ پر اتارا ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلی آیت میں بھی نزول قرآن ہی کا ذکر ہے۔

یہود موسیٰؑ کی مانند ایک نبی کی آمد کا جو عرب میں پیدا ہونے والا تھا۔ اس قدر انتظار کر رہے تھے۔ کہ تاریخوں میں لکھا ہے کہ بعض یہود نے مدینہ میں آکر پہلے ہی سے بود و باش اختیار کر لی تھی۔ تاکہ اس نبی کو سب سے پہلے ماننے والوں میں سے وہ ہوں۔ لیکن جب وہ نبی آگیا۔ تو اس کے سب سے بڑے دشمن وہی ثابت ہوئے۔

۹۲ؔ ۔ فان کنت فی شک سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جس پر کلام نازل ہوتا ہے۔ اس کو شک نہیں ہو سکتا۔ پس اس سے مراد اختلاف کرنے والے لوگ ہیں نیز اس آیت کا یہ مطلب نہیں۔ کہ قرآن کریم سے شک پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ اس جگہ کفار کے اعتراض کے الفاظ دہرائے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں قرآن کریم کی عبارتوں سے شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہی کے الفاظ کو دہرا کر فرماتا ہے۔ کہ اے معترض اگر تجھے بقول تیرے اس کلام سے شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ تو جو لوگ تجھ سے پہلے قرآن کریم کو پڑھ کر فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ ان سے پوچھ کہ ان کے دلوں کو اس کتاب نے کیسی جلا اور روشنی عطا کی ہے۔ ان سے سوال کرنے پر تجھے معلوم ہو جائیگا۔ کہ یہ کلام شک پیدا کرنیوالا نہیں۔ بلکہ یقین پیدا کرنے والا ہے۔

مَا اخْتَلَفُوْا سے مراد توراۃ نہیں

اس آیت سے یہ بات بوضاحت ظاہر ہو جاتی ہے کہ خالی کتاب کافی نہیں ہوتی۔ انسان معلم کا بھی محتاج ہوتا ہے۔ کیونکہ روحانی علوم کے انکشاف کے لئے ایک حد تک روحانیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ پس چاہیئے کہ جب الہامی کتاب کا انسان مطالعہ کرے تو جن امور کے متعلق اسے شک ہو۔ ان کے متعلق اس کتاب کے ماہرین سے دریافت کئے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرے۔ کیونکہ اگر وہ کتاب الہامی ہے۔ تو ضرور اس کا فہم روحانیت کے مطابق نازل ہوگا۔

تعلیم کیلئے کتاب کے علاوہ معلم انسان کا ہونا بھی ضروری ہے

بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ شک کرنے والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی ہیں۔ اور جن سے پوچھنے کا حکم ہے۔ وہ یہود

شک کرنیوالے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہو سکتے

قرآن کریم شک پیدا کرنیوالا نہیں ہو سکتا۔

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُونَ

اور تو ان (لوگوں) میں سے ہرگز نہ بن جنہوں نے اللہ (تعالیٰ) کے نشانوں کو جھٹلا دیا ہے ورنہ تو

۹۶ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ

نقصان اٹھانیوالوں میں سے ہو جائیگا جن لوگوں پر تیرے رب کی طرف سے ہلاکت کی بات واجب ہو چکی ہے

۹۷ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى

وہ ہرگز ایمان نہیں لائینگے ۹۳ جب تک کہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں ۔ گو ان کے

۹۸ يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ○

پاس تمام (قسم کے) نشان آ چکے ہیں ۹۴

وضاری ہیں ۔ مگر جیسا کہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مراد نہیں ہو سکتے اور نہ آپ کے صحابہ ۔ کیونکہ ان کی نسبت قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے کہ قل ھٰذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی (سورہ یوسف ع۱۲) تو کہہ دے کہ میں اور میرے تبع صرف گمان سے اس مذہب کو نہیں مان رہے ۔ بلکہ ہم نے مشاہدہ سے قرآن کریم کی سچائی کو معلوم کر لیا ہے ۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ جو لوگ کسی امر کو مشاہدہ سے تسلیم کریں ۔ وہ اسکے متعلق شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہو سکتے ۔ اگلی آیت بھی بتاتی ہے کہ اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب نہیں ہو سکتے ۔

۹۳ حل لغات - الکلمۃ - اللفظۃ منہ سے بولا ہوا مفرد لفظ ۔ ہر وہ بات جو انسان بولے ۔ خواہ مفرد ہو ۔ خواہ مرکب ۔ والعشر کلمات وصایا اللہ العشر ۔ عشر کلمات اللہ تعالیٰ کے دس حکموں کو کہتے ہیں ۔ الخطبۃ والقصیدۃ ۔ کبھی خطبہ اور قصیدہ کو بھی کلمہ کہتے ہیں ۔ (اقرب)

کلمہ

تفسیر - اس جگہ کلمہ سے مراد انذار کی بات ہے یعنی جو لوگ انذار کے مستحق ہو گئے ہیں ۔ اور اس سے بچنے کی انہوں نے کوشش نہیں کی ۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے ۔

اس آیت سے ثابت ہے ۔ کہ صرف ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کی پیشگوئی تھی ۔ جنہوں نے انذار سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا ۔ نہ کہ سب کفار کے متعلق ۔

۹۴ - اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ سچائی سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ نہیں رکھتے انہیں آیات نفع نہیں دیا کرتیں ۔ اور بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان کی نظروں میں دھوکا اور فریب ہوتا ہے پس معاندین کا خواہ وہ کتنے بڑے عالم کیوں نہ ہوں یہ کہنا کہ فلاں شخص نے معجزہ نہیں دکھایا ۔ کوئی دلیل نہیں ہوتا ۔ ہر شخص کو اپنے لئے خود غور کر کے فیصلہ کرنا چاہیئے ۔ اور معجزات کو سنت انبیاء پر پرکھنا چاہیئے ۔ تاکہ حق سے محروم نہ رہ جائے ۔

فَلَوۡلَا كَانَتۡ قَرۡيَةٌ اٰمَنَتۡ فَنَفَعَهَاۤ اِيۡمَانُهَاۤ اِلَّا

اور یونس کی قوم کے سوا کیوں کوئی (اور ایسی) بستی نہ ہوئی جو (سب کی سب) ایمان لاتی ۔ تو اس کا ایمان فائدہ

قَوۡمَ يُوۡنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوۡا كَشَفۡنَا عَنۡهُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡىِ

اسے نفع دیتا جب وہ (یعنی یونس کی قوم کے لوگ) ایمان لائے تو ہم نے ان (پر) سے اس ورلی زندگی میں (بھی) رسوائی

فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَمَتَّعۡنٰهُمۡ اِلٰى حِيۡنٍ ۝ ۹۹

کا عذاب دور کردیا اور انہیں ایک وقت تک (ہر طرح کا) سامان عطا کیا ۔ ۹۵

۹۵ حل لغات ۔ القریۃ ۔ المصر الجامع بڑا شہر ۔ کل مکان اتصلت الابنیۃ واتخذ قرارا ہر آبادی کی جگہ خواہ شہر ہو یا گاؤں ۔ جمع الناس ۔ لوگوں کی جماعت (اقرب) الخزی الھوان ذلت ۔ ذلیل وحقیر ہونا ۔ العقاب سزا ۔ البعد دوری ۔ الندامۃ شرمندگی پچھتانا ۔ واصل الخزی ذل یستحیٰ منہ اس کے اصل معنی ایسی ذلت کے ہیں ۔ جو لوگوں کے سامنے شرمندگی کا موجب ہو ۔ (اقرب) الحین وقت مبہم یصلح لجمیع الازمان طال اوقصر ۔ مطلق وقت خواہ بہت ہو ۔ خواہ تھوڑا ۔ وقیل الدھر بعض محققین لغت نے اس کے معنی زمانہ کے بتائے ہیں المدۃ مدت (اقرب)

تفسیر ۔ غور کرنے والے کے لئے اس آیت میں محبتِ الٰہی کی عظمت معلوم کرنے کے لئے انتہا درسامان موجود ہے ۔ الفاظ سے کس قدر خواہش ٹپکتی ہے کہ سب کی سب دنیا ہدایت پا جائے کس قدر افسوس کا اظہار یہ الفاظ کر رہے ہیں کہ کیوں یونس کی قوم کی طرح پوری کی پوری ایمان لانے والی اور اتولم نہ ہو گئیں اسپر جب عذاب آیا ۔ تو اس قدر اخلاص سے تائب ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اسکی توبہ کو قبول کر لیا ۔ اور اسے عذاب سے نجات دی ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ۔ فتح مکہ کے موقع پر سب قوم نے اطاعت قبول کر لی اور عذاب سے محفوظ ہو گئی ۔ آخر ایمان بھی لے آئی اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں کی وارث بنی ۔ اور اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مثیل یونس بھی بن گئے ۔

حضرت یونس جن کا اس آیت میں ذکر ہے ۔ ایک نبی ہیں ۔ جن کا ذکر قرآن شریف میں چھ جگہ آیا ہے سورۂ صٰفٰت ع۵ میں ان کے مرسل ہونے کا ذکر ہے ۔ اور سورہ انعام (ع۱۰) اور سورۂ نساء (ع۲۳) میں انہیں نبیوں میں شمار کیا ہے ۔ سورۂ انبیاء (ع۶) اور سورۂ ن (ع۲) میں بجائے نام کے ذالنون اور صاحب الحوت کی صفت سے ان کا ذکر کیا ہے ۔ کیونکہ ان کے ساتھ مچھلی کا واقعہ پیش آیا تھا احادیث میں بھی ان کا ذکر آتا ہے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ ماینبغی لعبد ان یقول انا خیر من یونس ابن متی (مسلم مصری جلد ۲ ص۲۳۱) کسی بندہ کو جائز نہیں کہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ وہ یونس بن متی سے افضل ہے اسکی وجہ یہ نہ تھی ۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان سے افضل نہیں تھے ۔ بلکہ اس کی وجہ شارحین حدیث کے نزدیک یہ ہے ۔ کہ جس وقت یہ بات آپ نے فرمائی ۔ اسوقت تک آپ پر اپنی افضلیت واضح نہ ہوئی تھی ۔ لیکن بعد میں آپ نے خود فرمایا ۔ کہ انا سید ولد آدم (صحیح مسلم) میں بنی نوع انسان میں سے سب سے افضل اور سب کا سردار ہوں ۔

میرے نزدیک اسکی ایک اور بھی وجہ ہے جو اس آیت کے مضمون سے تعلق رکھتی ہے ۔ اور وہ یہ کہ اس جگہ کلی فضیلت کا ذکر نہیں بلکہ جزوی فضیلت کا ذکر ہے ۔ اور وہ وہی فضیلت ہے جو اس

قریۃ ۱

حضرت یونس کا ذکر قرآن کریم اور حدیث میں ۲

خزی ۳

حین ۴

کاش ہر ایک نبی کی قوم یونس کی قوم کا نمونہ دکھاتی ۵

حدیث نفی تفضیل بر یونس اور اسکے معنی ۶

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کا فتح مکہ کے موقعہ پر بچ جانا

آیت میں مذکور ہے۔ یعنی ان کی قوم سب کی سب عذاب دیکھ کر ایمان لے آئی۔ حالانکہ کسی اور نبی کی قوم کو ایسا موقع نہیں ملا۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب نہ سمجھا کہ جب تک اپنی قوم کا انجام نہ دیکھ لیں۔ اس امر میں یونس ؑ پر آپنے آپ کو فضیلت دیں۔ لیکن بعد کے واقعات نے یہ فضیلت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی اور آپ کی قوم بھی غزوۂ فتح مکہ کے وقت تائب ہوئی۔ اور سب کی سب ایمان لاکر عذاب سے محفوظ ہو گئی۔

حضرت یونس کا ذکر بائیبل میں[1]

علماء بائیبل کے بیان کے مطابق حضرت یونس گاتھ ہیپر GATH HAPPER ضلع زبیلون میں پیدا ہوئے اس وقت یربعام (JOROBOAM) بادشاہ کا زمانہ تھا۔ جس کی حکومت ۸۱، قبل مسیح سے ۴۱، تک رہی ہے اس بادشاہ کا ذکر ۲ سلاطین باب ۱۴ میں آتا ہے بائیبل میں ایک کتاب بھی یونہ نبی کی کتاب کے نام سے درج ہے

عام

لیکن محققین میں اختلاف ہے۔ کہ یونہ جس نے بنی اسرائیل کی ادومیوں سے آزادی کی خبر دی تھی وہی ہے۔ جس کی وہ کتاب ہے یا اور کوئی شخص ہے۔ بائیبل کی کتاب یونہ میں یونس نبی کا حال یوں درج ہے۔ کہ خدا کی طرف سے ان کو نینوا NENVAH کی طرف جو کہ ایک بڑا اور شرارتی شہر تھا۔ جانے کا حکم ہوا تھا۔ اور انہیں حکم تھا۔ کہ وہ اس کے خلاف پیشگوئی کریں۔ مگر حضرت یونس ؑ ڈرے۔ کہ نینوا والے توبہ کریں گے۔ اور عذاب سے بچ جائینگے۔ پس وہ بجائے نینوا کے یافا چلے گئے اور ترشیش کی طرف جانیوالے ایک جہاز میں سوار ہو گئے۔ لیکن دفعۃً جہاز کو طوفان نے آگھیرا۔ ملاحوں نے دیوتاؤں سے بہت دعائیں کیں۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر قرعہ ڈالکر انہوں نے دریافت کیا۔ کہ یہ عذاب کس کے سبب سے ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کا نام قرعہ میں نکلا۔ اور انہوں نے ان سے جاکر حال پوچھا۔ انہوں نے اپنا سب حال بتایا۔ اور کہا کہ میں خدا تعالیٰ کے حکم سے بھاگا ہوں۔ مجھے پانی میں پھینکدو۔ اس طرح عذاب سے محفوظ رہو گے۔ چنانچہ لوگوں نے انہیں پانی میں پھینکدیا۔ اور طوفان تھم گیا۔ خدا تعالیٰ نے ایک مچھلی کو حکم دیا۔ اور وہ حضرت یونس علیہ السلام کو نگل گئی۔ اس کے پیٹ میں حضرت یونس تین دن رات رہے۔ آخر اُن کی دُعا کو اللہ تعالیٰ نے سُنا اور مچھلی کو حکم دیا۔ کہ وہ انہیں اگل دے۔ چنانچہ مچھلی نے ان کو اگل دیا۔ جب وہ اچھے ہوئے۔ تو پھر خدا تعالےٰ کے حکم سے نینوا کو خبردار کرنے گئے۔ اور خبر دی۔ کہ چالیس دن تک نینوا برباد کیا جائیگا۔ لیکن لوگوں نے توبہ کی اور گنہ سے باز آگئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے عذاب کو ٹلا دیا۔ حضرت یونس کو یہ امر بہت شاق گذرا۔ اور وہ جنگل کی طرف چلے گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک ارنڈ کا درخت اُن کے سایہ کے لئے اگایا۔ جس کے نیچے وہ آرام کرنے لگے۔ مگر پھر ایک کیڑے کے ذریعہ سے اسے تبہ کرادیا۔ سایہ کے نہ ہونے سے انہیں تکلیف ہوئی۔ تو وہ بہت رنجیدہ ہوئے۔ اس پر خدا تعالیٰ نے انہیں الہام کیا کہ تو ایک درخت کی ہلاکت پر جسے تونے نہیں اُگایا۔ رنجیدہ ہوتا ہے۔ تو میں اپنے لاکھوں بندوں کو جنہیں خود میں نے پیدا کیا ہے۔ کس طرح بلا وجہ تباہ کر سکتا ہوں۔

قرآن کریم کی رو سے بائیبل کے بیان پر نظر[2]

قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیبل میں حضرت یونس کے متعلق جو واقعات بیان ہوئے ہیں۔ وہ غلط ہیں۔ اول قرآن کریم اس بات کا مخالف ہے۔ کہ خدا کا کوئی نبی خدا تعالیٰ کا بالصراحت کوئی الہام سُنکر اس کا انکار کر دے۔ اگر یہ بات ہو۔ تو پھر امان ہی اُٹھ جائے۔ فرماتا ہے۔ وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (نساء ع ۹) اور پھر فرماتا ہے۔ فبھدا ھم اقتدہ (انعام ع ۱۰) انسان کو چاہیئے۔ کہ سب نبیوں کی پیروی کرے۔ اور اصلی مغز جو ان کے عمل کا ہے۔ اس کو اپنے اندر پیدا کرے۔ اگر انبیاء ایسے شدید امراض میں مبتلا ہو سکتے۔ تو کبھی ان کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا۔

کوئی نبی کسی حکم الٰہی کی خلاف ورزی نہیں کرتا[3]

دوم قرآن شریف سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ

اور اگر اللہ (ہدایت کے معاملہ میں) اپنی (ہی) مشیئت کو نافذ کرتا تو جو (اور جس قدر) لوگ زمین پر (موجود) ہیں وہ سب کے

تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۝ ۱۰۰

سب ایمان لے آتے (پس جب خدا تعالیٰ بھی مجبور نہیں کرتا) تو کیا تو لوگوں کو (اتنا) مجبور کریگا کہ وہ مومن بن جائیں ۱۵۹

یونسؑ اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے۔ اور یہودی روایات سے معلوم ہوتاہے۔ کہ وہ یہودی تھے۔ لیکن نینوا والوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ جو کہ اشور کا دار الخلافہ تھا۔ اور وہاں کے لوگ اشور قوم کے تھے۔ اشور سے مراد سیریا یعنی شام کا علاقہ نہیں۔ بلکہ یہ الگ علاقہ ہے۔ اور شہر بِل کے شمال سے شروع ہو کر ارمینیا کی ہر حد سے جا ملتا ہے۔ اور مشرقی سمت اس کی کردستان سے ملتی ہے اور مغربی سمت دجلہ کے مغرب کے علاقہ کے ایک حصہ پر مشتمل ہے۔ گویا موجودہ عراق کا ایک حصہ اس میں شامل ہے۔ ایک زمانہ میں اس علاقہ میں زبردست حکومت قائم تھی۔ اس کا دار الخلافہ پہلے تو اسور تھا جو موصل سے ساٹھ میل جانب شمال واقع تھا اور اب اسے قلعات شرجت کہتے ہیں۔

لیکن قریباً تیرہ سو سال قبل مسیح اس شہر کو چھوڑ کر نینوہ کو دار الحکومت قرار دیا گیا۔ پس قرآن کریم کے بیان کے رو سے یا تو حضرت یونس بنی اسرائیل میں سے نہ تھے اور یا پھر وہ نینوہ کی طرف نہیں بھیجے گئے۔ بلکہ کسی اسرائیلی قبیلہ کی طرف بھیجے گئے تھے۔ محققین یورپ بھی اس بارہ میں مختلف الخیال ہیں۔ کہ آیا یونس بنی اسرائیلی تھے یا نہیں ہر عقلمند غور کرکے سمجھ سکتا ہے۔ کہ قرآنی بیان دونوں اختلافات کے متعلق معقول ہے اور بائیبل کا بیان خلاف عقل۔

۱۵۹ — پہلے فرمایا تھا کہ لولا کانت قریتہ اٰمنت فنفعھا ایمانھا الا قوم یونس۔ جس میں ایک رنگ میں اس خواہش کا اظہار تھا۔ کہ لوگ ایمان لے آئیں۔ اس پر سوال ہوتا تھا۔ کہ جب خدا تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ تو کیوں اپنی خواہش کو پورا نہیں کرلیتا۔ اور سب کو مومن بنا دیتا۔ اس کا کیا لطیف جواب دیا ہے۔ کہ ولو شاء ربك لاٰمن من فی الارض کلھم جمیعا۔ اگر خدا تعالیٰ اپنی خواہش کو جبریہ طور پر پورا کرنا چاہتا۔ تو پھر کسی ایک قوم کی ہدایت تک کیوں جبر کو محدود رکھتا۔ کیوں نہ ساری دنیا ہی کو ہدایت دے دیتا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ ایمان کے معاملہ کو اس نے انسان کے اپنے دل پر چھوڑا ہوا ہے۔ ہاں وہ پسند یہی کرتا ہے۔ کہ اس کے سب بندے ہدایت پاکر اعلیٰ درجات حاصل کریں۔

دوسرے حصہ آیت کے دو معنی ہیں۔ یہ حصہ پہلے حصہ کی دلیل بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی اس میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہ اللہ تعالیٰ جبر کرے کیونکہ جبر سے منوانا فائدہ بخش نہیں ہوتا۔ عقلمند انسان بھی جبر سے کسیکو نہیں منواتا۔ فرمایا اے ہمارے رسول کیا تو پسند کرے گا۔ کہ لوگوں کو جبر سے منوائے نہیں تو ایسا پسند نہیں کرے گا۔ پس یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ جو دلوں کے حالات کو جانتا ہے جبر سے لوگوں کو منوالے۔ دوسرے معنی اس کے یہ ہو سکتے ہیں۔ کہ اس میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں بلکہ ہر مسلمان سے ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ لوگوں کے ایمان نہ لانے پر جوش میں آکر جبر سے کام نہ لینا اور یہ امر مدنظر رکھنا کہ جب خدا تعالیٰ جو مالک و آقا ہے۔ جبر نہیں کرتا۔ تو تم کون ہو

حضرت یونس یہود کی طرف نہیں بھیجے گئے تھے

اٰمنت تکرہ الناس کے معنی

خدا تعالیٰ لوگوں کے ایمان لانے کو پسند کرتا ہے مگر اس کے لئے مجبور نہیں کرتا۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَيَجْعَلُ

اور اللہ (تعالیٰ) کے (دیے ہوئے) اذن کے سوا (کسی طور پر) ایمان لانا کسی شخص کے اختیار میں نہیں اور وہ

الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ ۱۰۱

(ایمان نہ لانے کی وجہ سے) اپنا غضب ان (ہی) لوگوں پر (نازل) کرتا ہے جو عقل (رکھتے ہوئے اس) سے کام نہیں لیتے ۹۷ؔ

جبر کرنے والے۔

اسلام کو جبراً پھیلانے کی سخت مخالفت

بہرحال دونوں معنوں میں سے کوئی سے معنی بھی لئے جائیں۔ یہ آیت جبر سے اسلام پھیلانے کی سخت مخالف ہے۔ اور ان لوگوں کے اعتراض کو پاش پاش کر دیتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے جبر سے اشاعت دین کی تعلیم دی ہے۔ اس آیت سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے

مسلمانوں نے زندگی میں ہی جبر سے کام لیا نہ مکی زندگی میں۔

ممکن نہیں کہ مسلمانوں نے اشاعتِ اسلام میں جبر سے کام لیا ہو۔ کیونکہ ابتدائی زمانہ کے مسلمان نہایت سختی سے قرآن کریم کی تعلیم پر عمل کرتے تھے۔ اور یہ ممکن نہیں۔ کہ جبکہ مسلمانوں کو حکومت کے ملنے سے پہلے بلکہ اس زمانہ میں جبکہ وہ مکہ مکرمہ میں کفار کے ظلموں کے شکار ہو رہے تھے۔ جبر سے روکا جا رہا تھا۔ وہ حکومت ملنے پر جبر کرنے لگ جاتے۔

اذن

انبیاء اور نشانات کے ذریعہ سومنوانا جبر واکراہ نہیں۔

رجس

۹۷ؔ حل لغات۔ آذِنَ بالشئِ اِذْنًا عَلِمَ جانا۔ معلوم کیا۔ لہٗ فی الشئِ اباح اجازت دی الاذن الاجازۃ جانے دینا۔ اجازت دینا۔ الارادۃ چاہنا۔ العلم جاننا (اقرب) الرجس القذر۔ گند۔ المأثم گناہ۔ گناہ کا کام۔ العمل المؤدی الی العذاب ایسا کام جس کا نتیجہ عذاب اور سزا ہو الشک شک۔ العقاب سزا۔ الغضب ناراضگی (اقرب)

ایمان خدا تعالیٰ کی مقرر کردہ قواعد پر مبنی کے سوا کسی طریق سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

تفسیر اس آیت کے دو معنی ہیں۔ اول یہ کہ اس آیت میں جبر سے باز رہنے کے دلائل دیئے ہیں اور فرمایا ہے کہ ممکن نہیں کہ کوئی جان سوائے اللہ تعالیٰ کے اذن کے یقین سے آئے۔ یعنی یقین خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ قواعد کے ماتحت پیدا ہوتا ہے۔ خالی مُنہ کے اقرار سے نہیں پیدا ہوتا۔ پس تم جبر کر کے یقین نہیں پیدا کر سکتے۔ اور جو لوگ عقل سے نہیں مانتے۔ یونہی بے سوچے سمجھے مانتے ہیں ان کے ایمان ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے۔ بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ان پر وبال ہی آتا ہے۔ پس اگر تم ظاہری طور پر لوگوں سے اقرار کرا بھی لو۔ تو اس کا فائدہ کچھ نہ ہوگا۔

کیسے نادان لوگ ہیں جو باوجود ان تعلیمات کے قرآن کریم پر جبر کا الزام لگاتے ہیں۔ قرآن کریم تو بدلائل جبر کی تعلیم کے خلاف وعظ کرتا ہے۔ اس تعلیم کو منسوخ کرنے والے بھی ناواقف لوگ ہیں۔ کیونکہ حقیقی دلائل کبھی رد نہیں ہوا کرتے۔ جبر کے خلاف یہ دلائل تو ہر زمانہ میں درست ثابت ہوتے ہیں۔ پھر ان کی منسوخی کے کیا معنی۔

دوسرے معنی اس آیت کے یہ ہیں۔ کہ پہلی آیۃ یعنی افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین پر یہ اعتراض پڑ سکتا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ جبر نہیں کرتا۔ تو پھر انبیاء کے ذریعہ سے شریعت کیوں بھیجتا ہے۔ اور انذار و تبشیر سے کیوں کام لیتا ہے۔ یہ بھی تو ایک قسم کا اکراہ ہی ہے۔ سو اس کا جواب اس آیت میں دیدیا ہے کہ انبیاء کے ذریعہ سے ہدایت کا اعلان کرنا اور اپنی قدرتوں کے ذریعہ سے ایمان کو مضبوط کرنا جبر نہیں ہے۔ بلکہ یہی واحد ذریعہ ایمان پیدا کرنے کا ہے۔ بغیر اس کے کہ خدا تعالیٰ اپنی مرضی کے حصول کا طریق بتائے لوگ اس تک پہنچ

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ

تو (انہیں) کہہ (کہ) دیکھو (تو) آسمانوں اور زمین میں کیا (ہو رہا) ہے اور (نصرت الٰہی کے) نشانات اور (عذاب سے)

وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ○ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا ۱۰۲

متنبہ کرنیوالے ان لوگوں کو جو (ضد سے) ایمان نہیں لاتے (کچھ بھی) فائدہ نہیں پہنچاتے ۹۸ پھر کیا جو لوگ ان سے پہلے گذر چکے ہیں ان کے

مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ قُلْ فَانْتَظِرُوْا اِنِّي

ایام (کے نمونہ) کے سوا وہ کسی اور چیز کا انتظار کر رہے ہیں۔ تو (ان سے) کہہ (کہ) اچھا اگر وہی نمونہ دیکھنا ہے تو) پھر تم (لوگ (کچھ) انتظار

مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ○ ۱۰۳

کرو۔ میں (بھی) یقیناً تمہارے ساتھ انتظار کرنیوالوں میں سے ہوں ۹۹

ہی کب سکتے ہیں۔ پس اگر اس طریق کو اختیار نہ کیا جاتا۔ تو ہدایت پانا کسی کے لئے بھی ممکن نہ ہوتا۔ ان معنوں کے وقت اذن کے معنی ارادہ کے ہونگے یعنی جب تک اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ سے ہدایت کا سامان مہیا نہ کرے۔ انسان ہدایت نہیں پا سکتا ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اور اذن کو نہیں مانتے ان پر ہم جبر نہیں کرتے۔ ہاں اُن کے فعل کے مطابق ہم نتیجہ نکال دیتے ہیں۔ چونکہ وہ بدی کی طرف جاتے ہیں۔ اس لئے ہم یہ نتیجہ نکال دیتے ہیں۔ اور یا یہ کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے انہی کو ہم بدی میں مبتلا ہونے دیتے ہیں۔ دوسروں کو نہیں۔

۹۸ حل لغات ما یغنی عنک ھذا ای ما یجدی عنک (اقرب) یعنی اغنی عنہ کے معنی ہیں فائدہ پہنچانا۔ النُّذُر۔ نذیر کی جمع ہے۔ جس کے معنی متنبہ کرنے والے کے ہیں (اقرب)

تفسیر۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی کے سامان آسمان و زمین میں پیدا ہو رہے ہیں۔ پس کسی جبر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آخری حصہ آیت نے صاف بتا دیا ہے۔ کہ آسمان و زمین کی طرف توجہ دلانے سے مراد نشانات ارضی و سماوی ہیں۔ تبھی تو فرماتا ہے کہ جنہوں نے ایمان نہیں لانا ہوتا اور ضد سے کام لیتے ہیں۔ ان کو نشانات بھی فائدہ نہیں پہنچاتے۔

۹۹ حل لغات ایام اللہ نعمہ و نقمہ۔ ایام اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اس کے عذاب ہوتے ہیں وعلیہ فی القرآن وذکرھم بایام اللہ ای ذکرھم بنعمہ ونقمہ اور یہی معنی اس لفظ کے آیت فذکرھم بایام اللہ میں ہیں (اقرب)۔ اور زمخشری کی کتاب اساس میں ہے کہ ایام اللہ وہ ہلاکتیں اور تباہیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کے منکرین پر آئیں۔ ھو عالم بایام العرب ای بوقائعھا۔ ایام العرب سے مراد عرب کی مشہور لڑائیاں اور معرکے ہیں (اقرب)۔ پس معنی اس آیت کے یہ ہوئے۔ کہ وہ نہیں انتظار کرتے۔ مگر ویسے ہی عذابوں کا جو ان قوموں پر آئے۔ جو اُن سے پہلے گذر چکی ہیں۔ یہاں چونکہ دشمن مخاطب ہیں۔ اس لئے نقم ہی کے معنی کئے جائیں گے۔

تفسیر۔ یعنی جو ضد کرتے ہیں آخر عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ پس ان کو خود عذاب مانگنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو خود ہی اپنے وقت پر آ کر رہے گا۔ یہ عجیب

ایام اللہ

نذار

نذر

آسمانی اور زمینی نشانات جو اللہ تعالیٰ کے انعامات کے ہونے پر کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی ہے

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا

پھر (جب عذاب آئیگا تو اس وقت) ہم اپنے رسولوں کو اور جو لوگ (ان پر) ایمان لائے ہیں انکو بچا لینگے۔ اسیطرح ہمارے ذمہ (خود اپنا قائم کیا ہوا)

۱۰ ع ۱۱ ۱۵

عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۟ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ

۱۰۴

ایک حق ہے۔ ہم مومنوں کو (ضرور) بچا لیا کرتے ہیں ۱۰۳ تو کہ (کہ) اے لوگو۔ اگر تم میرے دین کے متعلق کسی قسم

كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ

کے (شک (و شبہ) میں ہو تو (سن لو کہ) اللہ (تعالیٰ) کے سوا جن (معبودوں) کی تم پرستش کرتے ہو میں ان کی پرستش نہیں

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ

کرتا بلکہ میں اللہ (تعالیٰ) کی پرستش کرتا ہوں۔ جو تم کو وفات دیگا

۱۰۵

وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اور مجھے حکم دیا گیا ہے۔ کہ میں ایمان لانے والوں میں سے بنوں ۱۰۴

ظلم کفار کا آخر عذاب پر گھبرانا اور مظلوم مومنوں کا مطمئن ہونا۔

بات ہے کہ کفار جو اپنے وقت میں غالب ہوتے ہیں اور نبیوں اور ان کی جماعتوں کو دُکھ دے رہے ہوتے ہیں عذاب کے لئے گھبراہٹ کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن نبی اور ان کی جماعتیں نہیں چاہتے کہ وہ جلد آئے۔ اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے کہلواتا ہے۔ کہ میں بھی تو عذاب کا انتظار کر رہا ہوں۔ اور گھبراہٹ کا اظہار نہیں کرتا۔ حالانکہ تمہارے ظلموں کا تختۂ مشق بن رہا ہوں پھر تم جو آرام میں ہو۔ اور ظلم کے مرتکب ہو رہے ہو۔ کیوں اس قدر گھبرا رہے ہو۔

کوئی مانے یا نہ مانے تم تبلیغ کئے جاؤ

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ لوگ ہماری بات نہیں سنتے تبلیغ کس کو کریں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کے اعلان کا ارشاد ہوا تھا کہ اگر تم میری بات نہ بھی سنوگے۔ تو بھی میں تمہارا پیچھا نہ چھوڑونگا۔ اور کہتا چلا جاؤں گا۔

رُسُلَنا بصیغۂ جمع لانے کی وجہ

۱۰۳ ۔ یہاں ذکر تو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ مگر فرمایا ہے۔ کہ ہم اپنے رسولوں کو نجات دینگے۔ جمع کا لفظ اس لئے استعمال فرمایا ہے۔ کہ (۱) ہر نبی ساری نبیوں کا قائم مقام ہوتا ہے پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نجات دینا گویا سب نبیوں کو نجات دینا تھا۔ کیونکہ اگر آپ تباہ ہوتے ۔ (نعوذ باللہ) تو سب نبیوں کی صداقت مشتبہ ہوجاتی (۲) اس طرف بھی اشارہ ہے۔ کہ اس امت میں آئندہ بھی رسول آئینگے۔ اور وہ ہونگے بھی امتی۔ کیونکہ حقًّا علینا ننجی المؤمنین میں رسولوں کی جگہ مومنون کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اور اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔ کہ وہ لوگ ایک لحاظ سے رسول ہونگے اور دوسرے لحاظ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مومن اور امتی۔

توفی

۱۰۴ حل لغات ۔ یتوفّٰی کا مادہ وفی اور ماخذ وفاۃ ہے اور یہ باب تفعل سے فعل مضارع ہے۔ وفات کے معنی موت کے ہیں اور توفّی کے معنی موت وارد کرنے اور جان نکال لینے کے ہیں ما قرب الموارد میں ہے

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ

اور اس زمان کے پہنچنے تک یہی حکم دیا ہے کہ (اے مخاطب) تو ہر کجی سے پاک ہوتے ہوئے اپنی توجہ کو ہمیشہ کے واسطے دین کے لئے (وقف)

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ ۱۰۶

کردے اور تو مشرکوں میں سے ہرگز نہ بن ۱۲۵

توفی اللہ زیدا اقبض روحہ اللہ تعالیٰ نے زید کی روح قبض کرلی یا جان نکال لی۔ تُوُفِّيَ۔ فلان مجہولا قبضت روحہ ومات۔ توفی بصیغہ مجہول کے معنی ہیں۔ اس کی جان نکال لی گئی اور وہ مرگیا۔ فاللّٰہ المتوفّی و العبد المتوفّٰی۔ غرض اللہ تعالیٰ متوفی یعنی وفات دینے والا ہوتا ہے۔ اور انسان متوفّٰی یعنی وفات پانے والا۔ اور قاموس میں ہے۔ اوفی فلانا حقہ ووفاہ وافاہ فاستوفاہ وتوفاہ والوفاۃ الموت وتوفاہ اللہ قبض روحہ کہ جو لفظ توفی استیفاء یعنی پورا پورا لینے کے معنی دیتا ہے وہ ایفاء توفیۃ اور موافاۃ کا مطاوع اور لفظ وُفِی سے ماخوذ ہوتا ہے اور اس کا مفعول کوئی حق یا کوئی مالیت ہوتی ہے۔ اور جس لفظ توفی کے معنی قبض روح کے ہوتے ہیں۔ وہ لفظ وفاۃ سے ماخوذ ہوتا ہے۔ جس کے معنی موت کے ہیں اور توفاہ اللہ کے معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کرلی۔ یعنی جان نکال لی۔ اور کلیات ابوالبقاء میں ہے۔ والفعل من الوفاۃ یعنی یہ فعل لفظ وفاۃ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی موت کے ہیں۔

تفسیر[۱] ۔ توفی کا لفظ جبکہ اس کا فاعل اللہ تعالیٰ ہو۔ اور ذی روح مفعول ہو۔ قبض روح کے سوا اور کسی معنی میں نہیں آتا۔ اس کی ایک مثال بھی لغت اشعار عرب اور قرآن مجید سے پیش نہیں کی جاسکتی۔ جب بھی توفی اللہ زیدًا آئیگا۔ اس کے معنی قبض روحہ کے ہونگے کسی شاعر کسی خطیب کسی مصنف نے اس کو دوسرے معنوں میں استعمال ہی نہیں کیا۔ جب ذی روح مفعول ہو تو اس کے معنی پورا پورا دینا نہیں ہوتے۔ پورا حق دینا حق ہی کے متعلق آتا ہے۔

مومن[۲] اس کو کہتے ہیں جس کے ہاتھ سے لوگ امن میں آجائیں اور وہ دنیا کو امن دینے والا ہو۔ اور اس کو بھی مومن کہتے ہیں کہ جو خود امن میں آجاتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین ہوجاتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ اس کی سزا سے بچ جاتا ہے۔

اس آیت میں فرمایا ہے کہ تم لوگ کہتے ہو۔ کہ ہمیں[۳] تیرے دین سے شک پیدا ہو رہے ہیں۔ حالانکہ میرا عمل تو اسی مذہب پر ہے۔ اور میں شرک سے کلی طور پر بیزار ہوں۔ اور مجھے تو اس دین سے یقین اور ایمان ہی پیدا ہو رہا ہے۔ نہ معلوم تمہیں شک کس طرح سے پیدا ہوتے ہیں[۴] یتوفاکم کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ جس خدا پر میرا ایمان ہے وہ تمہیں ہلاک کرنیوالا ہے اور اس طرح تم پر اپنی حجت تمام کرنے والا ہے۔

۱۰۶ حل لغات ۔ اقم۔ اقام سے نکلا ہے اقام الشیٔ کے معنی ہیں ادامہ۔ اسے مداومت کے ساتھ سرانجام دیا (اقرب) الوجہ کے معنی منہ کے علاوہ چھ اور بھی ہیں (۱) نفس الشیٔ خود چیز (۲) سید القوم قوم کا سردار (۳) الجاہ جاہ و حشمت۔ (۴) الجہۃ طرف (۵) القصد والنیۃ نیت وارادہ (۶) المرضاۃ خوشنودی۔ یقال ارید وجھک ای رضاک۔ جب ارید وجہک کہیں۔ تو اس سے مراد یہ ہوتی

[۱] لفظ توفی کے معنی جبکہ اس کا فاعل اللہ مفعول ذی روح ہو

[۲] لفظ مومن کے معنی

[۳] یہ دین شک پیدا کرنیوالا نہیں ہوسکتا

[۴] تمہاری ہلاکت کا وقت قریب آرہا ہے۔

[۵] اَقِمْ

[۶] وَجْهَ

[۷] وجہ

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ج

اور تو اللہ (تعالیٰ) کے سوا (کسی چیز) کو جو تجھے نہ (کوئی) نفع پہنچاتی ہے۔ اور نہ (کوئی) نقصان پہنچاتی ہے۔ نہ پکار

۱۰۷ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَاِنْ

اور اگر تو نے (ایسا) کیا تو اس صورت میں تو یقیناً ظالموں میں سے ہوگا ۱۳۰ اور اگر

يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ج

اللہ (تعالیٰ) تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اُس کے سوا کوئی بھی اسے دور کرنے والا نہیں (ہو سکتا)

وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ يُصِيْبُ بِهٖ

اور اگر وہ تیرے لئے کوئی بہتری چاہے۔ تو اس کے فضل کو روکنے والا بھی قطعاً کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے

۱۰۸ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○

پسند کرتا ہے اسے وہ (یعنی اپنا فضل) پہنچا دیتا ہے اور وہ بہت ہی بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے ۱۳۱

ہے کہ میں تیری خوشنودی چاہتا ہوں (اقرب) الحنیف الصحیح المبیل الی الاسلام الثابت علیہ دین اسلام کی طرف مائل ہونے اور اس پر ثابت رہنے والا وکل من کان علی دین ابرٰھیم۔ جو حضرت ابراہیم کے مذہب پر ہو۔ ان معنوں میں مذہبی خیالات کا دخل پایا جاتا ہے۔ یعنی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معنی اسلام کے نزول کے بعد آیات قرآنیہ کی تفسیر کے اثر کے نیچے پیدا ہو گئے ہیں المستقیم جو اِدھر اُدھر ہونے والا نہ ہو (اقرب) اصل معنی اس لفظ کے یہی معلوم ہوتے ہیں۔

تفسیر۔ اس آیت میں مشرک نہ ہو کے یہ معنی نہیں۔ کہ تو ملحد کو نہ پوج۔ یا اللہ تعالیٰ کا بیٹا نہ بنا۔ کیونکہ حنیف بنانے کے بعد پھر اس ہدایت کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ چونکہ مشرک کا لفظ حنیف کے مقابلہ پر آیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو غیر اللہ کی طرف بالکل توجہ نہ کر ورنہ محض اس فعل سے ہی تو مشرک ہو جائیگا۔ گویا شرک کی باریک راہوں کی طرف توجہ دلا کر ان سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔

۱۳۰ تفسیر۔ یہ مطلب نہیں کہ ان چیزوں کو مت پکار جو نفع و ضرر کی مالک نہیں۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو بھی ہے وہ بالذات نفع و ضرر کا مالک نہیں پس کسی پر توکل نہ کر۔ ظالم سے مراد اس آیت میں مشرک ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دفعہ ظلم کے متعلق سوال کیا گیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ ظلم سے مراد کبھی شرک بھی ہوتا ہے (بخاری کتاب التفسیر زیر آیت لم یلبسوا ایمانہم بظلم) اس جگہ بھی شرک ہی مراد ہے۔

۱۳۱ — اس جگہ یہ بتلایا ہے کہ تم لوگوں کے دلوں میں جو قرآن مجید کی طرف سے شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ تو اس کا ذمہ وار قرآن مجید نہیں ہے۔ ورنہ سب سے پہلے وہ شبہات میرے دل میں پیدا ہونے چاہیئے تھے۔ جس پر اس کا نزول ہوا ہے۔ لیکن میں یقین کی مضبوط چٹان پر کھڑا ہوں اور مجھے کامل محبت الٰہی

حنیف ۱۲۹

خدا تعالیٰ کے سوا کوئی چیز نفع یا ضرر پہنچانے پر قادر نہیں۔ ۱۳۰

ظالم بمعنی مشرک

شرک کے معنی

۱۳۱ کفار کے شبہات کا موجب قرآن کریم نہیں ہو سکتا۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ج

تو (ان سے) کہہ کہ اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آگیا ہے۔ پس (اب)

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ

جو کوئی (اسکی بتائی ہوئی) ہدایت کو اختیار کرے تو وہ اپنی جان ہی کے فائدہ کیلئے ہدایت کو اختیار کرتا ہے۔ اور جو اس راہ سے بھٹکا

فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ج وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝ ۱۰۹

تو اس کا بھٹکنا (بھی) اس (کی جان) پر ہی (ایک وبال) ہوگا۔ اور میں کوئی تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں ۱۰۵

دی گئی ہے۔ میرے ذہنی افکار تیز ہوگئے ہیں۔ اور ہر نفع وضرر کے متعلق غیر اللہ کا پردہ میری آنکھ پر سے اُٹھ گیا ہے۔ گویا ماسوی اللہ میری نظروں سے غائب ہوگیا ہے۔ جب میری یہ حالت ہے تو تمہارا اعتراض غلط ہے۔ بلکہ یہ گند تمہارے اپنے پیدا کردہ ہیں۔

پھر آخر پر وھو الغفور الرحیم رکھ کر بتا دیا ہے۔ کہ اگرچہ تمہارے دل گندے ہو چکے ہیں۔ لیکن اگر تم مغفرت مانگو تو اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کو صاف اور پاک کر دے گا اور سب گندوں کو دھو دے گا۔ اور تمہیں بھی ایسا ہی یقین عطا فرمائے گا۔

اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خیر اور شر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک خیر اور شر وہ ہوتے ہیں جو خاص ارادہ الٰہی کے ماتحت نہیں آتے۔ بلکہ تقدیر عام کے ماتحت آتے ہیں۔ قانون قدرت ان کا موجب ہوتا ہے۔ ایسے خیر اور شر قانونِ قدرت کے ماتحت کوشش سے آبھی سکتے ہیں۔ اور ٹل بھی سکتے ہیں۔ لیکن ایک خیر اور شر کے نزول کا موجب اللہ کا خاص ارادہ ہوتا ہے۔ جن کے لانے کا موجب دنیوی اعمال نہیں ہوتے۔ بلکہ شرعی اعمال ہوتے ہیں۔ ایسے خیر و شر کو لانا یا ٹلانا صرف ارادہ الٰہی پر منحصر ہے تدبیر سے نہ وہ آسکتے ہیں اور نہ ٹل سکتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے اس طرف اشارہ کیا ہے

کہ آپ سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ تقدیر کا ہے۔ آپ کی ترقیات تدبیر کے ماتحت نہیں ہیں۔ کہ کوئی انہیں تدبیر سے ٹلا سکے۔ اور ہر عقلمند غور کرکے معلوم کر سکتا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کام فضل الٰہی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اس وجہ سے آپ کے دشمنوں کی تدابیر آپ کے مقابلہ میں۔ باوجود آپ کی تدابیر سے بہت زیادہ زبردست ہونے کے بالکل بے کار اور رائگاں جاتی تھیں۔

(اس گندگی اصل وجہ) (اس گند کا علاج)

۱۰۵ حل لغات۔ الوکیل۔ الموکول الیہ

(وکیل)

جس کے سپرد کوئی بات کر دی جائے۔ وقد یکون للجمع والانثی یہ لفظ واحد و جمع ہر دو کے لئے اور اسی طرح مذکر و مؤنث ہر دو کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ویکون بمعنی فاعل اذا کان بمعنی الحافظ اور جب اسکے معنی حافظ یعنی نگہبان کے ہوں تو اسوقت اسم مفعول کے معنی میں نہیں۔ بلکہ اسم فاعل کے معنی میں ہوتا ہے۔ یوصف به الله تعالیٰ اور انہی معنوں میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ وقیل الکافی الرازق۔ اور بعض کہتے ہیں کہ جب یہ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے والے اور رازق کے ہوتے ہیں (اقرب)

(خیر و شر کے اقسام مطابق مسئلہ تقدیر)

تفسیر۔ فرمایا کہ تمہاری ہدایت یا گمراہی سے میرا نفع یا نقصان نہیں۔ کیونکہ میں تم پر محافظ کی حیثیت سے مقرر نہیں کیا گیا۔ اگر میں نگران اور محافظ کی حیثیت سے مقرر ہوتا۔ تو بیشک مجھ سے گرفت ہوتی کہ تم نے ان لوگوں سے

(نبی محافظ نہیں ہوتا بلکہ مبلغ ہوتا ہے)

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَ

اور جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ تو اس کی پیروی کر اور صبر سے کام لے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ (فیصلہ صادر) کردے ۔ اور

هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝ ۱۱۰ ع ۱۶

وہ سب فیصلہ کرنیوالوں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ۱۰۶

فلاں فلاں باتوں پر عمل نہ کرایا اور فلاں فلاں باتیں نہ چھوڑائیں میں تو صرف مبلغ کی حیثیت رکھتا ہوں۔

صبر

۱۰۶ حل لغات۔ صبر۔ فلانا عن الامر حبسہ عنہ فلاں شخص کو فلاں بات سے روک رکھا۔ صبرت نفسی علی کذا احبستہا میں نے فلاں بات پر ثابت قدمی دکھائی۔ تقول صبرت علی ما اکرہ و صبرت عما احب یعنی جب صبر کا صلہ علی ہو۔ تو اس کے معنی کسی امر پر ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں اور جب اس کا صلہ عن ہو تو اس کے معنی روک دینے کے ہوتے ہیں (اقرب)

فیصلہ تیرے حق میں ہو کر رہا ہے۔

آخر سورۃ اور ابتداء سورۃ کے مضمون کا اتحاد۔

تفسیر۔ آخر سورۃ میں پھر سورۃ کے ابتدائی مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور فرمایا ہے۔ کہ خدا تعالے کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۔ وہ جس طرح حکیم ہے اسی طرح حاکم بھی ہے پس تو اس کلام الٰہی کی تبلیغ کرتا جا۔ جو تجھ پر نازل ہوا ہے۔ اور جب تک اللہ تعالیٰ کا فیصلہ نہ ہو۔ ان لوگوں کی ایذا رسانی کی برداشت کرتا جا۔ اور پرواہ نہ کر۔

خیر الحاکمین کہکر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ اس کا فیصلہ تیرے بارے میں بہت اچھا صادر ہونے والا ہے۔ چنانچہ جب وہ فیصلہ ہوا۔ تو دنیا دنگ رہ گئی۔ وہ لوگ جو آپ کے خون کے پیاسے تھے۔ آپ کے والہ و شیدا ہوگئے۔ اور سب ملک حضرت یونسؑ کی قوم کی طرح یکدم ایمان لے آیا۔ اور وفود کے وفود آکر آپ کی غلامی میں داخل ہوگئے۔

صلے اللہ علیہ والہ وسلم

سُورَةُ هُودٍ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَثَلَاثٌ وَعِشْرُونَ آيَةً دُونَ الْبَسْمَلَةِ وَعَشْرُ رُكُوعَاتٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لیکر شروع کرتا ہوں۔ جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے لـه

لـه سورۃ ہود مکی سورۃ ہے۔ ابن عباس۔ الحسن۔ عکرمہ مجاہد۔ قتادہ۔ جابر بن زید کے نزدیک یہ سورۃ سب کی سب مکی ہے۔ ابن عباس سے ایک روایت ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے سوائے ایک آیت کے اور وہ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ الآیۃ ہے مقاتل کا قول ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ سوائے ان تین آیتوں کے۔ ایک آیت فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ الآیۃ دوسری آیت اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ جو عبد اللہ بن سلام اور اُن کے ساتھیوں کے متعلق ہے۔ تیسری آیت اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ۔ جو نبہان التمار کے متعلق ہے۔ (بحر المحیط)

یہ سورۃ۔ سورۃ یونس کے مضامین میں سے ایک مضمون کو تفصیلی طور پر بیان کرتی ہے سورۃ یونس میں بیان کیا گیا تھا۔ کہ انبیاء کی اقوام سے اللہ تعالیٰ تین طرح سے معاملہ کرتا ہے۔ (۱) کسی قوم کو بالکل تباہ کر دیتا ہے (۲) کسی قوم کو بالکل چھوڑ دیتا ہے۔ (۳) اور کسی قوم کے ایک حصہ کو بالکل تباہ کرکے دوسرے حصہ کو بالکل بچا لیتا ہے۔ اس سورۃ میں اول الذکر امر کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ کس طرح بعض اقوام کو اللہ تعالیٰ نے بالکل مٹا دیا اور ان کا نام و نشان باقی نہ رکھا اور ان کی بجائے ایک اور قوم کو کھڑا کر دیا۔ جو پہلی قوموں کے تسلسل میں قائم نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے ذریعے سے دنیا کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

سورۃ ہود مکی ہے

روحانی حیاۃ ملۃ اور نسل کا قیام

اس سورۃ میں یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ بدی اور بدکاری پر نگاہ رکھتا ہے۔ اور اس کے مطابق لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کے لئے حسب ضرورت سامان پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور چونکہ وہ سامان خود انسان کے فائدہ کے لئے ہوتے ہیں اس لئے جب وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ تو روحانی طور پر ہلاک ہو جاتا ہے۔ جس طرح کہ جسمانی غذا کے استعمال نہ کرنے پر ہلاک ہو جاتا ہے۔ پھر بتایا ہے۔ کہ جس طرح ایک نسل کے مرنے سے انسان ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کے بعد اور ایک نسل اس کی قائم مقام کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہی حال روحانی سلسلوں کا ہے۔ ایک سلسلہ تباہ کر دیا جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ ایک اور سلسلہ کو قائم کر دیتا ہے۔

سورۃ ہود کا خلاصہ مضمون اور پہلی سورۃ سے تعلق۔

دنیا کی ترقی بغیر دین کے قائم نہیں رہ سکتی۔

اس سورۃ میں یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ دنیوی ترقی بیشک خدا سے جدا ہو کر بھی مل سکتی ہے لیکن دنیا میں ہمیشہ قائم رہنے والی قومیں وہی ہوا کرتی ہیں جو دنیا کے ساتھ دین کو بھی قائم رکھتی ہیں۔ یعنی جو قوم اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اسی کا نام قائم رہتا ہے۔ پھر یہ بتایا ہے کہ مومن کافر کے مقابلہ میں کیوں جیت جاتا ہے اور کافر مومن کے مقابلہ میں

مومن کی کافر کے مقابلہ میں فتح

الٓرٰ تف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ

الرا (یہ) ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیات کو محکم کیا گیا ہے اور نیز انہیں کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ ۲

(اور یہ) ایک حکیم اور خبیر (ہستی) کی طرف سے ہے سلہ

کیوں تباہ ہوتا ہے۔ اور مختلف قوموں کی مثالیں بیان کرکے بتایا ہے۔ کہ وہ کیسی طاقتور قومیں تھیں۔ لیکن ہمارے بندوں کے مقابلہ میں تباہ و برباد ہوگئیں۔ چنانچہ اس سورۃ میں قوم نوح۔ قوم ہود قوم صالح قوم لوط اور قوم شعیب کا ذکر کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابل پر فرعون اور اس کی قوم کا ذکر کیا ہے۔ درمیان میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر بھی آیا ہے۔ مگر ان کا ذکر اصل مقصود نہیں۔ بلکہ حضرت لوط علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ ضمنی طور پر ان کا بھی ذکر آگیا ہے۔ اس کے بعد حضرت موسےٰ ع کے واقعات کو لیا ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر۔ بنی اسرائیل کے ساتھ جو اُن کا تعلق تھا۔ اس کے لحاظ سے نہیں کیا بلکہ اُن کے اس تعلق کے لحاظ سے کیا ہے۔ جو انہیں فرعون کے ساتھ تھا۔ اور جس کی وجہ سے فرعون اور اس کی قوم تباہ ہوگئی۔

پھر یہ بتایا ہے کہ جس قوم کے متعلق عذاب کا فیصلہ ہو جائے۔ اس سے مومنوں کو بچتے رہنا چاہیئے کیونکہ ایسی قوم کے ساتھ شامل ہونے سے انسان عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے۔ اور آپ کو بتایا ہے کہ ان نبیوں کے حالات اس لئے بیان کئے گئے ہیں کہ تا تیرے دل کو صدمہ نہ ہو کہ میری قوم تباہ ہو رہی ہے۔ بہت سے نبیوں کے مخالفین کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے۔ اور آخر میں مسلمانوں کی ترقیات کی طرف توجہ دلا کر مزید تسلی دی ہے۔

اس سورۃ میں اتنے عذابوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی ذمہ داریوں کو بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ شَيَّبَتْنِيْ هُوْدُ۔ کہ سورۂ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے یعنی اس کے مضامین کا اثر مجھ پر اتنا پڑا ہے۔ کہ اس کے نازل ہونے کے بعد میں اپنے جسم میں کمزوری محسوس کرنے لگا ہوں ✦

سلہ حل لغات أَحْكَمَتْهُ التَّجَارِبُ جعلته حكيما۔ تجارب نے اسے حکیم بنا دیا۔ أَحْكَمَ السَّفِيْهَ اخذ على يده مال کی قدر و قیمت نہ سمجھنے والے پر مال کے خرچ کرنے میں بندش ڈال دی۔ او بَصَّرَهٗ ما هو عليه یا یہ کہ اس کی حالت پر اسے آگاہ کیا۔ أَحْكَمَ الشَّيْءَ اتقنه۔ پختہ اور مضبوط کر دیا۔ احكم فلانا عن الامر رجعه۔ ہٹا دیا، روک دیا۔ احكم الفرس جعل للجامه حكمة (اقرب) گھوڑے کے لگام میں اس کا آہنی پرزہ لگا

فَصَّلَ الشيءَ جعله فصولا متمائزة اسے جدا جدا حصوں میں تقسیم کیا۔ فصل الثوب قطعه بقصد خياطته۔ سلائی کے لئے کپڑے کو کاٹا۔ فصل الكلام بيّنه ومنه اجمله۔ کھول دیا مجمل نہ رہنے دیا۔ فصل العقد جعل بين كل خرزتين من لون واحد خرزة او مرجانة او شذرة او جوهرة تخالفهما۔ (اقرب)

اس سورۃ میں خصوصیت سے ساتھ آیتوں عذاب اور آنحضرت ؐ کی ذمہ داریوں کا ذکر ہے

أُحْكِمَ

تفصیل

نبیوں کے حالات بیان کرنے کا مقصد

موتیوں وغیرہ کے ہار کے ہر رنگ منکوں کے درمیان کسی
دوسرے رنگ کے مرجان یا جواہرات وغیرہ کے منکے
ڈالے۔

الخبیر۔ العارف بالخبیر۔ خبر کو اچھی طرح سے جاننے
والا۔ اور خبر کے معنی ہیں۔ **ماینقل ویتحدث بہ** ۱؎ اقرب
جس کو نقل کیا جائے۔ یا جس کا تذکرہ کیا جائے۔ یعنی ایسا
امر جس سے دوسروں کیلئے دلچسپی کی وجہ موجود ہو۔ و
اللہ خبیر۔ ای عالم باخبار اعمالکم ۲؎ اللہ تعالیٰ تمہارے
اعمال کی حقیقت سے واقف ہے۔ وقیل عالم بواطن
امورکم یعنی بعض نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ اللہ تو
تمہارے اندرونی حالات سے واقف ہے۔ خبیر بھی
مخبر بھی آتا ہے۔ یعنی خبر دینے والا (مفردات)

تفسیر۔ فرماتا ہے کہ اس کتاب کی آیتیں اپنے
اندر حکمت رکھتی ہیں۔ اور جو کچھ بھی اس میں بیان ہوا ہے
وہ بدی سے روکنے والا اور نیکی کی طرف لیجانیوالا ہے۔ اور
انسان کی پوشیدہ بدیوں سے اس کو آگاہ کرکے اس کی
حقیقت سے اسے واقف کرتا ہے۔ اور اس کلام میں
کسی قسم کا کوئی نقص نہیں اور نہ کوئی ضرورت سے زائد
بات ہے۔ غرض تمام ضروری تعلیم بغیر فضول لغو کی تفصیلات
بیان کی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی پھر اس امر کا بھی لحاظ
رکھا گیا ہے۔ کہ ہر ایک قسم کی ضروری تفصیل بھی آگئی ہے۔
اور فروعات کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا۔ بلکہ بقدر ضرورت
انہیں بھی بیان کیا گیا ہے۔

فصلت سے درحقیقت متشابہ تعلیم کی طرف اشارہ
کیا گیا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرماتا ہے ھو الذی انزل علیک
الکتٰب منہ اٰیٰت محکمٰت ھن ام الکتٰب واخر متشٰبھٰت
(آل عمران ۸) اس سورۃ آل عمران کی آیت میں محکم کے مقابلہ میں متشابہ
کو رکھا ہے۔ لیکن آیت زیر تفسیر میں متشابہات کی جگہ
فصلت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ پس ظاہر ہوا کہ یہ لفظ متشابہ
کے معنوں کو واضح کرتا ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ
متشابہ درحقیقت تفصیلی تعلیم کا ہی نام ہے۔ اور یہی تعلیم ہے جس
پر اعتراض کی دشمن کو جرأت ہوتی ہے۔ ورنہ محکم یعنی اصولی تعلیم
پر کوئی شخص حرف گیری نہیں کرسکتا۔ مگر حق کے معلوم کرنے
کا طریق یہی ہے کہ انسان تفصیلی تعلیم کو محکم کے ماتحت لاکر دیکھے
اگر وہ اس کے ماتحت آجائے تو پھر اس پر اعتراض کرنے کی کوئی
وجہ نہیں جیسے کہ مثلاً بعض لوگ اسلام کی بعض تفصیلی تعلیمات
پر جو سزا کے متعلق ہیں اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اسلام کی
اصولی تعلیم کو دیکھیں جو یہ ہے کہ جس جگہ رحم سے فائدہ ہوتا ہو
رحم کرو اور جس جگہ سزا سے وہاں سزا دو۔ تو اس پر انہیں
کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ اب اگر وہ تفصیلی تعلیم کو دیکھیں
تو انہیں معلوم ہوگا۔ کہ اسلام نے سزا کے موقع پر سزا تجویز کی
ہے اور رحم کے موقعہ پر رحم۔ اس لئے اس پر اعتراض خلاف
اصول ہے۔ مثلاً بعض حالات میں جنگ کی اجازت دی ہے
اور یہ بات بظاہر معیوب نظر آتی ہے۔ لیکن ہمیں دیکھنا یہ ہوگا
کہ جنگ بعض اوقات عدل و انصاف کے قیام کے لئے ضروری
ہوتی ہے۔ پس اس پر اعتراض درست نہیں ہوسکتا۔ اس
کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ ایک ڈاکٹر کسی کا دانت نکالتا
ہے جو بظاہر ظالمانہ فعل نظر آتا ہے۔ اور رحم کے خلاف۔
لیکن اگر حقیقت پر نظر کریں تو وہ عین رحم ہے اور آرام کا
موجب۔

من لدن حکیم خبیر سے یہ بتایا ہے۔ کہ اس کا منبع
بھی اعلیٰ ہے۔ اس لئے اس کی تمام تفاصیل پر اعتبار کیا جا
سکتا ہے۔

حکیم اسے کہتے ہیں۔ جو موقع کے مطابق کام کرنے والا ہو
اس صفت سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس کلام کی بھیجنے والی
ہستی کے یہ مدنظر نہیں ہے کہ وہ لوگوں میں شہرت یا عزت
حاصل کرے بلکہ اس کے مدنظر بنی نوع انسان کا فائدہ ہے۔
پس اس نے کوئی ایسی تعلیم اس میں نہیں دی۔ جو بظاہر
خوبصورت ہو لیکن بہ باطن خراب ہو۔ بلکہ اس نے ہر وہ تعلیم
جو انسان کے فائدہ کی ہے پیش کردی ہے۔ خواہ لوگ

۱؎ خبیر

۱؎ حکمت آیات کے معنی

۱؎ تشابہت کی بجائے فصلت

۲؎ لفظ حکیم میں اس کتاب کی پر حکمت تعلیم کیطرف اشارہ ہے۔

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ

اس تعلیم پر مشتمل ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوائے (کسی) کی عبادت نہ کرو۔ میں اس کی طرف سے یقیناً یقیناً

لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝ ٣

تمہارے لئے ہوشیار کرنیوالا اور بشارت دینے والا (بنا کر بھیجا گیا) ہوں گ

اس سے کس قدر ہی کیوں نہ بھاگیں اور برا نہ منائیں۔ ظاہر میں اچھی اور باطن میں بری تعلیم کی مثال انجیل کی تعلیم ہے۔ کہ اگر کوئی تیری ایک گال پر تھپڑ مارے تو تو دوسری بھی پھیر دے۔ اور بظاہر بری لیکن حقیقت میں اچھی تعلیم کی مثال قرآن کریم کی یہ تعلیم ہے کہ جو اقوام جبراً مذہب میں دخل دیں۔ ان کا سختی سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔ جس تعلیم کی غرض لوگوں میں قبولیت حاصل کرنا ہوگی۔ وہ اول الذکر قسم کی تعلیموں پر انحصار کرے گی۔ اور جس کی غرض اصلاح ہوگی۔ وہ لوگوں کی پسندیدگی یا عدم پسندیدگی کا خیال کئے بغیر جو مفید باتیں ہیں انہیں بیان کر دے گی۔

چونکہ اس سورۃ میں سزاؤں کا اکثر ذکر ہے اس لئے اس کی پیش بندی کرتے ہوئے سورۃ کے شروع میں ہی اپنی صفت حکیم کا ذکر کر دیا ہے۔ یعنی وہ سزائیں ہماری صفتِ حکیم کے ماتحت تھیں۔ ظلم کے ماتحت نہیں تھیں۔

لفظ خبیر کے معنی

خبیر کہہ کر یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقت امر سے واقف ہے۔ خبیر کا لفظ اصل حال کی واقفیت پر دلالت کرتا ہے۔ اور بواطن امور کے جاننے کی طرف اس میں اشارہ ہوتا ہے۔ اور اس لفظ سے اس طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ کہ اس صفت کا مالک اندرونی تغیرات پر خاموش نہیں رہ سکتا اور بداعمالی کی سزا کو نظر انداز نہیں کر سکتا

اللہ تعالیٰ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں ہے۔

۵۳ — بظاہر یہ تعلیم کہ خدا تعالیٰ نے بندہ کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ خود غرضانہ معلوم دیتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا اللہ تعالیٰ بندہ کی عبادت کا محتاج ہے۔ لیکن اگر قرآن پر غور کیا جائے تو حقیقت بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم بوضاحت بیان فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی عبادت کا محتاج نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ عنکبوت رکوع اول میں ہے۔ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ یعنی جو شخص کسی قسم کی جدوجہد روحانی ترقیات کے لئے کرتا ہے۔ وہ خود اپنے نفس کے فائدے کے لئے ایسا کرتا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات اور ان کے ہر قسم کے افعال سے غنی ہوتا ہے۔ اسی طرح سورۃ حجرات میں فرماتا ہے۔ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ (حجرات ع ٢) یعنی مذہب اسلام کو قبول کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان نہیں۔ نہ خدا تعالیٰ پر ہے۔ بلکہ اللہ کا احسان ہے۔ کہ اس نے وہ طریق بتایا جو لوگوں کی ترقی اور کامیابی کا موجب ہے۔ پس عبادت قرآن کریم کے رو سے خود بندہ کے فائدہ کے لئے ہے۔ اور اس کی یہ وجہ ہے کہ عبادت چند ظاہری حرکات کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ان تمام ظاہری اور باطنی کوششوں کا نام ہے۔ جو انسانوں کو اللہ کی صفات کا مظہر بنا دیتی ہیں۔ کیونکہ عبد کے معنی اصل میں کسی کے نقش کے قبول کرنے اور پورے طور پر اس کے منشاء کے ماتحت چلنے کے ہوتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ جو شخص کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی منشاء کے ماتحت چلیگا۔ الٰہی صفات کو اپنے اندر پیدا کر لیگا۔ اور ترقی کے اعلیٰ مدارج کو حاصل کریگا۔ تو یہ امر خود اس کے لئے نفع رساں ہوگا۔ نہ کہ اللہ کے لئے۔ بائبل میں جو یہ لکھا ہے۔ کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی شکل پر پیدا کیا۔ (پیدائش باب ١) ۔ تو درحقیقت

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا

اور یہ کہ تم اپنے رب سے بخشش مانگو (اور) پھر اس کی طرف (سچا) رجوع کرو۔ (تب) وہ تمہیں ایک مقررہ میعاد

حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ

تک اچھی طرح سے سامان عطا کریگا۔ اور نیز ہر ایک فضیلت والے (شخص) کو اپنا فضل عطا کرے گا۔

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝ ۴

اور اگر تم پھر جاؤ گے۔ تو میں یقیناً تم پر ایک بڑے (ہولناک) دن کے عذاب (کے آنے) سے ڈرتا ہوں سکھ

اس میں بھی اس امر کی طرف اشارہ ہے۔ کہ انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر پیدا کر سکے ۔ ورنہ اللہ تعالےٰ تمام شکلوں سے پاک ہے۔

پس عبادت پر زور دینے کے محض یہ معنی ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھو۔ کیونکہ کامل تصویر تبھی کھینچی جاسکتی ہے۔ جب اس وجود کا نقشہ ذہن میں موجود ہو۔ جس کی تصویر لینی ہو۔ اور عبادت اللہ تعالیٰ کی صفات کو سامنے رکھنے اور ان کا نقش اپنے ذہن پر جمانے کا ہی نام ہے۔ جس میں انسان کا فائدہ ہے۔ نہ کہ اللہ تعالیٰ کا۔

اس مضمون کی طرف ایک حدیث میں بھی اشارہ ہے جس میں بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے سوال کیا۔ کہ یا رسول اللہ۔ ما الاحسان۔ کامل عبادت کیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ ان تعبد الله كانك تراه۔ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے۔ کہ گویا معنوی طور پر وہ اپنی تمام صفات کے ساتھ تیرے سامنے کھڑا ہو جائے۔

انذار کے معنی اس قسم کا ڈرانا نہیں ہوتا جیسے کہ سانپوں یا شیروں سے ڈرایا جاتا ہے۔ اس قسم کے ڈرانے کو ترہیب یا تخویف کہتے ہیں۔ انذار لغت میں ہوشیار کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔ پس مطلب یہ نہیں کہ میں تمہیں خدا تعالیٰ سے ڈراتا ہوں۔ بلکہ مطلب یہ ہے۔ کہ میں تمہیں ہوشیار کرتا ہوں۔ تاکہ اپنے نفع کے پہلوؤں کو بھول نہ جاؤ اور نقصان کے پہلوؤں کو اختیار نہ کر لو۔

بشیر کے معنی

اسی طرح بشیر کے لفظ سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ میں صرف تمہیں ہوشیار ہی نہیں کرتا۔ بلکہ تمہاری ترقی کے سامان بھی ساتھ لایا ہوں۔

متاع

سکھ حل لغات۔ المتاع كل ما ينتفع به من الحوائج كالطعام والبز واثاث البيت والادوات والسلع۔ متاع عام ضروریات کی چیزوں کو کہتے ہیں۔ جیسے خوراک۔ پوشاک۔ گھر کے استعمال کا سامان آلات اور اجناس۔ وقال فی الکلیات المتاع

حدیث میں اس حقیقت کی طرف اشارہ

والمتعة ما ينتفع به انتفاعًا قليلًا غير باق بل ينقضى عن قريب۔ اور کلیات ابوالبقاء میں لکھا ہے۔ کہ متاع یا متعہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو محض وقتی طور پر کچھ فائدہ پہنچانے والی ہو۔ واصل المتاع ما يتبلغ به من الزاد۔ اور اس کے اصل معنی زادِ راہ کے ہیں۔ و ياتى المتاع اسمًا بمعنى التمتيع۔ اور یہ لفظ اسم مصدر کے طور پر تمتیع کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی سامان دنیا (اقرب)

انذار کے معنی

تفسیر۔ پہلی آیت میں اس مقصد عظیم کی طرف

٥ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○

اللہ (تعالیٰ) کی طرف تم (سب) کو واپس لوٹنا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر کامل طور پر قدرت رکھنے والا ہے ٥ھ

توجہ دلائی تھی جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ مقصد تک پہنچنے میں بعض دفعہ انسان کے رستہ میں روکیں حائل ہو جاتی ہیں۔ اس لئے فرمایا۔ کہ اگر تم اللہ تعالےٰ سے یگانگت پیدا کرنا چاہتے ہو۔ اور تمہارے رستہ میں ایسی رکاوٹیں ہیں کہ جن کی وجہ سے خدا تک پہنچنا تمہارے لئے ناممکن ہو گیا ہے۔ تو ان کو دور کرنے کا یہ طریق ہے کہ پہلے تم اپنے رب سے مغفرت مانگو۔ یعنی گناہوں کی وجہ سے جو تمہارے دلوں پر زنگ لگ گئے ہیں اور وہ خدا تک تمہیں نہیں پہنچنے دیتے ان کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی اعانت طلب کرو۔ اس سے دعائیں کرو۔ کہ وہ تمہارے زنگوں کو دور کردے۔ دوسرے معنی استغفار کے دبا دینے کے ہیں ان معنوں کے رو سے اس آیت کے یہ معنی ہونگے۔ کہ ان جذبات کے دبانے کی دعا مانگو۔ جو خدا تک پہنچنے میں روک بن جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد فرمایا ثم توبوا الیہ۔ یعنی جب وہ جذبات دب جائیں تو اس کے بعد خدا کی محبت پیدا کرنے کے لئے اس کی طرف توجہ کرو۔ اس طرح خدا تک پہنچنا تمہارے لئے آسان ہو جائے گا۔ اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کو ناراض کرنے والے جذبات جب مٹ جائیں۔ تب اس کی طرف انسان جا سکتا ہے۔ بغیر ایسے جذبات کے دبانے اور پرانے اثر کے مٹانے کے خدا کی کامل محبت نہیں پیدا ہو سکتی اس سے یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ توبہ کا مقام استغفار کے بعد کا مقام ہے۔

وہ نادان جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلامی توبہ گناہوں کی زیادتی کا موجب ہے۔ وہ دراصل اس کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ کیونکہ جو شخص گناہوں کے پچھلے اثر کے مٹانے اور جذبات کو دبانے میں لگا ہوا ہوگا اور اس کام سے فارغ ہو کر توبہ کی طرف توجہ کریگا۔ اس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ صرف منہ سے توبہ توبہ کریگا۔ بیوقوفی نہیں۔ تو اور کیا ہے۔ توبہ منہ سے توبہ توبہ کرنے کا نام نہیں۔ بلکہ گناہوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی طرف بہ تمام توجہ جھک جانے کا نام ہے۔ اور اگر اس فعل سے خدا نہیں ملیگا تو اور کس چیز سے ملے گا

یمتعکم متاعا حسنا سے بتایا ہے کہ اگر تم نبی کی بات مان لوگے۔ تو دنیوی منافع بھی ملیں گے۔ کیونکہ متاع عارضی نفع کو کہتے ہیں اور عارضی نفع سے مراد دنیا کا نفع ہے۔ اور اجل مسمّٰی سے مراد وہ زمانہ ہے جو نبی کی امت کے قیام کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہو۔ ویؤت کل ذی فضل فضلہ سے مراد دینی برکات ہیں۔ خواہ اس دنیا میں ملیں۔ خواہ اگلے جہان میں۔

کبیر کسی چیز کو بلحاظ وسعت کے بھی۔ کہتے ہیں۔ اور بلحاظ اس کی گرانی کے بھی۔ پس مراد یہ ہے۔ کہ اس تعلیم کو چھوڑ کر تم ایک لمبے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ جو ہوگا بھی ایسا سخت کہ اس کا برداشت کرنا مشکل ہوگا۔

٥ھ — یعنی آخر اس سے معاملہ پڑنا ہے۔ پھر کیوں اس کی ملاقات کی تیاری نہیں کرتے۔ دوسرے وہ ہر اک امر پر قادر ہے۔ یعنی سزا پر بھی اور انعام پر بھی۔ پھر کیوں اس کے انعام کے حصول کی کوشش نہیں کرتے۔

٢ متاع اور اجل مسمّٰی سے مراد

فضل سے مراد

٣ استغفار کے معنی اور اس کی ضرورت۔

٤ کبیر کے معنی

أَلَآ إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ

سنو! وہ یقیناً اپنے سینوں کو اس لئے موڑتے رہتے ہیں کہ اس سے چھپے رہیں۔

أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَ

سنو! جس وقت وہ اپنے کپڑے اوڑھتے ہیں (تو اس وقت بھی) جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور

مَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ ٦

جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں اسے وہ جانتا (ہوتا) ہے وہ یقیناً سینوں کی باتوں کو (بھی) خوب جانتا ہے ۵۶

۵۶ حل لغات ۔ ثَنَی الشیءَ ثَنْیاً ۔ عطفہ ۔ اس کو موڑ دیا ۔ چکر دیا ۔ (اقرب) تھیلے کا منہ موڑنے کی غرض یہ ہوتی ہے ۔ کہ کوئی چیز اس میں سے باہر نہ نکلے پس استعارۃً اس کے یہ معنی ہیں ۔ کہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کے دلی خیالات ظاہر نہ ہوں ۔

استغشٰی ثوبہ و بثوبہ اِستغشاءً تغطّٰی بہٖ ۔ کپڑے کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھانپ لیا اور محاورہ ہے کہ استغشِ ثوبکَ کَیْ لا تسمع ولا تری ۔ اپنا کپڑا اوڑھ لے کہ نہ کچھ دیکھے نہ کچھ سُنے (اقرب) یہ محاورہ اس وقت استعمال کرتے ہیں ۔ کہ جب کوئی شخص کوشش کرے کہ میں دُوسرے کی بات نہ سنوں نہ اس کی حالت دیکھوں ۔

تفسیر ۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی دو حالتوں کا ذکر کیا ہے جو انہیں ہدایت سے محروم کر رہی ہیں ۔ اول یہ کہ وہ اپنے خیالات کو چھپاتے ہیں اور انہیں ظاہر ہونے نہیں دیتے اس وجہ سے ان کا ازالہ نہیں ہو سکتا ۔ ہدایت کے لئے ضروری ہے ۔ کہ انسان ان امور کو بیان کرے جو اس کے لئے صداقت کو قبول کرنے میں اصل روک ہیں ۔ کیونکہ جب تک اصل روک دور نہ ہو ہدایت نہیں مل سکتی ۔ یہ عیب اکثر لوگوں میں دیکھا گیا ہے ۔ کہ کسی مسئلہ پر بحث کرتے وقت وہ اس کے متعلق جو اصل روک ہوتی ہے ۔ اُسے تو ظاہر نہیں کرتے اِدھر اُدھر کی بحثیں کرتے رہتے ہیں اس وجہ سے ان بحثوں کے ختم ہونے پر بھی وہ وہیں کے وہیں رہتے ہیں جہاں ابتداء میں تھے ۔

ثنی

دوسری بات ان کے متعلق یہ بتائی ہے کہ یہ لوگ یہی کوشش کرتے ہیں ۔ کہ ان کے دل کی حالت کبھی نہ بدلے اور اس کے لئے یہ طریق اختیار کرتے ہیں ۔ کہ بات ہی نہیں سنتے ۔ اور جو یہ کوشش کرے گا کہ بات ہی نہ سنوں وہ ہدایت کس طرح پائیگا ۔ یہ مرض پہلی مرض سے بھی زیادہ سخت ہے ۔ اپنی حالت کو قائم رکھنے کے لئے اکثر لوگ صداقت کے ظاہری آثار سے متاثر ہو کر اس بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ نہ دین کی باتوں کو خود سنیں اور نہ اُن کے دوست سنیں ۔ انہیں بھی یہ کہہ کر روکتے رہتے ہیں کہ یہ لوگ جادو کر دیتے ہیں ۔ ان کی باتوں کو نہ سُنو ۔ حالانکہ جب تک انسان کوئی بات سنے گا نہیں ۔ ہدایت کس طرح پا سکے گا ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ کہ ان کا واسطہ عالم الغیب ہستی سے ہے ۔ کیا اس حالت میں انہیں یہ عذر کام دے سکتا ہے ۔ کہ ہم پر حجت پوری نہیں ہوئی جو کوشش کرتا ہے کہ مجھ پر حجت پوری نہ ہو ۔ اس پر حجت پوری ہو چکی اور وہ عدم علم یا عدم تسلی کا عذر نہیں

استغشاء

کفار کی ہدایت سے محرومی کے اسباب

الجزء ۱۲

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ

اور زمین میں ایسا کوئی بھی جاندار نہیں ہے کہ جس کا رزق اللہ (تعالیٰ) کے ذمہ نہ ہو۔ اور وہ اس کی

مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○

قرارگاہ کو اور اس کی حفاظت کی جگہ کو جانتا ہے (یہ سب کچھ) ایک واضح کردینے والی کتاب میں (موجود) ہے ۷

پیش کرسکتا۔ عذر وہی پیش کرسکتا ہو کہ جو اپنی طرف سے سمجھنے کی پوری کوشش کرچکتا ہے۔ یا وہ لوگ پیش کرسکتے ہیں جن تک ان کی اپنی کوشش کے باوجود ہدایت نہ پہنچی ہو۔ یہ بھی مراد ہے۔ کہ ان کی پوشیدہ عداوتوں کو بھی اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ اور ظاہر کو بھی۔

ذات الصدور سے مراد

ذات الصدور سے مراد دلی خیالات اور ارادے ہیں۔ کیونکہ صدر سے مراد اعلیٰ چیز ہوتی ہے اور انسان کے جسم میں سب سے بلند مقام اس کے ارادوں اور اس کے خیالات کو حاصل ہے کیونکہ انہی کے ماتحت اس کے اعمال ہوتے ہیں۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ ان لوگوں کی قلبی کیفیتوں سے اللہ تعالیٰ واقف ہے۔ اور اسی کا اندازہ لگا کر اس نے اپنا مامور بھیجا ہے۔ پس ان کا یہ دعویٰ فضول ہے کہ ہمیں کسی مصلح کی کیا ضرورت ہے۔

ترتیب

اس آیت کا تعلق پہلی آیتوں سے یہ ہے۔ کہ ان میں ترقیات روحانیہ کا گر بتایا تھا۔ اور ان روکوں کا ذکر کیا تھا جو بلا ارادہ انسان کے راستہ میں آجاتی ہیں اور ان کے دور کرنے کا ذکر کیا تھا۔ اِس آیت میں ان روکوں کا ذکر کیا ہے جو انسان خود اپنے لئے پیدا کرلیتا ہے اور جن کا دور کرنا خود اس کے ارادہ اور کوشش سے متعلق ہے۔

۷ حل لغات۔ **الدابة**

الدابة۔ مادبّ من الحیوان۔ ہر حیوان جو زمین پر چلتا ہے اسے دابہ کہتے ہیں۔ وغلب استعمالها علی ما یرکب ویحمل علیه الاحمال والهاء فیها للوحدة کما فی الحمامة۔ اور اس کا استعمال اکثر ان جانوروں کے لئے ہوتا ہے۔ جن پر سواری کی جاتی ہے یا بوجھ لادا جاتا ہے ویقع علی المذکر والمؤنث۔ اور مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے آخر میں جو ۃ ہے یہ مفرد کی ہے نہ کہ مؤنث کی۔ جس طرح حمامہ (کبوتر وغیرہ) میں ھا مفرد کے لئے ہے۔ اور اس لفظ کی جمع دواب آتی ہے (اقرب)

مستقر

المستقر۔ موضع الاستقرار۔ قرار پکڑنے کی جگہ والشمس تجری لمستقر لها ای المکان لاتجاوزه وقتاً ومحلاً۔ یعنی وہ جگہ یا وقت جس سے سورج آگے نہیں نکل سکتا۔ النهایة والغایة انتہا اور منزل مقصود (اقرب)

مستودع

استودع مالاً۔ استحفظه ایاه۔ حفاظت کے لئے مال اس کو دیا۔ یعنی اس کے پاس رکھا۔ المستودع مکان الودیعة والحفظ۔ وہ جگہ جس میں کوئی چیز بطور امانت وحفاظت رکھی جائے۔ مکان الولد من البطن پیٹ میں بچہ کی جگہ یعنی رحم مادر (اقرب)

اللہ تعالیٰ کی رزق رسانی

تفسیر۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی سب کے لئے رزق کے سامان مہیا کرتا ہے۔ آگے ان کا استعمال کرنا نہ کرنا ان کے اختیار میں ہوتا ہے۔ زمین کے اندر کے کیڑے یا شہروں میں رہنے والے جانور یا جنگلوں کے درندے

سب کے لئے سامان بہم پہنچائے ہوئے ہیں۔ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کہ اس قدر کیڑے مکوڑے کہاں سے رزق حاصل کرتے ہونگے۔ مگر سب کے لئے سامان موجود ہے۔ حتی کہ بعض کیڑوں کے رزق تک سے انسان ناواقف ہے اور نہیں جانتا کہ ان کا رزق کیا ہے۔ انسانی کھیتی کو ہی دیکھ لو۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں بھی جانوروں کا خیال رکھا ہے۔ اگر گیہوں انسان کے لئے پیدا کی ہے۔ تو ساتھ ہی بھوسہ بھی رکھا ہے۔ جو جانوروں کے کام آتا ہے۔ اگر گیہوں کے دانہ سے گیہوں ہی نکلتی۔ تو انسان شائد جانور کا خیال کم ہی رکھتا۔

بعض چیزیں ایسی بنادی ہیں کہ ایک کے لئے مضر اور دوسرے کے لئے نفع رساں ہوتی ہیں۔ کانٹے دار جھاڑیاں اور درخت اونٹوں کی غذا ہیں اور نجاست بھیڑوں کے کام آجاتی ہے۔ انسانی جسم میں پیدا ہونے والے کیڑوں کے لئے اسی جگہ غذا موجود ہے۔ غرض ہر جنس کیلئے الگ الگ قسم کی غذا ہے۔ حتی کہ شکاری جانوروں کی غذائیں بھی مختلف ہیں۔ کوئی کسی قسم کا جانور کھاتا ہے کوئی کسی قسم کا مکوڑوں بلکہ اربوں قسم کے جانور مختلف اقسام کی غذائیں کھاتے ہیں اور انسان جو قانون قدرت کے راز کے ظاہر کرنے کا مدعی ہے۔ ابھی تک ان جانوروں سے بھی پورے طور پر واقف نہیں۔ کجا یہ کہ ان کی غذاؤں سے واقف ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان سب کے لئے غذاؤں کے سامان مقرر کر چھوڑے ہیں۔

مستقر اور مستودع کا ذکر اس لئے فرمایا۔ کہ مستقر ہمیشگی کے رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں اور مستودع عارضی رہائش کی ہے اور غذا وہی مہیا کر سکتا ہے جو غذا کے حاجتمند کے رہنے کی جگہ جانتا ہو۔ اور پھر صحیح غذا وہی مہیا کر سکتا ہے۔ جو کسی چیز کی قوتوں کے منتہا سے واقف ہو۔ پس فرمایا۔ کہ جو ہستی مستقر اور مستودع کا علم رکھے وہی غذا مہیا کر سکتی ہے اور مناسب غذا تجویز کر سکتی ہے۔

فی کتاب مبین کے معنی۔

کل فی کتاب مبین میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اشیاء آپ ہی آپ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی غایت اور منزل مقصود اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص ارادوں کے ماتحت مقرر کی گئی ہے۔

ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے روحانی رزق پیدا نہ کیا ہو۔

اس آیت سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب رزق کے سامان اللہ تعالیٰ ہی مہیا کرتا ہے اور ادنیٰ سے ادنیٰ جانوروں کی ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورت حقہ کو پورا کرتا ہے۔ تو کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ اس نے اس اعلیٰ مخلوق کے لئے جو پیدائش کا منتہا ہے۔ وہ رزق مہیا نہ کیا ہو جس سے اسے دوسری مخلوقات پر فضیلت ہے۔ یعنی روحانی اور اخلاقی قابلیتوں کے نشو و نما کے لئے کوئی تعلیم نہ دی ہو۔ یہ عقل کے خلاف ہے۔ کہ جس وقت انسان ایک خون کا لوتھڑا تھا۔ اس وقت تو اس کی ضرورتوں کو پورا کیا۔ لیکن جب وہ کامل انسان بنا اسے اپنی روحانی اور اخلاقی طاقتوں کی رہنمائی کی ضرورت پیش آئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پس یقیناً اللہ تعالیٰ نے انسان کی روحانی تربیت کے سامان پیدا کئے ہیں۔ آگے انسان ان سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے۔

رزاق وہی ہو سکتا ہے جو مستقر و مستودع کا علم رکھتا ہو۔

اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ جس کو مستقر اور مستودع کا علم نہ ہو وہ رزق بھی مہیا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جب منازل کا علم نہ ہو۔ تو انسان تقسیم غذا میں غلطی کر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ انسانی

مستقر اور مستودع کے ذکر سے مقصود

بنائی ہوئی تعلیموں میں یا تو صرف مستقر کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور جسم کو اس قدر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کہ اس کی وجہ سے روحانی ترقی سے بھی انسان محروم رہ گیا ہے کیونکہ برتن کی خرابی سے اس کے اندر پڑی ہوئی چیز بھی

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ

اور وہ وہ (ذات) ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ وقتوں میں پیدا کیا ہے

وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَ

اور اس کا عرش پانی پر ہے۔ تاکہ وہ تمہارا امتحان کرے (کہ) تم میں سے کس کے عمل زیادہ اچھے ہیں اور

لَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ

یقینی امر ہے کہ اگر تو (ان سے) کہے (کہ) تم مرنے کے بعد یقیناً اٹھائے جاؤ گے تو جن لوگوں نے

الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○

انکار کیا ہے وہ یقیناً یقیناً کہیں گے (کہ) یہ (بات) صرف ایک دھوکہ ہے ۵۸

خراب ہو جاتی ہے۔ اور یا پھر مستورع کا ہی خیال رکھا گیا ہے اور جسم کی تربیت پر ہی سب زور دیدیا گیا ہے اور روح کو بھلا دیا گیا ہے۔ حالانکہ انسان کا اصل مقام روحانی ترقی کا مقام ہے۔ پس جو اصل مقصد ہے اس کا خیال نہ کر کے گویا پیدائش انسان کی غرض کو ہی باطل کر دیا گیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ انسانی عقل ان دونوں مقامات کا خیال رکھتے ہوئے صحیح غذا تجویز نہیں کر سکتی کیونکہ انسان کو قبر اور مابعد الموت کے حالات کا علم نہیں اور روحانی غذا کا تعلق اگلی دنیا کے ساتھ ہے۔ پس وہ اعمال اور افکار جو اگلے جہان میں کام آتے ہیں ان کو انسان خود اپنی عقل سے معلوم نہیں کر سکتا۔

ممکن نہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے روحانی قوتوں کے نشوونما کے لئے کوئی سامان پیدا نہ کرے۔

۵۸ حل لغات۔ الماء جسم رقیق مائع یشرب بہ۔ حیاۃ کل نام۔ ماء کے معنی پانی کے ہیں۔ جس پر نشوونما پانیوالی چیز کی زندگی کا مدار ہے۔ (اقرب)

ماء

عرشہ علی الماء کے معنی

سحر

السحر۔ کل ما لطف ماخذہ ودقّ۔ ہر وہ بات جس کی اصلیت ایک مخفی راز ہو۔ وقیل اخراج الباطل فی صورۃ الحق۔ جھوٹ کو سچ بنا کر دکھانا واطلاقہ علی مایفعلہ من الحیل حقیقۃ لغویۃ اور حیلوں اور چالاکیوں کے معنوں میں اس کا استعمال لغت کی رو سے اس کا اسکے حقیقی معنوں میں استعمال ہے۔ سحرہ عمل لہ السحر وخدعہ۔ سحرہ کے معنی ہیں اپنی چالاکی سے دوسرے کو دھوکا دیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے کہ دیکھو خدا تعالیٰ نے کس طرح تمہاری پیدائش اور ترقی کے لئے تدریجی سامان پیدا کئے ہیں۔ اور تدریجی طور پر ترقی دیتے دیتے آخر میں انسان کو پیدا کیا ہے۔ کیا اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا۔ کہ اس دنیا کی پیدائش میں اصل مقصود انسان ہی ہے۔ پھر سوچو کہ وہ اصل مقصود کیوں ہے۔ یقیناً اپنی روحانی قابلیتوں کی وجہ سے پھر کس طرح ممکن ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ان روحانی قابلیتوں کو نظر انداز کر دے اور ان کے نشوونما کے لئے کوئی سامان پیدا نہ کرے۔

کان عرشہ علی الماء۔ قرآن کریم میں متعدد جگہ یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ حیاۃ کا منبع ماء ہے۔ جیسے فرماتا ہے الم نخلقکم من ماء مھین (سورہ مرسلات ع ۱) فلینظر الانسان مم خلق۔ خلق من ماء دافق (سورہ طارق) وھو الذی خلق من الماء بشرا فجعلہ

لیبلوکم (سورۂ فرقان ع ۵) اولم یر الذین کفروا ان السمٰوٰت والارض کانتا رتقاً ففتقنٰھما وجعلنا من الماء کل شئ حی افلا یؤمنون (سورہ انبیاء ع ۲) غرض قرآن کریم نے متواتر بتایا ہے کہ حیاۃ کی پیدائش ماء سے ہے۔ پس کان عرشہ علی الماء میں اسی طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات کاملہ کا ظہور حیاۃ کے ذریعہ سے ہوا ہے۔ اور اس میں کیا شبہ ہے۔ کہ عرش یعنی صفات کاملہ کا ظہور انسان ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ جو حیاۃ کی آخری کڑی ہے۔ لیبلوکم ایکم احسن عملا بھی انہی معنوں کی تصدیق کرتا ہے۔ کیونکہ اصلی پانی پر اگر عرش رکھا ہوا ہو تو اس سے انسان کے اعمال کی آزمائش کس طرح ہو سکتی ہے ہاں جو معنی اوپر کئے گئے ہیں۔ اُن کے رو سے دونوں فقرے بالکل مطابق ہو جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے جاندار اشیاء سے اپنی صفات کاملہ کے ظہور کو وابستہ کر دیا ہے۔ اور اس طرح وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کونسا انسان ان صفات سے فائدہ اٹھا کر دوسرے بنی نوع انسان سے زیادہ ترقی کر جاتا ہے۔

لیبلوکم ایکم احسن عملا میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کو صفات الٰہیہ کا مظہر بننے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ کیونکہ کان عرشہ علی الماء کے بعد اس جملہ کے بیان کے یہی معنی ہو سکتے ہیں۔ کہ اس لئے ہم صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔ تاکہ تم اعلیٰ سے اعلےٰ عمل کرو۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صفات کا ظہور اسی لئے ہوتا ہے کہ انسان ان کی نقل کرے۔

کان عرشہ علی الماء میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ کہ جب ہماری حکومت تمہاری پیدائش کی تمام کڑیوں پر ہے۔ تو تم ہماری حکومت سے باہر کس طرح جا سکتے ہو۔

پانی سے مراد کلام الٰہی

دوسرے معنی کان عرشہ علی الماء کے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اپنی صفات کا ظہور کلام الٰہی سے وابستہ کیا ہوا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد جگہ کلام الٰہی کو پانی سے مشابہت دی ہے۔ پس ہو سکتا ہے کہ اس جگہ ماء سے مراد کلام الٰہی ہی ہو۔ اور یہ بتایا گیا ہو۔ کہ ہم نے کلام الٰہی سے اس لئے اپنی صفات کے ظہور کو وابستہ کیا ہے۔ تاکہ تم کو عمل کی طرف توجہ ہو۔ اگر روحانی ترقیات کے ساتھ جسمانی نعمتوں کے حصول کا سلسلہ بھی نہ لگا دیا جاتا۔ تو شائد کئی لوگ روحانی ترقیات سے محروم رہ جاتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ سنت مقرر کر دی ہے۔ کہ کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی (مجادلہ ع ۳) میں نے یہ بات اپنے پر فرض کر لی ہے کہ میں اور میرے رسول دنیا میں غالب ہو کر رہینگے۔ پس کلام الٰہی جنپر نازل ہوتا ہے انہیں اور ان کی امتوں کو دنیاوی غلبہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ تاکہ یہ ظاہر ہو کہ اس امت نے طاقت کے حصول کے بعد کلام الٰہی پر کس طرح عمل کیا۔

صفات الٰہیہ کے ظہور کی کلام الٰہی سے وابستگی کی وجہ

مسئلہ ارتقاء

اس آیت میں اسلامی ارتقاء یعنی ایوولیوشن تھیوری بھی بیان ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے پانی یعنی سلسلۂ حیاۃ پر اپنا عرش اس لئے رکھا تاکہ حیوانات میں قابلیتوں کا مقابلہ ہو اور آخر میں یہ امر ظاہر ہو جائے کہ ان میں سے کون اصل مقصود بننے کے قابل ہے۔ یعنی پیدائش حیاۃ کا اصل مقصد آخر میں ایک ایسے وجود کا پیدا کرنا تھا۔ جو حیاۃ کے اعلیٰ سے اعلیٰ جلوے دکھا سکتا ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ انسان کی پیدائش مختلف ادوار حیاۃ کے آخری دور میں ہوئی ہے۔ پس گو یا اسلام گو بندر یا کسی اور جانور سے ترقی کر کے انسان کی پیدائش تو تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن یہ ضرور تسلیم کرتا ہے۔ کہ حیاۃ کی ادنیٰ حالت سے ترقی کرتے کرتے آخر میں انسانی پیدائش کا دور آیا ہے۔ گو اس کی پیدائش شروع سے ہی ایسے

انسان کو مظہر صفات الٰہیہ بننے کیلئے پیدا کیا ہے۔

انسان اللہ تعالیٰ کی حکومت سے باہر کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ

اور یہ بھی قطعی امر ہے کہ اگر ہم اس عذاب کو (ایک اندازہ کی ہوئی) مدت تک ان سے پیچھے ہٹائے رکھیں تو وہ یقیناً یقیناً کہیں گے

مَا يَحْبِسُهٗ ۗ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَ

(کہ) کونسی بات اسے روک رہی ہے سنو جس وقت وہ ان پر آئے گا تو ان سے ہٹایا نہیں جائیگا اور

حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ۹-ع

جس (عذاب) پر وہ ہنسی کرتے تھے وہ انہیں گھیر لے گا ؎۵۹

رنگ میں چلائی گئی تھی کہ اس سے انسان ہی پیدا ہونا تھا۔

یہ طریق پیدائش بتا رہا ہے کہ انسان کے لئے موت کے بعد دوبارہ حیات مقدر ہے۔

ولئن قلت انکم مبعوثون من بعد الموت میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ طریق پیدائش ہی صاف ظاہر کرتا ہے۔ کہ انسان کو موت کے بعد پھر دوبارہ حیاۃ حاصل ہو۔ کیونکہ اس قدر وسیع عالم کا پیدا کرنا جس میں ایک بالارادہ ہستی یعنی انسان بس سکے صاف بتا رہا ہے۔ کہ اس کی حیاۃ کا کوئی خاص مقصد ہے۔ لیکن دوسری طرف اس دنیا کی زندگی کو دیکھا جائے۔ تو دار الابتلا نظر آتی ہے۔ اور آزمائش کی جگہ عارضی ہوتی ہے۔ جیسے امتحان کا کمرہ مستقل رہائش کے لئے نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ امتحان دینے کے وقت تک انسان اس میں ٹھہرتا ہے۔ پھر دار الابتلاء میں اخفاء کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ اور دار الجزاء میں اظہار کے پہلو کا غالب ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اب چونکہ اس دنیا میں اخفاء کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ حتی کہ بہت لوگ خود اللہ تعالیٰ کی ہستی تک کے بھی منکر ہیں۔ پس ان حالات سے صاف پتہ لگتا ہے۔ کہ اس دار الابتلاء سے نکال کر اسے دار الجزاء میں لے جانا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ یہ کیسی عجیب بات ہے۔ کہ اگر تو ان کو کہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو ترقی دیتے دیتے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور اسے پیدائش عالم کا مقصود بنایا ہے تو یہ اس امر کو مان لیتے ہیں (جیسے کہ دہریہ تک ایوولیوشن

الامۃ

حاق

لوگ دنیا کے عذابوں کے متعلق دھوکے میں ہیں

مجبوری کو مانتے ہیں)۔ لیکن جب تو اس کا عقلی نتیجہ ان کے سامنے پیش کرے۔ کہ تب تو انسانی حیاۃ کا دور اس دنیا میں ختم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ضرور ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کے لئے ایک زندگی کو تسلیم کیا جائے۔ تو اس کا وہ انکار کر دیتے ہیں۔

؎۵۹ **حل لغات**۔ الامۃ۔ الجماعۃ۔ جماعت گروہ۔ الجیل من کل حیّ۔ قوم۔ بڑا گروہ۔ الطریقۃ طریقہ۔ الدین۔ مذہب۔ الحین۔ وقت۔ زمانہ عرصہ۔ (اقرب) حاق بہ یحیق حیقا وحیوقا وحیقانا۔ احاط بہ اس کا احاطہ کر لیا۔ حاق بہم الامر۔ لزمہم ووجب علیہم۔ بات ان کے لازم حال ہو گئی۔ اور ان سے چمٹ گئی۔ حاق بہم العذاب۔ نزل و احاط۔ عذاب نازل ہو گیا اور اس نے ان کا احاطہ کر لیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرمایا یہ لوگ جس طرح بعد الموت کے متعلق دھوکہ میں ہیں۔ اسی طرح دنیا کے عذابوں کے متعلق بھی دھوکہ خوردہ ہیں۔ اور اگر عذاب میں تاخیر ہو جائے تو اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ سوچتے تو یہ بات ظاہر تھی کہ دار الابتلاء تو لازماً ڈھیل کو چاہتا ہے۔ اگر ڈھیل نہ ہو۔ تو پھر یہ دنیا دار الجزا ہو جائے۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ

اور اگر ہم انسان کو اپنی طرف سے (کسی قسم کی) رحمت (کا مزا) چکھائیں (اور) پھر اسے اس سے چھین لیں تو وہ یقیناً یقیناً (اور پھر)

لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ ۱۰

یقیناً نہایت نا امید (اور) نہایت ناسپاس بن جاتا ہے اور اگر ہم کسی مصیبت کے بعد جو اسے پہنچی ہو اسے (کسی بڑی) نعمت (کا مزا) چکھائیں تو وہ

لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ ۱۱

یقیناً یقیناً (اور پھر یقیناً) کہنے لگتا ہے کہ (اب میری) تمام تکلیفیں مجھ سے دور ہو گئی ہیں یقیناً یقیناً وہ بہت ہی اترانے والا (اور) بہت ہی فخر کرنے والا ہے ؎۱

عجیب بات ہے کہ دنیا کے لوگ ایک طرف تو دارالجزاء سے انکار کرتے ہیں اور دوسری طرف انبیاء کے مقابلہ میں قطعی عذاب کا بھی مطالبہ کرتے ہیں اور اس طرح خود ہی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ایک دارالجزاء کا ہونا ضروری ہے

وحاق بھم ماکانوا بہ یستھزءون سے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ عذاب کے مطالبہ سے مراد ان کی فی الواقع عذاب کا طلب کرنا نہیں ۔ بلکہ ہنسی کرنا مقصود ہے۔ ان کی یہ ہنسی انہیں پر الٹ کر پڑے گی اور عذاب کو فی الواقع قریب کر دے گی ۔

؎۱ حل لغات ۔ یؤس ۔ یَئِسَ سے صیغہ مبالغہ اسم فاعل کا ہے ۔ اور اس کے معنی ہیں قنط ۔ نہایت درجہ کا مایوس (اقرب) کفور بھی صیغہ مبالغہ اسم فاعل ہے ۔ اور اس کے معنی ہیں نہایت ناشکر گزار ۔ چنانچہ اس پر ہا، تانیث نہیں آ سکتی اور اس کی مصدر کفور یا کفران ہے ۔ کفر النعمۃ ۔ جحدھا وسترھا ۔ وھو ضد الشکر ناسپاسی کی ۔ ناشکری کی محسن کے احسان کا انکار کیا ۔ اور اسے چھپایا (اقرب) النعماء ۔ الید البیضاء الصالحۃ الضراء ۔ الزمانۃ ۔ اپاہج ہونا ۔ یا ہو جانا ۔ قویٰ کا معطل ہو جانا ۔ آفت ۔ الشدۃ سختی ۔ مصیبت تکلیف ۔ دکھ ۔ النقص فی الاموال والانفس ۔ مالی اور جانی نقصان ۔ نقیض السراء ۔ خوشی کا عکس یعنی غم و اندوہ کی حالت ۔ (اقرب)

السیئۃ نقیض الحسنۃ ۔ سیئہ حسنہ کی نقیض ہے (اقرب) والحسنۃ یعبر بھا عن کل ما یسر من نعمۃ تنال الانسان فی نفسہ و بدنہ واحوالہ ۔ والسیئۃ تضادھا (مفردات) حسنہ ہر ایک خوش کن نعمت کو کہتے ہیں ۔ خواہ جان کے متعلق ہو یا جسم یا دیگر حالات کے متعلق ۔ اور سیئہ کا لفظ اس کی ضد ہے ۔ فرح بھی صیغہ مبالغہ اسم فاعل کا ہے ۔ اور اس کا فعل فَرِحَ ہے ۔ فرح الرجل ۔ انشرح صدرہ بلذۃ عاجلۃ ۔ کسی وقتی لذت کی وجہ سے بہت ہی خوش ہوا ۔ بطر ۔ اترایا ۔ غرور میں آ گیا ۔ (اقرب) پس فرح کے معنی ہوئے کسی وقتی لذت کی وجہ سے حد سے زیادہ خوش ہونے والا یا اترانے والا ۔ فخور بھی صیغہ مبالغہ اسم فاعل کا ہے ۔ اور فخر سے نکلا ہے ۔ فخر تمدح بالخصال وباھی بالمناقب والمکارم من حسب ونسب وغیر ذلک ۔ اما فیہ او فی آبائہ اس کے معنی ہیں اپنی طرف فضائل منسوب کر کے ان پر فخر اور ناز کیا ۔ اور اپنے منہ سے اپنی بڑائی بیان کی (اقرب) ۔ پس فخور کے معنی ہوئے اپنے فضائل و مناقب

دارالجزاء کے وجود کا اقرار مخالفین کے منہ سے

مطالبہ عذاب سے کفار کا مقصود ہنسی ہے ۔

السیئۃ

فرح

یئس

کفور

فخور

النعماء

ضراء

إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ أُولٰٓئِكَ لَهُم

سوائے ان لوگوں کے جو صبر (اختیار) کریں اور نیک و مناسب حال اعمال کریں یہ وہ (لوگ) ہیں جن کیلئے

۱۲ مَّغْفِرَةٌ وَّأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا

بخشش اور (بہت) بڑا اجر (مقدر) ہے سلا پس (اب بزعم کفار) شاید تو اس (کلام) کا جو تجھ پر وحی کیا جاتا ہے

يُوحٰىٓ إِلَيْكَ وَضَآئِقٌ بِهٖ صَدْرُكَ أَن يَقُولُوا

کچھ حصہ (لوگوں کو پہنچانے کی بجائے) چھوڑ دینے والا ہے اور تیرا سینہ اس (کلام الٰہی) سے اس بنا پر تنگ ہو رہا ہو کہ وہ کہتے ہیں

خوشی کے ایام کا اثر سکھ کے ایام سے دور جا پڑنے والے لوگوں پر

کا اظہار کرکے ان پر بہت ہی فخر اور ناز کرنے والا۔
تفسیر ۔ یہ دونوں غلط نقطہ نگاہ اس قوم کے افراد کے ہو جاتے ہیں۔ جو الہام الٰہی سے دور جا پڑتی ہے۔ اور ایسا شخص باوجود اس بات کے دیکھنے کے کہ دنیا کے حالات ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالتا کہ کسی خاص حالت کے ماتحت یہ تبدیلی ہوئی ہوگی بلکہ جو حالت بھی پیدا ہو جاتی ہے اسکو اپنے نفس پر غالب آنے دیتا ہے۔ اگر تکلیف پہنچے تو نا امیدی کو اپنے اوپر غالب آنے دیتا ہے۔ اگر خوشی ہو تو غرور کو۔ اس کی یہی وجہ ہے۔ کہ اس نے ازلی قانون کو نہیں سمجھا۔ یعنی یہ کہ یہ دنیا دار الابتلا ہے۔ اور خدا تعالیٰ انسانی دماغ کی دونوں حالتوں کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ اور دیکھتا ہے۔ کہ اس پر خوشی کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اور غمی کا کیا۔ اور ان دونوں حالتوں میں سے گذار کر اس کی روحانی حالت کو کمال تک پہنچانا چاہتا ہے۔ لیکن ایسا شخص چونکہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتا۔ اس لئے اس پر جو حالت بھی آئے بجائے اس سے سبق حاصل کرنے کے وہ اس کو اپنے اوپر غالب آنے دیتا ہے ✦

مومنین کے اعمال کی جزا

خوشی اور اندوہ کا اثر مومنوں پر

سلا یعنی مومنوں کی حالت اوپر کی حالت کے خلاف ہوتی ہے۔ وہ غم اور خوشی کو اپنے نفس پر غالب نہیں آنے دیتے۔ بلکہ غم اور خوشی کو خود اپنے تابع رکھتے ہیں۔ جب غم آتا ہے۔ تو بجائے گھبرانے اور مایوس ہونے کے صبر سے کام لیتے ہیں اور بہادری سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور مخالف اسباب کو دور کرنے کے لئے ہمت سے کوشش کرتے ہیں۔ اور جب خوشی کے ایام آتے ہیں۔ تو بجائے فخر کرنے اور اترانے کے وہ ان نعمتوں کے ذریعہ سے جو ان کو ملتی ہیں نیکی اور تقویٰ میں اور بھی ترقی کر جاتے ہیں۔ اور نیک اعمال کے ذریعہ سے ان نعمتوں سے دوسرے لوگوں کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں۔
لھم مغفرۃ واجر کبیر میں مومن کی صحیح جزا بتائی ہے۔ چونکہ مومن تکالیف پر صبر سے کام لیتا ہے۔ اور تکالیف غلطیوں یا بشری کمزوریوں کے نتیجہ میں پہنچتی ہیں۔ اس لئے اس کے صبر کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ غلطیوں کو معاف کرتا یا اس کی بشری کمزوریوں پر پردہ ڈالتا ہے۔ اور چونکہ مومن نعمت کے حصول پر اتراتا نہیں۔ بلکہ ان نعمتوں کو نیکی میں ترقی کرنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اسے اجر کبیر دے کر اپنے فضلوں میں زیادتی کرتا ہے ✦

لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ

لوگ کہیں اس پر کوئی خزانہ نہیں اتارا گیا یا اُس کے ساتھ کوئی فرشتہ آیا (حالانکہ) تو صرف

نَذِيۡرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ وَّكِيۡلٌ ۝ ۱۳

(ہوشیار اور آگاہ کرنیوالا ہے اور اللہ (تعالیٰ) ہر بات کا کارساز ہے ۱۲ع)

۱۳ع حل لغات لَعَلَّ طمع وَاِشفاق کے لئے

طمع اور خوف ہر دو کے لئے آتا ہے۔ ولعل وان کان طمعا فان ذلک یقتضی فی کلامھم۔ تارۃ طمع المخاطَب وتارۃ طمع المخاطِب وتارۃ طمع غیرھما فقولہ تعالیٰ فیما ذکر من قوم فرعون لعلنا نتبع السحرۃ فذلک طمع منھم وقولہ فی فرعون لعلہ یتذکر او یخشیٰ فاطماع موسیٰ مع ھارون ومعناہ فقولا لہ قولا لینا راجیین ان یتذکر او یخشیٰ و قولہ تعالیٰ فلعلک تارک بعض ما یوحیٰ الیک ای یظن بک الناس ذٰلک۔ اور جب یہ لفظ طمع کے معنوں میں ہو تو عربی زبان کے محاورہ میں اس کے کئی مفہوم ہوتے ہیں۔ کبھی اس سے مخاطب کے دل کی طمع کا اظہار یا اس کے دل میں طمع کا پیدا کرنا مراد ہوتا ہے۔ کبھی مخاطِب یعنی بولنے والے کی طرف سے طمع مراد ہوتی ہے۔ اور کبھی ان دونوں کے سوا دوسروں کی طمع کا ذکر ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں جو فرعون کی قوم کا قول آتا ہے۔ کہ لعلنا نتبع السحرۃ۔ اس میں فرعون کی قوم نے اپنی طمع کا اظہار کیا ہے۔ کہ کیا اچھا ہو کہ یہ جیت جائیں۔ اور ہم ان کی اتباع کریں اور جو خدا تعالیٰ کا یہ قول فرعون کے بارہ میں آتا ہے۔ کہ لعلہ یتذکر او یخشیٰ۔ اس میں موسیٰ اور ہارون کو جو مخاطب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے طمع دلائی ہے۔ کہ شائد فرعون ہدایت پا جائے۔ اور یہ جو آیت ہے۔ لعلک تارک بعض ما یوحیٰ الیک۔ اس میں دوسروں کی طمع کا ذکر ہے۔ کہ دوسرے لوگ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ شائد تو ان کے اعتراضوں سے ڈر کر خدا کے کلام کے بعض حصوں کو چھپا دے۔ (مفردات)

کنز — الکنز ما یدخر۔ جس مال کو انسان جمع کرے۔ المال المدفون فی الارض۔ زمین میں گاڑا ہوا مال۔ اسم للمال اذا احرز فی وعاء۔ جب مال کسی حفاظت کی چیز میں رکھا ہوا ہو۔ تو اسے بھی کنز کہتے ہیں۔ الذھب سونا۔ الفضۃ۔ چاندی ما یحرز فیہ المال۔ جس چیز میں مال کو محفوظ کر کے رکھا جائے یعنی مخزن (اقرب)

تفسیر۔ قرآن کریم کا یہ طریق ہے۔ کہ بعض جگہ سوال کا ذکر چھوڑ دیتا ہے۔ صرف جواب دیدیتا ہے۔ اور اسی سے سوال سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس آیت میں بھی ایسا ہی کیا گیا ہے۔ گو جس سوال کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے اسے علیحدہ بیان نہیں کیا گیا۔ لیکن آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ لھم مغفرۃ واجر کبیر کا وعدہ سنکر کفار نے اعتراض کیا کہ مومنوں کو تو مغفرۃ اور اجر کبیر تب ملے گا۔ پہلے تم جو سلسلہ کے بانی ہو۔ اپنا حال تو دیکھو کہ نہ تمہارے پاس خزانہ ہے اور نہ کمزوریوں کو دور کرنے کے ظاہری مظہر فرشتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تعریضاً فرماتا ہے۔ کہ ادھر تو یہ بڑا بھاری اعتراض انہوں نے کیا ہے اس کے خوف کے مارے تو اب تو ضرور کلام الٰہی کا کچھ حصہ یعنی جس میں اسلام کی ترقیات کی پیشگوئیاں ہیں چھپا ڈالیگا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ ایسا کبھی نہیں

فلعلک تارک کی تعریض کے طور پر فرمایا ہے۔

ہو سکتا۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ اس جگہ لَعَلَّ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہ دشمن یہ طمع رکھتا ہے۔ کہ اس کے ان اعتراضوں سے ڈر کر تو کلام الٰہی کو چھپانے لگے حالانکہ اس کی یہ طمع باطل ہے۔ کیونکہ تو تو فقط نذیر ہے۔ یعنی پیغامبر اور پیغامبر کا کام تو دیانتداری سے پیغام پہنچانا ہوتا ہے۔ اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ بعض حصہ کلام کو چھپالے۔ اور بعض کو ظاہر کر دے پھر تیرا دعوےٰ خدائی کا نہیں ہے کہ دنیا کے خزانے تیرے قبضہ میں ہوں۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ جن مومنوں کا ذکر کیا ہے کہ ان کو اجر کبیر ملے گا وہ بھی تو انسان ہی ہونگے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ وہ تو ایک خاص وقت تک صبر کرنے کے بعد کی حالت کا ذکر ہے نہ کہ شروع سے ہی ایسا وعدہ تھا۔ سو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقیات کے ظاہری مظاہر کا مطالبہ بھی کفار تبھی کر سکتے تھے۔ جب کہ وقت مقررہ آتا۔ نہ کہ شروع سے ہی۔ شروع سے طاقت کا ساتھ ہوتا تو ذاتی اقتدار پر دلالت کرتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے نہ کہ بندہ کو۔

ملا آنحضرت قرآن کریم کے کسی حصہ کو چھوڑنے والے نہیں تھے۔

ملا اس آیت میں کفار کی طمع کا ذکر ہے۔

واللہ علی کل شیء وکیل سے یہ بتایا ہے کہ آخر یہ سب کچھ ہو کر رہے گا۔ تجھے مغفرت بھی ملے گی اور اجر کبیر بھی۔ خدا تعالیٰ کے فرشتے آئینگے جو تیرے کام کو پورا کریں گے اور اجر کبیر بھی ملے گا۔ تیرا تو کیا ذکر ہے تیرے غلام بھی بادشاہ ہوں گے۔ ہر اک غیر متعصب انسان دیکھ سکتا ہے کہ یہ دونوں باتیں پوری ہوئیں یا نہیں۔ اسلام کی ترقیات کے راستہ سے سب روکیں ملائکہ نے دور کر دیں یا نہیں۔ اور اس طرح مغفرۃ کامل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوئی یا نہیں۔ اسی طرح کیا آپ کو اور آپ کے خدام کو جو دیر تک دنیا کے عذابوں پر صبر سے کام لیتے رہے تھے۔ آخر اجر کبیر مل کر رہا کہ نہیں۔ افسوس

ملا یہ وعدے پورے ہوکر رہیں گے۔

ہے کہ اسلام کے دشمن اس آیت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کے اعتراضوں سے ڈر کر بعض حصہ قرآن کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ حالانکہ سیاق وسباق اس آیت کا ان معنوں کو رد کر رہا ہے۔ کیا کوئی عقلمند بھی خیال کر سکتا ہے۔ کہ فرشتوں یا خزانہ کا مطالبہ کوئی ایسا اعتراض تھا۔ کہ اس سے ڈر کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کلام الٰہی کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتے اور کیا انما انت نذیر واللہ علی کل شیء وکیل دو ایسی باتیں ہیں کہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر سے اوجھل تھیں یا یہ وہ باتیں ہیں جو دشمنان اسلام کی نظر سے اوجھل تھیں۔ اگر صرف کفار کی نظر سے یہ امور اوجھل تھے۔ تو انہی کی طمع کا اس آیت میں ذکر ہے نہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طمع کا۔ کیا معترضین یہ بھی خیال نہیں کرتے۔ کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قریش نے خاص وفد کے ذریعہ سے یہ درخواست کی کہ یا تو آپ اُن سے سمجھوتا کریں۔ یا پھر وہ آپ کو اور آپ کے رشتہ داروں کو پیس ڈالیں گے تو اس وقت آپ نے یہ جواب دیا کہ اگر سورج کو میرے دائیں اور چاند کو بائیں لا کر کھڑا کر دو۔ تب بھی میں خدا تعالیٰ کی تعلیم کو نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر کیا ان دو لغو اعتراضوں سے آپ ایسے متاثر ہو سکتے تھے کہ کلام الٰہی کو چھپانے کے لئے تیار ہو جاتے۔

اگر اس سے اگلی آیت پر غور کیا جائے۔ تو وہ بھی اسی بیہودہ خیال کی تردید کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں ساری دنیا کو چیلنج دیا گیا ہے۔ کہ قرآن کریم کی کسی دس سورتوں کی مثل لے آؤ۔ اگر آپ کے دل میں شک ہوتا۔ تو کیا اس کے ذکر کے ساتھ ہی یہ چیلنج دیا جا سکتا تھا۔ یہ چیلنج تو بتاتا ہے کہ آپ کے دل میں قرآن کریم کی صداقت کا یقین پہاڑ سے بڑھ کر راسخ تھا۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ

کیا وہ کہتے ہیں (کہ) اس نے اس (کتاب) کو اپنے پاس سے گھڑ لیا ہے۔ تو (انہیں) کہ اگر تم (اس بیان میں) سچے

مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

ہو تو اس جیسی دس سورتیں اپنے پاس سے گھڑی ہوئی (بنا) لاؤ اور اللہ (تعالیٰ) کے سوا

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ ۱۴

جس (کو) بھی اپنی مدد کے لئے لانے) کی تمہیں طاقت ہو اسے بلا لو ۱۳ھ

۱۳ھ - اس آیت سے میرے اُن معنوں کی جو پہلی آیت میں ہینے کئے تھے۔ تصدیق ہوگئی۔ گذشتہ آیت میں ان کے اس اعتراض کے کہ اب یہ ہمارے اعتراضوں سے ڈر کر قرآن کریم کے بعض حصوں کو ضرور چھوڑ دے گا۔ دو جواب دئے گئے تھے۔ اول یہ کہ تو تو نذیر ہے۔ تو نے خدائی کا دعویٰ تو کیا ہی نہیں۔ کہ یہ چیزیں ساتھ لانا بھی تیرا کام ہو۔ دوم یہ کہ تو تو پیغامبر ہے۔ جو پیغام تجھے ملے گا۔ تو اس کے ظاہر کرنے پر مجبور ہے۔ اس جواب پر کفار کی طرف سے یہ اعتراض ہو سکتا تھا۔ کہ یہ تو صرف تمہارا دعوےٰ ہے۔ کہ تم خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو۔ ہمارا خیال تو یہی ہے۔ کہ جب تمہارے ساتھ کوئی خاص طاقت نہیں تو تم مفتری ہو۔ سو اس اعتراض کا جواب اس آیت میں دیا کہ گو ظاہری خزانے ابھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں ہیں۔ مگر باطنی خزانہ موجود ہے۔ اور خزانہ بھی وہ جس کے برابر ایک انسان تو کیا سب دنیا کے پاس مجموعی طور پر بھی دولت نہیں ہے۔ اور وہ قرآن کریم ہے پس اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ ہمارا رسول مفتری ہے۔ اور اس کے لائے ہوئے کلام کے بعض حصے ناقص ہیں اور بدلنے کے قابل ہیں۔ تو سارے قرآن کریم کے برابر نہیں۔ صرف دس سورتوں کے برابر کوئی کلام پیش کر دو۔ جو اس کے ان حصوں کی مثل ہو جن کو تم بدلنے کے قابل سمجھتے ہو اور اگر ایسے حصوں کی مثل بھی پیش نہ کر سکو۔ جو تمہارے نزدیک ناقص ہیں اور بدلنے کے قابل ہیں۔ تو تم کو تسلیم کرنا ہوگا۔ کہ اس کے پاس وہ خزانہ ہے۔ جس کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی وقت بھی حقیقی خزانہ سے تہیدست نہیں ہوئے

فأتوا بعشر سور مثله مفتريات ۔ سورۂ یونس میں بتایا جا چکا ہے۔ کہ یہ مضمون کئی جگہ آیا ہے۔ اوّل سورۂ بقرہ ۲۴ کی آیت وان كنتم فی ريب مما نزلنا على عبدنا فأتوا بسورة من مثله وادعوا شهداءكم من دون الله ان كنتم صدقين ہے دوم سورۂ یونس میں فرمایا ہے۔ ام يقولون افتراه قل فأتوا بسورة مثله وادعوا من استطعتم من دون الله ان كنتم صدقين ۔ یونس ع ۴۔ سوم یہ زیر تفسیر آیت ہے۔ کہ أم يقولون افتراه قل فأتوا بعشر سور مثله مفتريات وادعوا من استطعتم من دون الله ان كنتم صدقين چہارم سورۂ بنی اسرائیل ۱۰۶ میں آتا ہے۔ قل لئن اجتمعت الانس والجن على ان يأتوا بمثل هذا القرآن لا يأتون بمثله ولو كان بعضهم لبعض

آیات تحدّی وسعاتیہ

ظهيرا۔ پنجم سورہ طور ع ۲ میں آیا ہے ام یقولون تقوله بل لا یؤمنون۔ فلیاتوا بحدیث مثله ان کانوا صادقین۔

ان مطالبات میں مقدار مطلوب کے اختلاف کی وجہ

ان پانچ جگہوں میں سے دو جگہ پر تو ایک ہی قسم کا مطالبہ ہے۔ باقی تین جگہ میں علیحدہ علیحدہ مطالبے کئے گئے ہیں۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں سارے قرآن کریم کی مثل کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اور فرمایا ہے۔ کہ اگر سارے جن وانس بھی اکٹھے ہو جائیں تو قرآن کریم کی مثل نہیں لاسکینگے۔ یہاں سورۂ ہود میں دس سورتوں کے متعلق فرمایا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو دس سورتیں اپنے پاس سے بناکر خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرکے شائع کرو۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ یونس میں ایک سورۃ کا مطالبہ ہے۔ اور سورۂ طور میں ایک سورۃ کی بھی شرط نہیں ہے۔ خواہ وہ ایک بات ہی بناکر لے آئیں۔ اب بظاہر یہ بات عجیب نظر آتی ہے

اس تحدی والی سورتوں کے زمانہ نزول کا مختلف ہونا ثابت نہیں۔

کہ کہیں سارے قرآن کا مطالبہ ہے کہیں دس سورتوں کا ہے اور کہیں ایک سورۃ کا۔ اور کہیں ایک ہی بات پر اکتفار کی گئی ہے۔ اور طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ فرق کیوں ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا ہے۔ کہ ترتیب نزول کے لحاظ سے ایسا ہوا ہے۔ پہلے سارے قرآن کی مثل کا مطالبہ کیا۔ جب وہ نہ لاسکے تو دس سورتوں کا مطالبہ کیا جب وہ بھی نہ لاسکے تو پھر فرمایا ایک سورۃ ہی لے آؤ۔ جب وہ بھی نہ لاسکے تو پھر فرمایا کہ کچھ ہی لے آؤ۔ خواہ ایک بات ہی ہو۔ میرے نزدیک اس میں کچھ اشتباہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان سورتوں میں سے کہ جن میں اس مضمون کا ذکر آیا ہے نزول کے لحاظ

اس اختلاف کا ترتیب نزول پر مبنی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

سے سب سے پہلے سورہ طور ہے اور اس میں قرآن کریم کی بجائے بحدیث مثله ہے۔ یعنی اس جیسا کوئی کلام لے آؤ۔ اور شرط ایک سورۃ کی بھی نہیں رکھی گئی۔ خواہ وہ کلام ایک سورۃ سے بھی کم ہو۔ پس عقلاً یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کہ سورہ طور میں تو پہلے بغیر مقدار مقرر کرنے کے مثل کا مطالبہ کیا گیا ہو۔ اور اس کے بعد سورۂ بنی اسرائیل میں پورے قرآن کا مطالبہ کیا گیا ہو اور بعد میں اس مطالبہ کو گراکر دس سورتوں میں اور پھر دس سورتوں سے گراکر ایک سورۃ میں محصور کر دیا گیا ہو۔

دوسرے یہ کہ یہ کوئی واقعہ تو ہے نہیں کہ ہم اس سے عبرت پکڑیں۔ بلکہ ایک چیلنج ہے۔ جو ہم نے دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اب ہم دنیا کے سامنے کیا پیش کریں۔ آیا یہ کہ سارا قرآن لاؤ یا یہ کہ دس سورتیں لاؤ۔ یا ایک سورۃ یا ایک بات لاؤ۔ اگر ایک آیت کا مطالبہ کافی ہے۔ تو ایک سورۃ کا مطالبہ کیوں کریں۔ اور اگر ایک سورۃ کا لانا کافی ہو سکتا ہے تو دس سورتوں کا مطالبہ کیوں کریں اور اگر دس سورتوں کا لے آنا کافی ہے۔ تو سارے قرآن کی مثل لانے کے لئے کیوں کہیں۔

میرا اپنا یہ خیال ہے کہ اس میں ترتیب نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اول تو ان میں سے بعض سورتیں ایسے قریب قریب کے زمانہ کی نازل شدہ ہیں کہ ان کی صحیح ترتیب کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔ دوسرے قرآن کریم کی تنزیل اس طرح نہیں ہوئی کہ ایک وقت میں ایک ہی سورۃ نازل ہوئی ہو بلکہ قریب قریب نازل ہونے والی سورتیں بعض دفعہ ایک ہی وقت میں تین تین چار چار نازل ہوتی جاتی تھیں اور ان میں سے ایک کو پہلی کہنا اور دوسری کو بعد کی کہنا اس لحاظ سے تو گو درست ہو کہ ایک کی آخری آیت پہلے اور دوسری کی آخری آیت پیچھے نازل ہوئی ہو۔ لیکن ایک کی سب آیتوں کے متعلق کہنا کہ یہ پہلے نازل ہوئی ہیں اور دوسری کی سب آیتوں کے متعلق یہ کہنا کہ یہ پیچھے نازل ہوئی ہیں درست نہیں ہو سکتا۔ پس میرے نزدیک ان آیتوں میں ایسے مطالبات بھی ہیں جو ترتیب نزول کے حل کرنے کے محتاج نہیں ہیں اور سب کے سب ایک ہی وقت میں آج بھی

اسی طرح پیش کئے جاسکتے ہیں۔جس طرح کہ زمانۂ نزول میں پیش کئے جاسکتے تھے۔

پیشتر اس کے کہ میں ان مختلف تحدیوں کی تشریح کروں۔جو ان آیات میں مذکور ہیں۔میں اس عجیب بات کی طرف بھی توجہ پھرانی چاہتا ہوں۔کہ یہ چیلنج جس جس جگہ آئے ہیں۔ان کے ساتھ ہی مال ودولت اور طاقت وقدرت کا بھی ذکر آیا ہے سوائے سورۂ بقرہ کے اور اس کی وجہ یہ ہے۔کہ اس میں کوئی نیا چیلنج نہیں ہے۔بلکہ سورۂ یونس کے چیلنج کو سورہ بقرہ کے مضامین کی ضرورت کے لحاظ سے دہرایا گیا ہے (سورہ یونس مکی ہے اور سورہ بقرہ مدنی ہے۔) اس لئے اس میں اس ذکر کو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا گیا ہے۔اس کے سوا باقی سب سورتوں کو دیکھو سب میں مال ودولت یا طاقت وقدرت کا ذکر ہے۔

سورۂ یونس میں اس مطالبے سے چند آیات پہلے آیا ہے قل من یرزقکم من السمآء والارض امن یملک السمع والابصار ومن یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی ومن یدبر الامر فسیقولون اللّٰہ فقل افلا تتقون ۝ گویا دعویٰ کیا ہے کہ سب خزانے اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔خواہ وہ رزق کے ہوں یا قوائے طبعیہ کے یا قوائے عملیہ کے ہوں یا مختلف قوتوں کو ایک نظام میں لانے کے متعلق ہوں۔اور پھر اس کے بعد فرمایا۔قل ھل من شرکآئکم من یبدء الخلق ثم یعیدہ۔ قل اللّٰہ یبدء الخلق ثم یعیدہ فانی تؤفکون قل ھل من شرکائکم من یھدی الی الحق قل اللّٰہ یھدی للحق۔افمن یھدی الی الحق احق ان یتبع امن لا یھدی الا ان یھدی فما لکم کیف تحکمون۔اس میں بھی طاقت وقوت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔پھر سورۂ طور میں تحدی کے بعد فرماتا ہے۔ امر خلقوا من غیر شیئ ام ھم الخالقون۔ام خلقوا السمٰوٰت والارض بل لا یوقنون۔ام عندھم خزآئن ربک ام ھم المصیطرون۔یہاں پر بھی دولت اور حکومت اور طاقت وقدرت کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس تحدی کے ساتھ اکثر جگہ مال ودولت اور طاقت کا بھی ذکر آیا ہے۔

سورۂ ہود کی زیر تفسیر آیت سے پہلے بھی لولا انزل علیہ کنز او جاء معہ ملک آیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں تحدی کے بعد آیا ہے۔ وقالوا لن نؤمن لک حتی تفجر لنا من الارض ینبوعا او تکون لک جنۃ من نخیل وعنب فتفجر الانھار خلٰلھا تفجیرا او تسقط السمآء کما زعمت علینا کسفا او تأتی باللّٰہ والملٰئکۃ قبیلا۔ او یکون لک بیت من زخرف او ترقٰی فی السمآء اس جگہ بھی مال ودولت اور طاقت وقوت کا ہی ذکر ہے۔غرض چاروں جگہ پر ایک ہی قسم کا مطالبہ بیان ہوا ہے یا مطالبہ کا ذکر نہیں۔لیکن مطالبہ کا جواب دیا گیا ہے۔پس معلوم ہوتا ہے۔کہ خزانوں کے سوال اور مطالبۂ مثل میں کوئی گہرا تعلق ہے۔اور وہ یہی تعلق ہے۔کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو خزانہ قرار دیا ہے اور مخالفین کے خزانہ کے مطالبہ کا یہ جواب دیا ہے۔کہ اس کا اصل خزانہ قرآن کریم ہے۔اور لولا انزل علیہ ملک کا بھی یہی جواب دیا ہے کہ ملائکہ ظاہری مقابلوں کے لئے نہیں اترتے۔بلکہ کلام الٰہی لیکر اترا کرتے ہیں۔اور وہ اس پر نازل ہو چکا ہے۔پس یہ کہنا کہ اس پر ملک نہیں اترا یا یہ کہ اترنا چاہئے۔بے معنی قول ہے۔اور ایسی چیز کا مطالبہ ہے جو پہلے سے حاصل ہے۔پھر چونکہ ملائکہ کا اترنا یا روحانی خزانہ کا حصول بظاہر ایک دعوے معلوم ہوتا ہے۔جس کا ثبوت نہیں اس کے لئے خود قرآن کریم کے بےمثل ہونے کو پیش کیا ہے کہ یہ اپنی صداقت کی آپ دلیل ہے۔اور اس کے اندر ایسے دلائل موجود ہیں جو اسے ایک لاثانی خزانہ اور منجانب اللہ کلام ثابت کرتے ہیں۔اور یہ جو فرق کیا ہے کہ جس جگہ زیادہ کلام کا مطالبہ

ان تحدیوں میں مطالبہ خزائن کے جواب میں قرآن کریم کو بطور خزانہ پیش کیا گیا ہے۔

ہے۔ اس جگہ کفار کی طرف سے خزانوں یا ملک کا مطالبہ ہو اور جس جگہ تھوڑے کلام کی مثل کا مطالبہ ہے۔ اس جگہ خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ سوال کیا گیا ہے۔ کہ کیا یہ کفار خزانوں کے مالک اور قانون قدرت کے متولی ہیں۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ جن مقامات پر پورے قرآن یا دس سورتوں کا مطالبہ ہے۔ اس جگہ سوال ایسا ہے۔ جو کفار کے ذہن میں آسکتا تھا۔ اور موٹا تھا۔ پس ان کے سوال کو پیش کرکے اس کا جواب دیدیا گیا ہے۔ لیکن بعض پہلو قرآن کریم کے بے مثل ہونے کے ایسے رہ جاتے ہیں۔ جن کے متعلق سوال کرنے کا بھی کفار کو خیال نہیں آسکتا تھا۔ اگر ان کا بیان کرنا بھی کفار کے سوالات پر منحصر رکھا جاتا۔ تو وہ پہلو پوشیدہ ہی رہتے۔ اس لئے ان پہلوؤں کو قرآن کریم نے خود سوال پیدا کرکے بتا دیا۔ اور اس طرح قرآن کریم کی تکمیل کے سب پہلوؤں کو روشن کر دیا۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

قرآن کریم کی چار صفات

ان تمام تحدیوں پر تفصیلی نظر

اب میں تفصیل کے ساتھ ایک ایک مطالبہ کو الگ الگ لیکر بتاتا ہوں کہ کس طرح ان آیات میں قرآن کریم کی مختلف خوبیوں کے مقابلہ کی دعوت دی گئی ہے اور ہر جگہ کے مناسب حال زیادہ یا کم کلام کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل والی تحدی

سب سے بڑا مطالبہ سارے قرآن کی مثل لانے کا ہے۔ اور یہ سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ اس مطالبہ میں یہ شرط نہیں رکھی گئی کہ جس کلام کو منکر پیش کریں اسے خدا تعالیٰ کی طرف بھی منسوب کریں بلکہ جائز ہے کہ ان کا پیش کردہ کلام مفتریات میں سے نہ ہو۔ اور ان کا صرف یہ دعویٰ ہو کہ گو ہم نے یہ کلام خود بنایا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے۔ لیکن یہ کلام قرآن کریم کی مثل یا اس سے بڑھکر ہے۔ چونکہ مثل کی حد بندی بھی ضروری تھی کہ وہ کلام کس امر میں مثل ہو اس لئے اس کی تشریح بھی خود کردی اور فرمایا۔ کہ ولقد صرفنا للناس فی ھٰذا القراٰن من کل مثل فابیٰ اکثر الناس الا کفورًا[۱۲]

مطالبہ کی بجائے صورت کے پیشگوئی کی صورت میں تحدی

اس کلام میں ہر پہلو سے لوگوں کے فائدہ کے لئے ہر اک ضروری دینی امر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن پھر بھی بہت سے لوگ اس کے انکار پر مصر ہیں۔ یہی چیز ہے۔ جس میں مثل کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اگر فی الواقع وہ اس کلام کو انسانی کلام سمجھتے ہیں تو چار خوبیوں والا کلام پیش کریں۔ جو اپنی خوبیوں میں قرآن کریم کے برابر ہو۔ (۱) اس میں ہر ضروری دینی مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ یعنی اعتقادات۔ فلسفۂ اعتقادات۔ صفات باری اور فلسفۂ ظہور صفات باری۔ علم کلام عبادات۔ فلسفۂ عبادات۔ علم اخلاق۔ فلسفۂ اخلاق۔ معاملات۔ فلسفۂ معاملات۔ مدنیت۔ اقتصادیات۔ سیاسیات کا جو حصہ مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کا فلسفہ معاد اور اس کے متعلق تمام امور وغیرہ وغیرہ سب امور ضروریہ پر اس میں روشنی ڈالی گئی ہو۔ (۲) وہ بحث جو ان امور کے متعلق کی گئی ہو۔ سیر کن ہو نہ صرف وسعت کے رُو سے احاطہ ہو یعنی سب علوم کے متعلق کچھ نہ کچھ بحث ہو۔ بلکہ حق کی گہرائی کا بھی احاطہ ہوا ور ہر مسئلہ کے ہر پہلو کو پیش کرکے اس پہ ہدایت دی گئی ہو۔ (۳) وہ تمام تعلیم باوجود اپنی وسعت اور باریکی کے مضرت رساں نہ ہو۔ بلکہ اس میں نفع ہی نفع ہو۔ (۴) اس میں کسی ایک قوم یا طبقے کے فائدہ کو مدنظر نہ رکھا گیا ہو۔ بلکہ تمام بنی نوع انسان کی فطرت کو مدنظر رکھا گیا ہو۔ اور ہر قسم کی طبیعت اور ہر قسم کے حالات اور ہر درجہ اور ہر فہم کے انسان کے متعلق اس میں ہدایت موجود ہو۔

چونکہ قرآن کریم ابھی مکمل نہ ہوا تھا۔ اس لئے یہ نہیں فرمایا۔ کہ تم ابھی اس کی مثل لے آؤ۔ بلکہ یہ فرمایا ہے۔ کہ نہ لا سکو گے۔ یعنی نہ اس کی موجودہ حالت میں اور نہ اس وقت جب یہ مکمل طور پر نازل ہو جائیگا حق یہی ہے کہ قرآن کریم نے ایسے رنگ میں روحانی امور

پر بحث کی ہے۔ کہ اوپر کے چاروں امور کے مقابلہ میں اس قدر کلام میں بھی کوئی شخص اس کی کوئی مثل نہیں لا سکتا تھا۔ جو اس وقت تک نازل ہو چکا تھا اور اس وقت کے لحاظ سے قرآن کہلاتا تھا۔

اس آیت کے مطالب میں ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ جس کا بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ اور وہ یہ کہ اس میں علم الارواح کے ماہرین کو بھی جنہیں انگریزی میں سپریچولسٹ کہتے ہیں مخاطب کیا گیا ہے اور جن سے مراد وہی ارواح ہیں جن سے تعلق پیدا کر کے روحانیات کی باریکیاں معلوم کرنے کے علم الارواح کے علماء مدعی ہیں اور بتایا ہے کہ قرآن کریم کی مثل نہ تو انسان خود لا سکتے ہیں اور نہ پوشیدہ ارواح کی مدد سے لا سکتے ہیں۔ جن کی مدد کا ان کو دعویٰ ہے۔ اس جگہ جن سے مراد وہ جنات نہیں کہ جو عوام الناس میں مشہور ہیں۔ کیونکہ ان کی مدد سے کلام لانے کا مطالبہ ایک مہمل بات ہو جاتی ہے۔ نیز اس آیت سے پہلے ویسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی بھی مذکور ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ اس جگہ ارواح کا ہی ذکر ہے نہ کہ جنات کا۔ (تفصیل کے لئے دیکھو اس آیت کی تفسیر بنی اسرائیل رکوع ۱۰ میں)

دوسری آیت جس میں کفار کا اعتراض بیان کیا ہے۔ کہ اس کے پاس خزانہ اور ملک نہیں اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر یہ درست ہے تو تم دس سورتیں مفتریات کی اس کے مقابلہ میں لے آؤ۔ پس اس جگہ سورتوں کو بطور خزانہ کے پیش کیا اور مفتریات کا مطالبہ کر کے بتایا ہے۔ کہ اگر اس کا دعویٰ وحی بالملائکہ کا جھوٹا ہے۔ اور اس کے ساتھ ملائکہ نہیں آتے۔ تو تم بھی زیادہ نہیں تو دس سورتیں ایسی پیش کر دو۔ جن کے متعلق یہ دعویٰ ہو کہ ملائکہ نے باذن الٰہی ہم پر اتاری ہیں

پھر دیکھو کہ تمہارا کیا انجام ہوتا ہے اور اگر تم میں یہ جرأت نہیں۔ کہ تم ایسا جھوٹا دعویٰ کر سکو تو محمد رسول اللہ صلعم کی نسبت کس طرح خیال کر سکتے ہو۔ کہ اس قدر افترا کر رہا ہے۔ اور اگر افترا کر رہا ہے تو پھر خدا تعالیٰ کی گرفت سے محفوظ کیوں ہے۔ غرض اس جگہ عقلی مقابلہ کے ساتھ آسمانی مقابلہ کو بھی شامل کیا گیا ہے

سپر چولزم کا ابطال

اور یہ جو اس جگہ فرمایا۔ کہ دس سورتیں ایسی لاؤ۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ اس جگہ قرآن کریم کے ہر رنگ میں مکمل ہونے کا دعویٰ نہ تھا بلکہ کلام بعض القرآن کے متعلق تھا یعنی مخالف معترض تھا کہ اس کے بعض حصے قابل اعتراض ہیں جیسا کہ آیت فلعلک تارک بعض ما یوحیٰ الیک سے ظاہر ہے اور اسی طرح کفار کے اس سوال سے بھی ظاہر ہے کہ اس کے پاس خزانہ اور ملک نہیں۔ پس اس جگہ سارے قرآن کے مقابلہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ بلکہ یہ مطالبہ کیا ہے۔ کہ تم قرآن میں جو بھی کمزور سے کمزور حصہ سمجھتے ہو۔ اس کے مقابلہ میں دس سورتیں بنا کر پیش کر دو۔ تا تمہارے دعوے کی آزمائش ہو جائے۔

دس سورتوں کا مطالبہ کفار کی فلعلک تارک بعض ما یوحیٰ الیک والی جرح کے جواب میں ہے۔

دس کا عدد اس واسطے استعمال کیا۔ کہ یہ عدد کامل ہے۔ اور چونکہ معترض کے دعوی کو رد کرنا تھا اس وجہ سے اس کو دس سورتیں بنانے کو کہا۔ کہ تم کو ایک مثال نہیں دس مثالیں بنانے کی اجازت دیتے ہیں۔

دس کا عدد اختیار کرنے کی وجہ

پس یہاں دس کا لفظ اس لئے نہیں رکھا گیا۔ کہ وہ ایک سورۃ تیار کر سکتے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ ان کے اس اعتراض کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ یہی تھا۔ کہ انہیں کئی مواقع اعتراض کے دئے جاتے اور سب اس لئے نہیں کہا۔ کہ اس وقت جن معترضوں کا ذکر تھا۔ وہ صرف بعض حصوں کو قابل اعتراض قرار دیتے تھے۔ سب کو نہیں۔ غرض سورۃ بنی اسرائیل میں چونکہ تکمیل کا دعوےٰ تھا اس میں قرآن شریف کی مثل کا مطالبہ کیا گیا اور سورۃ ہود میں چونکہ کفار کے اس اعتراض کا جواب تھا کہ بعض حصے غیر معقول ہیں۔ اس لئے فرمایا۔ کہ دس ایسے حصے جو تمہارے نزدیک سب سے کمزور اور قابل

دس سورتوں کا مطالبہ

سورۃ بنی اسرائیل کے مطالبہ اور سورہ ہود کے مطالبہ کے فرق کی وجہ۔

سورۂ طور والی تحدی کہ بالمقابل کسی بات پیشگوئی کا مطالبہ

اعتراض ہوں تم انہیں کے مقابل میں کوئی کلام بنا کر پیش کردو۔ تاکہ کفار یہ نہ کہیں کہ ہمیں صرف ایک اعتراض کا حق دیا تھا اور اس کا مقابلہ کرنے میں ہم سے غلطی ہوگئی۔

سورۂ یونس والی تحدی اور ایک سورۃ کی مثل کا مطالبہ

تیسرا مقام جس میں قرآن کریم کی بے مثلی کا دعویٰ ہے۔ سورۂ یونس ہے اس میں ایک سورۃ کا مطالبہ کیا ہے۔ جو پہلے دونوں مطالبوں سے کم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مطالبہ اپنے ایک دعویٰ کے ثبوت کے لئے تھا۔ نہ کہ کفار کے اعتراض کی تردید میں اگلی اس آیت سے پہلے دعویٰ کیا گیا تھا۔ کہ سب تصرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اور اس کے ثبوت میں قرآن کریم کو پیش کرکے اس کے متعلق پانچ دعوے کئے تھے۔ وما کان ھذا القرآن ان یفترٰی من دون اللہ ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل الکتاب لا ریب فیہ من رب العالمین۔ یعنی اول اس میں ایسی تعلیم ہے جسے انسان بنا ہی نہیں سکتا۔ دوم پہلی کتب کی اس میں تصدیق ہے۔ سوم اس میں پہلی کتب کے نامکمل احکام کو مکمل کیا گیا ہے۔ چہارم یہ کلام بالکل محفوظ اور انسانی دستبرد سے پاک ہے۔ پنجم اس کی تعلیم تمام قسم کے انسانوں اور تمام زمانوں کے لئے ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ کہ اگر یہ سچ نہیں تو پھر تم بھی ایک سورۃ ایسی بنا کر پیش کردو۔ جس میں وہ پانچ باتیں جو بیان کی گئی ہیں ایسے مکمل طور پر بیان ہوں جیسی کہ اس سورۃ یعنی یونس میں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن اگر ایک سورۃ کے مقابلہ میں بھی تم کوئی کلام نہ پیش کرسکو۔ تو پھر سمجھ لو۔ کہ سارے کلام میں کس قدر کمالات مخفی ہونگے اور ان کا بنانا انسانی طاقت سے کس قدر بالا ہوگا۔ غرض کہ اس جگہ مثلہ سے مراد ان پانچ کمالات کی مثل والا کلام ہے۔ جو سورۂ یونس میں بیان کئے گئے ہیں۔

اب رہی آخری آیت یعنی فلیأتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صٰدقین (سورۂ طور ع۲) کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی ایسی ہی بات پیش کرکے دکھاؤ۔ میرے نزدیک اس آیت میں سب سے چھوٹا مطالبہ ہے۔ اور وہ صرف ایک مثال کا ہے۔ خواہ وہ ایک سورۃ سے بھی چھوٹی ہو اور یہ مطالبہ بھی اپنے دعوے کے ثبوت میں ہے نہ کہ کفار کے دعوے کے رد میں۔ اور وہ دعویٰ وہی ہے جو اس سورۃ کے شروع میں کیا گیا ہے۔ یعنی والطور وکتاب مسطور فی رق منشور والبیت المعمور والسقف المرفوع والبحر المسجور ان عذاب ربک لواقع ما لہ من دافع۔ یعنی یہ کتاب جس کا وحی کے ظہور پر پایا گیا تھا اور جو لکھی جائیگی اور ہمیشہ پڑھی جائیگی اور دنیا میں پھیلائی جائیگی۔ اور اسلام جس کے متبعین کی تعداد بہت بڑھ جائیگی اور نہ صرف عوام بلکہ اعلیٰ طبقہ کے لوگ روحانی وجسمانی فضائل والے اس میں داخل ہونگے۔ اور یہ روحانیت کا چشمہ جو مختلف ملکوں کو سیراب کریگا۔ ان دونوں امور کو ہم بطور قیامت کی دلیل کے پیش کرتے ہیں۔ اس ذکر کے بعد فرمایا کہ کیا یہ لوگ اس کلام کو بناوٹی کہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو جو جو اور جس جس قسم کی پیشگوئیاں اوپر پیش کی گئی ہیں۔ ان کی مانند یہ بھی ایک پیشگوئی پیش کردیں۔ اور مفتریات کی بھی ہم شرط نہیں لگاتے۔ انہیں اجازت ہے۔ کہ یہ چاہیں تو پچھلی الہامی کتب سے ہی کوئی ایسی مثال نکال کر پیش کردیں۔ مگر یاد رکھیں۔ کہ یہ اس کی نظیر کہیں سے نہیں لاسکتے۔ اس مطالبہ میں خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی بھی کوئی شرط نہیں۔ اور نہ یہ شرط ہے۔ کہ اپنے پاس سے کوئی پیشگوئی کریں۔ بلکہ اجازت دی ہے۔ کہ خواہ خود بنالیں یا پچھلی کتب سے جو خواہ الہامی ہوں خواہ غیر الہامی نکال کر پیش کردیں اور پھر مطالبہ بھی نہایت چھوٹا رکھا ہے۔ کہ ایسی ایک ہی

پیشگوئی پیش کردیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں اور بھی عظیم الشان پیشگوئیاں ہیں۔ اور پھر دشمن کے عاجز رہنے کی وجہ بھی بتا دی ہے۔ کہ ایسی پیشگوئی کے بیان کرنے کے لئے تو زمین اور آسمان کے خالق اور خزانوں کے مالک اور نگراں اور روحانی ترقی کے مالک اور غیب کے مالک کی ضرورت ہے۔ اور یہ باتیں ان میں نہیں۔ پس یہ کیونکر اس کی مثل بنا سکتے ہیں۔

دوسرے حصہ کو یعنی پہلی کتب سے مثال نہ لا سکنے کے دعویٰ کو رد کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ کیونکہ وہ کتب سچی تھیں۔ صرف درجہ کا سوال تھا۔ یہ مطالبہ بھی باقی مطالبوں کی طرح اب تک قائم ہے۔ پھر کیا کوئی انسان خواہ کسی مذہب کا ہو۔ سورۂ ھود کی اس آیتہ کی مثل لانے کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ اگر ہے تو آگے آکر اُسے پیش کرے۔

پانچواں مطالبہ سورۂ بقرہ میں ہے۔ اور اس میں بھی سورۂ یونس کی طرح ایک سورۃ لانے کا مطالبہ ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فأتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین۔ اس جگہ بھی اپنے دعویٰ کی ہی مثل طلب کی ہے۔ اور وہ دعویٰ یہ ہے۔ ذٰلک الکتاب لا ریب فیہ ھدی للمتقین۔ سورۂ یونس کی آیت کے پہلے بھی لا ریب فیہ ہے۔ گویا ایک سورۃ کی مثل کے مطالبہ کا لا ریب فیہ سے خاص جوڑ ہے۔ اس مطالبہ سے پہلے یہ دعویٰ کیا گیا ہے۔ کہ قرآن کریم ھدی للمتقین ہے یعنی اعلیٰ مدارج روحانیہ تک پہنچاتا ہے۔ پس فرمایا کہ اگر قرآن کریم کے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہونے میں تمہیں کوئی شک ہے۔ تو اس کے روحانی اثر کا مقابلہ کر لو۔ کوئی ایک ہی سورۃ لے آؤ جو قرآن کریم کے مقابلہ میں روحانی تاثیرات رکھتی ہو۔ قرآن کریم میں یہ تاثیر ہے کہ اس کی کوئی سورۃ بھی آدمی پڑھے۔ اس کے دل میں اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی تاثیرات پیدا ہونے لگیں گی۔ گویا بجائے شکوک پیدا کرنے کے وہ شکوک کو قطع کر دیتا ہے۔ اور لوگوں کو ایسے مقامات تک پہنچا دیتا ہے۔ کہ وہاں شک باقی ہی نہیں رہتا اور یہ تعلق باللہ کا مقام ہے۔ یہ مقام صرف قرآن کریم کی تلاوت سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا کوئی کلام اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور قرآن کریم کی ہر اک سورت ان روحانی تاثیرات میں ایسی بےمثل ہے۔ کہ کوئی اور کلام اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا۔

اوپر کی تشریحات سے یہ امر ثابت ہے کہ درحقیقت یہ پانچوں مطالبے الگ الگ ہیں اور سب ایک ہی وقت میں قائم ہیں۔ کوئی مطالبہ کسی دوسرے مطالبہ کو منسوخ نہیں کرتا۔ اور سب غلطی اس امر سے لگی ہے۔ کہ خیال کر لیا گیا ہے۔ کہ جہاں جہاں مثل طلب کی گئی ہے وہاں صرف فصیح عربی کی مثل طلب کی گئی ہے۔ اور سب آیتوں میں ایک ہی مطالبہ ہے۔ حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ ان پانچ سورتوں میں ایک ہی مطالبہ نہیں۔ بلکہ مختلف مطالبے ہیں اور ہر مطالبہ کے مناسب حال پورے قرآن یا بعض قرآن کی مثل طلب کی گئی ہے۔

ا سورۂ بقرہ والی تحدی

۲ فصاحت و بلاغت میں نظیر کا مطالبہ

اب رہا یہ سوال کہ آیا ان مطالبات میں فصاحت و بلاغت کا مطالبہ شامل ہے یا نہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً شامل ہے۔ لیکن ضمنی طور پر۔ نہ کہ اصل مقصود کے طور پر۔ کیونکہ اعلیٰ مطالب بغیر اعلیٰ الفاظ اور عمدہ تراکیب کے ادا ہی نہیں ہو سکتے۔ پس چونکہ قرآن کریم بہترین مطالب پر حاوی ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کے لئے بہترین الفاظ اور بہترین طریقہ ادائیگی کو اختیار کیا جاتا۔ ورنہ اسکے مطالب مشتبہ رہتے اور جب قرآن کریم کا فصیح ترین الفاظ اور بلیغ ترین عبارات میں نازل ہونا اُسکے مطالب کے لحاظ سے ضروری تھا اور وہ اسی رنگ میں نازل ہوا ہے تو جس جس حصہ کی مثل کا مطالبہ کیا گیا ہے اس میں فصاحت و بلاغت کا مقابلہ بھی ضرور شامل رہیگا۔

قرآن کریم کی ہر ایک سورۃ اعلیٰ سے اعلیٰ تاثیرات پیدا کرنے والی ہے

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ

پس اگر وہ تمہاری (یہ) بات قبول نہ کریں تو جان لو کہ (یہ علوم کا خزانہ) جو (تم پر) اتارا گیا ہے اللہ (تعالیٰ) کے (خاص) علم پر مشتمل

۱۵ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○

ہے۔ اور یہ کہ اسکے سوا کوئی (ہستی) بھی پرستش کے لائق نہیں۔ پس کیا تم کامل فرمانبردار بنوگے (یا نہیں) سٹلہ[۱۴]

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ

جو (لوگ اس) ورلی زندگی (کے سامان) اور اس کی زینت کو (اپنا) مقصود بنا لینگے انہیں ہم انکے اعمال (کے پھل)

۱۶ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ○

اسی (زندگی) میں پورے پورے دیدینگے اور انہیں اس میں کم نہیں دیا جائے گا سٹلہ[۱۵]

سٹلہ[۱۴] - فرماتا ہے کہ اگر یہ لوگ اس چیلنج کو قبول نہ کریں تو اس سے ثابت ہوجائیگا کہ یہ کلام خدا تعالیٰ کے علم پر مشتمل ہے۔ اور اس میں ایسے امور بیان ہوئے ہیں جنہیں انسان دریافت نہیں کرسکتا۔ تبھی تو ہر انسان اس کی مثل لانے سے قاصر ہے۔ دوسرے اس سے یہ بھی ثابت ہوجائیگا کہ خدا ایک ہی ہے۔ کیونکہ اگر ایک سے زائد خدا ہوں تو جب انہیں بھی قرآن کریم کی مثل پیش کرنے کا چیلنج دیا گیا ہے۔ تو کیوں نہ وہ ایک ایسا ہی کلام پیش کرکے اسے جھوٹا ثابت کریں سب طرف سے خاموشی کا ہونا اس امر کی دلیل ہے۔ کہ خدا ایک ہی ہے۔ اور اس کا کوئی ثانی نہیں۔

(حاشیہ: قرآن کا علم الٰہی پر مشتمل ہونا اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہے۔)

(حاشیہ: فھل انتم مسلمون کے مخاطب کون ہیں؟)

اس جگہ ایک سوال پیدا ہوسکتا تھا۔ کہ یہ چیلنج حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک کے لئے ہی تھا۔ یا اب بھی قائم ہے۔ اس سوال کا جواب جمع مخاطب کی ضمیر۔ استعمال کرکے دیدیا گیا ہے کہ یہ چیلنج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کیلئے خاص نہیں بلکہ ہر زمانہ کے لئے کھلا ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے خاص ہوتا۔ تو اس کی جگہ یہ فرماتا۔ کہ اگر وہ تیرے چیلنج کا جواب نہ دیں۔ لیکن فرمایا یہ ہے کہ اگر "تمہارے" چیلنج کا جواب نہ دیں۔ غرض لفظ "تمہارے" اسکے استعمال سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر زمانہ میں مسلمانوں کو اس چیلنج کے پیش کرنے کا اختیار ہے۔ اور قرآن کریم ان خوبیوں میں ہمیشہ بے مثل رہیگا۔

(حاشیہ: یہ چیلنج ہمیشہ کے لئے ہے۔)

فھل انتم مسلمون کا میرے نزدیک خطاب کفار سے ہے۔ اور انہیں توجہ دلائی گئی ہے۔ کہ قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے اور اس کے معارضہ سے ہر ایک غیر اللہ کے عاجز ثابت ہونے کے بعد بھی کیا تم اسلام نہ لاؤگے۔

سٹلہ[۱۵] حل لغات وفّٰی فلانا حقہ توفیۃ اعطاہ ایاہ وافیا (ای کثیرا) تاما (اقرب) وفّی کے معنی ہوتے ہیں کسیکو اس کا حق پورا اور کثرت کے ساتھ ادا کردیا۔

بخسہ یبخس بخسًا۔ نقصہ کم کردیا ومنہ لا تبخس اخاک حقہ اور اس سے یہ محاورہ ماخوذ ہے۔ کہ اپنے بھائی کا حق کم نہ کر۔ او عابہ یا اس کے معنی عیب لگانے کے ہوتے ہیں۔ وبخس الناس

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَ

یہ وہ (لوگ) ہیں جن کے لئے آخرۃ میں (دوزخ کی) آگ کے سوا (اور) کچھ نہیں ہوگا اور جو کچھ

حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ۱۷

انہوں نے اس (ورلی زندگی) کی خاطر کیا ہوگا وہ (آخرت کے حق میں بالکل) بیسود ہو جائیگا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہونگے وہ اکارت ہو جائیگا ۱۶؎

اخذ منهم شیئا باسم العشر اور اس کے معنی عشر یعنی ٹیکس کے وصول کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔

تفسیر۔ فرماتا ہے جو کوئی ورلی زندگی کو اس کی زینت یعنی اموال ودولت کو چاہتا ہے۔ ہم اس کو پورا پورا حق دیدینگے۔ یعنی جس امر کے پیچھے وہ پڑا ہے۔ اس سے محروم نہیں کیا جائیگا۔ جو لوگ یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ سیحیوں کے پاس اس وقت بڑی دولت ہے۔ انہیں اس آیت پر غور کرنا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ دنیا کا ملنا دین کے حصول پر منحصر نہیں دین سے بیگانہ ہو کر بھی انسان دنیا حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ حصول دنیا کے لئے بعض اور قواعد بھی ہیں۔ یعنی اس کے حصول کے لئے اصول طبعیات کے مطابق کوشش کرنا۔ پس دنیا کا ملنا بغیر دینی نشانات کی شمولیت کے خدا رسیدہ ہونے کی علامت نہیں ہے۔ ہاں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ خالص دنیوی اعمال کا بدلہ ہر انسان کو اس دنیا میں ملتا ہے۔ لیکن جن اعمال میں دین کو شامل کر لیا گیا ہو۔ مگر خدا تعالیٰ کی منشاء کے مطابق وہ عمل نہ ہوں۔ ان کا بدلہ نہیں ملتا۔ اعمالهم فيها سے اسی طرف اشارہ ہے۔

لا یبخسون یعنی دنیاوی اعمال میں ان پر کوئی عیب نہ لگایا جائیگا۔ یا یہ کہ اگر وہ ظلم نہ کرینگے۔ تو اس دنیا میں ان پر کوئی عذاب نہ آئیگا۔ خواہ وہ دین کی طرف توجہ نہ کریں۔ عذاب دینی امور میں اسیوقت آتا ہے جب استہزاء اور شرارت کو استعمال کیا جائے۔ خالی انکار

دنیا کا حصول دین پر موقوف نہیں۔

پر اس دنیا میں عذاب نہیں آتا۔ کیونکہ اصل دار الجزاء دوسرا جہان ہے۔

حبط

۱۶؎ حل لغات۔ حبط العمل حبوطا وحبطا فسد وهدر۔ بے فائدہ اور بے ثمرہ ہوگیا اکارت ہوگیا۔ ماء البئر ذهب ذهابا لا يعود كما كان۔ کوئیں کا پانی ہمیشہ کے لئے منقطع ہوگیا جاتا رہا۔ (اقرب)

بطل

بطل۔ فسد او سقط حكمه خراب ہوگیا۔ اکارت ہوگیا۔ کالعدم ہوگیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ یہ آیت فهل انتم مسلمون کے جواب میں ہے۔ کہ تم جو دین کی طرف رغبت نہیں کرتے۔ اگر تم مسلمان نہ ہوگے۔ تو دنیا کے سامان تو تمہیں مل جائینگے۔ لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے تمہیں کوئی ترقی نہ ملے گی۔

ما صنعوا فیها کی ضمیر مجرور کا مرجع۔

ما صنعوا فیها میں ضمیر مؤنث الحیٰوة الدنیا کیطرف بھی پھیری جا سکتی ہے۔ اور آخرۃ کی طرف بھی۔ پہلی صورت میں یہ معنی ہونگے کہ دنیا میں جو دنیا کی خاطر کام کئے ہونگے۔ چونکہ ان کا بدلہ مل چکا ہوگا۔ اس لئے اب وہ کام نہ آسکیں گے۔ اور دوسری صورت میں یعنی آخرت کی طرف ضمیر پھیرنے کی صورت میں یہ معنی ہونگے۔ کہ دنیا کے کام چونکہ خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے ماتحت تھے ان کا بدلہ تو مل گیا۔ مگر اُخروی کام چونکہ مقررہ قوانین کے خلاف تھے۔ بوجہ ناقص ہونے کے فائدہ نہیں دیں گے۔ اور جس مقصد کے لئے تھے وہ حاصل نہ ہوگا

دنیا میں اعمال کی سزا بصورت عذاب دنیا میں نہیں دی جائے گی۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ

پس کیا جو (شخص) اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر (قائم) ہے اور (اس کی صداقت کا) ایک گواہ اس (یعنی خداوند تعالیٰ)

قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ

کی طرف سے (آگے) اسکی پیروی کریگا اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب تھی جو (لوگوں کے لئے) امام اور رحمت تھی (ایک جھوٹے مدعی جیسا ہو سکتا

بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ

ہے؟) وہ (یعنی موسیٰ کے سچے پیرو) اسپر (ابھی ضرور) ایمان لاتے ہیں اور ان (مخالف) گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کریگا تو (دوزخ کی) آگ

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۗ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ

اس کے (لئے) وعدہ کی جگہ ہے۔ پس (اے مخاطب) تو اس کے متعلق کسی (قسم کے) شک میں نہ پڑ۔ وہ یقیناً بالکل حق ہے۔

اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ۱۸

(اور) تیرے رب کی طرف سے ہے) لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لایا کرتے ۱۷ئہ

امام

۱۷ئہ حل لغات۔ الامام من یؤتم بہ جس کی اقتدا کی جائے۔ للمذکر والمؤنث یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے آتا ہے۔ ومنہ قامت الامام وسطھن کہتے ہیں (عورتوں کی) امام نماز میں ان کے درمیان کھڑی ہوئی۔ ما امتثل علیہ المثال۔ جس چیز کو کسی کام کے کرنے میں نمونہ ٹھہرا کر اس کے مطابق کام کیا جائے۔ اس لفظ کے اور معنی بھی ہیں۔ جو یہاں چسپاں نہیں ہوتے۔ مگر معنوں کے سمجھنے میں مُد دے سکتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں الخیط یمدّ علی البناء فیبنی۔ یعنی وہ تاگہ جس کے ساتھ معمار دیوار کی کجی کو معلوم کرتے ہیں۔ (اقرب)

رحمت

الرحمۃ۔ رقۃ القلب وانعطاف یقتضی التفضل والاحسان والمغفرۃ۔ یعنی رحمت دل کی نرمی اور ایسے جذبۂ ترحم کو کہتے ہیں۔ جو فضل احسان اور بخشش کرنے کی تحریک کرے۔ (اقرب)

حزب

الاحزاب۔ حزب کی جمع ہے۔ الحزب الطائفۃ جماعۃ الناس۔ لوگوں کا گروہ۔ جند الرجل واصحابہ الذین علی رأیہ۔ کسی آدمی کے ساتھی اور وہ لوگ جو اس کے خیال کے مطابق ہوں۔ ومنہ فی القرآن اولٰئک حزب الشیطان اور انہی معنوں میں قرآن کریم میں حزب الشیطان کے الفاظ آئے ہیں۔ وکل قوم تشاکلت قلوبھم واعمالھم فھم احزاب وان لم یلق بعضھم بعضا اور تمام وہ لوگ جن کے دلی خیالات اور اعمال ہم رنگ ہوں۔ احزاب کہلاتے ہیں خواہ ایک دوسرے کو انہوں نے دیکھا بھی نہ ہو۔ (اقرب)

مریت

اَلْمِریۃ۔ استخراج ما عند الفرس من الجری گھوڑے کو جس قدر اس کی طاقت تھی دوڑایا۔ المِرْیۃ والمُریۃ الشک شک۔ ویقولون ما فیہ مریۃ ای جدلٌ کہتے ہیں کہ اس میں مریہ نہیں ہے۔ یعنی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ قرآن شریف اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

سچائی پرکھنے کے لئے تین گُر بتائے گئے ہیں ۔ اور
فرمایا ہے ۔ کہ جس میں یہ تین باتیں پائی جائیں وہ جھوٹا
نہیں ہوسکتا ۔ افمن کان کا جواب کمن ھو کاذب
محذوف ہے ۔ یعنی کیا اوپر کی صفات والا شخص جھوٹوں
کے زمرہ میں شامل ہوسکتا ہے ؟ یا یہ کہ جو ایسا ہو کیا
وہ اپنے مخالف کی طرح ہوسکتا ہے ۔ اور اس صورت
میں یوں عبارت ہوگی ۔ افمن کان علی بینۃ
کمن لیس علی بینۃ ۔ یہ عربی کا قاعدہ ہے
کہ عام طور پر ایسے فقروں میں جواب کے حصے کو
حذف کر دیا کرتے ہیں ۔

دنیا میں اس سچائی سے تعلق رکھنے والے
تین قسم کے لوگ ہوسکتے ہیں ۔ (۱) ایک وہ جو
اس وقت اس کے مخاطب ہوں ۔ (۲) وہ جو اس
وقت تو مخاطب نہ ہوں ۔ لیکن آئندہ مخاطب بننے
والے ہوں ۔ (۳) تیسرے وہ لوگ جو پچھلے
زمانہ میں گذر چکے ہوں ۔ لیکن وہ اس آنے والے
نذیر کی امید رکھتے تھے ۔ اگر ان تینوں قسم کے گواہوں
سے کسی امر کی سچائی ثابت ہو تو اس سچائی میں
کسی قسم کا شبہ نہیں ہوسکتا ۔ کیونکہ تینوں کے
تینوں زمانے اس کے حق میں گواہی دیتے ہیں ۔ جو
لوگ کسی صداقت کے منتظر ہوں ۔ لیکن ابھی وہ صداقت
ظاہر نہ ہوئی ہو ۔ ان کے ایمان کی بنیاد خالص طور
پر امور غیبیہ پر ہوتی ہے ۔ اور جب لوگوں کے سامنے
وہ صداقت آ گئی ہو ۔ وہ اس کو دو پہلوؤں سے
دیکھتے ہیں ۔ (۱) کیا اس کی ذات میں کوئی ایسا ثبوت
موجود ہے ۔ جس سے اُس کا سچائی ہونا ثابت ہوتا ہو ۔
(۲) اس سچائی کے متعلق جو پہلی کتب میں خبریں تھیں ۔ کیا
وہ اس کے ذریعہ سے پوری ہو جاتی ہیں ۔ جب یہ زمانہ
بھی گذر جاتا ہے ۔ اور ایسے لوگ دنیا میں پیدا ہوتے
ہیں جن کے لئے یہ سب باتیں قصہ ہو جاتی ہیں ۔
قرآن کے لئے ایک تیسری شہادت پیدا کی جاتی ہے
اور وہ اس صداقت کے ثمرات ہیں ۔ وہ لوگ علاوہ
پہلی دونوں قسم کی دلائل کے اس امر پر بھی غور کرسکتے
ہیں ۔ کہ اس صداقت کے ثمرات کیا پیدا ہوئے
اور اگر اس کے ثمرات ان کے زمانہ تک پیدا ہوتے
چلے جاتے ہیں ۔ تو وہ سمجھ لیتے ہیں ۔ کہ وہ صداقت
ان کے زمانہ سے بھی ویسا ہی تعلق رکھتی ہے ۔ جیسا کہ
پہلے زمانوں سے ۔

ان شہادتوں کی ترتیب

درجہ کے لحاظ سے اندرونی شہادت سب سے اہم ہوتی
ہے ۔ کیونکہ وہ زمانۂ حال اور آئندہ دونوں زمانوں کے لوگوں کے
لئے گواہ ہوتی ہے ۔ اور نیز اس لئے کہ وہ دوسری چیزوں کی
طرف توجہ کرنے کی زحمت سے آزاد کر دیتی ہے
اور خود اپنی ذات میں ہی صداقت کو ثابت کر دیتی ہے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر تین قسم کے گواہ

دوسرے نمبر پر اس دلیل کو اہمیت حاصل ہوتی ہے ۔
جو صداقت کے ثمرہ کے طور پر آتی ہے ۔ اس لئے کہ
وہ بھی بعد میں آنے والے مخاطبین کے لئے ضروری ہے
اگر وہ نہ ہو ۔ تو بعد میں آنے والوں کے لئے صداقت مشتبہ
رہے ۔ کیونکہ کسی چیز کا خالی صداقت ثابت ہونا اس پر
عمل کرنے کیلئے کافی محرک نہیں ہوتا ۔ بلکہ ضروری ہوتا ہے کہ یہ بھی
ثابت کیا جائے کہ وہ صداقت موجودہ زمانہ میں بھی قابل
عمل ہے ۔ اور یہ بات نہیں ہے ۔ کہ اس سے بڑھ کر کوئی
اور صداقت ظاہر ہو کر اسے منسوخ کر چکی ہے ۔ اور جب
کسی صداقت کے تازہ ثمرات ظاہر ہوتے ہیں ۔ تو یہ
بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ صداقت موجودہ زمانہ کے لئے
بھی ویسی ہی مفید ہے ۔ جیسے کہ گذشتہ زمانہ کے لوگوں کیلئے تھی ۔

تیسرے نمبر پر اہمیت اُن
گذشتہ پیشگوئیوں کو حاصل ہوتی ہے ۔ جو لوگوں کو
کسی صداقت کی امید دلاتی چلی آئی ہوں ۔ یہ دلیل بھی
اپنی ذات میں کارآمد ہوتی ہے ۔ کیونکہ ایمان کے لئے
لوگوں کے دلوں کو تیار رکھتی ہے ۔ گو اس سے فائدہ وہی

لوگ اٹھاتے ہیں۔ جن کے زمانہ میں وہ صداقت ظاہر ہو۔ جس کی خبر پیشگوئیوں میں دی گئی ہو۔ قرآن کریم کی تائید میں ان تینوں قسم کے دلائل کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ اپنی ذات میں بھی صداقت کے ثبوت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے کی کتب میں بھی اس کی تصدیق موجود ہے۔ اور بعد میں بھی اس کے ثمرات ایسے طور پر ظاہر ہوتے رہینگے۔ کہ لوگوں کو اس کے انکار کی گنجائش نہ ہوسکے گی۔

پہلی شہادت

چنانچہ سب سے پہلے فرماتا ہے۔ کہ قرآن کریم یا اس کا لانے والا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا تعالیٰ کی طرف سے اپنے ساتھ ایسے دلائل رکھتا ہے جو قطعی طور پر ثابت کرتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

دوسری شہادت

اور چونکہ قرآن کریم کا زمانہ ممتد ہونے والا تھا۔ اور اس نے بعید ترین زمانہ کے لوگوں کو بھی ہدایت دینی تھی۔ اس لئے فرمایا۔ کہ و یتلوہ شاھد منہ۔ اس کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے جب اتنا عرصہ گذر جائیگا۔ کہ پہلے دلائل قصوں کے رنگ میں رہ جائینگے۔ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک نیا گواہ آجائیگا۔

تیسری شہادت

پھر فرمایا۔ کہ علاوہ ان موجودہ دلائل کے گذشتہ نبیوں نے بھی اس کی خبر دی ہوئی ہے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہو کہ وہ امام ہے یعنی لوگوں کو کھینچ کھینچ کر ادھر لاتی ہے۔ اور رحمت ہے کہ قرآن کے ماننے کے لئے اس نے لوگوں کے واسطے آسانیاں کردی ہیں اولئک یؤمنون بہ یعنی جن لوگوں کے لئے موسیٰ کی کتاب امام اور رحمت بنجاتی ہے۔ وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔

شاھد منہ کے معنی

یہاں اس سوال کا جواب بھی آجاتا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ گذشتہ تیرہ سو سال میں کیوں کوئی مامور نہیں آیا۔ کیونکہ آنے والے کے لئے شاہد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ شاھد کی ضرورت اسی وقت ہوتی ہے۔ کہ جب کسی صداقت کے متعلق یہ خیال ہو۔ کہ اب بھی یہ ماننے کے قابل ہے یا نہیں۔

آنحضرت صلعم کے اور فترۃ

پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اسی وقت کسی مامور کی ضرورت ہوسکتی تھی۔ جب قرآن کریم کے متعلق یہ سوال پیدا ہو جاتا۔ کہ وہ ماننے کے قابل ہے یا نہیں اور اس کی صداقت قابل عمل ہے یا نہیں۔ اور پچھلے تیرہ سو سال میں کبھی بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوا۔ ہاں آج قرآن کے متعلق یہ سوال کئی گروہوں کی طرف سے پیدا ہو رہا ہے۔ (اول) خود مسلمانوں کے نزدیک اس کی بعض تعلیمیں اب قابل عمل نہیں رہیں۔ ان میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ جیسے نماز و روزہ کے احکام۔ چور کے ہاتھ کاٹنے۔ پردہ اور سود وغیرہ احکام کے متعلق لوگوں میں سوالات پیدا ہو رہے ہیں۔ (دوسرے) بہاء اللہ اور باب جیسے مدعیوں کے ماننے والوں کی طرف سے جو قرآن کریم کی شریعت کو منسوخ قرار دیکر نئی شریعت جاری کرنیکا اعلان کرتے ہیں (تیسرے) یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے ان علوم جدیدہ کے محققین کی طرف سے جو تاریخی و علمی رنگ میں قرآن کریم پر حملہ آور ہیں۔ یہ حالات اس زمانے سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ اس لئے اس زمانہ سے پہلے کسی شاہد کی بھی ضرورت نہ تھی۔

شاھد منہ کے متعلق مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ بعضوں نے شاہد سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور افمن کان سے مومن مراد لئے ہیں۔ مگر یہ معنی بالکل خلاف عقل ہیں۔ کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے تھے اور مومن پیچھے تھے۔ اور اس آیت میں افمن کان والا وجود پہلے اور یتلوہ شاھد منہ والا پیچھے بتایا گیا ہے۔ بعض نے شاھد منہ کے معنی ابوبکر کے اور بعض نے حضرت علی کے کئے ہیں مگر یہ بھی درست نہیں۔ کیونکہ آیت میں شاھد کے لئے منہ کی شرط لگائی گئی ہے۔ یعنی وہ شاہد خدا تعالیٰ کی طرف سے اس شہادت کے لئے حکم پاکر کھڑا ہوگا۔ اور حضرت ابوبکر اور حضرت علی کی طرف سے ہرگز یہ دعویٰ نہ تھا کہ ان کو خدا تعالیٰ نے شہادت کے لئے مبعوث کیا ہو۔ بعض لوگوں نے عبداللہ بن سلام کو شاہد قرار دیا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ

اور اس سے زیادہ کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے۔ ایسے لوگ اپنے رب کے سامنے

عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ

پیش کئے جائینگے اور تمام گواہ کہیں گے (کہ) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۱۹

سنو! ان ظالموں پر اللہ (تعالیٰ) کی لعنت ہے ۝۱۸

لیکن اُن پر بھی یہی اعتراض پڑتا ہے۔

پس جاننا چاہیئے۔ کہ اس جگہ خصوصیت کے ساتھ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہی ذکر ہے۔ جن کا نزول خدا تعالیٰ کی طرف سے اسی رنگ میں ہونا تھا جیسے کہ پہلے بینہ کا نزول ہوا تھا۔ اور جنکی آمد کی غرض یہ تھی کہ وہ اسلام کی صداقت کی شہادت تازہ نشانوں سے دیں جبکہ اسلام کی صداقت اور اس کی قوت قدسیہ کے خلاف بہت سے امور جمع ہونیوالے تھے۔

کتاب موسیٰ کی شہادتیں بہت سی ہیں۔ لیکن بڑی موٹی شہادت وہ ہے۔ جو استثنا باب ۱۸ آیت ۱۸ میں ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی کتاب قرآن کریم کے لئے مندرجہ ذیل طریق پر امام و رحمت ہے۔ اوّل پیشگوئیوں کے ذریعہ سے دوم منہاج نبوت کو واضح کر کے۔ سوم تعلیم کے مقابلہ کے لحاظ سے چہارم اصول شرائع کے سمجھانے میں مدد دے کر۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یتلوہ شاھد منہ میں آئندہ زمانہ میں ایک گواہ کی امید دلائی گئی ہے۔ جو اس کی صداقت کو لوگوں سے منوائیگا۔ نہ کسی ایسے شخص کی جو قرآن کریم کی تعلیم کو منسوخ کرے گا۔ پس اس آیت میں بہائیوں کا رد ہے۔ اور یہ ان پر حجت ہے کیونکہ گو وہ قرآن کریم کو سچا تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا زمانہ اب گزر گیا ہے اور بہاء اللہ کو قرآن کریم کا موعود وجود قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ آیت بتاتی ہے کہ موعود وجود قرآن کریم کو ہمیشہ کے لئے قابل عمل ثابت کرنے کے لئے اور اس کی صداقت کا گواہ بنکر آئیگا۔ نہ کہ اسے منسوخ کرنے کے لئے پس ایسا کوئی شخص جو قرآن کریم کو منسوخ کرتا ہو قرآن کریم کا موعود نہیں ہو سکتا۔

فلا تک فی مریۃ منہ سے مخاطب مراد ہیں۔ نہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ کیونکہ اس سے پہلے کہا جا چکا ہے۔ کہ اولئک یومنون بہ یعنی ایک ایسی جماعت پیدا ہو چکی ہے۔ جو قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتی ہے۔ پس یہ معنی نہایت ہی خلاف عقل ہونگے۔ کہ پچھلے بیان کردہ دلائل سے ایک جماعت تو مومنوں کی پیدا ہو چکی ہے۔ لیکن جس پر وہ دلائل نازل ہوئے ہیں وہ ابھی شک میں ہی ہے۔ پس یقیناً اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ اے مخاطب اس میں شک نہ کیجیو۔

احزاب کا لفظ جو یہاں آیا ہے اس سے عام طور پر مراد انبیاء کی مخالف جماعتیں ہوتی ہیں۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے لئے تشریف لائے تھے۔ اسلئے اس جگہ پر ساری دنیا کے مذاہب اور ساری دنیا کی قومیں مراد لی جائینگی۔

۝۱۸ - کیا لطیف بات فرمائی۔ کہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والا سب سے زیادہ ظالم ہوتا ہے۔ اور جھوٹوں پر خدا تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے۔ پس جھوٹے نبیوں اور سچوں میں فرق کرنا فی الحقیقت کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ جھوٹے نبی اپنی شکل سے پہچانے جاتے ہیں۔ چنانچہ سچے انبیاء قیامت کے دن جھوٹے انبیاء کی طرف اشارہ کر کے

فلا تک فی مریۃ سے قرآن کریم کے مخاطب کے لئے ہے۔

کتاب موسیٰ کی شہادتیں

احزاب سے دو مخالفین کی جماعتیں ہیں۔

شاھد منہ میں بہائی ازم کا رد۔

جھوٹے اور سچے کے درمیان نبوت میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا۔

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ

جو اللہ (تعالیٰ کی طرف پہنچنے) کی راہ سے (لوگوں کو) روکتے ہیں۔ اور اسکی کجی چاہتے ہیں۔

۲۰ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا

اور یہی (لوگ) پیچھے آنیوالی (گھڑی) کے (سب سے بڑے) منکر (ہوتے) ہیں ؎۱۹ یہ (لوگ) ملک میں (الٰہی سلسلوں کو) عاجز

مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

کر بینے والے نہیں ہوتے اور نہ (ہی) (اللہ تعالیٰ) کو چھوڑ کر ان کے کوئی (دوست و)

مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا

مددگار ہوتے ہیں ان کو دوہرا عذاب دیا جاتا ہے (دنیا میں بھی۔ اور آخرت میں بھی) وہ (کچھ بھی)

۲۱ يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ○

سن نہیں سکتے اور نہ وہ (کچھ) دیکھ سکتے ہیں ؎۲۰

کہینگے کہ لوگو! دیکھو جھوٹے ایسے ہوتے ہیں تم لوگ اپنے خبث باطن کی وجہ سے ہمیں جھوٹا سمجھتے تھے۔

عوج ؎۱۹ حل لغات - العوج - اسم ضد الاستقامۃ ٹیڑھا ہونا۔ الانحناء - کجی - والعوج یکون فی المعانی کما یکون العَوَج فی الاجسام جس طرح جسموں کے ٹیڑھا ہونے کیلئے عَوَج کا لفظ ہوتا ہے۔ اسی طرح معانی و صفات کی کجی اور نادرستی کے لئے عِوَج کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ (اقرب)

یبغونہا عوجا کے معنی تفسیر - ویبغونہا عوجا کے دو معنی ہیں اول یہ کہ اس کے لئے کجی چاہتے ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں۔ بَغَیْتُكَ الشَّرَّ ای طلبت لك الشر۔ مطلب یہ کہ وہ چاہتے ہیں کہ اس میں کجی آجاوے۔ وہ بگڑ جائے یعنی صرف لوگوں کو ہی نہیں روکتے۔ بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کی خوبی بھی لوگوں کی نگہ سے پوشیدہ ہو جائے اور ایسے طریق اختیار کرتے ہیں۔ کہ لوگوں کی نظر سے

کلام الٰہی کا حسن مخفی رہے۔ اور اس میں لوگوں کو عیوب نظر آنے لگیں۔ یہ ایک عام حربہ ہے۔ جو حق کے دشمن چلایا کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں۔ کہ حق کا حسن پوشیدہ ہو جائے۔ اور ایسے ایسے جھوٹے الزام تراشتے ہیں۔ کہ جن کو سنکر ناواقف لوگ خوبی کو بھی عیب دیکھنے لگتے ہیں۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یبغونہا میں لاھل کو محذوف سمجھا جائے۔ اور مراد یہ ہو کہ جو لوگ اللہ کے راستہ پر چلنے والے ہیں۔ ان کے لئے کجی چاہتے ہیں یعنی انہیں گمراہ کرنا یا تکلیف میں ڈالنا چاہتے۔ یہ معنی بھی مذکورہ بالا محاورہ ہی کے ماتحت آتے ہیں۔

؎۲۰ - ارض کے معنی کل زمین کے ہوتے ہیں۔ لیکن جب کسی خاص قوم کا ذکر ہو تو اس وقت ان کی زمین یعنی ان کا ملک مراد ہوتا ہے۔ فرماتا ہے

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ

یہ وہ (لوگ ہیں) جو اپنے نفسوں کے متعلق گھاٹے میں رہینگے اور جس (مدعا) کے لئے وہ (اللہ تعالیٰ

مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ ۲۲

پر) جھوٹ باندھتے تھے۔ وہ ان (کے ہاتھ) سے جاتا رہیگا ۲۱ھ

کہ افترا کرنے والے کبھی بھی ملک میں غلبہ نہیں پا سکتے۔ یعنی ان کی تدابیر دوسروں پر غالب نہیں آسکتیں۔ وہ خود ہی اپنی کوششوں میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اور خدا تعالےٰ کی طرف سے ان کو نصرت نہیں ملتی۔ اور اس پر افترا کرنے کی وجہ سے اور اس کے خلاف چلنے کے سبب سے وہ کہیں بھی مددگار نہیں پاتے۔ یہ مطلب نہیں کہ ان کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کا کوئی ایسا دوست نہیں ہوتا جو ان کے کام آسکے اور ان کے مقصد کے بڑھانے میں مد ہوسکے۔

اس آیت کا یہ بھی مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ تو ان کا دوست ہوتا ہے۔ مگر دوسرے لوگ دوست نہیں ہوتے۔ بلکہ مراد یہ ہے۔ کہ بوجہ افترا کے خدا تعالیٰ تو ان کا دوست ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر اس کے غضب کی وجہ سے جو ان کے ہر رنگ دوست ہوتے ہیں۔ وہ بھی ان کے کام نہیں آسکتے۔

ضِعف کے معنی دگنے کے بھی اور زیادتی کے بھی ہوتے ہیں۔ پس اس کے دونوں معنی ہیں۔ ایک یہ کہ انہیں دگنا عذاب ہوگا۔ اپنے گناہوں کا بھی اور ان کا بھی جنھیں انہوں نے گمراہ کیا۔ دوسرے یہ کہ ان کا عذاب بڑھتا جائیگا۔ کیونکہ وہ ایک غلط تعلیم پھیلا کر دنیا میں بدی کا بیج پھیلا گئے ہیں۔

ما کانوا یستطیعون السمع وما کانوا یبصرون کا مطلب یہ ہے۔ کہ تعجب ہے کہ جھوٹے مدعی نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ان سے پہلے دونوں قسم کے نبی گذر چکے ہوتے ہیں۔ سچے بھی اور جھوٹے بھی۔ لیکن نہ یہ ان کے انجام کو دیکھتے ہیں نہ ان کے حالات کو سنتے ہیں +

جھوٹوں کو کبھی دوست اور مددگار نصیب نہیں ہوتے۔

۲۱ھ حل لغات۔ خَسِرَ۔ ضد ربح نفع کے مقابل کا لفظ ہے یعنی گھاٹا کھایا۔ ضَلَّ گمراہ ہوا هلك ہلاک ہوا۔ (اقرب) عربی زبان میں یہ لفظ ہمیشہ لازم ہی استعمال ہوتا ہے۔ میں نے بڑی تحقیق کی ہے مگر مجھے نہیں ملا۔ کہ یہ لفظ عربی کے استعمال میں کہیں بھی متعدی استعمال ہوا ہو۔ مگر یہ عجیب بات ہے۔ کہ تمام کے تمام مفسرین خسروا کے معنی اھلکوا کرتے ہیں۔ لیکن تاج العروس والا کہتا ہے۔ کہ سارے اہل تعریف اس کو لازم ہی قرار دیتے ہیں۔ مگر وہ سب غلطی پر ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں متعدی استعمال ہوا ہے۔ لیکن حق یہ ہے۔ کہ یہ لازم ہی ہے۔ اور افسوس یہ ہے۔ کہ ہماری لغتیں مذہبی اثر کے نیچے ہیں۔ اور تفسیروں کے ماتحت لغت کو بھی کر دیا گیا ہے جس سے اسلام کو فائدہ نہیں پہنچا۔ بلکہ نقصان پہنچا ہے اور کئی معارفِ قرآنیہ اس تصرف کی وجہ سے لوگوں کی نظر سے مخفی ہو گئے ہیں۔ کاش کوئی شخص ہمت کر کے ایسی لغت تیار کرے جو تفسیروں کے اثر سے بالکل آزاد ہو۔ تاکہ لوگ اس ناجائز دباؤ سے بالکل آزاد ہو جائیں۔ اور قرآن کریم کے سمجھنے میں لوگوں کو سہولت حاصل ہو جائے۔

خَسِرَ کے لفظ کے متعلق ہی اگر تفسیروں کا

خسر متعدی نہیں بلکہ لازم ہے۔

من دون اللہ کے معنی

یضاعف لهم العذاب کے معنی

نفی سمع و بصر کے معنی

۲۳ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ

یہ اٹل (بات) ہے کہ آخرت میں وہی (سب سے) زیادہ گھاٹا پانے والے ہونگے ۲۲ جو (لوگ)

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ

ایمان لائے اور انہوں نے نیک (اور مناسب حال) عمل کئے اور اپنے رب کی طرف جھک گئے

۲۴ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

وہ یقیناً بہشت (میں رہنے) والے ہیں وہ اس میں رہا کرینگے ۲۳

رعب ماننے کی بجائے عربی کے قواعد پر نظر کی جائے تو اُسے خلاف محاورہ متعدی بنانے کی ضرورت نہ تھی ہم اس کے معنی اس طرح کر سکتے ہیں ۔ جس طرح سَفِهَ نَفْسَہ کے معنی کرتے ہیں ۔ یعنی حرف جار محذوف تصور کرتے ہیں ۔ اور جملہ کو یوں تصور کرتے ہیں کہ سَفِہ فی نفسہ یا تمیز خیال کرتے ہیں ۔ جو شاذ و نادر طور پر معرفہ بھی آجاتی ہے ۔ اسی طرح ہم خسروا انفسہم کے بھی یہ معنی کر سکتے ہیں ۔ کہ اپنے نفسوں کے بارہ میں گھاٹے میں پڑ گئے ۔ اور یہ معنی دوسرے معنوں سے زیادہ زوردار بھی ہوجاتے ہیں ۔ اور یہ مطلب نکلتا ہے کہ ان کا سب فریب خود اپنے ہی نفسوں کے خلاف پڑا ہے ۔ تمیز کی صورت میں بھی زور قائم رہتا ہے ۔ اور معنی اوپر والے ہی رہتے ہیں ۔ خسر الرجل ضلّ وھلک ہلاک ہوگیا (اقرب)

اخروی نقصان صرف کفار کو پہنچیگا۔

لاجرم

۲۲ حلّ لغات ۔ لاجرم ۔ جَرَمَ ۔ یَجْرِمُ جَرْمًا ۔ قطع ۔ کاٹ دیا ۔ لاجرم قال الفرّاء ھی کلمة کانت فی الاصل بمنزلة لابدّ ولا محالة فجرت علی ذلک وکثرت حتی تحولت الی معنی القسم ۔ وصارت بمنزلة حقًّا وھو ماخوذ من القطع فرّاء کا قول ہے ۔ کہ لاجرم پہلے لابدّ یعنی ضرور کے معنی میں استعمال ہوا کرتا تھا ۔ پھر کثرت سے استعمال ہوتے ہوتے اس کے معنی قسم کے بن گئے اور حقًّا یعنی یقیناً کے معنی دینے لگا ۔ ورنہ اس کے اصل معنی یہی ہیں ۔ کہ اسے کوئی کاٹ نہیں سکتا یعنی یہ اٹل بات ہے ۔ (اقرب)

تفسیر ۔ یعنی دنیا میں تو یہ لوگ انبیاء کو اپنی شرارتوں سے کچھ نہ کچھ نقصان پہنچا لیتے ہیں ۔ خواہ وہ عارضی ہی کیوں نہ ہو ۔ لیکن آخرت میں سب نقصان انہی کو پہنچے گا ۔

اخبت

۲۳ حلّ لغات اخبت الی اللہ ۔ اطمئن الیہ وتخشع امامہ ۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے فروتنی اور عاجزی کے ساتھ کھڑا ہوگیا ۔ واصلہ اخبت ای صار الی الخبت ای الارض المتسع المطمئن ۔ اور اصل میں یہ اخبت سے نکلا ہے ۔ جس کے معنی ایک وسیع اور نشیب والی زمین میں داخل ہوجانے کے ہیں (اقرب) گویا اس لفظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کے سامنے فروتنی کے ساتھ آکر اطمینان پاتے اور آرام محسوس کرتے ہیں ۔ اور سب اطراف سے منہ موڑ کر اس کی طرف جھک جاتے ہیں ۔ اور جس طرح کھلی زمین میں چلنے پھرنے میں سہولت ہوتی ہے ۔ اسی طرح وہ لوگ

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَ

ان دونوں گروہوں کی حالت ایک اندھے اور بہرے اور ایک بینا اور خوب

السَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

ع ۲/۱۶ ۲۵

سننے والے کی (حالت کی) طرح ہے۔ کیا ان (دونوں) کی حالت برابر ہو سکتی ہے (تو) کیا پھر (بھی) تم نہیں سمجھتے ۲۴ؔ

خدا تعالیٰ کی طرف جھکنے میں اطمینان اور لذت پاتے ہیں۔

تفسیر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کمالات روحانیہ کے لئے ایمان اور اعمال صالحہ ہی کافی نہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ پر یقین اور تسلی اور اس سے محبت کی بھی ضرورت ہے۔ جس طرح بچہ ماں کے پاس جاکر تسلی پاتا ہے۔ یہی حال اس شخص کا ہونا چاہیئے جو روحانیت میں ترقی کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہو۔ اور اس پر اعتماد کامل ہو۔ اور اس کی طرف رجوع ہو۔ جب تک یہ بات حاصل نہ ہوگی کبھی بھی قرب الٰہی نصیب نہ ہوگا۔

قرب الٰہی کے شرائط

۲۴ؔ حل لغات۔ الفریق ۔ الطائفۃ من الناس اکثر من الفرقۃ۔ لوگوں کا ایک گروہ۔ لیکن یہ لفظ فرقہ کی نسبت زیادہ کثرت افراد کو ظاہر کرتا ہے۔ وربما اطلق الفریق علی الجماعۃ قلّت او کثرت ۔ اور بعض دفعہ یہ لفظ مطلق جماعت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ چھوٹی جماعت ہو یا بڑی۔ (اقرب)

تفسیر اس آیت میں ایمان اور کفر کا مقابلہ کیا ہے۔ مومن کو بینا قرار دیا ہے۔ اور کافر کو اندھا۔ اور مومن کو سننے والا اور کافر کو بہرا۔ قرآن کریم گالی نہیں دیتا۔ بلکہ حقائق بیان کرتا ہے پس ہم یہ خیال نہیں کرسکتے کہ کافر کو یونہی اس نے اندھا اور بہرا کہہ دیا ہے۔ اس مثال میں یقیناً کفر کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے اور

اعمیٰ اور اصم کا لفظ اور کفر کی حقیقت

اس امر کو سمجھنے کے لئے ہمیں اندھے اور بہرے اور بینا اور سننے والے کے فرق کو معلوم کرنا چاہیئے پہلے ہم نابینا اور بینا کو لیتے ہیں۔ سو سب سے پہلا فرق ہمیں ان دونوں میں یہ نظر آتا ہے کہ بینا تو نور کو دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اندھا نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح جو خدا تعالیٰ کی محبت رکھنے والے ہوتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے کلام کو پہچان لیتے ہیں۔ لیکن دوسرے نہیں پہچان سکتے۔ دوسرا فرق یہ ہے۔ کہ اندھا فوراً اپنی مقصود چیز تک نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ ٹھوکریں کھاتا ہوا اور ٹٹولتا ہوا پہنچتا ہے۔ اس کے برخلاف بینا اپنی مقصود چیز تک فوراً پہنچ جاتا ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے۔ کہ مقابلہ کے وقت اندھا اپنے اور پرائے میں فرق نہیں کرسکتا۔ بالکل ممکن ہے کہ اپنے ساتھی ہی کو مار بیٹھے لیکن بینا یعنی آنکھوں والا دشمن کو دیکھ کر اس پر حملہ کرتا ہے۔ یہی فرق سچے دین کے متبع اور اس کے منکر میں ہوتا ہے۔ سچے دین کا متبع خدا تعالیٰ کے منشاء کو جو روحانیت کے لئے بمنزلہ نور ہے۔ کہ جس سے روحانی راستوں کا علم ہوتا ہے پہچان لیتا ہے لیکن جو شخص سچائی کا منکر ہے اس کی روحانی آنکھ ماری جاتی ہے۔ اور وہ خدا تعالیٰ کے منشاء کے پہچاننے سے محروم رہ جاتا ہے۔ اسی طرح سچائی کو پانے والا چونکہ خدا تعالیٰ کے الہام کا طالب ہوتا ہے وہ ٹھوکریں نہیں کھاتا۔ بلکہ فوراً اپنے منزل مقصود کو پا لیتا ہے

فرق

اس کے برخلاف جو لوگ اپنی عقل سے کام لینے والے ہوتے ہیں وہ بھی گو کبھی صداقت کو پا لیتے ہیں۔ لیکن ہزاروں ٹھوکریں کھانے کے بعد۔ اس کی ایک موٹی مثال حرمت شراب کی ہے۔ اسلام نے تو اسے فوراً حرام کر دیا اور مسلمان رُک گئے۔ دوسری دنیا تیرہ سو سال دھکے کھانے کے بعد اب اس کی برائیوں کی قائل ہونے لگی ہے۔ تیسرا فرق بھی ظاہر ہے۔ سچائی کے ماننے والے ایک اصل پر قائم ہوتے ہیں اور ان کے عقائد میں اختلاف نہیں ہوتا۔ لیکن جھوٹ کے تبع نہیں جانتے۔ کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ بسا اوقات ایک سچائی کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے ان سچائیوں پر بھی حملہ کر جاتے ہیں۔ جن کو وہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن کریم بار بار اپنے مخالفین کو توجہ دلاتا ہے کہ اسلام پر حملہ کرتے ہوئے تم اپنے مسلمات کو بھی بھول جاتے ہو۔ اور نہیں جانتے کہ جو حملہ تم اپنے خیال میں اسلام پر کرتے ہو۔ وہ خود تمہارے معتقدات پر پڑتا ہے۔

ہر صداقت کو اپنی چیز سمجھنے کی تعلیم اور دشمن کا اس پر اعتراض ۲۳

دوسری تشبیہ بہرے اور سننے والے کی دی ہے ان دونوں میں یہ فرق ہوتا ہے کہ ایک دوسرے لوگوں کے تجربوں سے فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ اور دوسرا اس سے محروم رہ جاتا ہے۔ کیونکہ نہ وہ سُنتا ہے۔ نہ اُسے دوسروں کے خیالات پر آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہی اسلام اور غیر اسلام اور مسلم اور غیر مسلم میں فرق ہے۔ اسلام اور مسلمان تو ساری سچائیوں کو اپنے اندر جمع کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے دشمن صرف اپنے پرانے خیالات پر قانع ہیں۔ وہ دوسری سچائیوں سے اپنے کانوں میں روئی ڈالکر غافل بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسی فرق کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہتے ہوئے اشارہ فرمایا ہے۔ کہ کلمة الحکمة ضالة المؤمن اخذها حیث وجدها حکمت کی بات تو مومن ہی کی گم شدہ چیز ہے۔ وہ جہاں اسے پاتا ہے۔ لے لیتا ہے غرض جو سچا مذہب ہوتا ہے۔ وہ تمام سچائیوں کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے۔ اور جھوٹا ضد اور تعصب کو اختیار کرتا ہے کیا عجیب بات ہے۔ کہ وہی بات جسے دشمن اعتراض کے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اسی کو خوبی کی دلیل قرار دیکر بیان کیا گیا ہے۔ دشمن کہتا ہے کہ دوسرے مذاہب کی صداقتوں کو اسلام اپنے اندر لے آیا ہے۔ اس لئے وہ جھوٹا ہے۔ لیکن قرآن کریم اسی اعتراض کو بطور خوبی بیان کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ اسلام بہرے کی طرح نہیں ہے کہ صرف اپنی مخصوص باتوں پر قانع رہے بلکہ وہ سننے والوں کی طرح ہے۔ جو دوسروں کے علوم کو بھی لے لیتے ہیں۔ اور اپنے علم کو کامل کر لیتے ہیں۔ اور اس نے تمام مذاہب کی ایسی تعلیمات کو اپنے اندر جمع کر لیا ہے جو مفید اور نفع رساں ہیں۔ اور ان کے علاوہ ایسی صداقتیں بھی پیش کی ہیں۔ جو دوسرے مذاہب میں نہیں ہیں۔

کافر و مسلم میں ایک اور طرح کا فرق۔ بہرا اور کافر ۲۴

دوسرے سمیع اور اصم کا مقابلہ کرکے یہ فرق بھی بتایا ہے کہ اسلام میں الہام الٰہی کا دروازہ کھلا ہے۔ وہی کان سننے والا ہے۔ جو خدا تعالےٰ کی آواز کو سُنتا ہے۔ اور درحقیقت کان اسی لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور جو کان خدا تعالیٰ کی آواز کو نہیں سنتا وہ بہرہ ہے۔ اور یہی فرق بصیر اور اعمیٰ کے مقابلہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اسلام میں نشانات اور معجزات کا دروازہ کھلا ہے۔ اور درحقیقت بینا وہی ہے۔ جو اپنے رب کے تازہ نشانات کو دیکھتا ہے۔ جو آنکھ خدا تعالےٰ کے معجزات اور نشانات کو نہیں دیکھتی وہ اندھی ہے۔ چونکہ جلال الٰہی پردوں میں ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی آواز پردوں میں نہیں ہوتی۔ اس لئے سننے کے لئے مبالغہ کا صیغہ یعنی سمیع (بہت سننے والا) استعمال فرمایا ہے۔ اور دیکھنے کے لئے مبالغہ کا صیغہ استعمال نہیں فرمایا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ز

اور ہم نے یقیناً نوح کو اس کی قوم کی طرف (رسول بنا کر) بھیجا تھا (جس پر اس نے انہیں کہا تھا)

اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ ۲۶

کہ میں یقیناً تمہیں (کھول) کھول کر آگاہ اور ہوشیار کرنیوالا (بنا کر بھیجا گیا) ہوں ؁۲۵

؁۲۵ - چونکہ اس سے پہلے بیان فرمایا تھا کہ جھوٹے مدعی یا ان کے پیرو نہ سچے اور جھوٹے نبیوں کے انجام کو دیکھتے ہیں اور نہ ان کے حالات سنتے ہیں اور سچوں اور جھوٹوں کی مثال آنکھوں والے اور اندھے سے دی تھی۔ اب اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے چند مثالوں کو پیش کیا ہے۔ اور سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی مثال کو لیا ہے۔ فرماتا ہے۔ کہ نوح سچے نبیوں میں سے تھا۔ اور اس نے نذیر مبین ہونے کا دعوی کیا تھا اس کے حالات پر غور کرو۔

سچے نبی کی زبردست نشانیوں میں سے ایک یہ ہے۔ کہ وہ نذیر مبین ہوتا ہے۔ یعنی (۱) اس کی تعلیم مخفی نہیں ہوتی۔ اور وہ چوری چوری کام نہیں کرتا اور کبھی اپنے پیغام کو اور تعلیم کو لوگوں سے چھپاتا نہیں جبکہ جھوٹے مدعی عام طور پر جتھا بندی کے خیال سے اور لوگوں کے بدک جانے کے ڈر سے اپنی تعلیم کو چھپاتے ہیں۔ اس وقت بھی دیکھ لو کہ باب اور بہا کی تعلیم کو کس طرح مخفی رکھا جاتا ہے۔ ان کی کتب کو بھی ظاہر نہیں ہونے دیا جاتا۔ اور بہائیوں نے باب کی بعض کتب تو تلاش کر کر کے تلف کر دی ہیں۔ (۲) دوسرے سچے نبی کا انذار مبین ہوتا ہے۔ یعنی بے معنی انذار نہیں ہوتا بلکہ دلائل پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اس وجہ سے وہ انذار مایوسی پیدا کر کے قوم کو اور بھی تباہ نہیں کرتا۔ جھوٹے نبیوں کے انذار یونہی نقل کے طور پر ہوتے ہیں۔ اور بے معنی ہوتے ہیں۔ اور لوگوں میں صرف مایوسی پیدا کرنے کا کام دے سکتے ہیں بلکہ تمام نادان لوگ ایسے ہی بے معنی انذار کے عادی ہوتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ انذار بھی ہمیشہ اچھا نہیں ہوتا۔ کبھی اس کا اثر الٹ پڑتا ہے۔ ایسے ہی انذار کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ من قال هلك الناس فهو اهلكهم جو شخص یہ کہتا پھرے کہ لوگ تباہ ہو گئے۔ بے ایمان ہو گئے۔ بے دین ہو گئے۔ در اصل وہی ان کی تباہی و بربادی اور بے ایمانی و کمزوری کا موجب ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے بے دینی اور بے ایمانی کی اہمیت لوگوں کے دل سے اُٹھ جاتی ہے۔ اور مایوسی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب تک کوئی نیا نظام نہ بدلا جائے لوگوں میں یہ احساس نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ ان میں سے کوئی بھی اچھا نہیں رہا۔ ورنہ وہ بالکل ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ ہاں جب ایک نبی آکر نیا نظام قائم کرتا ہے۔ تب انذار عام مضر نہیں ہوتا۔ ایک تو اس لئے کہ واقع میں اس وقت قوم کی حالت خراب ہو چکی ہوتی ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ علاج بھی ساتھ موجود ہوتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ میں نذیر مبین ہوں۔ یعنی میرا انذار دلیل پر مبنی ہے۔ میں قوم کو خراب اور مایوس کرنے کو نہیں آیا۔ بلکہ حقیقت سے آگاہ کرنے کو آیا ہوں۔

اندھے اور سوجاکھے کے فرق کی ایک مثال

غیر مبین انذار لوگوں کے لئے الٹا موجب نقصان ہوتا ہے

سچا نبی ہمیشہ مبین ہوتا ہے۔

مبین کے مفہوم میں عذاب سے بچنے کے طریق کی طرف بھی اشارہ ہے۔

أَنْ لَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّا ٱللَّهَ ۖ إِنِّيٓ أَخَافُ

(اس پیغام کے ساتھ) کہ تم اللہ (تعالیٰ) کے سوا (کسی ہستی) کی پرستش نہ کرو

۲۷ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ ۝

میں یقیناً تم پر ایک (بڑے) تکلیف (دینے) والے دن کے عذاب (کے آنے) سے ڈرتا ہوں ۲۶ے

نذیر مبین کا ایک مطلب یہ بھی ہے۔ کہ میں صرف خالی انذار ہی نہیں کرتا۔ بلکہ اس عذاب سے بچنے کے ذرائع بھی بتاتا ہوں۔ چنانچہ اسی لئے اگلی آیت میں فرمایا ہے۔ کہ اس عذاب سے بچنے کا ذریعہ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اگر تم ایسا کروگے۔ تو عذاب سے بچ جاؤگے۔ تو گویا علاج بتاکر اپنا نذیر مبین ہونا ثابت کیا۔ ظالم بادشاہ کا وجود بھی ملک کے لئے نذیر ہوا کرتا ہے۔ منافقوں کا گروہ اور استبدادیوں کا گروہ بھی قوم اور ملک کے لئے نذیر ہی ہوتا ہے۔ مگر یہ ساری جماعتیں نذیر مبین نہیں ہوا کرتیں۔ کیونکہ وہ خود نہیں کہتیں کہ ہم نذیر ہیں۔ بلکہ وہ تو اپنے آپ کو قوم کی ترقی کا موجب بتاتی ہیں۔ ان کا انذار عملی ہوتا ہے۔ اور پھر اس انذار کی تائید الہام الٰہی سے بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف اس قیاس پر مبنی ہوتی ہے۔ کہ چونکہ اس قوم پر ظالم بادشاہ حاکم ہے۔ تو قوم ضرور تباہ ہوگی یا یہ کہ جب ان کے اندر فسادی لوگ پیدا ہوگئے ہیں۔ تو ان کے لئے ہلاکت ضرور مقدر ہے پس صرف نبی ہی نذیر مبین ہوسکتا ہے۔ کیونکہ وہ خود موجب تباہی نہیں ہوتا۔ بلکہ تباہی سے ہوشیار کرنے والا ہوتا ہے۔ اور اس کے انذار کی بنیاد الہام الٰہی پر اور یقین پر ہوتی ہے۔ اور دوسرے انذاروں میں صرف قیاس ہوتا ہے۔

نذیر مبین صرف نبی ہو سکتا ہے۔

۲۶ے - بعض مفسرین اس بحث میں پڑ گئے ہیں کہ الیم یوم کی صفت کیوں آئی ہے۔ حالانکہ دکھ تو عذاب کی صفت ہے نہ کہ دن کی۔ میرے نزدیک یہ ان کی غلطی ہے انہوں نے اس امر کو نہیں سمجھا۔ کہ جس کلام میں عمیق اور حقائق سے پر معارف بیان کئے جائینگے لازماً اس میں نئے نئے محاورات اور عجیب عجیب ترکیبیں بھی استعمال کرنی پڑینگی۔ ورنہ اس کے باریک مطالب کا اظہار نہیں ہوسکے گا۔ جو شخص بھی غور سے کام لے گا۔ اسے معلوم ہوجائیگا۔ کہ عذاب الیم اور عذاب یوم الیم میں بڑا فرق ہے۔ الیم کو یوم کی صفت بنانے سے اس عذاب کی شان زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔ بہ نسبت عذاب کی صفت بنانے کے۔ الیم کے معنی دکھ دینے والے کے ہیں۔ بیشک عذاب بھی الیم یعنی دکھ دینے والا ہوتا ہے۔ اور اس سے تکلیف ہوتی ہے مگر کئی دن بھی ایسے ہوتے ہیں۔ جن کی یاد ہمیشہ انسانوں کو دکھ دیتی رہتی ہے۔ اور ہزاروں سال بعد بھی ان کی تکلیف کا خیال کرکے انسان کانپ اٹھتے ہیں۔ پس یہ امر ثابت ہے کہ بعض دن بھی الیم ہوتے ہیں۔ بلکہ عذاب تو صرف ان لوگوں کے لئے الیم ہوتا ہے۔ جن پر وہ نازل ہوا ہو۔ مگر خطرناک عذابوں کے زمانہ کی یاد بعد میں آنے والوں کے لئے بھی دکھ کا موجب ہوتی رہتی ہے۔ پس عذاب یوم الیم کہکر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ وہ عذاب ہمیشہ یاد رہنے والا اور لوگوں کو ڈراتے رہنے کا موجب ہوگا۔ اور ان معنوں میں جو خوبی اور جدت ہے۔ وہ عذاب الیم

عذاب الیم کی نسبت ... یوم الیم فرمایا

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا

اس پر ان بڑے لوگوں نے جنہوں نے اس کی قوم میں سے (اس کا) انکار کیا تھا (اسے) کہا (کہ) ہم تجھے اپنے جیسے ایک

بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ

آدمی کے سوا (کچھ) نہیں سمجھتے اور نہ ہم (یہ) دیکھتے ہیں کہ سوائے ان لوگوں کے جو سرسری نظر میں ہم میں سے

اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ

حقیر ترین (نظر آتے) ہیں کسی نے تیری پیروی (اختیار) کی ہو۔ اور ہم اپنے پر تمہاری (کسی قسم کی) کوئی

فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝ ۲۸

فضیلت نہیں دیکھتے۔ بلکہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو ۵۴۷

کہنے میں ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ اور حقیقۃً بھی دیکھو تو آج تک حضرت نوح علیہ السلام کا طوفان ایک ہیبت ناک واقعہ اور وہ دن ایک خوفناک دن سمجھا جاتا ہے۔ اس دن کا ذکر کرنے سے ہی لوگ ڈر جاتے ہیں اور دلوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

۵۴۷ حل لغات۔ بشرًا۔ عُبّر عن الانسان بالبشر اعتبارًا بظهور جلده من الشعر بخلاف الحیوانات التی علیها الصوف او الشعر او الوبر واستوی فی لفظ البشر الواحد والجمع و ثنّی فقال انؤمن لبشرین وخص فی القراٰن کل موضع اعتبر من الانسان جثته و ظاهره بلفظ البشر۔ انسان کو بشر اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے جسم پر بال نہیں ہوتے برخلاف جانوروں کے کہ ان کے جسموں پر بال یا صوف ہوتی ہے۔ اور بشر کا لفظ واحد اور جمع دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ مگر تثنیہ کا صیغہ الگ بنایا جاتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔ انؤمن لبشرین اور قرآن کریم میں جہاں کہیں انسان کے جسم اور شکل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے لئے بشر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ (مفردات) میرے نزدیک بشر آدمی اور انسان کے الفاظ مختلف لحاظ سے بولے جاتے ہیں۔ انسان کے لفظ سے اس کی حقیقت اور اس کے اخلاق کو ظاہر کرتے ہیں۔

بشر

بشر کے لفظ سے اس کے ڈھانچے اور ظاہری شکل پر زور دینا مدنظر ہوتا ہے۔ اور آدمی کے لفظ سے اس کی ابتداء کا اظہار مطلوب ہوتا ہے۔

اراذل

اراذل۔ ارذل کی جمع ہے۔ جو اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ اس کا فعل رَذُلَ بھی ہو سکتا ہے۔ جس کی مصدر رذالۃ ہے۔ اور رَذَلَ بھی۔ جو متعدی ہے۔ اور اس کی مصدر رَذْلٌ ہے۔ اور اس مؤخر الذکر صورت میں ارذل یعنی مرذول ہوگا۔ رَذَلَہٗ کے معنی ہیں جعله رذيلا۔ اسے رذیل قرار دیا۔ ضد انتقاه اسے ردی ٹھہرایا۔ انتخاب میں ساقط کر دیا۔ رد کر دیا۔ ناپسند کیا۔ ناقابل پذیرائی قرار دیا۔ الارذل ایضا الدون فی منظره وحالاته کالرذل والرذیل ارذل کا لفظ علاوہ افعل التفضیل کے معنوں کے اس

چیز یا شخص کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جو اپنے منظر یا حالات کی رو سے حقیر ہو۔ اور یہی معنی لفظ رذل اور رذیل کے ہیں۔ یقال ثوب رذل و رذیل ای دون ردیئ اور جب یہ الفاظ کپڑے کے لئے بولے جائیں۔ تو ان کے معنی میلے اور ردی کے ہوتے ہیں۔ (اقرب) بادی الرائی۔ بادی کے معنی ظاہر کے ہیں۔ یہ بدا یبدو سے نکلا ہے۔ اور بعض لوگوں نے اسے بدء یبدء سے قرار دیا ہے۔ اس صورت میں اس کے معنی ہونگے۔ شروع والا۔ پہلا۔ شروع کرنے والا۔ پہل کرنے والا۔ یہ لوگ بادی الرای کو بادیٔ الرائی پڑھنا بھی جائز سمجھتے ہیں۔

بادی

تفسیر۔ ما نراک الا بشرا مثلنا۔ یعنی تیری ظاہری صورت و شکل ہم سے ملتی ہے اور تو ہماری ہی طرح کا ایک بشر ہے۔ پھر ہم کیونکر تسلیم کریں کہ باطن میں تو ہم سے مختلف ہے اور کیونکر سمجھیں کہ تیری خدا کے دربار میں رسائی ہو گئی ہے۔ اور کیونکر یقین کریں کہ تجھے ایسی طاقتیں ملی ہیں۔ جو ہمیں نہیں ملیں۔ جن کی وجہ سے تو تو خدا کی باتیں سن سکتا ہے۔ اور ہم نہیں سن سکتے۔

اس اعتراض کا جواب کہ جب ہماری ظاہری شکلیں یکساں ہیں۔ تو باطنی فرق کیونکر ہو سکتا ہے

انبیا کے دشمن ہمیشہ سے یہی اعتراض کرتے چلے آئے ہیں۔ اور ان کی دلیل یہ ہوا کرتی ہے کہ انسان کے کمال کی بنیاد علوم کسبیہ پر ہوتی ہے جب یہ نبی کسبی علوم نہیں رکھتے۔ تو انہیں خاص طاقتیں کیسے مل سکتی ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے دشمن بھی یہی دلیل پیش کر کے اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اگر تم کو باطنی طور پر کوئی خاص قوتیں ملتیں۔ تو چاہیئے تھا۔ کہ تمہاری ظاہری شکل بھی بدلی ہوئی ہوتی۔ یعنی علوم ظاہر بھی تم کو خاص رنگ کے عطا ہوتے۔ اور اگر کسبی علوم سے تمہاری عزت نہیں۔ بلکہ خاص موہبت تم کو عطا ہوئی ہے۔ تو پھر باطنی طاقتوں میں فرق کے ساتھ تمہاری ظاہری شکل میں بھی کچھ تغیر چاہیئے تھا۔ مگر یہ تو نظر نہیں آتا۔ پس ہم کیونکر مان لیں کہ تمہارے باطنی قوی ہم سے جدا ہیں۔

یہ انہوں نے اپنی طرف سے ایک بہت بڑا فلسفیانہ نکتہ بیان کیا ہے۔ اور بہت ممکن ہے۔ کہ وہ اس دلیل کی تائید میں ہندوؤں کی طرح بزرگوں کی تصویریں دکھاتے ہوں۔ کہ دیکھو نبی ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے دس دس سر اور کئی کئی مونہہ ہوں۔ گنیش جی کی ہندوؤں نے عجیب شکل تجویز کی ہوئی ہے۔ پہلے زمانہ کے لوگ یہ سمجھ ہی نہ سکتے تھے۔ کہ نبی ظاہری شکل و شباہت میں ہماری طرح کا ایک انسان ہوتا ہے۔ غرض نوح علیہ السلام کے دشمن یہ دلیل بیان کر کے کہ ظاہر کا باطن کے ساتھ مطابق ہونا ضروری ہے۔ اور باطن کا ظاہر کے ساتھ مطابق ہونا لازم۔ حضرت نوح علیہ السلام کے خلاف اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اگر تو نبی ہوتا۔ تو تیری اور ہماری ظاہری شکل و شباہت میں اختلاف لازم تھا۔ اس زمانہ کے دشمنانِ حق اس دلیل کو سنکر سر دھنتے ہونگے اور اس پر واہ واہ کا شور بلند ہوتا ہوگا۔ حالانکہ حقیقت میں یہ بات بالکل فضول اور ہیچ ہے۔ حضرت نوحؑ کے دشمن اس سے آگے بڑھتے ہیں۔ اور ما نراک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا بادی الرأی کہکر اپنی حجۃ کو اور زیادہ مضبوط کرتے ہیں۔ یعنی وہ کہتے ہیں۔ کہ تو خاص قوتوں سے عاری ہے۔ بلکہ صرف ہماری طرح کا ایک بشر ہے۔ رہے تیرے مرید۔ سو وہ ہم سے بھی گرے ہوئے اور گئے گذرے ہیں۔ اب یہ مجموعہ یا معجون مرکب مل کر دنیا میں کیا بنا لیگا۔

بادی الرأی کی ترکیب کے لحاظ سے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ اسے اراذلنا کے متعلق

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ

اسنے کہا اے میری قوم (ذرا) بتاؤ (تو سہی کہ) اگر (ثابت ہو جائے کہ) میں (اپنے دعوی کی بنا) اپنے رب کیطرف سے (عطا شدہ) کسی کھلے نشان پر

سمجھا جائے۔ اس صورت میں اگر بادی کا لفظ بَدَءَ یَبْدَءُ سے سمجھا جائے۔ تو اس کے معنی یہ ہونگے۔ کہ پہلی نظر میں تو نوح ؑ کے تبع رذیل ہی نظر آتے ہیں۔ باطن میں شاید اشراف ہوں تو ہوں۔ یہ قاعدہ ہے۔ کہ کبھی اپنی بات پر زور دینے کے لئے شبہ کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور مطلب اس کے اُلٹ ہوتا ہے۔ جیسے کوئی شخص کہے۔ کہ شاید ہم کمینے ہی ہوں۔ تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے۔ کہ ہم ہرگز ایسے نہیں ہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ حضرت نوح ؑ کے متبعین کے متعلق طنزاً کہتے ہیں کہ پہلی نظر میں تو یہ لوگ رذیل ہی نظر آتے ہیں۔ غور و خوض سے یہ اشراف ثابت ہوں تو ہوں۔ مطلب یہ کہ ان کے رذیل ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

اور اگر اس لفظ کو بَدَا یَبْدُوْ سے سمجھا جائے اور اَرَاذِلُنَا کا متعلق قرار دیا جائے۔ تو اس کے معنی یہ ہونگے۔ کہ ظاہری نظر میں تو یہ لوگ کمینے نظر آتے ہیں کوئی ان کی خاص خوبیاں ہوں تو وہ نوح ؑ کو معلوم ہونگی ہمیں تو نظر نہیں آتیں۔ اس میں بھی طنز ہے۔

دوسری صورت یہ ہے۔ کہ بادی الرأے کو اتَّبَعَكَ کا متعلق قرار دیا جائے۔ اس صورت میں اس آیۃ کے یہ معنی ہونگے۔ کہ ہمارے نزدیک تو چند رذیلے لوگ تجھ پر ایمان لائے ہیں اور وہ بھی بغیر سوچے سمجھے۔ ان کا ایمان اوپرا ایمان ہے۔ اگر وہ بھی تیری تعلیم کی حقیقت پر غور کرتے۔ تو ہرگز نہ مانتے گویا اول تو تیرے اتباع اَرَاذِلُنَا ہم میں سے عیب دار اور ادنیٰ لوگ ہیں۔ اور پھر انہوں نے تیرے قبول کرنے میں غور و فکر اور سوچ بچار سے کام نہیں لیا۔ اس رنگ میں انہوں نے حضرت نوح ؑ کی انتہائی تحقیر کی ہے۔

تیسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں۔ کہ ان کی اتباع محض ظاہری ہے۔ یعنی ان لوگوں نے بعض فواید کے حصول کے لئے صرف ظاہر میں مانا ہے۔ دل میں یہ بھی ایمان نہیں لائے۔ گویا تین معنی ہوئے۔

١۔ ہمارا پہلا یا ظاہری خیال تو یہ ہے۔ کہ جن لوگوں نے تجھے مانا ہے۔ وہ اراذل ہیں۔

٢۔ ان لوگوں نے بھی بغیر فکر کے مانا ہے۔

٣۔ جن لوگوں نے مانا ہے۔ انہوں نے صرف ظاہر میں مانا ہے۔ حقیقت میں دل سے کسی نے نہیں مانا۔

ما نری لکم علینا من فضل۔ یعنی ہم یہ بھی مان لیتے ہیں کہ کوئی باریک اور مخفی بات ہوگی جس کی وجہ سے خدا نے تمہیں یہ درجہ دیدیا ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ۔ کہ اگر سچ مچ ایسی خوبی تم میں تھی۔ تو کیا اس کے نتیجہ میں تم کو کوئی خاص شان و شوکت نہیں ملنی چاہیئے تھی۔ کیونکہ جس کے اندر کوئی خاص قابلیت ہوتی ہے۔ وہ اپنے ہمعصروں پر غالب آجاتا ہے۔ مگر یہ بات بھی ہمیں نظر نہیں آتی۔

پھر ان سب دلائل کے مجموعہ کا وہ آخری نتیجہ یہ نکالتے ہیں۔ کہ ہمیں یقین ہے کہ تم جھوٹے ہو۔ کیونکہ بلا وجہ اور بلا سبب اپنی برتری اور اپنے حق پر ہونے کا دعوی کرتے ہو۔

آہ یہ ایک قدیم دستور ہے۔ کہ لوگ نبیوں کو اپنے بنائے ہوئے معیاروں پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب وہ ان معیاروں پر پورے نہیں اترتے تو تسکین قلب کے ساتھ یہ خیال کر لیتے ہیں کہ انہوں نے ان کے دعوی کو غیر متعصبانہ طور پر سوچ لیا۔ اور اسے غلط پایا

وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ

رکھتا) ہوں اور اس نے اپنے حضور سے مجھے (اپنی) ایک (بہت بڑی) رحمت عطا کی ہو اور وہ تم پر مشتبہ رہی ہے۔ (تو تمہارا

۲۹ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ○ وَيٰقَوْمِ لَآ

کیا حال ہوگا) کیا ہم اس (روشن نشان کو بھی تم پر (جبراً) واجب کر دینگے اگرچہ تم اُسے ناپسند کرتے ہو ۲۸ اور اے میری قوم میں

اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ

اس کی بابت تم سے کوئی مال نہیں مانگتا۔ میرا اجر اللہ (تعالیٰ) کے سوا (اور) کسی پر نہیں

وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا

اور میں ان لوگوں کو جو (مجھ پر) ایمان لائے ہیں ہرگز نہیں دھتکاروں گا۔ وہ (تو) اپنے رب سے ملنے (کا شرف پانے) والے

۳۰ رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ○

ہیں۔ بلکہ (اس سے بڑھکر بات یہ ہے کہ) میں تمہیں ایسے لوگ خیال کرتا ہوں۔ جو جہالت سے کام لیتے ہیں ۲۹

دنیا اس قدر ترقی کر چکی ہے اور اس قدر انبیاء گذر چکے ہیں۔ لیکن اب بھی انسان خدائی کلام کو اور خدا کے فرستادوں کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ معیار پر پرکھنے کے لئے طیار نہیں بلکہ اپنی غلط خیالات کے مطابق ان کی سچائی کو دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن کیا اس طرح ہدایت مل سکتی ہے ؟ ہرگز نہیں۔

جبری تبلیغ کے عقیدہ کا ابطال

اَلْزَمَ

۲۸ حل لغات۔ اَلْزَمَ فلانًا المالَ والعملَ اَوْجَبَهٗ علیہ اس کے ذمہ ڈالدیا اس کی ادائیگی یا اس پر عمل پیرا ہونا اس کے ذمہ لازم کر دیا (اقرب)

تفسیر۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوتا ہے کہ اپنی مخالفوں کو توجہ دلائیں کہ تم تھوڑی دیر کیلئے فرض کر لو کہ یہ واقعہ صحیح ہے کہ مجھے اپنی رب کی طرف سے دلائل ملے ہیں۔ اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت دی ہے۔ اور پھر یہ بھی فرض کر لو کہ وہ بینات اور رحمت ایسی پیچیدہ صورت میں آئے ہیں۔ کہ تمہیں نظر نہیں آتے تو بتلاؤ کہ کیا بغیر اس کے کہ تم غور کرو۔ ہم تمکو سمجھا سکتے ہیں یعنی کسی حقیقت کے سمجھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ انسان اس پر غور وفکر کرے اور اسے ایسے راستہ سے سوچے جسکے ذریعہ سے اسے سمجھا جا سکے۔ لیکن تم لوگ تو پہلے ہی اسے ناپسند کرنے لگے ہو۔ اور سنتے ہی تم نے اسے ردی قرار دیدیا ہے پھر تمہارے سمجھنے کی کیا صورت رہ جاتی ہے۔ صرف جبر ہے۔ سو وہ کیا نہیں جا سکتا۔ اس آیت سے جبری تبلیغ کے عقیدہ کی تردید ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ جو دین کو ناپسند کرے۔ اسے جبراً دین نہیں سکھایا جاتا۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو کسی امر کی تحقیق کرنے کی بجائے اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ وہ حق سے محروم رہ جاتے ہیں۔ جو شخص صداقت کا متلاشی ہو۔ اسے چاہیئے کہ اپنے دل کو ہمیشہ تعصب سے خالی رکھے اور سچی تلاش کی عادت ڈالے۔

بلا تحقیق کسی امر سے نفرت رکھنا محرومی کا باعث ہے

طَرَدَ

۲۹ حل لغات۔ طارد۔ طَرَدَ سے اسم فاعل ہے طرد کے معنی ہیں۔ اَبْعَدَ۔ دور کر دیا۔ ہٹا دیا۔ رد کر دیا۔ (اقرب)

مجھے جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں

تفسیر۔ ان کے تعصب کی حالت کو بیان کرنے کے بعد حضرت نوح ؑ اپنی صفائی پیش کرتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں۔ کہ عقلمند

انسان جو کام کرتا ہے۔ کسی مقصد کیلئے کرتا ہے۔ اگر میں ویسا ہی ہوں۔ جیسا کہ تم سمجھتے ہو۔ اور جھوٹا کلام بنا کر تم کو سنا رہا ہوں۔ تو یہ تو سوچو کہ اس میں میری غرض کیا ہے۔ کیا میں اس کام میں کوئی فائدہ حاصل کر رہا ہوں تم خوب جانتے ہو۔ کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگ رہا۔ پھر مجھے جھوٹ بنانے کی ضرورت کیا پیش آئی تھی۔

حکومت بھی مقصد نہیں

شاید کوئی شخص کہے۔ کہ گو نوح ؑ اجر طلب نہیں کر رہے تھے۔ مگر آخر اپنے ماننے والوں پر حکومت تو کرتے تھے۔ اور کئی لوگ حکومت کے حصول کے لئے جھوٹ بول لیتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض بھی درست نہ ہوگا۔ اس لئے کہ انبیاء اپنی تعلیم پر دوسروں سے زیادہ عامل ہوتے ہیں۔ پس وہ کام جسے وہ خود دوسروں سے بڑھ کر کر رہے ہوں حاکمانہ فعل نہیں کہلا سکتا۔ اس صورت میں تو ان کی حکومت بھی خادمانہ حکومت ہی کہلا سکتی ہے۔ جسے کوئی شخص لالچ اور حرص کے تابع قرار نہیں دے سکتا۔

اپنے اتباع کے ایمان و اخلاص کا اثبات

اپنی برأت کے بعد حضرت نوح علیہ السلام اپنے اتباع کی بریت کرتے ہیں اور پہلا جواب یہ دیتے ہیں۔ کہ یہ لوگ ظاہر میں ایمان دار ہیں۔ اور جب یہ ظاہر میں ایمان لا چکے۔ تو میرا حق نہیں کہ میں وساوس اور شبہات کی بنا پر انہیں اپنے پاس سے دھتکار دوں اور دور کردوں۔ دوسرے یہ کہ جب میں کسی سے کچھ طلب نہیں کرتا۔ تو میرے نزدیک غریب و امیر برابر ہو گئے۔ پھر میں کیوں انہیں دھتکاروں۔ میرے نزدیک تو ایمان کا سوال ہی اہمیت رکھتا ہے۔ اور ایمان ان لوگوں کو حاصل ہے۔ پس جو چیز میری نظر میں عزت ہے۔ جب وہ انہیں حاصل ہے تو تمہارا یہ اعتراض کہ یہ اراذل ہیں۔ میری نظر میں کیا وقعت رکھتا ہے۔

دوسرا اعتراض آپ کے مریدوں پر کفار نے یہ کیا تھا۔ کہ یہ لوگ ظاہر میں ایمان لائے ہیں۔ ان کے دل میں ایمان نہیں۔ اس کا جواب یہ دیا کہ جس طرح میں ان سے کچھ نہیں مانگ رہا۔ یہ لوگ بھی مجھ سے کچھ نہیں لے رہے۔ پھر میرا کیا حق ہے کہ ان کے ایمان کی نسبت شبہ کروں۔ یہ خدا تعالے کے فضل کے طالب ہیں۔ اور وہ عالم الغیب ہے۔ آخر یہ اس کے سامنے پیش ہونگے اور اس کی ملاقات ان کو نصیب ہوگی۔ جو ان میں سے جھوٹا ہوگا۔ خدا تعالیٰ خود اس سے مناسب معاملہ کرے گا۔ مجھے اس جھگڑے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

میں جھوٹا نہیں بلکہ تم بد اخلاق ہو۔

تیسرا اعتراض نوح علیہ السلام کے دشمنوں کا یہ تھا۔ کہ تم کو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ بلکہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ اور اس طرح ادنیٰ درجہ کے لوگ ہو۔ اس کا جواب یہ دیا کہ میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ سچائی سے منہ موڑ رہے ہو۔ یعنی تم کو یہ خوب معلوم ہے۔ کہ ہمارے اخلاق کیسے ہیں۔ اور آیا ہم جھوٹ بولتے ہیں یا سچ بولتے ہیں۔ لیکن تم دشمنی کی وجہ سے ان امور کو چھپاتے ہو اور تجاہل سے کام لیتے ہو۔

حضرت نوح ؑ کا اپنی پہلی زندگی کو اپنی سچائی کے ثبوت میں پیش کرنا

یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ کہ جو نبی بھی آتا ہے اس کی دعوے سے پہلے کی زندگی بھی نہایت ہی راستبازی کی زندگی ہوتی ہے۔ وہ جھوٹ سے ہمیشہ سے محفوظ چلا آیا ہوتا ہے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام اس جگہ اس امر کو پیش کرتے ہیں۔ کہ میری سچائی کے تو تم بھی قائل ہو۔ ہاں دعوے کے بعد دشمنی کی وجہ سے الزام لگانے لگے ہو۔

ملاقات رب کے معنی واصل باللہ

اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تم تو کہتے ہو۔ کہ انہیں کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن میں تو ان کے چہروں سے محسوس کرتا ہوں۔ کہ وہ لوگ واصل باللہ ہو رہے ہیں۔ تم لوگ خود علم روحانی

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا

اور اے میری قوم اگر میں ان کو رد کردوں۔ تو اللہ کی طرف سے (آنیوالی اس فعل کی سزا سے مجھے بچانے کے لیے) کون میری مدد کریگا

۳۱ تَذَكَّرُوْنَ ○ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ

پھر کیا تم (پھر بھی) نہیں سمجھتے ؀ اور میں تم سے (یہ) نہیں کہتا (کہ اللہ تعالیٰ) کے خزانے میرے پاس ہیں۔

وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ

اور نہ یہ کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ میں (یہ) کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ میں ان لوگوں کے متعلق جنہیں تمہاری آنکھیں

تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ

حقارت (کی نگاہ) سے دیکھتی ہیں (یہ) کہتا ہوں (کہ اللہ تعالیٰ) انہیں (کبھی) کوئی بھلائی نصیب نہیں کریگا۔ جو کچھ

سے کورے ہو۔ اسی لئے تمہیں ان کے چہروں سے ایمان نظر نہیں آتا۔ تم کہتے ہو ما نرٰی لکم علینا من فضل کہ ہمیں تمہاری اپنے پر کوئی فضیلت نظر نہیں آتی۔ حالانکہ خدا کا فضل ہو رہا ہے۔ اور یہ لوگ خدا کا قُرب حاصل کر رہے ہیں۔ تم نہ دیکھو تو اس میں ان کا کیا قصور ہے۔

اصل فضیلت وہ ہے جو خدا تعالیٰ کے ہاں فضیلت ہو

نادان انسان صرف دنیا کی فضیلت کو فضیلت سمجھتا ہے۔ خدا رسیدہ کے نزدیک اصل فضیلت وہ ہے جو خدا تعالیٰ کے ہاں ہو۔ حضرت نوح ؑ تو یہ دیکھتے تھے۔ کہ ان کے اتباع قرب الٰہی کی راہوں میں ترقی کر رہے ہیں۔ اور کفار اُن کے کپڑوں اور کھانوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس قدر مختلف نقطۂ نگاہوں سے ایک نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا۔ اس لئے دونوں کے نتیجوں میں زمینؔ آسمان کا فرق تھا۔ ایک جماعت اتباع نوح علیہ السلام کو اراذل دیکھ رہی تھی۔ دوسرا شخص ان کو شریف ترین وجود پاتا تھا۔

حضرت نوح ؑ کے اتباع کی قربانیاں

ولکنی ارٰکم قوما تجھلون سے ان قربانیوں کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ جو حضرت نوح علیہ السلام کے اتباع کر رہے تھے۔ کیونکہ نبی پر ابتدا میں ایمان لانا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ بلکہ آگ میں کودنے سے کم یہ فعل نہیں ہوتا۔ پس حضرت نوح ؑ اپنے مخالفین کو توجہ دلاتے ہیں کہ کیا تم لوگ ان کی قربانیوں کو نہیں دیکھتے۔ ان کا ایمان اور اخلاص دیکھکر بھی یہ کہنا۔ کہ ان کا ایمان صرف ظاہری ایمان ہے۔ کس قدر بیوقوفی کی بات ہے۔

۳۵ - آپ کے اتباع پر جو ارذل ہونے کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس کا مزید جواب حضرت نوح ؑ اس طرح دیتے ہیں۔ کہ ان کو رذیل کہنے سے تمہاری غرض تو یہی ہے نہ کہ میں ان کو اپنے پاس سے جدا کردوں۔ لیکن اتنا تو سوچو کہ مجھے تم سے تو کوئی غرض نہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ سے غرض ہے پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ میں تمہیں خوش کرنے کیلئے خدا تعالیٰ کو ناراض کرلوں۔ جب تم لوگوں کی خاطر جو ایمان نہیں لائے میں ایمان لانے والوں کو نکال دونگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے جو میری نصرت کا سامان پیدا کیا ہے۔ اسکی ناقدری کرنے کے سبب سے یقیناً وہ مجھ سے ناراض ہوگا۔ اور اس کی ناراضگی کے بعد میں اس عظیم الشان فرض کو کس طرح ادا کر سکونگا جو اس نے میرے ذمہ لگایا ہے ✦

اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ ۳۲

انکے نفسوں میں ہے اسے اللہ (ہی سب سے) بہتر جانتا ہے۔ اس صورت میں میں یقیناً (یقیناً) ظالموں میں سے ہوں گا ۱۳۱ـه

۱۳۱ـه حل لغات۔ تزدری ازدراہ۔ احتقرہ اسے حقیر سمجھا۔ واستخف بہ اسے ذلیل سمجھا۔ (اقرب)

تفسیر۔ مخالفین کے اعتراضوں کا حضرت نوحؑ ایک نئے پیرایہ میں جواب دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ تم لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ میں تمہارے جیسا بشر ہوں۔ لیکن میرے دعوی اور بشر ہونے میں کوئی مخالفت نہیں ہے۔ میں تو ایک پیغامبر ہوں۔ اور پیغامبر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ان لوگوں سے جن کی طرف وہ بھیجا گیا ہو مختلف الانواع ہو۔ بلکہ اس کا تو ان سے متحد ہونا ضروری ہے ہاں اگر میں یہ کہتا۔ کہ خدا تعالے نے اپنی خدائی میرے سپرد کر دی ہے۔ تو بیشک تم یہ مطالبہ کر سکتے تھے کہ ہمارے جیسا ایک بشر خدا تعالے کی خدائی کس طرح سنبھال سکتا ہے۔ مگر مجھے تو یہ دعوی ہرگز نہیں۔ بلکہ صرف یہ دعویٰ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے اس علم کو جو وہ بندوں پر ظاہر کرنا چاہتا ہے میرے ذریعہ سے ظاہر کرتا ہے۔

دوسرے اعتراض کا جو آپ کے اتباع پر تھا۔ اس طرح مزید جواب دیتے ہیں۔ کہ تم تو ان کے موجودہ حالات پر قیاس کرتے ہو۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے۔ کہ آئندہ کیا ہوگا۔ میں تو یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ کہ آئندہ ان کو خدا تعالیٰ کی طرف سے بہتر سے بہتر جزا نہ ملے گی۔ یہ ایک لطیف پیرایہ ہے۔ اس امر کے کہنے کا۔ کہ آئندہ بہتر بدلے ان کو ملنے والے ہیں۔ اس قسم کا کلام ایک تعریضی اثر رکھتا ہے۔ اور زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ چنانچہ اگلے حصہ آیت میں آپ اس کی تفصیل بھی کر دیتے ہیں۔ کہ رذیل تو وہ شخص ہوتا ہے جس کا دل گندہ ہو۔ اور دل کا حال خدا جانتا ہے۔ تم ظاہری حالت پر قیاس کرتے ہو۔ حالانکہ ظاہری غربت سے انسان رذیل نہیں بنتا۔ بلکہ دل کی ناپاکی سے رذیل بنتا ہے۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ ہی دلوں کو دیکھنے والا ہے۔ اس لئے اگر یہ رذیل نہ ہوئے۔ یعنی دل کے گندے نہ ہوئے۔ تو یقیناً وہ ان کو ان کی خدمات کے صلہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ بدلہ دیگا۔

آخری حصہ میں بتا دیا۔ کہ ناحق دعوی کرنیوالا یا کسی شخص پر بلاوجہ فتوی لگا دینے والا ظالم ہوتا ہے پس میں تو نہ اپنی نسبت وہ باتیں کہتا ہوں۔ جن کا مجھے حق نہیں۔ اور نہ مومنوں پر ان کے ظاہر کے خلاف فتوی لگانے کے لئے تیار رہوں۔

افسوس کہ اللہ تعالیٰ کے نبی تو ظاہر کے خلاف فتولے لگانے سے اس قدر اجتناب کرتے ہیں لیکن دوسرے لوگ جن کے لئے زیادہ خوف کا مقام ہے چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے خطرناک سے خطرناک اتہام لگانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں ظلم کسی کا حق دوسرے کو دبینے کا نام ہے۔ پس مطلب یہ ہے۔ کہ اگر میں پہلی بات کہوں۔ تو اس صورت میں خدا کا حق اپنے آپ کو دینے والا بن جاؤں گا۔ اور دوسری بات کہوں۔ تو میں مومنوں کا حق چھینے والا قرار پاؤں گا۔ گویا دونوں صورتوں میں میں ظالم بن جاؤں گا۔

اِزْدَرٰی

[1] بشریت اور نبوت میں کوئی تضاد نہیں

[2] کسی کے ظاہر کے خلاف اسپر فتوی لگانا ظلم ہے

[3] ان مومنوں کسلا نیوالوں کو بڑے بڑے مراتب اور انعامات عطا ہونے والے ہیں

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا

انہوں نے کہا کہ) اے نوح تو ہم سے (خوب) بحث کر چکا ہے۔ اور تو ہم سے بہت (دفعہ) بحث کر چکا ہی۔ اب تو اگر سچا ہی

۳۳ بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَا

تو (باتوں کو جانے دے اور) جس (عذاب) کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے اُسے ہم پر لے آ۔ ۳۲ اس نے کہا (یہ) صرف اللہ ہی

۳۴ يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ وَلَا

اگر چاہیگا تو لائیگا۔ اور تم (اسے اس کے لانے سے) ہرگز عاجز نہیں کر سکتے ۳۳ اور اگر میں

يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ

(ذاتی طور پر) تم سے خلوص (کا تعلق) رکھنا چاہوں (بھی) تو میرا (تم سے) خلوص رکھنا تمہیں اللہ کے عذاب سے بچنے کے لئے

۳۵ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

کوئی نفع نہیں پہنچائیگا۔ اگر اللہ (تعالیٰ یہ) چاہتا ہو کہ تمہیں ہلاک کرے وہ تمہارا رب ہی اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ۳۴

۳۲ چونکہ اوپر کی آیات میں حضرت نوح ع نے اشارۃً مومنوں کی ترقی کی پیشگوئی کی تھی - اور یہ ظاہر امر تھا - کہ مومن تبھی ترقی کر سکتے تھے - جبکہ ان کے دشمن ہلاک ہو کر ان کے لئے رستہ صاف کریں - اس لئے کفار نے سمجھ لیا - کہ اس میں ہماری ہلاکت کی بھی خبر ہے - اور مطالبہ پیش کر دیا - کہ اچھا بحث جانے دو - یہ بتاؤ کہ جو تم نے ہماری ہلاکت کی خبر دی ہے - وہ کب پوری ہوگی -

نصح

۳۳ حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا کہ سمجھ تو تم ٹھیک گئے ہو - لیکن عذاب کا لانا اللہ تعالےٰ کے اختیار میں ہے - میرے اختیار میں نہیں - اس آیت میں وعیدی پیشگوئیوں کی نسبت تین اصل بتائے ہیں - اول یہ کہ ان کے اوقات عام طور پر مخفی رکھے جاتے ہیں - دوسرے یہ کہ وہ ٹل سکتی ہیں - کیونکہ ان شاء کہکر بتا دیا ہے - کہ عذاب کی خبر ٹل بھی جائے - تب بھی مشیت الٰہی سے

وعیدی پیشگوئیوں کے متعلق تین اصل

غوی

معلق رہتی ہے - تیسرے یہ کہ تفصیلی پیشگوئیاں خواہ ٹل بھی جائیں - اصولی فیصلہ کہ خدا تعالیٰ کے بندے غالب ہو کر رہینگے نہیں بدلتا - تبھی فرمایا کہ خدا چاہیگا تو عذاب آ جائیگا لیکن بہرحال خواہ عذاب آئے یا نہ آئے - تم لوگ مومنوں پر غالب نہیں آ سکتے اور اللہ تعالیٰ کے کام میں روک نہیں بن سکتے -

۳۴ حل لغات - نصحی - نَصَحَهٗ و نَصَحَ لَهٗ نصحاً و نُصحاً و نصاحةً و نصاحيةً ينصحه - اى وَعَظَهٗ - اُسے نصیحت کی - و اَخْلَصَ لَهُ المَوَدَّةَ - اور اس سے بغیر غرض کے محبت کی - وَاَلا فْصَحُ بصلَةِ اللام - اور اس لفظ کو لام کے صلہ سے استعمال کرنا زیادہ فصیح ہے - یُغْوِیکُم - غَوٰی یَغْوِی غَيًّا ضَلَّ وخابَ اَنهمكَ فى الجهل هَلَكَ گمراہی - ناکامی اور جہالت میں پڑ کر تباہ ہوگیا - غَوِیَ غَوَایَۃً ضَلَّ - گمراہ ہوگیا - اغواہ - اَضَلَّہٗ - اغواء کے معنی ہے برباد اور ہلاک کر دیا (اقرب الموارد)

تفسیر - حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں -

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ

کیا وہ کہتے ہیں (کہ) اس نے اس (وعدۂ عذاب وغیرہ) کو اپنی پاس سے گھڑ لیا ہے۔ تو (انہیں) کہہ اگر میں نے اسے اپنی پاس سے گھڑ لیا ہے تو میرا یہ

إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ ۝

ع ۳ ۱۱ ۳ ۳۶

خطرناک جرم (ضرور) مجھ پر (ہی) وبال بنکر) پڑیگا اور (تمہارے جرموں کا وبال مجھ پر نہیں ہوگا کیونکہ) جو خطرناک جرم تم کرتے ہو ان سے میں بیزار ہوں ۳۵

کہ مجھے بیشک تمہاری ہدایت کی خواہش ہے۔ اور میں تم کو بہت اخلاص رکھتا ہوں مگر میرا اخلاص خدا کی محبت سے جو تمہارا رب ہے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ جب وہ دیکھے کہ تمہارا ہلاک ہونا ہی ٹھیک ہے۔ تو پھر میرے ارادے تو اس کے تابع ہیں۔

یہ آیت نہایت واضح طور پر اس اعتراض کو رد کرتی ہے جو کہا جاتا ہے کہ حضرت نوح ؑ نے خود بد دعا کی۔ حضرت نوح ؑ نے بد دعا نہیں کی بلکہ خدا تعالیٰ نے خود کروائی۔ وہ تو صاف کہہ رہے ہیں۔ کہ اگر خدا ہلاک کرنا چاہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ پھر ھود بکھو کہکر اللہ تعالیٰ پر سے بھی اعتراض کو دور کر دیا۔ اور یہ بتا دیا کہ جب اس نے جو تمہارا رب ہے۔ تمہاری ہلاکت کا فیصلہ کیا ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب تمہاری ہلاکت ہی تمہارے لئے اور دوسروں کے لئے مفید ہے۔

۳۵ حل لغات - اجرامُ - اَجْرَمَ کی مصدر ہے۔ جس کے معنی ہیں اَذْنَبَ۔ گناہ کیا۔ عَظُمَ جُرْمُہٗ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوا۔ (اقرب) پس اجرام کے معنے ہوئے بہت بڑا گناہ کرنا۔

تفسیر - اس آیت میں بھی حضرت نوح علیہ السلام ہی کا ذکر ہے نہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اور فرق صرف یہ ہے۔ کہ پہلے تو حضرت نوح ؑ لوگوں کو مخاطب کرتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مخاطب کیا ہے کہ تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں اور یہ سب امور اپنے پاس سے بنا رہا ہوں۔ تو یہ تو ایک

حضرت نوح ؑ نے اپنی قوم پر خود بخود بد دعا نہیں کی تھی

بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ اور اس کی سزا مجھے ملے گی۔ پس تم کو گھبرانے کی ضرورت نہیں اور اگر میں سچا ہوں۔ تو تمہارا انکار بھی ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ اس کی سزا تم کو ملے گی۔ اور مجھے اس سے کوئی خوف نہیں۔

حضرت نوح ؑ کا دعوئے عصمت

میں تمہارے جرموں سے بری ہوں کہکر حضرت نوح علیہ السلام نے افترار کے الزام کا ایک اور بھی لطیف جواب دیا ہے۔ جو یہ ہے۔ کہ تم لوگ ذرا غور تو کرو۔ کہ تمہاری قوم میں جتنے گناہ پائے جاتے ہیں۔ میں اُن سب سے پاک ہوں۔ پھر کس طرح ممکن تھا۔ کہ خدا پر جھوٹ باندھنے کا جو بدترین گناہ ہے۔ اس کا میں مرتکب ہو جاتا۔ کیا عقل اس بات کو تسلیم کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ پس افترار کا الزام بالکل باطل ہے۔

اِجرام

اس جگہ پر ویری صاحب نے ایک اعتراض کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ جو بعض لوگوں نے کہا ہے۔ کہ اس آیت میں حضرت نوح ؑ مراد ہیں اور انہی کی طرف سے یہ جواب دیا گیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے۔ کہ (نعوذ باللہ) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود قرآن بنایا کرتے تھے۔ بناتے بناتے اس جگہ بھول گئے۔ کہ میں اپنی بات کرتا ہوں یا نوح کی اور جھٹ کہہ دیا۔ ام یقولون افتراہ الآیۃ میرے نزدیک معنی تو وہی صحیح ہیں۔ جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں۔ لیکن ویری صاحب کا کلام پڑھنے کے بعد میں ان معنوں کو

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا

اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا تیری قوم میں سے (اب کوئی) (اور شخص تجھ پر) قطعاً ایمان نہیں لائیگا

مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۳۷

اس لئے جو (کچھ) وہ کر رہے ہیں اس کی وجہ سے تو افسوس نہ کر ۳۶ھ

بھی صحیح سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اس میں اللہ تعالیٰ نے ویری صاحب کے اعتراض ہی کا جواب دیا ہے۔ اور وہ اس طرح سے کہ ویری صاحب نے آیت وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وغیرہ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اعتراض نوح علیہ السلام پر نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئے تھے۔ مگر انہوں نے ان کا جواب حضرت نوح کی زبان سے دیا تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ ایسے اعتراض ہمیشہ سے ہوتے چلے آئے ہیں کوئی نئے اعتراض نہیں ہیں۔ گویا ویری صاحب نے اس اعتراض میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء کا الزام لگایا ہے۔ پس بالکل ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عالم الغیب ہے پہلے ہی سے اس جگہ جملہ معترضہ کے طور پر ویری صاحب اور ان کی طرح کے دوسرے معترضوں کا جواب دے دیا ہو۔ اور فرما دیا ہو۔ کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آئندہ زمانہ میں بعض لوگ پچھلی باتوں پر اعتراض کرینگے اور کہیں گے کہ یہ نوح کی کہی ہوئی نہیں۔ بلکہ تو نے اپنے پاس سے بنائی ہیں تو بھی ان کو یہ بات جواب میں کہہ دے کہ اگر میں مفتری ہوں تو اس کی سزا خدا سے پاؤنگا۔ اور اس سے بچ نہیں سکتا مگر واقعات نے بتلا دیا۔ کہ جسے ویری صاحب خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں اُسے تو دشمن پھانسی پر لٹکانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن جسے وہ مفتری قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنے دشمنوں پر غالب آ گیا۔ کیا مفتری کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ اسیطرح اپنے زمانہ کے تمام عیبوں

ابتأس

حضرت نوح نے اپنی قوم کی ہلاکت کے لئے بد دعا نہیں کی تھی۔

اور نجاستوں سے پاک ہونے کی وجہ سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے پر مہر صداقت ثبت ہوتی ہے ✦

۳۶ھ حل لغات۔ ابتأسہ۔ کَرِھَہٗ۔ ناپسند کیا۔ حَزِنَ۔ افسوس کیا۔ لا تبتئس لاتحزن ولا تشتک۔ یعنی لا تبتئس کے معنی ہیں غم نہ کر۔ اور شکایت نہ کر (اقرب)

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے کہ تیری قوم میں سے جو ایمان لا چکے سو لا چکے۔ آئندہ لوگ ایمان نہیں لائینگے صاف پتہ لگتا ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا کو جسے بد دعا کہا جاتا ہے۔ اگر بد دعا ہی سمجھا جائے تو بھی وہ خدا کے حکم کے ماتحت تھی۔ کیونکہ اس آیت کے آخر میں فلا تبتئس بما کانوا یفعلون فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس وقت یہ الہام ہوا تھا اس وقت تک حضرت نوح ؑ اپنی قوم کی ہدایت سے مایوس نہیں ہوئے تھے۔ اور ان کی حالت پر غمگین تھے کہ اس وقت تک وہ ایمان کیوں نہیں لائے۔ اب اگر یہ خیال کیا جائے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا یعنی رب لا تذر علی الارض من الکافرین دَیَّارًا (نوح ع) بد دعا تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ اس الہام سے جو اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ پہلے کی تھی یا بعد کی۔ اگر بعد کی تھی۔ تو حضرت نوح علیہ السلام کی دعا بد دعا نہ رہی۔ بلکہ وہ خدا تعالیٰ کے فیصلہ پر ایک قسم کا اظہار تسلیم تھا۔ کیونکہ اگر خدا تعالیٰ لوگوں کی تباہی کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ تو حضرت نوح علیہ السلام کو بد دعا

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ

اور تو ہماری آنکھوں کے (سامنے) اور ہماری وحی (کے حکم) کے مطابق کشتی بنا - اور جن لوگوں نے ظلم (کا شیوہ اختیار)

۳۸ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝

کیا ہے ان کے متعلق مجھ سے (کوئی) بات نہ کرنا - وہ ضرور (ہی) غرق کئے جائیں گے ۵۳ے

کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی - اور اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ دعا اس الہام سے پہلے کی ہے تو پھر بھی بات نہیں بنتی کیونکہ اگر حضرت نوحؑ اس الہام سے پہلے ہی اپنی قوم کی ہلاکت اور تباہی کی دعا کر رہے تھے - تو اس آیت میں یہ کیوں کہا گیا ہے - کہ اب تیری قوم ایمان نہیں لائیگی لیکن تو اس مشیت الٰہی پر غم نہ کر - جو شخص پہلے ہی قوم کی تباہی کی دعا کر رہا تھا - اس نے قوم کی تباہی کی خبر سنکر غم کیوں کرنا تھا - وہ تو خوش ہوتا -

غرض دونوں صورتیں جو اوپر بیان ہوئی ہیں - ٹھیک نہیں بنتیں اور اصل بات یہی ہے - کہ آیت مذکورہ کا الہام پہلے کا ہے اور دعا بعد کی ہے - اور بطور بددعا نہیں - بلکہ الٰہی فیصلہ کی تصدیق کے رنگ میں ہے - گویا حضرت نوح علیہ السلام یوں کہتے ہیں کہ اے میرے رب تو ان کو جس طرح تو نے فیصلہ کیا ہے - تباہ کرنے میں تیری رضا پر راضی ہوں - اور اگر اس کا نام بددعا بھی رکھا جائے - تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت بددعا ہے - اور ایسی بددعا جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہو نبی کی شان کے خلاف نہیں - کیونکہ جب علیم و خبیر خدا کسی قوم کی خراب حالت کو ظاہر کردے - تو پھر ہدایت سے محروم رکھنے کی دعا صرف واقعات کا اظہار رہ جاتی ہے -

اگر یہ کہا جائے کہ خدا تعالیٰ تو فیصلہ کر ہی چکا تھا - پھر حضرت نوح ؑ کو دعا مانگنے کی کیا ضرورت تھی - تو اس کا جواب یہ ہے - کہ بعض وقت نبی کو عذاب کی خبر تو معلوم ہو جاتی ہے - مگر وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کو دیکھ کر اپنی قوم کے لئے سفارش کرتا رہتا ہے - اور سمجھتا ہے کہ شائد اللہ تعالیٰ وعید کو ٹلا دے - حضرت نوح ؑ بھی اسی طرح کرتے رہے - یہانتک کہ انہوں نے سمجھ لیا - کہ عذاب میں تاخیر کرنے سے خود دین کو نقصان ہوگا - تب انہوں نے دعا کی کہ خدا تعالیٰ اپنے اس فیصلہ کو جو وہ کر چکا ہے جاری کر دے -

فلک

عین

۵۳ے حل لغات - الفلک - السفینۃ - کشتی - یہ لفظ کبھی مذکر استعمال ہوتا ہے - کبھی مؤنث (راغب) اعین - عین کی جمع ہے اور عین ان لفظوں میں سے ہے - جن کے عربی زبان میں بہت کثرت سے معنی پائے جاتے ہیں - العین الباصرۃ اس کے معنی آنکھ کے ڈھیلے کے بھی ہیں - وقد تطلق علی الحدقۃ اور اس کے معنی آنکھ کی سیاہی کے بھی ہوتے ہیں - والاصابۃ بالعین اور نیز اس کے معنی ہیں نظر لگانا - واھل البلد ایک شہر کے لوگ واھل الدار - ایک گھر کے لوگ - ایک کنبہ - والاصابۃ فی العین یقال بہ عین - آنکھ کی بیماری کو بھی عین کہتے ہیں - (اردو میں بھی یہ محاورہ ہے کہ آنکھیں آگئیں) - الدیدبان خبر رسان - الجماعۃ - جماعت - گروہ - حاسۃ البصر - نظر - الحاضر من کل شیئ - جو چیز آنکھ کے سامنے ہو - خیار الشیئ - اچھی چیز - الدینار - سونے کا سکہ - نفس الشیئ - کسی چیز کا وجود - النقد الحاضر - نقدی جو موجود ہو - السید قوم

حضرت نوحؑ نے یہ دعا کیوں کی

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّنْ

اور وہ کشتی بناتا تھا اور جب بھی اس کی قوم میں سے کوئی بڑے لوگوں کی جماعت اس کے پاس سے

کا سردار - الشمس - سورج - او شعاعہا - دھوپ - سورج کی روشنی - سورج کی کرنیں - العتید من المال جو مالیت والی چیز موجود ہو - مال - مطر ایام لایقلع کئی دن تک لمبی چلی جانے والی بارش - الینبوع - چشمہ اور کہتے ہیں کہ انت علی عینی - ای فی الاکرام وا لحفظ - یعنی جب کہیں - انت علی عینی تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ تو میری حفاظت میں ہے - اور میں تیری عزت کرتا ہوں (اقرب) فلان بعینی - ای احفظہ واراعیہ یعنی میں اس کی حفاظت اور نگرانی کرتا ہوں انک باعیننا - واصنع الفلک باعیننا ای بحفاظتی - یعنی ان دونوں آیتوں میں اعیننا سے مراد حفاظت الٰہی ہے ومنہ عین اللہ علیک ای کنت فی حفظہ یعنی تو اس کی حفاظت میں رہ (مفردات)

باعیننا کے معنی

تفسیر - جب حضرت نوح علیہ السلام کو قوم کی تباہی کی خبر دی گئی - تو ساتھ ہی یہ حکم ملا کہ ہمارے حکم کے ماتحت کشتی تیار کر اور اس میں اپنے اتباع سے یا گھر والوں سے مدد لو - حل لغات میں بتایا جا چکا ہے - کہ عَین کے معنی گھر کے لوگوں کے بھی ہوتے ہیں - اور نبی کے گھر کے لوگوں میں نہ صرف اس کے عزیز شامل ہوتے ہیں - بلکہ بسا اوقات اس کے اتباع بھی اس کے گھر کے لوگ ہی کہلاتے ہیں - کیونکہ اس کے سب رشتے روحانی ہو جاتے ہیں جسمانی رشتوں میں سے بھی وہی اس کے رشتہ دار رہتے ہیں - جو روحانی طور پر اس سے تعلق رکھتے ہوں - پس باعیننا سے مراد ہمارے گھر والے یا اتباع بھی ہو سکتے ہیں - اور یہ جو فرمایا - کہ ہمارے گھر والے

ولاتخاطبنی کی دلالت کہ اپنی طرف سے حضرت نوح نے بد دعا نہیں کی تھی

سو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالےٰ کا بھی کوئی گھر ہوتا ہے - بلکہ چونکہ نبی سے تعلق رکھنے والے خدا تعالےٰ کے بھی پیارے ہو جاتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف منسوب کر لیا ہے - جیسے فرماتا ہے - فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی - پس خدا تعالیٰ کے گھر والوں سے مراد اس کی جنت کے مستحق لوگ ہیں - اور ان الفاظ میں اس عذاب کے وقت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو مزید تسلی دی ہے -
دوسرے معنی اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہماری قسم قسم کی حفاظتوں میں رہکر تو یہ کام کر - کیونکہ عین کے معنی جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے - حفاظت کے بھی ہوتے ہیں اور عزت کے بھی - ان معنوں کے رو سے یہ مراد ہو گی - کہ کشتی بناتے وقت لوگ تمسخر کرینگے ہنسی اڑائینگے تکلیفیں دینگے - لیکن ہماری حفاظت اور ہماری طرف سے اعزاز تجھے عطا ہو گا - پس تو ان کی باتوں کی پرواہ نہ کیجیو -

میرے نزدیک باعیننا و وحینا سے دو کشتیوں کی طرف اشارہ کیا ہے - ایک کشتی جو مومنوں کی مدد سے تیار ہوئی تھی - اور دوسری جو وحی سے تیار ہوئی تھی - پہلی سے مراد جسمانی کشتی ہے اور دوسری سے مراد روحانی کشتی ہے - یعنی تقویٰ - جو انسان کو عذاب الٰہی سے بچا لیتا ہے -

یہ جو فرمایا ہے کہ ظالموں کے بارہ میں مجھ سے کچھ نہ کہیو اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے - کہ حضرت نوحؑ نے بد دعا اپنی طرف سے نہیں کی تھی - اگر وہ بد دعا کر رہے ہوتے - تو انہیں دعا کرنے سے روکنے کی کوئی ضرورت نہ تھی ٭

قَوْمِہٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا

گذرتی تو اسپر ہنستی (جیسا اس نے (ان لوگوں سے) کہا (کہ) اگر (آج) تم (لوگ) ہم پر ہنستے ہو۔ تو (کل ہم (بھی)

نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ؕ۝ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ ۳۹

تم پر ہنسینگے جیسا کہ (آج) تم (ہم پر) ہنستے ہو ۳۸ پھر جلد تمہیں معلوم ہو جائیگا (کہ) وہ کون

يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ ۴۰

(فریق) ہے جسپر ایسا عذاب آرہا ہے جو اُسے رُسوا کر دیگا۔ اور جسپر ڈیرا ڈال دینے والا عذاب نازل ہو رہا ہے۔ ۳۹

۳۸ **حل لغات** ۔ سخر منہ ۔ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ کسی فعل کی جزا کے لئے بھی وہی لفظ بول دیتے ہیں۔ جو اس فعل کے لئے بولا گیا ہو۔ قرآن کریم میں یہ محاورہ متعدد جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا اور فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ یہ بات ظاہر ہے کہ ہر امر کی سزا کو زیادتی کرنا نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ زیادتی کرنا جرم سے زیادہ سزا دینے کو کہتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے یہاں برابر کی سزا کا نام بھی اعتداء رکھا گیا ہے۔ اسیطرح ایک شاعر کا قول ہے فَدَا وَدَا بالجنون من الجنون ۔ مطلب یہ کہ دشمنوں نے اپنی طاقت کا اندازہ صحیح نہ کرکے اور اس زبردست مقام پر حملہ کر کے اپنے جنون کا ثبوت دیا۔ حالانکہ طاقتور کا کمزور پر حملہ کرنا جنون نہیں ہوتا۔ بلکہ کمزور کا طاقتور پر حملہ کرنا جنون کہلاتا ہے۔ مگر یہاں پر جنون کی سزا کے لئے بھی جنون کا لفظ بول دیا گیا ہے۔

تفسیر ۔ جب کبھی بھی خدا تعالیٰ کے مامور دنیا میں آتے ہیں۔ لوگ ان کی باتوں کو ہنسی میں اڑانا چاہتے ہیں۔ اور چونکہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ جن کے ماننے کے لئے ابھی دنیا تیار نہیں ہوتی۔ اس لئے دشمنوں کو اور زیادہ ہنسی کا موقع مل جاتا ہے۔ نادان لوگ نہیں سمجھتے کہ اگر غیر معمولی کام ان کے ذمہ نہ لگایا گیا ہو۔ جس کا سمجھنا انسانی عقل سے بالا ہو تو اللہ تعالیٰ کو مامور بھیجنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب باوجود عقل کے انسان اپنی مصیبتوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ اور جب اس کی عقل اپنے گرد و پیش کے حالات پر قیاس کر کے جو علاج سوچتی ہے وہ اس کی ترقی کا موجب نہیں۔ بلکہ اس کی ہلاکت کا موجب ہوتا ہے۔ تبھی تو خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور آتے ہیں اور چونکہ ان کا علاج بالکل نرالا ہوتا ہے۔ لوگوں کو طبعاً ان کی بات غیر معقول معلوم ہوتی ہے۔ اور دشمنوں کو شرارت اور ہنسی کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ یہی کہ انبیاء اور ان کی جماعتیں تو کامیاب ہو جاتی ہیں۔ اور اُن کے دشمن ہمیشہ کے لئے بے وقوفوں میں شامل ہو جاتے ہیں ۔

سخر

۳۹ **حل لغات** ۔ اَخْزَاهُ اِخْزَاءً ۔ اَوْقَعَهٗ فِي الْخِزْيِ وَاَهَانَهٗ ۔ اس کو رسوائی میں مبتلا کر دیا۔ ذلیل کر دیا۔ اَللّٰهُ فلانًا فَضَحَهٗ ۔ جب خدا تعالیٰ فاعل ہو۔ تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ اس نے اس کی پردہ دری کی ۔ يَحِلُّ عليه ۔ او يَحُلُّ عليه ۔ يجب عليه و ينزل ۔ اسپر واجب ہو جائیگا اور نازل ہوگا (اقرب)

اخزٰی

ضروری ہے کہ ہماری بعض باتوں کو دنیا کے لوگ ماننے کے لئے تیار نہ ہوں۔

تفسیر ۔ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ ۔ عذاب کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ایسے عذاب کہ جن کے آنے سے دوسرے لوگوں کو

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ

یہانتک کہ جب ہمارا (عذاب کا) حکم آجائے اور چشمے پھوٹ کر بہ پڑیں تو (اسوقت) ہم فرمائینگے (کہ) اسمیں ہر ایک (قسم کے جانوروں) میں سے

كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ

ایک جوڑا (یعنی دو ہمجنس نر و مادہ) کو اور اپنے اہل (و عیال) کو (بھی) سوائے اس (فرد) کے جس کی ہلاکت کے متعلق اس عذاب کے آنے سے پہلے (ہی ہمارا قطعی) فرمان

۴۱ وَمَنْ اٰمَنَ ۭ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ○

جاری ہو چکا ہو اور (نیز) جو لوگ تجھپر ایمان لائے ہیں انہیں اسمیں سوار کر لے اور اسکی (قوم کے) شدید مخالفت اختیار کرتے ہوئے سوائے قلیل تعداد کے کوئی اسپر ایمان نہ لایا تھا

التَّنُّوْرُ عذاب پانیوالوں پر رحم آتا ہے۔ جیسے کسی کا مکان گر جائے تو سب لوگ اس پر رحم کرتے ہیں۔ ایسے عذابوں کے ساتھ رسوائی کا پہلو نہیں ہوتا۔ مگر بعض عذاب رسوائی کا پہلو بھی ساتھ رکھتے ہیں۔ جیسے مثلاً یہ کہ کسی شخص کا جھوٹ کھل جائے یہ عذاب بھی ہے اور اس کے ساتھ رسوائی بھی ہے۔ یا مثلاً ایسا عذاب ہو کہ اُسے لوگوں سے بطور عبرت کے یاد رکھوایا جائے جیسے قوم نوح ؑ کا عذاب کہ آجتک لوگوں میں اس کی یاد قائم ہے۔

عذاب مقیم۔ ایسا عذاب جو قائم رہیگا۔ یعنی اس دنیا میں آئیگا اور اگلے جہان میں بھی جاری رہے گا۔

ہماری تکلیف وقتی ہے اور تمہاری دائمی یعنی فرمایا کہ عذاب تو وہی ہے۔ جس میں قائم رہنے والی اور حقیقی ذلت ہو۔ جو مٹنے والی نہ ہو۔ بلکہ تباہ کردینے والی ہو۔ پس تمہاری ہنسی سے ہماری کوئی تذلیل نہیں ہوتی۔ اور نہ ہم اس سے گھبراتے ہیں۔ گھبرانا تو تم کو چاہیئے۔ کہ جن پر حقیقی اور دائمی ذلت اور عذاب آنیوالا ہے۔

فَارَ **حل لغات**۔ فَارَ۔ جَاشَ ابل پڑا (قاموس) فَارَتِ القِدْرُ۔ غلت۔ ہنڈیا کو اُبال آگیا۔ فار الماء نبع مِنَ الاَرْضِ وَجَرٰی۔ جب یہ لفظ پانی کے لئے استعمال ہو۔ تو اس کے معنی ہوتے ہیں پانی زمین میں سے پھوٹ پڑا اور بہ پڑا (اقرب)۔ التنور۔ الکانون یخبز فیہ۔ تنور۔ جس میں روٹیاں پکاتے ہیں۔ کل مفجر ماءٍ۔ جہاں سے پانی پھوٹے۔ یعنی چشمہ۔ محفل ماء الوادی۔ وادی کے پانی کے جمع ہونے کی جگہ۔ (اقرب) التنور وجہ الارض۔ تنور کے معنی سطح زمین کے بھی ہیں (تاج)۔ بحر محیط کے مصنف کہتے ہیں۔ کہ قرآن میں فار التنور ہو سکتا ہے کہ مجازاً استعمال ہوا ہو۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔ کہ حمی الوطیس۔ جس سے آپ کی مراد یہ تھی۔ کہ جنگ خوب تیز ہو گئی ہے۔ حالانکہ لفظ یہی تھے۔ کہ تنور گرم ہو گیا ہے اور فار اور حمی کے معنی ایک ہی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ (ملک ع ۱) کافر دوزخ کی آواز سنینگے اور وہ جوش میں آرہی ہوگی۔ پس اس صورت میں اس کے یہ معنی ہونگے۔ کہ پانی چاروں طرف پھیل گیا۔ (بحر محیط زیر آیت مذکورہ)

زوج کے معنی ہیں کل واحد معہ اٰخر من جنسہ ہر اک وہ چیز جس کے ساتھ اس کی جنس میں سے ایک اور وجود بھی ہو (اقرب) پس زوج کے معنی ساتھ کے جوڑے کے ہوتے ہیں۔ نہ کہ دو دو چیزوں کے اور اسی وجہ سے اثنین کا لفظ لگا کر واضح کر دیا گیا ہے۔

کہ مراد ذو جنس جانور ہیں نہ کہ دو جوڑے۔ یعنی چار جانور۔ حضرت نوح ؑ کو حکم تھا۔ کہ ضروری جانوروں میں سے ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ اپنے ساتھ رکھ لیں۔

تفسیر۔ یعنی یہ جواب وسوال اور دشمنوں کی طرف سے ہنسی اور حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے صبر اور توکل کا اظہار اسی طرح ہوتا چلا گیا۔ یہانتک کہ چشموں کی جگہوں سے پانی پھوٹ پڑا۔ یا یہ کہ سطح زمین پر پانی بہنے لگا۔ یہ عذاب جو حضرت نوح ؑ کی قوم پر آیا۔ صرف کسی زمینی چشمہ کے پھوٹنے کے سبب سے نہ تھا۔ بلکہ جیسا کہ قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے ظاہر ہے۔ اصل سرچشمہ پانی کا بادل تھے۔ عذاب سے قبل اس قدر بارش ہوئی کہ سب جگہ پانی ہی پانی ہو گیا۔ اور جیسا کہ کثرت بارش کے وقت میں ہوا کرتا ہے۔ زمین کے سوتے بھی جاری ہو گئے۔ اور اس آسمانی اور زمینی پانی نے ملکر اس علاقہ کو تباہ کر دیا۔ سورۂ قمر رکوع اول میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ۔ اور ہم نے زمین میں چشمے پھوڑ دیئے۔ اور پانی مقررہ امر کے لئے اس میں مل گیا۔ یعنی آسمانی پانی زمینی پانی سے مل کر دنیا کو تباہ کرنے لگا۔ اسی سورۃ یعنی ہود میں چند آیات آگے چلکر فرمایا ہے۔ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِىْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِىْ اس میں بھی بارش کا ذکر ہے۔ اور سورۂ قمر میں ہے۔ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ اپس ہم نے آسمان کے دروازے ایک شدت سے برسنے والے پانی کے ذریعہ سے کھولدیئے۔ غرض آیات قرآنیہ سے ثابت ہے۔ کہ پانی اوپر سے بھی برسا اور زمین سے بھی نکلا۔ اور دونوں پانیوں کے ملنے سے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر تباہی آئی۔ اور یہ بات نہ صرف یہ کہ خدا تعالیٰ کی قدرت میں ہے۔ بلکہ اس کے عام قانونِ قدرت کے بھی مطابق ہے۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ جب بارش زور سے پڑے تو زمین سے بھی پانی اُبلنے لگ جاتا ہے اور خصوصاً پہاڑی علاقوں میں کہ جہاں چشموں کا پانی اونچے پہاڑوں پر پڑی ہوئی برف کے پانی سے نکلتا ہے جسوقت بارش ہوتی ہے۔ تو برف کے گھلنے کی وجہ سے ان کے پانیوں میں زیادتی آجاتی ہے۔

> پانی کا عذاب آسمانی اور زمینی دونوں قسم کا جمع ہو گیا تھا۔

اور یہ بات قرآن کریم اور تاریخ سے ثابت ہے۔ کہ حضرت نوح ؑ پہاڑی علاقہ میں رہتے تھے۔ کیونکہ اس آیت سے آگے دو آیتیں چھوڑ کر تیسری آیت میں حضرت نوح ؑ کے بیٹے کا قول نقل کیا ہے۔ کہ سَاٰوِىْٓ اِلٰى جَبَلٍ میں کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤنگا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ علاقہ پہاڑی تھا۔ اور حضرت نوح ؑ پہاڑوں کے درمیان کسی وادی میں رہا کرتے تھے۔ ورنہ یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ طوفان کے آنے پر اُن کے بیٹے نے کہا ہو کہ میں دوڑ کر سو یا دو سو میل کے کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤنگا۔ اس کا فقرہ صاف بتاتا ہے۔ کہ وہ بالکل دامن کوہ میں کھڑا ہوا تھا۔ اور باوجود اس کے کہ طوفان بڑھ رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں آسانی سے پہاڑ پر چڑھ کر بچ سکوں گا۔

> حضرت نوح ؑ پہاڑی علاقہ میں بستے تھے

مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ میں کل سے مراد صرف وہی جانور ہیں۔ جو حضرت نوح ؑ کے گھر میں موجود تھے۔ اور عموماً کل انہی افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو عرف عام کے مطابق اس کے نیچے آسکیں۔ نہ کہ کل افراد پر۔ قرآن کریم میں ملکہ سبا کی نسبت آتا ہے۔ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ اسے ہر ایک شے دی گئی تھی۔ مگر حضرت سلیمان علیہ السلام اس کے پیغامبروں کے جواب میں فرماتے ہیں۔ کہ اے ملکہ تیری ہستی ہی کیا ہے۔ میں تجھے ہلاک کر دوں گا۔ اگر کل کے معنی سب کچھ کے ہی ہوتے۔ تو ضروری تھا۔ کہ جو کچھ سلیمان علیہ السلام

> لفظ کل سے مراد

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا

اللہ (جب طوفان آگیا تو ہمارے حکم سے) اسنے (اپنے ساتھیوں کو) کہا (کہ) اسمیں سوار ہو جاؤ اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرایا جانا

۴۲ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

اللہ (تعالیٰ) کے نام کی برکت سے ہی ہوگا۔ میرا رب یقیناً یقیناً بہت ہی بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے [۱۲]

کے پاس تھا وہ بھی اس کے پاس ہوتا۔ لیکن اس جگہ کل کے معنی کوئی شخص سب کچھ نہیں کرتا۔ بلکہ مفسرین بھی یہی معنی کرتے ہیں۔ کہ سب قسم کی ضرورتوں کے سامان اس کے پاس تھے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ یہی معنی یہاں نہ کیئے جائیں اور یہ نہ کہا جائے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو بھی انہی جانوروں کے جوڑے لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ جن کی انہیں ضرورت ہو سکتی تھی۔ اور یہی معقول معنی ہیں۔ ورنہ ماننا پڑے گا۔ کہ کروڑوں اربوں حشرات الارض اور درندے سب حضرت نوح ع کی کشتی میں جمع ہوگئے تھے۔ اس صورت میں تو کشتی کوئی چوتھائی حصۂ زمین کے برابر چاہیئے۔

زوجین اثنین میں تقلیل کی وجہ

یہ امر بھی قابل غور ہے۔ کہ اس جگہ زوجین کہہ کر تقلیل پر زور دیا ہے کہ جوڑوں سے زائد نہ لو پس یہ زور دینا بھی بتا رہا ہے کہ حکم صرف ضروری اشیاء کے لئے تھا نہ کہ دنیا جہان کی چیزوں کو اکٹھا کرنے کے متعلق۔

اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ کے معنی

اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ کے یہ معنی نہیں کہ سوائے اس کے جس کے متعلق پہلے بتا دیا گیا ہے۔ بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ سوائے اس کے کہ جس کے خلاف الٰہی فیصلہ ہو چکا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اس فقرہ کی نسبت یہ خیال کیا۔ کہ یہ صرف استغنار کے اظہار کے لئے ہے۔ جیسے کہ حضرت شعیب ع نے اپنے مخالفوں سے کہا تھا۔ کہ مَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا (اعراف) یعنی ہم تمہارے دین میں کسی صورت میں واپس نہیں آسکتے۔ سوائے اس کے کہ خدا تعالےٰ چاہے کہ ہم ایسا کریں۔ اب یہ امر ظاہر ہے۔ کہ خدا تعالیٰ ایسا کبھی پسند نہیں کر سکتا کہ اپنے نبی کو شرک کی تعلیم دے یا یہ کہ نبی مرتد ہو جائے۔ پس اس جگہ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ سے درحقیقت اللہ تعالیٰ کا استغنار ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اور نیز یہ بتانا کہ خدا تعالیٰ کی قدرتوں کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ نہ یہ بتانا کہ بالکل ممکن ہے کہ نبی بھی مرتد ہو جائے۔

مُرْسٰىهَا

[۱۲] حل لغات مجریٰ اصل میں مجریٰ ہے جسکے معنی چلنے کے ہیں اور یہ لفظ جری یجری کا مصدر میمی ہے اور اسم ظرف بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اس کے معنی ہونگے چلنے کا وقت یا جگہ مُرْسٰى۔ اَرْسٰى میں سے نکلا ہے۔ اَرْسٰى کے معنی ہیں ٹھہرایا۔ اور یہ مصدر میمی ہے۔ جس کے معنی ٹھہرانے کے ہیں۔ اس کا مجرد رسا ہے۔ یہ لفظ کشتی کے لنگر ڈالنے کے متعلق خصوصیت سے استعمال ہوتا ہے۔ بعض قراتوں میں مُجْرِيْهَا وَمُرْسِيْهَا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا نام لیکر جو اس کا چلانے والا اور ٹھہرانے والا ہے۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۟ وَنَادٰى

اور وہ ایک پہاڑوں کی طرح کی (اونچی) موج میں انہیں لئے جا رہی تھی۔ اور (اسی اثناء میں) نوح نے اپنے بیٹے کو درانحالیکہ

نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا

وہ (اس سے علیحدہ) ایک اور جانب میں تھا۔ پکار کر کہا اے میرے پیارے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور

تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ ۴۳

کافروں کے ساتھ نہ ہو ۴۲ھ اس نے کہا کہ میں ابھی کسی پہاڑ پر جا ٹھہرونگا (اور پناہ لونگا) جو اس پانی

مِنَ الْمَآءِ ۭ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ

سے مجھے بچا لیگا۔ اس نے کہا (کہ) اللہ (تعالیٰ) کے (اس عذاب کے) حکم سے آج کوئی بھی (کسیکو) بچانیوالا نہیں (ہو سکتا) سوائے اسکو

رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝ ۴۴

جس پر وہ (آپ) رحم کرے اور (اسی اثناء میں) پانی کی لہران (دونوں) کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ غرق کئے جانے والوں میں (شامل) ہو گیا

۴۲ھ **حل لغات** ۔ معزل ۔ عزل سے نکلا ہے۔ کہتے ہیں۔ عزل الشیٔ عن غیرہ یعزل عزلاً نعزلہ ای نحّاہ عنہ جانبًا فتنحّٰی ای لازم و متعدی۔ اسے کسی دوسری چیز سے ایک طرف ہٹا دیا اور وہ ہٹ گیا۔ گویا لازم و متعدی دونوں معنوں میں آتا ہے۔ عزل فلانًا عن منصبہ اونحوہٖ رفعہ عنہ اس کام سے اُسے ہٹا دیا المعزل الجانب یقال ھو عن الحق بمعزل اسے مجانب لہ معزل کے معنی ایک طرف کے ہوتے ہیں جب کسی کے متعلق کہتے ہیں کہ ھو عن الحق بمعزلٍ تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہ وہ شخص حق سے ایک طرف ہو گیا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ مفسرین نے اس بیٹے کے متعلق اختلاف کیا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ حقیقی بیٹا نہ تھا۔ بلکہ رشتہ دار تھا۔ بعض کے نزدیک حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کا بیٹا تھا۔ آپ کی نسل سے نہ تھا۔ مگر ابن مسعود و ابن عباس و عکرمہ رضی اللہ عنہم۔ الضحاک۔ ابن جبیر وغیرہم اور اکثر مفسرین کی رائے میں ان کا بیٹا ہی تھا۔ میرے نزدیک اس بحث میں پڑنا بے فائدہ ہے جب قرآن کریم اسے بیٹا کہتا ہے اور نوح ؑ کی زبان سے بیٹا کہلواتا ہے۔ اور کوئی دوسری آیت اس کے خلاف نہیں۔ تو وہ ضرور ایسا رشتہ دار تھا۔ جس کے لئے بیٹے کا لفظ بولا جاتا ہے۔

مسیحی مفسرین اس بیٹے کے واقعہ پر معترض ہیں کہ یہ بائیبل کے خلاف ہے مگر بائیبل ایسے ناقص حالات میں ہے۔ کہ اس کی بنا پر قرآن کریم پر اعتراض کرنا حیرت انگیز ہے۔

۴۳ھ **حل لغات** ۔ آوٰی ۔ منزلہٗ اوالی منزلہ نزل بہٖ لیلًا اونہارًا (اقرب) دن کو یا رات کو اپنے گھر میں آ ٹھہرا۔ یعنی اَوٰی کے معنی ہیں بے اطمینانی کی جگہ سے آرام کی جگہ پر آ گیا۔ عَصَمَ ۔ یَعْصِمُ عصمًا ۔ الشیء منعہ اُسے روک دیا ۔ اللہ فلانًا

معزل

مسیحی مصنفین کا اس واقعہ کے بیان پر اعتراض

ابن نوح کیا ان کا حقیقی بیٹا نہیں تھا

۲ اوٰی

۲ عصم

وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ

اور (زمین سے بھی) کہدیا گیا (کہ) اے زمین تو (اب) اپنے پانی کو نگل جا اور (آسمان سے بھی) اے آسمان (اب) تو (برسنے سے) رک جا

الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا

اور پانی کو جذب کر دیا گیا اور (یہ) معاملہ ختم کر دیا گیا اور وہ (کشتی) جودی پر (جاکر) ٹھہر گئی اور کہدیا گیا (کہ)

ربع لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ

ان ظالم لوگوں کے لئے ہلاکت ہے اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا (کہ) میرے رب! میرا بیٹا یقیناً میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ بھی یقیناً

۴۶ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ○

نہایت سچا ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بڑھکر (بہتر اور درست) فیصلہ کرنے والا ہے

من المكروه حفظه ووقاه خدا تعالیٰ نے فلاں شخص کو تکلیف سے محفوظ رکھا اور بچا لیا۔ (اقرب)

حضرت نوحؑ کا مقام رہایش پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا

تفسیر۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی رہایش کا مقام پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا۔ کیونکہ تبھی تو ان کا بیٹا کہتا ہے۔ کہ میں کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤنگا۔ کسی کا لفظ علاقہ کے ساتھ ساتھ پہاڑوں کی کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ جگہ پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک وادی تھی اور ایسی جگہ پر پانی کا یکدم اونچا ہو جانا اور غیر معمولی طور پر بلند ہو جانا خلاف عقل نہیں ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نادان انسان آخر تک واقعات سے آنکھیں بند کئے بیٹھا رہتا ہے۔ طوفان آرہا ہے۔ لیکن باوجود اس کے حضرت نوح ؑ کا بیٹا اپنے باپ کے پیغام میں شک کر رہا ہے۔

استوٰی

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ کے معنی

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ استثنار مفرغ ہے۔ اور اسکے معنی یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا آج کوئی بچانے والا نہیں۔ ہاں مگر وہ شخص محفوظ رہیگا۔ جسے خدا تعالیٰ بچائے۔

حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو بیٹے کے غرق ہونیکا نظارہ دیکھنے سے بچا لیا اور ایک بلند موج کے پردہ میں اُسے غرق کیا۔

۴۵ حل لغات۔ بَلِعَهٗ يَبْلَعُ وابْتَلَعَهٗ انزله من حلقومه الى جوفه ولم يمضغه بَلِعَ اور ابتلع کے یہ ہوتے ہیں کہ بغیر چبانے کے کسی چیز کو گلے سے پیٹ میں اُتار دیا (اقرب) اقلع عن الامر۔ کَفَّ۔ رک گیا۔ (اقرب) غَاضَ الماءُ۔ نَقَصَ اَوْغَارَ فذهب فى الارض وغاض الماء نقصه۔ یعنی غاض لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے معنی زمین میں جذب ہو جانے کے بھی ہوتے ہیں۔ اور کم کر دینے کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) استوٰى على ظهر دابته استقر۔ سواری پر ٹک گیا۔ (اقرب) بَعُدَ۔ يَبْعُدُ بُعْدًا ضد قرب۔ یعنی یہ قریب ہونے کے مخالف معنی دیتا ہے وفلان اى مات۔ اور جب یہ انسان کے لئے آئے۔ تو کبھی اس کے معنی فوت ہو جانے کے بھی ہوتے ہیں (اقرب)

۴۵ تفسیر۔ انبیاء کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے کیسا مؤدب ہوتا ہے۔ کلام الٰہی سے حضرت نوح علیہ السلام

قَالَ يٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ‌ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ

فرمایا اے نوح وہ تیرے اہل میں سے ہرگز نہیں (اور تمہاری یہ دعا) یقیناً ایک نادرست

صَالِحٍ ‌‌ۖ فَلَا تَسۡـَٔـلۡنِ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ اِنِّىۡۤ

بے محل کام ہے۔ پس جس چیز (کی بھلائی یا برائی) کا تجھے کچھ علم نہیں وہ مجھ سے مت مانگ میں تجھے

اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ‏ ○ ٤٧

نصیحت کرتا ہوں (تا) کہ تو (کہیں) جہالت دکھانے والوں میں (شامل نہ) ہو جائے ٥٤٦

کو اجتہادی غلطی لگی۔ اور انہوں نے یہ خیال کیا۔ کہ میرے تمام اہل نجات پائیں گے۔ لیکن جب بیٹا غرق ہونے لگا۔ تو کس لطیف پیرایہ سے خدا تعالیٰ کے حضور میں دعا کی۔ کہ خدایا یہ میرے اہل میں سے ہے یعنی میں اس وعدہ کا واسطہ دے کر اس کی نجات کا خواہاں ہوں۔ مگر چونکہ ظاہری سامان اس کی نجات کے خلاف تھے۔ یہ بھی کہدیا کہ یہ ڈوب بھی جائے۔ تو میں یہ خیال نہیں کروں گا۔ کہ تیرا وعدہ جھوٹا تھا تیرا وعدہ بہرحال سچا ہے۔ اور تیرا فیصلہ بالکل درست ہے۔ ایسے صدمہ کے وقت میں اس ادب اور اس ایمان کا ظہور صرف اعلیٰ درجہ کے نیک بندوں سے ہی ممکن ہے۔

٥٤٦۔ کیسے مختصر الفاظ میں حقیقت کو ظاہر کردیا ہے۔ کہ جب اہل کہا تھا۔ تو اس سے مراد تمام اہل نہ تھے۔ بلکہ مومن اہل تھے۔ کیونکہ تیرا حقیقی اہل وہی ہے۔ جو خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتا ہو۔

اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ یہ فقرہ حضرت نوحؑ کی دعا کے متعلق ہو۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ یہ تیرا عمل یعنی دعا بے محل ہے۔ کیونکہ صالح کے معنی مناسب حال کے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہم پہلے اس امر کا اعلان کرچکے ہیں۔ اور اب عذاب کا وقت آ چکا ہے۔ اب اس دعا کا فائدہ نہیں ہوسکتا۔ اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں۔ کہ یہ جملہ بیٹے کے متعلق ہو اور عمل بمعنی عامل کے ہو۔ یا ذو کا لفظ محذوف ہو۔ اور یہ دونوں باتیں عربی محاورہ کے مطابق جائز ہیں۔ اس صورت میں اس آیت کے یہ معنی ہونگے کہ یہ لڑکا تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ کیونکہ وہ نامناسب اعمال کرتا رہا ہے۔ یا یہ کہ اس کے عمل بے محل اور تقویٰ سے دور تھے۔ عربی زبان کا محاورہ ہے۔ کہ مبالغہ کے لئے مصدر کا صیغہ بجائے اسم فاعل کے استعمال کردیتے ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔ فانما هى اقبال و ادبار۔ وہ اونٹنی اپنے بچوں کو کھو بیٹھنے کی وجہ سے ایسی بیقرار ہے۔ کہ گویا آنا اور جانا ہی (بنی ہوئی) ہے۔

کوئی غیر مومن حقیقۃً نبی کے اہل خانہ نہیں ہوسکتا۔

اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ۔ یعنی تو تو کلام الٰہی کا حامل ہے۔ تجھے آئندہ چاہیئے کہ کلام الٰہی کے سب پہلوؤں پر غور کرلیا کرے۔ گویا یہ اجمال جو پیشگوئی میں واقع ہوا ہے۔ اسکو اللہ تعالیٰ آئندہ کے لئے ایک ذریعہ عبرت بناتا ہے اور فرماتا ہے۔ کہ اس واقعہ سے سبق حاصل کرو۔ اور

انہ عمل غیر صالح کے معنے

یاد رکھو کہ پیشگوئیاں کئی معنی رکھتی ہیں۔ اور اصل حقیقت ان کی پورا ہونے پر ہی ظاہر ہوتی ہے۔

خدا تعالیٰ سے ہمیشہ وہی طلب کرنی چاہیئے جو کسی چیز کے نیک و بد کا پورا علم نہ ہو۔

فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسے امر کے متعلق دعا نہ کر جس کا تجھے علم نہ ہو۔ اور یہ بھی ایک اہم بات ہے جس کے نہ جاننے کی وجہ سے لوگ نقصان اٹھاتے ہیں۔ انسان عالم الغیب نہیں اسے معلوم نہیں ہو سکتا۔ کہ جس چیز کو وہ مانگتا ہے۔ وہ اس کے لئے کیسی ہوگی۔ مبارک یا منحوس۔ پس دعا کرتے وقت ہمیشہ یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ سے عرض کرے کہ اگر یہ چیز اچھی ہو تو مجھے ملے ورنہ نہیں۔

دعا استخارہ اور اسکا حکم۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس نکتہ پر خود بھی عمل کیا ہے۔ اور دوسروں سے بھی عمل کرایا ہے۔ آپ ہر نئے کام سے پہلے یہ دعا مانگنے کا حکم دیتے ہیں اللهم ان كنت تعلم ان هذا الامر خير لی فی دينی ومعاشی وعاقبة امری فاقدره لی ويسره لی ثم بارك لی فيه وان كنت تعلم ان هذا الامر شر لی فی دينی ومعاشی وعاقبة امری فاصرفه عنی واصرفنی عنه واقدر لی الخير حيث كان ثم ارضنی به۔ یعنی اے اللہ اگر تیرے علم میں یہ بات میرے لئے اچھی ہے میرے دین اور میری دنیا اور میرے انجام کے لحاظ سے تو یہ مجھے حاصل ہو جائے اور آسانی سے حاصل ہو جائے اور اس میں میرے لئے برکت ڈال دے۔ اور اگر تیرے علم میں یہ بات میرے دین اور میری دنیا کے لحاظ سے اور میرے انجام کے لحاظ سے بری ہے۔ تو تو اسے مجھ سے دور کر دے اور میرے دل کو اس سے پھیر دے اور جو چیز میرے لئے اچھی ہو جہاں بھی ہو میرے لئے مہیا کر دے۔ اور مجھے بھی اس کے متعلق شرح صدر عطا فرمادے۔ کیسی مکمل دعا ہے۔ اور کس طرح اس اصل کی اس میں

سوال صرف ایسے کرنے چاہئیں جو زیادۃ علم کا موجب ہوں۔

وضاحت کی گئی ہے۔ کہ انسان جس چیز کو اچھا سمجھتا ہے ضروری نہیں کہ وہ اچھی ہو۔ بلکہ ممکن ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے علم میں جو عالم الغیب ہے۔ وہ بات انجام کو مدنظر رکھتے ہوئے بری ہو۔ پس اس سے یہ نہیں کہنا چاہیئے۔ کہ وہ بات ہو۔ اور وہ نہ ہو۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اگر اس کا انجام اچھا ہو۔ تو پھر مجھے ملے ورنہ میرے دل سے اس کی خواہش نکال دے ہاں جن باتوں کا انسان کو علم ہو کہ وہ ضرور اچھی ہیں۔ ان کے متعلق وہ دعا کر سکتا ہے۔ کہ وہ اسے مل جائیں۔ مثلاً ہدایت یا رضائے الٰہی یا لقائے الٰہی کی اگر انسان دعا کرے۔ یا یہ دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ دین اور دنیا کی خیر عطا کرے۔ تو ایسی دعائیں جائز ہیں۔ احتیاطاً ایسے امور کے متعلق کرنی چاہیئے جن کا انجام معلوم نہیں۔ اور حضرت نوح ؑ کا بیٹے کے لئے اشارۃً دعا کرنا کہ وہ کشتی میں چڑھ جائے۔ ایسے ہی امور میں سے تھا۔ جن کا انجام معلوم نہیں تھا۔ بالکل ممکن تھا بلکہ غالباً یہی واقعہ تھا۔ کہ اگر وہ بچ جاتا۔ تو اس کے ذریعہ سے دین کو نقصان پہنچتا اور وہ نبوت کو طاقت پہنچانے کی بجائے اس کی کمزوری کا موجب ہو جاتا۔ پس اس کا فنا ہونا ہی بہتر اور مناسب تھا۔

اور اگر سوال کے معنی دعا مانگنے کی جگہ دریافت کرنے کے کئے جائیں تو اس صورت میں اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ سوال صرف ایسے امور کے متعلق کرنا چاہیئے جن کے جواب سے علم میں زیادتی ہو۔ اور انسان کے لئے اس کی حقیقت کو سمجھنا ممکن ہو۔ مگر وہ باریک حکمتیں جن پر قانون قدرت کا مدار ہے۔ اور جو صرف ایک دو واقعات پر مبنی نہیں ہوتیں۔ بلکہ لاکھوں کروڑوں امور جن میں سے بعض لاکھوں سال پہلے کے ہوتے ہیں اور بعض آئندہ ظاہر ہونے والے ہوتے ہیں۔ ان پر ان کی بنیاد ہوتی ہے۔ ان کے متعلق سوال فضول ہے۔ کیونکہ ان کا پورے طور پر سمجھنا انسانی طاقت سے بالا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان

کے سمجھنے کی انسان کو قابلیت ہی نہیں دی گئی۔ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ سے مراد اس صورت میں یہی ہے۔ کہ جن کے سمجھنے کی تجھے طاقت نہیں دی گئی۔ ان کے متعلق سوال نہ کر یا یہ کہ جن امور کو تیرے دائرہ علم سے باہر رکھا گیا ہے ان کے متعلق سوال نہ کر۔ عدم علم اس جگہ مراد نہیں کیونکہ سوال تو کیا ہی اس وقت جاتا ہے۔ کہ جب انسان کو علم نہ ہو۔ جس امر کا علم ہو اس کے متعلق اسے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ پس علم نہ ہونے سے مراد اس جگہ علم کے احاطہ سے باہر ہونے کے ہیں۔ اور اس میں کیا شک ہے۔ کہ جن امور کی حقیقت کو انسان نہ سمجھ سکتا ہو۔ یا جن کی تفصیل کا اظہار نامناسب ہو۔ انکے متعلق سوال نہیں کرنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ کے اس جواب سے کہ ان کے بیٹے کے اعمال اچھے نہ تھے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی نظر سے اس کے اعمال پوشیدہ تھے۔ اور نیز اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت نوح ؑ کو جو سوال سے روکا گیا ہے۔ تو اسی وجہ سے کہ اس طرح ان کے بیٹے کی پردہ دری ہوتی تھی۔ اگر ان کے سوال کا صحیح جواب دیا جاتا۔ تو تفصیلاً اس کے عیوب بیان کرنے پڑتے جو اللہ تعالیٰ کی ستاری کے خلاف تھا اس لئے ایک مختصر جواب دیا۔ کہ اس کے اعمال اچھے نہ تھے۔ اور مزید سوالات سے روک دیا۔ تاکہ اور زیادہ عیب سے پردہ نہ اٹھانا پڑے۔ اس امر سے اللہ تعالیٰ کے رحم اور اس کی ستاری کا ایک نہایت دلکش جلوہ نظر آتا ہے۔ ایک طرف غرق کا حکم ہے۔ دوسری طرف پردہ پوشی بھی ہو رہی ہے۔ ان معنوں کے رُو سے "جاہل نہ بن" کے یہ معنی ہونگے کہ ایسے امور کو خود ہی سمجھ لینا چاہیئے۔ اور سوال نہیں کرنا چاہیئے۔ اور اسمیں کیا شک ہے۔ کہ بعض امور کے متعلق سوال کرنا مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ انکے متعلق خود ہی اجتہاد کر لینا سوال کرنے سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

اس جگہ ایک اور بھی سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ وعدہ تو خدا تعالیٰ کا کوئی بیان نہیں ہوا۔ بلکہ الہام الٰہی میں صرف حکم بیان ہوا ہے کہ فلاں قسم کے لوگوں کو کشتی میں بٹھا لے۔ اب اگر کسی شخص نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو نہیں مانا اور کشتی میں سوار نہیں ہوا تو وہ نافرمان بن گیا۔ خدا تعالیٰ پر وعدہ خلافی کا الزام کس طرح لگ سکتا تھا۔ اور جب خدا تعالیٰ پر وعدہ خلافی کا کوئی الزام نہیں لگ سکتا تھا۔ تو پھر حضرت نوح علیہ السلام کے اس قول کا کیا مطلب ہوا۔ کہ اِنَّ وَعْدَکَ الْحَقُّ۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ وعدہ ضرور تھا۔ گو جو الفاظ قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں۔ وہ حکم کے رنگ میں ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ بعض دفعہ حکم بھی وعدہ کا رنگ رکھتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا۔ کہ فلاں فلاں کو کشتی میں بٹھا لیجیو۔ تو اس کے یہ معنی تھے۔ کہ میں اُن کو بچاؤں گا۔ اور یہ امر کہ یہ وعدہ تھا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس حکم میں ایک استثناء فرمایا ہے۔ کہ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْہِ الْقَوْلُ لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ لوگ جن کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے کون لوگ ہیں۔ اب اگر اس عبارت میں حکم ہوتا وعدہ نہ ہوتا تو ضروری تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو بتایا جاتا کہ یہ کون لوگ ہیں کہ جن کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے۔ تاکہ حضرت نوح ؑ ان کو کشتی میں نہ بٹھائیں۔ مگر انہیں ان کے ناموں یا ان کے افعال سے بالکل واقف نہیں کیا گیا۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ حضرت نوح ؑ کے بیٹے نے جب کشتی میں سوار ہونے سے انکار کیا۔ تو حضرت نوح علیہ السلام کو تعجب ہوا۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے نام جن کو نہیں بٹھانا تھا۔ ظاہر نہیں کئے تو صاف ظاہر ہے کہ حکم کے الفاظ میں یہ ایک وعدہ تھا۔

٥١ حضرت نوح ؑ اپنے بیٹے کے اعمال سے بے خبر تھے۔

١ اس سوال سے حضرت نوح ؑ کو کیوں روکا گیا

قَالَ رَبِّ اِنِّيْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ

(نوح نے) کہا (اے) میرے رب! میں اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ کہ میں تجھ سے (آیندہ) کوئی ایسی چیز مانگوں

لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْۤ اَكُنْ

جس (کی بھلائی یا برائی) کا مجھے کچھ علم نہ ہو اور اگر تو (میری یہ غلطی) مجھے نہ بخشے اور مجھ پر رحم نہ کرے۔ تو میں

مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ ۴۸

نقصان اٹھانیوالوں میں سے ہو جاؤنگا ؎

ﷲ چونکہ اس کا ایفاء اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے ان لوگوں کے نام جو اس وعدہ سے مستثنیٰ تھے اس نے ظاہر کرنے پسند نہ کئے۔

دوسری دلیل وعدہ کی موجودگی کی یہ ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نہیں فرماتا۔ کہ میں نے کب کسی کے بچانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے تو صرف حکم دیا تھا کہ گھر کے لوگوں اور مومنوں کو کشتی میں بٹھا لیجیو۔ اب اگر ان میں سے کوئی کشتی میں نہیں بیٹھا تو یہ اس کا قصور ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام کے اس سوال کو کہ تیرا وعدہ تو اہل کے بچانے کا تھا۔ قبول کر لیتا ہے اور یہ جواب دیتا ہے۔ کہ وعدہ اہل کے متعلق تھا۔ اور یہ لڑکا حقیقتاً تیرا اہل نہیں ہے۔

اس امر پر روشنی ڈالنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے۔ کہ بعض نادان لوگ پیشگوئیوں کے سمجھنے میں اجتہادی غلطی کے لگنے کے منکر ہیں۔ اور جب انہیں قرآن کریم کی یہ آیات بتلائی جاتی ہیں۔ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اس جگہ کوئی وعدہ نہ تھا۔ بلکہ ایک حکم تھا۔ لیکن جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے حضرت نوح ؑ سے اہل کے متعلق ایک وعدہ تھا۔ لیکن اس کے صحیح معنی وقت سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام نہیں سمجھے اور انہیں اجتہادی غلطی لگ گئی۔ وقت پر اللہ تعالیٰ نے انہیں حقیقت حال سے آگاہ کیا۔

؎ - انبیاء کیسے اعلیٰ مقام پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نصیحت کو سنکر انہوں نے اپنے قول سے خالی رجوع ہی نہیں کیا۔ بلکہ یہ بھی دعا کی ہے۔ کہ گو میں آیندہ ایسی غلطی کے ارتکاب سے بچنے کی کوشش کرونگا۔ لیکن تیری مدد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسلئے تو بھی میری مدد کر۔ کہ میں آیندہ ایسا کوئی فعل نہ کروں۔ کیسے نادان لوگ ہیں وہ جو بہت ادنیٰ مقام کے ہو کر بھی بڑے بڑے دعوے کر دیتے ہیں۔ اور انبیاء کے طریق عمل سے نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

اس آیت سے نبیوں کے استغفار کی بھی حقیقت کھل جاتی ہے۔ اس جگہ حضرت نوح ؑ کا استغفار بیان ہوا ہے لیکن جیسا کہ اوپر کی آیات سے ظاہر ہوا ہے ان سے صرف اجتہادی غلطی ہوئی تھی جو شریعت کا گناہ نہیں بلکہ بشری کمزوری ہے۔ باوجود اس کے وہ استغفار کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا۔ کہ استغفار سے گناہ کا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ لفظ بشری کمزوریوں کے نتائج سے بچنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے ؂

نوح کا صرف اپنی نسل سے بچانے کے لئے خدا کی پناہ چاہنا

نبیوں کے استغفار کی حقیقت۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ

(اس پر اسے) کہا گیا (کہ) اے نوح تو ہماری طرف سے (عطا شدہ) سلامتی اور (طرح طرح کی) برکات کے ساتھ جو تجھ پر اور جو (لوگ)

عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ

کہ تیرے ساتھ ہیں ان میں سے کئی جماعتوں پر (نازل کی جاتی) ہیں اتر جا۔ اور بعض جماعتیں (ایسی بھی ہیں) جنہیں ہم فرد

۴۹ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(دنیا کا عارضی) سامان عطا کریں گے (مگر) پھر ان پر ہماری طرف سے دردناک عذاب آئیگا ۵۴۹

۵۴۸ حل لغات ۔ برکات ۔ برکۃ کی جمع ہے ۔ البرکۃ ۔ النماء نشو و نما پانا ترقی کرنا الزیادۃ ۔ بڑھنا ۔ زیادہ ہوجانا ۔ السعادۃ اقبال مند ہونا ۔ خوش نصیب اور خوش حال ہونا ۔ ہر قسم کی نحوستوں اور کدورتوں سے پاک ہونا ۔ برك على شيء بالمكان ثبت ۔ برک کے معنی ہیں قرار پذیر ہوا ۔ قائم ہوگیا ۔ اور بارك الله فيك کے معنی ہیں طَهَّرَ ۔ پاک کیا ۔ اور بارکہ کے معنی ہیں رضی عنہ ۔ اس پر راضی ہوا ۔ (اللهم) بارك على الانبياء وآلهم اى ادم لهم ما اعطيتهم من التشريف والكرامة اور جب اس کا فاعل اللہ تعالیٰ ہو اور مفعول بصلہ علیٰ ہو ۔ تو اس کے معنی شرف و عزت عطا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے ہوتے ہیں (اقرب)

تفسیر ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے علاوہ دوسرے مومنوں کی بھی نسل چلی اور ان کے لئے بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے برکات کے وعدے تھے ۔ اور یہ خیال جو لوگوں میں رائج ہے ۔ کہ سب لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہیں درست نہیں ہے بائبل کے بیان پر قرآن کریم کے اس بیان کو کس

برکات

قدر فوقیت حاصل ہے ۔ آج ہر ایک تعلیم یافتہ مسیحی دل میں یہ یقین رکھتا ہے ۔ کہ دنیا پر بسنے والے بنی نوع انسان صرف نوح علیہ السلام کی ہی اولاد نہیں ہیں لیکن وہ اس یقین کے وقت بائبل کا مکذب ہوتا ہے اور قرآن کریم کا مصدق ۔ کیونکہ بائبل کہتی ہے ۔ کہ صرف نوح اور ان کی اولاد اس طوفان سے بچے ۔ اور اسی کی نسل آئندہ دنیا میں پھیلی (پیدائش باب) چنانچہ وہ کل بنی آدم کو تین ہی نسلوں میں تقسیم کرتے ہیں ۔ یعنی سام حام اور یافث کی اولاد جو تینوں حضرت نوح ؑ کے بیٹے تھے ۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ دوسرے لوگوں کا تو کیا ذکر ہے ۔ خود حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کی نسلیں بھی چلیں ۔

امم سنمتعہم سے کون لوگ مراد ہیں
موجودہ سب نسل حضرت نوح سے نہیں چلی ۔

وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ سے ۔ یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ حضرت نوح ؑ کے وقت میں بھی اور اقوام تھیں جو ہلاک نہیں کی گئیں ۔ بلکہ انہیں ڈھیل دی گئی ۔ اور وہ بعد میں اپنے وقت مقررہ پر ہلاک ہوئیں اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے ۔ کہ اس میں اگلی نسلوں کا ذکر ہے ۔ کہ ان سلامتی اور برکت پانے والے لوگوں میں سے ایک گروہ بعد میں بگڑ کر سزا پائے گا ۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ج مَا

یہ (انذاری بیان) غیب کی (اہم) خبروں میں سے ہے جنہیں ہم تجھ پر وحی (کے ذریعہ سے) نازل کرتے ہیں

كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛؕ مع

نہ تو ان کو اس سے پہلے جانتا تھا اور نہ تیری قوم (جانتی تھی)۔

فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ ۵۰ ع ۴

پس تو صبر سے کام لے (اچھا) انجام یقیناً تقوٰی اختیار کرنے والوں کا ہی ہوتا ہے[۴۹]

یہ ذکر در اصل نوح کے واقعہ کا نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے مستقبل کا ہے۔

۴۹ ۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کریم قصے بیان نہیں کرتا۔ کیونکہ یہاں فرماتا ہے کہ یہ غیب کی خبریں ہیں۔ یعنی آیندہ ہونیوالے واقعات ہیں بیشک ظاہری طور پر تو حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے ۔ مگر مطلب یہ ہے کہ نوح ؑ کے مشابہ واقعہ تیرے ساتھ بھی گذریگا ۔ اسی وجہ سے آیت کے آخر میں فرمایا۔ کہ تو بھی صبر سے کام لے ۔ انجام متقیوں کا ہی نیک ہوتا ہے ۔ یعنی جس طرح نوحؑ کی قوم تباہ ہوئی ۔ تیری قوم کا ایک حصہ بھی تباہ ہوگا ۔ اور خدا تعالیٰ تجھ سے اور تیرے ساتھیوں سے ایک نئی نسل چلائیگا ۔ جو ہر نئے زمانہ میں نیکی اور تقوی کے جھنڈے کے علم بردار رہیں گے ۔

قرآن کریم گذشتہ قصے بیان نہیں کرتا

تعجب ہے کہ اس قسم کی آیات کی موجودگی میں بھی بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں ۔ کہ قرآن کریم پچھلی اقوام کے قصص بیان کرتا ہے ۔ قرآن کریم تو جو تاریخی واقعہ بھی بیان کرتا ہے ۔ وہ صرف یہ خبر دینے کے لئے کرتا ہے ۔ کہ آیندہ مسلمانوں سے بھی ایسا ہی ہونے والا ہے چنانچہ ایک بھی تاریخی واقعہ قرآن کریم میں ایسا بیان نہیں کیا کہ جس کے مشابہ واقعہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کی امت کے ساتھ نہ گذرا ہو ۔ یا جو آیندہ نہ گذرنے والا ہو ۔

حضرت نوح کے واقعہ پر اجمالی نظر۔

اوپر کی آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا جو واقعہ بیان ہوا ہے ۔ اس کے متعلق مسلمانوں اور مسیحیوں اور یہودیوں میں بہت کچھ اختلاف ہے ۔ چونکہ کسی ایک آیت کے نیچے اس واقعہ کا ذکر نہیں ہو سکتا تھا ۔ اس لئے میں سب آیات کے آخر میں اس کے متعلق اپنی تحقیق اور دوسرے لوگوں کے خیالات لکھ دیتا ہوں ۔

بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام لمک کے بیٹے تھے اور حضرت آدم علیہ السلام سے نویں پشت میں تھے (حضرت آدم کو شمار کر کے دسویں) جب وہ پانچسو برس کے ہوئے ۔ تو ان کے ہاں سم حام اور یافث پیدا ہوئے (پیدایش باب ۲۸ تا ۳۲)) اہل دنیا کی شرارت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے ان کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا ۔ مگر چونکہ نوح ؑ نیک تھا ۔ خدا نے اسے پسند کیا ۔ اور اسے ایک کشتی بنانے کا حکم دیا اور ارشاد کیا ۔ کہ علاوہ بیوی بچوں کے کشتی میں طوفان کے وقت حلال جانوروں میں سے سات سات جانور اور دوسرے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا ہر اک قسم کا چڑھا لے (پیدایش باب ۷) طوفان کے آنے پر دنیا کے تمام جانور اور انسان ہلاک ہو گئے ۔ مگر نوح ؑ اور ان کے اہل وعیال کشتی کے ذریعے سے بچ گئے ۔ اور ان کے اور ساتھ کے جانوروں کے ذریعے سے پھر دنیا آباد ہوئی ۔ اور طوفان کے بعد کشتی ارارات پہاڑ کی چوٹی پر ٹھہر گئی ۔ (باب ۷ و ۸)

اس کے بعد نوح اور اس کی اولاد سے دنیا پھر بسنے لگی۔ اور نوح کھیتی باڑی کرنے لگا۔ اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا۔ ایک دن اس کی شراب پی کر نشہ میں مست ہوگیا۔ اس کے بیٹے حام نے سب سے پہلے اُسے ننگا دیکھا۔ اور باقی بھائیوں کو بتایا۔ انہوں نے اُلٹے پاؤں آکر بغیر دیکھے اس پر کپڑا ڈال دیا۔ نوح جب ہوش میں آئے تو اُنھوں نے حام کو بد دعا دی اور اس کی اولاد کی نسبت جس نے کنعان کہلانا تھا۔ اور ملک کنعان کو آباد کرنا تھا۔ سام کی غلامی کی پیشگوئی کی۔ اور اسیطرح یہ خبر بھی دی کہ حام کی اولاد یافث کی اولاد کی بھی غلام ہوگی۔

بائیبل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ طوفان کے بعد نوح کی اولاد عراق موجودہ میں آباد ہوئی۔ کیونکہ لکھا ہے۔ کہ حام کے پوتے نے بابل وغیرہ پر حکومت کی۔ یہودیوں کی احادیث اور روایات کی کتب میں بائیبل سے کسی قدر اختلاف ہے۔ اس جگہ اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس قدر بتادینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ کہ مدرشں المادہ میں لکھا ہے۔ کہ نوح کا نام اس کے ہل ایجاد کرنے کے سبب سے نوح رکھا گیا تھا۔ چونکہ بائیبل میں لکھا ہے۔ کہ ان کے والد نے ان کا نام نوح رکھا۔ اس لئے اس اختلاف کو کتاب سفرہا یشیر میں یوں مٹایا گیا ہے۔ کہ ان کے والد نے ان کا نام مناحیم رکھا تھا۔ جس کے معنی تسلی دینے والے کے ہیں۔ طوفان کے بعد ان کا نام نوح ہوا۔

نوحؑ کی نیکی کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ بعض انہیں نیک۔ بعض معمولی نیک۔ اور بعض بدکار بھی کہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ وہ محض اپنی نسل میں سے پیدا ہونے والے نیک لوگوں کی خاطر بچایا گیا۔

حضرت نوح کی شریعت اور کتاب

طالمود جو یہودیوں کی کتب احادیث کا مجموعہ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ نوح شریعت والے نبی تھے۔ اور انہوں نے طوفان کے اٹھائیس سال بعد شریعت مرتب کرنی شروع کی۔ جس میں کچھ تو طبعیات کے مسائل تھے اور کچھ موسٰی کی شریعت سے ملتے جلتے مسائل تھے۔ رافائیل فرشتہ نے انہیں علم طب سکھایا تھا۔ اور بوٹیوں کے خواص سکھائے تھے اس نے ایک کتاب لکھی جو بعد میں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ اور یونانیوں اور ہندوستانیوں نے اس کتاب سے علم طب حاصل کیا (یہودی علماء کو بھول گیا ہے۔ کہ ان کے نزدیک سوائے نوحؑ کے اور کسی انسان کی نسل دنیا میں باقی نہ رہی تھی۔ اس وجہ سے سب دنیا میں نوح کی ہی اولاد تھی۔ پھر انہیں کسی ترجمہ سے فائدہ اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو اپنے دادا کے علوم کو اس کی اپنی زبان میں سمجھتے تھے۔ مگر سچ ہے دروغگو را حافظہ نباشد۔)

بائیبل سے معلوم ہوتا ہو کہ نوح کی اولاد طوفان کے بعد عراق میں آباد ہوئی

طوفان نوح کا تاریخی ثبوت

یہ ایک عجیب بات ہے کہ نوح کے واقعہ سے ملتے جلتے واقعات پر مبنی روایات دنیا کے قریباً ہر براعظم میں ملتی ہیں (دیکھو انسائیکلو پیڈیا ببلیکا) یونان کی قدیم روایات میں بھی ایک ایسے انسان اور اس کے وقت میں طوفان کا ذکر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یورپ بھی اس قسم کے کسی تاریخی واقعہ سے واقف تھا۔ شمالی امریکہ کے قدیم باشندوں میں بھی ایسی روایات پائی جاتی ہیں۔ حتے کہ بعض جگہ ناموں کی مشارکت بھی ہے۔ بابل کی قدیم روایات میں طوفان کے ہیرو کا نام ہسیس اندرا دیا ہے۔ اور لکھا ہے۔ کہ وہ دسواں بادشاہ تھا۔ بائیبل بھی آدم کی نسل سے نوح کو دسواں قرار دیتی ہے۔ شمالی امریکہ کی روایتوں میں اس شخص کا نام کنبان بتایا ہے۔ جس کے معنی عقلمند کے ہیں اور یہ نام معنوں کے لحاظ سے ہسیس اندرا کے

نوح کا نام نوح کب رکھا گیا۔

شمالی امریکہ کے قدیم باشندوں کی روایت

حضرت نوح کی نیکی کے متعلق یہودیوں کے مختلف اقوال

بابل کی قدیم روایات

نام سے جو بابل کی روایتوں میں آتا ہے ملتا ہے۔ پالینیشیا۔ ایران۔ کنعان مصر اور ہندوستان میں بھی اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں کہ پرانے زمانے میں ایک سخت طوفان آیا تھا۔ اور ایک خاص نیک بندے کے ذریعہ سے کچھ لوگ ایک کشتی میں بچے تھے۔ چنانچہ بابل کی روایات اور ہندوستان کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے وقت کی ایک شخص کو قبل از وقت خدا تعالیٰ کی طرف سے اطلاع دی گئی تھی۔ بابل کی روایات میں لکھا ہے۔ کہ خواب کے ذریعہ سے اطلاع ملی اور ہندوستان کی روایات میں لکھا ہے۔ کہ دیوتاؤں نے اسے بتایا۔

بابل کی روایتوں میں اس پہاڑ کو جہاں نوح کی کشتی ٹھہری تھی ارمینیا کا پہاڑ قرار دیا ہے۔ اسلامی مفسروں نے بھی جُودی جو اس پہاڑ کا نام قرآن کریم میں آیا ہے۔ اُسے آرمینیا کا پہاڑ قرار دیا ہے۔ اس طرح قرآن کریم کی روایت اس امر میں بابل کی روایت سے ملتی ہے۔ اور بابل ہی چونکہ نوحؑ کی اولاد کے رہنے کا مقام تھا۔ جس پر خود بائیبل بھی گواہ ہے۔ اس لئے وہاں کی روایت کو ایک حد تک ضرور فوقیت دینی پڑے گی خصوصاً جب کہ بابل والوں کو نوح کے واقعہ سے کوئی خاص فائدہ اٹھانا مقصود نہیں تھا۔ برخلاف بائیبل کے کہ اس کی روایتوں میں یہ بات مدنظر ہوتی ہے۔ کہ سب دنیا کی تاریخ انہی کے گرد چکر کھاتی ہے۔

ہندوستان میں اس طوفان کا ذکر سب سے پہلے ستھا پتھا برہمنا نامی کتاب میں ہے۔ اس میں لکھا ہے۔ کہ منو پہلا انسان تھا۔ وہ سورج دیوتا وِوَسوات کا بیٹا تھا۔ وہ ایک دفعہ نہا رہا تھا۔ کہ ایک مچھلی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ مچھلی نے اس وعدہ پر نجات حاصل کی کہ ایک بڑا طوفان آنیوالا ہے۔ اس وقت میں تجھے نجات دوں گی۔ اور اُسے ایک کشتی تیار کرنے کی ہدایت کی۔ جب طوفان آیا۔ تو مچھلی کشتی کو پہاڑ پر لے گئی۔ اور وہاں طوفان کے کم ہونے پر منو اترا اور اس نے قربانی کی آخر خدا تعالیٰ نے اسے ایک بیٹی (بغیر میاں کے) عطا کی۔ اور اس سے (بغیر باپ کے) سب دنیا کی نسل چلی۔

اس طوفان کا ذکر ہندوستان کی قدیم تاریخ میں

دوسری روایت مہابھارت میں ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ منو کے ساتھ سات عقلمند لوگ اَور بھی تھے اور لکھا ہے۔ کہ وہ مچھلی برہما یعنی خدا تھی اور اس نے منو کو دیوتا اور انسان بنانے سکھائے تھے۔

تیسری روایت بھگوتا پرانا میں ہے۔ اس میں جانوروں کے جوڑے ساتھ لینے کا بھی ذکر ہے۔ روایات کا اس قدر اتفاق ہے کہ بعض جگہ ناموں کا ملنا جیسے کہ ہندوستان میں اس کا نام منو بتانا اور بائیبل میں نوح اور طالمود میں مناحیم جو منو سے بہت ملتا ہے۔ کیونکہ آخری یَ اور یمؔ صرف ادب کے لئے عربی، زبان میں لگتے جاتے ہیں۔ پس صرف مناح رہ جاتا ہے۔ جو منو سے ملتا ہے۔ اسی طرح بابل کے نام اور امریکہ کی قدیم روایتوں کے ناموں کے معنوں کا ملنا۔ ہر جگہ ایک کشتی کا ذکر ہونا۔ اور طوفان سے صرف چند آدمیوں کے بچکر نکلنے کا بیان کیا جانا بتاتا ہے۔ کہ یہ واقعہ ایک زبردست تاریخی واقعہ ہے جس پر دنیا کی سب قومیں شاہد ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس واقعہ کا سب دنیا پر اثر پڑا تھا۔ تبھی تو سب دنیا کی تاریخوں میں اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔

چونکہ بظاہر سب دنیا پر ایسے طوفان کا آنا محال نظر آتا ہے۔ اس لئے علوم جدیدہ کے ماہروں نے اس واقعہ کو ایک تشبیہی کہانی قرار دیا ہے۔ اور یہ معنی کئے ہیں۔ کہ پرانے زمانہ میں ستاروں کی گردش وغیرہ کا ذکر تمثیلی زبان میں بعض لوگوں نے کیا ہے

طوفان کا ذکر تمثیلی نہیں ہو سکتا۔

اس سے دھوکہ کھا کر یہ قصہ مشہور ہوگیا ہے۔ مگر یہ سوال
پھر بھی باقی رہ جاتا ہے۔ کہ اس تمثیلی قصہ کو اس قدر
اہمیت کیوں حاصل ہوگئی ہے۔ اور سب دنیا کی قوموں کے
دلوں پر اس قدر گہرا اثر اس کا کیوں پڑا ہے۔ اور کیوں
دوسرے قصوں کو چھوڑ کر اسے سب دنیا نے یاد رکھا
ہے۔ اور پھر سوال یہ ہے۔ کہ قصہ تو آخر کسی ایک جگہ
کے لوگوں نے بنایا ہوگا۔ وہ اس طرح سب دنیا میں کس
طرح پھیل گیا۔ اور ہر زبان کی مذہبی تاریخوں میں اس کا
ذکر ہونے لگا۔ کونسا عقلمند اس امر کو تسلیم کرسکتا ہے
کہ ایک ملک میں بنایا جانے والا قصہ قدیم زمانہ میں جبکہ
تعلقات بہت محدود تھے۔ اس طرح مختلف ملکوں اور
مختلف زبانوں میں پھیل گیا۔ اور یکساں اہمیت پا گیا
اور سب مذاہب کا جزو بن گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تواتر اور اس عظمت کو
دیکھ کر جو اس قصہ کو حاصل ہے۔ اس امر سے انکار نہیں
ہوسکتا۔ کہ یہ واقعہ ضرور ہوا ہے۔ اور اس کا تعلق بھی
سب دنیا سے ہے۔ اور ہوا بھی غیر معمولی طور پر ہے اور
جب ہم اس نتیجہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ تو یہ امر ہمارے
لئے سمجھنا بالکل آسان ہو جاتا ہے۔ کہ وہ واقعہ جو قرآن
کریم نے بیان کیا ہے۔ ان سب نتائج کے مطابق پورا
اترتا ہے۔ اور اس سے کوئی بات قانون طبعیات کے
خلاف بھی نہیں ماننی پڑتی۔ کیونکہ قرآن کریم سے صرف
یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ پرانے زمانہ میں ایک زبردست طوفان
آیا تھا۔ جس سے اس ملک کے سب باشندے تباہ
ہوگئے تھے۔ اور یہ کہ اس طوفان کے ہیرو نوح علیہ السلام
کو خدا تعالیٰ نے خاص برکت دی تھی۔ اور ان کی نیکی کی
وجہ سے ان کی نسل کو خاص غلبہ دنیا میں عطا کیا تھا۔
باقی اور اقوام بھی اس وقت تھیں۔ جو اس عذاب میں شامل
نہ تھیں۔ ایک مدت تک اپنے دن گذار کر وہ اپنے انجام
کو پہنچ گئیں۔ اور یہ بھی ثابت ہے۔ کہ یہ طوفان اس قدر
شدید تھا کہ کشتیوں میں پناہ لینی پڑی۔ اور آسمان سے
بھی بارش ہوئی۔ اور زمین کے چشمے بھی پھوٹ پڑے
اور بعض پہاڑیوں کی چوٹیوں تک پانی پہنچ
گیا

یہ طوفان عالمگیر نہیں تھا

یہ واقعات ایسے ہیں کہ جن کا انکار کرنے کی
کسی کو گنجائش نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم سے ثابت
ہے۔ اور ہر ملک کی روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ
وہ ملک پہاڑی تھا۔ اور قرآن کریم سے مزید یہ معلوم ہوتا
ہے۔ کہ وہ ایک ایسی وادی تھی۔ جس کے پاس بہت
سے پہاڑ تھے۔ پس یہ بالکل ممکن ہے۔ کہ اس وادی
کا منہ پہاڑوں کے بالمقابل سلسلوں کی وجہ سے
تنگ ہو۔ جیسا کہ اکثر پہاڑی وادیوں میں ہوتا ہے
زلزلہ کے سبب سے پتھروں کے گرنے سے یا برف
کی سلوں کے پھسل کر آ پڑنے کے سبب سے اس
وادی کا منہ بند ہوگیا ہو۔ اور اوپر سے تیز بارش کے
ہونے اور نیچے سے چشموں کے پھوٹنے کے سبب سے
پانی اس قدر جمع ہوگیا ہو کہ پہاڑوں کی چوٹیاں بھی
پانی کے نیچے آگئی ہوں۔ جیسا کہ سنہ ۱۹۲۰ میں ہی
تبت کی پہاڑیوں میں ایک گلیشر کے گرنے کی وجہ
سے حادثہ ہوچکا ہے۔

قرآن کریم سے اس واقعہ کے متعلق کیا ثابت ہوتا ہے

چونکہ یہ واقعہ بنی نوع انسان کی تہذیب کے
ابتدائی دور میں ہوا ہے۔ اور حضرت نوحؑ اس دور کے
پہلے فرد ہیں۔ جیسا کہ احادیث میں انہیں پہلا رسول
کہا گیا ہے۔ اور اسی طرح بائبل سے بھی ثابت ہوتا ہے
پس معلوم ہوا کہ دور تہذیب کے بانی حضرت نوحؑ ہیں۔
ہندو روایات بھی اس امر کی تصدیق کرتی ہیں۔ کیونکہ
ان سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ منو پہلا انسان تھا لیکن
ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے۔ کہ اس کے ساتھ سات
اور آدمی بھی طوفان سے بچے تھے۔ پس ان دونوں
باتوں کو ملا کر یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ منو تہذیب کے

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا

اور عاد کی طرف (بھیجے) ان کے بھائی ہود کو (رسول بنا کر بھیجا) اسنے (یہ حکم پاکر انہیں) کہا اے میری قوم تم اللہ کی عبادت

۵۱ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ○

کرو اسکے سوا تمہارا کوئی بھی معبود نہیں ہے (اسکے شریک مقرر کرنے میں) تم محض افترا کرنے والے ہو ن۵

دور کا پہلا انسان تھا۔ ورنہ انسان ہونے کے لحاظ سے وہ پہلا نہ تھا۔ ان تین اہم بیانات کے اتفاق کے بعد جو مختلف ممالک کے مذاہب کا ہے اس کے ماننے میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ تہذیب اور تمدن کی بنیاد نوحؑ سے پڑی ہے۔ اور یہ ایک امر واقع ہے۔ کہ جب کوئی قوم تہذیب اور تمدن میں ترقی کرنے لگتی ہے۔ تو اس کی نسل بھی کثرت سے بڑھنے لگ جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ بسنے والی دوسری اقوام خود بخود کم ہونے لگ جاتی ہیں۔ چنانچہ جس جس ملک میں بھی کوئی نسبتاً زیادہ مہذب قوم جا کر بسی ہے اس نے یا تو دوسری اقوام کو جو اس سے تہذیب میں کم تھیں۔ مٹا دیا ہے۔ یا بہت کمزور کر دیا ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی اولاد اور ان کے ہمراہیوں کی اولاد جو تہذیب کے دور کی اول کڑی تھی۔ جن جن ملکوں میں پھیلی ہے۔ اس نے وہاں کی پہلے سے آباد شدہ نسلوں کو یا تو بالکل مٹا دیا یا اپنے اندر جذب کر کے یا ان کی طاقت توڑ کر بالکل کمزور کر دیا۔ اور اپنی روایات اور اپنے آثار کو ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ اس کی وجہ سے وہ طوفان کا قصہ جس نے یقیناً ان کے دلوں پر ایک گہرا اثر ڈال دیا ہوگا۔ اُن کے ساتھ ساتھ ہی سب دنیا میں پھیلتا گیا۔

شرک کا عقیدہ محض افترا ہے

طوفان کا واقعہ ایک ہی ہے نہ مختلف ملکوں کے مختلف واقعات

پس نہ یہ درست ہے کہ نوحؑ کا طوفان سب دنیا پر آیا اور نہ یہ درست ہے کہ یہ سب قصص جو مختلف ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں مختلف واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ واقعہ ایک ہی ہے۔ اور طوفان نوحؑ کی ایک ہی ملک میں آیا ہے۔ لیکن چونکہ نوحؑ دورِ تہذیب کے انسان اول ہیں۔ ان کی اور ان کے ساتھیوں کی اولاد طوفان کے بعد مختلف ممالک میں پھیل گئی۔ اور اپنی اعلیٰ تہذیب اور بہتر تمدن کی وجہ سے اصلی باشندوں پر غالب آگئی یا تو وہی باقی رہ گئی۔ یا پھر انکو اس نے ایسا مرعوب کر لیا کہ انہوں نے بھی نوحؑ کی امت کی تہذیب کو اختیار کر لیا۔ اور اس طرح دنیا کے ہر ملک میں طوفان نوحؑ کا قصہ پہنچ گیا۔ اور ایک لمبا زمانہ گذرنے پر جب باہر سے آنے والوں کو اپنے اصلی وطن سے کوئی تعلق نہ رہا۔ تو ہر اک ملک کے شہروں ناموں اور مقام نے اس قصہ میں جگہ لے لی۔ اور اس طرح یہ واقعہ مختلف واقعات کا رنگ اختیار کر گیا۔

ن۵ — یعنی واقعات بتا رہے ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ اور شرک کا عقیدہ محض ایک افترا ہے۔ مطلب یہ کہ شرک کی تائید میں کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی نہیں۔ جس سے یہ خیال بھی کیا جائے۔ کہ اس عقیدہ کے پابند کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ صرف اپنے آبائی خیالات کی اندھا دھند پیروی کر رہے ہیں۔

عاد کے متعلق یورپین محققین کا خیال ہے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں ملتا۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ جو کتبے عرب سے نکلے ہیں۔ ان سے کسی گذشتہ

قوم کا نام عاد نہیں ملتا۔ صرف اتنا پتہ لگتا ہے کہ سمیری قوم سب سے قدیم ہے۔ ان کی حکومت سب سے پہلی تھی۔ پھر سامی قوم ہوئی۔ جن میں حمورابی سب سے مشہور آدمی گذرا ہے۔ جس کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی تھا۔ یہ مسیحؑ سے دو ہزار سال قبل اور حضرت موسیٰ سے چھ سو سال قبل تھا۔ بائیبل سے اس کی تعلیم اس قدر ملتی ہے۔ کہ بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ بائیبل کی تعلیم اس سے چرائی گئی ہے۔ (ان مسیحیوں کو غور کرنا چاہیئے جو قرآن کریم کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کی تعلیم پہلے صحیفوں سے چرائی گئی ہے)

محققین یورپ کا خیال ہے۔ کہ عربوں کے عام قصے سُن کر قرآن شریف نے یہ قصہ نقل کر دیا ہے۔ میری نزدیک بنی نوع انسان کی جماعتوں کے نام دو قسم کے ہوتے ہیں ایک قومی نام ہوتا ہے اور ایک نسلی نام ہوتا ہے۔ جیسے کہ آرین ایک اجتماعی اور مشترک نام ہے۔ جس کے ماتحت کئی خاندان ہیں۔ اب اگر کوئی کہے کہ کتبوں میں سے کوئی گپتا کا کتبہ نکلتا ہے۔ اور کوئی کسی اور کا لیکن آرین کہیں بھی نہیں نکلتا۔ تو یہ اس کی بیوقوفی ہوگی۔

غرض میرے نزدیک عاد ایک مجموعہ قبائل کا نام ہے اور اس کے ماتحت قبائل میں سے مختلف زمانوں میں بعض قبائل غلبہ اور حکومت حاصل کرتے رہے ہیں۔ جو اپنے اپنے ناموں کے کتبے نصب کرتے رہے ہیں۔ مگر وہ سب عاد ہی تھے۔ قرآن کریم سے اس قدر پتہ لگتا ہے کہ ثمود سے پہلے عاد تھے۔ پس گو مجموعی نام کا پتہ نہیں ملتا لیکن ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ جو قومیں ثمود سے پہلے آباد تھیں۔ ان کا مجموعی نام عاد تھا اور اس بات کا ثبوت کہ عاد کا لفظ موجود تھا جغرافیوں سے ملتا ہے۔ یونان میں جو جغرافئے لکھے گئے ہیں ان میں ایک قبیلے کا نام عاد پایا جاتا ہے۔ ان میں لکھا ہے۔ کہ یمن میں مسیحؑ کے زمانے سے پہلے ایک قبیلہ حاکم تھا۔ جس کا نام

کیا قوم عاد کوئی قوم تھی یا نہیں

ADRAMITAI تھا۔ یہ وہی ہے جو قرآن کریم میں عاد ارم کے نام سے موسوم ہے چنانچہ سورۂ فجر میں فرمایا ہے۔ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ۔ چونکہ یونانی نام کا پچھلا حصہ صرف اسم پر دلالت کرتا ہے۔ اصل نام ادرم ہے اور چونکہ یونانی زبان میں عین نہیں ہے۔ عین کو بھی الف لکھا جاتا ہے۔ اس لئے ادرم اصل میں عدرم ہے جو عاد ارم سے بگڑا ہوا ہے۔ بعض یورپین مصنفوں کا خیال ہے۔ کہ اس لفظ سے مراد حضرموت ہے۔ لیکن یہ خیال ان کا درست نہیں۔ کیونکہ اول تو حضرموت ایک شہر کا نام ہے۔ اور یہ نام ایک قبیلہ کا بتایا گیا ہے دوسرے حضرموت کا شہر یونانی اور لاطینی دونوں کتب میں مذکور ہے۔ اور ان میں کسی جگہ بھی اس کا نام ان حروف میں نہیں لکھا گیا۔ بلکہ یونانی کتب میں ہمیشہ حضرموت ADRAMOTITAI لکھا جاتا ہے۔ یعنی ادراموتی تائی اور اوپر کا نام ادرامی تائی ہے۔ اسی طرح لاطینی میں حضرموت کو CHATRAMOTITAI لکھا جاتا ہے۔ یعنی شترا موتی تائی پس اس لفظ سے حضرموت کا شہر مراد لینا کسی صورت میں بھی درست نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم خیال کریں کہ اس خاص موقع پر جغرافیہ والوں نے پرانے یونانی اور لاطینی لفظ کو ترک کر کے ایک نیا لفظ ایجاد کر لیا۔ پھر اس سے بھی بڑا ثبوت یہ ہے۔ کہ جس کتاب میں یہ لفظ آیا ہے اس میں ساتھ ہی حضرموت کا بھی حال لکھا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کتاب کے مصنف کے نزدیک بھی یہ دونوں نام علیحدہ علیحدہ چیزوں کے تھے۔ (دیکھو العرب قبل الاسلام)

ایک قوم کے حصے کا بھی ہو سکتا ہے

ادرمیتائی عاد ارم حضرموت نہیں ہو سکتا

عاد چند قبائل کا اجتماعی مشترک نام تھا

قرآن کریم سے اس قبیلہ کی تاریخ جو ہمیں معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ (۱) اَلَمْ تَرَ کَیْفَ

اس قبیلہ کی تاریخ قرآن کریم کی رو سے

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (فجر) یعنی عاد جن میں سے اس وقت ہم ارم کا ذکر کرتے ہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں بناتے تھے۔ اور ان کو ایسی طاقت حاصل تھی۔ کہ ان کے بعد عرب میں کسی قوم کو اس قدر طاقت حاصل نہیں ہوئی۔ ارم قبیلے کے متعلق تاریخ سے یہ امر یقینی طور پر ثابت ہو چکا ہے۔ کہ ان کی نہایت زبردست حکومت تھی۔ جو کہ پانچویں صدی قبل مسیح تک قائم رہی۔ عبرانی زبان کی بحث کرتے ہوئے محققین السنہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ ارمیک بھی ایک زبان تھی۔ جس کے الفاظ عبرانی کے ساتھ بہت ملتے جلتے تھے۔ اور یہ ارم قوم کی زبان تھی اور اس ارم قوم کی زبردست حکومت تھی۔ جو سامی حکومت کے بعد قائم ہوئی۔ اپنے زمانہ حکومت میں یہ لوگ سارے عراق فلسطین شام اور کالدی علاقے پر حاکم ہو گئے تھے۔ بلکہ بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ ان علاقوں سے باہر بھی نکل گئے تھے (انگریزی میں کالدی کو CHALDIA کہتے ہیں) غرض مذکورہ بالا آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ عاد کی وہ قوم جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ ارم نامی تھی۔ اور ارم کا پتہ آثار قدیمہ سے لگ چکا ہے۔ (۲) وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ (اعراف ۹) اس آیت سے پتہ لگتا ہے۔ کہ یہ قوم حضرت نوح کی قوم کے معاً بعد گزری ہے۔ پس معلوم ہوا کہ تاریخوں میں جو سامی وغیرہ دوسری قوموں کا ذکر ہے۔ جو کہ ارم سے پہلے حاکم تھیں۔ وہ بھی عاد ہی کا حصہ تھیں (۳) سورہ شعراء (۷) میں فرماتا ہے أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ۔ کہ تم ہر اونچی جگہ پر نشان کھڑا کرتے ہو۔ یعنی MONUMENT بناتے ہو۔ اس آیت سے عاد کی ایک اور نشانی کا پتہ لگتا ہے اور وہ یہ کہ عاد قوم اونچے مقامات پر یادگاریں قائم کرنے کی عادی تھی۔ چنانچہ عرب میں بعض نہایت پرانی بڑی بڑی عمارتیں اب بھی ملتی ہیں۔

[۱] عاد عالیشان عمارات بناتے تھے۔

[۲] قوم عاد احقاف میں رہتی تھی۔

[۳] آنے والے عذاب سے آگاہ اور ہوشیار کیا تھا۔

[۴] قوم عاد حضرت نوح کے بعد والی قوم ہے۔

[۵] قوم عاد بلند مقامات پر اپنی یادگاریں بنایا کرتی تھی۔

[۶] قوم عاد آندھی سے ہلاک ہوئی۔

عدن سے چند میل کے فاصلے پر میں نے بھی بعض اونچی اونچی عمارتیں دیکھی ہیں۔ جو اونچے ٹیلے پر بنی ہوئی ہیں۔ ان عمارتوں میں حوض وغیرہ بھی تھے۔ یہ دوران سفر یورپ کا واقعہ ہے۔ اس وقت میرے ہمراہیوں میں سے بھی بعض میرے ساتھ تھے۔

(۴) سورہ احقاف (ع۳) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس قوم کی تاریخ پوشیدہ ہو گئی ہے۔ صرف ان کی بڑی بڑی عمارتوں کے آثار باقی رہ گئے ہیں (۵) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ان کے مقام کا بھی پتہ دیتا ہے چنانچہ فرماتا ہے۔ وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ (احقاف ع۳) اور عاد کے بھائی ہود کو یاد کر جبکہ اس نے اپنی قوم کو احقاف میں ڈرایا تھا۔ احقاف لغت کے لحاظ سے ریت کے ٹیڑھے ترچھے ٹیلوں کو کہتے ہیں۔ اور اصطلاح عرب میں ان علاقوں کو کہتے ہیں۔ جو خود تو شاداب ہیں۔ لیکن صحراء کے پاس ہیں صحراء سے ریت اڑ اڑ کر ان علاقوں میں ٹیلے بنا دیتی ہے۔ ان دو علاقوں میں سے ایک تو عرب کے جنوب کی جانب ہے یہ علاقہ جو جنوبی احقاف کے نام سے موسوم ہے۔ یمن سے شروع ہو کر صنعاء کے نیچے نیچے عدن سے اوپر مشرق کی طرف کو چلا گیا ہے۔ پھر وہاں سے پھیلتا ہوا شمال کی جانب کو نکل گیا ہے۔ دوسرا علاقہ شمالی احقاف ہے۔ جو بصریٰ سے نیچے کی طرف عراق کے بیابان کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے۔ کہ جس وقت عذاب آیا ہو۔ اس وقت اس علاقہ میں ٹیلے نہ ہوں بلکہ بعد میں اسی عذاب کے وقت صحراء کی ریت کے آنے کے سبب سے وہاں ٹیلے بن گئے ہوں۔ اور اس وجہ سے اس قوم کی تاریخ مخفی ہو گئی ہو۔ صحراء کی ریت کے ٹیلوں کو اگر صاف کیا جائے تو بالکل ممکن ہے۔ کہ نیچے سے ایسے آثار نکلیں۔ جن سے قوم کی تاریخ پر مزید روشنی پڑ سکے۔ (۶) عاد کی ہلاکت کی خبر قرآن کریم یوں دیتا ہے۔ أَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ

يٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى

اے میری قوم میں اس (کام) کا تم سے کوئی اجر نہیں مانگوں گا۔ میرا اجر اس (ہستی) کے سوا جس نے مجھے

الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ ۵۲

پیدا کیا ہے (اور) کسی کے ذمہ نہیں ہے۔ (تو) کیا پھر (بھی) تم عقل سے کام نہیں لوگے اور باوجود اس کے ایمان نہیں لاؤ گے؟[۵۵]

صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (الحاقة ع۱) اور عاد کا یہ حال ہوا کہ انہیں ایک تیز حد سے نکل جانے والی ہوا سے جسے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی ہلاکت کے لئے چلایا تھا ہلاک کیا گیا۔ یہ ہوا سات دن تک بلاوقفہ خدا تعالیٰ کے حکم سے چلتی رہی۔ یہاں تک کہ تو اس قوم کو اس ہوا کے اثر کے نیچے اس طرح گرا ہوا دیکھے گا۔ کہ گویا وہ کھجور کے گرے ہوئے درخت ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عاد کے ملک پر ایک تیز آندھی آئی تھی۔ جو سات دن تک متواتر چلتی رہی۔ اور ان کے بڑے بڑے شہر اس آندھی کی زد میں آکر زیر خاک ہوگئے۔ اور اس طرح اس قوم کا زور ٹوٹ گیا۔ اور زوال شروع ہوگیا۔ اس آیت سے خیال پڑتا ہے۔ کہ ابھی زیر خاک ان کے آثار باقی ہیں۔ تبھی تو فرمایا ہے۔ کہ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى۔ اور یہ بھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احقاف اس علاقہ کا نام اس تباہی کے بعد پڑا۔ کیونکہ آندھی کے سبب سے شہر ریت کے تودوں میں دب گئے اور علاقہ میں ٹیلے ہی ٹیلے نظر آنے لگ گئے۔

۵۵ حل لغات۔ فَطَرَ يَفْطُرُ فَطْرًا الشیءَ شَقَّه۔ اس چیز کو پھاڑا۔ العجين اختبزه من ساعته ولم يخمّره۔ جب آٹے کے متعلق یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ گوندھتے ہی روٹی پکا لی۔ خمیر نہ ہونے دیا۔ الامرَ۔ اِخْتَرَعَهٗ وَابْتَدَءَهٗ وَاَنْشَاَهٗ۔ اس کام کو شروع کیا۔ یا بغیر سابقہ مثال کے کیا۔ الصائمُ فَطْرًا وَّ فِطْرًا و فطورًا اکل و شرب وقيل ابتدأ الاكل والشرب۔ روزہ دار نے پیا اور کھایا یا یہ کہ خالی پیٹ کھایا اور پیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ پہلے حصہ آیت میں استغناء ظاہر کیا ہے۔ اور نفس کی خواہش سے اپنے آپ کو پاک قرار دیا ہے لیکن دوسرے حصہ میں اپنے عجز اور محتاجی کو ظاہر کیا ہے۔ اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے فضل کا بھوکا ثابت کیا ہے۔ اور خدا کے بندوں کا یہی مقام ہوتا ہے کہ ایک طرف تو وہ سب دنیا سے مستغنی ہوتے ہیں اور دوسری طرف وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس قدر عجز و انکسار سے گرتے ہیں کہ ان سے زیادہ محتاج بھی کوئی نظر نہیں آتا۔

(انبیاء کا دنیا سے استغناء اور خدا تعالیٰ کے حضور میں نیازمندی)

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ کہکر اس یقین کا بھی پتہ دیا ہے۔ جو انہیں اللہ تعالیٰ پر تھا وہ اپنے اجر کے متعلق شک میں نہ تھے۔ بلکہ انہیں یقین تھا کہ میرا اجر مجھے ضرور ملکر رہیگا۔

نیز اس آیت میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے۔ کہ انسان سے مانگنا تو عزت نفس کے خلاف ہے لیکن خدا تعالیٰ سے مانگنا عزت نفس کے خلاف نہیں۔ کیونکہ جس نے پیدا کیا اس سے مانگنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس سے ایک غلط خیال کا جو انسان کے اندر پیدا ہو سکتا تھا۔ ازالہ کر دیا تاکوئی یہ خیال نہ کرے کہ خدا تعالیٰ سے بھی کچھ نہیں مانگنا چاہئے۔

(خدا تعالیٰ سے مانگنا خودداری کے خلاف نہیں فطر)

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ

اور اے میری قوم تم اپنے رب سے بخشش مانگو۔ پھر اس کی طرف کامل رجوع اختیار کرو۔ (ایسا کروگے تو) وہ تم پر خوب برسنے

السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ

والا بادل بھیجے گا اور تمہاری (موجودہ) قوت کے ساتھ (نئی قوت شامل کرکے) تمہیں قوت میں (اور بھی) بڑھائے گا

٥٣ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ○ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا

اور تم جرم کی راہ اختیار کرتے ہوئے (میری طرف) پیٹھ نہ پھیرو۵۲ انہوں نے کہا اے ہود تو ہمارے پاس (اپنے دعویٰ کا) کوئی

بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا

روشن ثبوت نہیں لایا اور ہم (محض) تیرے کہدینے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دینے والے نہیں ہیں اور

٥٤ نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ○

نہ ہی ہم تیرا کہا ماننے والے ہیں ۵۳

انبیاء کے متبعین کو دنیوی ترقی بھی ملا کرتی ہے

۵۲ حل لغات - مدرار - صیغہ مبالغہ اسم فاعل ہے۔ اس کا فعل درّ یدرّ اور مصدر درًّا اور درورًا ہے۔ درّ الشئ - کثر بہت ہوگیا۔ کثرت سے ہوا۔ العرق - وکذا السماء بالمطر سال۔ بہہ پڑا برسا۔ سماء مدرار - تدرّ بالمطر۔ خوب برسنے والا بادل۔ عین مدرار - تدرّ با لدمع۔ بہت کثرت سے آنسو بہانے والی آنکھ۔ دیمۃ مدرار - غزیرۃ السیلان بکثرت اور مسلسل برسنے والا بادل۔ وفی القرآن یرسل السماء علیکم مدرارًا۔ اور انہی معنوں میں قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ والسماء ھی بمعنی المطر مجازًا اور سماء کے معنی اس جگہ بارش کے مجازًا لے گئے ہیں (اقرب)

مدرارا

عَنْ

معاہدہ کی تابعداری معنی نیز

تفسیر - اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ چاہی یا نہری زمینوں والے نہ تھے۔ بلکہ بارانی زمینوں والے تھے۔ اور کھیتی باڑی کی طرف ان کی توجہ زیادہ تھی۔ اس آیت میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ انبیاء پر ایمان لانے کر قوموں کی ظاہری حالت بھی ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوئی قوم اپنے تنزل کے وقت اس وقت کے رسول پر ایمان لے آئے۔ تو اُسے زندگی کا ایک اور دور عطا ہو جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ ان الفاظ میں کہ تمہاری قوت پر اور قوت کا اضافہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو جائیگا۔

قوم عاد زراعت پیشہ تھی

۵۳ حل لغات - عن حرف جر۔ و لہ تسعۃ معان - عن حرف جر ہے اور اس کے ۹ معنی ہوتے ہیں۔ ۔ الرابع التعلیل۔ چوتھے معنی اس کے اظہار علت و باعث کے ہیں۔ جیسے عن موعدۃ کے معنی وعدہ کی وجہ سے کے ہیں (اقرب)

تفسیر - شریر آدمی اچھی بات کے بھی بُرے ہی معنی لیتا ہے۔ ایسے اخلاص کی نصیحت کا مطلب ان لوگوں نے یہی لیا۔ کہ یہ شخص ہم پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ اور یہی جواب دیا۔ کہ تیرے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو

إِنْ نَّقُوْلُ إِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ

(تیرے متعلق) ہم سوائے اسکے (کچھ) نہیں کہتے۔ کہ ہمارے کسی معبود نے تجھ پر کوئی آفت ڈال دی ہے۔

قَالَ إِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا

اس نے کہا میں اللہ (تعالیٰ) کو (اس بات کا) گواہ ٹھیراتا ہوں۔ اور تم (بھی) گواہ رہو کہ جسکو تم (اسکا) شریک ٹھہراتے ہو اس

تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ۵۵

سے میں بیزار ہوں (جو) اس (خدا) کے سوا (ہیں) اس لئے تم سب (اکٹھے ہوکر) میرا مقابلہ کرو

ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝ ۵۶

اور مجھے مہلت (بھی) نہ دو ۵۴ھ

نہیں چھوڑ سکتے اور تیرے فرمانبردار نہیں ہو سکتے۔
پھر تعجب اس دلیری پر ہے کہ شرک جیسی بے دلیل
بات کے پیچھے پڑتے ہوئے حضرت ہود سے مطالبہ کرتے ہیں
ہیں کہ تو اپنے دعویٰ کی دلیل دے۔ حالانکہ شرک
کے مدعی تو وہ خود تھے۔ دلیل ان کو دینی چاہئے تھی
نہ کہ شرک کے منکر کا فرض تھا۔ کہ وہ دلیل پیش کرتا لیکن
کے اس فقرے سے تعجب ہوتا ہے۔ کہ ایک طرف تو وہ
خدا تعالیٰ کے سوا معبود بنا لیتے ہیں جو کہ بالکل ہی
بے دلیل دعوے ہے۔ اور دوسری طرف جب اس
کے خلاف دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ تو اپنے مخالف کو
کہدیتے ہیں۔ کہ تم تو کوئی دلیل ہی نہیں لاتے۔ گویا وہ
بڑے ہی دلیل کے پابند ہیں۔ کوئی بات انہوں نے کبھی
بغیر دلیل کے مانی ہی نہیں۔

عن قولك میں کس قدر توہین مقصود ہے الفاظ تھوڑے
ہیں۔ مگر تذلیل کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کہ تو بھی
کوئی ہستی رکھتا ہے کہ صرف تیرے کہنے کی وجہ سے ہم اپنے
معبودوں کو چھوڑ دیں۔

۵۴ھ حل لغات۔ اعتراه۔ غشيه طالبا معروفه

اسکے ساتھ چمٹا رہا کہ اسکے احسان کو حاصل کرے۔ اعتری فلانا امرٌ اصابه۔ وہ بات اُسے لگ گئی چمٹ گئی (اقرب)

تفسیر۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ تو ہمارے معبودوں کو نہیں
مانتا تھا۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے تیرا
دماغ خراب کر دیا ہے اور تیری عقل ماری گئی ہے اس
اعتراض کا حضرت ہود نے کیا لطیف جواب دیا ہے۔
کہ اگر تمہارا خیال ہے کہ میری کسی غلطی کی وجہ سے کسی بت نے
میرا دماغ بگاڑ دیا ہے۔ تو اب میں تمکو بتاتا ہوں۔ کہ میں
ان سارے بتوں کے خلاف ہوں۔ اور ان سے کلی طور پر
بیزار ہوں یعنی اگر تمہارے خیال میں تمہارے بعض بتوں نے کسی بات
سے ناراض ہو کر مجھ پر وبال نازل کیا ہے تو اب میں یہ کہتا
ہوں کہ میں ان سب کے خلاف ہوں۔ اور ان کے متعلق جو کچھ
کہا جاتا ہے۔ ان سب باتوں سے بیزار ہوں۔ پس اگر ان میں
کچھ طاقت ہے۔ تو میری ایسی شدید بیزاری کے بعد وہ جو کچھ میرے
خلاف کر سکتے ہیں۔ کر لیں۔

اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ میں یہ فرمایا کہ تم نے عقلی دلائل سے تو فائدہ نہیں اٹھایا
اب میں خدا تعالیٰ کی عملی شہادت کو پیش کرتا ہوں۔ اور اس سے دعا کرتا ہوں کہ وہ
اپنے نشانات سے سچ اور جھوٹ میں فیصلہ کر کے دکھا دے۔

شرک جیسی بے ثبوت بات کے ماننے والے یکطرفہ بات کا ثبوت مانگتے ہیں

حضرت ہود کے منکرین کا اعتراض

حضرت ہود کا جواب

حضرت ہود کی توہین

خدا تعالیٰ کی شہادت سے مراد اسکے نشانات کی شہادت ہے

اعتراه

إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا

میں نے یقیناً اللہ پر جو میرا بھی) رب (ہے) اور تمہارا (بھی) رب ہے بھروسہ کیا ہے (روئے زمین پر) کوئی بھی چلنے والا (جاندار)

۵۷ هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا إِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝

ایسا نہیں کہ وہ اسکی پیشانی کو پکڑے ہوئے نہ ہو میرا رب یقیناً سیدھی راہ پر (کھڑا اور اپنی طرف آنیوالوں کی حفاظت کر رہا) ہے ۵۵

ناصیۃ ۵۵ حل لغات - الناصیۃ - قصاص الشعر ای حیث تنتھی نبتتہ من مقدمہا و مؤخرہ - یعنی سر کی اگلی یا پچھلی طرف جہاں بال ختم ہو جاتے ہوں وہاں کے بالوں کا گچھا - یعنی بالوں کا مجموعہ - وقیل الناصیۃ مقدم الراس - بعض کے نزدیک ناصیہ سر کے اگلے حصہ کو کہتے ہیں وکالوا الطرۃ ھی الناصیۃ - اور بعض نے طرہ ہی کو ناصیۃ قرار دیا ہے - اس کی جمع ناصیات اور نواصی ہے - اذل فلانٌ ناصیۃ فلانٍ ای عزہ وشرفہ فلاں شخص نے فلاں کی عزت اور بزرگی کو خاک میں ملا دیا - نواصی الناس - اشرافھم والمتقدمون منھم - نواصی کے معنی قوم کے بزرگوں اور لیڈروں کے بھی ہوتے ہیں - وھذا کما وصفوا بالذوائب - یقال فلان ذوابۃ قومہ وناصیۃ عشیرتہ - اور یہ استعمال ایسا ہی ہے - جیسے ذوائب (مینڈھیوں) کا لفظ بھی سرداران قوم کے لئے آتا ہے عرب میں کہتے ہیں - کہ فلاں شخص اپنی قوم کی مینڈھی اور اپنے قبیلے کی چوٹی ہے - یعنی اپنی قوم کا سردار ہے - (اقرب)

جب میرا اسا تا میرا اور تمہارا رب ہے تو تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو -

تفسیر - الا ھو اٰخذ بنا صیتھا - عرب کا یہ قاعدہ تھا - کہ جب کسی قوم کو کوئی فتح ہوتی تھی - تو قیدیوں کو بادشاہ کے سامنے لایا جاتا تھا - اور وہ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں فاتح بادشاہ ہوں اور تم مفتوح ہو - ان کے اگلے بالوں کو پکڑ کر جھٹکا دیتا تھا - اور یہ بھی عرب کا رواج تھا کہ جس پر رحم کرنا ہوتا تھا - اس کے اگلے

ان ربی علیٰ صراط مستقیم کے معنی -

اخذ ناصیہ کے متعلق عرب کا دستور -

بال مونڈ کر اسے چھوڑ دیا جاتا تھا - تو اٰخذٌ بناصیتھا کے دونو معنے ہو سکتے ہیں (۱) کہ کوئی دابۃ نہیں جس کی ناصیۃ خدا تعالیٰ نے نہ پکڑی ہوئی ہو یعنی جو خدا تعالیٰ کے ماتحت نہ ہو اور (۲) یہ کہ خدا تعالیٰ نے ہر ایک کے بال مونڈے ہوئے ہیں - یعنی اللہ تعالیٰ نے احسان کر کے تم کو چھوڑا ہوا ہے ورنہ تم تباہ ہو جاتے - غرض انسان کو توجہ دلائی ہے - کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا قبضہ اور تصرف ہے - اور یہ کہ تم صرف اس کے فضل سے زندگی بسر کر رہے ہو - ورنہ تمہارے اعمال تو اس قابل نہیں کہ تم کو زندہ رکھا جاسکے -

ربی و ربکم کہکر یہ بتلایا ہے - کہ جس سے میرا تعلق ہے - وہ تمہارا بھی مالک ہے - اور میرا بھی مالک ہے - پس جب میرا تعلق تمہارے مالک سے ہے - تو پھر تم سے جو اس کے غلام ہو - مجھے کیا ڈر ہو سکتا ہے - کیونکہ جب آقا کسی کا دوست ہو جاتا ہے - تو پھر غلاموں کی طاقت نہیں ہوتی - کہ اپنے آقا کے دوست کو کوئی نقصان پہنچا سکیں -

ان ربی علیٰ صراط مستقیم کہکر فرمایا کہ جو سیدھے رستے پر چلے اسی کو خدا مل سکتا ہے - مشرک تو ادھر ادھر پھرتا رہتا ہے وہ اسے کہاں پا سکتا ہے - دوسری بات یہ بتائی ہے کہ تم تو مجھے مارنا چاہتے ہو جیسا کہ لا تنظرون میں اس کی طرف اشارہ تھا - تو خدا تعالیٰ بھی سیدھے راستے پر میری طرف مدد کیلئے آرہا ہے - یعنی قریب سے قریب راہ سے میری مدد کیلئے آرہا ہے - سیدھے راستے سے مراد قریب کا رستہ ہی ہے کیونکہ سیدھا رستہ ہمیشہ سب سے چھوٹا ہوتا ہے -

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ

پھر اگر تم (میری طرف) پیٹھ پھیر لو تو (اسمیں میرا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) جو بات دیکر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے وہ میں تمہیں پہنچا دی ہے۔

وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ؕ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ

اور (اگر تم ایسا کروگے تو) میرا رب تمہارے سوا کسی اور قوم کو (پہلوں کا) جانشین بنا دیگا۔ اور تم اس کو کچھ بھی نقصان نہیں

شَيْئًا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝ وَلَمَّا جَآءَ ۵۸

پہنچا سکوگے۔ میرا رب یقیناً ہر چیز کا محافظ ہے ۵۶ اور جب ہمارا (عذاب کا)

اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ

حکم آگیا تو (اسوقت) ہم نے ہود کو اور جو (لوگ) اس کے ساتھ (ہو کر) اسپر ایمان لائے تھے۔ ان کو (اس عذاب سے)

مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝ ۵۹

اپنی (خاص) رحمت کے ذریعہ سے نجات دی اور ایک سخت عذاب سے ہم نے انہیں بچا لیا ۵۷

۵۶ **حل لغات** ۔ تولوا! اصل میں تتولوا ہے اس کے شروع میں حرف ت کے مکرر آنے کی وجہ سے عربی کے قاعدہ کے مطابق ایک ت کو حذف کر دیا گیا ہے ۔ تولی کے معنی پیٹھ پھیرنے کے ہوتے ہیں۔

تفسیر۔ نادان لوگ خیال کرتے ہیں کہ اگر وہ نبی کے پیغام کو رد کرتے ہیں۔ تو اس سے اس نبی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ حالانکہ پیغامبر کو پیغام کے رد ہونے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ نقصان ہوگا تو یا پیغام بھیجنے والے کا ہوگا یا اس کا جس کی طرف پیغام بھیجا گیا ہو۔ پس حضرت ہودؑ فرماتے ہیں۔ کہ میں تو پیغامبر ہوں۔ مجھے تو نقصان اسی صورت میں ہو سکتا تھا۔ کہ میں پیغام حق نہ پہنچاتا۔ اور اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا۔ سو اس سے میں محفوظ ہوں۔ میں نے پیغام پوری طرح پہنچا دیا ہے۔ اب اگر نقصان کا احتمال ہو سکتا ہے۔ تو پیغام بھیجنے والے کو۔ یا جس کی طرف پیغام دیا گیا ہے۔ اُسے۔ سو پیغام دینے والے کا یہ حال ہے۔ کہ وہ تمہارا محتاج نہیں۔ کہ اس کی بات رد ہو جانے کی وجہ سے اسے نقصان پہنچے۔ اس کی بات تو خود تمہارے فائدہ کے لئے تھی۔ اگر تم نہ مانوگے۔ تو کوئی اور قوم اس بات کو مان کر ترقی کر جائے گی۔ بہرحال اس کا پیغام ضائع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس بات کو وہ چاہتا ہے اس کی حفاظت بھی کیا کرتا ہے۔ اب جس امر کا اس نے ارادہ کیا ہے۔ اور جو تعلیم میری معرفت اس نے دی ہے اس کی بھی وہ ضرور حفاظت کریگا۔

ان ربی علی کل شیٔ حفیظ میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو بھی یونہی جانے نہیں دیگا۔ وہ اس کے حضور میں محفوظ ہیں اور ضرور ان اعمال کے متعلق تم سے بازپرس ہوگی ✦

۵۷ ۔ اللہ تعالیٰ کی عام سنت تو یہ ہے۔ کہ جب کوئی وبا یا تکلیف ملک میں آتی ہے۔ تو اچھے بُرے سب ہی اس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ لیکن انبیاء کے زمانہ میں چونکہ عذابوں کا نزول اتمام حجت کے طور پر ہوتا ہے۔ اسوقت اللہ تعالیٰ کی رحمت مومنوں کے لئے خاص جوش میں آجاتی ہے۔ اور باوجود ایک

تولّی

پیغام کے رد ہونے کا نقصان پیغامبر کو نہیں پہنچتا۔

اس پیغام کو رد کرنے میں تمہارا ہی نقصان ہے

وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ

اور یہ (مذکور لوگ) عاد (کی قوم کے لوگ) تھے۔ انہوں نے (دیدہ ودانستہ) اپنے رب کے نشانوں کا انکار کر دیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی

۶۰ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ

اور ہر ایک سرکش (اور) حق کے دشمن (شخص) کے حکم کی پیروی کی ۵۵۸ اور اس دنیا میں (بھی) لعنت ان کے پیچھے

الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا

لگا دی گئی ہے اور قیامت کے دن (بھی لگا دی جائیگی)۔ سنو! عاد نے یقیناً اپنے رب (کے احسانوں)

۶۱ رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝ ۱۱/۵ ع ۵

کی ناشکری کی تھی۔ سنو! عاد یعنی قوم ہود کے لئے (قرب الٰہی سے) دوری ہے ۵۵۹

ہی ملک اور ایک ہی جگہ میں رہنے کے وہ اکثر قسم کے عذابوں سے کلی طور پر یا جزوی طور پر محفوظ رہتے ہیں۔ اسی کی طرف (رحمة منا کہکر اشارہ کیا ہے۔ کہ یہ ایک خاص اور اہم فضل تھا۔ اور عام قانون قدرت کے ماتحت نہ تھا۔

تلك کے اشارہ کی وجہ

عذاب غلیظ سے مراد یہ ہے۔ کہ وہ اس عذاب سے باوجود کوشش کے آزاد نہیں ہو سکینگے۔ کیونکہ گاڑھی چیز میں جب کوئی پھنس جائے۔ تو اس سے نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ نہ وہ ٹھوس ہوتی ہے کہ اسپر سہارا دیکر نکل آئے اور نہ پتلی ہوتی ہے کہ اس میں سے چلکر نکل جائے جیس طرح دلدل کہ اس میں پھنسا ہوا باہر نہیں نکل سکتا۔

عذاب غلیظ کے کیا معنے

جَحَدَ

۵۵۸ حل لغات جَحَدَ۔ یَجْحَدُ جحودًا۔ حقّہٗ و بحقّہٖ انکرہ مع علمہ بہٖ۔ اس نے اس کے حق کا باوجود یہ جاننے کے کہ اس کا مجھ پر حق ہے۔ انکار کر دیا۔ کفرٌ و کذّب بہٖ اس کی بات کا انکار کیا۔ اور اسے جھوٹا قرار دیا۔

لعنت کے معنی

جبّار

الجبّار۔ من صفات اللہ تعالیٰ۔ جبار کا لفظ خدا تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ (یعنی اصلاح کرنیوالا) وکل عاتٍ متمرد اور ہر سرکشی کرنیوالے اور بات نہ ماننے والے کو بھی کہتے ہیں (اقرب) العنید۔ المخالف للحق الذی یردّہ

الا ورد تنبیہ کے ورد کی وجہ

وھو یعرفہ۔ جمعہ عُنُدٌ۔ حق کا مخالف جو اُسے جانتے ہوئے رد کرے۔ اسکی جمع عُنُدٌ ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ تلك سے عاد کی بڑائی کی طرف اشارہ ہے۔ کہ عاد ایسی زبردست قوم تھی۔ مگر باوجود اس کے جب انہوں نے شوخی اور شرارت سے کام لیا اور حق کا جان بوجھکر اور ضد سے انکار کر دیا اور جو ان کی بھلائی کا پیغام لائے تھے۔ ان کی بات تو نہ مانی لیکن جو لوگ دنیا میں زور اور جبر کرنے والے تھے اور بلا وجہ لوگوں سے لڑائی جھگڑا مول لیا کرتے تھے۔ ان کی بات مان لی اور باوجود اس کے حریت کا دعویٰ بھی رکھتے تھے۔

۵۵۹ حل لغات۔ بُعْدًا۔ البعد ضد القرب۔ دوری۔ اللعن۔ لعنت۔ خدا کے قرب سے محرومی۔ (اقرب)

تفسیر۔ جب لعنت کا فعل بندوں کی طرف منسوب ہو۔ تو اس کے معنی لعنت کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور جب خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہو۔ تو اس کے معنی دور کر دینے کے ہوتے ہیں۔ پس مراد یہ ہے۔ کہ قیامت کے دن وہ قرب الٰہی سے محروم رہینگے اور خدا تعالیٰ کا قرب نہیں پائینگے۔

اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ۔ یہ جملہ نہایت ہی دلکش ہے

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ (وقف لازم)

اور ثمود کی طرف (بھیجا) ان کے بھائی صالح کو (بھیجا تھا) اس نے انہیں کہا اے میری قوم تم اللہ (تعالیٰ) کی عبادت کرو۔

مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ هُوَ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ

اس کے سوا تمہارا کوئی بھی معبود نہیں ہے۔ اسی نے تمہیں زمین سے اُٹھایا (اور بلندی بخشی)

وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ

اور اس میں تمہیں آباد کیا اس لئے تم اس سے بخشش طلب کرو اور اسکی طرف کامل رجوع اختیار کرو

إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُجِيبٌ ○ ۶۲

میرا رب یقیناً قریب ہے (اور دعائیں) قبول کرنے والا ہے۔ ۵۰

الا تنبیہ کے لئے آتا ہے۔ پس اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ سنو سنو عاد نے اپنے رب کا انکار کر دیا۔ یعنی یہ کس قدر اندھیر کی بات ہے۔ کہ عاد نے اپنے پرورش کرنے والے کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ اپنے محسن کی بات کی شریف لوگ قدر کیا کرتے ہیں۔ رب کے معنی ہیں پیدا کر کے پھر ادنیٰ حالت سے ترقی دیکر کمال تک پہنچانے والا۔ پس اس امر پر اظہار افسوس کیا ہے۔ کہ جس نے ان کو اس اعلیٰ مقام پر پہنچایا تھا۔ شان و شوکت کے حصول کے بعد اسی کی بات ماننے سے انکار کرنا جو ایک طرف تو ناشکری کا فعل ہے اور دوسری طرف بیوقوفی پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ جس نے بڑھایا ہے گرا بھی سکتا ہے۔ چنانچہ کان کھول کر سن لو۔ کہ آخر عاد سے یہی معاملہ ہوا۔ ہودؑ کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے وہ تباہ و برباد کر دیئے گئے۔

۵۰ حل لغات۔ استعمرہ فی المکان — جعلہ یعمرہ۔ اسے مقرر کیا کہ وہ مکان کو آباد کرے (اقرب) اور اقرب میں بحوالہ اساس لکھا ہے۔ استعمر اللہ عبادہ فی الارض طلب منہم العمارۃ فیہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے چاہا۔ کہ وہ زمین کو آباد کریں۔

یہاں صالح کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ ثمود عربی امت تھے۔ کیونکہ صالح عربی زبان کا لفظ ہے۔ اور چونکہ قرآن شریف یہ فرماتا ہے کہ قوم ثمود عاد کی قائم مقام تھی۔ جیسا کہ فرمایا۔ واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد عاد یاد کرو۔ جب اللہ تعالیٰ نے تم کو عاد کے بعد ان کا قائم مقام بنایا۔ پس معلوم ہوا۔ کہ یہ عاد بھی ایک عربی نژاد امت تھی۔ شاید یہ خیال کیا جائے۔ کہ صالح کا لفظ کسی دوسری زبان کے نام سے ترجمہ کر کے اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تمام غیر عربی اسماء بغیر ترجمہ کے ہی قرآن مجید میں مندرج ہیں۔ جیسے موسیٰ۔ ہارون۔ یونس۔ زکریا۔ یس یقیناً یہ نام انہی کی زبان کا ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عاد اور ثمود دونوں عربی قومیں تھیں۔ اور چونکہ عاد کو نوح کی قوم کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ نوح بھی عرب ہی کے کسی علاقہ میں مبعوث ہوئے تھے اور عربی نسل سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ تاریخ سے حضرت نوح کا مقام عراق میں ہی ثابت ہے۔ اور عرب قوم ابتداء میں اس علاقہ میں حکومت کرتی رہی ہے۔

ان باتوں کے بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے۔ کہ ابتدائے عالم کی زبان عربی تھی۔ کیونکہ جب نسل انسانی کا آغاز

ثمود عرب تھے

عاد بھی عرب تھے

صالح کا نام بطور ترجمہ نہیں ہو سکتا۔

قوم نوح بھی عرب تھی

اِسْتَعْمَرَ

عربی زبان ام الالسنہ ہے

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ

انہوں نے کہا اے صالح اس سے پہلے (تو) تو ہمارے درمیان (آئندہ کیلئے) امید کی جگہ (سمجھا جاتا) تھا (اب) کیا تو (با وجود اس

هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا

عقل و دانش کے) ہمیں اس بات سے روکتا ہے کہ ہم ایسی چیز کی عبادت کریں جس کی ہمارے باپ (دادے) کرتے آئے ہیں اور

لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ ۶۳

(سچ تو یہ ہے کہ) جس بات کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے۔ اسکے متعلق ہم ایک بےچین کر دینے والے شک میں (پڑے ہوئے) ہیں ۱۲۶۰

عرب سے مانا جائے۔ تو اس ملک کی زبان کو بھی اُمّ الالسنہ ماننا پڑیگا۔ یورپ کی تحقیقات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے۔ کہ ابتداء میں ایک زبان سامی نام کی تھی۔ اس سے عربی زبان نکلی اور پھر اس کے مختلف تغیرات سے اور زبانیں پیدا ہو گئیں اور یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ کہ سامی زبان عرب کے جنوب میں بولی جاتی تھی۔ مگر حق یہ ہے کہ عراق اور عرب کی مختلف زبانیں درحقیقت عربی زبان کی شاخیں ہیں۔

انسان اپنی ترقی کیلئے ہر آن خدا کے فضل کا محتاج ہے۔

سامی زبان عربی زبان کی ایک شاخ تھی نہ کہ اصل

ھو انشاکم من الارض کا یہ مطلب نہیں۔ کہ ان کو زمین سے پیدا کیا تھا۔ کیونکہ زمین سے پیدائش صرف حضرت آدم ؑ کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ بعد ازاں سلسلہ تناسل جاری کیا گیا۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم ادنیٰ تھے۔ زمینی تھے اور لوگوں کی نظروں میں ذلیل تھے۔ خدا نے تم کو اٹھایا۔ ترقی دی۔ اعلیٰ بنایا حکومت عطا کی۔ پس زمین سے پیدا کرنے کے الفاظ سے مقصود۔ ادنیٰ حالت سے اٹھانے اور ترقی پر زور دینا ہے۔ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ادنیٰ حالت سے ترقی دے کر زمین میں تہذیب و شائستگی کے پھیلانے کا کام سپرد کیا۔ پس چاہیئے کہ اس عظیم الشان ذمہ داری کو دیکھتے ہوئے اپنی خطاؤں پر استغفار کرو تاکہ اگر تم سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی نقص رہ گیا

انشاکم کے معنی

قریب مجیب کے معنی

ہو۔ تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ تم پر اور بھی فضل کریگا۔

اس آیت میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی رہتی ہے۔ پس انسان کو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اسکی پیدائش کی بنیاد کمزوری پر ہے۔ اور اس کی ترقی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوتی ہے۔ پس چاہیئے کہ اس کی طرف رجوع کرتا رہے۔ تاکہ اس سے تازہ بتازہ فیضان حاصل کر کے اپنی ترقی کو قائم رکھ سکے۔ ورنہ قطع تعلق کی صورت میں وہ آپ ہی آپ گھِس کر پھر اپنی ابتدائی حالت کیطرف لوٹ جائے گا۔

قریب کہکر بتایا ہے کہ اگر اس کے پیغام کا انکار کروگے تو وہ بہت جلد سزا بھی دے سکتا ہے۔ کیونکہ اسکی افواج کے آنے میں دیر نہیں لگتی۔ اور مجیب کے لفظ سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ شائد کسی کو خیال ہو کہ گو وہ قریب ہے لیکن وہ بندوں کے کاموں میں دخل نہیں دیتا۔ مگر یہ خیال غلط ہوگا۔ وہ بندوں کے کاموں میں دخل دیتا ہے اور جو لوگ اُسے پکارتے ہیں ان کی دعاؤں کو سنتا ہے اور ان کی پکار پر ان کی امداد کے لئے فوراً آتا ہے۔

۱۲۶۱ حل لغات۔ اَرَابَہٗ یُرِیْبُہٗ اِرَابَۃً شَکَّکَہٗ وجعل فیہ ریبۃ۔ اس کے دل میں شک ڈالدیا۔ اوارابہ منہ امرا ساء بہ الظن ولم یستیقن منہ الریبۃ

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ

اس نے کہا اے میری قوم بتاؤ اگر میں (فی الواقع اپنے دعویٰ کی بنا) اپنے رب کی طرف سے (عطا شدہ) کسی روشن ثبوت پر رکھتا ہوں

اس کی نسبت بدگمانی کی۔ ارابلف فلان۔ بلغك عنه الشئ اوتوهمته۔ تجھے اس سے کوئی شکایت پہنچی۔ یا تونے اسکے متعلق کسی شکایت کا خیال کیا۔ زیدا اقلقه وازعجه۔ قال المتنبي مااربك عن مريب اسے گھبرادیا اور فکر میں ڈالدیا۔ چنانچہ متنبی نے اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اور لکھا ہے۔ کہ جس بات نے تجھے بےچین کردیا ہے۔ اس نے کس شان کے انسان کو بےچین اور بیقرار کیا ہے (اقرب)

تفسیر۔ صالح علیہ السلام کی قوم شاکی ہے کہ ہم تو تیرے ذہن رسا اور خداداد طاقتوں کو دیکھکر امید لگائے بیٹھے تھے۔ کہ تو قوم کے لئے طاقت اور قوت کا موجب ہوگا۔ لیکن تو تو اُلٹا قوم کو تباہ کرنے لگا ہے۔ مگر قوم نے یہ نہ خیال کیا کہ ان کی امیدیں جو صالح کے متعلق تھیں۔ وہ تو پوری ہوگئیں۔ اور فی الواقع وہ قوم کے لئے مفید وجود بن گئے۔ لیکن ان کی امیدیں اپنی ذاتوں کے متعلق پوری نہ ہوئیں اور اس مفید تحریک سے جو صالح کے ذریعہ سے قائم ہوئی تھی۔ وہ محروم رہ گئے۔ انسان بھی کس قدر کمزور ہے۔ وہ کبھی امید لگاتا ہے۔ اور وہ امید پوری ہو جاتی ہے۔ مگر عین اس وقت جب اس کی برسوں کی بلکہ اس کی قوم کی صدیوں کی امیدیں پوری ہونے لگتی ہیں۔ وہ مُنہ موڑ کر چلا جاتا ہے۔ اور جو چشمہ اس کے گھر سے پھوٹا تھا۔ دوسرے اس سے سیراب ہوتے ہیں۔ یہی نظارہ پھر اس وقت ظاہر ہو رہا ہے۔ مسلمان ایک آنیوالے کے منتظر تھے۔ وہ آگیا۔ اور دوسری قومیں

اس سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ ابھی اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں۔

شکوک دور کرنیوالی تعلیم شکوک کے بڑھنے کا موجب کیوں بنی؟

اَتَنْهٰىنَآ۔ کیا تو ہمیں باپ دادوں کے طریق عبادت سے روکتا ہے۔ یعنی ہم تو سمجھتے تھے۔ کہ تو باپ دادا کی عزت کو بلند کرے گا۔ مگر تو تو الٹا ان کی جڑیں کاٹنے لگ گیا ہے۔ جب انسان کے اندر بیماری ہو۔ تو اس کے منہ کا مزہ بگڑ جاتا ہے۔ چونکہ ان لوگوں کے دل خراب ہوگئے تھے۔ وہی تعلیم جو شکوک کو دور کرنے کے لئے آئی تھی۔ اسکی نسبت کہتے ہیں کہ ہمارے دل اس کی وجہ سے شکوک سے بھر گئے ہیں۔

حضرت صالحؑ کے متعلق ان کی قوم کی پہلے سے امیدیں اور حقیقۃً ان کا پورا ہونا

حضرت صالح کی قوم کا یہ کہنا۔ کہ ہمیں تو تجھپر بہت سی امیدیں تھیں۔ صرف لالچ دلانے کے لئے نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہی کہ اس کی طرف سے جسقدر مامور آتے ہیں وہ سب ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ جو بچپن سے لوگوں کے دلوں پر اپنی قابلیت اور نیکی سے گہرا اثر پیدا کر لیتے ہیں اور یہ امر ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ شروع دعویٰ میں نہ ابھی پیشگوئیاں پوری ہوئی ہوتی ہیں۔ اور نہ تعلیم مکمل ہوئی ہوتی ہے۔ اس وقت ان کی گذشتہ زندگی ہی ان کی صداقت کی دلیل ہوتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ اور حضرت خدیجہ اور حضرت ابوبکر اور حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ اس دلیل کی بنا پر بغیر کسی نشان (معجزہ) اور تفصیلی تعلیم کے سننے کے آپ پر ایمان لے آئے۔

تعلیم کی حقیقت

وَاٰتٰنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ

اور اس نے مجھے اپنی جناب سے ایک (خاص) رحمت عطا کی ہو۔ تو (باوجود اس کے) اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اسد (تعالی)

عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ○ وَيٰقَوْمِ ۶۴

کے مقابل پر کون میری مدد کریگا۔ پھر (اسوقت تو) تم مجھے سوائے تباہی میں ڈالنے کے (اور) کسی بات میں نہیں بڑھاؤگے ۶۲ اور اے میری قوم

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ

یہ (اونٹنی) درانحالیکہ تمہارے لئے (میری سچائی کا) ایک نشان ہو اسد تعالی ہی کی طرف منسوب ہوسکنے والی اونٹنی ہو۔ اسلئے تم اسے (آزاد پھرتی)

اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ○ ۶۵

ہوئے خدا کی زمین میں (چل پھر کر) کھانے (پینے) دو اور اسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔ ورنہ تمہیں ایک جلد آنیوالا عذاب پکڑ لیگا ۶۳

نَصَرَ

۶۲ حل لغات۔ نصر فلانا من عدوہ نجاہ منہ وخلصہ واعانہ وقوّاہ علیہ (اقرب) یعنی جب نَصَرَ کا صلہ مِنْ ہو تو اس کے معنی مدخول مِن کے خلاف کسی کو مدد دینے کے ہوتے ہیں۔ پس اس کے معنی ہوئے اسے اس کے دشمن کے مقابل پر مدد دی۔ اور اس سے بچایا۔ خسّرہ جعلہ یخسر۔ اسے گھاٹے میں ڈالا نسبہ الی الخسران۔ اسے گھاٹا پانے والا قرار دیا۔ اضلہ اسے گمراہ کیا۔ اَھلکہٗ اسے ہلاک کیا (اقرب)

اس اونٹنی کی پیدائش کا معجزانہ ہونا ثابت نہیں۔

تفسیر۔ حضرت صالح کہتے ہیں کہ تم کہتے ہو۔ اس تعلیم کی وجہ سے ہمیں شبہات پیدا ہو رہے ہیں اور اگر تو اسے پیش نہ کرتا۔ تو ہم تجھے اپنا لیڈر بنانے کے لئے تیار رہتے۔ سوچو تو سہی۔ کہ اگر میں فی الواقع خدا تعالے کی طرف سے ہوں تو اس کی تعلیم کو چھوڑ کر تمہاری لیڈری مجھے کیا نفع پہنچا سکتی ہے۔ اس صورت میں تمہاری امداد تو میرے لئے نقصان ہی نقصان کے سامان پیدا کریگی۔

ذَرْ

۶۳ حل لغات۔ ذَرْ ذَرْہُ۔ اَی دَعْہُ۔ چھوڑ دے کہتے ہیں ذَرْہُ و اھملہ۔ اسے چھوڑ دے اور اس سے غافل ہو جا (اقرب)

صالح کی اونٹنی کے متعلق مفسرین بے سروپا روایات

تفسیر۔ صالح کی اونٹنی سے کہ انسانی قوت تخیلہ کیسے ایک کھیل بن رہی ہے مفسرین نے ہر قسم کی روایات اس کے متعلق جمع کر دی ہیں۔ جن میں یہاں تک بیان ہوا ہے۔ کہ حضرت صالح ؑ نے کفار کے مطالبہ پر دعا کر کے پہاڑ کے پیٹ سے ایک اونٹنی پیدا کی تھی۔ اور جب وہ پیدا ہوئی۔ اسوقت وہ حاملہ بھی تھی۔ اور پھر فوراً اس کے بچہ بھی پیدا ہو گیا۔ اور اسی قسم کی بے سروپا روایات جو یہودیوں میں مشہور تھیں۔ انہوں نے تفسیروں میں نقل کر دی ہیں اور یہ نہیں خیال کیا کہ ناواقف لوگوں پر ان روایات کا کیا اثر پڑے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اونٹنی کی پیدائش کے معجزانہ ہونے کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے۔ بلکہ سورۂ شعراء میں فرماتا ہے۔ قالوا انما انت من المسحرین ما انت الا بشر مثلنا فات باٰیۃ ان کنت من الصّٰدقین۔ قال ھٰذہ ناقۃ لھا شرب ولکم شرب یوم معلوم ولا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب یوم عظیم۔ (شعراء ع ۸)

منکرین صالح نے کہا۔ کہ تو صرف دھوکہ خوردہ ہے تو فقط ہمارے جیسا ایک آدمی ہے۔ پس اگر تو سچا ہے تو کوئی نشان لے آ۔ اسپر صالح نے کہا۔ کہ یہ میری اونٹنی

ہے اسے بھی اپنی باری پر پینے کا حق ہے۔ اور تم کو بھی ایک مقررہ دن پر اپنی باری کا پانی پینا ہوگا۔ اور تم اسے کوئی تکلیف نہ دینا۔ نہیں تو تم کو ایک بڑے دن کا عذاب پہنچیگا۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹنی کی پیدائش نشان کے طور پر نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس کی آزادی کو ایک نشان قرار دیا گیا تھا۔ اور اسے مارنے والے کے لئے عذاب مقرر تھا۔ اگر اس کی پیدائش ایک نشان ہوتی تو صالح ؑ کفار کے مطالبہ پر کہتے کہ پہلے تمہارے مطالبہ پر یہ اونٹنی پہاڑ سے پیدا ہو چکی ہے۔ لیکن بجائے اس کے وہ ان کے مطالبہ کے جواب میں اونٹنی کی آزادی کو آئندہ آنے والے نشان کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اونٹنی نشان کس طرح تھی۔ اس کا ایک جواب تو وہ ہے۔ جو استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحب رضی اللہ عنہ دیا کرتے تھے کہ عرب اور دوسرے ممالک میں دستور تھا۔ کہ بادشاہ اپنی طاقت کے اظہار کے لئے کوئی جانور چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اور اعلان کر دیا کرتے تھے۔ کہ اسے کوئی کچھ نہ کہے۔ اگر کوئی کچھ کہتا۔ تو وہ اُسے تباہ کر دیتے تھے۔ اس طرح کی نقل میں حضرت صالح ؑ نے اپنی اونٹنی کو اللہ تعالےٰ کے حکم سے نشان مقرر کیا۔ کہ تمہاری دیرینہ رسم کے مطابق اس اونٹنی کو بھی نشان مقرر کیا جاتا ہے۔ اگر تم اسے روکو گے۔ تو وہ الٰہی گورنمنٹ کا مقابلہ سمجھا جائیگا اور تم عذاب میں مبتلا کیے جاؤ گے۔

ان معنوں پر اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جو اس قسم کے جانور چھوڑے جاتے تھے وہ بطور سانڈھ کے ہوتے تھے۔ اور ان کو چھیڑنا یا کھیتوں سے روکنا ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ امر ایک نبی کی شان کے خلاف ہے۔ کہ ایک جانور کو چھوڑ دے کہ لوگوں کے کھیتوں کو کھاتا پھرے۔ اور روکنے والوں کو عذاب کی دھمکی دے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک ایک نبی کی شان کے یہ خلاف ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر امر میں پرانی رسم کی اتباع کی جائے حضرت صالح ؑ نے یہ شرط نہیں کی تھی۔ کہ جس کی کھیتی میں یہ جانور چاہے گھس جائے۔ بلکہ صرف یہ شرط رکھی تھی کہ علم افتادہ زمینوں میں یہ چرے گی۔ وہاں اسے نہ چھیڑا جائے۔ چنانچہ اس آیت میں صاف الفاظ میں فرمایا ہے۔ کہ ذرو ھا تأکل فی ارض اللہ اس اونٹنی کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرے۔ پس لوگوں کے کھیتوں میں اونٹ چرانے کا اعلان حضرت صالح نے نہیں کیا تھا۔ بلکہ صرف افتادہ زمینوں میں جن کا کوئی مالک نہ تھا۔ اور جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے تصرف میں تھیں کہ اس کے اوپر بادل برس کر وہاں گھاس اگا دیتے تھے۔ کسی کو ان کی سرسبزی کے لیے کچھ نہ کرنا پڑتا تھا۔

افتادہ زمینوں میں آزادانہ چرنے کا حکم تھا نہ کہ لوگوں کے کھیتوں میں

اونٹنی کس طرح نشان تھی۔

میرے نزدیک اس نشان کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے۔ کہ کسی دیرینہ رسم کی طرف اشارہ نہ ہو۔ بلکہ حضرت صالح کا یہ مطلب ہو۔ کہ تبلیغ کے لئے مجھے ادھر ادھر پھرنے دو۔ اور اس میں روک نہ ڈالو۔ اور یا خدا کی زمین میں چرنے دو کے یہ معنی ہوں۔ کہ فرائض دینی کے پورا کرنے کے لئے جو میں مختلف علاقوں میں پھروں تو اس میں روک نہ ڈالو۔ اور یہ مجاز مختلف زبانوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور مراد سوار کا روکنا ہوتا ہے حالانکہ روکا سواری کو جاتا ہے۔ بسا اوقات جب ایک مسافر کو لوگوں نے کھڑا کرنا ہوتا ہے۔ تو اس کی سواری کو پکڑ لیتے ہیں۔ اور اس سے ان کی مراد سواری کو نہیں بلکہ سوار کو روکنا ہوتی ہے۔ اسی طرح معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ لوگ حضرت صالح کے تبلیغی سفروں میں روک ڈالتے ہونگے اور ادھر اُدھر پھرنے نہیں دیتے ہونگے اسپر خدا تعالیٰ نے ان کو منع کیا۔ اور فرمایا کہ صالح کی اونٹنی کو ادھر اُدھر پھرنے دو۔ مطلب یہ کہ صالح

تبلیغ کے لئے آزادانہ پھرنا بھی مراد ہو سکتا ہے

کیا اونٹنی کو آزاد چھوڑنا نبی کی شان کے خلاف نہیں ہے؟

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ

اس پر انہوں نے (تلوار سے) اس کی ٹانگیں کاٹ دیں جس پر اس نے (ان سے) کہا تم تین روز (کی مہلت میں) اپنے گھروں میں (اپنے حاصل شدہ سامانوں

ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۝ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا ۶۶

سے) فائدہ اٹھالو۔ یہ (وعدہ) ایسا وعدہ ہے جو جھوٹ سے نہیں کیا گیا پھر جب ہمارا (عذاب کا) حکم آیا تو ہم نے

کے سفروں میں روک نہ ڈالو۔ جہاں چاہے وہ اپنی اونٹنی پر بیٹھ کر چلا جائے۔ اور خدا کا کلام پہنچائے۔ چونکہ وہ لوگ بھی اس کلام کے مطلب کو سمجھتے تھے۔ انہوں نے حضرت صالح ؑ کی اونٹنی کو مار دیا۔ اور گویا دوسرے الفاظ میں یہ کہا کہ ہم تمکو اپنے ملک میں تبلیغ کرنے کی عام اجازت نہیں دے سکتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عذاب میں گرفتار ہوکر ہلاک ہوگئے۔

وہ دوسرے معنی الناقۃ

ایک تیسرے معنی بھی میرے نزدیک اس آیت کے ہو سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ حضرت صالح نے تجربہ سے جب معلوم کیا۔ کہ ان کا دوسرے لوگوں سے ملنا جلنا فساد کا موجب ہوتا ہے۔ اور عوام الناس سے ملنے کا زیادہ موقع چشموں اور جانور چرانے کی وادیوں میں ہی ہوتا ہے۔ اس لئے انہوں نے خدا تعالیٰ کے حکم سے فساد دور کرنے کے لئے ایسا انتظام کیا کہ جو عام چراگاہ تھی۔ اس سے اپنے جانوروں کو روک دیا۔ اور کوئی دوسری افتادہ زمین جو ان کی قوم کی ملکیت نہ تھی۔ اس امر کے لئے منتخب کرلی اسی طرح اونٹنی کو پانی پلانے کے لئے بھی انہوں نے عام وقت جو پانی پلانے کا تھا۔ اسے چھوڑ دیا۔ اور دوسرا وقت جس وقت لوگ پانی نہیں پلاتے تھے مقرر کرلیا۔ اور پھر اعلان کر دیا کہ فساد سے بچنے کے لئے جتنے ہر ممکن تدبیر اختیار کرلی ہے۔ اور اپنے آپ کو تکلیف میں ڈال کر بھی ایسی جگہوں اور وقتوں کو چھوڑ دیا ہے۔ جن میں تم لوگوں سے ملکر فساد کا اندیشہ ہو سکتا

صرف ایک اونٹنی کا مارنا قوم کی تباہی کا موجب کیونکر ہوا؟

ہے۔ لیکن اگر اب بھی آپ لوگوں نے فساد کیا۔ تو اس کے یہ معنی ہونگے۔ کہ آپ لوگ ہماری زندگی کو ہی پسند نہیں کرتے اور اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا عذاب آپ پر نازل ہوگا۔ ان معنوں کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے۔ کہ پرانی تاریخوں سے ایک وادی کا پتہ لگتا ہے۔ جس کا نام فج الناقہ تھا۔ اور حضرت مسیح سے ڈیڑھ سو سال قبل کے ایک جغرافیہ میں بھی اس کا ذکر ہے۔ پرانے یونانی مورخ اسے بیڈاناٹا لکھتے تھے۔ جو فج الناقہ کا ہی بگڑا ہوا ہے اس قدیم وادی سے پتہ لگتا ہے۔ کہ حضرت صالح ؑ نے اپنی قوم سے الگ ایک وادی اپنی اونٹنی کے چرانے کے لئے مقرر کرلی تھی۔ تا کہ ان کا جانور دوسرے جانوروں سے اور چرواہا دوسرے چرواہوں سے نہ ملیں اور آپس میں فساد کی صورت پیدا نہ ہو۔ لیکن آپ کے مخالفوں کو اس پر بھی صبر نہ آیا اور انہوں نے وہاں جاکر بھی آپ کی اونٹنی کو مار ڈالا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اعلان کی بے حرمتی کرکے عذاب میں گرفتار ہوئے۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ ایک اونٹنی کے مارنے پر قوم کو کیوں تباہ کر دیا۔ کیونکہ اونٹنی کے مارنے کے معنے یہ تھے کہ ہم صالح کو کسی جگہ بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دینگے۔ اور اس کے سفر کے ذریعوں کو مسدود کر دینگے اور یہ امر شدید ترین دشمنی پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی سزا سے ایسی قوم جو پہلے نعیم الٰہی کا انکار کرکے مجرم ہو چکی ہو۔ نہیں بچ سکتی۔

نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ

صالح کو اور اس کے ساتھ جو لوگ اس پر ایمان لائے تھے انہیں بھی (اپنی خاص) رحمت کے ذریعہ سے (اپنے حکم کے نتیجہ سے)

مِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ ٦٧

اور اس دن کی رسوائی سے بچا لیا۔ یقیناً تیرا رب ہی (تمام تر) قوت والا (اور) غلبہ والا ہے ۵۶۳

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ

اور جنہوں نے ظلم (کا ارتکاب) کیا تھا انہیں اس عذاب نے پکڑ لیا۔ اور وہ اپنے (اپنے) گھروں میں زمین سے

دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ ٦٨

لگے ہوئے ہو گئے ۵۶۴ گویا انہوں نے ان میں زندگی نہیں گزاری تھی

اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ۝ ٦٩ ع ٨ / ٦

سنو ثمود نے اپنے رب (کے احسانوں) کی ناشکری کی تھی سنو ثمود کے لئے (قرب الٰہی سے) دوری ہو ۵۶۵

۵۶۳ ومن خزي يومئذ۔ گو عذاب اپنی ذات میں بھی ذلت ہوتا ہے۔ لیکن یہاں عطف کرکے بتلایا ہے۔ کہ اس عذاب میں کچھ خاص پہلو بھی رسوائی کے تھے۔

۵۶۴ حل لغات۔ الصيحة۔ الصوت الشديد سخت آواز۔ الزجر ڈانٹ۔ العذاب۔ عذاب۔ الإغارة اذا فوجي الحي به اچانک حملہ (اقرب)

جاثمين۔ جثم يجثم ويجثِم جثوما۔ تلبّد زمین سے چمٹ گیا۔ یعنی وہ زمین پر گرے ہوئے تھے۔

تفسیر۔ اس آیت میں عذاب کے لئے صیحة کا لفظ آیا ہے۔ لیکن سورۂ اعراف میں رجفة کا لفظ آیا ہے۔ جس کے معنی زلزلہ کے ہیں۔ سورۂ شعراء میں خالی عذاب کا لفظ ہے۔ سورۂ نمل میں ہے کہ ہم نے انہیں بالکل ہلاک کر دیا۔ اور ذاریات میں صاعقہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے معنی بجلی اور عذاب کے ہیں۔ الحاقہ میں عذاب کا ذریعہ طاغیہ کو قرار دیا گیا ہے۔ جس کے معنی حد سے نکل جانے والے کے ہیں۔ سورۂ قمر میں صیحة کا لفظ اور شمس میں دمدم علیہم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر ان سب الفاظ میں کوئی اختلاف نہیں جن الفاظ میں بظاہر اختلاف ہے وہ رجفة۔ صیحة۔ صاعقة اور طاغیہ ہیں۔ لیکن صیحہ صاعقہ اور طاغیہ تینوں کے معنی عذاب کے بھی ہیں۔ پس اگر زلزلہ سے وہ قوم ہلاک ہوئی ہو۔ تو سب الفاظ بغیر اختلاف کے چسپاں ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ زلزلہ بھی عذاب اور ہلاکت کا ذریعہ ہے۔

عذاب کے مختلف ناموں میں تطبیق

۵۶۵ حل لغات۔ غني يغنى غنىً فلان عاش۔ زندہ رہا۔ زندگی گزاری۔ (اقرب الموارد)

تفسیر۔ اس جگہ پر بُعْدًا لِّثمود قوم صالح نہیں کہا گیا۔ جیسا کہ اس سے پہلے رکوع کے آخر میں لعادٍ قوم هود کہا گیا تھا۔ اس سے یہ دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔ کہ پہلی آیت میں ہود کی زیادتی قافیہ کے

کی گئی تھی۔ مگر اسجگہ چونکہ قافیہ نہیں بنتا تھا۔ اسلئے صالح کا نام ساتھ نہیں لیا گیا۔ ایسا نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم ہرگز قافیوں کی وجہ سے الفاظ نہیں بڑھایا کرتا۔ اس فرق کی ایک تاریخی وجہ ہے۔ اور وہ یہ کہ عاد دو قوموں کا نام ہے۔ ایک عادِ اولیٰ اور دوسری عادِ ثانیہ کہلاتی ہے۔ پس اگر خالی بُعدًا لِعادٍ کہدیا جاتا۔ تو یہ اشتباہ پڑتا کہ کیا عاد سے مراد پہلی قوم عاد ہے یا دوسری۔ یا دونوں۔ اس لئے وہاں قوم ہود کہکر بتا دیا۔ کہ اس آیت میں عاد سے عاد اولیٰ مراد ہے۔ نہ کہ عاد ثانیہ۔ اس کے برخلاف ثمود صرف ایک قوم کا نام ہے۔ اور اس کے متعلق دھوکے کا احتمال نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وجہ سے ثمود کے ساتھ قوم صالح کے الفاظ نہیں بڑھائے کیونکہ ان الفاظ کے بڑھانے سے کوئی خاص غرض پوری نہیں ہوتی تھی۔

قوم ثمود جنوب سے ہجرت کر کے شمال کی طرف آئی تھی۔

ثمود اور صالح کے حالات پر تاریخی روشنی۔

ثمود کا ذکر یونانی تاریخوں میں بھی آتا ہے اور ان میں مسیح ؑ کے زمانہ کے قریب ان کا ذکر ہے۔ اور انہوں نے ثمود کا مقام حجر بتایا ہے جسے وہ اپنے رسم الخط میں اگرا کر کے لکھتے ہیں۔ اور ثمود کا نام انکے جغرافیوں میں تمودینی (THAMUDENI) آتا ہے اور حجر کے پاس وہ ایک جگہ کا ذکر کرتے ہیں جسے عرب ان کے بیان کے مطابق فج الناقہ کہتے تھے بطلیموس جو ۱۴۰ سال قبل مسیح ہوا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حجر کے پاس ایک جگہ ہے جس کا نام (BADANATA) ہے۔ فتوح الشام کا مصنف ابو اسمٰعیل لکھتا ہے ان ثمود املاؤا الارض بین بصرٰی و عدن فلعلها کانت فی طریق هجرتها نحو الشمال کہ ثمود قوم بصریٰ (جو شام کا ایک شہر ہے) سے لیکر عدن تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہیں ان کی حکومت تھی۔ شاید کہ وہ اس وقت جنوب سے شمال کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ یعنی حمیر اور سبا کی طاقت

قوم ثمود قوم عاد کے مشابہ ہوئی۔

کے زمانہ میں جب ان کو ہجرت کرنی پڑی تو اس وقت ایسا ہوا۔ ان دونوں قبیلوں کی حکومت سرزمین میں طاقت پکڑی تھی۔ اور ثمود کی حکومت احقاف کے جنوب میں تھی انہوں نے جب ان کو نکالا تو یہ اوپر کی طرف نکلنے شروع ہوئے۔ پہلے حجاز پھر تہامہ اور پھر حجر میں چلے گئے۔ تمدنِ عرب والا کہتا ہے۔ کہ ولا یخرج الحکم فی ذٰلک من الظنون یعنی یہ قیاسی بات ہے۔

درحقیقت عربوں کا خیال ہے کہ ثمود بھی عاد کی ایک شاخ ہے۔ اور انہی کی طرح یہ یمن میں رہتی تھی۔ جب حِمیر کی حکومت ہوئی۔ تو انہوں نے ان کو حجاز کی طرف نکال دیا۔ لیکن اس کی تصدیق اب تک کسی دلیل سے نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس قوم کے آثار اب تک جنوب میں نہیں ملے۔ حجر کو پرانے زمانہ سے مدائن صالح بھی کہتے ہیں۔ اور اس کے آثار سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسیح کے زمانہ سے پہلے یہ نبطیوں کے ماتحت آچکا تھا۔ جنہیں انباط بھی کہتے ہیں۔ یہ لوگ بطرا کے رہنے والے تھے۔ جسے یونانی لوگ پیٹرا کہتے ہیں۔ چنانچہ اس جگہ کئی کتبے نبطی زبان کے ملے ہیں۔ لیکن ان نبطی کتبوں کے ساتھ ساتھ بعض کتبے یمنی زبان میں بھی ملے ہیں۔ ان کتبوں کو مستشرقین کا گروہ ثمودیہ کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ یعنی ثمود قوم کے کتبے۔ اس تحقیق سے عرب جغرافیہ نویسوں کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ کہ ثمود قوم جنوب سے ہجرت کرکے شمال کی طرف آئی تھی۔ کیونکہ اگر وہ جنوب سے نہ آتی۔ تو ان کی زبان یمنی زبان سے ملتی جلتی نہ ہوتی۔

حجر جو اس قوم کا دارالحکومت معلوم ہوتا ہے مدینہ منورہ اور تبوک کے درمیان جا ہے اور اس وادی کو جس میں حجر واقع ہے۔ وادی قرٰی کہتے ہیں۔ اس علاقہ میں اس قوم کا زور تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ الذین جابوا الصخر بالواد کہ ثمود نے وادی قرٰی میں پہاڑ کاٹ کاٹ کر مکان بنائے تھے۔ (الفجر) قرآن کریم میں اس قوم

کا زمانہ عاد کے معاً بعد بتایا ہے ۔ کیونکہ فرماتا ہے ۔ و اذکروا اذ جعلکم خلفآء من بعد عاد (اعراف) یاد کرو جب خدا نے تم کو عاد کا جانشین بنایا ۔ اسی طرح حضرت موسیٰ کی تائید میں جو ایک مومن آدمی ۔ فرعون کی مجلس میں بولا تھا ۔ اس کی زبان سے قول نقل کیا ہے ۔ یاقوم اِنّی اخاف علیکم مثل یوم الاحزاب مثل دأب قوم نوح وعاد وثمود (مومن ۳۱) اے قوم میں تمہارے متعلق اس گھڑی سے ڈرتا ہوں ۔ جو پہلے انبیاء کے دشمنوں کو پیش آئی ۔ یعنی اس حالت سے جو نوح کی قوم اور عاد اور ثمود کو پیش آئی ۔ اس سے پتہ لگا کہ یہ قوم موسیٰ ع سے پہلے تھی ۔ کیونکہ موسےٰ کے زمانہ میں ان کی تباہی کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے ۔

ایک اور استدلال سے اس قوم کی تباہی کا زمانہ اور بھی پیچھے چلا جاتا ہے ۔ اس قوم کے آخری دور میں اس کی حکومت شمالی عرب اور جنوبی فلسطین میں تھی ۔ اور قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان علاقوں میں جو اس قوم کی حکومت کا علاقہ تھا ۔ مدین قوم کے لوگوں کا غلبہ تھا ۔ اور مدین لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے ۔ کیونکہ مدین قیتورا (حضرت ابراہیم ع کی تیسری بیوی کے پیٹ سے تھا ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب کوئیں سے نکال کر مصر کی طرف لے جایا گیا ۔ تو قتورہ کی نسل اس علاقہ میں بس رہی تھی ۔ اس سے معلوم ہوا کہ ثمود حضرت ابراہیم کے زمانہ سے بھی پہلے تباہ ہو چکے تھے ۔ یا ان کی طاقت ٹوٹ چکی تھی ۔ ورنہ مدین ان کے علاقہ پر قابض نہ ہو سکتے ۔

اس آخری استدلال سے میری غرض نہ صرف ایک تاریخی حقیقت کا ثابت کرنا ہے ۔ بلکہ میں اس اعتراض کا بھی جواب دینا چاہتا ہوں جو بعض مسیحی مورخ قرآن کریم پر کرتے ہیں ۔ کہ اس میں تاریخی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ۔ قرآن کریم ہر جگہ ہود کا پہلے اور صالح کا اس کے بعد اور ابراہیم اور موسیٰ (علیہم السلام) کا ان کے بعد ذکر کرتا ہے ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ اس میں ملے ہوئے تاریخی واقعات بھی نہایت صحت کے ساتھ بیان ہوتے ہیں اور یہ کہ وہ تاریخ کو اس کی صحیح ترتیب سے بیان کرتا ہے ۔ مذکورہ بالا امور کو مد نظر رکھکر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ثمود کا حقیقی زور آج سے قریباً تین ہزار چھ سو سال پہلے ٹوٹ چکا تھا ۔

کیا ثمود عاد ثانیہ کا ہی دوسرا نام ہے

ثمود کو بعض لوگ عاد ثانیہ بھی کہتے ہیں ۔ اور بعض کہتے ہیں کہ عاد ثانیہ پہلے تباہ ہو گئے تھے ۔ بعد میں ثمود آئے ۔ گویا عادِ اُولیٰ حضرت ہود ع کے زمانہ میں ہلاک ہوئے ۔ اور ان کے بعد عادِ ثانیہ ہوئے اور ثمود یا تو انہی کا نام تھا ۔ یا ان کی تباہی کے بعد انہی میں سے نکلی ہوئی ایک قوم کا نام تھا جس نے ان کے بعد ترقی کی ۔

ثمود کے پرانی قوم ہونے کی ایک اور دلیل ۔

مولوی سید محمد سلیمان صاحب ندوی اپنی کتاب ارض القرآن میں تحریر فرماتے ہیں کہ ایک کتبہ ثمود کے متعلق حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں بعض مسلمانوں نے پڑھا تھا (یورپین محققین اس روایت کو بناوٹی قرار دیتے ہیں) اس کے بعد اس کا کوئی نشان نہیں ملا ۔ اب اس زمانے (۱۸۳۴ء) میں ایک انگریز مستشرق (WELLESTED) نے پھر اس کا پتہ لگایا ہے ۔ اور وہ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل میں چھپ چکا ہے ۔ اور فارسٹر نے (جو ایک انگریز مستشرق ہے ۔) اپنی کتاب میں اُسے نقل کیا ہے یہ کتبہ حمیری زبان میں ہے ۔ جو اصل میں جنوبی عربی زبان ہے ۔ موجودہ مستشرقین نے اس کا نام حمیری رکھ لیا ہے ۔ یہ کتبہ حصن غراب میں جو عدن کے قریب ہے ملا ہے ۔ اس کتبہ کی عبارت کا ترجمہ یہ ہے ۔

اس کتبہ کی عبارت کا ترجمہ

(۱) ہم مدت تک اس وسیع قصر میں رہے ۔ ہماری حالت بد نصیبی اور ادبار سے دور تھی ۔ ہماری نہروں میں (۲) دریا کا پانی امڈا آتا تھا ۔ سمندر موجیں مارتا ہوا

ہمارے قلعہ کی دیواروں سے غضبناک ہوکر ٹکراتا تھا۔ ہمارے چشمے خوش آیند آواز سے بہتے تھے۔

(۳) بلند کھجوروں کے اوپر جن کے باغبان خشک چھوہارے ہماری وادیوں کے چھوہاروں کی زمینوں میں لگاتے تھے اور خشک چاول بونے تھے۔

(۴) ہم پہاڑی بکروں کا اور جوان خرگوشوں کا شکار پنجروں اور جالوں سے کرتے تھے اور مچھلیوں کو

(۵) بہلا بہلا کر باہر نکال لیتے تھے۔ اور ہم آہستہ آہستہ خراماں خراماں رنگ برنگ کے ریشم کے کپڑے اور لاہی سبز مختلف الالوان چلے پہنکر چلا کرتے تھے۔ اور ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے تھے جو کینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے۔ ہود کی شریعت کے مطابق۔

یہ قوم میدانوں اور پہاڑوں پر بھی حکومت رکھتی تھی۔

(۶) اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔ اور ہم معجزات کا یقین رکھتے تھے۔ قیامت کے روز اور نتھنوں کے راز پر ایمان تھا۔

(۷) راہزن گھس آئے۔ اور وہ ہمارے ساتھ کچھ جھگڑا کرتے تھے۔ مگر ہم نے اپنے گھوڑوں کو پیچھے ڈال دیا۔ اور ہمارے شریف نوجوان سخت اور نوکدار نیزوں کو لیکر آگے بڑھے۔

یہ قوم اسلام سے پہلے بالکل مٹ چکی تھی۔

(۸) ہمارے خاندان کے مغرور بہادر مرد اور عورتیں گھوڑوں پر لڑ رہی تھیں جن کی گردنیں لمبی تھیں۔ اور جو چک دار کمیت رنگ کے تھے۔

(۹) ہماری تلواریں بدستور دشمنوں کو زخمی کر رہی تھیں۔ اور چھید رہی تھیں۔ یہانتک کہ ان کے قلب پر حملہ کر کے ان کو مغلوب اور بالکل پست کر دیا۔ جو بدترین نوع انسان میں سے تھے۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان لوگوں میں ہر قسم کی تہذیب تھی۔ اور قوانین کے علاوہ فیصلہ جات بھی لکھے جاتے تھے۔ تاکہ آیندہ لوگوں کے لئے سند ہوں۔ جیسا کہ آجکل کی انگریزی عدالتوں کے فیصلوں کی رپورٹیں شائع ہوتی ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قوم جس کا ذکر کتبہ میں ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام سے پہلے ہوئی ہے یا بعد میں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت ہود کی امت میں سے ایک حصہ جنوبی عرب میں بھی رہ گیا ہو۔ بہرحال یہ ثابت ہے کہ یہ قوم ثمود میں سے تھی۔ اور ان کی طرف یا ان کے اُن بھائیوں کی طرف جو ہجرت کر کے شمال کو چلے گئے تھے۔ صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔

اس کتبہ کی عبارت سے ثمود کی عادت ثابت ہوتی ہے۔

قرآن کریم کی عبارت تتخذون من سهولها قصورًا وتنحتون الجبال بيوتًا (سورة اعراف ۱۰۹) سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ میدانوں اور پہاڑوں دونوں پر اس قوم (ثمود) کی حکومت تھی۔ اتتركون فى جنّٰت وعيونٍ وزروعٍ ونخلٍ طلعها هضيم (شعراء ۸۶) سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کا ملک چشموں والا اور باغات والا تھا۔ وہاں کھجوریں بھی اچھی قسم کی ہوتی تھیں۔ اور زراعت بھی ہوتی تھی۔ غرض یہ کتبہ جس کا مضمون بیان ہوا ہے حرف بحرف قرآن کریم کا مصدق ہے۔

حضرت صالح کے بعد جلدی ہی یہ قوم گرنے لگ گئی۔ کیونکہ اس کے زمانہ کے چند صدیوں بعد کے فاتح قوموں میں اس کا ذکر مفقود ہے۔ سرجون یا شرغون نامی اسیریا کے ایک بادشاہ نے جسکا زمانہ حکومت ۷۲۲ قبل مسیح سے ۷۰۵ قبل مسیح تک تھا۔ عرب پر فوج کشی کی تھی۔ اسکی فتوحات میں ثمود کا نام آتا ہے اور اس نے اس کا ذکر ایک کتبہ میں کیا ہے۔ جو اس نے ایک فتح کی یادگار میں کندہ کرایا تھا۔ مؤرخین یونان میں ڈائدورس جو ۸۰ قبل مسیح میں گزرا ہے۔ پلینی جو ۷۹ء قبل مسیح گزرا ہے اور بطلیموس جو ۱۴۰ء قبل مسیح گزرا ہے۔ تینوں نے اس قوم کا ذکر کیا ہے۔ جسٹینین بادشاہ روم نے جب عرب پر حملہ کیا ہے۔ تو اس کی فوج میں تین سو ثمودی سپاہی بھی تھے۔ لیکن اسلام سے پہلے اس قوم کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ

اور ہمارے فرستادے یقیناً یقیناً ابراہیم کے پاس خوشخبری لائے (اور) کہا (ہماری طرف سے آپ کو) سلام ہو۔

قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ ۷۰

اس نے کہا تمہارے لئے ہمیشہ سلامتی ہو۔ پھر (اس نے) ایک بھنے ہوئے بچھڑے کے لانے میں (کچھ بھی) دیر نہ لگائی ؎

حل لغات ۔ لبث ۔ یقال ما لبث اَنْ فَعَلَ کَذَا ۔ یعنی مَا لَبِثَ کے معنی ہوتے ہیں ۔ بغیر دیر کے فوراً وہ کام کر لیا ۔ ما ابطأ فی فعله ۔ اَوْ ما تأخّر من فعله ۔ اپنے کام میں دیر نہ لگائی (اقرب) العِجْل ۔ وَلَدُ البقرۃ ۔ گائے کا بچہ ۔ وقیل اول سنتہ اور بعض نے اُسے ایک سال کی عمر تک کے لئے مخصوص قرار دیا ہے ۔ (اقرب) الحنیذ ۔ المشوی ۔ بھنا ہوا ۔ وفسّرہ ابو زید بالنضیج ۔ ابوزید نے اس کے معنی پکے ہوئے کے کئے ہیں ۔ والآخر بالذی یقطر ماؤہ بعد الشیء اور بعض نے اس گوشت کے معنی کئے ہیں ۔ جس میں سے بھوننے پر پانی ٹپک رہا ہو ۔ ونقل الازھری عن الفرّاء الحنیذ ۔ ما حفرت له فی الارض ثم غممته ۔ وھو من فعل اھل البادیۃ الیٰ ان قال والشواء المحنوذ الذی قد القیت فوقه الحجارۃ المرضوفۃ بالنار حتّٰی ینشوی الشواء شدیدًا فیتھرّٰی تحتھا ۔ یعنی ازھری نے فرّاء سے نقل کیا ہے ۔ کہ حنیذ اس گوشت کو کہتے ہیں ۔ جسے گڑھا کھود کر اس میں رکھ دیا جائے ۔ اور اس پر تیز گرم کرکے پتھر رکھ دیئے جائیں ۔ یہاں تک کہ ان کی گرمی سے وہ گوشت پوری طرح پک جائے (اقرب)

تفسیر ۔ میں شروع سورۃ میں بتا چکا ہوں ۔ کہ حضرت ابراہیم ؑ کا ذکر اس سورۃ میں ضمناً ہے ۔ اور حضرت لوط ؑ کا ذکر چھیڑنے کے لئے ہے ۔ ورنہ اصل

لبث

مقصود حضرت لوط ؑ کا ہی ذکر ہے ۔ جن کی قوم تباہ کی گئی تھی ۔ کیونکہ اس سورۃ میں انہی اقوام کا ذکر ہو رہا ہے ۔ جو تباہ کر دی گئی تھیں ۔ حضرت ابراہیم ؑ کا ذکر لوط ؑ کے ذکر کے ابتدا میں اس لئے کیا ہے ۔ کہ حضرت لوط ؑ حضرت ابراہیم ؑ پر ایمان لانیوالوں میں سے تھے اور ان کے تابع نبی تھے ۔ جس طرح حضرت اسحاق اور اسماعیل ان کے تابع تھے ۔ یا ہارون حضرت موسےٰ کے تابع تھے ۔ گو امتی نہ تھے ۔ کیونکہ اسوقت نبوت براہ راست ملا کرتی تھی نہ کہ نبی متبوع کے فیض سے ۔ اس قسم کی نبوت صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں جاری ہے ۔ کہ تابع نبی ایک لحاظ سے نبی ہوتا ہے اور دوسرے لحاظ سے امتی ۔

حضرت ابراہیم ؑ کے ذکر کی وجہ

الحنیذ

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ چونکہ متبوع نبی تھے اور حضرت لوط ؑ نبوت سے پہلے ان پر ایمان لائے تھے اور ان کے ساتھ ہجرت کرکے شام کے ملک میں آ گئے تھے اس لئے اُن کی قوم کی تباہی کی خبر اللہ تعالیٰ نے پہلے حضرت ابراہیم کو دینی مناسب سمجھی ۔ اور اسی وجہ سے لوط کا ذکر کرنے سے پہلے اس خبر کا ذکر کر دیا ۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوم لوط کی تباہی کے متعلق دی گئی تھی ۔ مگر اللہ تعالیٰ کا رحم دیکھو ۔ کہ چونکہ یہ خبر حضرت ابراہیم ؑ کو نبی متبوع ہونے کی حیثیت سے دی جا رہی تھی ۔ اور براہ راست اس خبر سے حضرت ابراہیمؑ کا تعلق نہ تھا ۔ اس لئے ان کی تکلیف کو ایک بشارت کے ساتھ ملا دیا ۔ تا کہ ایک بد قوم کی تباہی کی خبر کے ساتھ ایک نیک نسل کی ابتدا کی خبر کو ملا کر

اس انذار کے ساتھ بیٹے کی بشارت کو کیوں ملایا گیا ۔

یہاں حضرت ابراہیم ؑ کا ذکر صرف استطراداً ہے ۔

صدمہ کو کم کر دیا جائے۔

یہ رسل کون تھے؟

یہ رسل کون تھے۔ اس کے متعلق اختلاف ہے بعض لوگ انہیں انسان قرار دیتے ہیں اور بعض ملائکہ قرار دیتے ہیں۔ میرے نزدیک بھی یہ لوگ آدمی ہی تھے۔ گو ان کی نیکی کی وجہ سے بعض نے انہیں ملک کہا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی نسبت آتا ہے۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْم (یوسف ع۴) ان لوگوں کے فرشتہ ہونے کے خلاف یہ آیت ہے۔ قل لو کان فی الارض ملآئکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیھم من السمآء ملکًا رسولًا (بنی اسرائیل ع۱۱) اس آیت سے دو استدلال ہوتے ہیں (۱) فرشتے رسول ہو کر نیک لوگوں کے لئے آتے ہیں۔ نہ کہ بدکاروں کے لئے۔ پس اس طرح انسانی شکل میں ایک بدکار شہر کے سامنے ان کا ظاہر ہونا اس آیت کے خلاف ہے۔ (۲) دوسرے اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نیک انسان کو بھی فرشتہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں بتایا ہے۔ کہ اگر اس دنیا میں ملائکہ بستے لیکن مراد انسانوں سے ہے۔ کیونکہ ملائکہ سے مراد ملائکہ ہوتے تو ان کی طرف رسول بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ ملائکہ تو احکام الٰہی کے تابع ہوتے ہی ہیں۔

یہ انذار پہلی دفعہ کا نہیں تھا۔

یہ بشارت حضرت ابراہیم ؑ کو بلاواسطہ کیوں نہ دی گئی۔

اگر یہ سوال ہو۔ کہ کیوں براہ راست حضرت ابراہیمؑ کو ہی یہ الہام نہ ہوا دوسروں کی معرفت کیوں یہ خبر دی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ کہ المؤمن یَرٰی و یُرٰی لہ۔ کبھی مومن کو براہ راست خبر دی جاتی ہے کبھی دوسرے کی معرفت۔ چونکہ ان لوگوں کو کسی خاص غرض کے ماتحت حضرت لوط کے پاس جانے کا حکم ملا تھا۔ اور یہ خبر انہوں نے حضرت ابراہیم ؑ کو بھی پہنچائی تھی۔ اس لئے حضرت ابراہیم ؑ کے رنج کو دور کرنے کے لئے یہ بشارت بھی انہی کی معرفت بھیجی گئی۔

کیوں دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے حضرت لوط کو یہ خبر دی گئی

وہ خاص غرض کیا تھی جس کے سبب سے ان لوگوں کو خبر دیکر حضرت لوط کے پاس بھیجا گیا۔ اس کا یقینی پتہ تو کلام الٰہی سے نہیں لگتا۔ مگر میرے نزدیک ایک وجہ ظاہر ہے اور وہ یہ کہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط اس علاقہ میں باہر سے آکر بسے تھے۔ اس وجہ سے بالکل ممکن ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے چند مقامی نیک لوگوں کو الہام کر کے بھیجا۔ تاکہ وہ تباہی سے پہلے حضرت لوط کو بھی محفوظ اور مناسب جگہ کی طرف لیجائیں۔ اور انہیں تکلیف نہ ہو۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے۔ کہ کیا کبھی پہلے ایسا ہوا ہے۔ کہ نبی کو تو انذار نہ ہوا ہو۔ مگر دوسروں کو ان کی قوم کے متعلق انذار ہوا ہو۔ اور پھر بغیر اس کے کہ قوم کو توبہ کا موقع دیا گیا ہو۔ عذاب آگیا ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ لیکن حضرت لوط کے معاملے میں بھی ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ دوسروں کی معرفت خبر دینے سے میری یہ مراد نہیں کہ انذار ہی ان کی معرفت ہوا تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ وقتِ عذاب کی خبر انکی معرفت دی گئی۔ ورنہ عذاب کی خبر تو پہلے سے مل چکی تھی اور انذار ہو چکا تھا۔ سورۂ قٓ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کذبت قبلھم قوم نوح و اصحٰب الرس و ثمود و عاد و فرعون و اخوان لوط و اصحٰب الایکۃ و قوم تبع کل کذب الرسل فحق وعید (قٓ ع۱) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس طرح پہلی قوموں کے لئے ایک عرصہ پہلے سے انذار ہو چکا تھا۔ اسیطرح حضرت لوط کے مخاطبین کے لئے بھی انذار ہو چکا تھا۔ پس جو کچھ بالواسطہ ہوا۔ وہ صرف یہ ہے۔ کہ حضرت لوط کی تسلی کیلئے عین عذاب کے وقت اسکے نزول کے قرب کی خبر چند علاقہ کے واقف لوگوں کی معرفت ان کو پہنچائی گئی۔ تاکہ وہ لوگ حضرت لوط کو اپنے ساتھ لے کر مناسب جگہ تک پہنچا دیں۔

پہلے انذار ہو چکنے کا ثبوت

پہلے انذار ہو چکنے کا ثبوت۔ بل جئنٰک بما کانوا فیہ یمترون سے بھی نکلتا ہے۔ (حجر ع۴) اس آیت میں وہ خبر لانیوالے لوگ مقر ہیں کہ جو خبر آپ پہلے دے چکے ہیں۔ اور جس کے متعلق یہ لوگ آپ سے جھگڑا کرتے تھے۔ ہم اُسیکا وقت بتانے آئے ہیں۔

قالوا سلامًا میں سلاما سے پہلے نُسلِّم کا فعل

فَلَمَّارَآ اَيْدِيَهُمْ لَاتَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ

پس جب اس نے ان کے ہاتھوں کو دیکھا کہ اس (کھانے) تک نہیں پہنچتے تو اس نے سمجھا کہ میں نے انہیں نہیں پہچانا۔ اور ان

محذوف ہے۔ یعنی آنیوالوں نے سلامًا کہا کہ ہم سلام کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم ؑ کے جواب میں سلامٌ یا تو مبتدا ہے اور علیکم اس کی خبر محذوف ہے یعنی تم پر سلامتی ہو۔ اور یا پھر مبتدا محذوف ہے۔ یعنی جوابی کا لفظ۔ اور مراد یہ ہے۔ کہ میرا جواب بھی یہ ہے۔ کہ تم پر سلامتی ہو۔

سلامٌ اور سلامًا کے معنے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں اس تعلیم کا کیا ہی عمدگی سے لحاظ رکھا گیا ہے۔ کہ جو کوئی دعا کرے اس سے بہتر دعا اس کے لئے کی جائے۔ آنے والوں نے سلامًا کہا تھا۔ جو جملہ فعلیہ ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سلامٌ کہا۔ جو اپنے محذوف کے ساتھ ملکر جملہ اسمیہ بنتا ہے اور جملہ اسمیہ اپنے معنوں میں جملہ فعلیہ سے قوی ہوتا ہے اور اسکے معنوں میں دوام کا پایا جاتا ہے۔ گویا انہوں نے جواب میں یہ کہدیا کہ تم پر بھی ہمیشہ سلامتی ہوتی رہے۔

سلام کا جواب حضرت ابراہیم نے بہتر دیا

ایک اور سبق بھی اس آیت سے ملتا ہے۔ اور وہ مہمان نوازی کا سبق ہے۔ حضرت ابراہیم ؑ نے ان لوگوں کے آتے ہی بغیر کسی مزید سوال و جواب کے بچھڑا ذبح کر کے ان کے آگے لا رکھا۔ اور یہ نہیں پوچھا۔ کہ آپ لوگ کھانا کھا کر آئے ہیں یا نہیں۔ یا ابھی کھانا کھائینگے یا ٹھیر کر۔ مہمان نوازی اسلام کے اصول میں سے ہے مگر افسوس کہ دوسری قوموں کے اثرات کے نیچے مسلمان بھی اب اس فرض سے غافل ہوتے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے نبی کی سنت ان کے لئے اُسوۂ حسنہ کے طور پر موجود ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم میں یوں تو سبھی خوبیاں موجود تھیں۔ مگر وہ باتیں جو آپ کی پہلی بیوی حضرت خدیجہؓ کو خاص طور پر محسوس ہوئیں۔ ان میں سے ایک آپ کی مہمان نوازی کی صفت بھی تھی۔ چنانچہ جب پہلی وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اور آپ گھبرا کر گھر تشریف لائے۔ اور حضرت خدیجہ رضؓ سے نزول وحی کا ذکر گھبراہٹ میں کیا۔ تو انہوں نے آپ کو ان الفاظ میں تسلی دی۔ کلا واللہ لا یخزیك اللہ ابدًا انك لتصلُ الرحم وتحمل الکلَّ وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق۔ (صحیح بخاری باب کیف کان بدء الوحی) یعنی ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالےٰ کی قسم ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ کو ہرگز کبھی رسوا نہ ہونے دے گا۔ کیونکہ آپ رشتہ داری کے تعلقات کا ہمیشہ پاس رکھتے ہیں۔ لوگوں کا بوجھ اپنے اوپر لیتے ہیں۔ دنیا سے اُٹھ چکے ہوئے اخلاق حمیدہ کو از سر نو عدم سے وجود میں لاتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں۔ اور حق کے خلاف پیش آمدہ حوادث کا مقابلہ کرتے اور ستم رسیدوں کی حمایت کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم ؑ کی مہمان نوازی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہمان نوازی۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اِسراف سے کام لیا۔ کہ چند آدمیوں کے لئے بچھڑا ذبح کر دیا۔ لیکن یہ اِسراف نہیں۔ وہ جنگل میں رہتے تھے۔ اور اس جگہ نہ قصاب تھا۔ نہ پرچون کا دوکاندار کہ بازار سے سودا خرید کر کھانا تیار کرتے۔ وہ جانور پالتے تھے۔ پس ان کی مہمان نوازی یہی ہو سکتی تھی۔ کہ دنبہ یا بچھڑا جو اس وقت پاس ہو ذبح کر کے مہمانوں کے لئے تیار کر دیں +

کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ مہمان نوازی اسراف میں داخل ہے۔

---+---

مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ

(کے اس رکنے کی وجہ) سے خطرہ محسوس کیا۔ اسپرانہوں نے کہاکہ) تو خوف نہ کر۔ ہمیں (تو) لوطؑ کی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے

۷۱ لُوْطٍ ؕ۝ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا

۶۸؎ اور اس کی بیوی (بھی پاس ہی) کھڑی تھی۔ اسپر وہ گھبرائی۔ تب ہم نے اس کو اسحاق کی اور

۷۲ بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝

اسحٰق کے بعد یعقوب کی (پیدائش) کی بشارت دی ۶۹؎

نکر

۶۸؎ حل لغات ۔ نکرالامر ۔ یَنْکُرُ نَکرًا وُنُکرًا وَنُکودًا وَنَکِیرًا ۔ جَھِلَہٗ اس سے بیخبر رہا ۔ الرجل لم یعرفه اسے نہ پہچانا (اقرب)

اَوْجَسَ

اوجس ایجاسا اَحَسَّ وَاَضْمَرَ ۔ محسوس کیا ۔ اور اپنے دل میں پوشیدہ رکھا (اقرب) الخیفة مصدر خاف

الخیفة

خاف کا مصدر ہے ۔ جس کے معنی ہیں الفَزَعُ ۔ گھبراہٹ الحَذَرُ ۔ احتیاط کی بات ۔ ضد الامن ۔ امن کے خلاف حالت یعنی خطرہ ۔ ڈر ۔ (اقرب)

بشارت لانے والے انسان ہونے پر ایک اور دلیل

حضرت ابراہیم کو کس بات کا خوف ہوا تھا ۔

تفسیر ۔ یہ مطلب نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان لوگوں سے ڈر گئے ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ کے دل میں یہ خوف پیدا ہوا ۔ کہ شائد کوئی امر مہمان نوازی کے خلاف ہوگیا ہے ۔ جس کی وجہ سے یہ لوگ نہیں کھاتے ۔ مگر انہوں نے اس خوف کا اظہار نہ کیا ۔ کیونکہ مہمان کو یہ کہنا کہ شائد مہمان نوازی میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہے ۔ اس سے مہمان کی شرافت پر حرف آتا ہے ۔ کیونکہ اس سے اشارہ ٹپکتا ہے کہ وہ لالچی یا حریص ہے ۔

ضحك

حضرت ابراہیم کس بات کو نہیں سمجھا ۔

اور یہ جو فرمایا کہ انہیں پہچانا نہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ پہلے تو حضرت ابراہیم ان کو معمولی مسافر سمجھتے تھے لیکن جب دیکھا کہ یہ کھانا نہیں کھاتے ۔ تو خیال کیا ۔ کہ غالباً میں نے ان کے یہاں آنے کے مقصد کو نہیں سمجھا ۔ کیونکہ اگر علم مسافر ہوتے ۔ تو مہمان نوازی کو قبول کرتے ۔ کہ ان بیابانی علاقوں میں مسافر بلا مہمان نوازی کے گذارہ ہی نہیں کر سکتے ۔ ان لوگوں نے بھی حضرت ابراہیم کے چہرے سے پہچان لیا ۔ کہ یہ حیران ہیں کہ کیا مہمان نوازی میں کوئی نقص ہوگیا ہے ۔ یا ان لوگوں کے یہاں آنے کا کوئی اور مقصد ہے ۔ اس لئے انہوں نے تسلی دینے کے لئے کہدیا ۔ کہ ہم آپ سے ناراض نہیں ہیں ۔ بلکہ ہم ایک عذاب کی خبر لیجا رہے ہیں ۔ اس وجہ سے کھانا نہیں کھا سکتے ۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ فرشتے نہ تھے ۔ کیونکہ اگر فرشتے ہوتے ۔ تو یہ نہ کہتے کہ ہم چونکہ لوطؑ کی قوم کی طرف جا رہے ہیں ۔ اس لئے کھانا نہیں کھا سکتے ۔ بلکہ یہ کہتے کہ ہم تو فرشتے ہیں کبھی کھانا کھایا ہی نہیں کرتے ۔

۶۹؎ حل لغات ۔ ضحك یضحك ۔ ضَحْکًا وَضِحْکًا وَضَحِکًا وَضِحِکًا ۔ ضد بَکٰی ۔ رونے کی مخالف حالت کا یعنی ہنسنے کا نام ضحک ہے ۔ ضَحِكَ الرجلُ ضَحْکًا عَجِبَ اَوْ فَزِعَ ۔ اس نے تعجب کیا یا گھبرا گیا ۔ (اقرب) ضحك فزع ۔ و به فسّر الفراء الاٰیة ۔ ضحك کے معنی گھبرا جانے کے بھی ہوتے ہیں ۔ اور فراء نے اس آیت میں یہی معنی کئے ہیں (تاج) ویستعمل فی السرور المجرد نحو مسفرة ضاحکة کبھی صرف خوشی کے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جیسے کہ قرآن کریم میں ہے مسفرة ضاحکة واستعمل للتعجب المجرد

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ط

اس نے کہا ہائے میری رسوائی کیا میں (بچہ) جنوں گی۔ حالانکہ میں بوڑھی ہوچکی ہوں اور یہ میرا خاوند بڑھاپے کی حالت

اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ ۷۳

میں ہے۔ یہ (بات) یقینا یقینا ایک اچنبی بات ہے ۵۳۵

قادۃ اور کبھی صرف تعجب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے (مفردات)

تفسیر۔ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی سُن رہی تھیں انہوں نے یہ بات سنی تو گھبرائیں۔ اور ایک قوم کی تباہی پر دل میں درد پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ بات بہت پسند آئی۔ اور اسحٰق ؑ کی خبر کے ساتھ جو پہلے ان نیک لوگوں کے ذریعہ سے بھی مل چکی تھی۔ حضرت یعقوب ؑ کی پیدائش کی بھی خبر دی۔ جس کا یہ مطلب تھا۔ کہ چونکہ بنی نوع انسان پر انہیں رحم آیا ہے۔ اللہ تو انہیں ایک ترقی کرنے والی نسل دیگا۔ خدا تعالیٰ کا رحم کس قدر وسیع ہے۔ وہ عذاب میں گرفتار ہونیوالوں سے سچی ہمدردی کو بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

یہاں سے ایک اور مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ذبیح کون تھا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ اسحاق ذبیح تھا مسلمان کہتے ہیں کہ اسماعیلؑ ذبیح تھا۔ ان کی بحث تو خیر تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر بعض مسلمان بھی غلطی سے حضرت اسحاق کو ذبیح قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں کی غلطی اس آیت سے دور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے حضرت اسحٰق ؑ کی پیدائش سے بھی پہلے خبر دیدی تھی۔ کہ اسحاقؑ کے ہاں اولاد بھی ہوگی۔ اور ان کا ایک بیٹا یعقوب مقرب الٰہی ہوگا۔ اور جس کی نسبت پہلے سے یہ بتا دیا گیا ہو۔ کہ وہ زندہ رہیگا۔ بڑا ہو کر شادی کرے گا۔ اور اس کا بیٹا پیدا ہوگا۔ جو مقرب الٰہی ہوگا۔ اس کی نسبت کب یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کہ اسے ذبح کرنے کا حکم ہوا ہو۔ اور پھر اس حکم سے دھوکا بھی لگ گیا ہو۔ اگر حضرت اسحٰقؑ کے متعلق ذبح ہونے کی رؤیا ہوتی۔ تو کیا حضرت ابراہیمؑ دریافت نہ کرتے۔ کہ الٰہی تو نے تو اس کے جوان ہونے اور ایک مقرب بارگاہ بچہ کے باپ ہونے کی خبر دی تھی۔ اب اس کے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔ کیا اس حکم کا مطلب کچھ اور تو نہیں۔

ط حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کی گھبراہٹ کا باعث۔

ط حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کو بشارت دیئے جانے کا باعث

غرض اس آیت سے صاف ثابت ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہی تھے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ یہودیوں کی محرف مبدل کتب سے ڈر کر ہم حضرت اسحٰقؑ کو ذبیح قرار دینے کی کوشش کریں۔

۵۳۵ **حل لغات**۔ ویلتیٰ اصل میں وَیْلَتِیْ ہے یعنی اے میری ویلۃ اور ویلۃ کے معنی ہیں۔ الفضیحۃ۔ بلای البلیۃ۔ مصیبت (اقرب) یہ کلمہ اصل میں مصیبت کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ تعجب کے لئے استعمال ہونے لگا۔ العجوز۔ المرءۃ المسنّۃ۔ بڑھیا عورت لعجزھا عن اکثر الامور۔ یعنی بڑھیا عورت کو عجوز اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اکثر کاموں سے عاجز آجاتی ہے۔ وھو وصف خاص لھا۔ اور یہ لفظ بوڑھی عورت کے سوا اور کسی کے لئے استعمال نہیں ہوتا (اقرب) البعل۔ ربّ الشئ چیز کا مالک یقولون من بعل ھٰذہ الناقۃ۔ ای ربّھا کہتے ہیں کہ اس اونٹنی کا بعل یعنی مالک کون ہے الزوج۔ بعل کے معنی جوڑے کے بھی ہیں۔ امرأۃ بعل او بعلۃ عورت کے لئے بھی یہ لفظ جوڑے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس وقت اس کے

ذبیح کون تھا

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ

انہوں نے کہا کیا تو اللہ (تعالیٰ) کی بات پر تعجب کرتی ہے۔ اے اس گھر والو تم پر (تو) اللہ (تعالیٰ) کی رحمت اور اسکی ہر (قسم کی)

۷۴ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ○

برکات نازل ہو رہی ہیں (لہٰس یہ کوئی اچنبھی بات نہیں) وہ یقیناً بہت ہی تعریف والا (اور) بزرگ شان والا ہے ۵۴ک

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى

پس جب ابراہیم سے گھبراہٹ دور ہوگئی اور اسے خوشخبری ملی تو (اس وقت)

۷۵ يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ○

وہ لوط کی قوم کے متعلق ہمارے ساتھ بہت جھگڑتا تھا ۵۵ک

ساتھ تا ر تانیث کا لانا اور نہ لانا دونوں باتیں جائز ہوتی ہیں۔ جیسے زوج اور زوجۃ (اقرب)

حضرت ابراہیم کی بیوی کا تعجب خدا کی نعمت پر تھا

تفسیر۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ وہ الٰہی خبر کا انکار کر رہی تھیں۔ ایک عام طبقہ کی مومنہ کے متعلق بھی یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر انکار کے رنگ میں تعجب کرے گی۔ تو ایک نبی کی مومنہ بیوی کے متعلق کس طرح خیال ہو سکتا ہے۔ کہ وہ خدا تعالیٰ کے نشانات کو دیکھنے کے بعد اس کی قدرت پر انکار کے رنگ میں تعجب کرے۔ پس ان کا تعجب

حضرت ابراہیم کا اپنا تعجب

نعمت کی عظمت کے اظہار کے لئے تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کے متعلق بھی ایک جگہ اس قسم کے لفظ آتے ہیں۔ اور وہ خود ہی تشریح بھی کر دیتے ہیں۔ کہ میرا تعجب نعمت کی عظمت کے اظہار کے لئے ہے۔ نہ کہ اس کے ناممکن ہونے کے خیال سے۔ فرمایا

روع

ابشرتمونی علی ان مسنی الکبر فبم تبشرون قالوا بشرناك بالحق فلا تكن من القانطين قال ومن يقنط من رحمة ربه الا الضالون (حجر ع ۴) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ کیا تم نے باوجود میرے بوڑھا ہو جانے کے مجھے یہ خوشخبری دی ہے۔ تم کیسی عجیب خبر دیتے ہو۔ خبر دینے والوں نے کہا کہ ہم نے تجھے ایک یقیناً پوری ہو کر رہنے والی خبر دی ہے۔

پس تو مایوس نہ ہو۔ حضرت ابراہیم نے جواب میں کہا۔ کہ میں مایوس نہیں۔ خدا کی رحمت سے تو گمراہ ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے۔ کہ ایسے ہی لفظ حضرت ابراہیم عم نے کہے ہیں۔ اور پھر خود تشریح بھی کر دی ہے کہ میرا تعجب مایوسانہ تعجب نہیں۔ بلکہ عظمت نعمت کے اظہار کے طور پر ہے۔

۵۴ک شیعہ اہل بیت میں بیویوں کو شامل نہیں کرتے۔ مگر یہاں صرف بیوی کو ہی اہل بیت کہا ہے۔ حالانکہ ابھی تک ان کے ہاں کوئی اولاد بھی نہ ہوئی تھی۔ حق یہی ہے۔ کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں اہل بیت کا لفظ آیا ہے وہاں بیوی بھی شامل ہے۔

۵۵ک **حل لغات**۔ الروع۔ الفزع۔ گھبراہٹ رَاعَ فَزِعَ۔ گھبرایا۔ (اقرب)

حضرت ابراہیم کا یہ خوف قوم لوط کے متعلق تھا۔

تفسیر۔ یہ خوف حضرت ابراہیم کا اپنے متعلق نہیں تھا۔ کہ اس کو محل اعتراض قرار دیا جائے۔ بلکہ قوم لوط کے متعلق تھا۔ اور یہ تقوی کے عین مطابق اور اعلیٰ اخلاق میں سے ہوتا ہے۔ پہلے تو حضرت ابراہیم عم کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ حیران رہ گئے۔ کہ میں اب کروں تو کیا کروں لیکن جب

إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّٰهٌ مُّنِيبٌ ۝ يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ أَعْرِضْ ٧٦

ابراہیم یقیناً بڑا بردبار۔ درد مند (دل رکھنے والا) اور ہماری حضور بار بار جھکنے والا تھا ۷۶ (اسپر ہم نے اسے کہا) اے ابراہیم تو اس دعا سے اپنا

عَنْ هَٰذَآ ۖ إِنَّهُۥ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ ءَاتِيهِمْ عَذَابٌ

رخ پھیرلے۔ اب تو تیرے رب کا حکم یقیناً آچکا ہے اور ان کی یقیناً یہ حالت ہے۔ کہ ان پر ہٹایا نہ جا سکنے والا

غَيْرُ مَرْدُودٍ ۝ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِىٓءَ بِهِمْ وَ ٧٧

عذاب آرہا ہے ۷۷ اور جب ہمارے فرستادے لوط کے پاس آئے تو ان کی وجہ

ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هَٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ۝ ٧٨

سے اسے غم ہوا اور وہ بے بس ہوگیا اور کہا یہ دن (بہت) سخت (چڑھا) ہے ۷۸

اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ آپ کو ایک بہتر قوم مل جائیگی۔ تو ان کے غم کا بوجھ کم ہوا۔ اور محبت الٰہی کا نظارہ دیکھکر لوط کی قوم کے بارہ میں بھی درخواست کرنی شروع کی۔

۷۶ حل لغات۔ اَلْاَوَّاہُ کثیر التّاوّہ اشفاقًا ومحبۃ جو خوف اور محبت کی وجہ سے بہت آہیں بھرتا ہو۔ (اقرب) اناب الیہ۔ رجع الیہ۔ مرۃ بعد مرۃ۔ بار بار رجوع کیا۔ پس منیب کے معنی ہوئے بار بار رجوع کرنیوالا۔ (اقرب)

۷۷ تفسیر۔ اللہ تعالیٰ کی محبت حضرت ابراہیمؑ سے کتنی بڑھی ہوئی تھی۔ انہیں یہ نہیں کہا کہ میں تیری بات نہیں سنتا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ اے ابراہیمؑ یہ سوال جانے دو۔ تمہارے رب کا حکم آگیا ہے۔ اور یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ کہ ان پر عذاب آئیگا۔ اس لئے اصرار نہ کرو۔

۷۸ حل لغات ساءہ۔ فعل بہ ما یکرھہ۔ او احزنہٗ۔ اس سے ایسا سلوک کیا جو اسے ناپسند ہے۔ یا یہ کہ اُسے غمگین کیا۔ سِیْٓءَ بہ فُعِلَ بہ المکروہ اس سے ناپسند معاملہ کیا گیا۔ (اقرب) ضاق بہ ذرعًا۔ ضعفت طاقتہ ولم یجد من المکروہ فیہ مخلصًا اس کی طاقت کمزور ثابت ہوئی۔ اور ناپسندیدہ بات سے بچنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔ واصل الذرع بسط الید فکأنک ترید مددت یدی الیہ فلم تنلہ اور ذرع کے اصل معنی ہاتھ پھیلانے یا بڑھانے کے ہیں۔ اور مراد یہ ہے۔ کہ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر میں اُسے پکڑ نہ سکا واراد بالذراع فی قولہ ع ولکن کان اَرْحَبَھُمْ ذراعًا۔ النفس۔ اور مذکورہ بالا مصرعہ میں ذراع سے مراد نفس ہے (اقرب)۔ یوم عصیب شدید الحرّ او شدید۔ یوم عصیب کے معنی سخت گرم دن کے۔ یا سخت دن کے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ لوگ حضرت لوطؑ کے پاس آئے۔ تو انہیں ان سے بہت تکلیف ہوئی۔ اور انہوں نے ان کے فعل سے خلاصی کی کوئی صورت نہ پائی۔ یا انہیں مقصد میں کامیاب ہونے کے۔ لئے بہت دقت پیش آئی۔ مفسرین نے لکھا ہے۔ کہ وہ اللہ کے رسول جن کا ذکر ہے۔ جب حضرت لوطؑ کے پاس مہمان آکر ٹھہرے۔ اور باوجود حضرت لوطؑ کے ٹلانے کے نہ ٹلے۔ اور بن بلائے مہمان بنے رہے۔ تو اس سے حضرت لوطؑ کے دل کو تکلیف ہوئی۔ اور اسی

اَوّاہ

مُنیب

اللہ تعالیٰ کی محبت حضرت ابراہیمؑ سے

حضرت لوط کی تکلیف کا باعث ملاقاتیوں کا بن بلائے آجانا تھا۔

سِیْٓءَ

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ۭ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا

اور اس کی قوم (غصہ سے) اس کی طرف بھاگتی کانپتی ہوئی اُسکے پاس آئی اور اس سے پہلے (بھی) وہ (لوگ نہایت خطرناک)

يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنَاتِيْ هُنَّ

بدیاں کیا کرتے تھے۔ اسنے کہا اے میری قوم یہ میری بیٹیاں (تمہارے ہی گھروں میں بیاہی ہوئی) ہیں وہ تمہارے

اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۭ

لا(اور تمہاری آبرو کے) حق میں نہایت پاک دل اور پاک خیال ہیں۔ پس تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور میرے مہمانوں (کی موجودگی) میں مجھے

اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ ۷۹

رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں سے کوئی (بھی) سمجھ دار (آدمی) نہیں ہے ۹۵

تکلیف کا اسجگہ ذکر ہے۔ مگر یہ بات غلط ہے۔ میرے نزدیک بائبل میں جو واقعہ لکھا ہے۔ وہ صحیح ہے۔ اور اسی کی طرف اس جگہ اشارہ ہے۔ اور وہ واقعہ یہ ہے۔ کہ جب یہ لوگ حضرت لوطؑ کی بستی کے پاس پہنچے۔ تو حضرت لوطؑ نے ان لوگوں کو اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس سے انکار کیا۔ غالباً اس امر سے ڈرتے ہونگے کہ انہیں تکلیف ہوگی۔ مگر حضرت لوطؑ نے اصرار کیا۔ انہوں نے انکار پر اصرار کیا۔ اس پر حضرت لوطؑ کو تکلیف ہوئی۔ اور اسی تکلیف کا اسجگہ ذکر ہے اور خدا کا اپنے نبی کی مہمان نوازی کی شان بتانا مقصود ہے۔ نہ اس کے بخل اور بدخُلقی کا اظہار۔ (دیکھو خروج باب ۱۹)

اسے اہم کہتے بائبل کا مضمون

حضرت لوطؑ کو اپنی قوم کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

اھرع

۹۵ حل لغات۔ اُھْرِعَ الرجلُ (مجہولًا) ارعد من غضب او ضعف او خوف او برد۔ خوف سردی غضب یا ضعف سے کانپنے لگا۔ اُعْجِلَ علی الاسلام فھو مُھْرَعٌ۔ اسے تیزی سے دوڑایا گیا۔ ایسے شخص کو مُھْرَعٌ کہینگے۔ وفی اللسان الھَرَعُ والھُرَاعُ والاِھْرَاعُ شدۃ السَّوْق اور لسان العرب میں ہے۔ کہ اِھرَاعٌ کے معنی تیز چلانے اور زور سے ہانکنے کے ہوتے ہیں۔ قال ابوعبید ۃ اُھرِعَ الرجل۔ اذا اتاہ وھو یرعد من البرد۔ ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص سردی سے کانپتا ہوا آئے۔ تو اس کی نسبت اُھْرِعَ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اقبل الشیخ یُھْرَعُ۔ اے اقبل یسرع مضطربا۔ یعنی بڈھا گرتا پڑتا دوڑتا ہوا آیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے افعالِ بد کی وجہ سے حضرت لوطؑ کے دل میں خطرہ پیدا ہوا۔ کہ وہ کوئی شرارت نہ کریں۔ اس سے کوئی خاص شرارت مراد نہیں۔ چونکہ وہ پہلے بھی شرارتیں کیا کرتے تھے۔ اس لئے حضرت لوطؑ کو خطرہ ہوا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں آئے تھے۔ وہ لوگ ان کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ اور ان سے بدی کرنے کو دوڑ آئے۔ مگر میرے نزدیک مفسرین کا یہ خیال غلط ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سورہ حجر۶ میں فرماتا ہے۔ اولم ننھک عن العالمین۔ یعنی کیا ہم نے تم کو غیر علاقہ کے آدمی لانے سے روکا ہوا نہیں ہے۔ اگر وہ کسی بدکاری کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور ان لوگوں کے آنے پر خوش تھے تو چاہیئے تھا۔ کہ تاکید کرتے کہ روز مسافروں کو پکڑ کر شہر میں لایا کرو۔ مگر وہ لوگ تو ناراض ہوکر کہتے ہیں۔ کہ کیا

ہم نے تم کو پہلے سے روکا ہوا نہیں ہے۔ کہ غیر علاقہ کے آدمی کو شہر میں مت لایا کرو۔

اگر کہا جائے کہ دوسری جگہ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وجآء اھل المدینۃ یستبشرون (حجر ع ۵) کہ شہر والے خوش ہو کر بھاگے آئے تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اس خوشی سے بھی یہ مراد نہیں کہ ان مہمانوں سے کسی قسم کی بیحیائی کا فعل کرینگے۔ بلکہ خوشی کا سبب یہ تھا۔ کہ آج لوطؑ کو سزا دینے کا بہانہ مل گیا ہے۔ اور وہ ہمارے قابو چڑھ گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے۔ کہ پرانے زمانہ میں عام طور پر الگ الگ شہروں کی حکومتیں ہوا کرتی تھیں۔ اور یہ علاقہ جس میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ رہتے تھے یہ تو اس وقت باقاعدہ حکومتوں سے بالکل خالی تھا۔ ہر شہر یا قصبہ یا چند قصبات کی اپنی الگ حکومت ہوتی تھی۔ جو جمہوریت کا رنگ رکھتی تھی۔ کبھی کوئی ملک حاکم ہوتا تھا۔ کبھی صرف شہر کے رؤسا، ملکرا اور سیاسیہ کو طے کر لیا کرتے تھے۔ سدوم اور عمورا دونوں بستیاں جن سے حضرت لوطؑ کا تعلق تھا۔ ایسی ہی شہری حکومتوں میں سے تھیں۔ اور شہر کا ملک ہی ان کا بادشاہ ہوتا تھا۔ (دیکھو پیدائش باب ۱۴)

طالمود جو یہود کی روایات اور تاریخ کی کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ ان بستیوں کے لوگ مسافروں کو لوٹ لینے کے عادی تھے۔ (دیکھو جیوش انسائکلوپیڈیا زیر لفظ سدوم) اور جو قوم ہمسایوں کو اس طرح دکھ دیگی وہ اُن سے خائف بھی رہیگی۔ کہ وہ بھی کسی وقت اسے نقصان نہ پہنچائیں۔ اور سدوم والوں سے تو ہمسایوں کی علاً بھی لڑائی رہتی تھی۔ (دیکھو پیدائش باب ۱۴ و ۲) اس سبب سے یہ لوگ غیر معروف آدمیوں کو شہر میں آنے نہیں دیتے تھے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ رات کو شہر کے دروازے کھولدیں۔ اور دشمن سوتے میں آ کر حملہ کر دیں۔ حضرت لوطؑ چونکہ سنت انبیاء کے مطابق مہمان نواز تھے۔ وہ مسافروں کو لے آئے۔ کہ باہر رہیں گے تو لوٹے جائینگے۔ یہ لوگ اُن کو منع کرتے۔ جیساکہ سورہ حجر کی مذکورہ بالا آیت سے ثابت ہے۔ اس دفعہ جب پھر حضرت لوطؑ آنے والے رسولوں کو لے آئے تو یہ لوگ ایک طرف تو غصہ سے بھر گئے۔ کہ ہماری ہدایت کے خلاف یہ اجنبیوں کو لے آئے ہیں۔ اور دوسری طرف خوش بھی ہوئے کہ اب لوطؑ کو پکڑنے کا بہانہ مل جائیگا۔ اور یہ قصہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگا۔ جب یہ لوگ دوڑتے ہوئے حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے۔ تو چونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ پہلے بھی مجھے مہمان لانے سے روکتے رہے ہیں۔ اس لئے وہ اس پہلے سلوک کی وجہ سے جو وہ لوگ ان سے کیا کرتے تھے۔ ڈرے کہ کہیں مہمانوں کے سامنے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ اور ان لوگوں سے کہا۔ کہ میری بیٹیاں یہاں موجود ہیں۔ (ان کی دو بیٹیوں کی اس شہر کے دو آدمیوں سے شادی ہو چکی تھی۔) وہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزگی کا موجب ہیں۔ یعنی مہمانوں کو رسوا کر کے نکالوگے۔ تو اس میں تمہاری بدنامی ہے۔ تم کو خوف ہے کہ باہر کے لوگ ملک میں تم کو نقصان نہ پہنچائیں۔ تو میری بیٹیاں تمہارے اپنے گھروں میں موجود ہیں۔ تم ان کو سزا دے کر مجھ سے بدلے سکتے ہو۔ اس طرح تمہاری بدنامی بھی نہ ہوگی۔

بعض لوگوں نے تورات کی اتباع میں اس آیت کے یہ معنی کئے ہیں۔ کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی باکرہ لڑکیوں کو (یا تو ان کی دو لڑکیاں کنواری ہی تھیں اور یا بیاہی ہوئی ابھی رخصت نہ ہوئی تھیں) ان لوگوں پر پیش کیا۔ کہ ان سے بدکاری کر لو۔ لیکن مہمانوں سے کچھ نہ کہو۔ مگر یہ معنی نبی کی شان کے خلاف ہیں۔ وہ سب لوگوں سے زیادہ باغیرت ہوتے ہیں۔ ایسا کام جسے ادنیٰ سے ادنےٰ لوگ بھی نہیں کر سکتے۔ وہ کیوں کرنے لگے۔ ایسے مقابلہ کے وقت میں تو بدکار لوگ بھی کبھی یہ تجویز پیش نہیں کر سکتے پس یہ غلطی اُن سے تورات کی نقل کی وجہ سے ہوئی ہے

۷ حضرت لوطؑ کی قوم کا ایک ہی وقت میں غصہ بھی اور خوشی بھی۔

۸ حضرت لوطؑ کا تعلق شہری حکومت سے تھا

حضرت لوطؑ کا جواب میں بیٹیوں کا ذکر

۹ اس بستی کے ملک یا شہنشاہ کی مدد گار کی بستیوں کی بخشش تھی۔

۱۰ حضرت لوطؑ نے بدکاری کے لئے اپنی لڑکیوں کا نہیں ذکر کیا تھا۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ

انہوں نے کہا تو یقیناً یقیناً معلوم کر چکا (ہوا) ہے۔ کہ تیری لڑکیوں کے متعلق ہمیں کوئی بھی حق (حاصل) نہیں ہے۔

۸۰ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ۝

اور جو (کچھ) ہم چاہتے ہیں۔ اسے تو یقیناً یقیناً جانتا ہے ۵۸۰

حضرت لوطؑ نے لڑکیوں کا ذکر دشمنی کے شبہ کے ازالہ کے لئے کیا تھا۔

قرآن کریم میں بدکاری کا کوئی لفظ استعمال نہیں ہوا۔ انہوں نے صرف شہر والوں کے خوف کو اس طرح دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ سمجھایا ہے۔ کہ جب میرے عیال تمہارے قبضہ میں ہیں تو تمہیں یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ میں تمہارا دشمن ہوں۔ اور دوسرے لوگوں سے مل کر تمہارے شہر کو کوئی نقصان پہنچاؤں گا۔ اگر یہ بات تمہاری سمجھ میں آجائے۔ تو اس پر عمل کرنا تمہاری عزت کے قیام کے لئے اچھا ہوگا۔ اور مہمانوں کو ذلیل کرنے کے عیب سے محفوظ ہو جاؤ گے۔

شادی کے لئے لڑکیاں پیش کرنے کا خیال بھی صحیح نہیں۔

بعض مفسرین قرآن یہ خیال ظاہر کرتے ہیں۔ کہ انہوں نے نکاح کے لئے لڑکیاں پیش کی تھیں۔ یہ خیال بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ بائبل کے رو سے لوطؑ کی لڑکیاں بیاہی ہوئی تھیں اگر باکرہ لڑکیاں نکاح شدہ لڑکیوں کے علاوہ بھی سمجھی جائیں۔ تب بھی یہ عقل کے خلاف ہے۔ کہ شہر کے لوگ تو ایک خاص قسم کے فحش کے لئے آئے ہوں۔ اور حضرت لوطؑ یہ کہیں۔ کہ تم میں سے دو آدمی میری لڑکیوں سے بیاہ کر لیں۔

[illegible] کے خیال کی تائید

بیٹیوں سے مراد قوم کی اپنی بیویاں بھی ہو سکتی ہیں

یہ مراد بھی ہو سکتی ہے۔ کہ حضرت لوطؑ بیٹیاں ان لوگوں کی بیویوں کو کہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ میری بیٹیاں (یعنی تمہاری بیویاں) جو تمہارے گھروں میں موجود ہیں۔ ان سے تعلق تمہارے لئے بہت پاکیزہ امر ہے۔ اسے چھوڑ کر تم کن بدکاریوں میں مبتلا ہو رہے ہو گویا حضرت لوطؑ چونکہ معمر ہو چکے تھے۔ عام محاورہ کے مطابق ان لوگوں کی بیویوں کو اپنی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔

۵۸۰ حضرت لوطؑ نے جو ان لوگوں سے کہا کہ میری بیٹیاں تمہارے قبضہ میں ہیں۔ اگر تم مجھ سے کوئی امر اپنے ملکی مصالح کے خلاف دیکھو۔ تو ان کے ذریعہ سے مجھے تکلیف پہنچا سکتے ہو۔ چونکہ یہ ایک رنگ یرغمال کا تھا۔ اور یرغمال کے متعلق یہ دستور تھا کہ اس میں نرینہ اولاد ہی رکھی جاتی تھی۔ ان لوگوں نے جواب دیا۔ کہ لڑکیاں رکھنے کا کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ اور تجھے معلوم ہے۔ کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ یعنی تجھے معلوم ہے۔ کہ ہم بہرحال مہمانوں کی آمد کو روکنا چاہتے ہیں۔ پس یہ کہنا۔ کہ یرغمال رکھ لو اور مہمانوں کے متعلق مجھے کچھ نہ کہو۔ ایک ایسا مطالبہ ہے۔ کہ جسے ہم تسلیم نہیں کر سکتے۔

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ حضرت لوطؑ نے لڑکیوں کو بدکاری یا نکاح کے لئے پیش کیا تھا۔ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ ضرور ایسا ہی ہوگا۔ تبھی تو ان لوگوں نے جواب دیا۔ کہ لڑکیوں کے متعلق ہمارا کوئی حق نہیں حالانکہ یہ آیت تو ان کے خلاف ہے۔ کیونکہ جو قوم بدکاری میں اس قدر بڑھ چکی ہو۔ وہ شہوانی امور کے متعلق حق و ناحق کا سوال کب اٹھا سکتی ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ ہمارا کوئی حق نہیں۔ تو بتاتا ہے۔ کہ یہاں یرغمال کا ہی سوال تھا۔ اور چونکہ ان کے ہاں رواج تھا۔ کہ یرغمال کے طور پر نرینہ اولاد ہی رکھی جاتی تھی۔ وہ اسے خلاف دستور قرار دیتے ہیں۔ اور بے فائدہ سمجھتے ہیں +

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝ ۸۱

اس نے کہا کاش مجھے تمہارے مقابلہ میں (کسی قسم کی) قوۃ (حاصل) ہوتی (تو میں تم کو تمہاری بدی سے روکتا) یا (پھر یہی کہ) میں ایک قوی ذریعہ حفاظت یعنی خدا کی پناہ لیتا

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ

انہوں نے (یعنی مہمانوں نے) کہا اے لوط ہم یقیناً تیرے رب کے فرستادہ ہیں۔ وہ تجھ تک ہرگز نہیں پہنچینگے (ان کی تباہی کا وقت آچکا ہے)

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ

اس لئے تو رات کے کسی حصہ میں اپنے گھر والوں کو لیکر تیزی سے (یہاں سے) چلے جاؤ اور تم میں سے کوئی (مڑ کر بھی)

اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ

اسوقت نہ دیکھے (اس طریق سے تم محفوظ رہوگے) سوائے تیری بیوی کے (کہ جو عذاب) ان پر آیا (ہوا ہے) وہ اسپر بھی یقیناً آنیوالا ہے۔ ان کا

مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ۝ ۸۲

مقررہ وقت (آئندہ) صبح ہے۔ (اور) کیا صبح قریب نہیں ہے۔ ۸۲

۸۱ **حل لغات**۔ الرکن۔ الجانب الاقوی نہایت مضبوط یا سب سے مضبوط جانب۔ الامرالعظیم عظمت اور بڑائی والی بات۔ مایقوی بہ من ملک و جند وغیرہ۔ قوۃ کا ذریعہ اور سامان خواہ جائداد ہو یا جتھا وغیرہ۔ العزۃ والمنعۃ۔ غلبہ اور مددگاروں اور حفاظت کرنے والوں کا جتھا۔ (اقرب)

تفسیر۔ حدیث میں ہے۔ عن ابی ھریرۃ قال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال رحمۃ اللہ اور رحمۃ اللہ علی لوط لقدکان یاوی الی رکن شدید (یعنی اللہ تعالیٰ عزوجل) ابوہریرہ سے روایت ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ کی رحمتیں ہوں حضرت لوط علیہ السلام پر۔ یا یہ فرمایا۔ کہ اس پر اللہ رحم کرے وہ بار بار ایک رکن شدید کی پناہ لیتے تھے۔ اور اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ (ابن کثیر)

حضرت لوط ع کا یہ مطلب ہے۔ کہ اگر طاقت ہوتی تو میں تمہارا مقابلہ کرکے بدی سے روکتا۔ مگر طاقت نہیں ہے۔ بس اب یہی ذریعہ ہے۔ کہ میں خدا تعالےٰ کی پناہ ڈھونڈوں۔ اور تمہارے لئے عذاب طلب کروں۔ مگر میں ابھی دیر کرتا ہوں۔ تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔ لیکن جب اس دردمندانہ اپیل کی طرف بھی لوگوں نے توجہ نہ کی۔ تو خدا تعالیٰ کے فیصلہ کے مطابق اللہ تعالیٰ سے اس قوم کی تباہی کی دُعا کی۔ جیساکہ مذکورۂ بالا حدیث سے ظاہر ہے۔ دکن

۸۲ جب ان لوگوں نے حضرت لوط کی یہ بات سنی کہ وہ ان لوگوں کے لئے خدا تعالیٰ کے حضور بددعا کرنا چاہتے ہیں۔ تو انہوں نے اس امر کو جسے اس وقت تک چھپائے رکھا تھا۔ ظاہر کر دیا اور بتا دیا۔ کہ خدا تعالیٰ کا فیصلہ ہوچکا ہے۔ ہم وہی بتانے آئے تھے۔ صرف تمہارے اہل عذاب سے بچائے جائینگے۔ اور باقی شہر تباہ کیا جائیگا۔ اہل میں سے بھی بیوی نہیں بچ سکے گی۔ اور عذاب صبح کے وقت تک آجائیگا۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا

پھر جب ہمارا (عذاب کا) حکم آیا تو ہم نے اس (بستی) کے اوپر والے (حصہ) کو نیچے والا (حصہ) بنادیا۔ اور اس پر پتھروں کی یعنی تہ بتہ

۸۳ عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ۙ مُّسَوَّمَةً

(رکی ہوئی) کنکروں والی (سخت شدہ) مٹی کی بارش برسائی ۸۳ جو تیرے رب کی تقدیر میں

۸۴ عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ۝ ع ۷ (۱۵)

(انکے لئے ہی) نشاندار (اور نامزد) کئے ہوئے تھے اور ان (محمد رسول اللہ کے زمانہ کے) ظالموں سے (بھی) یہ عذاب دور نہیں ۸۴

سجّیل **۸۳ حل لغات** ۔ السجّیل ۔ حجر وطین۔ مختلط ۔ ایسا مجموعہ جس میں کنکر اور مٹی ملی ہوئی ہو (مفردات) حجارۃ کالمدَر ڈھیلوں کی شکل کے پتھر۔ (اقرب)

نضد نَضَدَ المتاعَ یَنْضِدُ نَضْدًا ۔ جعل بعضہ فوق بعض ۔ ایک دوسرے پر تہ بہ تہ لگاکر رکھا (اقرب) پس منضود کے معنی ہوئے۔ تہ بتہ لگاکر رکھا ہوا۔ المسوّمۃ للرسلۃ ۔ آزاد چھوڑے ہوئے المعلمۃ ۔ جن پر نشان لگایا ہوا ہو۔

یہ عذاب نا تباشیہ زلزلہ کی صورت میں آیا تھا۔

تفسیر معلوم ہوتا ہے شدید زلزلہ سے یہ قوم ہلاک ہوئی تھی۔ شدید زلزلوں میں زمین الٹ بھی جاتی ہے۔ اور اس کے ٹکڑے اڑکر پھر واپس آکر گرنے لگتے ہیں۔ نشان لگے ہوئے پتھروں سے مراد یہ ہے۔ کہ ازل سے ان پتھروں کے لئے یہی مقدر تھا۔ کہ اس قوم کی تباہی کا موجب بنیں۔

واقعہ لوط کے متعلق بعض مزید

بائبل کے بیان کے مطابق حضرت لوط ؑ حضرت ابراہیم ؑ کے بھائی حاران کے بیٹے تھے اور اُور سے جو عراق کے علاقہ کا ایک قصبہ تھا۔ حضرت ابراہیم کے ساتھ ہی ہجرت کرکے کنعان یعنی فلسطین کے ملک کی طرف چلے آئے تھے۔ یہاں پہنچ کر وہ حضرت ابراہیم ؑ سے الگ ہوکر صدوم نامی بستی میں رہنے لگے۔

حضرت لوط ؑ کے متعلق بائبل کے اور قرآن کریم کے بیانوں میں اختلاف

قرآن کریم اور بائبل میں لوط علیہ السلام کے واقعہ میں کچھ اختلافات بھی ہیں۔ بائبل حضرت لوط کو لوط کا اور حاسد بتاتی ہے۔ اس کے برخلاف قرآن کریم انہیں نیک بتاتا ہے۔

بائبل سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان تینوں آنیوالوں نے حضرت ابراہیم ؑ کا پیش کردہ کھانا کھایا۔ قرآن کریم اس کا منکر ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے۔ کہ بائبل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ تین شخص جو آئے تھے۔ ان میں سے ایک خود خدا تھا۔ اور دوسرے دو فرشتے تھے۔ مگر باوجود اس کے وہ یہ شہادت دیتی ہے۔ کہ انہوں نے کھانا کھایا۔ ہر ایک عقلمند ان دونوں بیانوں میں سچے بیان کو خود معلوم کرسکتا ہے۔

بائبل بتاتی ہے۔ کہ حضرت لوط ؑ نے اپنی لڑکیوں کو بدکاری کے لئے پیش کیا تھا۔ قرآن کریم اس کے برخلاف انہیں بطور ضمانت پیش کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ ان کے سوا اور بھی اختلافات ہیں۔ مثلاً بائبل کہتی ہے۔ کہ حضرت لوط کی بیوی نمک کا کھمبا بن گئی تھی۔ قرآن کریم ایسی فضول باتوں سے بالکل پاک ہے۔ یہ چند مثالیں قرآن کریم اور بائبل کے بیانات میں اختلافات اور ان کی حقیقت بیان کرنے کے لئے کافی ہیں۔

۸۴ اس آیت کے آخر میں یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ یہ قصہ نہیں ہے۔ بلکہ پیشگوئی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لوگوں کے لئے بھی ایسے ہی عذاب مقدر ہیں اور لوط کی بستی کی طرح آپ کی قوم کے بعض مخالفوں کے لئے بھی نیست و نابود ہوجانا مقدر ہوچکا ہے۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا

اور مدین کی طرف (بھیجا) ان کے بھائی شعیب کو (نبی بنا کر بھیجا) اسنے (انہیں) کہا اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے

لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ

سوا تمہارا کوئی بھی معبود نہیں اور ماپ اور تول کو کم نہ (کیا) کرو میں اسوقت یقیناً

اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۝ ۸۵

تمہیں اچھی حالت میں دیکھتا ہوں اور (ساتھ ہی) میں یقیناً تمہاری نسبت ایک تباہ کن دن کے عذاب سے ڈر رہا ہوں ش

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا

اور اے میری قوم تم ماپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا (کیا) کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں

النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ ۸۶

کم نہ دیا کرو اور فسادی بنکر زمین میں خرابی مت پھیلاؤ ۵

ش حل لغات ۔ المکیال مایکال بہ۔ وہ پیمانہ (ظرف) جس سے کسی چیز کی مقدار کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ چیزوں کا وزن معلوم کرنے کے دو طریق ہیں۔ ایک برتن کے ذریعہ سے۔ دوسرے بٹہ وغیرہ کے مقابلہ پر وزن کرنے سے۔ گویا ایک جگہ کے لحاظ سے اور ایک بوجھ کے ذریعہ سے۔ پرانے زمانہ میں جگہ کے لحاظ سے زیادہ لین دین کیا جاتا تھا۔ اور آج کل بوجھ کے لحاظ سے اندازہ کرنے کا زیادہ رواج ہے۔ گو اب بھی سیّال چیزوں کا جگہ کے لحاظ سے اندازہ کرتے ہیں۔ مکیال ہر اس پیمانہ کو کہتے ہیں۔ جس کے ذریعہ سے دوسری چیز کا اندازہ کیا جائے۔ المیزان ۔ آلۃ ذات الکفتین۔ یوزن بہ الشیٔ و یعرف مقدارہ من الثقل یعنی میزان ایک آلہ ہوتا ہے۔ دو پلڑوں والا (یعنی ترازو) جس سے چیز کا وزن کیا جاتا ہے۔ اور اس چیز کی مقدار بوجھ کے لحاظ سے معلوم کی جاتی ہے۔

المکیال

المقدار۔ یعنی یہ لفظ مطلق مقدار کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ (اقرب)

آسودہ حال کا ذکر کیوں بدترین ہے۔

تفسیر ۔ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ ۔ میں تم کو اچھی اور آسودہ حالت میں دیکھتا ہوں یعنی ٹھگی کا موجب اگر فقر ہو تب بھی وہ بری چیز ہے۔ لیکن مالدار آدمی فریب سے لوگوں کا مال لوٹے۔ تو وہ اور بھی بُرا ہے۔

محیط کو یوم کی وصف بنانے کی وجہ۔

اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۔ احاط بالشیٔ کے معنے میں بتا چکا ہوں۔ کہ ہلاک کر دینے کے ہوتے ہیں۔ یوم کی صفت محیط کو مجازاً مبالغہ کے اظہار کے لئے بنایا ہے۔ جیسے کہتے ہیں۔ نہارہ صائمٌ اس کا دن روزہ دار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے دنوں کو کامل روزہ کی حالت میں گذارتا ہے۔ اسی طرح عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ سے مراد یہ ہے۔ کہ اس دن کا عذاب بالکل تباہ کر دینے والا ہوگا۔ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ وہ دن ختم نہیں ہوگا۔ جب تک سب قوم کو تباہ

المیزان

ذکر ہے۔

مَدین

حضرت شعیب علیہ السلام مدین قوم کی طرف آئے تھے۔ اور مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام ہے۔ جو قتورہ کے پیٹ سے تھے (قتورہ آپ کی تیسری بیوی تھی یعنی سارہ اور ہاجرہ کے علاوہ) ان کا ذکر پیدائش باب ۲۵ میں آتا ہے۔ پرانے زمانے کے اصول کے لحاظ سے کہ باپ کے نام پر اولاد بھی پکاری جاتی تھی۔ ان کی اولاد بھی ان کے نام کے لحاظ سے مدین کہلائی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ شروع میں وہ بنو مدین کہلاتے ہوں۔ پھر کثرت استعمال سے بنو کا لفظ اڑ گیا ہو۔ اور خالی مدین رہ گیا ہو۔ اس قوم کے مرکزی شہر کا نام بھی مدین ہے۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں یہ دور مدین کہلاتا ہو۔ پھر کثرت استعمال سے مدین رہ گیا ہو۔

۱ حضرت شعیبؑ کا زیادہ مقابلہ اہل شہر سے تھا۔

مدین شہر کا محل وقوع

یہ شہر خلیج عقبہ کے پاس تھا۔ بحیرہ احمر جہاں ختم ہونے لگتا ہے۔ وہاں اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک مصر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے۔ اور ایک عرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے۔ جو شاخ عرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ اسکو خلیج عقبہ کہتے ہیں۔ اور یہ شہر خلیج عقبہ کے پاس عرب کی جانب سمندر کے بالکل قریب چھ سات میل کے فاصلہ پر ہے۔ بوجہ اتنا قریب ہونے کے پرانے زمانہ کے جغرافیہ نویسوں میں سے بعض اس کو بندرگاہ لکھتے ہیں اور بعض اس کو خشکی کا شہر لکھتے ہیں۔

۲ یہ قوم تجارتی کاروبار میں خیانت کا شیوہ رکھتی تھی۔

۳ اس قوم کی مالی حالت اچھی تھی۔

عرب سے جو قافلے مصر کو جاتے تھے۔ وہ مدین کے راستہ سے ہو کر جاتے تھے۔ اب بھی مدین نام کی کئی بستیاں چھوٹے چھوٹے قصبات کے رنگ میں ملتی ہیں۔ اصل مدین شہر اب موجود نہیں ہے۔ مدین کی اولاد حجاز کے شمال میں بستی تھی۔ اور یہ شہر انہی کا بنایا ہوا تھا۔

۴ یہ قوم راہزنی بھی کرتی تھی۔

آنحضرتؐ اور حضرت موسیٰؑ میں ایک وجہ مماثلت

حضرت موسےٰ علیہ السلام واقعہ قتل کے بعد ہجرت کر کے مدین میں ہی آئے تھے۔ اور بنی اسرائیل کو لیکر بھی جب وہ آئے۔ تب بھی وہ مدین ہی کے قریب آکر ٹھہرے تھے۔ یہ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک مشابہت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ٹھہرے۔ اور موسےٰ علیہ السلام مدین میں ٹھہرے۔ گو مدینہ کا نام پہلے یثرب تھا۔ مگر اللہ تعالےٰ نے اس کی وبائیں دور کر کے اس کا نام مدینہ ڈلوا دیا۔ اور اس طرح ظاہری مشابہت بھی قائم ہو گئی۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت شعیبؑ کا زیادہ مقابلہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرح اہل شہر سے ہی تھا۔ سورۂ اعراف میں آتا ہے۔ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ ۝ (سورۂ اعراف ع ۱۱)

(۲) دوسری بات اس سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ کہ ان کی قوم شرک میں مبتلا ہونے کے علاوہ معاملات کی خرابی کی مرض میں بھی مبتلا تھی۔ تبھی تو اس بات پر زور دیا گیا ہے۔ کہ لَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ۔ پیمانہ اور تول میں کمی نہ کیا کرو۔

(۳) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ کیونکہ فرمایا ہے۔ کہ إِنِّي أَرَاكُم بِخَيْرٍ یعنی میں یقیناً تمہاری مالی حالت اچھی دیکھتا ہوں۔

(۴) یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ قوم ڈاکے بھی ڈالتی تھی۔ کیونکہ فرمایا ہے۔ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا (اعراف ع ۱۱) وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (ہود ع ۸) اور یہ الفاظ یا تو قتل و غارت پر دلالت کرتے ہیں۔ یا ڈاکہ و راہزنی پر۔ چونکہ یہ علاقہ عرب اور شام اور مصر کے رستوں پر تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ اس قیاس کو مزید

تقویت اس امر سے حاصل ہوتی ہے۔ کہ مدین قوم کے قبضہ میں مدین کے پاس ایک جنگل تھا۔ جس میں وہ ان قوم رہتی تھی۔ جو مدین کے بھتیجے اور حضرت ابراہیم ؑ کے ایک دوسرے بیٹے کی نسل سے کہ وہ بھی فتورہ کے بطن سے تھا۔ پوتے تھے۔ اس جنگل میں رہنے والوں کو قرآن کریم نے اصحاب الایکہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور سورۃ شعراء (رکوع ۱۰) میں ان اصحاب الایکہ کو بھی حضرت شعیب کی زبانی ہی کہا گیا ہے۔ جو کہ مدین والوں کو کہا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ○ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ○ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ○ ایکہ عربی زبان میں ایسے جنگل کو کہتے ہیں کہ جس میں بیریاں اور پیلو کے درخت ہوں ایسے جنگل میں ڈاکے ڈالنے زیادہ آسان ہوتے ہیں کیونکہ بیری اور پیلو کے پتے نیچے سے شروع ہوتے ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کے پیچھے آدمی آسانی سے چھپ سکتا ہے اور سورۂ حجر (ع ۵) میں فرماتا ہے۔ وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ○ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ○ اور اصحاب ایکہ ضرور ظالم تھے۔ اس وجہ سے ہم نے انہیں ان کے جرم کی سزا دی اور وہ دونوں (قوم لوط اور اصحاب الایکہ) ایک عام چلنے والے راستہ پر واقع تھے۔

مفسرین کا قول ہے۔ کہ شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھے۔ اور ان کے خسر تھے اور انہیں کے پاس موسیٰ ؑ واقعہ قتل کے بعد آکر ٹھہرے تھے۔ اور پھر انکی لڑکی سے شادی کی تھی۔ لیکن تورات میں اس شخص کا نام جسکے پاس موسیٰ ؑ آکر ٹھہرے اور جسکی لڑکی سے انہوں نے شادی کی تھی بعض جگہ حوباب اور بعض جگہ یترو آتا ہے۔ مصنف ارض القرآن کی بھی یہی رائے ہے کہ مفسرین کا قول صحیح ہے اور انہوں نے اس امر کے ثبوت میں کئی دلیلیں دی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ (۱) بائبل سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لیکر آئے تھے تو پہلے مدین میں آکر ٹھہرے تھے۔ اور جب مدین کی عورتوں نے انہیں لوٹنا شروع کیا۔ اور ان کو شرک میں مبتلاء کرنے لگیں۔ (کیونکہ وہ ان کو اپنے مندروں میں لیجاتی تھیں) تو موسیٰ علیہ السلام نے ان پر چڑھائی کی اور سارے کی ساری قوم کو تباہ کر دیا۔ حتیٰ کہ بچوں اور عورتوں کو بھی۔

(۲) دوسری دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں حضرت شعیب ؑ کا قول نقل ہے۔ بقیت الله خیر لکم اس سے مراد بھی یہی ہو سکتی ہے۔ کہ حضرت موسیٰ ؑ نے اہل مدین کی زمین بنی اسرائیل میں بانٹ دی تھی۔ حضرت شعیب ؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں۔ کہ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ جس قدر زمین تمہارے لئے چھوڑ دی ہے۔ تم اسپر اکتفا کرو۔ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا سے بھی ان کے نزدیک یہی مراد ہے کہ بنی اسرائیل سے صلح کرنے کے بعد لڑو نہیں +

مصنف ارض القرآن نے مدین قوم کے مقام اور ان کے قومی حالات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے میں اس سے متفق ہوں اور ان کی محنت کی داد دیتا ہوں۔ لیکن مجھے حضرت شعیب کی شخصیت کے متعلق ان سے اختلاف ہے۔ اور اس کے مندرجہ ذیل وجوہ ہیں۔

(۱) قرآن کریم میں حضرت شعیب کی قوم کا یہ قول درج ہے۔ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۔ کیا تو اس امر کا ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم اپنے اموال کو جس طرح چاہیں استعمال نہ کریں۔ لیکن نہ بائبل سے اور نہ قرآن کریم سے کسی ایسے واقعہ کا پتہ لگتا ہے۔ جس کی بنا پر ہم اس آیت کو بنی اسرائیل اور اہل مدین کے تعلقات پر چسپاں کر سکیں۔ (۲) حضرت شعیب ؑ کا قول ہے۔ کہ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا زمین میں صلح قائم ہو جانے کے بعد فساد نہ کرو۔ لیکن حضرت موسیٰ کی قوم سے جو مدین والوں کا معاملہ ہوا تھا۔ اس پر یہ فقرہ چسپاں نہیں ہوتا۔ کیونکہ موسےٰ کی قوم سے ان کی کوئی صلح

دہوئی تھی۔ بلکہ برخلاف اس کے اگر بائبل کا بیان صحیح تسلیم کیا جائے۔ تو انہوں نے مدین والوں کی جائدادوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ پس صلح کا تو اس موقع پر کوئی ذکر ہی نہیں۔ یہاں تو فساد کی بنیاد پڑتی نظر آتی ہے۔ ان حالات میں ہم مجبور ہیں۔ کہ اصلاح سے مراد وہ نیکی کی بنیادیں۔ جو پہلے نبی کے زمانہ میں ڈالی گئی تھیں۔ اور یہ سمجھیں کہ شعیب علیہ نصیحت کرتے ہیں۔ کہ جو نیکی پہلے انبیاء کے ذریعہ سے قائم ہوئی تھی۔ اسے تم لوگ اپنے اعمال سے برباد نہ کرو۔ (۳) تورات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حُوباب مدین کی تباہی کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس چلے گئے۔ اور وہاں انہیں زمین مل گئی۔ اور اس کے بعد ان کا ذکر خاموشی کے پردہ کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ لیکن یہ امر کہ ایک نبی اپنی قوم کو چھوڑ کر ایک دوسرے علاقہ میں چلا گیا۔ اور اپنی بعثت کے کام کو بھلا کر صرف زمینداره میں مشغول ہو گیا۔ عقل کے خلاف ہے۔ (۴) بائبل میں حُوباب کے نبی ہونے کا کہیں ذکر نہیں حالانکہ جب وہ حضرت موسیٰ ع کے زمانہ کے آدمی تھے۔ اور پھر ان کے خسر تھے۔ تو اگر وہ نبی ہوتے۔ تو غالب خیال یہ ہے۔ کہ ان کی نبوت کا ذکر اس میں ہوتا۔ (۵) قرآن کریم میں حضرت شعیب کا متعدد جگہ ذکر آیا ہے۔ اور اسی طرح حضرت موسیٰ ع کے خسر کا بھی ذکر قرآن کریم میں ہے۔ لیکن ایک جگہ بھی اس نے اشارہ نہیں کیا۔ کہ یہ دونوں وجود ایک ہی ہیں۔ اور نہ کہیں موسیٰ ع کے خسر کے نبی ہونے کا ذکر آیا ہے۔ (۶) یہ عقل کے خلاف ہے۔ کہ ایک نبی کی قوم کو دوسرے نبی کے ہاتھوں سے تباہ کروایا جائے۔ اور پھر اگر یہ صحیح ہو۔ تو لازماً شعیب اور ان پر ایمان لانے والوں کو حضرت موسیٰ ع کا ساتھ دینا چاہیئے تھا۔ مگر اس کا ذکر تورات میں بالکل نہیں بلکہ یہ ذکر بھی نہیں۔ کہ حُوباب پر ایمان لانے والا کوئی ایک شخص بھی تھا۔ برخلاف اس کے وہاں یہ لکھا ہے کہ صرف حُوباب کی اولاد ان کے ساتھ تھی۔ لیکن قرآن کریم بتاتا ہے۔ کہ شعیبؑ پر ایمان لانے والی ایک جماعت تھی۔ (۷) سب سے بڑھ کر اور قطعی ثبوت اس امر کا کہ شعیب اور حوباب الگ الگ شخص تھے۔ یہ ہے۔ کہ قرآن کریم میں حضرت شعیب کی قوم کی تباہی کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے۔ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا (اعراف ع۱۳) یعنی اس قوم کے بعد ہم نے موسیٰ کو مبعوث کیا تھا۔ پس جب قرآن کریم بوضاحت اور بنص صریح حضرت موسیٰ کی بعثت کو شعیبؑ کی قوم کی تباہی کے بعد بتاتا ہے تو ہم کس طرح خیال کر سکتے ہیں۔ کہ شعیب اور حوباب موسیٰ علیہ السلام کے خسر ایک ہی شخص تھے۔ اور یہ کہ شعیب کی قوم کی تباہی حضرت موسےٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ہوئی۔ (۸) اگر شعیب کو حضرت موسیٰ کا خسر قرار دیا جائے تو ماننا پڑے گا۔ کہ موسیٰ کے مدین پہنچنے پر شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ اور ان کا کام صرف موسےٰ سے صلح رکھنے کی تلقین کرنا تھا۔ حالانکہ موسےٰ علیہ السلام کو اور قوموں سے بھی واسطہ پڑا۔ جیسے عمالقہ وغیرہ۔ لیکن انہیں سمجھانے کے لئے کوئی نبی مبعوث نہ ہوا۔ (۹) حضرت شعیب علیہ السلام کا قول اسی رکوع میں آتا ہے۔ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت شعیب حضرت لوط کی قوم کے قریب بعد میں ہوئے۔ پس حضرت موسےٰ علیہ السلام کے زمانہ میں انہیں قرار دینا درست نہیں ہو سکتا۔

(۱۰) اگر شعیبؑ حضرت موسےٰ ع کے خسر ہوتے تو جیسا انہوں نے نوح ہود اور صالح کی قوم کی تباہی کا ذکر کیا تھا۔ تو کیوں تازہ بتازہ تباہی جو حضرت موسےٰ کے دشمن فرعون کو پہنچی تھی اس کا ذکر نہ کرتے۔ خصوصاً جبکہ وہ حضرت موسےٰ علیہ السلام ہی کی تائید کر رہے تھے۔ تو یہ خیال نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ اس موقع پر

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَ

اگر تم (سچے) مومن ہو تو (یقین جانو کہ) اللہ (تعالیٰ) کا (تمہارے پاس) باقی چھوڑا ہوا (مال ہی) تمہارے لئے بہتر (اور مبارک) ہے

مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝ ۸۷

اور میں تم پر کوئی محافظ (بنا کر) نہیں (بھیجا گیا) ؁۵۸

ان تائیدات کا ذکر چھوڑ دیں گے۔ جو موسےٰ علیہ السلام کو ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں ملیں۔

پس میرے نزدیک ان مفسرین کا خیال غلط ہے۔ جو شعیب ؑ کو حضرت موسےٰ ؑ کا خسر قرار دیتے ہیں۔ حوباب جو حضرت موسےٰ ؑ کا خسر تھا۔ وہ بالکل اور شخص ہے۔ اور حضرت شعیبؑ اور شخص ہیں۔ اور میرے نزدیک یہ قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے تباہ ہو چکی تھی۔ اور حضرت موسےٰ علیہ السلام کے زمانہ میں صرف اس کی نسل کا بقیہ موجود تھا اور شان و شوکت اس قوم کی زائل ہو چکی تھی۔

حوباب نے جو حضرت موسےٰ علیہ السلام کی قوم کا نظام تجویز کیا ہے۔ وہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت شعیب ؑ کے اثر سے متاثر ہو کر تھا۔ کیونکہ جیسا کہ ہر نبی کی قوم کو ترقی عطا ہوتی ہے۔ ضرور ہے کہ حضرت شعیب پر ایمان لانے والوں کو بھی ترقی ملی ہو۔ اور چونکہ ان کا زمانہ قریب کا تھا۔ ان کے تمدن کے آثار ابھی تازہ ہونگے۔ اور انہی کے متاثر ہو کر حوباب نے جو معلوم ہوتا ہے۔ کہ شعیب کی امت میں سے تھے۔ ایک نظام تجویز کیا۔ جو موسیٰ کی قوم میں جاری ہوا۔

۸۵۷ حل لغات۔ البقية۔ اسم لما بقي بقیہ حصہ۔ وَمَثَلٌ فِی الْجَوْدَةِ وَالفضل۔ يقال فلان بقية القوم۔ اى من خيارهم

بقیہ کا لفظ خوبی اور کمال کے بیان کے لئے آتا ہے یعنی جب کسی کو بقیۃ القوم کہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ کہ وہ اپنی قوم کے بہترین آدمیوں میں سے ہے۔ اسیطرح عربی زبان کا محاورہ ہے۔ فی الزوایا خبایا وفی الرجال بقایا۔ کونوں میں چھپے ہوئے خزانے مل جاتے ہیں۔ اور انسانوں میں اچھے سے اچھے آدمی مل جاتے ہیں۔ اولوا بقية اى اولوا الرأي والعقل۔ اور قرآن کریم میں جو اولوا بقیۃ کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں عمدہ رائے اور عقل والے لوگ (اقرب)

بقیۃ اللہ سے مراد

تفسیر۔ بقیۃ اللہ یعنی جو مال نیک ذرائع سے حاصل ہوا ہوا اور اللہ تعالیٰ کی اجازت کے ماتحت ملا ہو۔ وہ اچھا ہے۔ اسی پر کفایت کرنی چاہیئے۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ ترقی کی قابلیتیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہیں اگر ان کو استعمال کرو۔ تو تم زیادہ ترقی کر سکتے ہو۔ بہ نسبت ٹھگی کے کاموں کی طرف توجہ کرنے کے۔

ما انا علیکم بحفیظ میں کیا بتایا گیا ہے

وما انا علیکم بحفیظ میں بتایا ہے۔ کہ یہ خیال نہ کرنا۔ کہ میری وجہ سے عذاب ٹل جائیگا۔ اگر میری نصیحت کو نہ مانو گے۔ تو ضرور عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ باوجود انبیاء سے دشمنی کے ان کے پیلے چال چلن اور نمونہ کی وجہ سے لوگ اپنے دلوں میں انہیں ایک خیر و برکت کا موجب وجود ہی خیال کرتے ہیں۔ مخالفت کی تہ کے نیچے ادب و احترام کا جذبہ ضرور کام کر رہا ہوتا ہے۔

بلقیۃ

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا

انہوں نے کہا اے شعیب کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ جس چیز کی ہمارے باپ دادا

يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ط اِنَّكَ

پرستش کرتے آئے) ہیں اُسے ہم چھوڑ دیں۔ یا اس بات کو (ترک کردیں) کہ اپنے مالوں کے متعلق ہم جو چاہیں کریں تو تو یقیناً

لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ ۸۸

بڑا (ہی) عقلمند (اور) سمجھدار (آدمی) ہے ۵۵ش اس نے کہا اے میری قوم (مجھے) بتاؤ (تو سہی اگر ثابت ہوا) کہ میں

كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا

(اپنے دعویٰ کی بنا) اپنے رب کی طرف سے (عطا شدہ) کسی روشن دلیل پر (رکھتا) ہوں اور اس نے اپنے حضور سے مجھے اچھا (اور پسندیدہ) رزق دیا ہے (تو کل خدا

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ط اِنْ اُرِيْدُ

کے حضور تم کیا جواب دوگے۔) اور میں نہیں چاہتا کہ جس بات سے تمہیں روکوں (اس سے تم تو رک جاؤ اور خود میں) تمہارے خلاف اسی (بات) کا قصد کروں۔

۵۵ش حل لغات۔ الحلیم۔ حَلُمَ سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے جسکے معنی ہیں۔ صَفَحَ درگذر کیا۔ سَتَرَ پردہ پوشی کی (اقرب) نیز حِلْم کے معنی ہیں الاناۃ آرام سے کام کرنا۔ جوش میں نہ آنا۔ العَقْل عقلمندی۔ (اقرب) پس حلیم کے معنی آرام سے بغیر جوش کے کام کرنے والے اور عقلمند کے بھی ہوئے۔ (اقرب) الرشید ذوالرشد۔ رُشْدًا الذی حسن تقدیرہ فی ما قدّر۔ جو اندازہ درست لگاتا ہو۔ فی صفات اللہ۔ الھادی الی سواء الصراط۔ اللہ تعالیٰ کے لئے جب یہ لفظ استعمال ہو۔ تو اس کے معنی سیدھے رستہ کی طرف ہدایت دینے والے کے ہوتے ہیں (اقرب)

الحلیم

الرشید

تفسیر۔ میرے نزدیک یہ بھی انہوں نے تمسخر کے طور پر کہا ہے اور مطلب یہ ہے۔ کہ سوائے نماز کے تم میں ہم اور تو کوئی خوبی نہیں دیکھتے۔ نہ محنت کرنا جانتے ہو۔ نہ تجارت کرنا نہ زراعت کرنا۔ پس کیا تم چاہتے ہو۔ کہ ہم بھی تمہاری طرح دنیا کی عزتوں کو کھو دیں۔ اور نکمے ہو کر بیٹھ جائیں۔

قوم شعیب کا تمسخر

کیا نماز تم کو حکم دیتی ہے کہکر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ نماز پڑھ پڑھ کر تمہاری عقل ماری گئی ہے۔ اور تم خیال کرنے لگے ہو۔ کہ سب سے بڑا کام یہی ہے۔ لیکن تم کو اس سے کیا کام کہ ہم کس کی عبادت کرتے ہیں۔ اور اپنے مالوں کو کس طرح خرچ کرتے ہیں۔

یہ عجیب لطیفہ ہے۔ کہ حضرت شعیبؑ تو انہیں یہ نصیحت کرتے ہیں۔ کہ دوسروں کے مالوں کو جھوٹ اور فریب سے نہ لیا کرو۔ اور وہ یہ جواب دیتے ہیں۔ کہ تمہیں کیا ہم جس طرح چاہیں اپنے مالوں کو استعمال کریں۔ گویا حرام کھاتے کھاتے ان کی عقل پر اس قدر پردہ پڑ گیا تھا۔ کہ وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ کہ وہ اپنے مالوں میں نہیں۔ بلکہ دوسرے کے مالوں میں تصرف کر رہے ہیں۔

اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ

میں تو سوائے اس (حد تک) اصلاح کے جسکی مجھ طاقت ہو کچھ نہیں چاہتا اور میرا توفیق پانا اللہ (تعالیٰ) ہی (کے فضل اور رحم) سے (وابستہ) ہے

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ ۸۹

اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسیکی طرف میں بار بار جھکتا ہوں ۵۸۹ اور اے میری قوم (دیکھنا کہیں تمہاری) مجھ سے دشمنی تمہیں

شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ

یہ بات حاصل نہ کروا دے کہ تم پر ویسی ہی مصیبت آئے جیسی کہ نوح کی قوم یا

قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ

ہود کی قوم یا صالح کی قوم پر مصیبت آئی تھی اور لوط کی قوم (تو) تم سے کچھ (ایسی)

۵۸۹ حل لغات - خالفہ الی کذا کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ جو کام وہ کرتا ہے۔ اس کے خلاف کام کیا۔ یقول خالفنی الیٰ کذا۔ اذا قصدہ وانت مُوَلٍّ عنہ یعنی اسنے فلاں کام جو تم نہیں کرتے کرکے تمہارے خلاف راہ اختیار کی (اقرب)

تفسیر - جواب شرط محذوف ہے اور مراد یہ ہے کہ میری نماز مجھے نہیں کہتی۔ بلکہ میرا خدا مجھے کہتا ہے۔ اور اگر اللہ تعالےٰ کی طرف سے با دلائل کلام مجھ پر نازل ہو اور وہ اپنے فضل سے حلال رزق مجھے دے۔ تو بتاؤ کہ کیا پھر بھی میرا حق نہیں کہ میں تم کو نصیحت کروں اور اس بات سے روکوں جسے میں بدلائل نقصان دہ ثابت کر چکا ہوں۔

ان کے اس سوال کا جواب کہ کیا تم ہمیں اس امر سے روکتے ہو۔ کہ ہم اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کریں یہ دیا کہ خود میرا اپنا رویہ دیکھ لو کہ کیا میں اس تعلیم پر عمل کرتا ہوں کہ نہیں اگر میں خود بھی عامل ہوں۔ تو میری نیک نیتی تو ثابت ہے۔ اور اگر یہ خیال ہو کہ میں حکومت کرنی چاہتا ہوں تو یہ خیال تمہارا درست نہیں۔ حکومت کے بغیر بھی انسان کو نصیحت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اور اس حق سے جہاں تک ہو سکے گا۔ میں فائدہ اٹھاؤنگا۔ باقی رہے نتائج سو ان سے مجھے کوئی تعلق نہیں۔ میرا کام سمجھانا ہے۔ اور اُن کے نتائج پیدا کرنا خدا تعالےٰ کے اختیار میں ہے۔

خَالَفَہٗ

حضرت شعیبؑ کا جواب۔

نبوت کے مقام کی کیسی لطیف تشریح ہے۔ ہر مامور کے سامنے یہی مشکلات پہلے آتی ہیں۔ بلکہ ہر مبلغ کے سامنے بھی۔ پہلے پہلے لوگ اس کی باتوں سے بہت گھبراتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنی وعظ سے ان پر جبر کرتا ہے۔ پھر مساوات دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ اچھا جو کچھ کہنا ہے کہتے جاؤ۔ مگر نبی نہ اسوقت جب لوگ ناراض ہوتے ہیں۔ اور نہ اس وقت جب لوگ پرواہ کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنے کام سے رکتے ہیں۔ بلکہ دونوں حالتوں میں یکساں جد و جہد سے کام لیتے چلے جاتے ہیں۔ اور صرف خدا تعالیٰ کی طرف نظر رکھتے ہیں۔ اور اس کے سوا ہر اک چیز کو بھلا دیتے ہیں۔

۹۰ بَبَعِيْدٍ ○ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ

دور کی (بھی) نہیں ہے ۹۰ اور تم اپنے رب سے بخشش طلب کرو۔ (اور) پھر اس کی طرف کامل رجوع اختیار کرو

۹۱ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ○

میرا رب یقیناً بار بار رحم کرنیوالا (اور) بہت ہی محبت کرنیوالا ہے ۹۱

جرم

۹۰ **حل لغات** - جَرَمَ لاهله - كَسَبَ كمایا۔ ومنه فی القرآن لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا - ای لا یکسبنکم - یعنی کسی قوم کی دشمنی کے نتیجہ میں تمہارے دل میں بے انصافی نہ پیدا ہو جائے۔ وفسّر ایضا بلا یحملنکم اور اس کے معنی آمادہ کرنے کے بھی کیے گئے ہیں۔ (اقرب) اصل الجرم قطع الثمرة عن الشجر - جرم کے اصل معنی درخت سے پھل توڑنے کے ہیں۔ واستعیر ذلك لكل اکتساب مکروہ اور پھر بطور توسیع و استعارہ اسے ہر ناپسندیدہ کمائی کے لئے استعمال کیا جانے لگا ہے۔ ومعنی جرم کسب او جنی اور جرم کے معنی کمانے یا پھل توڑنے کے یا کسی جرم کا ارتکاب کرنے کے ہیں۔ (مفردات)

حضرت شعیب کے زمانہ کی تعیین

تفسیر - اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیبؑ نوحؑ ہودؑ صالحؑ ابراہیمؑ اور لوط علیہم السلام کے بعد گزرے ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے کیونکہ ان کی قوم کا کوئی ذکر نہیں۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام اسی علاقہ میں اپنی قوم کو لا کر رہے ہیں۔ کہ جس میں ان کی قوم بستی تھی۔

ودود

۹۱ **حل لغات** - الودود - الكثیر الحب۔ بہت محبت کرنے والا۔ فعول بمعنی الفاعل یقال ھو ودود وھی ودود - یہ لفظ فعول کے وزن پر ہے اور مبالغہ فاعل کے معنی دیتا ہے۔ اس وجہ سے مذکر و مؤنث میں کوئی فرق نہیں۔ الودود فی الاسماء الحسنٰی معناہ المحب او المحبوب من اولیاءہ فیکون بمعنی مفعول اور ودود اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے بھی ہے۔ اور اس کے معنی محبت کرنے والے کے ہیں یا اولیاء اللہ کا محبوب ہونا اس سے مراد ہے۔ اس صورت میں اس لفظ کے معنی فاعل کے نہیں۔ بلکہ مفعول کے ہونگے (اقرب)

توبہ کی حقیقت

تفسیر - ہمیشہ دشمنانِ اسلام اسلام پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہ اسلام توبہ کا دروازہ کھول کر گناہ کا راستہ کھولتا ہے۔ توبہ کے معنی وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ منہ سے میری توبہ میری توبہ کہدیا۔ اور بس اسی قدر گناہ کی معافی کے لئے کافی ہے۔ حالانکہ اسلام کی یہ تعلیم نہیں۔ اسلامی توبہ بالکل اور چیز ہے۔ اسلام نے بدی سے نیکی کی طرف آنے اور نیکی سے اعلیٰ مقامات کی طرف جانے کو صرف ایک مقام نہیں قرار دیا بلکہ اسلام بتاتا ہے۔ کہ یہ دونوں کام کئی مدارج طے کرنے کے بعد پورے ہوتے ہیں۔ ایک گنہگار جب خدا تعالیٰ کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔ تو پہلے اس میں محاسبہ کا مادہ پیدا ہوتا ہے یعنی وہ اپنے نفس کا مطالعہ کر کے اس کی غلطیوں کو پکڑتا ہے۔ تب اس میں ندامت پیدا ہوتی ہے اس کے بعد وہ استعاذہ کرتا ہے۔ یعنی ان گناہوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے بھی مدد لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ استغفار کرتا ہے یعنی پچھلے گناہوں کے بد اثرات سے محفوظ رہنے کی دعا کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ توبہ کرتا ہے یعنی پوری توجہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت میں لگ جاتا ہے۔ اور اس سے اپنا پیوند جوڑ لیتا ہے۔ غرض توبہ کے معنی منہ سے معافی

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا

انہوں نے کہا اے شعیب جو کچھ تو کہتا ہے اس میں سے بہت سا حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا ۔ اور ہم

لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫

تجھے اپنے درمیان یقیناً یقیناً ایک کمزور (آدمی) سمجھتے ہیں اور اگر تیرا گروہ نہ ہوتا ۔ تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے ۔

وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ

۹۲

اور تو (بذات خود) ہماری نظر میں کوئی قابل عزت (وجود) نہیں ہے ۔ ۹۲؎ اس نے کہا اے میری قوم کیا میرا گروہ اللہ تعالیٰ کی نسبت تمہاری

عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ

نظر میں زیادہ قابل عزت ہے اور اسے تم نے بھلاتے ہوئے بالکل پیٹھ کے پیچھے کیا ہوا ہے ۔

۹۳

اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝

جو کچھ تم کرتے ہو ۔ اسے میرا رب یقیناً خوب جانتا ہے ۔ ۹۳؎

مانگنے کے ہرگز نہیں ہوتے ۔ بلکہ یہ بدی سے نیکی کی طرف آنے یا نیکی کے کسی مقام سے اس کے دوسرے مقام کی طرف جانے کی منزلوں میں سے ایک منزل کا نام ہے ۔ اور تو یہ پر اس تشریح کے بعد اعتراض کوئی علم النفس سے جاہل انسان ہی کر سکتا ہے ۔

یاد رہے کہ جو مدارج میں نے اوپر بیان کئے ہیں یہ سب اور ان سے زیادہ قرآن کریم میں مذکور ہیں ۔ یہاں اختصار کی غرض سے تفصیلاً ان کا ذکر نہیں کیا گیا ۔

۹۲؎ حل لغات ۔ الرھط قوم الرجل وقبیلتہ آدمی کی قوم اور اس کا قبیلہ وعدد یجمع من الثلاثۃ الی العشرۃ ولیس فیہم امرءۃ ولا واحد لہ من لفظہ ۔ وجمعہ ارھط و ارھاط ۔ وجمعہا اراھط و اراھیط وفی القراٰن ۔ وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ ای تسعۃ انفس ۔ یعنی رہط کے معنی اتنی تعداد کے افراد کے ہوتے ہیں ۔ جس میں تین سے لیکر دس تک وجود شامل ہوں ۔ بشرطیکہ ان میں عورت کوئی نہ ہو ۔ سب مرد ہوں ۔ اور اس لفظ کا واحد کوئی نہیں آتا ۔ اور اس کی جمع اَرْھُطٌ اور اَرْھَاطٌ ہے اور جمع الجمع اراھط اور اراھیط ہے قرآن کریم میں ان معنوں میں یہ لفظ آیا ہے ۔ چنانچہ فرماتا ہے تِسْعَةُ رَهْطٍ یعنی نو افراد (اقرب)

العزیز

العزیز ۔ الشریف عزت والا ۔ القوی ۔ مضبوط ۔ القلیل النادر لا یکاد یوجد ۔ نادر الوجود جس کی مثل ملنی مشکل ہو ۔ المکرم معزز ۔ وجمعہ عِزَازٌ و اَعِزَّۃٌ و اَعِزَّاءُ اور اس کی جمع عزاز ۔ اَعِزَّۃ اور اعزاء ہے ۔ والعزیز ایضاً من اسماء اللہ تعالیٰ وھو المنیع الذی لا ینال ولا یغالب ولا یعجزہ الشیء ولا مثل لہ اور یہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت بھی ہے ۔ اور اس کے معنی ہیں ۔ وہ ہستی کہ جس تک پہنچنا تمام طاقت سے بالا ہے اور جس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا ۔ نہ اسے اس کے کام سے کوئی چیز روک سکتی ہے ۔ اور اس کی کوئی مثل نہیں الملک لغلبتہ

رھط

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ

اور اے میری قوم تم اپنی جگہ پر (اپنے) کام کئے جاؤ۔ میں (بھی اپنی جگہ پر) یقیناً کام کر رہا ہوں ۔ عنقریب تمہیں

تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ

معلوم ہو جائیگا ۔ کہ وہ کون ہے جسپر وہ عذاب آتا ہے ۔ جو اسے رسوا کر دے گا اور کون

علیٰ اھل مملکتہ ۔ بادشاہ کو بھی عزیز کہتے ہیں کیونکہ اسے اپنی رعایا پر غلبہ حاصل ہوتا ہے ۔ لقب من ملک مصر مع الاسکندریہ وہ بادشاہ جو مصر اور سکندریہ دونوں کا بادشاہ ہو اسے بھی عزیز کہتے ہیں (اقرب) قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ فراعنہ کے زمانہ میں وزیر مالیہ کو بھی عزیز کہتے تھے۔

ظہری

الظھری ۔ الذی تجعلہ وراء ظھرک وتنساہ وتغفلہ ۔ جسے تو اپنی پیٹھ کے پیچھے ڈالدے اور اسے بھول جائے اور اس سے غافل ہو جائے (اقرب)

انبیاء کی خدا کے لئے غیرت

تفسیر ۔ نبی کی غیرت کو دیکھو ۔ اور کوئی ہوتا تو خوش ہوتا ۔ کہ میری قوم ایسی مضبوط ہے کہ اس کی وجہ سے میری حفاظت ہو رہی ہے ۔ اور شائد اس امر پر اور زور دیتا کہ مجھے چھیڑ کر دیکھو تو سہی کہ میری قوم تم سے کیسا سلوک کرتی ہے ۔ لیکن حضرت شعیب علیہ السلام اسلئے ناراض ہوتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں ۔ کہ کیا میری قوم خدا تعالےٰ سے بڑی ہے ۔ کہ تمہیں اس کا لحاظ ہے مگر خدا تعالےٰ کا نہیں ۔ میری قوم کے ڈر سے مجھے کچھ نہیں کہنا چاہتے ۔ لیکن خدا کا خوف نہیں کرتے ۔ اور دھوکے اور لوٹ سے باز نہیں آتے ۔ اس جوش میں حضرت شعیب علیہ السلام اس امر کا بھی خیال نہیں کرتے کہ اس طرح وہ اپنی قوم کی تحقیر کر کے اسے بھی غصہ دلاتے ہیں ۔ صرف ایک ہی بات ان کے خیالات پر حاوی ہے ۔ اور وہ اللہ تعالےٰ کی عزت کا مقام ہے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیرت اللہ کا ایک نمونہ

۹۳ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایسے کئی مواقع پیش آئے ہیں ۔ اور آپ نے ان مواقع پر اپنی شان کے مطابق محبت الٰہی کے نظارے دکھائے ہیں ۔ مثلاً احد کے موقع پر جب اسلامی لشکر پراگندہ ہو گیا اور صرف چند آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہ گئے اور یہ خبر مشہور ہو گئی ۔ کہ آپ قتل ہو گئے ۔ اس وقت ابوسفیان نے آواز دیکر پکارا ۔ کہ اے مسلمانو ۔ ہم نے تمہارے رسول کو مار دیا ہے ۔ گو یہ بات غلط تھی ۔ مگر موقع کی نزاکت کو دیکھ کر آپ نے جواب دینے سے روکدیا ۔ تا دشمن اس پراگندگی سے فائدہ اٹھا کر دوبارہ حملہ نہ کر دے ۔ اس کے بعد ابوسفیان نے کہا ۔ کہ اگر ابوبکر ہے ۔ تو بولے آپ نے ان کو بھی روکدیا ۔ اس پر اس نے نعرہ لگایا ۔ کہ ہم نے اسے بھی مار دیا ہے ۔ پھر اس نے کہا کہ عمر کہاں ہیں حضرت عمر نے جوش میں آکر کہا ۔ کہ عمر تمہارا سر کچلنے کو موجود ہے ۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی بولتے بولتے روکدیا ۔ اسپر ابوسفیان نے بڑے زور سے نعرہ لگایا ۔ کہ اُعْلُ هُبَل اُعْلُ هُبَل کہ ہبل کی شان بلند ہو ۔ یعنی ہمارے بت جیت گئے ۔ اسکو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم برداشت نہ کر سکے ۔ اور فرمایا کہ اب کیوں نہیں بولتے ۔ کہو اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلّ ۔ اللہ ہی سب سے بلند و برتر اور سب سے زیادہ شوکت والا ہے ۔ دشمن کے نرغہ میں گھرے ہوئے ۔ اور جب سب لشکر پراگندہ ہو چکا تھا ۔ خدا تعالیٰ کی شان کے خلاف لفظ سنکر آپ کس طرح بے تاب ہو گئے ۔

اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ اس فقرہ کے ساتھ ان کو ڈرایا ہے ۔ کہ خدا تعالیٰ اس غیرت میں آکر کہ تم نے میری قوم کو اس سے زیادہ سمجھا ۔ کہیں تمہارے

كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ○ وَلَمَّا جَآءَ ۹۴

جھوٹا ہے۔ اور تم (بھی اس کے انجام کا) انتظار کرو میں (بھی) یقیناً تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں ۹۴ اور جب ہمارا (عذاب کا) حکم آگیا

اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ

تو ہم نے شعیبؑ کو اور ان (لوگوں) کو جو اس کے ساتھ اس کی اتباع کرتے ہوئے ایمان لائے تھے اپنی (خاص) رحمت سے (اس عذاب سے) بچالیا۔

مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا

اور جنہوں نے ظلم کا شیوہ اختیار کیا تھا انہیں اس عذاب نے پکڑ لیا اور وہ اپنے

فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ○ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا ۹۵

(اپنے) گھروں میں زمین سے لپٹے ہوئے ہو گئے ۹۵ گویا وہ ان میں (کبھی) بسے (ہی) نہ تھے سنو!

بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ○ ۹۶ ع ۱۲/۸

مدین کیلئے بھی (خدا کی جناب سے) دوری (ہو گئی) تھی۔ جیسا کہ ثمود (خدا کی جناب سے) دور ہو گئے تھے ۹۶

اموال کو تباہ کرکے پھر عذاب نہ نازل کر دے اور یہ تجارتیں وغیرہ سب برباد ہو جائیں۔ اور تم لوگ کنگال ہو جاؤ۔

۹۴ حل لغات۔ المکانۃ۔ الموضع۔ المنزلۃ۔ جگہ اور درجہ (اقرب) ارتقب فلانا والشیئ انتظرہ۔ فلاں شخص یا فلاں چیز کا انتظار کیا (اقرب) الرقیب من صفات اللہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ اس جگہ معنی ہیں۔ الحافظ۔ نگران المنتظر۔ منتظر۔ الحارس۔ چوکیدار ابن العم۔ چچا کا بیٹا۔ رقیب الجیش۔ طلیعۃ۔ راستہ کے آگے آگے چلنے والا جو راستہ کی حالت اور اس کے خطرات کی خبر لیتا چلا جاتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی تم اپنے مقام کے لحاظ سے عمل کرتے جاؤ۔ میں اپنی روش کے مطابق عمل کرتا چلا جاؤنگا آخر نتائج بتا دینگے کہ کون اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق عمل کر رہا تھا۔ اور کون اس کے خلاف۔

نبی ہمیشہ یہی کہتے چلے آئے ہیں۔ کہ خدا پر فیصلہ چھوڑو۔ اور انتظار کرو۔ مگر لوگ ہمیشہ اپنے ہاتھ میں ہی فیصلہ رکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ پر نہیں چھوڑتے اور آخر اس کی سزا بھگتتے ہیں۔

مکانۃ

انی معکم رقیب میں بتایا ہے۔ کہ چاہئے تو یہ تھا کہ میں گھبراتا کیونکہ میں مصیبت میں ہوں۔ پھر صاحبیوں کو تم تکلیفیں دیتے ہو۔ لیکن گھبرا تم رہے ہو۔ حالانکہ چاہیئے یہ کہ ہم دونوں خدا کے فیصلے کا انتظار کریں۔

ارتقب

رقیب

۹۵ حضرت شعیب ایسے علاقہ میں۔ تھے۔ کہ جس میں زلزلے بہت کثرت سے آتے ہیں۔ ممکن ہو کہ آیت کے ظاہری الفاظ کے مطابق ان کی قوم پر زلزلہ کا عذاب آیا ہو۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ صیحہ سے مراد عام عذاب ہو۔ اور گھٹنوں کے بل گرے ہوئے کے الفاظ مجازاً استعمال ہوئے ہوں۔ کسی اور عذاب سے اس قوم کی شان و شوکت توڑ دی گئی ہو۔ اور یہ لوگ ذلیل ہو کر اپنے گھروں میں بیٹھ گئے ہوں۔

۹۷ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِلٰى

اور ہم نے موسےٰ کو یقیناً یقیناً اپنے (ہر قسم کے) نشان اور روشن دلیل دے کر بھیجا تھا ۱۲۸ (ہم نے اسے)

فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ

فرعون اور اس کی قوم کے بڑے لوگوں کی طرف بھیجا تھا) تو انہوں نے (ہمارے حکم کے خلاف) فرعون کے حکم کی پیروی کی اور

۹۸ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ۝

فرعون کا حکم ہرگز درست نہ تھا ۱۲۹

سلطٰن

۱۲۸ حل لغات۔ السلطان۔ الحجۃ محکم دلیل۔ تقول له سلطان مبين ای حجۃ۔ یعنی جب کسی کے متعلق کہیں کہ له سلطان مبين تو اس کے معنی یہ ہونگے ہیں کہ اس کے پاس روشن اور محکم دلیل ہے۔ (اقرب)

اس جگہ موسیٰ کے ذکر کے ساتھ بنی اسرائیل کا ذکر کیوں نہیں

تفسیر۔ اس جگہ حضرت موسیٰ ؑ کی بعثت کے اس حصہ پر بحث ہے۔ جو سزا ہی سزا کا رنگ رکھتا تھا۔ یعنی آپ کی بعثت فرعون اور اس کی قوم کی طرف۔ یہ قوم ایمان نہ لائی اور تباہ کردی گئی اور یہی بحث اس سورۃ میں ہے۔ بنی اسرائیل کا ذکر اس سورۃ میں نہیں کیا گیا۔ کیونکہ وہ ایمان لائے اور نعمتوں کے وارث ہوئے۔

فرعون کسی خاص شخص یا خاندان کا علم نہیں

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں فرعون کسی ایک شخص کا نام نہیں تھا بلکہ فرعون شاہان مصر کا لقب ہوا کرتا تھا۔ یعنی وادی نیل اور سکندریہ کا حکمران فرعون کہلاتا تھا۔ یہ اصطلاح رومیوں کے آنے سے پہلے پہلے تھی۔ رومیوں کے آنے پر حکومت غیر ملکیوں میں چلی گئی۔ اور فرعون کا لفظ مٹ گیا۔ کیونکہ ان کے ہاں اپنے الگ القاب تھے۔ دوسرے یہ کہ فرعون کسی ایک ہی خاندان کے بادشاہوں کا نام نہیں تھا۔ بلکہ کئی خاندان گذرے ہیں جنہوں نے تین چار ہزار سال تک حکومت کی ہر کسی خاندان کے دس دس بادشاہ گزرے۔ کسی کے بیس مختلف خاندانوں کے حکمرانوں کو جنہوں نے وادی النیل اور سکندریہ پر حکومت کی یکے بعد دیگرے فرعون کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ فرعون

موسیٰ کے متعلق بائبل اور قرآن کریم کے بیان میں اختلاف

موسیٰ کو ان کی والدہ نے کہاں رکھا تھا۔

فرعون کو بنی اسرائیل کی طرف سے خطرہ کیوں تھا

بھی جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے۔ بنی اسرائیل کی طرح غیر ملکی تھا۔ اور اس لئے وہ بنی اسرائیل کی کثرت اولاد سے ڈرتا تھا۔ اور اسے خوف تھا کہ مبادا وہ ملک کے اصلی باشندوں سے ملکر اس کو ملک سے نکال دیں۔ یا بغاوت و جنگ کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ جیسا کہ خروج باب۱ آیت ۹-۱۰ میں لکھا ہے "اس نے اپنے لوگوں سے کہا۔ دیکھو۔ کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں آؤ ہم ان سے دانشمندانہ معاملہ کریں۔ تا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو ہمارے دشمنوں سے مل جائیں اور ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں"۔ "ہم سے زیادہ" ہونے کا یہی مطلب ہے۔ کہ وہ ہمارے خاندان یا نسل سے زیادہ ہیں نہ یہ کہ وہ تمام اہل ملک سے زیادہ ہیں۔

انہی دنوں میں جبکہ فرعون بنی اسرائیل پر تشدد کر رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ خروج باب ۲ و ۳ میں ان کی پیدائش۔ جوانی اور زندگی کے حالات مذکور ہیں۔ وہ بیان قرآن مجید سے بعض باتوں میں مختلف ہے۔

(۱) بائبل کہتی ہے۔ کہ حضرت موسیٰ ؑ کی والدہ نے ان کو دریا میں نہیں ڈالا تھا۔ بلکہ دریا کے کنارے ایک جھاؤ کے نیچے ایک ٹوکرے میں چھپا دیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے۔ "تو اس نے (یعنی موسیٰ ؑ کی والدہ نے) سرکنڈوں کا ایک ٹوکرہ بنایا اور اس پر لاسا اور رال لگایا اور لڑکے کو اس میں رکھا اور اس

نے اسے دریا کے کنارے پر جھاؤ میں رکھدیا۔" (خروج ۲/۳)

لیکن قرآن مجید سے ثابت ہے۔ کہ انہوں نے اس بچے کو دریا میں ڈالدیا تھا۔ جیسا کہ فرمایا۔ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ۔ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ (طٰہٰ ۲)

(۲) بائبل کہتی ہے۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عبرانی اور مصری کے جھگڑے میں مصری کو عمداً مار ڈالا جیسا کہ لکھا ہے "دیکھا کہ ایک مصری ایک عبرانی کو جو اس (موسیٰ) کے بھائیوں میں سے ایک تھا۔ مار رہا ہے پھر اس نے ادھر ادھر نظر کی اور دیکھا کہ کوئی نہیں۔ تب اس مصری کو مار ڈالا اور ریت میں چھپا دیا۔" (خروج ۲/۱۱و۱۲)

مگر قرآن مجید فرماتا ہے۔ فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ (قصص ۲) یعنی حضرت موسیٰ ؑ نے مصری کو صرف تنبیہ کے طور پر ایک مکا مارا ان کا ارادہ قتل کا نہ تھا۔ مگر وہ اتفاقاً مر گیا۔ گویا بائبل حضرت موسیٰ ؑ کو قاتل قرار دیتی ہے۔ مگر قرآن مجید ان کی بریت کرتا ہے۔

(۳) بائبل کہتی ہے۔ کہ پہلے دن کے جھگڑے کے بعد دوسرے دن حضرت موسیٰ ؑ نے دو عبرانیوں کو لڑتے دیکھا چنانچہ لکھا ہے۔ "تب وہ دوسرے دن باہر گیا۔ تو کیا دیکھتا ہے۔ کہ دو عبرانی آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ تب اس نے اس کو جو ناحق پر تھا۔ کہا کہ تو اپنے یار کو کیوں مارتا ہے۔ وہ بولا کس نے تجھے ہم پر حاکم یا منصف مقرر کیا۔ کیا تو چاہتا ہے کہ جس طرح تو نے اس مصری کو مار ڈالا مجھے بھی مار ڈالے۔" (خروج ۲/۱۳و۱۴)

کیا دوسرے دن جھگڑنے والے دونوں عبرانی تھے۔

مگر قرآن مجید فرماتا ہے۔ کہ دوسرے دن بھی ایک مصری اور ایک عبرانی ہی لڑ رہے تھے۔ جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے۔ فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ۔ قَالَ لَهٗ مُوْسٰٓى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ۔ فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ (قصص ۲)

کیا مجھے نے مصری کو دانستہ قتل کیا تھا۔

حضرت شعیب کی لڑکیوں کے گلہ کو پانی پلانے کا واقعہ

(۴) بائبل کہتی ہے۔ کہ جب حضرت موسیٰ ؑ فرعون سے بھاگ کر مدین پہنچے۔ تو انہیں مندرجۂ ذیل واقعہ پیش آیا "اور مدیان کے کاہن کی سات بیٹیاں تھیں۔ وہ آئیں اور پانی نکالنے لگیں اور کٹھروں کو بھرا۔ تاکہ اپنے باپ کے گلے کو پانی پلائیں۔ تب گڈریوں نے آ کے انہیں ہانکا لیکن موسیٰ نے کھڑے ہو کر ان لڑکیوں کی مدد کی اور ان کے گلے کو پانی پلایا"۔ (خروج باب ۲ آیت ۱۶ و ۱۷)

مگر قرآن مجید کا بیان اس سے مختلف ہے۔ قرآن مجید اس واقعہ کو یوں بیان فرماتا ہے۔ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۔ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۔ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ۔ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (قصص ع ۳) کہ جب حضرت موسیٰ ؑ مدین کے پانی پر وارد ہوئے۔ تو انہوں نے دیکھا کہ لوگوں کا ایک گروہ (اپنے مویشیوں کو) پانی پلا رہا ہے۔ اور دو لڑکیاں اپنے گلے کو پرے روکے کھڑی ہیں۔ حضرت موسیٰ ؑ نے ان سے پوچھا۔ تم الگ کیوں کھڑی ہو۔ انہوں نے جواب دیا۔ کہ جب چرواہے چلے جائیں گے تب ہم پانی پلا سکیں گی کیونکہ ہمارا باپ بوڑھا اور عمر رسیدہ ہے۔ اس جگہ پر قرآن مجید کی تعلیم کیا ہی اعلیٰ اخلاق والی اور پاکیزہ ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ

ان لڑکیوں کا پرے رہنا ان کی شرم کی وجہ سے تھا۔ اس بیان میں قرآن مجید تورات سے کئی باتوں میں اختلاف کرتا ہے۔

(الف) بائبل کہتی ہے۔ مدین کے کاہن کی سات بیٹیاں پانی پر آئیں۔ اور قرآن مجید فرماتا ہے۔ دو لڑکیاں آئی تھیں۔ (ب) بائبل کہتی ہے لڑکیوں نے گھڑوں کو پانی کر بھرا۔ اور چرواہوں نے آکر ان کو روکا۔ اور قرآن مجید فرماتا ہے۔ وہ لڑکیاں آگے نہیں بڑھیں بلکہ شرم کے مارے گلے کو روکے کھڑی رہیں (ج) بائبل کہتی ہے حضرت موسیٰؑ نے گڈریوں کا مقابلہ کیا اور لڑکیوں کی مدد کی اور ان کے جانوروں کو پانی پلایا۔ اور قرآن مجید فرماتا ہے مقابلہ وغیرہ کوئی نہیں ہوا۔ ہاں حضرت موسیٰؑ نے اسی دوران میں ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا۔

حضرت موسیٰ کا ید بیضا کیا مبروص تھا؟

(۵) بائبل کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا۔ کہ بنی اسرائیل کو سرزمین مصر سے نکال لا۔ مگر شاہ مصر کو یہ بتلانا۔ کہ ہم بھاگ رہے ہیں۔ بلکہ لکھا ہے۔ کہ تو اور اسرائیلیوں کے بزرگ مصر کے بادشاہ کے پاس آیو اور اسے کہیو۔ کہ خداوند عبرانیوں کے خدا نے ہم سے ملاقات کی اور اب ہم تیری منت کرتے ہیں۔ ہم کو تین دن کی راہ بیابان میں جانے دے۔ تاکہ ہم خداوند اپنے خدا کے لئے قربانی کریں۔" (خروج ۳/۱۸) گویا ایک طرح سے دھوکہ کی تعلیم دی ہے۔ مگر قرآن مجید صاف کہتا ہے۔ کہ تم اس کے پاس جاکر یہ کہنا۔ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (طٰہٰ ع ۲) کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ اور اس لئے آئے ہیں۔ کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔

کیا حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو دھوکہ دیکر بنی اسرائیل کو نکالا تھا۔

کیا حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰ کے مادری یا حقیقی بھائی نہ تھے؟

(۶) بائبل کہتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا۔ ہر ایک عورت اپنی پڑوسن سے اور اس سے جو اس کے گھر میں رہتی ہے۔ روپے اور سونے کے برتن اور لباس عاریت لے گی۔ اور تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے۔ اور مصریوں کو غارت کرو گے" (خروج ۳/۲۲)

کیا بنی اسرائیل کو لوگوں کے زیورات لے جانے کا حکم دیا گیا تھا۔

مگر قرآن مجید فرماتا ہے۔ کہ ہم نے انہیں نہیں کہا تھا۔ کہ زیور ساتھ لے آنا۔ بلکہ وہ خود ہی لے آئے تھے۔ اور یہ ان کی خیانت اور غداری تھی۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْكَوْمِ (طٰہٰ ع ۴) جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ اس دھوکہ کے خود ذمہ وار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا۔

(۷) بائبل میں حضرت موسیٰؑ کے معجزۂ ید بیضاء کے متعلق لکھا ہے۔" چنانچہ اس نے اپنا ہاتھ اپنی چھاتی پر چھپا کے رکھا۔ اور جب اس نے اُسے نکالا۔ تو دیکھا۔ کہ اس کا ہاتھ برف کی مانند سفید مبروص تھا" (خروج ۴/۶) یعنی ہاتھ سفید تھا۔ مگر برص کے عیب کی وجہ سے وہ ایسا تھا اور قرآن مجید فرماتا ہے وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى (طٰہٰ ع ۱) کہ وہ ہاتھ بیشک روشن اور چمکیلا تھا مگر کسی بیماری کی وجہ سے ایسا ہرگز نہ تھا بلکہ ایک نشان کے طور تھا

(۸) بائبل حضرت ہارون کے متعلق کہتی ہے۔ کہ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے خاندان بنی لاوی کا ایک فرد ہونے کی رو سے اُن کے بھائی تھے۔ نہ حقیقی یا مادری بھائی۔ چنانچہ لکھا ہے۔" اس خدا نے کہا کیا نہیں ہے لاویوں میں سے ہارون تیرا بھائی۔ میں جانتا ہوں۔ کہ وہ فصیح ہے"۔ (خروج ۴/۱۴) مگر قرآن مجید حضرت ہارونؑ کو موسیٰؑ کا سگا بھائی یا ماں کی طرف سے بھائی بتاتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۔ (طٰہٰ ع ۵) کہ حضرت ہارون نے حضرت موسیٰؑ سے عرض کیا۔ اے میری ماں کے بیٹے۔ میری ڈاڑھی اور میرے سر کے بالوں کو نہ پکڑ۔

(۹) بائبل بچھڑے کو معبود بنانے میں حضرت ہارون کو بنی اسرائیل کا شریک بلکہ اس شرک کا بانی قرار دیتی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔ "اور خداوند نے ان کے بچھڑے بنانے کے سبب جسے ہارون نے بنایا تھا۔ لوگوں پر مری بھیجی" (خروج ۳۲/۳۵) مگر قرآن مجید حضرت ہارونؑ کو اس قسم کے عیب سے بری قرار دیتا ہے۔ بلکہ فرماتا ہے وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۖ وَ

وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے (آگے) چلیگا اور ان کو (دوزخ کی) آگ میں (جا) اتاریگا اور

بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝ ۹۹

وہ (ان کے) اترنے کا گھاٹ بہت (ہی) برا ہے ۹۹ؐ

مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ (طٰہٰ ۶)

یعنی حضرت ہارون نے ان لوگوں کو بچھڑے کی عبادت سے منع کیا تھا۔ ان اختلافات کے متعلق ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے خود مسیحی کتب ہی بائیبل کے بیانات کو مخدوش قرار دیتی ہیں۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں موسیٰ ؑ کے لفظ کے ماتحت لکھا ہے۔ کہ موسوی تعلیم کا بہت سا حصہ بطور خلاصہ موسیٰ کی کتاب میں آگیا ہے۔ نیز ہارون کے شرک کے واقعہ کو بھی اس نے غلط قرار دیا ہے۔ اور اس سے یہ بھی استدلال کیا ہے۔ کہ بائیبل میں کئی واقعات بعد میں بڑھا دیئے گئے ہیں۔

بہرحال عقل اور جدید تحقیق دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ قرآن کریم کا بیان گو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دو ہزار سال بعد شائع ہوا درست ہے اور بائیبل جسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ موسیٰ کے وقت میں لکھی گئی اس کا بیان مشکوک ہے۔

حضرت موسیٰ کا نام موسیٰ کیوں رکھا گیا۔ اس کی وجہ بائیبل نے یہ بتائی ہے۔ کہ انہیں پانی سے بچایا گیا تھا۔ خروج ؑ آیت ۲ لیکن تعجب یہ ہے کہ باوجود اس کے تورات ان کے پانی سے نکالنے کی منکر ہے لیکن قرآن کریم اس واقعہ کی تائید کرتا ہے۔

ہارون کے معنی عبرانی زبان میں کوئی نہیں۔ موجود محققین کہتے ہیں کہ شمالی عرب کی زبانوں میں سے یہ نام ہے (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس وقت تک عبرانی لوگ اپنی اصلی زبان یعنی عربی سے تعلق رکھتے تھے۔

۹۹ؐ حل لغات۔ قَدَمَ۔ القَوْمَ۔ يَقْدُمُ قَدْمًا وَقُدُوْمًا۔ سَبَقَهُمْ۔ ان سے آگے نکل گیا۔ فلانٌ علیٰ قِرْنِهٖ شَجُعَ واجْتَرَءَ علیہ اپنے دشمن پر دلیری سے حملہ کیا۔ قَدِمَ عَلَى العيب يقدَم رضی بہ عیب پر راضی ہوگیا۔ من سفرہٖ عاد۔ سفر سے واپس آیا۔ قالبلد اتاہ شہر میں آیا۔ (اقرب) اَوْرَدَہٗ ایرادًا احضرہ للورد۔ ثم استعمل لمطلق الاحضار۔ اَوْرَدَ کے اصل معنی ہیں گھاٹ پر لایا۔ لیکن بعد میں مطلق حاضر کرنے کے معنی میں بھی بکثرت استعمال ہونے لگ گیا ہے۔ اس کا ثلاثی وَرَدَ يردُ ورودًا ہے۔ کہتے ہیں۔ وَرَدَ البَعِيْرُ وغيرُہُ الماءَ وغيرہ بلغه ووافاه من غير دخول۔ وقد يحصل دخول فيه۔ وقد لا يحصل یعنی یہ لفظ اونٹ وغیرہ کے پانی وغیرہ پر جانے کے معنی دیتا ہے۔ خواہ وہ اس کے اندر گئے ہوں یا نہ۔ وَرَدَ زيدٌ الماءَ خلاف صدر عنه ورد کے معنی پانی کی طرف جانے کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) الورد۔ العطش پیاس۔ الابل الواردة۔ اونٹ جو پانی پر آئیں۔ الجيش۔ لشکر۔ الماء الذی یورد۔ گھاٹ۔ القوم يَرِدُونَ الماءَ پانی پر وارد ہونے والی جماعت۔ النصيب من الماء پانی کا حصہ (اقرب) المورد۔ گھاٹ۔ پانی پینے کے لئے اترنے کی جگہ۔

تفسیر۔ یعنی عقلمند انسان تو اس چیز کی پیروی کرتا ہے جو اسے صحیح راستہ دکھائے اور اس کے لئے مفید ہو۔ لیکن فرعون کی ہدایت اس کے برخلاف ہلاکت کی طرف لیجاتی تھی۔

قدم

ایک نئی تحقیق

اَوْرَدَ

وَأُتْبِعُوا فِي هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ بِئْسَ

اور اس دنیا میں (بھی) لعنت ان کے پیچھے لگا دی گئی ہے۔ اور قیامت کے دن (بھی لگا دی جائیگی) یہ عطا جو (انہیں)

۱۰۰ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ○

دی جانے والی ہے بہت (ہی) بری ہے ۱۶۵

مگر پھر بھی یہ لوگ اس کے پیچھے چلتے تھے۔ اَوْرَدَهُمُ النَّارَ میں بتلایا کہ قوم نے فرعون کا ساتھ دیکر کیا نتیجہ حاصل کیا۔ بجائے کہ اس نے ان کو دوزخ میں لا ڈالا۔ اور یہ گھاٹ نہایت ہی خطرناک گھاٹ ہے۔ اورد کا لفظ اصل میں پانی پر وارد کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ مگر اس جگہ پر یہی لفظ آگ کے لئے استعمال کر کے اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ پانی جو روحانی اور جسمانی حیات کا باعث ہے (چنانچہ فرمایا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ) اس کی بجائے انہیں آگ دی جائیگی جو حیات کو تباہ کرنے والی ہے۔ اور اس طرح ان کی اپنی کوششیں جو بجائے روحانی حیات کے حصول کے اس کے تباہ کرنے میں خرچ ہوتی تھیں ان کے لئے متشکل ہو جائیں گی۔ پھر اس کے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ داخل تو آگ میں ہونگے۔ مگر یہ داخلہ اسی طرح ہوگا۔ جس طرح یہاں پیاسا پانی پر جاتا ہے یعنی اس ذریعہ سے بھی آخر ان کی روحانی پیاس بجھ جائیگی۔ یعنی آگ اُن کے پاک کرنے کا موجب ہو جائیگی اور آخر وہ اس راستہ سے گزر کر اپنی روحانی پیاس کو بجھانے میں کامیاب ہو جائینگے۔

پرانے زمانہ میں داغ دینے کی رسم ہوا کرتی تھی۔ یعنی جانور کے منہ پر یا پہلو میں نشان لگایا کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بہت ناپسند فرمایا۔ لیکن چونکہ علاج کے طور پر بھی داغ دیا جاتا تھا۔ فرمایا کہ اٰخرالدواء الکیّ کہ دوا کے طور پر بھی استعمال کرنا پڑے تو آخری علاج کے طور پر داغ کو استعمال کرو۔ ایسا ہی یہاں فرمایا۔ کہ پانی کی بجائے انکی پیاس کا علاج آگ سے کیا جائیگا۔ اور وہ انکا آخری اور انتہائی علاج ہوگا۔

دفد

پانی کی بجائے آگ

لعنت کا مفہوم

رفد سے مراد

۱۶۵ حل لغات۔ رفدہ یَرْفِدُ رَفْدًا۔ اعطاہ اعزاہ۔ اعانہ۔ اس کی مدد کی۔ اور یہی معنی اس لفظ کے اس محاورہ میں ہیں کہ "هو نعم الرافد اذا حل به الوفد" یعنی فلاں شخص کے پاس جب کوئی (طالب امداد) آتا ہے تو وہ اس کی خوب ہی امداد کرتا ہے۔ الرفد العطآء والصلۃ رفد کے معنی بخشش اور انعام کے ہوتے ہیں۔ واصل الرفد ما یضاف الی غیرہ لیعمدہ یعنی اصل میں رفد اس چیز کو کہتے ہیں جسے کسی دوسری چیز کو سہارا دینے کے لئے کھڑا کیا جائے۔ یعنی ٹیک وفی القرآن بئس الرفد المرفود۔ ای العَوْن المعان والعطاء المُعطیٰ۔ اور قرآن کریم میں جو بئس الرفد المرفود آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں مدد جو دی گئی۔ یا بخشش جو کی گئی (اقرب)

تفسیر۔ یعنی بُرے آدمی کے پیچھے لگ کر انسان اس دنیا میں بھی ذلیل ہوتا ہے۔ اور اگلے جہان میں بھی۔ لعنت سے مراد اس جگہ گالی نہیں ہے۔ بلکہ یہاں اس کے اصل معنی یعنی دوری مراد ہے۔ اور مطلب یہ ہے۔ کہ اس دنیا میں بھی وہ خدا سے دور رہے اور اگلے جہان میں بھی دور ہی رہینگے۔

یہ بھی ممکن ہے۔ کہ الرفد سے مراد اس جگہ فرعون ہو۔ یعنی انہوں نے جو خدا کے مقابلہ میں فرعون کا سہارا لیا تھا۔ وہ کیسا بُرا ثابت ہوُا۔ جس کی وجہ سے یہ اب تک عذاب دیکھ رہے ہیں۔ کیونکہ انکا سہارا یعنی فرعون خود بھی جہنم میں گرا اور ان کو بھی اس نے جہنم میں لا ڈالا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ

یہ (تباہ شدہ) بستیوں کی خبروں میں سے (ایک حصہ) ہی ہم اُسے تیرے پاس بیان کرتے ہیں۔ انہیں سے بعض (بستیاں ابھی تک

وَّحَصِيْدٌ ۝ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ۱۰۱

موجود) کھڑی ہیں اور بعض کٹی پڑی ہیں ۱۰۱؎ اور ہم نے ان پر (کوئی) ظلم نہیں کیا (تھا) بلکہ انہوں نے (خود ہی) اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

پھر جب تیرے رب کا (عذاب کا) حکم آگیا۔ تو ان کے معبودوں نے جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارا کرتے تھے۔ انہیں کچھ بھی فائدہ

مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ۝ ۱۰۲

نہ دیا۔ اور سوائے تباہی میں ڈالنے کے انہوں نے (کسی بات میں) انہیں نہ بڑھایا ۱۰۲؎

۱۰۱؎ حل لغات۔ حصد۔ یَحْصُدُ ویَحْصِدُ حَصْدًا وحِصَادًا۔ قطعہ بالمنجل درانتی سے کاٹا۔ القوم بالسیف قتلھم۔ تلوار سے قتل کیا۔ الرجل مات۔ جب لازم استعمال ہو۔ تو اس کے معنی ہوتے ہیں مر گیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس جگہ پر القریٰ سے دو چیزیں مراد ہو سکتی ہیں (۱) اھل القریٰ یعنی بستیوں میں رہنے والے جیسا کہ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا (یوسف ع ۱۰) اس بستی والوں سے پوچھ لے۔ اس صورت میں قائم سے مراد وہ قومیں ہونگی۔ جن کی نسلیں باقی رہ گئی ہیں۔ اور حَصِيْد سے مراد وہ قومیں۔ جن کی نسلیں بھی اب بالکل یا قریباً نابود ہو گئی ہیں (۲) خود بستیاں اور اس صورت میں اس آیت کے یہ معنی ہونگے۔ کہ بعض شہروں کے نشان ابھی تک موجود ہیں۔ اور بعض کے نشانات بھی مٹ چکے ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک تاریخی نتیجہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جن قوموں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ ان میں سے بعض کے آثار اب تک باقی ہیں۔ اور بعض کے آثار کا پتہ نہیں چلتا۔ اس صورت میں اگر بعض بستیوں کے آثار نہ ملیں۔ تو

یورپ والوں کو یہ اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ کہ قرآن مجید کی بات غلط ہے۔ کیونکہ قرآن کریم تو خود کہتا ہے۔ کہ بعض ان میں سے بے نشان ہو چکی ہیں۔ ہاں اگر مل جاویں تو پھر بھی قرآن مجید پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ حَصِيْد کے ایک معنے درانتی سے کٹے ہوئے کے بھی ہوتے ہیں۔ اور درانتی سے کاٹنے کی صورت میں جڑیں باقی رہ جاتی ہیں پس اگر مٹے ہوئے نشان مل بھی جائیں تب بھی کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا۔

۱۰۲؎ حل لغات۔ تَبَّبَهٗ اھلکہ۔ اسے ہلاک کر دیا (اقرب)

تفسیر۔ قرآن مجید متواتر اس بات پر زور دیتا ہے۔ کہ جن لوگوں کو بھی ہم نے سزا دی ہے۔ اس سزا کا باعث خود ان کے اعمال تھے۔ ہماری طرف سے ظلماً یہ بات صادر نہیں ہوئی۔ اس طرح زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا۔ کہ آئندہ تقدیر کے مسئلہ کے ماتحت خدا تعالیٰ پر ظلم کا الزام لگایا جائیگا قریباً ہر مقام پر جہاں جہاں سزا کا ذکر آیا ہے۔ یہ مضمون ساتھ ہی بیان کیا گیا ہے۔ گویا خدا تعالیٰ اس قسم کی تقدیر سے انکار کرتا ہے۔ کہ وہ بلا وجہ ایک قوم کو ترقی دیتا اور دوسری کو تباہ کر دیتا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ یہ بھی بتاتے ہیں کہ

حصد

[illegible]

تتبیب

قائم وحصید کے معنی

سزا اعمال بد کا نتیجہ ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ

اور تیرے رب کی گرفت جب وہ بستیوں کو اس حالت میں کہ وہ ظلم (پر ظلم) کر رہی ہوں پکڑتا ہے ایسی

۱۰۳ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝

طرح پر (اتمام حجت کے بعد) ہوا کرتی ہے۔ اس کی گرفت یقیناً دردناک (اور) سخت ہوتی ہے [۱۴۳]

یہ عذاب اور سزائیں سزایافتہ لوگوں کے افعال و اعمال کا مناسب حال اور طبعی نتیجہ تھیں۔

مَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمْ کے معنی

مَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمْ سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ دوسری چیزیں مثلاً آگ پانی ہوا وغیرہ تو ان کو نفع دے جاتی ہیں۔ مگر ان کے معبودان کو کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کفار کی تلواروں نے تو بعض صحابہ کو شہید بھی کیا۔ مگر مکہ کے بتوں نے تو کچھ نہ کیا۔ فرمایا یہ عجیب بیوقوفی ہے کہ جو چیزیں کوئی بھی نفع نہیں دیتیں ان کو یہ لوگ خدا بناتے ہیں۔

بتوں کی حقیقت الٰہی فیصلہ صادر ہونے پر ظاہر ہوگی۔

لَمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اصل حقیقت اسی وقت ظاہر ہو سکتی ہے۔ جب خدا تعالیٰ بتوں کا پول کھولنے کا فیصلہ کرے۔ ورنہ اس سے پہلے پہلے تو کئی قسم کے فوائد لوگ معبودانِ باطلہ کی طرف منسوب کرتے رہتے ہیں۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آجاتا ہے۔ تو پھر کسی کے بنائے کچھ نہیں بنتی اور شرک کی حقیقت کھل جاتی ہے۔

بت کن معنوں میں کوئی ضرر نہیں پہنچاتے

قرآن مجید ایک طرف تو یہ فرماتا ہے کہ بت ان کو نہ کوئی ضرر پہنچاتے ہیں نہ نفع۔ مگر مَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بت ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ سو اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ضرر دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک اختیاری ضرر ہوتا ہے۔ جیسے کوئی انسان جان بوجھ کر کسی کو تکلیف پہنچائے۔ اور ایک بلا اختیار جیسے کوئی مکان گر جائے اور اس کے نیچے کوئی دب جائے۔ جس میں اس مکان کے ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے ایک طبعی فعل کا ایک طبعی نتیجہ نکل رہا ہوتا ہے۔ جس سے لوگوں کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

ان دونوں قسم کے نقصانوں کو سمجھ لینے کے بعد اس بات کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ کہ جس جگہ قرآن مجید میں یہ فرمایا ہے۔ کہ غیر اللہ معبود کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے اس جگہ ضرر سے مراد پہلی قسم کا ضرر ہے۔ اور جس جگہ یہ فرمایا ہے۔ کہ ان سے تعلق ہلاکت کا موجب ہوتا ہے۔ وہاں دوسری قسم کا ضرر مراد ہے۔ اور اس میں کیا شک ہے۔ کہ بلا ارادہ ضرر تو سب سے زیادہ معبودانِ باطل سے ہی پہنچتا ہے۔ کیونکہ سب سے بڑا جرم شرک ہی ہے۔

فتح مکہ کے وقت جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ فلاں فلاں اشرار کو پناہ نہیں دی جاوے گی۔ تو وہ لوگ دوڑ کر خانہ کعبہ کے غلاف کو چمٹ گئے۔ اور اس کے اندر چھپ گئے۔ مگر وہ وہیں مارے گئے۔ اگر ان کو یہ خیال نہ ہوتا کہ بت ان کی کوئی مدد کریں گے۔ تو ممکن تھا کہ بھاگ کر بچ جاتے۔ پس غَيْرَ تَتْبِيْبٍ میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ کہ شرک کی وجہ سے مشرکوں کی تدابیر میں سستی آجاتی ہے۔

[۱۴۳] اس آیت میں ان تمام واقعات کے بیان کرنے کی غرض بتائی ہے۔ جو اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اور بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب جب کسی قوم پر نازل ہوتا ہے۔ تو اس کے نام و نشان تک کو مٹا دیتا ہے۔ اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیئے۔ اور ایسے طریق اختیار نہیں کرنے چاہئیں جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کو ان پر کھینچ لائیں۔

ظالم کے معنی مشرک

اس آیت میں ظَالِمَةٌ کے معنی مُشْرِكَةٌ کے ہیں

إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ ۚ ذٰلِكَ

جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہو اس کے لئے (خدا تعالیٰ کی) اس (گرفت) میں یقینا یقینا ایک (عبرت انگیز) نشان (پایا جاتا) ہے یہ ایک

يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ ۝ ۱۰۴

ایسا دن (آنیوالا) ہے جسکے لئے لوگوں کو جمع کیا جائیگا۔ اور یہ آمنے سامنے ہونے کا دن ہوگا ۱۰۴؎

اور ان معنوں میں یہ لفظ قرآن کریم میں متعدد جگہ استعمال ہوا ہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معنی ثابت ہیں اور مراد یہ ہے کہ جسوقت کسی قوم میں سے حقیقی توحید مٹ جاتی ہے۔ اسوقت اسپر جو عذاب آتا ہے۔ وہ بہت زیادہ تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ اور جو تباہی طبعی اسباب تنزل کے ماتحت آتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ آتی ہے۔

۱۰۴؎ اس آیت کے متعلق یہ سوال ہو سکتا ہے۔ کہ جب نشان کو دیکھ کر وہی شخص آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ جو پہلے ہی اس سے ڈرنیوالا ہوتا ہے۔ اور جو پہلے سے ڈرنیوالا نہیں ہوتا۔ وہ اس نشان کو دیکھکر بھی نہیں ڈرتا۔ تو اس صورت میں اس عذاب کا کیا فائدہ ہوا۔ اس سوال کے جواب میں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہاں آیت سے مراد قیامت کا ثبوت نہیں ہے۔ بلکہ اس کا نصیحت کا موجب بننا مراد ہے۔ اور اس میں کیا شک ہے۔ کہ قیامت سے نصیحت وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں۔ کہ جو اُخروی عذاب پر ایمان رکھتے ہوں۔ پس چونکہ اس جگہ سے مضمون مومنوں کی طرف پھرنیوالا تھا۔ اس لئے فرمایا کہ عذابوں کو دیکھکر ان کے دل میں آخرت کے عذاب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور وہ خشیت کی وجہ سے اگلے جہان کے لئے اور زیادہ محنت اور کوشش شروع کر دیتے ہیں یعنی وہ دنیوی سزا کو دیکھ کر اس پر اُخروی عذاب کو قیاس کر لیتے ہیں۔

مَجْمُوعٌ لَّهُ النَّاس۔ لوگ اس دن کی خاطر جمع کئے جائیں گے۔ مطلب یہ کہ وہ دن اپنی ذات میں انسانی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ اسوجہ سے وہ کسی اور مقصد کا ذریعہ نہیں۔ بلکہ خود مقصود ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک مقررہ دن میں کل مخلوق کو جمع کرنا بلا سبب نہیں اور نہ اتفاقاً ہے۔ بلکہ خاص مقصد کے ماتحت ہے۔ اور بالارادہ ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ اس دن ہر اک چیز نمایاں ہو جائیگی اصل بات یہ ہے۔ کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسی انسان کا کوئی فعل بھی اس کا خالص ذاتی فعل نہیں ہوتا۔ بلکہ تمام انسانی افعال پہلے انسانوں یا پہلے حالات یا اپنے ہم صحبتوں یا ان کے حالات اور اپنے بعد آنے والوں اور انکے حالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور ہر فعل کے اچھا یا برا قرار دینے میں یا زیادہ یا کم اچھا یا بُرا قرار دیتے وقت ان حالات اور تاثیروں کا لحاظ ضروری ہوتا ہے مثلاً ایک انسان جرم کا عادی ہو۔ لیکن اس کے جرم میں اس کے دماغ کی بناوٹ کا دخل ہو۔ جو بناوٹ اسے کسی پچھلے بزرگ سے جو مجنون یا نیم مجنون ہو۔ ورثہ میں ملی ہو۔ اس صورت میں اس مجرم کے افعال کا اندازہ خود اس کے اپنے افعال کو دیکھ کر نہیں لگایا جا سکتا۔ جب تک اس کے مورث اعلیٰ کی دماغی حالت ہمارے سامنے نہ ہو۔ ہم اس کے افعال کی قیمت لگانے میں ضرور غلطی کرینگے۔ پس انسانی اعمال کی حقیقت کے پورے انکشاف کے لئے اور دوسرے لوگوں کو یہ تسلی دلانے کے لئے کہ مختلف انسانوں کی سزا اور جزاء میں جو بظاہر غیر واجب تفاوت نظر آتا ہے۔ وہ تفاوت ظلماً نہیں۔ بلکہ ان کے صاحب اختیار ہونے یا نہ ہونے کے سبب سے ہی ہے اسلیئے ضروری ہے کہ ایک دن ایسا آئے کہ جس

تہ لمن خاف عذاب الآخرۃ اور اس کے معنی

مجموع لہ الناس کے معنی

۱۰۵ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ۝ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ

اور ہم اسے صرف ایک گنی ہوئی میعاد تک پیچھے ڈال رہے ہیں ۱۰۵ جس وقت وہ آئیگی کوئی شخص اس (خدائے برتر)

۱۰۶ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ

کے اذن کے سوا کلام نہیں کر سکیگا۔ پھر ان میں سے (بعض) بدبخت (ثابت) ہونگے اور (بعض) خوش نصیب ۱۰۶ پس جو بدبخت

۱۰۷ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۝

(ثابت) ہونگے وہ آگ میں (داخل) ہونگے۔ اسمیں (کسی وقت) انکے لمبے سانس نکل رہے ہونگے اور (کسی وقت) ہچکی کیمانند سانس ۱۰۷

میں سب کے سب بنی نوع انسان اپنے تمام حالات سمیت جمع ہوں تاکہ ہر اک شخص کے تمام افعال کے علل و اسباب نظروں کے سامنے ہوں اور سزا اور جزا کے وقت اس کو بھی اور دوسروں کو بھی معلوم ہو جائے۔ کہ سزا یا جزا دیتے وقت پورے انصاف سے کام لیا گیا ہے۔

لام جارہ

۱۰۵ حل لغات للام الجارّۃ اثنان وعشرون معنیً لام جارہ کے بائیس معنی ہیں۔ الثامن موافقۃ اِلٰی آٹھویں معنے اس کے اِلٰی والے ہیں یعنی تک (اقرب)

کونسی اجل ٹل سکتی ہے اور کونسی نہیں ٹل سکتی۔

تفسیر۔ اجل دو قسم کی ہوا کرتی ہے (۱) جو ٹل سکتی ہو (۲) جو ٹل نہیں سکتی۔ جو اجل ٹل سکتی ہے۔ اس کے لئے ایک دائرہ مقرر ہوتا ہے۔ وہ اس دائرہ سے تو آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کے اندر حالات کے ماتحت گھٹ بڑھ سکتی ہے۔ جیسے انسانی عمر کا دائرہ ہے۔ ایک مقررہ میعاد کے اندر تو کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ مگر اس میعاد سے آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔ وہ اجل جو کسی صورت میں نہیں ٹل سکتی۔ وہ دنیا کی تباہی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ وہ مقرر ہے۔ معدود ہے اور اٹل ہے۔

اِلَّا باذنہ کے معنی

۱۰۶۔ الا باذنہ یعنی وہ جزا کا وقت ہوگا۔ اور اس وقت عدالت قائم کی جائے گی اور بجز اذن الٰہی کے کوئی کلام نہیں کرے گا۔ یہ مطلب نہیں کہ جس طرح اس دنیا کی عدالتوں میں افسر مجاز سے اجازت حاصل کیے بغیر بولنے کی اجازت نہیں ہوتی اگلے جہان میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ اس دنیا میں تو اس لئے اجازت نہیں ہوتی۔ کہ ایک ہی وقت میں کئی آدمی بول کر شور نہ ڈالدیں۔ مگر خدا تعالےٰ کے سامنے یہ دقت نہیں ہے۔ پس مطلب یہ ہے۔ کہ کوئی شخص بغیر ارشاد الٰہی کے بولے گا ہی نہیں۔ کیونکہ ہر اک نفس جانتا ہوگا۔ کہ عالم الغیب خدا کے سامنے کچھ عذر پیش کرنا فضول ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے کامل رحم سے کام لے کر خود لوگوں کی وکالت کرے گا۔ اور انہیں ان امور کو سامنے لانے کا ارشاد فرمائیگا جو ان کی ذات کے لئے یا انکے ساتھیوں کی نجات کیلئے جرم کی تخفیف یا نیکی کی عظمت ظاہر کرنے کا موجب ہوں۔ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ۔ شقی وہ ہے جس کے اندر نیکی کا مادہ نہ ہو۔ اور اس کا قلب نیکی کی تحریک سے متاثر نہ ہو۔ اور سعید وہ ہے۔ جس میں نیکی کا مادہ ہو۔ اور نیکی کی تحریک سے متاثر ہونے والا ہو۔ اس دن شقی کی اہانت اور سعید کا اعزاز ظاہر کیا جائے گا۔

زفیر

۱۰۷ حل لغات۔ زَفِیْرٌ مصدر ہے زَفَرَ۔ یزفِر۔ زَفْرًا وزفیرًا۔ اَخْرَجَ نَفْسَہٗ بعد مَدِّہٖ ایاہ۔ لمبا سانس کھینچکر ہوا باہر نکالی۔ النار سمع صوت یتوقدھا آگ زور سے بھڑکی جس کے شعلوں سے آواز پیدا ہوئی۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ

درانحالیکہ وہ اس میں رہینگے جب تک کہ آسمان اور زمین قائم ہیں۔ سوائے اس (عرصہ) کے جو تیرا رب چاہے

رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝ وَاَمَّا الَّذِیْنَ ۱۰۸

تیرا رب جو چاہتا ہے یقیناً اسے کرکے رہتا ہے ۱۵۰ اور جو خوش نصیب (ثابت) ہونگے

سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ

وہ جنت میں ہونگے درآنحالیکہ وہ اس میں رہینگے جب تک کہ آسمان اور زمین قائم ہیں

وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ۝ ۱۰۹

سوائے اس (وقت) کے جو تیرا رب چاہے (یہ ایسی) عطا ہے جو (کبھی) کاٹی نہیں جائے گی ۱۵۱

والزفیر۔ الداھیۃ۔ نیز زفر کے معنی بڑی مصیبت کے ہیں و اول صوت الحمار۔ اور گدھے کی آواز کے پہلے حصے کو بھی اس کے بولنے کے وقت جو اسکی ایک لمبی آواز پیدا ہوتی ہے اسے بھی زفیر کہتے ہیں (اقرب) شَهَقَ الرجل یشھق شھیقًا تردد البکاءُ فی صدرہ۔ ہچکیاں لے لے کر رویا شھیق الحمار۔ اٰخر صوتہ۔ گدھے کی آواز کا پچھلا حصہ یعنی جو چھوٹی چھوٹی آوازوں کا مجموعہ آخر میں سنائی دیتا ہے (اقرب)

تفسیر۔ قرآن مجید نے کفار کے لئے زفیر اور شہیق کے الفاظ استعمال کرکے انہیں گدھے سے مشابہت دی ہے۔ جس کی ایک وجہ تو قرآن کریم میں دوسری جگہ یہ بتائی ہے کہ جس طرح گدھے پر کتابیں لادو تو وہ عالم نہیں ہوجاتا۔ بلکہ ویسا کا ویسا ہی رہتا ہے۔ اسیطرح صداقت سے غافل لوگ ہوتے ہیں۔ کہ ظاہری علم تو انہیں حاصل ہوتا ہے۔ لیکن عرفان اور روحانیت سے وہ بالکل خالی ہوتے ہیں۔

پھر گدھا بے وقوفی کے لحاظ سے بھی مشہور ہے۔ اور قرآن مجید نے گدھے کی بزدلی کا بھی ذکر فرمایا ہے جیسے آتا ہے۔ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۙ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (المدثر ع۲)، ایسا ہی کافر بھی بزدل ہوتا ہے۔

اگر ہم غور سے دیکھیں۔ تو ایمان نہ لانے کی دو ہی بڑی وجہیں ہوتی ہیں۔ (۱) انسان ان علوم سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ جو اس کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ (۲) وہ سچائی کو سمجھ جاتا ہے۔ مگر خوف کی وجہ سے نہیں مان سکتا اور ان دونوں حالتوں میں کافر انسان گدھے سے مشابہت رکھتا ہے۔

شہیق

لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ آواز دوزخ میں جانے والوں کی ہوگی۔ پس جن دوسری آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوزخ کی آگ سے آواز آیئگی ان سے مراد بھی یہی ہے کہ وہ دوزخیوں کے رونے اور چلانے کی آوازہی ہوگی۔

کفار کی تشبیہ گدھوں سے

۱۵۱ حل لغات۔ سُعِدُوا۔ علی المجھول وسَعِدَ یسعَدُ سعادۃً۔ ضد شقی۔ سُعِدَ اور سَعِدَ کے معنی یہ ہیں کہ فلاں شخص میں شقاوت کے خلاف حالت پائی گئی۔ فھو مسعودٌ علی الاوّل و سَعِیْدٌ علی الثانی واللفظ یاتی مرۃ بصیغۃ الفاعل ومرۃ بصیغۃ المفعول والمعنی واحد۔ پس پہلے صیغہ یعنی مجہول کے لحاظ سے صاحب سعادت کو مسعود کہتے ہیں۔ اور دوسرے صیغہ یعنی معروف کے لحاظ سے اسے سعید کہتے ہیں۔ اور

سعدوا

اس طرح پر بسا اوقات ایک لفظ کے اسم فاعل اور اسم مفعول ہر دو کے صیغے ہم معنی آتے ہیں اور وہ لفظ دونوں صیغوں میں ایک ہی معنی دیتا ہے۔ نحو عید مُکاتِبٌ و مکاتَبٌ و بَیْتٌ عامرٌ و معمورٌ۔ جیسے مُکاتِبْ (بصیغہ اسم فاعل) اور مُکاتَبْ (بصیغہ اسم مفعول) اور اسی طرح عامر اور معمور ہم معنی ہیں۔ و نظائرہ کثیرۃ۔ اور اسکی نظائر عربی زبان میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ السعد الیمن۔ سَعْد کے معنی برکت کے ہیں۔ اَسْعَدَہٗ علیہ اعانہ اسعد کے معنی ہیں۔ دوسرے شخص کے خلاف اسکی مدد کی (اقرب) مجذوذ۔ جذّ میں سے اسم مفعول ہے جذّ الشئ کسرہ و قطعہ مستاصلا۔ اُسے توڑ دیا۔ اور جڑ سے کاٹ دیا۔ جذّ۔ اسرعؔ جلدی سے دوڑا۔ النخلَ صَرَمَہٗ کھجور کو کاٹ دیا۔ (اقرب) پس غیر مجذوذ کے معنی ہوئے جو کاٹی نہیں جائیگی۔ بند نہ ہوگی۔

عیسائیوں کا عقیدہ

اسلامی تعلیم

الا ماشاء ربک کے معنی

تفسیر۔ اس آیت میں ایک ایسے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس میں اسلام کو دوسرے تمام مذاہب سے سخت اختلاف ہے۔ اور وہ مسئلہ نجات کا ہے۔

نجات کے متعلق اختلاف مذاہب

ہندوؤں کا یہ خیال ہے۔ کہ دوزخ اور جنت (جزاء سزا) دونوں ہی محدود ہیں۔ انسان اپنے اعمال کی جزاء یا سزا بھگت کر پھر اسی دنیا میں آجاتا ہے۔ اگرچہ ان کے بعض فرقوں کا باہم اختلاف ہے۔ مگر تمام میں یہ بات بطور بنیاد کے موجود ہے۔ کہ جزاء اور سزا ہر دو عارضی ہیں۔

ہندوؤں کا عقیدہ

آرین قوم کے علاوہ جن میں سے ہندو ہیں۔ دوسرا بڑا سلسلہ اقوام سامی ہے۔ اس سلسلہ میں یہودی نسلاً اور عیسائی مذہباً شامل ہیں۔ یہود کے نزدیک جنت غیر یہودی کے لئے بالکل نہیں۔ اور دوزخ یہودی کے لئے قریباً حرام ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک یہودی گیارہ مہینے دوزخ میں رہ سکتا ہے۔ اس کے سوا باقی لوگوں کے لئے جہنم ابدی اور غیر منقطع ہے۔

یہود کا عقیدہ

موحد گنہگار کے لئے خلود نار کے الفاظ موجود ہیں۔

عیسائیوں کے نزدیک جہنم بھی غیر منقطع ہے اور جنت بھی غیر منقطع۔ عیسائیوں کے بعض فرقوں کے نزدیک آخرکار جنت مٹ جائیگی اسلام ان تمام عقائد سے اختلاف رکھتا ہے۔ اسلام کی وہ ثابت شدہ تعلیم جسے پہلے بھی اکثر ائمہ مانتے چلے آئے ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے خصوصیت سے اور نئے رنگ میں اس پر زور دیا ہے۔ وہ یہی ہے کہ جنت ہمیشہ کے لئے اور غیر محدود زمانہ تک کے لئے ہے۔ لیکن دوزخ غیر منقطع نہیں۔ ایک زمانہ آئیگا۔ کہ دوزخ ختم ہو جائے گا۔

مفسرین نے اس اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ کی جو دوزخ کے متعلق آتا ہے۔ تفسیر میں بہت اختلاف کیا ہے اور مختلف توجیہات بیان کی ہیں (۱) بعض نے ما بمعنی مَنْ مانا اور اِلَّا مَاشَآءَ کو اِلَّا مَنْ شَآءَ رَبُّكَ قرار دیا ہے یعنی جسے خدا چاہیگا۔ نکال لے گا۔ یعنی ان کے نزدیک دوزخ تو غیر منقطع ہی ہے۔ مگر موحد گنہگار ایک زمانہ کے بعد اسمیں سے نکال لئے جائینگے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مَا مَنْ کے معنی میں بھی آجاتا ہے۔ مگر وہیں آتا ہے جب کہ اس مَنْ میں بعض ما (غیر ذوی العقول چیزیں) بھی شامل ہوں۔ لیکن اس موقع پر ایسے وجود شامل نہیں ہیں۔ اس لئے یہ تاویل درست نہیں معلوم ہوتی بعض اور بواعث کی وجہ سے بھی اس کا استعمال مَنْ کی جگہ جائز ہے۔ مگر وہ بواعث بھی یہاں موجود نہیں ہیں۔ ان معنوں کی تائید میں جو بعض مثالیں مَا کی ایسی پیش کی گئی ہیں۔ جن سے صرف انسان ہی مراد ہیں۔ مثلاً مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ ان کو محققین نے تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ ان کے نزدیک مَا اس قسم کی آیات میں اور معنوں میں آیا ہے۔ اور یہی درست ہے۔ نیز یہ امر بھی قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے موحد گناہ گار کے لئے بھی وہی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جو ایک کافر کے لئے۔ پس فرق کرنے کے لئے کوئی دلیل چاہیئے۔ جو موجود نہیں ہے۔ سورۂ نساء میں

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی نسبت فرماتا ہے۔ کہ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِیْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ (ع) یعنی وہ مسلمان جو اس آیت سے پہلے گذرے ہوئے احکام کو تسلیم نہیں کرینگے۔ دوزخ میں جائینگے اور اسمیں رہتے ہی چلے جائینگے اسی طرح اسی سورۃ کے رکوع ۱۳ میں فرماتا ہے۔ وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا۔ اور جو کوئی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے۔ اس کی سزا جہنم ہوگی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیگا۔ اور اللہ اسپر غضب نازل کریگا۔ اور اُسے اپنے قرب سے محروم کردیگا۔ اور اس کے لئے بہت بڑا عذاب تیار کریگا۔ سورۂ جن رکوع ۲ میں ہے۔ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے پہلے کفار کا ذکر ہے۔ لیکن اس آیت میں جو قاعدہ بتایا گیا ہے۔ وہ صرف کفار پر چسپاں نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر اک نافرمانی کرنے والے پر خواہ موحد ہو یا غیر موحد پس اس کے حکم کی عمومیت کو ہم کسی صورت میں مقید نہیں کر سکتے۔

(۲) بعض نے کہا ہے کہ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ سے مراد دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے کا زمانہ ہے یعنی الا الوقت الذی لا یدخلہم اللہ فی النار۔ ای قبل ما یدخلھم فی النار۔ لیکن یہ معنی بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس سے پہلے خٰلِدِیْنَ فِیْهَا آچکا ہے اور اِلَّا خلود کے زمانہ سے ہی اپنے بعد والے مضمون کا استثنار کرتا ہے۔ اور یہ استثنار اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے۔ جبکہ مستثنےٰ وجودوں کا پہلے دوزخ میں داخلہ مان لیا جائے۔ نیز خلود سے آئندہ کا زمانہ مراد ہوتا ہے۔ نہ کہ پچھلا۔ جیسا کہ فرمایا۔ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ۔ (انبیاء۔ ع ۳) اگر پچھلا زمانہ بھی خلود کے منافی ہوتا۔ تو وہ تو آہی چکا تھا۔ اور وہ پیدا ہو چکے تھے۔ پس خلود کی نفی تو پیدائش ہی سے ہو جاتی تھی۔

اہل جنت کے متعلق بھی استثنار

جنتیوں کے متعلق جو استثنار ہے۔ اس کے متعلق بھی بعض مفسرین لکھتے ہیں۔ کہ اس سے اعراف والے لوگ یا دوزخ سے نکل کر جنت میں آنے والے لوگ اور اُن کا زمانہ مراد ہے۔ اس کا بھی یہی جواب ہے۔ کہ خلود بعد کے زمانہ کے امتداد پر دلالت کرتا ہے۔ نہ کہ پہلے زمانہ کے امتداد پر۔

عذاب جہنم غیر منقطع نہیں۔

اصل میں ساری مشکل ان لوگوں کو اس وجہ سے پیش آئی کہ اس آیت کے الفاظ سے تو ظاہر ہوتا ہے۔ کہ دوزخ کا عذاب آخر ختم ہونیوالا ہے۔ لیکن ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا۔ کہ دوزخ کا عذاب بھی جنت کی نعما کی طرح غیر مجذوذ اور نہ ختم ہونیوالا ہے۔ اس لئے وہ ان توجیہات پر مجبور ہوئے۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ نہ صرف قرآن مجید ہی دوزخ کو منقطع قرار دیتا ہے۔ بلکہ احادیث بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔

حدیث سے اس معا کا اثبات

چنانچہ عبداللہ ابن عمرو ابن العاص کی روایت سے احمد (ابن حنبل) نے نقل کیا ہے۔ کہ لَیَأْتِیَنَّ علی جھنم یوم تصفق فیه ابوابها لیس فیها احد۔ وذلك بعدما یلبثون فیها احقابا (فتح البیان سورۂ ہود آیت زیر بحث) ضرور جہنم پر ایک ایسا زمانہ آئیگا۔ کہ اس کے دروازے بجیں گے۔ اور اس میں کوئی شخص نہ ہوگا۔ اور یہ اس وقت ہوگا۔ جبکہ لوگ کئی صدیاں اس میں رہ چکے ہونگے۔ گویا خلود سے مراد صدیوں رہنا ہے۔ اس حدیث کے متعلق بعض محدثین کہتے ہیں۔ کہ اس کے راویوں میں ایک کذاب ہے۔ لیکن یہ اعتراض ان کا درست نہیں کیونکہ یہ روایت قرآن کریم کے مطابق ہے۔ سورہ نبا میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ لّٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا۔ کہ کفار دوزخ میں صدیوں رہینگے۔

جہنم میں داخل ہونے سے قبل کا زمانہ مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

سلف صالحین کے اقوال اس بارہ میں

فتح البیان میں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ یہی قول ابن مسعودؓ اور ابوہریرہ رضؓ کا بھی ہے۔ اور کئی راویوں سے مروی ہے۔

اور امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہی عقیدہ حضرت عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ اور بہت سے گذشتہ مفسرین کا بھی تھا حافظ ابن القیم جو بڑے صوفی اور علامہ ابن تیمیہ کے شاگرد ہیں انہوں نے اپنی کتاب حادی الارواح الی بلاد الافراح میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے۔

بعض ائمہ نے خَالِدِیْنَ کے لفظ کا یہ جواب دیا ہے۔ کہ بیشک وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے لیکن جب اللہ تعالیٰ دوزخ کو ہی مٹا دیگا اور اس طرح سے اپنا رحم جاری کریگا۔ تو پھر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ یعنی جب دوزخ ہی نہ رہے گا۔ تو دوزخی اس میں کس طرح رہ سکتے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ اور ابن القیمؒ نے بھی دوزخ کے فنا ہو جانے کے مسئلہ کی تائید کی ہے (فتح البیان)

علامہ بغوی نے اوپر والی روایت حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے نقل کی ہے۔ جس سے اس روایت کی مزید تصدیق ہوجاتی ہے۔ ابن جریر نے شعبی کا قول نقل کیا ہے۔ کہ جھنم اسرع الدارین عمرانا واسرعھما خرابا۔ یعنی جہنم دونوں گھروں میں سے پہلے آباد ہونے والی اور پہلے خراب ہونے والی ہے۔

وقال ابن مسعود رضؓ لَیَاتِیَنَّ علیھا زمان تخفق بھا ابوابھا۔ یہی قول جابر رضؓ ابو سعید خدری اور عبد اللہ بن عمرؓ کی طرف سے بھی مروی ہے (فتح البیان)

حدیث شفاعت

حضرت ابو سعید خدریؓ کی بھی ایک روایت ہے جو بخاری اور مسلم دونوں میں پائی جاتی ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہنم ہمیشہ کے لئے نہیں ہے حدیث لمبی ہے اس کا وہ ٹکڑا جس سے استدلال ہوسکتا ہے یہ ہے کہ قیامت کو اللہ تعالیٰ مختلف لوگوں کو شفاعت کی اجازت دیگا۔ آخر مومنوں کو بھی شفاعت کی اجازت ملے گی۔

قرآن کریم عذاب جہنم کو منقطع بتاتا ہے۔

پہلے وہ اپنے جان پہچان والے لوگوں کو بچائینگے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان سے کہیگا۔ کہ جس کے دل میں ایک دینار کے برابر بھی نیکی ہو اسے نکال لاؤ۔ پھر نصف دینار کے برابر نیکی والوں کو۔ پھر جس کے دل میں ایک ذرہ بھی نیکی ہوگی اُس کو بھی نکلوائیگا۔ اس کے بعد مومن کہینگے کہ **ربنا لم نذر فیھا خیرا فیقول اللہ شفعت الملائکۃ وشفع النبیون وشفع المؤمنون ولم یبق الا ارحم الراحمین۔ فیقبض قبضۃ من النار فیخرج منھا قوما لم یعملوا الخیر قط۔** یعنی اے ہمارے رب ہم نے دوزخ میں نیکی کا ایک ذرہ بھی باقی نہیں چھوڑا۔ تب اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ ملائکہ نے بھی شفاعت کرلی اور نبیوں نے بھی کرلی اور مومنوں نے بھی کر لی۔ اور صرف ارحم الراحمین باقی رہ گیا ہے۔ اس پر خدا تعالیٰ دوزخ سے ایک مٹھی بھریگا۔ اور دوزخ سے ایسے لوگوں کو نکالے گا۔ جنہوں نے کبھی کوئی نیک کام نہ کیا ہوگا۔ اس روایت سے ظاہر ہے کہ دوزخ سے وہ لوگ بھی نکال لیے جائینگے۔ کہ جنہوں نے کبھی نیکی نہیں کی ہوگی۔ اور اس درجہ سے ادنیٰ درجہ کوئی ہے ہی نہیں۔ کہ جس کی نسبت ہم خیال کریں کہ وہ دوزخ میں رہ گیا ہوگا۔ نیز اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ مٹھی بھر کر دوزخ سے نکالیگا۔ اور خدا تعالیٰ کی مٹھی سے مراد جسمانی مٹھی تو ہے نہیں اس سے مراد احاطہ ہی ہوتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے احاطہ سے کون شئے باہر رہ سکتی ہے۔

تیسرا استدلال اس روایت سے یہ بھی ہوتا ہے کہ جن کو سزا ملنی ہوگی انکو اُن کی بدیوں کی سزا پہلے مل جائیگی اور خیر کو باقی رکھ لیا جائیگا۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ **من یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ** (زلزال) جس نے ایک ذرہ نیکی بھی کی ہوگی۔ وہ اسے ضرور دیکھے گا۔ پس بعد میں نجات کا ملنا ضروری ہوا۔

اِن روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اکثر صحابہ اور بزرگ تابعین اس مسئلہ میں ہمارے ساتھ ہیں۔ اور خود قرآن مجید بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

(۱) پہلا ثبوت خود یہی آیت ہے۔ اس جگہ پر دوزخ

اور جنت دونوں کے لئے ایک ہی لفظ "اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ" وارد ہوا ہے مگر دوزخیوں کے متعلق آگے فرمایا "اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ" اور جنت کے ذکر میں "اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ" کے بعد "عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ" فرمایا۔ "اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ" میں زور دے کر بتلایا ہے کہ دوزخیوں کو دوزخ سے ضرور نکالا جائے گا۔ پہلے اِنَّ کا لفظ رکھا پھر ربّ کا لفظ پھر فَعَّالٌ کا لفظ جو کہ مبالغہ کا لفظ ہے اور پھر اس جملہ کو جملہ اسمیہ کے رنگ میں لاکر اور بھی تاکید کر دی۔ اگر ان کو نکالنا ہی نہ تھا تو پھر اتنا زور دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ پھر جیسا کہ جنت کے لئے "عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ" رکھا ہے اگر دوزخ بھی اسی طرح سے غیر منقطع تھی تو اس کے متعلق بھی "عِقَابًا غَيْرَ مَجْذُوْذٍ" آجاتا۔ جنت کے متعلق تو فرمایا کہ وہ رہیں گے تو ہماری مرضی کے مطابق۔ مگر ہماری مرضی یہی ہے کہ ہمیشہ رہیں۔ لیکن دوزخ کے متعلق ایسا مضمون کسی جگہ نہیں فرمایا۔ یہ بات اتنی واضح ہے کہ ابن حجر جو اس مسئلہ میں ابن تیمیہ کے خلاف ہیں انہیں بھی کہنا پڑا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے متعلق تو اپنی مشیت بتا دی مگر دوزخیوں کے متعلق خاموش رہا ہے۔ خاموشی کا دعویٰ بھی غلط ہے اللہ تعالیٰ نے تو اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ فرما کر بتلا دیا ہے کہ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ میں جس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ ضرور پورا کرکے رہے گا +

دوسرا ثبوت

(۲) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ۔ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (ھود ع ۱۰) اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو امت واحدہ بنا دیتا مگر وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے سوائے ان کے جن پر تیرا رب رحم کرے۔ اور اس نے ان لوگوں کو رحم کے لئے ہی پیدا کیا ہے

ولذٰلک خلقھم کے معنی

وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ سے رحم ہی مراد ہے

ابن کثیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَلَمْ يَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ کہ اللہ تعالیٰ نے رحم کے لئے ہی بندوں کو پیدا کیا ہے اور عذاب کے لئے نہیں پیدا کیا۔ اور ابن وہب نے طاؤس کے متعلق روایت کی ہے کہ دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ طاؤس نے انہیں کہا کہ تم کیوں جھگڑتے ہو۔ ایک نے ان میں سے کہا۔ لِذٰلِكَ خُلِقْنَا۔ یعنی خدا نے ہمیں جھگڑنے اور اختلاف کرنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے طاؤس نے کہا۔ كَذَبْتَ تُو نے جھوٹ بولا۔ اس پر اس نے یہی آیت پڑھی اور کہا کہ انسان اختلاف کے لئے پیدا کئے گئے ہیں مگر طاؤس نے جواب دیا۔ خَلَقَهُمْ لِلرَّحْمَةِ وَالْجَمَاعَةِ یعنی اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے رحم اور اتفاق کے لئے پیدا کیا ہے۔ ابن کثیر میں ہے کہ مجاہد۔ ضحاک اور قتادہ کا بھی یہی مذہب تھا کہ "ذٰلك" کا اشارہ رحم کی طرف ہے۔ اور درّ منثور میں لکھا ہے کہ ابن جریر نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ للرحمۃ خلقھم۔ ابن ابی حاتم نے عکرمہ اور قتادہ سے روایت کی۔ ہے کہ "للرحمۃ والعبادۃ" کہ رحمت اور عبادت کے لئے انسان کو پیدا کیا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اگر کچھ انسان بھی ہمیشہ ہمیش کے لئے دوزخ میں پڑے رہیں تو ان کی پیدائش رحمت کے لئے قرار نہیں دی جا سکتی۔ اور اس صورت میں نعوذ باللہ یہ آیت غلط ہو جائے گی +

تیسرا ثبوت

(۳) جنت کے متعلق کئی دوسرے مقامات

پر فرمایا ہے کہ وہ ہمیشہ رہیگی جیسے فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (سورۃ التین) لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (سورۃ انشقاق) لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (حٰمٓ سجدہ) لیکن دوزخ کے متعلق ایسا کہیں نہیں فرمایا جس سے معلوم ہو کہ جنت کی جزا اور دوزخ کی سزا میں فرق ہے +

عارضی سزا خلاف رحمت نہیں

چوتھا ثبوت

(۴) اعراف ع ۱۹ میں فرمایا ہے عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ میں اپنا عذاب تو جس کو چاہوں گا پہنچاؤں گا۔ اور میری رحمت ہر ایک چیز پر وسیع ہے پس میں اسے بطور حق کے ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو لوگ کہ ہمارے نشانوں پر ایمان لاتے ہیں +

پانچواں ثبوت

اس آیت سے ثابت ہے کہ اللہ تعالےٰ کی رحمت ہر چیز پر وسیع ہے۔ عذاب ایک درمیانی چیز ہے۔ جن کو وہ عذاب دے گا ان کو بھی آخر اپنی رحمت سے ڈھانپ لے گا۔ عذاب کو محدود لوگوں کے لئے بتا کر رحمت کو نہ صرف سب انسانوں بلکہ سب اشیاء کے لئے عام کرنا بالکل واضح کر دیتا ہے کہ اہل دوزخ کا عذاب بھی ختم ہو جائے گا۔ ورنہ "كُلَّ شَيْءٍ" غلط ہو جاتا ہے۔ سورہ مومن میں بھی اس مضمون کی ایک آیت ہے فرماتا ہے "رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا" (مومن ع ۱) اے خدا تو ہر چیز کا اپنی رحمت اور علم کے ذریعہ سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اب اگر بعض لوگ ہمیشہ کے لئے عذاب میں رہ کر رحمت الٰہی سے محروم ہو سکتے ہیں تو پھر یہ بھی ممکن ہونا چاہیئے کہ بعض چیزیں خدا کے علم سے بھی نکل سکیں۔ کیونکہ علم اور رحمت کا ذکر ایک ساتھ فرمایا ہے۔ مگر یہ امر بالبداہت غلط ہے پس اسی طرح بعض لوگوں کا رحمت سے ابدی طور پر محروم ہونا بھی بالبداہت غلط ہے +

شاید اس جگہ کوئی یہ اعتراض کرے کہ پھر بعض لوگوں کا عارضی طور پر سزا پانا بھی درست نہیں ورنہ کہنا پڑے گا کہ بعض لوگ عارضی طور پر خدا کے علم سے بھی نکل جاتے ہیں۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جب یہ تسلیم کیا جائے کہ آخر سزا دور ہو جائے گی تو ماننا پڑے گا کہ سزا درحقیقت اصلاح کا ذریعہ ہوگی اور جو سزا اصلاح کا ذریعہ ہو وہ رحمت کا ہی ایک ظہور ہوتی ہے جیسے استاد کی سزا۔ پس اس عقیدہ کے رو سے کوئی بندہ خدا کی رحمت سے ایک منٹ کے لئے بھی جدا نہیں ہوتا بلکہ ہر وقت وہ اس کی رحمت کے سایہ کے نیچے ہوتا ہے لیکن دائمی عذاب کو مان کر یہ صورت باقی نہیں رہتی +

(۵) سورہ ذاریات میں آتا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں نے سب جنوں اور انسانوں کو اپنا عبد بننے کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ اور پھر دوسری جگہ فرماتا ہے۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر) اے نفس مطمئنہ تو اب میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ یعنی جو عبد بن جائے گا۔ وہ ضرور جنت میں داخل ہو جائے گا۔ چونکہ پہلی آیت سے ثابت ہے کہ آخر سب ہی انسان عبد بنیں گے کیونکہ خدا نے جس غرض کے لئے انسان کو پیدا کیا ہے وہ ہمیشہ کے لئے اس سے محروم نہیں رہ سکتا۔ پس جب سب لوگ جلد یا بدیر عبد بنیں گے تو سب جنت میں بھی ضرور جائیں گے +

چھٹا ثبوت

(۶) چھٹا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سورہ "زلزال"

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰؤُلَاۤءِ ۚ مَا يَعْبُدُوْنَ

پس (اے مخاطب) جو عبادت یہ (لوگ) کرتے ہیں اس کے (باطل ہونے اور بُرا پھل لانے کے) متعلق تو کسی شک (وشبہ) میں نہ پڑ یہ ای

اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۚ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ

طرح کی عبادت کرتے ہیں جس طرح کی عبادت (ان سے) پہلے ان کے باپ دادے کرتے تھے اور ہم یقیناً یقیناً

نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ۝

انہیں (بھی) ان کا حصہ پورا پورا دیں گے جس میں سے (ہرگز) کچھ کم نہیں کیا جائے گا ؏

میں فرماتا ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ۔ کہ جو بھی نیکی کرے گا خواہ وہ کتنی بھی قلیل کیوں نہ ہو۔ وہ اس کو ضرور دیکھے گا۔

کمی سزا کا نام نیکی کا دیکھنا نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے ضرور ہے کہ بد اعمال کی سزا پہلے دی جائے اور پھر اس کو ایک عرصہ کے بعد ختم کر کے نیک اعمال کی جزا شروع کی جائے +

(۷) قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ۔ جس شخص کے اعمال ہلکے ہوں گے اور کم قیمت ہوں گے اس کی ماں "هَاوِيَة" یعنی جہنم ہوگی اس آیت میں جہنم کو ماں قرار دیا گیا ہے اور ماں کے پیٹ میں بچہ ہمیشہ کے لئے نہیں رہتا بلکہ اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ تکمیل اعضاء و قوٰی نہ ہو جائے۔ پس جہنم میں بھی اسی وقت تک انسان رہے گا جب تک کہ اس کی ان قوتوں کا نشوونما نہ ہو جائے جو دیدار الٰہی کے مناسب حال ہیں۔ یہ آیات بتلا رہی ہیں کہ دوزخ غیر منقطع نہیں اور خلود سے مراد لا انتہاء زمانہ نہیں بلکہ ایک لمبا عرصہ جس کو قرآن مجید نے لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا سے تعبیر کیا ہے مُراد ہے دوزخیوں اور جنتیوں کے متعلق یہ جو فرمایا ہے کہ جب تک آسمان و زمین رہیں گے وہ ان میں رہیں گے اس سے یہی مراد ہے کہ جب تک جنت و دوزخ کے آسمان و زمین رہیں گے وہ وہاں رہیں گے اور یہ امر کسی آیت سے ثابت نہیں کہ دوزخ کو فناء نہیں کیا جائے گا اور جب دوزخ کو فنا کر دیا جائے گا تو دوزخیوں کا دوزخ میں رہنے کا زمانہ بھی ختم ہو جائے گا +

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ کے معنی

سَاتواں ثبوت

؎ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ کے دو معنے ہیں (۱) ان کے غیر اللہ کو معبود بنانے کے متعلق شک نہ کر یعنے یہ خیال نہ کر کہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص غیر اللہ کی عبادت شروع کر دے کیونکہ جو عقیدہ ورثہ سے انسان کو ملتا ہے اور وہ خود اس پر غور نہیں کرتا اس میں ایسی حماقتوں کا ارتکاب اس سے کچھ بعید نہیں ہوتا۔ ان معنوں کے رو سے تسلیم کرنا ہوگا کہ مخاطب اس زمانہ کے لوگ ہیں جب شرک لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو چکا ہوگا اور چاروں طرف توحید کا خیال پھیل جائے گا۔ ان معنوں کے لحاظ سے یہ آیت ایک پیشگوئی کا رنگ رکھتی ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ توحید ایسی غالب آ جائے گی کہ ایک زمانہ میں لوگوں کو یہ بات ماننی مشکل ہو جائے گی کہ کوئی غیر اللہ کی بھی عبادت کرتا ہے۔ غلبۂ اسلام کے زمانہ میں مرکز اسلام کے رہنے والے لوگوں کا ہی

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا

اور ہم نے (اختلافات کے مٹانے کے لئے) یقیناً موسیٰ کو (بھی) کتاب (تورات) دی تھی۔ پھر (کچھ مدت کے بعد) اس کے متعلق (بھی) اختلاف

كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ

کیا گیا۔ اور اگر وہ (رحمت کے وعدہ والی) بات جو تیرے رب کی طرف سے پہلے (سے) آچکی (ہوئی) ہے (مانع) نہ ہوتی تو ان کے

لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ○

درمیان (کبھی کا) فیصلہ کیا جا چکا ہوتا۔ اور اب تو وہ اس (کتاب یعنی قرآن) کے متعلق (بھی) ایک بے چین کر دینے والے شک میں (پڑے ہوئے) ہیں شنہ

حال ہو گا لیکن اب بھی کفار کے کئی عقائد جن کا قرآن کریم میں ذکر آتا ہے لوگوں کے لئے قابلِ تعجب نظر آتے ہیں اور وہ حیران ہوتے ہیں +

(۲) دوسرے معنے یہ ہو سکتے ہیں۔ کہ اے مخاطب یہ نہ سمجھ لے کہ یہ لوگ سزا سے بچ جائیں گے کیونکہ یہ پہلوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ جب ان کو سزا ملی تھی۔ تو یہ کیونکر بچ سکتے ہیں +

کلام الٰہی کا نزول ہمیشہ ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے

مِمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ میں ما موصولہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور مصدریہ بھی۔ یعنی من الّذین یعبدھم ھٰؤُلَآءِ او من عبادتھم یعنی ان کے معبودوں کے متعلق یا ان کی عبادت کے متعلق شک میں نہ پڑ۔ یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ جن کی یہ عبادت کرتے ہیں ان کے متعلق تجھے شبہ پیدا نہ ہو کہ ممکن ہے انہوں نے ہی کوئی ایسی بات کہی ہو جس سے شرک پیدا ہوا ہو۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ یہ خیالات ان کے اپنے باپ دادوں کی ایجاد ہیں اور یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی عبادت کے متعلق شبہ نہ کر +

یہ ما موصولہ ہے یا مصدریہ

بتوں کے فیصلے ہوئے

پھر ان معنوں کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں یہ بھی کہ ان کی عبادت کے متعلق یہ شبہ نہ کر کہ کون ایسا فعل کر سکتا ہے اور یہ بھی کہ یہ مشرکانہ عبادت کرتے ہیں تو انہیں سزا کیوں نہیں ملتی +

غَيْرَ مَنْقُوْصٍ حال مؤکدہ ہے صرف زور دینے کے لئے آیا ہے ورنہ وفّٰی کے معنے خود پورا پورا دینے کے ہوتے ہیں۔ پس غیر منقوص کہہ کر مضمون کی مزید تاکید کر دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ نہ پہلے لوگ سزا سے بچے ہیں نہ یہ بچیں گے +

شنہ اب خاتمہ سورۃ پر اصل مضمون کی طرف پھر اشارہ فرماتا ہے کہ کلام الٰہی ضرور نازل ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے مگر انسان اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا موسیٰ پر کتاب اُتری اور اس کتاب میں ایک اور کتاب کا ذکر تھا مگر لوگوں نے قسم قسم کے شبہات اس میں پیدا کر لئے اور اس کے بدنتائج کو نہ دیکھا حالانکہ ان کا جرم اس قدر عظیم الشان تھا کہ اگر اس سے پہلے ہم ایک فیصلہ نہ کر چکے ہوتے تو انہیں تباہ کر دیا جاتا +

وہ فیصلہ جس کا ذکر اس جگہ کیا گیا ہے وہی ہے جس کا ذکر وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں (ذاریات ع ۳) اور رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف ع ۱۹) میں اور اسی قسم کی متعدد اور آیات میں کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندہ کو روحانی ترقی دینے کے لئے پیدا کیا ہے اور اس کے ساتھ رحم کا سلوک کرنے کا فیصلہ کیا

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۭ اِنَّهٗ بِمَا

اور تیرا رب یقیناً یقیناً (اور) ضرور ان سب کو ان کے اعمال (کے پھل) پورے (پورے) دے گا (گو ابھی تک

يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

نہیں دیئے) وہ جو کچھ کرتے ہیں اسے وہ یقیناً جانتا ہے۔ ۱۰۶

ہے۔ پس وہ اسے سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا تاکہ لوگ ہدایت سے محروم نہ رہ جائیں ✦

وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ سے دو امر کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرف بھی کہ جو کتاب شک کو دُور کرنے کے لئے آئی تھی وہ ان کی اندرونی بیماریوں کی وجہ سے ان کے لئے شک پیدا کرنے کا موجب ہو رہی ہے۔ اور یہ بھی کہ ہمارے رحم سے بجائے فائدہ اُٹھانے کے اور شکرگزار بننے کے یہ لوگ اس قسم کے شکوک میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ کتاب جھوٹی ہوگی تبھی تو اس کے انکار سے سزا نہیں ملتی ✦

۱۰۶ اس آیت کے متعلق مفسرین میں معنوی طور پر تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مگر اہل لغت میں تحقیق لفظی کی رو سے اختلاف ہوا ہے۔ یہ اختلاف لمّا کے لفظ کی وجہ سے ہے کیونکہ لمّا اس جگہ بظاہر ایسی صورت میں استعمال ہوا ہے جس میں استعمال نہیں ہوا کرتا۔ لمّا کا استعمال تین طرح ہوتا ہے (اوّل) مضارع پر آتا ہے۔ اور اسے جزم دیتا ہے۔ اور اس کے معنے ماضی منفی کر دیتا ہے۔ جیسے لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (سورۃ جمعہ) وہ ابھی ان سے نہیں ملے (دوم) ماضی پر آتا ہے اور دو جملے چاہتا ہے۔ جن میں سے پہلے جملہ کے مضمون کے پورا ہونے پر دوسرے کا مضمون پورا ہوتا ہے جیسے یہ کہیں کہ لَمَّا جَآءَنِيْ اَكْرَمْتُهٗ جب وہ میرے پاس آیا میں نے اس کی عزت کی۔ ایسے استعمال کے وقت ابن جنی کے نزدیک اس کے معنے حِيْنَ کے ہوتے ہیں۔ اور ابن مالک کے نزدیک اِذْ کے (سوم) حرف استثناء کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور اس صورت میں یہ جملہ اسمیہ پر بھی آتا ہے۔ جیسے کہ قرآن کریم میں ہے۔ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (طارق) اور ماضی پر بھی آ جاتا ہے جو لفظاً تو ماضی ہو لیکن معنیً ماضی نہ ہو جیسے اَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ لَمَّا فَعَلْتَ یہاں فعلت لفظاً ماضی ہے لیکن معنیً مصدر ہے اور اس سے مُراد اِلَّا فِعْلَكَ ہے یعنے میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ اس کام کے سوا جو میں تجھ سے چاہتا ہوں اور کام نہ کیجیو (دیکھو مغنی اللبیب لابن ہشام)

اس آیت میں یہ لفظ بظاہر ان تینوں استعمالات کے خلاف استعمال ہوا ہے۔ نہ اس کے بعد کوئی مضارع اس کا مجزوم بن کر آیا ہے نہ یہ ماضی پر ظرف بن کر آیا ہے کہ اس کے ساتھ دو جملے آئے ہوں۔ اور نہ جملہ اسمیہ پر یا صیغہ ماضی بمعنے مصدر پر آیا ہے کہ حرف استثناء کے معنے دیتا ہو ✦

ان مشکلات کو دیکھ کر نحویوں نے مختلف خیالات دوڑائے ہیں اور مبرد جیسوں نے تو یہ بھی کہہ دیا ہے کہ لمّا کا یہ استعمال محاورۂ عرب کے خلاف ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے کہ اس کو میں نہیں سمجھ سکا۔ ابن جنی نے یہ کہا ہے کہ شائد جس طرح الّا زائد آتا ہے لمّا بھی زائد آتا ہو لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا۔ بعض نے اس لفظ کو مرکب قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس جگہ لمّا ایک لفظ نہیں ہے۔ بلکہ لَمِنْ مَّا ہے نون میم

اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ کے معنے۔

اِنَّ كُلًّا لَّمَّا کی تحقیق نحوی

لمّا کے استعمالات

اس آیت میں لمّا کے متعلق نحویوں کے مختلف اقوال

سے تبدیل ہو کر تین میموں کے جمع ہو جانے کی وجہ سے
حذف ہو گیا ہے۔ لیکن یہ بھی درست نہیں۔ کیونکہ ایسے
میم کو تخفیف کی غرض سے حذف کرنے کا جواز ثابت
نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اصل میں یہ لفظ لَمًّا
سے ہے جس کے معنے جمع کرنے کے ہوتے ہیں جیسے
کہ قرآن کریم میں آیا ہے۔ اَکْلًا لَّمًّا۔ سب کا سب
کھا جاتے ہو تو تنوین کو وصل کی خاطر اُڑا دیا گیا اور
لمّا پڑھ لیا گیا۔ لیکن یہ بھی درست نہیں کیونکہ وصل کے
موقع پر اسم منصرف سے تنوین کا حذف کرنا بالکل بعید
از قیاس ہے +

ابن ہشام امام نحو کی تحقیق

لمّا جازمہ ہے

ان تمام توجیہات کو دیکھنے کے بعد درست
وہی معلوم ہوتا ہے جو ابن حاجب نے کہا ہے اور وہ
یہ ہے کہ لمّا اس جگہ پر جازمہ استعمال ہوا ہے اور
اس کا فعل محذوف ہو گیا ہے اور یہ عربی زبان کے
رو سے جائز ہے +

صحیح توجیہ یہی ہے کہ یہ لمّا جازمہ ہے۔

لمّا اور لم کے معنوں میں پانچ فرق نحوی بیان
کرتے ہیں اور ان میں سے ایک فرق یہ بھی ہے کہ لم
کے بعد کا فعل حذف نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن لمّا کے بعد
کا فعل جب اس پر کوئی دلیل موجود ہو حذف کیا جا سکتا
ہے۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں نحوی ایک شعر بھی نقل
کرتے ہیں جو یہ ہے ؎

فَجِئْتُ قبورَھُمْ بَدْءً أ وَلَمَّا
فنادیتُ القبورَ فَلَمْ یُجِبْنَہ

میں اپنی قوم کے بڑے آدمیوں کے مرنے کے بعد جبکہ
ان کی جگہ مجھے بڑا آدمی سمجھا جانے لگا۔ اور ابھی .. میں
فی الواقع بڑا آدمی بنا نہیں تھا۔ ان کی قبروں پر گیا اور
انہیں بلایا تو انہوں نے مجھے کوئی جواب نہ دیا +

ابن حاجب کا خیال ہے کہ اس آیت میں بھی
لمّا کا فعل حذف ہو گیا ہے جو ان کے نزدیک یُہْمَلُوْا
ہے۔ یعنی یہ کفار اپنے اعمال کی پاداش سے سبکدوش
اور آزاد نہیں ہو چکے۔ بلکہ ان کے اعمال کی جزاء ابھی
انہیں ملنے والی ہے +

ابن ہشام مصنف مغنی اللبیب کے نزدیک بھی
یہی توجیہ ٹھیک ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ محذوف یوفّوا
اعمالھم نکالا جائے تو زیادہ بہتر ہے اس جملہ کو
محذوف مان کر یہ معنے ہوں گے کہ اب تک تو ان کے
اعمال کا پورا بدلہ نہیں دیا گیا۔ لیکن اللہ تعالٰے پورا بدلہ
دے گا ضرور۔ علامہ محمد بن حیان اندلسی مصنف تفسیر
بحر محیط نے بھی اس توجیہ کو صحیح قرار دیا ہے لیکن لکھا
ہے کہ میرے نزدیک محذوف فعل ینقص نکالا
جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ اور انہوں نے یوں جملہ
بنایا ہے۔ لَمَّا یَنْقُصْ مِنْ جَزَاءِ عَمَلِھِمْ
لَیُوَفِّیَنَّھُمْ رَبُّکَ اَعْمَالَھُمْ یعنی سب کے
سب لوگ ایسے ہیں کہ ان کے اعمال کا بدلہ اب تک
ضائع نہیں ہوا اور ضرور اللہ تعالٰے ایک دن
انہیں ان کے اعمال کی پوری جزاء دے گا +

میرے نزدیک توجیہ یہی صحیح معلوم ہوتی
ہے۔ باقی سب توجیہات بعید از قیاس ہیں اور
گو ان کے پیش کرنے والوں کے علمی رتبہ کو مدنظر
رکھتے ہوئے ہم انہیں کلی طور پر باطل نہ کر سکیں لیکن
اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں بہت کچھ تکلّف
معلوم ہوتا ہے مگر یہ توجیہ بغیر تکلّف کے ہے اور
عربی کے ثابت شدہ قاعدہ کے مطابق ہے باقی
رہا محذوف کا سوال سو یہ معمولی سوال ہے۔ ایسے
موقع پر محذوف کے لئے قاعدہ یہ ہے کہ بقیہ عبارت
جس مضمون پر دلالت کرے اسے محذوف نکالا جائے
اور تینوں فعل جو تین ائمہ صرف و نحو نے محذوف
نکالے ہیں تینوں ہی آپس میں ہم معنے ہیں۔ اور ان
میں سے ہر اک کو ہم اختیار کر سکتے ہیں گو ابن ہشام
کے قول کو یہ ترجیح حاصل ہے کہ محذوف بھی الفاظ قرآن

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ

پس (اے رسول) تو ان (لوگوں) کے سمیت جنہوں نے تیرے ساتھ ہو کر (ہماری طرف سچا) رجوع (اختیار) کیا ہے (اسی طرح)

اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

جس طرح تجھے حکم دیا گیا ہے سیدھی راہ پر قائم رہ۔ اور (اے مومنو) تم (اس حکم کی) حد سے نہ بڑھنا جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے یقیناً دیکھتا ہے ؎

کے مطابق نکالا گیا ہے۔ اس محذوف کو اگر ظاہر کیا جائے تو عبارت یوں بنے گی۔ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا يُوَفَّوْا اعمالهم لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اعمالهم یقیناً یہ سب کے سب ایسے ہیں کہ اب تک انہیں ان کے اعمال کا پورا بدلہ نہیں ملا۔ مگر ایک دن ضرور تیرا رب انہیں ان کے اعمال کا پورا بدلہ دے گا۔ یعنی ان لوگوں کو ہمارے ڈھیل دینے سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ وہ سزا سے بچ گئے ہیں وہ سزا سے بچے نہیں ان کے اعمال محفوظ ہیں سزا میں ایک مدت تک ڈھیل ہے مگر وہ دن بھی ضرور آنے والا ہے جب مزید ڈھیل اللہ تعالےٰ نہیں دے گا اور یہ لوگ اپنے اعمال کی پوری سزا بھگتیں گے ✦

۱۱۳ حل لغات۔ اِسْتَقَامَ الْاَمْرُ و استقام لهُ الامرُ اِعْتَدَلَ۔ اس کے لئے کام ٹھیک اور درست ہو گیا۔ وَفِی الْقُرْاٰنِ اِسْتَقِيْمُوْا اِلَيْهِ ای استقیموا فی التوجہ الیہ دون الآلھۃ اور قرآن کے الفاظ اِسْتَقِيْمُوْا اِلَيْهِ کے معنے یہ ہیں کہ تم باقی تمام معبودوں کو چھوڑ کر اس کی طرف اپنی توجہ کو درست کرو (اقرب) وَاسْتِقَامَةُ الْاِنْسَانِ لُزُوْمُهُ الْمَنْهَجَ الْمُسْتَقِيْمَ (مفردات) اور انسان کے لئے استقامت کا لفظ آئے تو اس کے معنی سیدھے راستہ پر قائم رہنے کے ہیں۔

طَغٰى يَطْغٰى طَغْيًا و طُغْيَانًا و طِغْيَانًا جَاوَزَ الْقَدْرَ وَالْحَدَّ۔ حد اور اندازہ سے آگے نکل گیا۔ طَغٰى فلانٌ اَسْرَفَ فِى الْمَعَاصِى وَالظُّلْمِ۔ گناہوں اور ظلم میں حد سے بڑھ گیا (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف اپنی جان ہی کی ذمہ واری نہیں بلکہ آپ پر ایمان لانے والوں کی درستی بھی آپ کا کام ہے۔ اور یہی ذمہ واری آپ کے جانشینوں اور آپ پر ایمان لانے والوں پر ہے کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے یہ ذمہ واری اس قدر ہے کہ پڑھ کر دل کانپ جاتا ہے ✦

کمیت کی طرف تو فاستقم اور ومن تاب معك کے الفاظ اشارہ کرتے ہیں۔ ہمیشہ بغیر وقفہ کے خدا تعالےٰ کے احکام پر قائم رہنا اور اپنے ساتھیوں کو قائم رکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اور اس کی عظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ کیفیت جس کا مطالبہ کیا گیا ہے وہ بھی نہایت اعلیٰ ہے کیونکہ فرماتا ہے کہ استقامت اس طرح ہو جس طرح خدا تعالےٰ نے فرمائی ہے۔ ایک کمزور انسان کے لئے رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے بتائے ہوئے احکام کو کما حقہ ادا کرنا کس قدر مشکل ہے ✦

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خالی استقامت انسان کو نفع نہیں دے سکتی بلکہ وہ استقامت نفع دیتی ہے جو پوری طرح اللہ تعالےٰ کے منشاء کے مطابق ہو۔ بعض لوگ یہ خیال کر لیتے ہیں کہ چونکہ ہم نماز اور روزہ کے پابند ہیں اس لئے اب ہمیں کسی قسم کا

اس ترجمہ کے مطابق اس آیت کے معنے

آنحضرتؐ کی بہت بڑی ذمہ داری کی وسعت و عظمت

کمیت کی رو سے عظمت

استقام

کیفیت کی رو سے عظمت۔

استقامت وہی نافع ہوتی ہے جو فرمان الٰہی کے مطابق ہو

طغیٰ

خوف نہیں۔ حالانکہ نماز اور روزہ اصل میں مطلوب نہیں ہیں مطلوب تو امر الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے یہی نماز اور روزہ جس وقت خدا تعالےٰ کے احکام کے خلاف آ جائیں انسان کو شیطان بنا دیتے ہیں جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورج نکلتے یا اس کے غروب ہوتے وقت شیطان نماز پڑھتا ہے یعنی یہ کام شیطانی لوگوں کا ہے۔ اسی طرح عید کے دن روزہ رکھنے والے کا نام آپ نے شیطان رکھا۔ پس حق یہی ہے کہ جب تک انسان کا رویہ پوری طرح اللہ تعالےٰ کے منشاء کے ماتحت نہ ہو اور اس کے اعمال کا محرک صرف خدا تعالیٰ کی رضا کا حصول نہ ہو اس وقت تک وہ اللہ تعالیٰ کے فضلوں کا وارث نہیں ہو سکتا ✦

نیکی وہی کام ہوتی ہے جو مناسب وقت بھی ہو

آنحضرت صلعم کی اتباع کی اہمیت

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متبعین کے لئے آپ کی اتباع اور آپ کے اسوہ پر چلنا ضروری ہے۔ کیونکہ فرماتا ہے فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ۔ جس طرح تجھے حکم دیا گیا ہے اس طرح مستقل طور پر اور لزوم کے ساتھ تو عمل کر اور تیرے ساتھ خدا تعالےٰ کی طرف رجوع کرنے والے لوگ بھی اسی طرح عمل کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل معیار عمل کا وہی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مومنوں کے لئے یہ فرماتا کہ وہ اس طرح عمل کریں جس طرح انہیں حکم دیا گیا ہے مگر انہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کے تابع فرما کر بتا دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر چلنا ہی مومنوں کا کام ہے۔ اور یہ اتنا بڑا مقام ہے کہ اس کے حصول کے لئے جس قدر بھی انسان کوشش کر سکے ہے۔ اگر ہمارے لئے کوئی اور راہ ہوتی تو ہم کہہ سکتے تھے کہ ہم نے اپنے درجہ کے مطابق کام کرنا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے درجہ کے مطابق۔ مگر یہ بات نہیں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس مقام پر کھڑے ہونے کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے اس جگہ پر آپ کے اتباع کو کھڑا ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مگر افسوس مسلمانوں کا آج یہ حال ہے کہ خود تو اس مقام پر کھڑا ہونے کی کوشش کرتے نہیں اور اگر کوئی خدا کا بندہ اس مقام کو پالیتا ہے تو اسے کافر و دجال کہنے لگتے ہیں۔ انّا للہِ وانا الیہ راجعون ✦

کما اُمِرْتَ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو وہی نیکی کام دے سکتی ہے۔ جو وقت کے مناسب ہو۔ نماز کے وقت ذکر الٰہی اور روزہ کے وقت ایسے کام جو روزہ میں روک ہوں۔ اور جہاد کے وقت روزہ جو جہاد میں سُست کرے نفع نہیں دے سکتا۔ پس انسان کو چاہیئے کہ اس امر پر غور کرتا رہے کہ آج کل کونسی نیکی کا زمانہ ہے۔ اور اسی طرح مختلف اوقات میں ان نیکیوں پر عمل کرنے کی کوشش کرے جو اس وقت کے مناسب حال ہوں۔ زمانہ اور وقت کے لحاظ سے جو نیکی ہوگی وہی اللہ تعالےٰ کی رضا کو حاصل کرے گی ✦

مجھے تعجب ہے کہ اس آیت کو ایک نادان مفسّر نے سورہ نساء کی آیت اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ الآیہ کے مطابق قرار دے کر یہ استدلال کیا ہے کہ جس طرح اس آیت کے ماتحت صحابہ خاتم النّبیّین نہیں بن جاتے۔ اسی طرح سورۃ نساء کی آیت سے امت محمدیہ میں نبوت کا دروازہ نہیں کھل جاتا۔ حالانکہ اس جگہ توبہ میں شمولیت کا ذکر ہے نہ ختم نبوت میں۔ اب کیا کوئی نادان ہے جو یہ کہے کہ صحابہ تائب نہ تھے صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

تائب تھے۔ اگر نہیں بلکہ ہر اک کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ تائب دونو تھے گو مقام توبہ میں فرق تھا تو سورہ نساء میں کیوں یہ معنے نہیں کئے جاسکتے کہ نبوّت کا لفظ دونوں گروہوں پر بولا جائے گا۔ گو نبوّت کا درجہ مختلف افراد کا مختلف ہوگا +

اس آیت کا اثر آنحضرتؐ پر

اس آیت نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اثر کیا تھا وہ تو اس سے ظاہر ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے۔ اَلْھُوْدُ وَ اَخَوَاتُھَا شَیَّبَتْنِی قَبْلَ الْمَشِیْبِ (ابن مردویہ بحوالہ درمنثور) مجھے ہود اور اس جیسی سورتوں نے قبل از وقت بوڑھا کر دیا ہے کیونکہ آپؐ دیکھتے تھے کہ آپؐ کے ساتھ توبہ کرنے والے لوگ آپؐ کے زمانہ تک ہی محدود نہ تھے بلکہ آپؐ کے بعد قیامت تک آنے والے تھے۔ ان لوگوں کی تربیت کی ذمہ واری آپؐ کس طرح اٹھا سکتے تھے۔ یہ خیال تھا جس نے آپؐ پر اثر کیا اور آپؐ کو بوڑھا کر دیا۔ مگر آپؐ کا یہ تقویٰ اللہ تعالےٰ کو ایسا پسند آیا کہ اس نے یہ کام اپنے ذمہ لیا اور وعدہ کر لیا کہ میں ہمیشہ تیری امت میں سے ایسے لوگ مبعوث کرتا رہوں گا جو تیرے نقش قدم پر چل کر میرا قُرب حاصل کریں گے اور تیری طرف سے اس امت کی اصلاح کریں گے +

اس آیت کی رو سے ہمارے لئے اپنے محاسبہ کی ضرورت

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مقابلہ میں اب ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ ہم نے کیا کیا ہے ہمارا بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح یہ فرض رکھا گیا ہے کہ اپنے نفس کی اصلاح کے ساتھ دوسرے مومنوں کی اصلاح کا بھی فکر کریں +

ایک ادنیٰ غور سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ بغیر ایک کامل نظام کے اس حکم پر عمل نہیں ہو سکتا ایک مومن اپنے پاس کے مومنوں کو تو نصیحت کر سکتا ہے لیکن وہ سب دُنیا کے مومنوں کو بغیر نظام کے کس طرح نصیحت کر سکتا ہے۔ صرف مکمل نظام ہی ہے جس کے ذریعہ سے انسان اپنے گھر بیٹھا سب مسلمانوں کی خبر رکھ سکتا ہے کیونکہ جب وہ نظام کے قیام میں مدد دیتا ہے خواہ روپیہ سے وقت سے قلم سے زبان سے یا دماغ سے۔ تو وہ اس نظام کا ایک حصّہ ہو جاتا ہے اور اس نظام کے ذریعہ سے جہاں جہاں بھی کام ہوتا ہے اس میں وہ شریک ہوتا ہے۔ اس وقت احمدیہ جماعت ہی نظام کے ماتحت ہے اور دیکھ لو کہ وہی تبلیغ اسلام دُنیا کے مختلف ممالک میں کر رہی ہے۔ ایک پنجاب کے گاؤں کا زمیندار یا ایک افغانستان کے ایک گوشہ میں بسنے والا افغان جو جغرافیہ سے محض نابلد ہے جب اپنی کمائی کا ایک حصّہ خزانہ سلسلہ میں ادا کرتا ہے تو وہ نہ صرف اپنے ذاتی فرض کو ادا کرتا ہے بلکہ اس طرح وہ یورپ امریکہ سماٹرا جاوا افریقہ وغیرہ مختلف برّاعظموں اور ملکوں میں تبلیغ اسلام کا جو کام ہو رہا ہے اس میں شریک ہو جاتا ہے اور اس حکم کی ذمّہ واری سے ایک حد تک سبکدوش ہو جاتا ہے +

نظام جماعت احمدیہ

اولاد کی تربیت

اس آیت میں آیندہ اولاد کی درستی اور اس کی تربیت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے مگر افسوس ہے کہ اس امر کی طرف بہت کم لوگ توجہ رکھتے ہیں +

بیہقی نے شعب الایمان میں ابو علی سری سے روایت کی ہے کہ ابو علی نے کہا۔ رَاَیتُ رسولَ اللہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہِ وسلَّم فی المَنَامِ فقلتُ یا رسولَ اللّٰہ صلَّی اللّٰہُ علیہِ وسَلَّمَ رُوِیَ اَنَّکَ قُلتَ شَیَّبَتْنِیْ الھودُ قال نَعَمْ قلتُ ما الذی شیَّبَکَ قَصَصُ الانبیاءِ و ھلاکُ الاُمَمِ قال لا ولکن قولہ فَاسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور عرض کی یا رسول اللہ لوگ کہتے ہیں کہ آپؐ نے

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَ

اور تم ان لوگوں کی طرف جنہوں نے ظلم (کا شیوہ اختیار) کیا ہے نہ جھکنا۔ ورنہ تمہیں (بھی جہنم کی) آگ (کی لپٹ) پہنچے گی

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝

اور (اس وقت) اللہ کے سوا تمہارے کوئی دوست (مددگار نہ) ہوں گے۔ اور تمہیں (کسی طرف سے بھی) مدد نہیں ملے گی ۱۱۴

فرمایا ہے مجھے سورہ ہود نے بوڑھا کر دیا۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ اور میں نے عرض کی کس بات نے آپ کو بوڑھا کر دیا کیا انبیاء کے قصوں اور اُمتوں کی ہلاکت نے آپ نے۔ فرمایا نہیں بلکہ آیت فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ نے مجھے بوڑھا کر دیا اور دارمی نے اور ابوداؤد نے اپنی مراسیل میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں کعبؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِقْرَءُوْا هُوْدَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ سورہ ہود کو جمعہ کے دن پڑھا کرو۔

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت نظام جماعت کے ساتھ تعلق رکھتی ہے کیونکہ جمعہ کا دن بھی اجتماع کا دن ہوتا ہے +

کیا عجیب بات ہے کہ جس سورۃ نے رسول اللہ جیسے وسیع القلب پر اتنا اثر ڈالا کہ آپ بڑھاپے سے پہلے ہی بوڑھے ہو گئے وہ ہم پر کوئی اثر نہ کرے حالانکہ ہمیں آپ سے زیادہ ڈرنا چاہیئے تھا۔ تا کہ اس کام میں کامیاب ہوں جو ہمارے سامنے ہے +

اسلام صرف شخصی کامیابی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا

اصل بات یہ ہے کہ اسلام محض شخصی کامیابی کا قائل نہیں۔ اگر ہم ساری قوم کو ہر رنگ میں نہیں بڑھاتے۔ تو گویا ہم کامیاب ہی نہیں ہوئے۔ لا تطغوا میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ کہ قوم کی خبر نہ لینا ظلم ہے کیونکہ خبر نہ لینے سے بدی پھر عود کر آتی ہے۔ ایک آدمی کا اعلیٰ مقام تک پہنچ جانا دنیا کے لئے چنداں مفید نہیں۔ کیونکہ اس کے مرتے ہی وہی ظلمت پھیل جائے گی۔ کامیابی یہ ہے کہ سب صحیح راستہ کو اختیار کر لیں تا کہ بدی کا سر کچلا جائے مگر افسوس ہے کہ باوجود اس تعلیم کے مسلمان نہ صرف دینی علوم میں پیچھے رہ گئے ہیں بلکہ دنیاوی علوم اور ترقیات میں بھی بالکل بے خبر ہیں وہ بنی نوع انسان کی بہبودی میں بھی بہت کم حصہ لیتے ہیں جبکہ دوسری قوموں کے بہادر ہر شعبہ علمی میں ترقی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں +

اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مجموعی کوششوں کو بھی اسی طرح دیکھ رہا ہے جس طرح کہ وہ انفرادی کوششوں کو دیکھتا ہے +

رکن

۱۱۴ حل لغات۔ رَكَنَ اليه يَرْكُنُ و رَكِنَ يَرْكَنُ رُكُوْنًا۔ مال اليه و سَكَنَ اس کی طرف جھک گیا اور قرار پا گیا۔ (اقرب) یہ لفظ باب نَصَرَ يَنْصُرُ اور عَلِمَ يَعْلَمُ سے آتا ہے یعنی رَكَنَ يَرْكُنُ اور رَكِنَ يَرْكَنُ مگر کبھی مَنَعَ يَمْنَعُ کے وزن پر بھی آتا ہے۔ مگر یہ عام قاعدہ کے خلاف ہے کیونکہ جب تک دوسرا یا تیسرا حرف حروف حلقیہ سے نہ ہو تب تک اس وزن پر لفظ نہیں آیا کرتا۔ اور اس لفظ میں نہ دوسرا حرف حروف حلقیہ میں سے ہے نہ تیسرا حرف۔ (حروف حلقیہ یہ ہیں ع ھ ح خ غ ء) اس لئے

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ

اور (اے مخاطب) تو دن کی دونوں طرفوں اور (نیز) رات کے (متعدد اور مختلف) اوقات میں عمدگی سے نماز ادا کیا کر نیکیاں

الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰی لِلذّٰكِرِیْنَ ○

یقیناً بدیوں کو دُور کر دیتی ہیں۔ یہ (تعلیم اللہ تعالیٰ کی سننوں کو) یاد رکھنے والوں کے لئے ایک نصیحت ہے ۱۱۵

اس وزن کو شاذ کہتے ہیں یعنی عام قاعدہ کے خلاف استعمال ہوتا ہے مگر شاذ کے معنے غلط نہیں ہوتے صرف اس سے یہ مُراد ہوتی ہے کہ اس قسم کے الفاظ عربی زبان میں کم پائے جاتے ہیں +

تفسیر۔ اس آیت میں یہ قاعدہ بتایا ہے کہ ظالم سے تعلق رکھنے والا خود بھی اس کی سزا میں شریک ہو جائے گا۔ اور پہلی آیت سے اس کا یہ تعلق ہے کہ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ دوسروں کی نگرانی اور خبرگیری رکھو کہ وہ بھی استقامت پر رہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر مومن ایسا نہ کریں گے تو دوسرے لوگ استقامت کو چھوڑ کر ظالم بن جائیں گے اور سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔ اس لئے اس قاعدہ کی طرف توجہ دلائی کہ جو چیزیں آپس میں تعلق رکھتی ہیں وہ ایک دوسرے کے اثر کو قبول کرتی ہیں پس اگر تم ظالموں کی طرف جھکو گے تو وہ خرابیاں جو ان میں پائی جاتی ہیں وہ تم میں بھی سرایت کر جائیں گی۔ اور ان کا بگڑنا تمہارا ہی بگڑنا ہو گا +

غرض یہ سمجھایا ہے کہ اپنے عزیزوں سے تعلق قطع کرنا بھی ایک قسم کی موت ہے اور اگر وہ ظالم ہوں تو ان سے تعلق رکھنا بھی ایک موت ہے پس اصل راہ یہی ہے کہ ان کی اصلاح کرو۔ اور انہیں بگڑنے نہ دو تاکہ تعلق توڑنا بھی نہ پڑے اور ان کا تعلق خرابی کا موجب بھی نہ ہو +

دوسرے اس آیت کا یہ بھی مطلب ہے کہ پہلی آیت میں جو لا تَطْغَوْا کہہ کر ہم نے ظلم سے منع کیا تھا تو اس کا صرف یہ مطلب نہ تھا کہ اپنے ہاتھ سے ظلم نہ کرو۔ بلکہ ظالم کا کسی رنگ میں ممد ہونا یا اس کا ساتھ دینا بھی ظلم ہی ہے۔ اور انسان کو سزا کا مستحق بنا دیتا ہے۔ بہت سے لوگ ہیں کہ جو خود تو ظلم نہیں کرتے مگر دوستوں کے ظلم پر پردہ ڈالتے ہیں اور ان کو سزا سے بچانے کے لئے کوشش کرتے ہیں انہیں اس سے اجتناب چاہیئے +

(حاشیہ: ظالم سے تعلق رکھنے والا بھی سزا میں اس کا شریک ہوگا۔)

لَا تَرْكَنُوْا سے یہ بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ظالم کے پاس صرف کسی کام کے لئے جانا سزا کا مستحق نہیں بنا دیتا۔ بلکہ جب انسان ظالم کے ظالمانہ افعال میں تسکین محسوس کرے۔ اور اس پر نفرت کا اظہار نہ کرے تب سزا کا مستحق ہوتا ہے +

(حاشیہ: ظالم کے پاس کسی جائز کام کے لئے جانا ممنوع نہیں ہے۔)

۱۱۵۔ حل لغات۔ اَلطَّرَفُ۔ طَرَفُ الشَّیْءِ وَنِهَایَتُهٗ۔ کسی چیز کا کنارہ اور اس کی حد۔ النَّاحِیَةُ پہلو جانب طَائِفَةٌ مِنَ الشَّیْءِ۔ کسی چیز کا حصہ (اقرب) دن کی دونوں طرفوں سے مراد صبح اور شام کے اوقات ہیں +

(حاشیہ: طَرَف)

زُلَفًا جمع کا صیغہ ہے۔ اس کا واحد زُلْفَةٌ ہے اس کے معنی ہیں اَلْقُرْبَةُ۔ قرب۔ اَلْمَنْزِلَةُ درجہ الطَّائِفَةُ مِنْ اَوَّلِ اللَّیْلِ۔ رات کا پہلا حصہ وَقِیْلَ الزُّلَفُ السَّاعَاتُ الَّتِی یَلْتَقِیْ بِهَا اللَّیْلُ وَالنَّهَارُ۔ وہ حصے جن میں دن رات ملتے ہیں یعنی دن اور رات کے شروع اور آخر کے حصے۔ زلف کہلاتے ہیں (اقرب)

(حاشیہ: زُلَف — نماز کو ظلم سے روکنا میں دخل ہے۔)

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ○ فَلَوْلَا

اور (اس میں) صبر (واستقلال) سے کام لے کیونکہ اللہ (تعالیٰ) نیکوکاروں کے اجر کو ہرگز ضائع نہیں (کیا) کرتا ۱۱۵ پھر (تعجب ہے کہ)

وَقِيْلَ لِمَنَازِلِ اللَّيْلِ زُلَفٌ ۔ مطلق رات کے اوقات کو بھی زُلَفٌ کہتے ہیں۔ (مفردات)

اس آیت کا پہلی آیات سے تعلق اور کامیابی کا گر

تفسیر۔ اس آیت میں نیکی کا گر بتایا ہے اور اس آیت کا پہلی آیات سے یہ تعلق ہے کہ ان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اتباع کی ذمہ واریاں بتائی گئی تھیں۔ چونکہ اس قدر ذمہ واریوں کا پورا کرنا انسانی طاقت سے بالا تھا۔ اس لئے اس آیت میں وہ طریق بتایا جس کے ذریعہ سے اس عظیم الشان فرض کے پورا کرنے میں مسلمان کامیاب ہو سکیں۔ وہ گر یہ ہے ✚

کامیابی کا گر عبادت الٰہی اور دعا ہے۔

عبادت کرو۔ اور دعاؤں میں مشغول ہو جاؤ کیونکہ خدا کی مدد سے ہی یہ کام کر سکو گے۔ اور دوسرے یہ کہ نیک نمونہ سے لوگوں کے دلوں کو فتح کرو۔ الفاظ بدیوں کو نہیں مٹا سکتے بلکہ نیکیاں انہیں مٹاتی ہیں ✚

نیک تقدیر پیدا کرنے کا گر خود نیک نمونہ دکھاؤ

اَقِمِ الصَّلٰوةَ میں نیک تقدیر پیدا کرنے کا گر بتایا ہے اور اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ میں ان تدابیر کا ذکر کیا ہے جن سے بدیاں مٹائی جا سکتی ہیں۔ ایک تدبیر اس آیت سے یہ نکلتی ہے کہ خود نیک نمونہ دکھاؤ لوگ تمہاری نقل کریں گے۔ اس طرح قوم کی بدیاں دُور ہوتی جائیں گی۔ اگر ہم ذرہ غور سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ دُنیا کے بہت کم لوگ اپنے لئے سوچ کر راستہ تیار کرتے ہیں سوائے

کامیابی کیلئے استقلال بھی شرط ہے۔

انبیاء کے زمانہ کے کہ ان کے اتباع میں سے کثرت ان لوگوں کی ہوتی ہے جنہوں نے خود غور کر کے اپنے لئے راستہ تیار کیا ہوتا ہے۔ باقی زمانوں میں عام طور پر لوگ دوسروں کی نقل کر رہے ہوتے ہیں پس اچھا نمونہ قائم کرنا ایک بہت بڑا ذریعہ نیکی کے قائم کرنے کا ہے۔ ایسے آدمی کے گرد و پیش رہنے والے لوگ ضرور اس کی نقل کرتے ہیں اور اس طرح خود بخود ایک طبقہ بد اعمال سے نجات پا جاتا ہے ✚

دوسرا گر قوم کو وعظ و نصیحت کرنا ہے

دوسری تدبیر یہ نکلتی ہے کہ قوم کو وعظ و نصیحت کرو اس سے بھی بدیاں دُور ہوں گی اس صورت میں حسنات کے معنے اچھی باتوں کے کئے جائیں گے ✚

تیسری تدبیر یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگوں سے حُسنِ سلوک کا معاملہ کرو۔ اس سے شرارت مٹتی ہے جب لوگوں سے نیک معاملہ کرو گے تو ان کو بھی تم سے محبت پیدا ہوگی۔ اور وہ تمہاری باتوں کو قبول کریں گے ✚

اس آیت سے ذاتی ترقی کے بھی دو گر معلوم ہوتے ہیں (۱) ایک تو یہ کہ نیکیوں کی عادت سے بدیوں کی عادت دُور ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے جو شخص اپنے نفس کی اصلاح کرنا چاہے اُسے چاہیئے کہ جس بدی کی عادت ہو اس کے بالمقابل کی نیکیوں کی عادت ڈالے۔ اس سے خود بخود اس کی وہ بدیاں جن کی اسے عادت ہو چھوٹنے لگ جائیں گی (۲) دوسرا گر اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو گناہ انسان کر چکا ہو ان کے بدنتائج سے بچنے کا ذریعہ نیکی میں ترقی کرنا ہے جتنا جتنا وہ نیکی میں ترقی کرے گا اسی قدر وہ اپنے پچھلے گناہوں کے بدنتائج سے محفوظ ہوتا چلا جائے گا ✚

ن ۱۱۵ یعنی استقلال شرط ہے۔ جب اللہ تعالیٰ بداعمال کا نتیجہ نکالتا ہے۔ تو نیکی کا نتیجہ کیوں نہ نکالے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ گھبرانا اور کام کو چھوڑنا نہیں چاہیئے ✚

كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ

کیوں ان قوموں میں سے جو تم سے پہلے (زمانہ میں) تھیں ایسے عقلمند (لوگ) نہ نکلے جو (لوگوں کو) ملک میں بگاڑ پیدا

عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَ

کرنے سے روکتے سوائے چند ایک کے جنہیں ہم نے (انکے بدیوں سے رُکنے اور روکنے کی وجہ سے) بچا لیا۔ اور (باقی لوگ) جنہوں نے

اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ○

ظلم (کا شیوہ اختیار) کیا تھا اس (مال و متاع) کے پیچھے پڑ گئے جس میں (کہ) انہیں آسودگی بخشی گئی تھی اور مجرم ہو گئے ۱۱۱ھ

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ○

اور تیرا رب ایسا ہرگز نہیں ہے کہ (ملک کی) آبادیوں کو باوجود اس کے کہ ان کے رہنے والے اصلاح (کے کام) کرنے والے ہوں ہلاک کر دے ۱۱۲ھ

۱۱۱ھ **حل لغات**۔ اَلْبَقِيَّةُ۔ مَثَلٌ فِی الجَوْدَةِ وَالْفَضْلِ۔ کمال اور فضل بیان کرنے کے لئے اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔ يُقَالُ فُلَانٌ بَقِيَّةُ الْقَوْمِ اے من خِيَارِهِمْ۔ بقیّۃ القوم کے معنے قوم کے بہترین افراد کے ہوتے ہیں۔ اُولُوْ بَقِيَّةٍ اے مِنَ الرَّاْيِ والعقلِ اَوْ اُولُوا الْفَضْلِ۔ اولوا بقیہ سے مراد اچھی رائے والے عقلمند اور فضیلت والے لوگ ہوتے ہیں۔ (اقرب)

اَتْرَفَتِ النِّعْمَةُ زَيْدًا نَعَّمَتْهُ۔ نعمت نے زید کو آسودہ حال کر دیا۔ اَطْغَتْهُ و اَبْطَرَتْهُ نعمت نے اسے سرکش اور متکبّر بنا دیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی جب ہمیشہ سے۔ یہ قانون چلا آیا ہے کہ اگر لوگوں کی خبر نہ رکھی جائے تو لوگ بگڑتے چلے جاتے ہیں تو کیوں عقلمند لوگوں نے اپنی ذمہ واری کو نہ پہچانا اور اس بدی کے خمیر کو بڑھنے دیا جو آخر قوم کو تباہ کر دیتا ہے۔ اور کیوں نہ اس خمیر کو ہی ختم کر دیا۔ مگر افسوس کہ بہت کم لوگوں نے اپنی ذمہ واری کو سمجھا اور بجائے اس کے کہ عذاب کی حقیقت پر غور کر کے آئندہ سے اپنی قوم کو عذاب سے بچاتے پہلی تباہ شدہ قوموں کے اموال کے سمیٹنے میں لگ گئے اور خود بھی ظالم بن کر خدا تعالےٰ سے دُور جا پڑے۔

بقیہ

۱۱۲ھ **حل لغات**۔ اَصْلَحَ۔ ضِدُّ اَفْسَدَ۔ فساد کے خلاف معنے دیتا ہے۔ اَصْلَحَ الاَمْرَ۔ اَقَامَهُ بعد فسادِهٖ کام کے خراب ہونے کے بعد اسے درست کر دیا۔ اصلحَ بَيْنَ الْقَوْمِ۔ وَفَّقَ۔ آپس میں اتفاق کرا دیا۔ اَصْلَحَ اليه۔ اَحْسَنَ اليه۔ اس پر احسان کیا۔ (اقرب)

اصلاح

تفسیر۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ بغیر جرم کے عذاب دینا ظلم ہے آج مسلمانوں پر عذاب پر عذاب نازل ہو رہے ہیں پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ ہم صحیح راستہ پر قائم ہیں۔ گویا وہ خدا کو ظالم۔ مگر اپنے آپ کو نیک قرار دیتے ہیں۔

اترف

بغیر جرم کے عذاب دینا ظلم ہے

بڑے لوگوں کا خبر اہ نگہ نہ رکھنا مستوجب عذاب بنا دیتا ہے

اس آیت سے دو سبق حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) عذاب بغیر فساد کے نہیں آتا۔ پس جب عذاب کے آثار ظاہر ہوں تو ہوشیار ہو جانا چاہیئے۔

(۲) عذاب کو دُور کرنے کا گُر یہ ہے کہ قوم آپس میں صلح کرے۔ اور نیکی کا وعظ کرنا شروع کر دے۔ یعنی آپس

عذاب کو دور کرنے کا گر

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ

اور اگر تیرا رب اپنی (ہی) مشیت نافذ کرتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی جماعت بناتا۔ اور (چونکہ اس نے ایسا نہیں کیا)

مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ

وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے سوائے ان کے جن پر تیرے رب نے رحم کیا ہے۔ اور اسی (رحم کا مورد بنانے

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ

کے) لئے اس نے انہیں پیدا کیا ہے اور تیرے رب کا (یہ) فرمودہ یقیناً پورا ہو گا (کہ) میں جہنم کو یقیناً ان سب جنوں

وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝

اور انسانوں سے (جو اختلاف کا موجب بنتے ہیں) پُر کروں گا۔ ۱۱۳

میں اتحاد ہو۔ اور دوسروں کی بدیاں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ علاج ہی حقیقی علاج ہے۔کیونکہ کسی قوم میں تنزل کے آثار پیدا ہوجانے کی دو ہی وجہیں ہوتی ہیں (۱) قوم میں تفرقہ ہو (۲) اس میں کمزوریاں پیدا ہوجائیں۔ جب تنزل کے اسباب کو دُور کردیا جائے گا تو لازماً ترقی ہوگی ۔

تمت کلمت ربک کے معنے

نیکی کا نشان صبر میں ترقی ہے

۱۱۳ تفسیر اس آیت کو پچھلی آیات سے ملاکر معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان جتنا نیکی میں ترقی کرتا جائے اتنا ہی صبر میں بڑھتا جاتا ہے۔ اور جس قدر صبر میں ترقی کرتا ہے اسی قدر خدا تعالیٰ کی رحمتیں اس پر نازل ہوتی ہیں ۔

انسان کو رحم کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ سے مُراد یہی ہے کہ انسان کو رحم کے لئے پیدا کیا ہے نہ یہ کہ اختلاف کے لئے پیدا کیا ہے۔کیونکہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (ذاریات ع ۳) اور اسی طرح فرماتا ہے ورحمتی وسعت کل شیئ (اعراف ع ۱۹)

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ کا مطلب یہ ہے کہ متبعین شیطان سے جہنم کو بھردوں گا۔ نہ یہ کہ سب انسانوں کو۔کیونکہ اس جگہ ایک وعدے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔پس اس کے وہی معنے لئے جاسکتے ہیں جو اس وعدہ کے مطابق ہوں اور جب ہم اس وعدہ کی تلاش قرآن کریم میں کرتے ہیں تو کہیں بھی ہمیں یہ نظر نہیں آتا کہ میں سب انسانوں کو جہنم میں ڈالوں گا۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ وعدہ ملتا ہے کہ جب شیطان نے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی تو اس نے فرمایا کہ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ کہ تُو بیشک انسانوں کو ورغلا مگر یہ یاد رکھ کہ میں انسانوں میں سے جو تیرے تابع ہوں گے ان سب سے جہنم کو بھردوں گا (اعراف ع ۲) پس زیر تفسیر آیت میں سورہ اعراف کے وعدہ کا ہی ذکر ہے۔ کیونکہ اس کے سواء اس بارہ میں اور کوئی وعدہ قرآن کریم میں بیان نہیں ہے اور اس کے معنے یہی ہیں کہ متبعین شیطان کے ذریعہ سے جہنم کو

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ

اور ہم (اپنے) رسولوں کی خبروں میں سے اس سارے (کے سارے کلام) کو جس کے ذریعہ ہم تیرے دل کو ثبات بخشنے والے ہیں

بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى

تیرے پاس بیان کرتے ہیں۔ اور ان (خبروں کے ضمن) میں تیرے پاس کامل حق۔ اور مومنوں کے لئے ایک (تسلی بخش)

لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى

وعظ اور نصیحت آئی ہے ۱۲۱؎ اور جو (لوگ) ایمان نہیں لائے انہیں کہدے کہ تم اپنے درجہ کے مطابق کام کرتے جاؤ

بھرا جائے گا نہ یہ کہ مومنوں کو بھی بلا قصور ویسے گنہ اللہ تعالےٰ جہنم میں دھکیل دے گا ؀

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں اس وعدہ کا کیوں ذکر کیا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ اوپر فرمایا تھا کہ اللہ تعالےٰ نے بندہ کو رحم ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ پس طبعاً اس بیان پر یہ الجھن پیدا ہوتی تھی کہ جب انسان کو رحم کے لئے پیدا کیا تھا۔ تو پھر اسے سزا کیوں ملے گی۔ پس اس اُلجھن کو یُوں دُور کر دیا کہ بیشک ہم نے انسان کو پیدا تو رحم کے لئے ہی کیا تھا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جو لوگ شیطان کے پیرو ہوں گے۔ ان کے حق میں رحم کا وعدہ فوراً پورا نہ ہوگا۔ بلکہ جو شیطان سے جو ناری وجود ہے تعلق پیدا کریں گے انہیں اس مناسبت کی وجہ سے پہلے آگ میں ڈالا جاوے گا تا انہیں معلوم ہو جائے کہ نوری وجود کو چھوڑ کر انسان اپنے مقام سے کس قدر گِر جاتا ہے ؀

دُوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ ولذٰلك خلقھم میں فرمایا تھا - ہم نے انسان کو رحمت کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ اس لئے اسے رحمت میں ہی داخل کریں گے۔ اس سے سوال پیدا ہوتا تھا کہ ایک حصہ کے لئے تو آپ فرما چکے ہیں کہ میں ان کو جہنم میں داخل کروں گا وہ وعدہ کہاں گیا۔ تو اس کے جواب میں فرمایا کہ وہ وعدہ تو پورا ہو چکا ہے اب رحمت کا وعدہ پورا ہوگا۔ گویا یہ سوال اس وقت ہوگا کہ جب دوزخیوں کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا ؀

اس وعدہ الٰہیہ کے ذکر کی وجہ

دوزخیوں کے حق میں اس وعدہ کا پورا ہونا۔

۱۲۱؎ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے انبیاء کی اخبار بطور تاریخ بیان نہیں ہوئیں بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو ان میں بطور پیشگوئی بیان کیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان واقعات کے بیان کرنے سے آپ کو تسلی کس طرح ہو سکتی تھی۔ ہاں اگر انہیں پیشگوئی کے طور پر سمجھا جائے تو ضرور آپؐ کے لئے وہ واقعات تسلی کا موجب بن جاتے ہیں کیونکہ آپؐ کو اس طرح اپنی قوم کی شرارتوں اور اُن کے بُرے انجام اور آپؐ کی فتوحات کا علم ہو گیا کیونکہ سب انبیاء کا بروز ہونے کے لحاظ سے ضروری تھا کہ ان انبیاء کے حالات میں سے بھی آپؐ گزرتے۔ اور یہ جو فرمایا ہے کہ اس میں تیرے لئے حق آیا ہے اس سے مراد یہ سورۃ ہے اور اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ قصے بیان نہیں ہوئے بلکہ ایک پوری ہو کر رہنے والی بات بیان کی گئی ہے

قرآن کریم میں انبیاء کی اخبار بطور قصہ نہیں

جاءك فی ھذہ الحق کے معنی

مَكَانَتِكُمْ ۚ إِنَّا عَامِلُونَ ۝ وَانْتَظِرُوا ۚ إِنَّا مُنْتَظِرُونَ ۝

ہم (بھی جیسا کہ دیکھتے ہو اپنے درجہ کے مطابق) کام کر رہے ہیں ۱۱۵ اور تم (بھی انجام کا) انتظار کرو ہم (بھی) یقیناً انتظار کر رہے ہیں ۱۱۶

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ

اور آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ (تعالیٰ) ہی کے قبضہ میں ہے۔ اور اسی کی طرف اس تمام معاملہ کو لوٹایا جائے گا

كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ

پس تو اسی کی عبادت کر اور اس پر بھروسہ کر اور جو کچھ تم (لوگ) کرتے ہو اس سے

عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

تیرا رب ہرگز بے خبر نہیں ۱۱۷

نیز اس میں وعظ بھی ہے اور مومنوں کے فرائض بھی یاد دلائے گئے ہیں +

اعملوا علی مکانتکم کے معنے

۱۱۵ یعنی جھگڑے فساد کی ضرورت نہیں۔ جب ہمارے اعمال الگ الگ ہیں اور ہر اک ان کا ذمہ وار ہے تو نتائج خود بتا دیں گے کہ کون حق پر ہے اور کون نہیں۔ لڑنے جھگڑنے کی کیا ضرورت ہے +

کفار کا عذاب کے جلد آنے کا مطالبہ غلط ہے

۱۱۶ یعنی گھبرانا تو ہم کو چاہیئے نہ کہ تم کو کیونکہ تمہاری طرف سے دکھ ہم کو دیا جا رہا ہے مگر ہم صبر سے کام لے رہے ہیں اور تم گھبرا رہے ہو +

پیشگوئیاں پوری ہو کر رہیں گی

۱۱۷ یعنی گو بظاہر وہ پیشگوئیاں جو اس سورۃ میں کی گئی ہیں بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن نتائج کا نکالنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے پس گو یہ باتیں آج عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن وقت پر پوری ہو کر رہیں گی +

مومن کو بھی توجہ دلائی ہے کہ گو اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہو چکا ہے پھر بھی وہ غنی ہے اور اس کی کمزوریوں کی وجہ سے ممکن ہے کہ وہ اپنے فیصلہ میں دیر کر دے اس لئے اسے چاہیئے کہ عبادت میں لگا رہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل پر پورا یقین رکھے تاکہ اس کا عمل خدا تعالیٰ کے فیصلہ کو نازل کرنے میں ممد ہو +

سُوْرَةُ یُوْسُفَ مَكِّيَّةٌ

سورہ یوسف[1] یہ سورۃ مکی ہے

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ مِائَةٌ وَّاثْنَتَا عَشْرَةَ اٰيَةً وَّاثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا

اور بسم اللہ سمیت اس کی ایک سو بارہ آیتیں ہیں اور بارہ رکوع ہیں

[1] اکثر صحابہ کے نزدیک سورہ یوسف ساری کی ساری مکی ہے۔ لیکن ابن عباسؓ اور قتادہ کا قول ہے کہ پہلی تین آیات کے سوا باقی سب مکی ہے ✦

اس سورۃ کا تعلق پہلی سورۃ سے یہ ہے کہ سورہ یونس میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے ساتھ سلوک کے دو پہلو بیان فرمائے تھے۔ ایک سزا کا اور دوسرا رحم کا۔ سزا کے پہلو کو سورہ ہود میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کو پہلے اس لئے بیان کیا ہے کہ جب کفار کی جزاء کا وقت آیا ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے پہلے سزا کا معاملہ کیا گیا تھا اور سورہ یوسف میں رحم کا پہلو لیا گیا ہے۔ کیونکہ نبی کریمؐ کے آخری ایام میں رحم سے کام لیکر آپؐ کے مخالفوں کو معاف کر دیا گیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم النبیین ہیں آپؐ کے مخالفوں سے بھی قیامت کا سا معاملہ کیا گیا۔ وہاں بھی پہلے مجرموں کو دوزخ میں ڈالا جاوے گا۔ اور وہاں سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا ✦

اس سورۃ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں ایک ہی واقعہ تفصیل وبسط سے بیان کیا گیا ہے اور کسی سورۃ میں ایسا نہیں کیا گیا۔ باقی سورتوں میں ایک مضمون بیان ہوتا ہے اور مختلف واقعات کے چھوٹے چھوٹے فقرے تشریح کے لئے لائے جاتے ہیں اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تفصیلات میں بھی ملتی ہے۔ پس حضرت یوسفؑ کی تفصیلی زندگی بیان کی ہے۔ تا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آیندہ زندگی کے لئے بطور پیشگوئی ہو ✦

سورہ یونس میں رحم کی مثال کے لئے یونس علیہ السلام کا واقعہ لیا تھا۔ اور یہاں تفصیل میں آکر یوسف علیہ السلام کو لیا ہے۔ اس کی ایک تو یہ وجہ ہے کہ حضرت یونسؑ کے واقعہ میں جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں صرف انجام کی مشابہت ہے اور درمیانی تفصیلات کی مشابہت نہیں۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات میں نہ صرف انجام کی مشابہت ہے بلکہ درمیانی واقعات میں بھی ہے

دوسری وجہ یہ ہے کہ یونس علیہ السلام کے واقعہ میں صرف یہ مشابہت ہے کہ وہاں بھی قوم بچ گئی۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم بھی بچ گئی لیکن یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ کو مزید مشابہت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خاندان کو انہی کے ذریعہ سے نجات دی۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کی بخشش کا اعلان بھی خود آپؐ ہی کے منہ سے کرایا۔ برخلاف حضرت یونسؑ کی قوم کے کہ ان کی نجات کا اعلان حضرت یونسؑ کے ذریعہ سے نہیں ہوا بلکہ خدا تعالیٰ کے فعل کے ذریعہ سے ہوا ✦

حاشیہ: [1] یہ سورۃ مکی ہے — سورہ یوسف کا سورہ ہود سے تعلق — سورہ یونس میں تفصیلات کو چھوڑ کر سورہ یونس میں صرف انجام کو ذکر کرنے کی وجہ — سزا کے پہلو کو پہلے بیان کرنے کی وجہ — سورہ یوسف کی ایک خصوصیت کہ اس میں ایک ہی نبی کے حالات تفصیلاً پیش کئے گئے ہیں — آنحضرت کی اور حضرت یوسف کی زندگیوں کی تفصیل میں مماثلت۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(میں) اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞ اِنَّآ

الٓرٰ یہ (حقائق کو) روشن کرنے والی کتاب کی آیات ہیں ۲؎ اس (لپنے مطالب کو)

اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○

خوب واضح کرنے والے قرآن کو یقیناً ہم نے اُتارا ہے تاکہ تم (اس میں) عقل (اور تدبّر) سے کام لو۔ ۳؎

اس سورۃ میں بھی رؤیت کے مضامین پر بحث ہے

۲؎ الٓرا۔ میں اللہ ہوں جو دیکھتا ہوں۔ اس سورۃ میں بھی رؤیت کے مضمون پر بحث کی گئی ہے اور بتایا ہے کہ اس رسولؐ کے حالات یوسفؑ کے حالات سے ملتے ہیں۔ پس اگر اس کے انجام کے ظہور سے پہلے اسے مفتری کہنا درست نہ تھا تو اسے مفتری کیونکر کہا جاسکتا ہے +

یہ نشانات بعید کی تکمیل کی بنا پر ہے

تِلْكَ کے لفظ سے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس سورۃ میں جو پیشگوئی بیان ہوئی ہے وہ تم کو بعید نظر آتی ہے۔ لیکن وہ ایک دن ضرور ہی پوری ہو کر رہے گی +

لفظ مبین میں دلائل کی طرف اشارہ ہے

مُبِیْن کہہ کر بتایا ہے کہ یہ کتاب دلائل اور براہین ساتھ رکھتی ہے۔ اور نہ صرف خود واضح ہے بلکہ اپنے سے پہلی کتب پر بھی روشنی ڈالتی ہے +

اس لفظ میں قرآن کریم کی جامعیت کی طرف بھی اشارہ ہے

اس لفظ سے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو قرآن کریم پر آیندہ ہونے والے تھے۔ یعنی اس میں پچھلی کتب کی بیان کردہ تاریخ سے اختلاف ہے اور بتایا ہے کہ قرآن کریم کا تو فرض ہے کہ پچھلی کتب کی غلطیوں کو بیان کرے پھر اختلاف کیوں نہ ہو +

اس سورۃ میں لفظ مبین رکھنے کی وجہ

اس سورۃ میں مُبِیْن کا لفظ اختیار کیا گیا ہے اور سورہ ہود میں فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ کہا گیا تھا اس کی یہ وجہ ہے کہ سورہ ہود میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایسے مضامین کے بیان کئے گئے تھے جن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ثابت ہوتی تھی۔ اور یہاں ایک ہی لمبا مضمون چلا جاتا ہے پس چونکہ فَصَّلَ کے معنے الگ الگ کرنے کے ہیں وہاں فُصِّلَتْ کا لفظ رکھا گیا اور یہاں مُبِیْن کا لفظ رکھا گیا۔ جس کے معنے وضاحت کے ہیں +

اس لفظ میں قرآن کریم کے ذاتی کمال کی طرف بھی اشارہ ہے

مُبِیْن کے لفظ سے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن کریم اپنی ذات میں کامل کتاب ہے اور اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے بیرونی دلیل کی محتاج نہیں بلکہ خود ہی دعویٰ بیان کرتی ہے اور خود ہی دلیل بھی دیتی ہے +

مُبِیْن کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ وصول الی اللہ کے لئے جس قدر امور کی ضرورت ہے ان کو یہ کتاب واضح کر دیتی ہے۔ اسی طرح تمام وہ امور جو احکام یا اخلاق فاضلہ یا اعتقادات صحیحہ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں یہ ان سب کو بیان کرتی ہے +

عَرَبِیٌّ

۳؎ حل لغات۔ عَرَبِیٌّ کا لفظ عَرَبٌ کی طرف منسوب ہے۔ اور عَرَبٌ عَرِبَ یَعْرَبُ کی

مصدر بھی ہے اور صفت مشبہ بھی۔ اور نیز یہ عَرُبَ کی مصدر ہے۔ اور یہ ملک عرب کا نام بھی ہے۔ اور اس ملک کی اصلی اور پُرانی باشندہ قوم کا نام بھی ✣

عَرِبَ کے معانی حسب ذیل ہیں۔ جن میں سے ہر ایک میں پُری اور بھرا ہُوا ہونے کا مفہوم پایا جاتا عَرِبَت المعدۃُ عَرَبًا تغیّرت وفسدت۔ زیادہ کھانے سے فساد معدہ ہو گیا۔ عَرِبَ الجُرْحُ نُکِسَ وغفر وبقی اثرُہُ بعد البرء۔ زخم اوپر سے اچھا ہو کر اندر سے از سرِ نو بھر گیا۔ اور اس کا مُنہ بند رہا۔ تَوَرَّم وتَقَیَّحَ۔ زخم پھُول گیا۔ اور اس میں پیپ پڑ گئی۔ فُلَانٌ فَسَدَتْ معدتہ۔ اسے بدہضمی ہو گئی نَشِطَ۔ اس کے جسم میں چُستی پیدا ہو گئی۔ اور امنگ سے بھر گیا۔ فصح بعد لکنۃ۔ بغیر کسی رکاوٹ کے خوب بولنے لگ گیا۔ اور اس کی صفت مشبہ بھی عَرِبٌ ہی آتی ہے۔ النهر غمر۔ اور جب یہ لفظ نہر یا دریاء کے لئے بولا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں بھر گیا اور اس کا پانی بہت اونچا ہو گیا۔ (اقرب) ✣

پس عَرَبٌ مصدر کے ان تمام معانی کا قدر مشترک بھرا ہُوا ہونا۔ یا بھر جانا۔ ہوا۔ جس کے ساتھ یاء نسبت کے لگنے سے اس کے معنے ہوئے خوب بھری ہوئی چیز۔ کیونکہ یاء نسبت کے لگانے سے وصفی معنے کے علاوہ مبالغہ کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے اور عَرِبٌ صفت مشبہ کے معنے بھری ہوئی چیز کے ہوئے۔ اور جب اس کے ساتھ یاء نسبت لگائی جائے تو جس طرح اَحْمَرُ کے مقابلہ میں اَحْمَرِیٌّ کے معنے بہت سرخ کے۔ اور عَبْقَرٌ کے مقابلہ میں عبقری کے معنی نہایت ہی اعلےٰ درجہ کی چیز کے ہوتے ہیں اسی طرح اس کے معنے ہوں گے۔ خوب بھری ہوئی چیز۔ اور جب یہ لفظ کسی کتاب کی صفت واقع ہو تو ان معنوں کی رو سے کِتَابٌ عَرَبِیٌّ کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ نہایت پُر معانی کتاب ہے۔ کیونکہ جس چیز سے کسی کتاب کو بھری ہوئی کہا جا سکتا ہے وہ اس کے معانی اور مطالب ہی ہو سکتے ہیں۔ اور جب ایک زبان کو اس صفت سے موصوف کریں گے تو اس کا یہ مدعا ہو گا کہ اس کے مفردات نہایت ہی کثیر المعانی اور وسیع مفہوم رکھنے والے ہیں ✣

اور عَرُبَ عَرَبًا کے معنے ہیں کَانَ عَرَبِیًّا خالصًا ولم یلحن۔ تَکَلَّمَ بِالعَرَبِیَّۃِ وکان عربیًا فصیحًا۔ زبان کا ہر ایک نقص سے پاک اور خالص عربی اور خوب واضح ہونا۔ فصیح عربی بولنا اور اپنے مدعا کو بہت خوبی کے ساتھ واضح کرنا (اقرب)

اور یائے نسبت کے لگانے سے اس کے معنے نہایت فصیح اور خوب واضح ہر ایک نقص سے بالکل پاک کے ہو جائیں گے۔ اور ان معنوں کی مزید وضاحت اس لفظ کی مختلف تصریفات سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ اقرب الموارد میں ہے۔ اَعْرَبَ الشَّیْءَ اَبَانَہٗ وَ اَوْضَحَہٗ۔ خوب بیّن اور واضح کر دیا۔ عَنْ حَاجَتِہٖ اَبَانَ عَنْھَا کھول کر بیان کیا۔ کَلَامَہٗ حَسَّنَہٗ وَ اَفْصَحَ وَلَمْ یَلْحَنْ فِی الْاِعْرَابِ۔ بات میں حُسن پیدا کیا۔ اور اُسے خوب واضح کیا۔ اور تلفظ میں بھی کوئی غلطی نہ کی۔ بِحُجَّتِہٖ اَفْصَحَ بِھَا۔ اپنی بات خوب کھول کر مدلل طور پر بیان کی۔ اور مفردات راغب میں ہے۔ اَلْعَرَبِیُّ اَلْمُفْصِحُ۔ عربی کے معنی ہیں اپنے مدعا کو خوب صفائی اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والا۔ والاِعْرَابُ اَلْبَیَانُ۔ اور اعراب کے معنے کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں۔ پس ان معنوں کی رُو سے قُرْاٰنٌ عَرَبِیٌّ کے معنی ہوئے ایسی کتاب جو ہمیشہ پڑھی جانے والی اور اپنے مطالب کو نہایت وضاحت کے ساتھ اور مدلل طور پر بیان کرنے والی ہے ✣

قرآن کریم بکثرت لکھا بھی جائے گا اور پڑھا بھی جائیگا

تفسیر۔ ان آیات میں نہایت لطیف طور پر

دو دعوے قرآن شریف کے متعلق بیان کئے ہیں۔ (۱) پہلی آیت میں قرآن کریم کا نام الکتاب رکھ کر بتایا تھا کہ وہ ہمیشہ لکھا جایا کرے گا۔ اور کتابی صورت میں ہی رہے گا۔ اور دوسری آیت میں قرآناً عربیاً کہہ کر یہ بتایا ہے کہ وہ ہمیشہ پڑھا جائے گا۔ کیونکہ بعض کتب ایسی ہیں جو لکھی تو بہت جاتی ہیں لیکن پڑھی نہیں جاتیں۔ جیسے انجیل۔ کہ چھپتی بہت ہے لیکن پڑھی کم جاتی ہے۔ اور بعض کتابیں لکھی کم جاتی ہیں لیکن پڑھی زیادہ جاتی ہیں جیسے گرنتھ وغیرہ۔ لیکن کسی کتاب کے پورے طور پر محفوظ رہنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ بکثرت لکھی بھی جائے اور پڑھی بھی جائے۔ اور یہ خصوصیت صرف قرآن کریم کو حاصل ہے ✦

عربی زبان کی بعض خصوصیات

عَرَبِيًّا۔ یوں تو اس کے معنے عربی زبان کے ہی ہیں۔ لیکن عربی کا لفظ عرب سے نکلا ہے جس کے معنے بھرنے اور کثرت کے ہوتے ہیں اور جیسا کہ حل لغات میں بتایا جاچکا ہے۔ ع ر ب سے مشتق الفاظ جتنے بھی ہیں ان سب میں بھرنے اور کثرت کے معنے پائے جاتے ہیں۔ پس عربی زبان کو اسی وجہ سے عربی کہتے ہیں کہ اس کے معنوں میں بہت وسعت ہے اور اس کے مادے بہت زیادہ ہیں۔ ہر مضمون جو بیان کرنا چاہو اس کے لئے اس میں سامان موجود ہے۔ چنانچہ یورپین لوگوں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ یہ زبان مادوں کے لحاظ سے بہت مکمل اور وسیع ہے۔ مثلاً لین پول مشہور مصنف جس نے تاج العروس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب میں حسرت سے لکھتا ہے کہ عربی جیسی زبان ہمیں کوئی نظر نہیں آتی۔ لاکھوں مادے عربی زبان میں پائے جاتے ہیں اور ہر مادہ بامعنی ہے جس کے اندر ضرور کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے

عربی زبان کے مکمل ہونے کا کمال حضرت مسیح موعودؑ نے ہی ثابت کیا ہے

عربی زبان سے تدبر کا خاص تعلق

چنانچہ ابن جنی نے جو ایک بہت بڑا ادیب ہے اپنے استاد بو علی کا یہ دعویٰ بیان کیا ہے کہ عربی زبان کے حروف میں ہی معنوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور مثال کے طور پر اس نے۔ ك۔ ل۔ م۔ کو پیش کیا ہے کہ جب یہ حروف آپس میں مل کر استعمال ہوں تو قوت و طاقت کے معنے ضرور ان میں ملحوظ ہوتے ہیں۔ مثلاً مَلِكٌ بادشاہ۔ مَلَكٌ فرشتہ۔ كَلْمٌ زخم لکم تھپڑ وغیرہ۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ گو حروف آگے پیچھے ہوگئے ہیں اور معنے بدلتے چلے گئے ہیں لیکن سب کے سب الفاظ میں قوت و طاقت کی طرف اشارہ ہے اسی طرح عَرَبٌ کا لفظ ہے اس کے بھی جس قدر مشتقات ہیں سب میں بھرنے اور بہت ہو جانے کے معنے پائے جاتے ہیں جیسے عَبور رُعب وغیرہ ✦

عربی زبان کے ان کمالات کی طرف گو پہلے آئمہ زبان نے بھی توجہ دلائی ہے لیکن یہ حقیقت کہ یہ زبان ام الالسنہ ہے یعنی سب زبانیں اسی میں سے نکلی ہیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانی سلسلہ احمدیہ نے ہی ظاہر کی ہے اور اس مضمون پر ایسے لطیف پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے کہ کوئی اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا۔ افسوس کہ آپ کی کتاب نامکمل رہ گئی ہے مگر اصول بیان ہوچکے ہیں۔ ایک صاحب نے اسکی نقل میں ایک کتاب لکھی ہے لیکن افسوس کہ حقیقت کو بوجہ لاعلمی ملیا میٹ کردیا ہے ✦

لعلکم تعقلون۔ یعنی اس زبان میں اس کلام کو اس لئے اُتارا ہے کہ تاتم پورا فائدہ اُٹھا سکو۔ مگر یہ قرآن عربی نہ ہوتا۔ یعنی ایسی زبان میں نہ آتا جو ہر مفہوم کو ادا کرسکتی ہے تو لوگ پورا فائدہ نہ اُٹھا سکتے ✦

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ

ہم تیرے پاس (ہر امر کی) بہترین طور پر بیان کرتے ہیں کیونکہ

اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ

ہم نے اس قرآن کو تیری طرف (حقائق پر مشتمل) وحی (کے ذریعہ سے نازل) کیا ہے۔ اور اس سے

قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ○ اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ

پہلے یقیناً تو (ان حقائق سے) بے خبروں میں سے تھا ؎ (تو یاد کر اس وقت کو) جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا

؎ **حل لغات**۔ قَصَّ يَقُصُّ قَصًّا وَقَصَصًا اَثَرَهٗ تَتَبَّعَهٗ شَيْئًا بَعْدَ شَيْءٍ۔ اس کا نشان تلاش کرتے ہوئے اس کے پیچھے گیا۔ وَمِنْهُ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا۔ ای رجعا فی الطریق الّذی سلکاھا یقصّان الاثر۔ اور انہی معنوں میں قرآن کریم کی آیت فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا۔ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ قَصَّ عَلَيْهِ الْخَبَرَ وَالرُّؤْيَا حدّثہ بھما علٰی وجھھما بات کو بے کم و کاست بیان کیا۔ ٹھیک طور پر بیان کیا۔ ومنہ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ۔ ای نُبَيِّنُ لَكَ اَحْسَنَ الْبَيَانِ۔ اور انہی معنوں میں سورۂ یوسف کی آیت نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ میں یہ لفظ آیا ہے۔ یعنی ہم تیرے سامنے ٹھیک ٹھیک بات بیان کرتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسفؑ کے واقعہ کے متعلق دنیا میں اختلاف تھا اور قرآن کریم دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اس اختلاف کا فیصلہ کرے گا اور جو اصل واقعہ ہے اس کے چہرہ پر سے باطل کا نقاب اُٹھا دے گا۔ تبھی تو فرماتا ہے کہ ہم بے کم و کاست اصل واقعہ بیان کریں گے۔ اگر دُنیا میں یہ واقعہ مشتبہ نہ ہوتا تو ان الفاظ کے استعمال کی ضرورت ہی کیا تھی۔ مگر تعجب ہے یوروپین محققین پر جنہوں نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ حضرت یوسفؑ کا واقعہ قرآن کریم سے پہلے ہی مختلف فیہ ہو چکا تھا۔ اور تاریخی طور پر مجروح ہو گیا تھا اور صرف اس امر کو دیکھ کر کہ قرآن کریم میں یہ واقعہ بائبل سے مختلف طور پر بیان ہوا ہے اس پر حملہ کر دیا ہے

چنانچہ ایک مشہور جرمن برنکمین نے نولس آن اسلام صفحہ ۱۱۲ پر لکھا ہے کہ ایک مسلمان پر قرآن کو بائبل سے ادنیٰ ثابت کرنے کا بہترین ذریعہ یہی ہے کہ اس کے سامنے دونوں کتابوں میں سے یوسف کے واقعہ کو پیش کر دیا جائے۔ قرآن شریف نے ایک خوبصورت اور درد انگیز واقعہ کو نہایت خراب اور بدنما صورت میں پیش کیا ہے۔ اس اعتراض نے درحقیقت قرآن کریم کی سچائی کو ثابت کر دیا ہے کیونکہ اس کا یہ دعویٰ کہ ہم بلا کم و کاست بیان کریں گے ثابت کرتا ہے کہ قرآن کریم کا نازل کرنے والا جانتا تھا کہ لوگ اس کے بیان کردہ واقعات پر اعتراض کریں گے باقی رہا برنکمین صاحب کا یہ اعتراض کہ قرآن کریم نے ایک خوبصورت، واقعہ کو خراب شکل میں پیش کیا ہے سو اس کا جواب اگلی آیتوں میں آ جائے گا اور پڑھنے والوں کو خود معلوم ہو جائے گا کہ کس نے واقعہ کو بدنما صورت میں پیش کیا ہے ۰

اور یہ جو فرمایا کہ اس واقعہ کے بے کم و کاست بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے تیری طرف قرآن کریم

قَصَّ

واقعہ یوسفؑ کے پیش نظر برنکمین کا قرآن کریم پر حملہ اور اس کا جواب

یوسفؑ کے واقعہ کے متعلق دُنیا میں اختلاف تھا۔

بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ کے معنی

یٰٓاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ

(تھا) کہ اے میرے باپ (یقین مانیے) میں نے گیارہ ستاروں کو اور سورج

وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ۝ قَالَ یٰبُنَیَّ لَا

اور چاند کو (بھی) (رؤیا میں) دیکھا ہے (اور پھر مزید تعجب اس پر ہے کہ) میں نے انکو اپنے سامنے سجدہ کرتے دیکھا ہے ۵ اس نے کہا اے میرے پیارے بیٹے

نازل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہونے والا تھا کیونکہ قرآن کریم کے نزول کے ساتھ یوسف علیہ السلام کے قصہ کے بیان کرنے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں اس امر کا ضرور تعلق ہے کہ ان پیشگوئیوں کو بیان کیا جائے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہیں تاکہ لوگوں کو قرآن کریم کی سچائی پر اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر یقین حاصل ہو ✦

اَبَتِ

دوسرے یہ معنے ہو سکتے ہیں کہ حامل قرآن نے چونکہ مثیل یوسف ہونا تھا اس وجہ سے ضروری تھا کہ اسے اس کے حالات زندگی بتائے جائیں ✦

مِنَ الْغٰفِلِیْنَ میں کس بات سے بےخبری کی طرف اشارہ ہے۔

اور یہ جو فرمایا ہے کہ تو اس سے پہلے بےخبر تھا اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ تو اس واقعہ سے غافل تھا۔ کیونکہ نہ تو تورات میں ہی ایک جگہ تمام صداقتیں جمع کی گئی ہیں اور نہ طالمود میں ہی کوئی سچائی کسی جگہ ہے اور کوئی کسی جگہ۔ عیسائی کہتے ہیں کہ جبکہ یہ واقعہ بائبل میں موجود تھا تو آپ بےخبر کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو واقعہ بائبل میں بیان کیا گیا ہے وہ اَور ہے اور قرآن کریم کا بیان کردہ اَور ہے۔ اور جیسا کہ میں آیندہ ثابت کروں گا قرآن کریم کا بیان ہی درست ہے اور جہاں جہاں اس سے بائبل نے اختلاف کیا ہے اس میں بائبل نے ٹھوکر کھائی ہے ✦

قرآن کریم کے اور بائبل کے بیانوں میں پہلا فرق۔ طریق ابتداء کا ہے

دوسرے یہ معنے ہیں کہ تجھے بھی اس بات کا علم نہ تھا کہ تیرے ساتھ بھی یہ واقعات پیش آنے والے ہیں جیسا کہ یوسف علیہ السلام کو معلوم نہ تھا کہ ان کے ساتھ کیا واقعات پیش آنے والے ہیں ✦

۵ **حل لغات۔** اٰبَتِ اصل میں اَبِیْ ہے یعنی "میرے باپ"۔ لیکن عربی زبان کے قاعدہ کے مطابق کہ اَبِیْ اور اُمِّیْ کی یاءِ متکلم کو ندا کے وقت تاءِ مکسورہ سے بدل دیتے ہیں اور یَا اَبَتِ اور یَا اُمَّتِ کہدیتے ہیں اور اس سے ایک رنگ بےتکلفی اور محبت کا پیدا کر دیتے ہیں اس جگہ یَا اَبَتِ استعمال ہوا ہے ✦

تفسیر۔ چونکہ بعض مسیحی مصنفوں نے قرآن پر حملہ کیا ہے اس لئے میں ساتھ ساتھ ہی وہ فرق بتلاتا جاؤں گا جو بائبل اور قرآن کریم کے بیان میں ہے۔ پہلا فرق تو یہ ہے کہ بائبل میں اس واقعہ کے بیان کو حضرت یوسفؑ کے نسب نامہ سے شروع کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اس کو یوسفؑ کی اس خواب سے شروع کیا ہے جو کہ یوسفؑ کی ساری زندگی کے واقعات کے لئے نقطۂ مرکزیہ کے طور پر ہے اور آپ کی زندگی کے سب نشیب و فراز اسی پر مبنی ہیں۔ اور نسب نامہ وغیرہ کو جو مورخین کا کام ہے چھوڑ دیا گیا ہے۔ پس اگر اور فرقوں کو چھوڑ کر محض شروع ہی کے لحاظ سے دونوں کے بیانوں میں فیصلہ کیا جائے اور کسی مبصر کے سامنے دونوں بیانوں کو رکھ کر اس سے پوچھا جائے کہ قرآن کریم اور بائبل میں سے کس کا شروع

اچھا ہے۔ تو وہ یہی کہے گا کہ قرآن کریم نے عمدہ طور پر اس واقعہ کو شروع کیا ہے۔ وہ چیز جس نے یوسفؑ کو کامیاب بنایا۔ اس کی زندگی میں تغیر پیدا کیا۔ اس کے بھائیوں کو دشمن بنا دیا اور پھر آخر غلام بنا کر اس کے قدموں میں لا ڈالا۔ یہی خواب تھی۔ پس اگر یوسفؑ کا اس زندگی کو جس سے دُنیا سبق حاصل کر سکتی ہے پیش کرنا مقصود ہو تو اس خواب سے بہتر ابتداء اس کے لئے نہیں مل سکتی +

دوسرا فرق بائبل کے بیان اور قرآن کریم کے بیان میں یہ ہے کہ قرآن کریم میں گیارہ ستاروں کا پہلے ذکر ہے اور سورج اور چاند کا بعد میں لیکن بائبل میں اس کے برخلاف ہے۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے۔ "پھر اس نے دوسرا خواب دیکھا اور اسے اپنے بھائیوں سے بیان کیا۔ اور کہا کہ دیکھو میں نے ایک خواب دیکھا کہ سورج اور چاند اور گیارہ ستاروں نے مجھے سجدہ کیا اور اس نے یہ اپنے باپ اور بھائیوں سے بیان کیا" (پیدائش باب ۳۷ آیت ۹ و ۱۰) اس اختلاف سے قرآن کریم کی برتری اور بائبل کی کمزوری نہایت واضح ہو جاتی ہے قرآن کریم اور بائبل دونوں متفق ہیں کہ ستاروں سے مُراد بھائی اور سورج اور چاند سے مُراد ماں باپ ہیں۔ لیکن جیسا کہ بائبل خود تسلیم کرتی ہے حضرت یوسف علیہ السّلام کے عزّت پا جانے کے بعد پہلے ان کے بھائی ان سے ملے ہیں اور ادب سے ان کے سامنے جُھکے ہیں اُس کے بعد ان کے باپ اور ماں ان کے پاس آئے ہیں۔ پس وہ ترتیب جو قرآن کریم نے رؤیا کی بیان کی ہے درست ہے اور بائبل کی بیان کردہ ترتیب خود اس کے اپنے بیان کے مطابق غلط ہے یقیناً رؤیا میں انہی وجودوں کو پہلے دکھایا گیا ہوگا جنہوں نے پہلے یوسفؑ کے سامنے سر جھکانا تھا اور انہیں پیچھے دکھایا گیا ہوگا جنہوں نے بعد میں زیر سایہ آنا تھا۔

لفظ سجدہ سے مراد

اس آیت میں جو سجدہ کا لفظ آیا ہے اس سے مُراد یہ نہیں کہ واقعہ میں وہ سجدہ کریں گے بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ ان کے تابع ہو جائیں گے اور ایسا ہی ہُوا کیونکہ حضرت یوسفؑ کے بھائی اور ماں باپ مصر میں آکر بس گئے جہاں وہ وزارت کے مرتبہ پر فائز تھے اور اس طرح وہ لوگ ان کے تابع فرمان ہو گئے۔

دوسرا فرق۔ قرآن کریم نے ستاروں کا ذکر پہلے اور سورج چاند کا بعد میں کیا ہے۔

رُوح المعانی میں لکھا ہے کہ ماں باپ اور بھائیوں کی اطاعت چونکہ معمولی بات ہے پس یہاں سورج اور چاند سے کچھ اور مُراد لینا چاہیئے مصنف کتاب کی رائے ہے کہ سورج سے مراد درحقیقت بادشاہ اور چاند سے مُراد وزیر اور گیارہ ستاروں سے مُراد ارکین دولت اور رؤساءِ دیار ہیں۔ لیکن یہ معنے درست نہیں کیونکہ بادشاہ یوسفؑ کے ماتحت نہیں ہُوا۔ بلکہ وہ بادشاہ کے ماتحت تھے اور اس کے قوانین پر چلتے تھے۔ چنانچہ اس پر قرآن کریم شاہد ہے فرماتا ہے۔ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ (یوسف رکوع ۹) یوسف علیہ السّلام اپنے بھائی کو شاہی قانون کے مطابق نہیں روک سکتے تھے (۲) بادشاہ کسی وزیر کا خواہ کتنا ہی احترام کرے اسے سجدہ کے لفظ سے موسوم نہیں کر سکتے کیونکہ وہ احترام اطاعت کا نہیں ہوتا بلکہ شفقت کا ہوتا ہے۔ اور سجدہ چونکہ کمال اطاعت کی ظاہری تمثیل کا نام ہے اس لئے اظہار اطاعت کی شکلوں پر ہی مجازاً بھی اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے ماں باپ اور بھائی کی اطاعت بھی بڑی بات ہے۔ کیونکہ عام طور پر ماں باپ اپنی اولاد کے

سورج چاند اور ستاروں سے مراد بادشاہ اور ارکان سلطنت نہیں ہو سکتے۔

بادشاہ و وزراء سجدہ کی نہیں بلکہ والدین اور بھائیوں کی اطاعت بھی بڑی چیز ہے۔

تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ

(اپنی یہ) رؤیا اپنے بھائیوں کے پاس نہ بیان کیجیو ورنہ وہ تیرے متعلق (ضرور) کوئی

كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ

(مخالفانہ) تدبیر کریں گے شیطان انسان کا یقیناً (کھلا) کھلا دشمن

ماتحت نہیں ہوتے پھر یہاں تو معاملہ ہی اور ہے حضرت یوسف نے بچپن کی عمر میں خواب دیکھا ہے جس پر بتایا گیا ہے کہ ایک دن ان کے بھائی اور ماں باپ ان کی اطاعت میں آجائیں گے کون شخص اس قدر عرصہ پہلے یہ بتا سکتا ہے کہ وہ زندہ رہے گا اور ترقی کرے گا اس کے گیارہ بھائی اور ماں باپ بھی زندہ رہیں گے اور ایک دن اس کے حکم کے نیچے آجائیں گے حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ خواب دیکھی ہے ان کی عمر صرف گیارہ بارہ سال کی تھی اور ان کے والد کی عمر پچاسں سے اوپر تھی۔ پس ایسے وقت کی خواب کا پورا ہونا معمولی ہرگز نہیں کہلا سکتا ✦

خواب کا پورا ہونا بھی علامت کا ثبوت ہے۔

یوسف کے بھائیوں کے نام۔

گیارہ ستاروں کی تعبیر میں میں نے بتایا ہے کہ گیارہ بھائی ہیں ان کے نام بائبل سے یہ معلوم ہوتے ہیں۔ (۱) روبن۔ (۲) شمعون۔ (۳) لاوی۔ (۴) یہودا۔ (۵) دان۔ (۶) نفتالی۔ (۷) جد (۸) آشر (۹) اشکار (۱۰) زبلون۔ (۱۱) بنیامین۔ ان سب کے معنے بھی بائبل نے بتائے ہیں اور سب کے سب عجیب وغریب ہیں سوائے بن یامین کے سب نام ماؤں نے رکھے ہیں ✦

رسول کریمؐ کی مماثلت حضرت یوسفؑ سے سب سے پہلی وحی الٰہی میں

تیسری مماثلت سب سے پہلی وحی اپنے قومی بزرگ ورقہ بن نوفل کو سنانا۔

اس واقعہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوسف علیہ السلام سے دو مشابہتیں ہیں۔ اول آپؐ پر بھی غار حراء میں جو سب سے پہلی وحی آئی اس میں آپ کی سب قوم پر فضیلت پا جانے کی خبر تھی کیونکہ اس میں فرمایا گیا تھا کہ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ یعنی سب سے کرم رب کی مدد سے یہ کلام تُو لوگوں کو سنا یعنی وہ تجھے بھی سب سے مکرم بنا دے گا اور تیری معرفت لوگوں کو وہ بات سکھائیگا جو پہلے لوگوں کو نہیں سکھائی تھی۔ یعنی تُو موجودہ زمانہ کے لوگوں سے بھی کرم ہوگا اور پہلے لوگوں سے بھی۔ کیونکہ تجھے وہ کچھ ملے گا جو پہلے انبیاء کو بھی نہیں ملا۔ گویا تُو بھائیوں کا بھی سردار ہوگا۔ اور اپنے رُوحانی آباء کا بھی یعنی انبیاء کا بھی۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ۔ جس قدر انسان ہیں جن میں پہلے انبیاء بھی شامل ہیں۔ مَیں ان سب کا سردار ہوں۔ اور سردار کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اسی طرح فرمایا لَوْ كَانَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى حَيَّيْنِ لَمَا وَسِعَهُمَا اِلَّا اتِّبَاعِيْ۔ اگر موسیٰ اور عیسیٰ زندہ ہوتے تو میری اطاعت کے بغیر ان کو چارہ نہ ہوتا۔ (تفسیر ابن کثیر) غرض سب سے پہلی وحی ہی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تھا کہ آپؐ کے بھائی اور آپؐ کے بزرگ خواہ وہ کتنے پرانے ہوں سب آپؐ کے ماتحت ہوں گے اور آپؐ سب کے سردار ہوں گے ✦

دوسری مماثلت۔ سب سے پہلی وحی اپنے قومی بزرگ ورقہ بن نوفل کو سنانا

دوسری مشابہت

یہاں سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح یوسف علیہ السلام نے اپنی رؤیا اپنے باپ کو سنائی تھی اسی طرح

مُّبِیْنٌ ○ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ

اور (جیسا کہ تو نے دیکھا ہے) اسی طرح تیرا رب تجھے برگزیدہ کرے گا۔ اور (الہی) باتوں کی

تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ

حقیقت بیان کر کے تجھے علم بخشے گا اور تجھ پر اور یعقوب کی تمام (حقیقی) آل پر

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پہلی وحی حضرت خدیجہؓ کے کہنے پر اپنے خاندان کے ایک بزرگ کو سنائی جن کا نام ورقہ بن نوفل تھا۔

۵۶ حل لغات۔ بُنَیَّ اِبْنِیْ کی تصغیر ہے جو یاء ضمیر متکلم کی طرف مضاف ہے۔ اور تصغیر کے صیغہ سے مراد چھوٹی عمر کا بچہ نہیں۔ بلکہ پیار کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے باپ بڑی عمر کے لڑکے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کر سکتا ہے کیونکہ باپ کے لئے بیٹا چھوٹا ہی ہوتا ہے اور اس کے پیار کا مستحق۔ قرآن کریم میں بڑی عمر کے بیٹوں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے چنانچہ سورہ ہود میں ہی حضرت نوحؑ کا قول گذر چکا ہے کہ انہوں نے طوفان کے وقت اپنے بیٹے سے کہا یٰبُنَیَّ ارْكَبْ مَّعَنَا (ہود رکوع ۴) اسی طرح سورۃ لقمان میں لقمان کا قول ہے۔ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ (لقمان رکوع ۲)

كَادَهٗ يَكِيْدُهٗ كَيْدًا خَدَعَهٗ وَمَكَرَبِهٖ اسے دھوکہ دیا اور حیلہ بازی کی۔ وَالْاِسْمُ الْمَكِيْدَةُ۔ اور اس کا اسم مصدر مکیدۃ ہے جس کے معنی دھوکہ اور چالاکی کے ہیں۔ وعَلَّمَهُ الكيدَ۔ اور کاد کے ایک معنی ہیں اسے تدبیر سکھلائی۔ وبہ فُسِّرَ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ اے علّمناہ الکید علی اِخْوَتِہٖ۔ اور قرآن کریم میں یوسفؑ کے متعلق جو یہ لفظ آیا ہے اس کے بھی یہی معنے کئے گئے ہیں کہ ہم نے اسے تدبیر سکھائی۔ كَادَ لَهٗ۔ اِحْتَالَ لَهٗ اس سے حیلہ بازی کی۔ فلانًا حَارَبَهٗ۔ اس سے جنگ کی۔ اَرَادَهٗ بِسُوْءٍ۔ اس سے بدی کا ارادہ کیا اَلْكَيْدُ۔ اَلْمَكْرُ وَالْخُبْثُ۔ کید کے معنے مکر اور خباثت یعنی بدباطنی کے ہیں۔ الحیلۃ تدبیر الحرب جنگ۔ ارادۃُ مضرۃِ الغیرِ خفیۃً دوسرے کو پوشیدہ طور پر تکلیف پہنچانے کا ارادہ۔ وھو من الخلقِ الحیلۃ السیئۃُ ومن اللہ التدبیر بالحق لمجازاۃ اعمال الخلق۔ اور جب یہ کسی مخلوق کا فعل ہو تو اس کے معنے بُری تدبیر کے ہوتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنے نیکی اور مناسب تدبیر کے ہوتے ہیں جو انسانوں کے اعمال کا بدلہ دینے کے لئے اختیار کی گئی ہو۔ (اقرب)

تفسیر۔ بائبل اور قرآن کریم کے بیانات میں اس جگہ پھر اختلاف ہو گیا ہے اور پہلے کی طرح بائبل خود شاہد ہے کہ اس کا بیان غلط ہے قرآن کریم نے تو بتایا ہے کہ یوسفؑ نے اپنا یہ خواب پہلے اپنے والد کو سنایا اور اس نے انہیں منع کر دیا کہ بھائیوں کو یہ خواب نہ سنائیو۔ لیکن بائبل میں لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے پہلے اپنے بھائیوں کو یہ خواب سنایا۔ (پیدائش باب ۳۷ آیت ۹)

اس اختلاف میں بھی قرآن کریم ہی صادق ہے کیونکہ بائبل میں لکھا ہے کہ اس خواب کے دیکھنے سے پہلے یوسفؑ نے ایک اور خواب دیکھا تھا۔

بُنَیَّ

بائبل اور قرآن کریم کے بیان میں تیسرا فرق۔ یوسف نے صرف باپ کو اپنا خواب سنایا تھا۔

کَادَ

يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ

(اسی طرح) اپنے انعام کو پورا کرے گا جیسا کہ اس نے (اس سے) پہلے تیرے دو بزرگوں

اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۟ لَقَدْ

ابراہیم اور اسحٰق پر پورا کیا تھا۔ تیرا رب یقیناً بہت جاننے والا (اور) حکمت والا ہے ۵ؔ

ع ۱ ۱

اور اپنے بھائیوں کو سُنایا تھا چنانچہ لکھا ہے [۵] "اور یوسف نے ایک خواب دیکھا اور اسے اپنے بھائیوں سے کہا تب وے اس سے زیادہ متنفر ہوئے (پیدائش ۳۷) پھر لکھا ہے [۸] تب اس کے بھائیوں نے اسے کہا کہ کیا تو سچ ہمارا بادشاہ ہوگا یا تو ہمارا حاکم ہوگا؟ اور انہوں نے اس کے خوابوں اور اس کی باتوں سے اس کا زیادہ کینہ پیدا کیا (پیدائش ۳۷ ۸) ان دونوں خوابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اس خواب سے پہلے بھی ایک خواب دیکھی تھی اور جب انہوں نے وہ خواب اپنے بھائیوں کو سنائی تو انہوں نے اسے ڈانٹا اور اس سے نفرت کرنے لگے اور کینہ کرنے لگے۔ اب کیا عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ دوسری دفعہ جب انہوں نے ویسی ہی خواب دیکھی تو باپ کو سُنانے سے پہلے اپنے بھائیوں سے کہی ہوگی۔ عقل یہی کہتی ہے کہ اس دفعہ پہلے سلوک سے ڈر کر انہوں نے بھائیوں سے خواب نہیں کہی ہوگی بلکہ والد سے کہی ہوگی۔ پس قرآن کریم کا بیان خود بائبل کے دوسرے حوالجات کو مدنظر رکھتے ہوئے زیادہ معقول اور قابلِ قبول ہے ❖

بھائیوں کو خواب سنانے سے روکنے کی وجہ۔

یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھائیوں کو خواب سنانے سے منع کیا اسکی وجہ قرآن کریم نے خود ہی بتادی ہے اور وہ یہ کہ انہیں

کَذٰلِکَ کے معنی

رشک پیدا ہوگا کہ یہ لڑکا بڑا ہونے والا ہے اور غصہ میں وہ یہ نہ سوچیں گے کہ خواب دیکھنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے اور وہ محض اس وجہ سے کہ اس کے بڑا ہونے کی بشارت اسے ملی ہے اسے اپنے راستہ سے ہٹانے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ بائبل بھی اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ یوسفؑ کے بھائی اس وجہ سے اس سے ناراض تھے کہ یہ خوابیں دیکھتا ہے ❖

آنحضرتؐ اور حضرت یوسفؑ کی تیسری مماثلت

اس آیت میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت یوسفؑ کی ایک مشابہت بیان کی گئی ہے کیونکہ جس طرح حضرت یوسفؑ کو خواب سُنانے پر حضرت یعقوبؑ نے بتایا کہ اس رؤیا کو جب تیرے بھائی سُنیں گے تو تیری مخالفت کریں گے۔ اسی طرح جب ورقہ بن نوفل کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب سُنائی تو انہوں نے کہا کہ يَا لَيْتَنِيْ فِيْهَا جَذَعًا لَيْتَنِيْ اَكُوْنُ حَيًّا اِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ کہ کاش میں اس وقت مضبوط جوان ہوتا جب تیری قوم تجھے نکالے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پوچھنے پر کہ کیا میری قوم مجھے نکال دے گی انہوں نے کہا کہ اس قسم کا کلام جب بھی کسی نے اپنی قوم کو سُنایا ہے اس سے دشمنی کی گئی ہے چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں۔ لَمْ يَاْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهٖ اِلَّا عُوْدِيَ (صحیح بخاری باب کیف کان بدء الوحی)

۵ؔ یعنی جس طرح تُو نے خواب دیکھی ہے اسی طرح تجھ سے اللہ تعالیٰ معاملہ کرے گا اور وہ بزرگی جس کا اس خواب میں وعدہ ہے آخر تجھے ملے گی ❖

اور یہ جو فرمایا کہ خدا تعالیٰ تجھے خوابوں کی حقیقت بتائے گا۔ اس کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ خواب میں جو نظارہ دکھایا اسی طرح ظاہر میں کر کے دکھائے گا۔ دوسرے یہ کہ خوابوں کی تعبیر کرنے کا ملکہ عطا فرمائے گا +

یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ سے مراد مقام نبوۃ پر کھڑا کرنا ہے۔ یوسفؑ سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی نبوت عطا فرمائے گا اور ان کے ذریعہ سے آل یعقوب کو بزرگی عطا فرمائیگا یعنی انہیں ان پر ایمان لاکر اس نبوت میں حصہ لینے کی توفیق عطا ہوگی +

اس آیت میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس میں اور بائبل کے بیان میں بھی اختلاف ہے قرآن کریم کہتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی خواب پر یقین کیا۔ اور اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن بائبل کہتی ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے اپنے والد سے خواب بیان کی "تب اس کے باپ نے اُسے ڈانٹا اور اس سے کہا کہ یہ کیا خواب ہے؟ جو تُو نے دیکھا ہے؟ کیا میں اور تیری ماں اور تیرے بھائی سچ مچ تیرے آگے زمین پر جھک کے تجھے سجدہ کریں گے۔ اور اس کے بھائیوں کو رشک آیا لیکن اس کے باپ نے اُس بات کو یاد رکھا (پیدائش ۳۷ ۔ ۱۰ و ۱۱) اس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواب سُن کر یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو ڈانٹا حالانکہ ہر عقلمند انسان سمجھ سکتا ہے کہ بائبل کا یہ بیان خلاف عقل ہے کیونکہ کوئی معقول آدمی کسی کو خواب دیکھنے پر ڈانٹ نہیں سکتا کیونکہ خواب کا دیکھنا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ ہاں صرف ایک صورت ڈانٹنے کی ہو سکتی ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ خواب سنانے والے نے خواب نہیں دیکھا بلکہ وہ جھوٹ بول رہا ہے مگر بائبل کہتی ہے کہ یعقوبؑ نے کہا یہ "کیا خواب ہے جو تو نے دیکھا ہے" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یعقوبؑ نے یوسفؑ کو جھوٹا نہیں سمجھا۔ پس سچا سمجھتے ہوئے ڈانٹنا خلاف عقل ہے۔ اور ہر عقلمند قرآن کریم کا ہی بیان درست اور صحیح سمجھے گا۔ علاوہ ازیں بائبل خود اپنے بیان کو رد کرتی ہے کیونکہ اس میں ساتھ ہی یہ لکھا ہے کہ یعقوبؑ نے اس خواب کو یاد رکھا۔ یاد رکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یعقوبؑ اس خواب کو سچا اور آسمانی سمجھتے تھے اور جب وہ اسے آسمانی خواب سمجھتے تھے تو کس طرح ممکن تھا کہ وہ اس خواب پر یوسف علیہ السلام کو ڈانٹتے جن کا خواب کے دیکھنے میں کوئی بھی دخل نہ تھا +

تعلیم تاویل الاحادیث کے دو معنے۔

اتمام نعمت سے مراد

بائبل اور قرآن کریم کے بیان میں جو تفاوت حضرت یعقوبؑ رؤیا کو سُنکر خوش ہوئے تھے۔

آنحضرتؐ اور حضرت یوسفؑ کی چوتھی مماثلت

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس رؤیا کو آسمانی قرار دیا اور اس پر ایمان لائے اور اسے اپنی قوم کی بزرگی کا موجب قرار دیا اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا کہ ورقہ بن نوفل نے آپؐ کی وحی کو سُنکر اس کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لائے۔ اور اسے موسیٰ کے الہام کی مانند قرار دے کر اپنی قوم کی بزرگی کا موجب تسلیم کیا۔ اور کہا۔ هٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِيْ نَزَّلَ اللّٰهُ عَلٰى مُوْسٰى یہ وہی وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی تھی +

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ○

یوسف اور اس کے بھائیوں (کے واقعات) میں (حق کے) طالبوں کے لئے یقیناً کئی نشان (پائے جاتے) ہیں ۵۸

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا

(یعنی اس وقت کے واقعات میں) جب انہوں نے (یعنی یوسف کے بھائیوں نے ایک دوسرے سے) کہا (کہ) یوسف اور اس کا بھائی یقیناً ہماری

وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۚ ۝

نسبت ہمارے باپ کو زیادہ پیارے ہیں۔ حالانکہ ہم ایک منضبط جماعت ہیں (اس حال میں) ہمارا باپ یقیناً (کھلی) کھلی غلطی میں (پھنسا ہوا) ہے ۵۹

یوسفؑ کے حالات بطور قصہ نہیں بلکہ بطور نشان بیان ہوئے ہیں

۵۸ یعنی جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت سمجھنے کے لئے کوشش کرتے ہوں ان کے لئے اس واقعہ میں نشانات ہیں۔ گویا یہ حالات بعینہٖ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش آنے والے ہیں۔

یوسفؑ کی طرح آنحضرتؐ پر بیگانوں کا حسد۔

یہ آیت کس طرح وضاحت سے ثابت کرتی ہے کہ یوسفؑ کا واقعہ بطور قصہ بیان نہیں ہوا۔ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کے متعلق جستجو کرنے والوں کے لئے نشانات بہم پہنچانے کی غرض سے بیان ہوا ہے۔ پس جو امور اس واقعہ میں بیان ہوئے ہیں وہ بطور نشان صداقت ہیں ✦

عُصْبَة

۵۹ حل لغات۔ العُصْبَةُ من الرِّجال وَالْخَيْل والطَّيْر العِصابةُ۔ والعِصابةُ الجماعةُ من الرِّجال ومن الخيل ومن الطير۔ و قيل العشرة۔ و قيل ما بين العشرة الى الاربعين۔ عُصبہ کے وہی معنے ہیں جو عصابہ کے ہیں یعنی مطلق جماعت۔ اور بعض کے نزدیک دس افراد کی جماعت۔ اور بعض کے نزدیک دس سے لے کر چالیس تک کے افراد کی جماعت۔ (اقرب) مفسرین نے عشرہ والے معنے کو ترجیح دی ہے کیونکہ وہ دس ہی تھے ✦

عُصْبَةٌ میں طاقت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے یہ لفظ عصب سے نکلا ہے۔ گویا وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ کام کرنے والے ہم۔ کمانے والے ہم۔ مگر پیار کے لئے باپ کو یوسفؑ اور اس کا بھائی ✦

تفسیر

آنحضرت صلی اللہ علیہ

آنحضرتؐ اور حضرت یوسفؑ میں پانچویں مشابہت

وآلہ وسلم کے ساتھ بھی یہی واقعہ کئی رنگ میں پیش آیا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چچا زید بن نفیل جو یہودی علماء سے توحید کا علم حاصل کر چکے تھے۔ اسلام کے آنے سے پہلے شرک کے خلاف وعظ کیا کرتے تھے۔ ان سے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ شرک کے خلاف وعظ تو میں کرتا رہا ہوں اگر کچھ بننا ہوتا تو میں بنتا۔ یہ شخص نبی کس طرح بن گیا۔ یہی اعتراض آپؐ کی نبوت پر یہود و نصاریٰ کو تھا۔ کیونکہ وہ بھی یہی کہتے تھے کہ خدا کے دین کے حامل تو ہم ہیں۔ یہ انعام کا مستحق کس طرح ہو گیا۔ بلکہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ مکہ کے دلوں میں بھی یہ خیال عام تھا کہ ہم میں سے جو بڑے لوگ ہیں ان پر یہ کلام کیوں نازل نہ ہوا۔ چنانچہ سورہ زخرف میں فرماتا ہے۔ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ

اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ

(اس لئے یا تو) یوسف کو قتل کردو یا اُسے کسی اور ملک میں (دور) پھینک دو۔ (ایسا کرو گے تو)

وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ۝

تمہارے باپ کی توجہ تمہارے لئے فارغ ہو جائے گی اور (اس فعل سے قدرتی طور پر نہیں) اس کے بعد (توبہ کرکے) تم (پھر) ایک نیک گروہ ہو جاؤ گے ۱۰ء

عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ۝ (ع ۳) اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر نازل نہ ہوا۔ یعنی انہیں حسد آتا ہے کہ اس کمزور آدمی کو خدا تعالےٰ نے کیوں اپنے فضل کے لئے چن لیا جس کے جواب میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ کیا یہ لوگ تیرے رب کی رحمت کو خود تقسیم کرنا چاہتے ہیں +

لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ یعنے چاہیئے تو یہ تھا کہ ہمارے کاموں کی وجہ سے ہم سے پیار کیا جاتا۔ یوسفؑ چھوٹا اور نکما ہے اس سے محبت کرنا اور ہم سے نہ کرنا صریح غلطی ہے۔ یہ بات بتا رہی ہے کہ ان کو اس کے خلاف سخت غصہ تھا +

۱۰ء حل لغات۔ صَلَحَ الشَّيْءُ يَصْلَحُ و يَصْلُحُ صَلَاحًا وَصُلُوحًا وَصَلَاحِيَةً ضد فَسَدَ۔ وزال عنہ الفساد۔ یقال صلحت حالُ فلانٍ۔ درست اور ٹھیک ہو گیا۔ اس کی خرابی اور بدحالی دُور ہو گئی۔ الرَّجلُ فی عَمَلِہ لزم الصلاح۔ نیکوکار ہو گیا (اقرب)

تفسیر۔ نیک صحبت کس طرح دل پر اثر کرتی ہے۔ ایک خطرناک جُرم کا ارتکاب کرنے لگے ہیں لیکن پھر بھی گناہ کا خوف دل میں ہے اور اس خوف کا اثر دل سے مٹانے کے لئے یہ بہانہ تلاش کرتے ہیں کہ پھر توبہ کر لیں گے۔ یہ دھوکا بہت سے لوگوں کو لگا ہوا ہوتا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ پھر توبہ کر لیں گے حالانکہ زندگی کا اعتبار کیا؟ خواہ کس قدر پختہ نیت بھی توبہ کرنے کی ہو لیکن موت آجائے یا دماغ میں فتور آجائے یا عادت پڑ جائے تو پھر توبہ کا ارادہ کس طرح پورا ہو سکتا ہے +

قرآن مجید اور بائبل کے بیانات اس واقعہ میں بھی مختلف ہیں۔ قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے پہلے مشورہ کیا اور مشورہ کے بعد وہ یوسف علیہ السلام کو باہر لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر بائبل کہتی ہے کہ انہوں نے اچانک یوسفؑ کو آتے دیکھا تو فوراً قتل کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ بائبل میں لکھا ہے "اور جونہی انہوں نے اسے دُور سے دیکھا اس سے پہلے کہ وہ نزدیک پہنچے اس کے قتل کا منصوبہ باندھا اور ایک نے دوسرے سے کہا دیکھو یہ صاحبِ خواب آتا ہے سو آؤ ہم اب اسے مار ڈالیں۔ اور کسی کنوئیں میں ڈال دیں۔ اور کہیں کہ کوئی بُرا درندہ اسے کھا گیا اور دیکھیں کہ اس کے خوابوں کا انجام کیا ہوگا۔"

(پیدائش باب ۳۷ آیت ۱۸ لغایت ۲۰)

نیک صحبت کا اثر

جرائم کی تحقیقات کرنے والے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس اختلاف میں قرآن مجید کا بیان ہی قرینِ قیاس ہے۔ یونہی کھڑے کھڑے یکدم قتل کرنے کو تیار ہو جانا یا عادی ڈاکوؤں کا کام ہے یا پاگلوں کا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جو اپنے گھر میں شریفانہ زندگی بسر کرتے تھے وہ یکایک ایسے بھیانک فعل

نفس کا ایک خطرناک دھوکہ۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ

(اس پر) ان میں سے ایک بولنے والے نے کہا (کہ) تم یوسف کو قتل نہ کرو اور اگر (بہر حال) تم نے (کچھ) کرنا

غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ

(ہی) ہے تو اسے (کسی) گہرے کنوئیں کی تہ میں ڈال دو کسی قافلہ کا کوئی شخص اسے (دیکھ کر) اُٹھالے گا (اور بغیر جان

كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ○ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا

لینے کے تمہارا مقصد پورا ہو جائیگا) ہے[۱۱] (چنانچہ) انہوں نے (باپ سے جاکر) کہا۔ اے ہمارے باپ آپکو (ہمارے متعلق) کیا (خدشہ) ہے

کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ پس ان کا اس طرح قتل کے لئے آمادہ ہو جانا بتلاتا ہے کہ وہ پہلے مشورہ کر چکے تھے۔ فوراً تحریک کرنے والے کو کیا یہ ڈر نہ آتا کہ اتنی بڑی بات میں اگر بھائی ہم خیال نہ ہوئے تو میرا کیا حشر ہوگا۔ ان کا قول وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ۔ کہ محرک جرم جب راستہ سے ہٹ جائے گا تو پھر تم نیک ہو جاؤ گے بھی بتا رہا ہے کہ وہ عادی مجرم نہ تھے۔ اور ان کی فطرت اس کام کو ناپسند کرتی تھی۔ پس عقل کی رُو سے قرآن مجید کا بیان ہی صحیح اور واقعات کے مطابق ہے +

غیابۃ[۱]

آنحضرتؐ اور حضرت یوسفؑ میں چھٹی مماثلت

حضرت یوسفؑ کی طرح آنحضرتؐ کے خلاف قتل کا منصوبہ وغیرہ[۱]

اس منصوبۂ قتل میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت یوسف علیہ السلام سے مشابہت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ○ (انفال رکوع ۴) یعنی یاد کر جبکہ دشمن منصوبے کرتے تھے کہ تجھے کہیں قید کر دیں یا قتل کر دیں یا تجھے نکال دیں اور وہ اب بھی ایسے منصوبے کرتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی پختہ تدبیریں کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تدبیر زیادہ اچھی ہوتی ہے پس جس طرح یوسف علیہ السلام کی نسبت قتل اور کسی دوسرے علاقہ میں پھینک دینے کا منصوبہ کیا گیا تھا۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق بھی منصوبہ کیا گیا +

اَلْجُبّ[۲]

سلہ حل لغات۔ اَلْغَيَابَةُ من كل شئ مَا سَتَرَكَ منه۔ غیابۃ۔ ہر چیز کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو اسے نظروں سے غائب کر دے۔ ومن الجُبِّ والوادی قَعْرُهٗ۔ اور کنوئیں یا وادی کا غیابہ اس کے گہراؤ اور تہ کو کہتے ہیں۔ پس غیابۃ کا لفظ وادی یا جُبّ وغیرہ کی طرح کی جگہ کے نام کی طرف مضاف ہو کر استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کی تہ کی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے۔ وَوَقَعْنَا فی غیابۃٍ اے هَبْطَةٍ مِنَ الْاَرْضِ۔ زمین کا گہرا حصہ القبر۔ قبر۔ (اقرب)

الجُبُّ۔ البئر او البئر الكثير الماء البعيدة القعر۔ مطلق کنواں یا بہت پانی والا اور بہت گہرا کنواں وفی المصباح والجُبُّ بئرٌ لم تُطْوَ۔ ایسا کنواں جس کے گرد منڈیریں وغیرہ نہ ہوں۔ اور ویران پڑا ہو۔ (اقرب) +

عَلٰی یُوْسُفَ وَاِنَّا لَہٗ لَنٰصِحُوْنَ ○ اَرْسِلْہُ

کہ یوسف کے متعلق آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے۔ حالانکہ ہم یقیناً اس سے (دلی) خلوص رکھتے ہیں ۱۲ؔ

السَّیَّارَۃَ۔ مؤنث السیّارِ۔ سیارہ۔ سیار کی مؤنث ہے جس کے معنے ہیں۔ کَثِیْرُ السَّیْرِ۔ بہت سیر کرنے والا۔ القافلۃ۔ قافلہ۔ و اصلہا القوم یَسِیْرُوْنَ اور اس کے اصل معنے ایسی جماعت کے ہیں جو سفر کر رہی ہو (اقرب)

تفسیر۔ یعنی اگر تم یوسف سے ضرور ہی مخالفت کرنا چاہتے ہو تو بھی اسے قتل نہ کرو بلکہ اسے گھر سے نکالنے کی تدبیر کرو +

ساتویں مماثلت جس طرح یوسفؑ کے قتل کے بارہ میں بعض لوگوں نے مخالفت کی تھی۔ ایسا ہی مکہ کے بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے منصوبے میں کفار کی مخالفت کی اور کہا کہ انہیں قتل نہ کرو بلکہ بعض نے تو اس معاہدہ کو زور سے تڑوا دیا جو آپؐ کو اور آپؐ کے اتباع کو فاقے مارنے کے متعلق کیا گیا تھا +

۱۲ؔ حل لغات

تَاْمَنَّا۔ اَمِنَہ و اَمَّنَہٗ وَ اٰمَنَہٗ و اِسْتَاْمَنَہٗ۔ ے۔ جَعَلَہٗ اَمِیْنًا۔ اسے امین بنایا۔ (تاج العروس)

نَصَحَ الشَّیْءُ نَصْحًا و نُصُوحًا۔ خَلَصَ۔ ہر غل وغش اور کھوٹ سے پاک و صاف ہوا۔ نَصَحَتْ تَوْبَتُہٗ نُصُوحًا خلصت من شوائبِ العَزْمِ علی الرجوع۔ توبہ عہد شکنی اور خلاف ورزی کے خیالات کی آمیزش سے بکلی پاک ہوئی۔ الثوب انعم خیاطتہ ولم یترک فتقًا ولا خللًا۔ شُبِّہَ ذٰلک بالنصح۔ کپڑا ایسا سیا کہ اس میں کوئی شگاف اور رخنہ وغیرہ نہ چھوڑا۔ جیسے خلوص کی حالت میں کوئی مخالف خیال باقی نہیں رہتا۔ العملَ اخلصہ عمل کو خالص کیا۔ العسلَ صَفَّاہُ۔ شہد کو پاک و صاف کیا۔ (اقرب)

سیّادۃ

تفسیر۔ بائبل کا بیان ہے کہ "اور اس کے بھائی اپنے باپ کے گلے چرانے سکم کو گئے۔ تب اسرائیل نے یوسف کو کہا کیا تیرے بھائی سکم میں نہیں چراتے ہیں۔ آ میں تجھے ان کے پاس بھیجوں اس نے اسے کہا کہ میں حاضر ہوں۔ (پیدائش ۳۷ آیت ۱۲ و ۱۳) +

بائبل کے اور قرآن کریم کے بیان میں چھٹا اختلاف۔

یعنی باپ نے خود یوسف علیہ السلام کو تحریک کر کے بھائیوں کے پاس بھیجا۔ مگر قرآن مجید یہ بتلاتا ہے کہ بھائیوں نے قتل کا مشورہ کیا اور پھر باپ سے اجازت چاہی کہ باپ اسے ان کے ساتھ بھیجے +

حضرت یوسفؑ کی طرح آنحضرتؐ کے قتل کے منصوبہ کی بعض اہل مکہ کی طرف سے مخالفت۔

حضرت یعقوب علیہ السلام بیٹوں کی کاوش کو جانتے تھے انہیں معلوم تھا کہ باقی بھائی یوسف کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور بائبل میں لکھا ہے۔ "اور اس کے بھائیوں نے یہ دیکھ کے کہ ان کا باپ اس کے سب بھائیوں سے اسے (یعنی یوسف کو) زیادہ پیار کرتا ہے اس کا کینہ پیدا کیا۔ اور اس سے محبت کی بات نہ کر سکتے تھے (پیدائش ۳۷ آیت ۴)

بائبل کا یہ بیان خود بائبل کی رو سے غلط ہے۔

امّن

اس صورت میں یہ بالکل غیر طبعی بات ہے کہ خود حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کے پاس بھیجیں۔ پس بائبل کا بیان غلط ہے اور قرآن مجید کا بیان ہی صحیح ہے +

نصح

اس آیت سے حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر اس وقت قریباً گیارہ بارہ سال کی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ الفاظ اتنی ہی عمر کے بچے کے متعلق زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ مگر بائبل کے بیان کے مطابق

حضرت یوسف کی عمر اس واقعہ کے وقت۔

مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○

کل اسے ہمارے ساتھ (سیر کے لئے باہر) بھیجئے وہ (وہاں) کھلا کھائے (پئے) گا اور کھیلے گا۔ اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے ۱۳

قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ

اس نے (یعنی یعقوب نے) کہا تمہارا اسے (اپنے ساتھ) لے جانا مجھے یقیناً فکرمند کرتا ہے اور میں (اس بات سے بھی) ڈرتا

اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ○

ہوں کہ کہیں ایسی حالت میں کہ تم اس سے غافل ہو اسے (کوئی) بھیڑیا (ہی نہ آکر) کھا جائے ۱۴

وہ اس وقت ۱۷ یا ۱۸ سال کے ہو چکے تھے۔ لیکن یہ بات غلط ہے جیسا کہ آگے اس کی تحقیق آئے گی۔

۱۳ حل لغات۔ رَتَعَتِ الماشیۃُ فی المکان رَتعًا وَرُتُوعًا وَرِتَاعًا اکلت وشربت ماشائت فی خَصْبٍ وَّسَعَۃٍ۔ جانوروں نے عمدہ چراگاہ سے جو کچھ چاہا کھایا اور پیا۔ وَالقومُ اکلوا ماشاؤا فی رغدٍ۔ لوگوں نے جو چاہا با فراغت کھایا۔ ویقال خَرَجْنَا نَرْتَعُ و نلعب۔ اے ننعم ونلھو۔ اور نرتع و نلعب کے معنے محاورہ میں عیش کرنے اور کھیلنے کے ہوتے ہیں۔ (اقرب)

رتع

یوسف کی حفاظت کا وعدہ بھی ان کی اس وقت کی عمر پر روشنی ڈالتا ہے۔

حضرت یعقوب کا یہ خوف ہونا بھی حضرت یوسف کو اس وقت کم سن ثابت کرتا ہے

تفسیر۔ اس لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھیتی بھی کرتے تھے۔ بائبل کہتی ہے کہ وہ صرف جانور ہی چرانے تھے۔ لیکن بائبل میں جو پہلا خواب حضرت یوسف علیہ السلام کا بیان کیا گیا ہے اس میں اور ان کے بھائیوں کے پولے باندھنے کا ذکر ہے۔ اور ایک چھوٹا بچہ جو گھر سے زیادہ باہر نہیں نکلا اور جو شہر میں نہیں رہتا بلکہ اس کا خاندان باقی دنیا سے الگ زندگی بسر کر رہا ہے ایسی خواب نہیں دیکھ سکتا تھا جس کا نظارہ اس کی آنکھوں کے آگے نہ آچکا ہو۔ پس اس خواب

قرآن کریم کے اور بائبل کے بیان میں ساتویں اختلاف یوسف کے بھائی کھیتی باڑی بھی کرتے تھے۔

سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا بیان ہی صحیح ہے۔

اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک ان کی عمر ابھی چھوٹی ہی تھی۔ ورنہ جنگل میں رہنے والے سترہ برس کے نوجوان زمیندار کے لئے غیر کی حفاظت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۱۴ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ اس بات کو خیال کر کے بھی میرا دل افسردہ ہوتا ہے کہ تم اس کو لے جاؤ اور مجھے ڈر ہے کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے اور تم اس سے غافل ہو۔

اس قول سے ایک تو اس امر کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک یوسف علیہ السلام کی عمر اس وقت چھوٹی تھی۔ دوسرے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو الہاماً یہ بتا دیا گیا تھا کہ یہ لوگ ایسا منصوبہ کر رہے ہیں اس لئے انہوں نے وہی الفاظ استعمال کئے جو بھائیوں نے بطور بہانہ کے تجویز کئے تھے۔

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا

انہوں نے کہا اگر اس (بات) کے باوجود (بھی) کہ ہم ایک منضبط جماعت ہیں اسے بھیڑیا کھا جائے تو (خدا کی قسم) اس صورت میں ہم یقیناً

لَّخٰسِرُوْنَ ○ فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ

گھاٹے میں پڑنے والے ہونگے ۱۵ پھر جب وہ اسے لے گئے اور (جاکر) انہوں نے اسے (کسی) گہرے کنوئیں کی تہ میں ڈالنے کا متفقہ فیصلہ

فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ

کیا (تو ہو ہم انہوں نے اپنا ارادہ پورا کیا) اور (اُدھر) ہم نے اس کی طرف وحی (کے ذریعے سے یہ بشارت نازل) کی کہ تو (محفوظ رہے گا اور)

بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ

انہیں ان کے اس کام سے آگاہ کریگا اور وہ (اس بات کو) نہیں سمجھتے تھے ۱۶ اور عشاء کے وقت وہ

۱۵ تفسیر۔ اس واقعہ سے نصیحت پکڑنی چاہیئے۔ کہ حسد اور بغض انسان کو کہاں تک پہنچا دیتا ہے یوسف علیہ السلام کے دس بھائیوں میں سے دانی۔ اور نفتانی کو تو سخت شرم کرنی چاہیئے تھی۔ کیونکہ یہ دونوں حضرت یوسف علیہ السلام کی ماں کی لونڈی کے بیٹے تھے جب ان کے اولاد نہ ہوئی تو انہوں نے اپنی وہ لونڈی حضرت یعقوب علیہ السلام کو دی کہ تا ان کی نسل چلے اور انہوں نے اس کے بیٹوں کو اپنا بیٹا قرار دیا اور پہلے کا نام دانی رکھا کہ مجھے بھی ایک بیٹا دیا گیا۔ اور دوسرے کا نام نفتانی۔ کہ میں اس کے ذریعہ سے اپنی بہن پر غالب آئی۔ یہ بھی میرا ہی بیٹا ہے پھر ان لڑکوں کو خود حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ نے ہی پرورش کیا تھا۔ مگر ان کی سیاہ دلی کو دیکھو کہ اپنی محسنہ کے بیٹے کے قتل کے منصوبے میں شریک ہو گئے +

۱۶ تفسیر۔ مطلب یہ کہ آج ان کو پتہ نہیں کہ ایسا بُرا سلوک یہ کس کے ساتھ کر رہے ہیں مگر جب تیرے سامنے کھڑے ہوں گے تو انہیں خوب معلوم ہو جائے گا۔ اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کی حالتِ عجز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس وقت ان کے بھائیوں کے ذہن میں بھی نہ آسکتا تھا کہ یہ کتنے بڑھ جائیں گے +

حسد اور بغض انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا تا ہے

آٹھویں مشابہت

آنحضرت کو بھی ایک کنوئیں کی سی جگہ میں اترنا پڑا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کنوئیں کے واقعہ میں بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ مشابہت ہے آپؐ کو بھی کفار سے تنگ آکر مکہ سے نکلنا پڑا اور ان کے تعاقب کی وجہ سے غار ثور میں چھپنا پڑا۔ جو بادلی کی طرح پہاڑ کی ایک غار ہے فرق صرف یہ ہے۔ کہ یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے اپنے ہاتھ سے اس میں ڈالا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود غار میں گھسنا پڑا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس بارہ میں مشابہت اس واقعہ سے ہو جبکہ آپؐ کو تین سال تک مکہ کے پاس ایک وادی میں محصور کر دیا گیا تھا +

نویں مشابہت

آنحضرت کو بھی قبل بھائیوں کا جرم سامنے پیش ہوتے دکھایا گیا تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قبل از وقت بتا دیا گیا تھا۔ کہ آپؐ کے سامنے آپؐ کے بھائی مجرم بن کر پیش

عِشَآءً یَّبْکُوْنَ ○ قَالُوْا یٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ

روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس آئے ۱۷ (اور) کہا (کہ) اے ہمارے باپ (یقین جانیے) ہم جا کر (کھیلنے اور) مقابلہ دوڑنے

وَتَرَکْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَکَلَهُ الذِّئْبُ ۚ

لگے اور یوسف کو ہم اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے تو (خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ) اسے (ایک) بھیڑیا کھا گیا

وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ کُنَّا صٰدِقِیْنَ ○ وَجَآءُوْ

اور (یہ تو ہم جانتے ہیں کہ) آپ ہماری بات (کو درست) نہیں مانیں گے گو ہم (اس میں بالکل) سچے (ہی کیوں نہ) ہوں ۱۸ اور

عَلٰی قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ کَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَکُمْ

(اسے یقین دلانے کے لئے وہ) اس کے کرتے پر جھوٹا خون لگا لائے (تھے۔ جسے دیکھ کر) اس نے کہا (یہ بات درست نہیں) بلکہ تمہارے

اَنْفُسُکُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ

نفسوں نے تمہارے لئے کسی (بری) بات کو خوبصورت کرکے دکھایا ہے (جسے تم کر گذرے ہو) اب اچھی طرح صبر کرنا (ہی میرے لئے مناسب) ہے

ہوں گے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو بتایا گیا تھا مثال کے طور پر قرآن کریم کی یہ آیت ہے کہ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ (سورۃ القصص رکوع ۹) وہ خدا جس نے یہ قرآن تجھ پر عمل کے لئے اُتارا ہے ضرور تجھے ایک دن اس شہر کی طرف جو لوگوں کا مرجع ہے واپس لائے گا۔ یعنے یہاں سے نکلنے کے بعد پھر تم کامیاب واپس آؤ گے +

برادران یوسف کا یہ بیان بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ عادی مجرم نہ تھے۔

العِشَاءُ

۱۷ **حل لغات** - اَلْعِشَاءُ اَوَّلُ الظَّلَامِ۔ رات کی تاریکی کا ابتدائی حصہ۔ وَقِیْلَ مِنَ الْمَغْرِبِ اِلَی الْعَتَمَۃِ۔ اور بعض کہتے ہیں کہ سورج ڈوبنے سے لیکر تاریکی کے پورے طور پر چھا جانے تک کا درمیانی وقت وَقِیْلَ مِنْ زَوَالِ الشَّمْسِ اِلٰی طُلُوْعِ الْفَجْرِ۔ اور بعض کہتے ہیں کہ سورج کے ڈوبنے سے لے کر پو پھٹنے تک کا وقت عشاء ہی ہے (اقرب)

حضرت یوسفؑ کی خورد سالی پر ترکنا یوسف اور اکلہ الذئب کی دلالت۔

۱۸ **تفسیر** - ترکنا یوسف اور اکلہ الذئب سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر ابھی چھوٹی تھی۔ ورنہ سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا ہر قسم کی کھیلوں میں شامل ہو سکتا تھا۔ اور بھیڑیا بھی ایک جوان آدمی پر جس کے پاس ہتھیار ہوں حملہ نہیں کیا کرتا سوائے اس کے کہ بھیڑیوں کا ایک گلّہ ہو لیکن فلسطین کا علاقہ ایسا نہیں جہاں بھیڑیئے گلّوں کی صورت میں پھرتے ہوں +

وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا سے ظاہر ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی عادی مجرم نہ تھے۔ ورنہ وہ یہ فقرہ نہ کہتے جس سے ان کے جرم کا راز فاش ہو جاتا ہے۔ عادی مجرم کبھی اپنے جُرم کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ لیکن ان کے مُنہ سے تو بے اختیار نکل گیا کہ اگر ہم سچے بھی ہوں تو آپ ہماری بات نہیں مانیں گے اور اس طرح انہوں نے خود ہی اپنے جھوٹ پر سے پردہ اٹھا دیا +

عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ ○ وَجَآءَتْ سَیَّارَۃٌ فَاَرْسَلُوْا

اور جو بات تم بیان کرتے ہو اس (کے تدارک) کے لئے اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے (اور اسی سے مانگی جائیگی) ۱۹؎ اور (اتنے میں) ایک قافلہ آیا اور انہوں

۱۹؎ حل لغات۔ سَوَّلَتْ۔ سَوَّلَ لَہُ الشَّیْطٰنُ اَغْوَاہُ وَسَھَّلَ لَہُ۔ اسے گمراہ کیا۔ اور .... بُرے کام کے ارتکاب کو اس کی نظر میں معمولی بات کر کے دکھایا۔ من السَّوَلِ اے الاِسْتِرْخَاءُ۔ یہ لفظ سَوَل سے ہے جس کے معنے ڈھیلا ہو جانے کے ہیں۔ یُقَالُ ھٰذَا مِنْ تَسْوِیْلَاتِ الشَّیٰطِیْنِ وما قطلبتہ وتشاألہ۔ یعنی شیطان کی تسویلات سے مُراد اس کی گمراہ کُن تحریکیں ہیں۔ سَوَّلَتْ لَہُ نفسہ کذا زَیَّنَتْہُ لہ وسھلتہ لہ وھَوَّنَتْہُ۔ اس کے نفس نے اس کے لئے اس کام کو خوبصورت کر کے یا اسے ایک معمولی بات قرار دے کر اور آسان کر کے دکھایا (اقرب)

فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ۔ اس جملہ میں حذف واقع ہوا ہے۔ اور پورا جملہ تین طرح ہو سکتا ہے (۱) یہ کہ فَصَبْرِیْ صَبْرٌ جَمِیْلٌ۔ میرا صبر صبرِ جمیل ثابت ہوگا میں ہرگز نہ گھبراؤں گا (۲) اَمْرِیْ صَبْرٌ جَمِیْلٌ۔ میرا کام صبرِ جمیل ہوگا۔ (۳) یہ کہ صبرٌ جمیلٌ خَیْرٌ۔ صبرِ جمیل کرنا ہی بہتر ہے۔ گویا یا مبتداء محذوف مانا جائے گا۔ یا خبر محذوف مانی جائے گی

مُسْتَعَان۔ اسم مفعول کا صیغہ ہے اِسْتَعَانَ سے اور اس کے معنے ہیں "وہ وجود جس سے مدد طلب کی جائے"۔

تفسیر۔ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کے پھاڑے جانے کا یقین ہو گیا تھا۔ جیسا کہ لکھا ہے "اس (یعقوب) نے اسے (کرتہ کو) پہچانا۔ اور کہا کہ یہ تو میرے بیٹے کی قبا ہے۔ کوئی بُرا درندہ اسے کھا گیا۔ اور یوسف بیشک پھاڑا گیا" (پیدائش ۳۷/۳۳) مگر قرآن مجید کی اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ان کی بات کو محض فریب سمجھا بلکہ ان کے بیان کے خلاف اللہ تعالیٰ کی مدد چاہی اور مدد چاہنا بتاتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ابھی امید تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام زندہ ہیں۔ ورنہ مُسْتَعَان کا لفظ کہنا بے فائدہ تھا۔

سَوَّل

ساتواں اختلاف میں بھی بائبل اپنی غلطی کا آپ اقرار کرتی ہے۔

اس اختلاف میں بھی قرآن کریم کے بیان کی صداقت خود بائبل ہی کے دوسرے حوالجات سے ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پیدائش باب ۴۴ میں لکھا ہے کہ جب مصر میں حضرت یوسف نے اپنے بھائی کو روک لیا تو یہودا یوسف کے سامنے آیا اور اس نے کہا "میرے باپ نے ہم کو کہا تم جانتے ہو کہ میری جورو مجھ سے دو بیٹے جنی۔ ایک مجھ سے جدا ہوا اور میں نے کہا یقیناً وہ پھاڑا گیا اور میں نے اسے اب تک نہیں دیکھا۔" (آیت ۲۷ و ۲۸) حضرت یعقوب علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ میں نے اسے اب تک نہیں دیکھا۔ صاف بتا رہا ہے کہ وہ اسے زندہ سمجھتے تھے۔ ورنہ اگر انہیں یقین ہو جاتا کہ وہ پھاڑا گیا ہے جیسا کہ بائبل نویس نے یہاں بھی لکھ دیا ہے تو ان کا یہ قول کچھ معنے نہیں رکھتا۔ پس اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا بیان ہی درست ہے اور حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کو زندہ ہی سمجھتے تھے۔

مُسْتَعَان

آٹھواں اختلاف یعقوبؑ کو یوسفؑ کے زندہ موجود ہونے کا علم تھا

طالمود بھی قرآن مجید کے بیان کی تائید کرتی ہے اس میں بھی لکھا ہے کہ یعقوب کو ان کی بات کا یقین نہ آیا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے حتّٰی کہ وہ بھائی ایک بھیڑیا پکڑ لائے۔ بھیڑیئے نے کہا کہ میں آپ

طالمود سے بھی قرآن کریم کے بیان کی ہی تائید ہوتی ہے۔

وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَا بُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَامٌ ۚ

نے اپنے پانی لانے والے (آدمی) کو بھیجا۔ اور اس نے (اسی کنوئیں پر جاکر) اپنا ڈول ڈالا۔ (اور جب اسے کنوئیں میں ایک لڑکا نظر

وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ○

آیا تو) اس نے (قافلہ والوں سے) کہا اے (قافلہ والو!) خوشخبری (سنو اور دیکھو) یہ ایک لڑکا ہے اور انہوں نے اسے ایک قیمتی مال سمجھتے ہوئے چھپا لیا

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۚ وَكَانُوا

اور جو کچھ وہ کرتے تھے اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا تھا۔ اور اس کے بعد جب یوسف کو اس کا علم ہوا تو) انہوں نے (اپنا غلام بناکر) کچھ تھوڑے

کے بیٹے کو کیسے کھا سکتا تھا۔ حالانکہ آج تو خود میرا بیٹا گم ہو گیا تھا۔ پھر آگے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام مختلف تفاؤل نکالتے رہتے تھے آخر خدا نے انہیں خواب میں بتایا کہ وہ زندہ ہے (جیوش انسائیکلوپیڈیا)

یَا بُشْرٰی طالمود کا یہ بیان خواہ کس قدر ہی خلافِ عقل ہو مگر یہودا کے قول سے مل کر اس سے یہ امر یقیناً ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹوں کے بیان کو سچا نہیں سمجھتے تھے +

آنحضرتؐ کے قتل کے متعلق بھی خبر مشہور کر دی گئی تھی

دسویں مماثلت جس طرح یوسفؑ کے بھائیوں نے جھوٹے طور پر یہ کر دیا کہ یوسفؑ مار اگیا۔ ایسا ہی کفارِ مکہ نے بھی کہا۔ چنانچہ جنگِ احد کے موقع پر ابوسفیان نے اعلان کر دیا اِنَّا قَتَلْنَا مُحَمَّدًا ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مار دیا ہے۔ اور مکہ میں آکر بھی یہی خبر مشہور کر دی۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ انہوں نے قتل کو بھیڑیئے کی طرف منسوب کیا۔ اور کفارِ مکہ نے اپنی طرف +

وَارِد

نمبر۲۰ حل لغات۔ اَلْوَارِدُ اَلَّذِیْ یَتَقَدَّمُ اِلَی الْمَاءِ۔ قافلہ کا وہ آدمی جو پہلے پہنچ کر پانی کا انتظام کرے۔ اَلَّذِیْ یَتَقَدَّمُ الْقَوْمَ فَیَسْتَقِیْ لَھُمْ۔ جو قافلہ سے پہلے پہنچ کر جگہ وغیرہ کا انتظام کرے۔ اَرْسَلُوْا وَارِدَھُمْ اَیْ سَاقِیَھُمْ۔ ساقی۔ پانی پلانے والا۔ جس کے ذمہ پانی کا فراہم کرنا ہو (مفردات) اَلْوَارِدُ۔ اَلسَّابِقُ پہلے پہنچنے والا۔ اَلْوَارِدَۃُ اَلْقَوْمُ الَّذِیْنَ یَرِدُوْنَ الْمَاءَ۔ گھاٹ پر اُتر کر پانی لانے والے لوگ (اقرب) +

یَا بُشْرٰی یا بُشرٰی جیسے ہمارے ہاں واہ واہ کہتے ہیں ویسے ہی عربی زبان میں استعجاب اور عظمت کے لئے بطور مبالغہ یا بُشرٰی کہتے ہیں۔ یَا وَیْلَتٰی اور یَا حَسْرَتٰی بھی اسی قسم کے الفاظ ہیں جو افسوس کے موقعہ پر بولے جاتے ہیں +

بِضَاعَۃ اَلْبِضَاعَۃُ طَائِفَۃٌ مِّنَ الْمَالِ تُعَدُّ لِلتِّجَارَۃِ کچھ مال جو تجارت کے لئے تیار کیا جائے (اقرب)

اللہ تعالیٰ کا یوسفؑ کے لئے اس بیکسی کی حالت میں جنگل میں سامان پیدا کرنا

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کیسا وفادارانہ سلوک کرتا ہے۔ جنگل کے ایک کنوئیں میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انہیں ڈال دیا۔ لیکن معاً اللہ تعالیٰ نے یہ سامان پیدا کر دیا کہ ایک قافلہ آگیا۔ اور انہوں نے پانی لینے کیلئے ایک آدمی بھیجا اور وہ آدمی اسی کنوئیں پر آگیا جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کو ان لوگوں نے ڈال دیا تھا۔

اہل قافلہ کے دلوں میں یوسفؑ کی توقیر

اَسَرُّوْہُ بِضَاعَۃً سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے قیمتی چیز سمجھتے تھے۔ اور یوسف علیہ السلام کی شکل سے ہونہاری کے آثار ظاہر تھے +

فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِى اشْتَرٰىهُ

(کو) قیمت یعنی چند گنتی کے درہموں میں (اسی قافلہ والوں کے پاس اسے) بیچ دیا اور وہ اس (قیمت سے بالکل بے رغبت تھے ۲۱ اور مصر (کے

ع ۲ ۱۲

مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى

باشندوں) میں سے جس (شخص) نے اسے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا اس کی رہائش کی جگہ باعزت بنا۔ امید ہے کہ یہ

۲۱ تفسیر۔ مراد یہ کہ جب اس قافلہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو نکالا۔ تو بھائیوں کو پتہ لگ گیا اور انھوں نے اپنا غلام ظاہر کرکے انہیں بیچ دیا +

بائبل سے ثابت ہے کہ بیس[۲۰] روپے پر بیچا تھا (پیدائش ۳۷/۲۸) قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ بیچنا روپیہ کمانے کی نیت سے نہ تھا بلکہ صرف دکھاوے کے لئے تھا۔ معلوم ہوتا ہے وہ ڈرتے تھے کہ اگر انھوں نے یوسف کو چھڑانے کی کوشش نہ کی تو وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ یہ آزاد ہے۔ اور شائد اس کو گھر پہنچا دیں اس وجہ سے اسے غلام بتایا اور نکما ظاہر کرکے ادنیٰ قیمت پر اسے بیچ دیا تاکہ قافلہ کو کوئی شبہ نہ ہو ورنہ فروخت کرکے کوئی قیمت لینا ان کے مدنظر نہ تھا۔

شَرَوْہ کے معنے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ انھوں نے خریدا اور اس صورت میں ضمیر قافلہ والوں کی طرف پھیری جائے گی اور مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے تھوڑی سی قیمت پر یوسف علیہ السلام کو خرید لیا +

قرآن مجید کے بیان سے یہ ظاہر ہے کہ اس جگہ پر بیچنے والے یوسف علیہ السلام کے بھائی ہیں۔ اہل قافلہ نہیں کیونکہ اہل قافلہ کے متعلق تو فرمایا ہے کہ جب انھوں نے یوسف علیہ السلام کو پایا تو اَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً اسے قیمتی چیز سمجھ کر چھپا لیا لیکن بعد میں فرماتا ہے كَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ وہ اس کے متعلق کوئی رغبت ظاہر نہیں کرتے تھے۔ پس معلوم ہوا کہ بیچنے والے قافلہ والے نہ تھے۔ بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی تھے +

بیچنے رغبت رکھنے والے یوسف کے بھائی تھے۔

اس واقعہ کے متعلق بھی بائبل اور قرآن مجید کے بیان میں اختلاف ہے۔ بائبل تو کہتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی انہیں کنوئیں میں ڈال کر کھانا کھانے بیٹھے تو انہیں ایک اسماعیلی قافلہ نظر آیا اس پر انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ انہیں نکال کر قافلہ کے پاس بیچ دیں۔ چنانچہ لکھا ہے "سو انہوں نے یوسف کو کھینچ کے کنوئیں سے باہر نکالا اور اسمٰعیلیوں کے ہاتھ بیس روپے کو بیچا۔" (پیدائش ۳۷/۲۸) مگر قرآن مجید کے رو سے یوسف علیہ السلام کو کنوئیں سے نکالنے والے خود قافلہ کے لوگ تھے بائبل کی بات کو غلط ثابت کرنے کے لئے اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ بائبل نے انہی تین چار آیتوں میں سخت متضاد بیان دئے ہیں +

بائبل کی غلطی کا ثبوت خود بائبل سے۔

شَرَوْہ کے معنے خریدنے کے بھی ہوسکتے ہیں۔

اسی باب کی آیت ۲۵ اور ۲۷ میں اس قافلہ کو اسماعیلیوں کا قافلہ قرار دیا ہے۔ مگر آیت ۲۸ میں انہیں مدیانی سوداگر ظاہر کیا ہے۔ لیکن اسی آیت کے دوسرے حصہ میں پھر انہیں اسماعیلی کہا ہے حالانکہ مدیانی اور اسماعیلی نسل میں بہت بڑا فرق ہے +

بیچنے والے اہل قافلہ نہیں ہوسکتے

ان چار آیتوں میں غلطی کرنے والی اور قدم قدم پر ٹھوکر کھانے والی کتاب کو ہم کیونکر قرآن پر حاکم ٹھہرا سکتے ہیں؟ پھر قرآن مجید کے بیان کی تصدیق طالمود سے بھی ہو جاتی ہے۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں یوسف کے لفظ کے نیچے طالمود کا بیان بعینہ وہی درج ہے جو

قرآن مجید کے بیان کی تصدیق طالمود سے بھی ہو جاتی ہے

اَنۡ یَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَتَّخِذَہٗ وَلَدًا ؕ وَکَذٰلِکَ مَکَّنَّا

(لڑکا) ہمارے لئے نفع رساں (ثابت) ہوگا یا ہم اسے (اپنا) بیٹا (ہی) بنالیں گے۔ اور اس طرح سے ہم نے

لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ ۫ وَلِنُعَلِّمَہٗ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ

یوسف کو اس ملک میں (قدر و) منزلت بخشی اور (ہم نے اسے یہ عزت کا مقام) اس لئے (بھی دیا) تاکہ ہم (اپنی)

الۡاَحَادِیۡثِ ؕ وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰۤی اَمۡرِہٖ وَلٰکِنَّ

باتوں کی اصل حقیقت کا علم اسے دیں۔ اور اللہ (تعالیٰ) اپنی بات (کو پورا کرنے) پر (کامل) اقتدار رکھتا ہے۔ لیکن

اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ○ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗۤ

اکثر لوگ (اس حقیقت کو) جانتے نہیں عـــہ۲۲ اور جب وہ اپنی قوت (اور مضبوطی کی عمر) کو پہنچا

قرآن مجید نے ذکر کیا ہے +

مثوی[1] پھر طالمود مرتبہ ایچ پولائینو کے صفوہ ۱۵۰، پر لکھا ہے۔ "مگر واقعہ یوں ہوا۔ کہ جب وہ لوگ یوسف کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ ایک مدیانیوں کا قافلہ جو سفر کر رہا تھا۔ پانی کے کنوئیں کی تلاش میں آنکلا۔ انفاقاً وہ اسی کنوئیں پر آکر اُترے جس میں یوسف کو چھپایا گیا تھا۔ اور وہ ایک خوبصورت اور ہوشیار لڑکے کو اس میں دیکھ کر حیران رہ گئے انہوں نے یوسف کو کنوئیں سے نکالا اور اپنے ساتھ لے چلے جب وہ یعقوب کے بیٹوں کے پاس سے گزرے تو انہوں نے یوسف کو دیکھ لیا۔ اور پکارے دیکھو تم اس غلام کو جسے ہم نے کنوئیں میں اس کی

تاویل[2] نافرمانی کی وجہ سے ڈالا تھا۔ کیوں چُرا کر لے چلے ہو لاؤ اسے ہمارے حوالہ کرو" اس حوالہ کا مضمون قرآن کریم کے بالکل مطابق ہے۔ اور بائبل جس نے اس واقعہ کے بیان کرتے وقت تین چار آیتوں میں ہی کئی ٹھوکریں کھائی ہیں کوئی حق نہیں رکھتی کہ اسے اس دوسرے بیان پر جو عقلاً بھی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ترجیح دی جائے +

عـــہ۲۲ حل لغات۔ مَثْوٰی۔ ثَوَاءٌ میں سے مصدر میمی یا اسم ظرف ہے۔ جس کے معنے ہیں الْاِقَامَۃُ مَعَ الْاِسْتِقْرَارِ کسی جگہ رہائش اختیار کرنا ٹھہرنا۔ (مفردات) اَلْمَثْوٰی۔ اَلْمَنْزِلُ اترنے اور ٹھہرنے کی جگہ (اقرب)

مَکَّنْتُہٗ وَمَکَّنْتُ لَہٗ۔ فَتَمَکَّنَ۔ وَمَکِیْنٌ۔ اَیْ مُتَمَکِّنٌ ذُوْقَدْرٍ وَمَنْزِلَۃٍ۔ یعنی مَکَّنَہٗ اور مَکَّنَ لَہٗ کے یہ معنے ہیں کہ اسے قدر و منزلت بخشی۔ اور مکین صاحب عزت انسان کو کہتے ہیں (مفردات)

مَکُنَ فُلَانٌ عِنْدَ السُّلْطَانِ مَکَانَۃً عَظُمَ عِنْدَہٗ وَارْتَفَعَ وَصَارَ ذَا مَنْزِلَۃٍ (یعنی مکن کے مجرد) مکن کے معنے ہیں اس نے قدر و منزلت پائی (اقرب)

اَلتَّاْوِیْلُ مِنَ الْاَوْلِ بِمَعْنَی الرُّجُوْعِ اِلَی الْاَصْلِ تاویل کا لفظ اَوْلٌ میں سے باب تفعیل کا مصدر ہے جس کے معنے ہیں کسی چیز کا اپنے اصل کی طرف رجوع کرنا۔ وَذٰلِکَ ھُوَ رَدُّ الشَّیْءِ اِلَی الْغَایَۃِ الْمُرَادَۃِ مِنْہُ عِلْمًا کَانَ اَوْ فِعْلًا۔ اور تاویل کے معنے ہیں کسی چیز کو اس کے اصل مقصود اور غایت کی

عـــہ اصل من کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ جو حروف زائدہ میں سے ہے اور تاکید کے طور پر آیا ہے

آتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝

تو ہم نے اسے فیصلہ (کرنے کا منصب) اور (خاص) علم بخشا۔ اور (حقیقی) نیکو کاروں کو ہم اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں۔ ۲۳

طرف لوٹانا خواہ اس کا تعلق ذہن اور دماغ سے ہو یا دیگر اعضاء سے (مفردات)

اَلتَّاوِیْلُ: اَلْعَاقِبَۃُ۔ انجام۔ بَیَانُ اَحَدِ مُحْتَمَلَاتِ اللَّفْظِ کسی لفظ کے احتمالی معانی میں سے کسی ایک معنے اور مراد کی تعیین کرنا۔ اَوَّلَ الشَّیْءَ اِلَیْہِ۔ رَجَعَہٗ ومنہ اَوَّلَ اللّٰہُ عَلَیْكَ ضَالَّتَكَ اَیْ رَدَّ عَلَیْكَ ضَالَّتَكَ۔ اَوَّلَ کے معنے ہیں کسی چیز کو اس کی اپنی جگہ پر واپس لایا۔ چنانچہ جب کسی کی کوئی چیز گم ہو جائے تو اسے دعا کے طور پر کہا جاتا ہے اَوَّلَ اللّٰہُ عَلَیْكَ ضَالَّتَكَ۔ اللہ تعالیٰ تیری گم شدہ چیز تیرے پاس واپس لائے۔ وَاَوَّلَ الْکَلَامَ دَبَّرَہٗ وَقَدَّرَہٗ وَفَسَّرَہٗ۔ اور جب اس کا مفعول کوئی کلام ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں اس میں تدبر کر کے اس کی اصل مراد کو ظاہر کیا۔ وَالرُّؤْیَا عَبَّرَھَا اور جب اس کا مفعول رؤیا ہو تو اس کے معنے تعبیر کرنے کے ہوتے ہیں (اقرب)

تفسیر۔ جب قافلہ مصر میں پہنچا۔ تو اس نے یوسف کو اچھی قیمت پر فروخت کیا۔ اور جس شخص نے انہیں خریدا اس کا نام یہودی کتب سے فوطی فار معلوم ہوتا ہے۔ یہ شخص شاہی گارڈ کا افسر تھا۔ پرانے زمانہ میں باڈی گارڈ کا افسر سب سے بڑا عہدہ دار ہوتا تھا چنانچہ اسلامی عہد حکومت میں بھی حاجب اور کاتب۔ یعنی باڈی گارڈ کا افسر اور پرائیویٹ سیکرٹری سب سے بڑے عہدے سمجھے جاتے تھے۔ عباسی خلفاء کے آخر زمانہ میں حاجب کا درجہ کاتب سے بڑا سمجھا جاتا تھا +

جس وقت اس شخص نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا تو آپ کی شکل اور عادات سے آپ کی شرافت کا قائل ہو گیا اور بیوی کو نصیحت کی کہ اسے عام خادموں کی طرح نہ سمجھنا بلکہ عزت کے ساتھ رکھنا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ اس کی لیاقت سے ایک دن ہم فائدہ اٹھائیں یا اگر خاص لیاقت کا لڑکا ثابت ہو تو ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔ اس افسر کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اولاد نہ تھی +

وَلِنُعَلِّمَہٗ کا معطوف علیہ

وَلِنُعَلِّمَہٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ۔ یعنی ہم نے یہ اس لئے کیا کہ تا ایک طرف اسے عزت ملے اور دوسری طرف یہ مشکلات میں پڑے۔ اور روحانیت میں ترقی کرے۔ کیونکہ روحانیت کے لئے تکالیف کا آنا بھی ضروری ہے وَکَذٰلِكَ مَکَّنَّا لِیُوْسُفَ کے آگے لِنُکْرِمَہٗ کا جملہ محذوف ہے۔ اے لِنُکْرِمَہٗ وَلِنُعَلِّمَہٗ۔ اور اس پر لنعلمہ سے پہلی واو دلالت کرتی ہے۔ یعنی ہم نے یوسف علیہ السلام کو اس لئے اس افسر کے ہاں جگہ دی کہ تا اس کی عزت بھی ہو اور مشکلات میں پڑ کر روحانی علوم بھی اس پر کھلیں۔ کیونکہ اس شخص کی بیوی سے جھگڑا پیدا ہو کر حضرت یوسف علیہ السلام نے خاص مجاہدات میں سے گزرنا تھا +

مشکلات میں پڑنا روحانی علوم کا موجب ہوتا ہے

مصر میں یوسف کو شاہی باڈی گارڈ نے خریدا تھا

اَشُدّ

۲۳ حل لغات۔ بَلَغَ فُلَانٌ اَشُدَّہٗ اَیْ قُوَّتَہٗ وَھُوَ مَا بَیْنَ ثَمَانِیْ عَشَرَۃَ اِلٰی ثَلَاثِیْنَ سَنَۃً یعنی اَشُدّ کے معنے قُوَّۃ کے اور اس عمر کے ہوتے ہیں جس میں انسان پورے زور پر ہوتا ہے وَالْمَشْہُوْرُ اَنَّ ذٰلِكَ بِمَعْنَی الْاِدْرَاكِ وَالْبُلُوْغِ اور زیادہ مشہور یہ ہے کہ اس کے معنے بلوغت کے ہوتے ہیں (اقرب)

یوسف کے متعلق پیشگوئی کو تاکید کرنا۔

تفسیر۔ یہ مطلب نہیں کہ جوان ہونے ہی نبوت کے مقام پر پہنچ گئے۔ قرآن کریم کا طرز ہے کہ بعض دفعہ درمیانی واقعات کو چھوڑ کر انجام کو لے لیتا ہے +

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ

اور جس (عورت) کے گھر میں وہ (رہتا) تھا اس نے اس سے اس کی مرضی کے خلاف (ایک) فعل کروانا چاہا۔ اور

غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ

(اس مکان کے) تمام دروازے بند کر دیئے اور کہا (میری طرف) آجا۔ اس نے کہا (میں ایسا کرنے سے) اللہ کی پناہ

اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ

(چاہتا ہوں) وہ یقیناً میرا رب ہے۔ اس نے (ہی) میری رہائش کی جگہ اچھی بنائی ہے بات یہ (ہی) ہے کہ ظالم کامیاب

الظّٰلِمُوْنَ ۞ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا ج

نہیں ہوا کرتے۔ ۲۴ اور اس (عورت) نے اس کے متعلق (اپنا) ارادہ پختہ کرلیا۔ اور اس نے اس کے متعلق (اپنا) ارادہ پختہ کرلیا

راود
ھیت

۲۴ حل لغات۔ رَاوَدَهٗ شَاءَهٗ۔ اسے چاہا۔ اس کا خواہاں ہوا۔ وعن نَفْسِهٖ وَعَلَيْهَا خَادَعَهٗ۔ اسے دھوکہ دے کر اس پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وَفِي الْقُرْاٰنِ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ۔ اے طَلَبَتْ مِنْهُ الْمُنْكَرَ اور قرآن کریم کی آیت میں اس کے یہ معنے ہیں کہ اس سے بدی کروانی چاہی۔ اور اس سے بدی کے ارتکاب کی طالب بنی۔ (اقرب) وَالْمُرَاوَدَةُ اَنْ تُنَازِعَ غَيْرَكَ فِي الْاِرَادَةِ فَتُرِيْدَ غَيْرَ مَا يُرِيْدُ اَوْ تَرُوْدَ غَيْرَ مَا يَرُوْدُ۔ مُراودة۔ (راود کی مصدر) کے معنے یہ ہیں کہ جو بات ایک شخص کرنا چاہتا ہو اس کے خلاف اس سے چاہنا اور اس سے کروانے کی کوشش کرنا۔ وراودت فلانا عن کذا اور اس کا صلہ عن آتا ہے۔ قال تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ اے مَنْ نَفْسِهٖ فمعن دابہ۔ جیسا کہ اس آیت میں تراود کا لفظ ہے جس کے معنے ہیں وہ اسے اس کی رائے اور اس کی مرضی سے ہٹانا اور اس کے خلاف اس سے کروانا چاہتی ہے (مفردات)

هَيْتَ لَكَ۔ اے هَلُمَّ لَكَ وتعال۔ آجا (اقرب) تَهَيَّاْتُ لَكَ۔ میں تیرے لئے تیار اور آمادہ ہوں (مفردات)

حضرت یوسف اس عورت کے قریب میں نہیں آئے

تفسیر۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس عورت کے قریب میں نہیں آئے۔ پس بعض مفسرین کا یہ قول کہ وہ اس کے قریب میں آنے لگے تھے درست نہیں۔

ربی سے مراد عزیز مصر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہے

رَبِّیْ سے مراد اس جگہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ جن لوگوں نے اس کی تفسیر حاجب کی ہے درست نہیں بیشک حاجب نے ان کو عزت کی جگہ دی تھی۔ مگر اس تک پہنچنا اور اس کے دل میں اس خیال کا پیدا ہونا بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے تھا۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام جیسے انسان کے متعلق یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ گناہ سے بچنے کا ذریعہ انسانی احسانات کو بنائیں گے نہ کہ الٰہی فضلوں کو۔ جو کچھ انہیں ملا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی پیشگوئیوں کے ماتحت ملا تھا پس اسی کو وہ اپنے تقویٰ کا موجب قرار دیتے ہیں اور گناہ میں اس کے احسانات کی ناشکری محسوس کرتے ہیں۔

لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ

(اور) اگر اس نے اپنے رب کا روشن نشان نہ دیکھا ہوتا۔ (تو وہ ایسا عزم نہ کرسکتا) اسی طرح پر (ہُوا) تاکہ ہم اس سے

عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا

(ہر ایک) بدی اور بے حیائی (کی بات) کو دُور کر دیں (اور) وہ یقیناً ہمارے برگزیدہ (اور پاک کئے ہوئے)

الْمُخْلَصِيْنَ ۝ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ

بندوں میں سے تھا۔ ۲۵ؔ اور وہ (دونوں) دروازہ کی طرف دوڑے اور اس (کشمکش میں اس عورت) نے

۲۵ حل لغات۔ هَمَّ بِالشَّیْءِ نَوَاهُ وَاَرَادَهٗ وَعَزَمَ عَلَیْهِ وَقَصَدَهٗ وَلَمْ یَفْعَلْهُ۔ پختہ ارادہ اور عزم کرلیا مگر عمل میں نہ لایا۔ (اقرب)

هَمَّ

اَخْلَصَ الشَّیْءَ۔ اِخْتَارَهٗ وَاَخْلَصَهُ اللّٰهُ جَعَلَهٗ مُخْتَارًا خَالِصًا مِنَ الدَّنَسِ۔ اخلص کے معنے ہیں اسے چن لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے برگزیدہ اور ہر ایک میل سے پاک کیا۔ (اقرب)

اَخْلَصَ

تفسیر۔ جیسا کہ حل لغات میں لکھا گیا ہے همّ بہ کے معنے مضبوط ارادہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ گو ساتھ ہی یہ اشارہ بھی ہوتا ہے کہ جس کام کا ارادہ کیا تھا اسے پورا نہیں کیا۔ خواہ اس وجہ سے کہ حالات بدل گئے خواہ اس سبب سے کہ روکیں پڑ گئیں۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ عزیز کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق ایک ارادہ کیا لیکن وہ اسے پورا نہ کر سکی۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے متعلق ایک ارادہ کیا لیکن وہ بھی اس ارادہ کو پورا نہ کر سکے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے یہ مراد ہے کہ دونوں نے آپس میں بدی کا ارادہ کیا۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ اس کی نفی پہلی آیت میں ہو چکی ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ یوسف کو عزیز کی بیوی نے اس کے دلی خیالات کے خلاف پھسلانا چاہا۔ لیکن اس پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اس نے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا۔ اور اس کام کے بد انجام سے اس عورت کو بھی ڈرایا۔ پس اس آیت کی موجودگی میں همّ بہ کے یہ معنے کسی طرح نہیں کئے جا سکتے کہ یوسفؑ نے اس عورت سے کسی بُری بات کا ارادہ کیا +

همّ بہ کیا مراد ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر شخص کی حالت کے مطابق اس کی طرف ارادہ منسوب کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کی اندرونی حالت کو پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا ہے۔ عورت کی اندرونی حالت یہ بتائی ہے کہ وہ بدی کا ارادہ رکھتی تھی اور یوسف علیہ السلام کی حالت یہ بتائی ہے کہ وہ اسے ظلم کے بد انجام سے ڈراتے تھے۔ پس اس جگہ دونوں کے ارادوں سے یہی مُراد لی جا سکتی ہے کہ عزیز کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بدی کی راہ پر لگانا چاہا اور حضرت یوسف نے اسے نیکی کی راہ پر لگانا چاہا مگر دونوں اپنے مقصد کو پورا نہ کر سکے نہ یوسف علیہ السلام نے عزیز کی بیوی کی بات مانی اور نہ اس نے یوسف علیہ السلام کی بات مانی +

لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ الگ جملہ ہے۔

باقی رہا اللہ تعالیٰ کا قول لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ سو یہ هَمَّ بِهَا کے ساتھ نہیں ہے بلکہ الگ قول ہے

اور اس کی جزاء محذوف ہے جیسا کہ قرآن کریم میں متعدد جگہ جزاء محذوف کردی گئی ہے۔ جیسے لَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ وَاَنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ حَکِیْمٌ (نور ع) میں اور لَوْلَآ اَنْ تُصِیْبَہُمْ مُّصِیْبَۃٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْہِمْ فَیَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِکَ وَنَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (قصص ع ۵) میں محذوف ہے۔ اور اس حصہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے براہین نہ دیکھے ہوئے ہوتے تب ہوسکتا تھا کہ وہ اس ارادہ کے سواء کوئی اور

کذٰلک لنصرف عنہ السوء اور الفحشاء سے مراد۔

ارادہ کرتے۔ مثلاً اسے نیکی کی طرف نہ بلاتے خاموش ہی رہتے۔ لیکن جبکہ وہ براہین دیکھ چکے تھے تو پھر اس کے سواء اور وہ کر ہی کیا سکتے تھے ہاں یہ آگے اس عورت کی بدقسمتی تھی کہ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی نصیحت کو قبول نہ کیا اور ظلم پر مصر رہی +

برہان سے مراد

برھان کے متعلق بھی مفسرین میں اختلاف ہے جن لوگوں نے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بدی کا ارادہ کیا تھا وہ اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ عزیز کی بیوی اپنے بُت پر پردہ ڈالنے لگی تھی کہ اس سے مجھے شرم آتی ہے اس پر یوسف علیہ السلام کی آنکھیں کُھل گئیں اور انہوں نے کہا کہ پھر میں کیوں نہ اپنے خدا سے شرماؤں۔ جو دیکھتا اور جانتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے چھت پر یہ لکھا ہُوا دیکھا تھا۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً (گویا قرآن کریم اس وقت نازل ہوچکا تھا) بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک ہتھیلی دیکھی جس پر یہ لکھا ہُوا تھا۔ اِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ۔ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت دیکھی کہ وہ اُنگلیاں دانتوں میں دبا رہے تھے مگر میں کہہ چکا ہوں کہ یہ معنے ہی غلط ہیں۔ برھان سے مُراد وہی آیات اور نشانات ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے ظاہر ہو چکے تھے۔ مثلاً ان کی رؤیا آیندہ رُوحانی ترقیات کے متعلق۔ پھر کنوئیں میں ڈالتے وقت کا الہام کہ اللہ تعالےٰ تجھے اس بلا سے بچاکر ترقی دے گا۔ اور ایک دن تیرے بھائی تیرے سامنے پیش ہوں گے اور اس میں کیا شک ہے کہ جسے اللہ تعالےٰ ایسے عظیم الشان کام کے لئے تیار کر رہا ہو اسے اللہ تعالیٰ ایک مشرکہ کے سامنے شرمندہ نہیں کرسکتا تھا +

کذٰلک لنصرف سے یہ مُراد ہے کہ ہم نے اسے براہین دکھائے ہی اس لئے تھے کہ اس سے بدی اور بے حیائی کو دُور کر دیں۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے اسے اس غرض سے یہ نشانات دکھائے تھے تو کس طرح ممکن تھا کہ اللہ تعالےٰ کے منشاء کے خلاف نتیجہ نکلتا +

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ یہ واقعہ اس لئے ظاہر ہُوا تا کہ اللہ تعالےٰ یوسفؑ کو اس عورت کی بدصحبت سے نجات دلائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بد لوگوں میں رہ کر انسان کے خیالات اور اس کے دماغ پر بُرا اثر پڑتا ہے اگر اس طرح عزیز کی بیوی اپنے بدارادہ کا اظہار نہ کرتی تو اس کی اور اس کی ہجولیوں کی صحبت میں حضرت یوسف علیہ السلام کو رہنا پڑتا۔ جن کے اخلاق قرآن کریم سے ثابت ہے کہ نہایت گندے تھے۔ پس اللہ تعالےٰ نے پسند نہ فرمایا کہ آپ ان کی صحبت میں رہیں اور اس کے بدارادوں کو پُوری طرح اور جلد اللہ تعالےٰ نے ظاہر کرا دیا اور اس طرح انہیں ان سے جدا کر کے قید خانہ میں بھجوا دیا جہاں علیحدگی میں عبادت الٰہی کا خاص موقع ان کو مل گیا +

قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ

اس کے کرتے کو پیچھے سے پھاڑ دیا اور (جب وہ دروازہ تک پہنچے تو) انہوں نے اس (عورت) کے خاوند کو دروازہ کے

قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ

پاس (کھڑا) پایا (جس پر) اس (عورت) نے (اپنے خاوند سے) کہا جو (شخص) آپ کے اہل سے بدی (کرنا) چاہے

يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ

اس کی سزا سوا اس کے (کوئی) نہیں (ہونی چاہئے) کہ اسے قید کر دیا جائے۔ یا (اسے) کوئی اور دردناک عذاب (دیا جائے) ۲۶؎ اس نے

گیارھویں مشابہت

اس بارہ میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت یوسف علیہ السلام سے مشابہت ہے۔ آپؐ کے دشمنوں نے بھی آپ کو لالچ دے کر دین سے پھرانا چاہا تھا چنانچہ تاریخوں میں آتا ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کفار کا ایک وفد آیا اور انہوں نے آپؐ سے کہا کہ اگر آپؐ نے یہ دعویٰ روپیہ کے لئے کیا ہے تو ہم اس قدر روپیہ جمع کر دیتے ہیں کہ آپ سب سے زیادہ مالدار ہو جائیں۔ اور اگر عزت کے لئے کیا ہے تو ہم آپؐ کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں۔ اور اگر عورت کی آپ کو خواہش ہو تو سب سے حسین عورت آپ کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں مگر آپ یہ وعظ چھوڑ دیں۔ اس پر آپؐ نے جواب دیا کہ اگر سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں لا کھڑا کرو تب بھی میں تمہاری بات نہیں مان سکتا۔ قرآن کریم میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے اور اس آیت سے ملتے جلتے الفاظ میں ہے۔ فرماتا ہے وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا۔ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا۔ اور قریب تھا کہ یہ لوگ تجھے ابتلاؤں میں ڈال دیں بوجہ اس کلام کے جو ہم نے تیری طرف بطور وحی نازل کیا ہے تاکہ تو اس کلام کے سواء کوئی اور کلام اپنے پاس سے بنا کر پیش کر دے اس صورت میں یہ لوگ ضرور تجھے اپنا دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم تیرے دل کو کلام الٰہی سے مضبوط نہ کر دیتے تو اس صورت میں قریب ہوتا کہ تو ان کی طرف کسی قدر جھک جاتا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائش کرتے تھے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ الہام الٰہی نے آپ کا دل مضبوط کر چھوڑا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت یوسف علیہ السلام سے مزید مشابہت یہ ہے کہ جس طرح بعض لوگوں نے حضرت یوسفؑ کے متعلق قرآن کریم کی آیات کے یہ معنے کئے ہیں کہ وہ کچھ جھک گئے تھے اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یہ معنے کئے ہیں کہ آپؐ بھی کچھ جھک گئے تھے حالانکہ قرآن کریم دونوں جگہ اس کے خلاف مضمون بیان کرتا ہے +

آنحضرتؐ کو بھی پھسلانے کی کوششیں کی گئیں

آنحضرتؐ پر جھکنے کا قرآن کریم سے غلط الزام لگایا گیا ہے

۲۶؎ حل لغات اِسْتَبَقَا تَسَابَقَا یعنی اِسْتَبَقَا اِسْتِبَاق کے وہی معنے ہیں جو تسابق کے ہیں۔ تَسَابَقَا سَبَقَ اَحَدُهُمَا الْاٰخَرَ اَوْ اَرَادَ اَنْ يَّسْبِقَهٗ۔ اور تسابقا کے معنے ہیں۔ وہ دونوں مقابلہ کے طور پر دوڑے

عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ

(یعنی یوسف نے کہا (نہیں بلکہ) اس نے مجھ سے میری مرضی کے خلاف (ایک) فعل کروانا چاہا تھا۔ اور اس (عورت ہی) کے کنبہ میں سے

قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ

ایک گواہ نے گواہی دی (کہ اس عورت کے کپڑے صحیح سلامت ہیں اور اس آدمی کا کرتہ تار تار پھٹا ہوا ہے پس) اگر اس کا کرتہ آگے سے پھاڑا گیا ہے تو اس

جن میں سے ایک آگے نکل گیا۔ یا یہ کہ ہر ایک نے دوسرے سے آگے بڑھنا چاہا۔ اِلْقِرَاطَ جَاوَزَهٗ وَتَرَكَهٗ وَضَلَّا۔ اور جب اس کے بعد مفعول مذکور ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں وہ اس سے آگے نکل گئے

عزیز کی بیوی کا بھاگنے سے کیا مقصد تھا۔

وا ماقولہ واستبقا الباب فیتقدیر الجار اے تَسَابَقَا اِلَيْهِ او علی تضمین الفعل معنی الابتدار اے اِبْتَدَرَا الْبَابَ۔ لیکن اس آیت میں یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آیا۔ بلکہ یا تو اس کے مفعول سے حرفِ الیٰ محذوف ہے۔ اور یا استبقا کے لفظ میں ابتدار کے معنے ملحوظ ہیں۔ اس لئے اس جگہ معنے یہ ہیں کہ وہ دونوں دروازہ کی طرف دوڑے نہ یہ کہ دروازہ سے آگے نکل گئے (اقرب) +

قَدَّ

حضرت یوسف اپنا کرتہ وہیں چھوڑ کر نہیں بھاگے تھے۔

قَدَّ الشَّيْءَ۔ قَطَعَهٗ مُسْتَاصِلًا۔ اسے بالکل پھاڑ دیا۔ اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ وقیل مُسْتَطِيْلًا اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنے لمبی طرف سے پھاڑ کر پارہ پارہ کرنے کے ہیں۔ وَقِيْلَ شَقَّهٗ مُسْتَطِيْلًا اور بعض نے اس کے یہ معنے بیان کئے ہیں کہ اسے لمبائی کی طرف سے چیر دیا (اقرب)

حضرت یوسف نے بھاگنے کی کوشش کیوں کی۔

تفسیر۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ اس پر نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو انہوں نے اس خیال سے کہ اب زیادہ ٹھہرنا بدنامی کا موجب ہوگا دوڑنا چاہا لیکن عزیز کی بیوی نے اس سے ان کو روکا اور ان کا کرتا پکڑ کر کھینچا جو طول میں پھٹ گیا۔ اتفاقاً اسی وقت عزیز مصر بھی آ گیا۔ اور اس کی بیوی نے اپنے گناہ کو اس طرح چھپایا کہ الزام حضرت یوسف علیہ السلام پر لگایا اور فوراً سزا بھی خود ہی تجویز کر دی کہ اسے قید کر دینا چاہیئے۔ الفاظ آیت سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا منشاء تو یہ تھا کہ وہ دروازہ کھول کر بھاگ جائیں اور عزیز کی بیوی کا منشاء یہ تھا کہ وہ آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے سے روکے اسی وجہ سے اِسْتَبَقَا کا لفظ استعمال کیا ہے ورنہ اگر اس کا منشاء باہر نکلنے کا ہوتا تو وہ کرتہ نہ کھینچتی کرتہ اس نے اس لئے کھینچا کہ ان کو دھکا دے کر پیچھے کر دے اور خود دروازہ پر جا کھڑی ہو مگر باوجود اس کے وہ کامیاب نہ ہو سکی +

بائبل کو اس جگہ بھی قرآن کریم سے اختلاف ہے اس میں لکھا ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنا پیراہن عزیز کی بیوی کے پاس چھوڑ کر بھاگ گئے مگر جب ہم اس امر کو مدنظر رکھیں کہ عبرانیوں میں عام طور پر ایک کرتہ ہی پہننے کا رواج تھا تو اس کے یہ معنی بنتے ہیں کہ وہ ننگے بھاگے جو ایک نہایت معیوب امر ہے اور اس کی امید حضرت یوسف علیہ السلام سے نہیں کی جا سکتی۔ پس قرآن کریم کا بیان عقلاً بھی زیادہ قابل تسلیم ہے کہ ان کا کرتہ پھٹ گیا تھا وہ اسے پھینک کر نہیں بھاگے +

الْكٰذِبِيْنَ ○ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ

(عورت) نے سچ کہا ہے اور وہ (آدمی) یقیناً جھوٹا ہے ۲۷ھ اور اگر اس (شخص) کا کرتہ پیچھے سے پھاڑا گیا ہے تو اس (عورت)

فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاٰ

نے جھوٹ بولا ہے اور وہ یقیناً سچا ہے ۲۸ھ پس جب اس (کے خاوند) نے اس

۲۷ھ حل لغات۔ شَهِدَ الْمَجْلِسَ شُهُوْدًا حَضَرَهٗ۔ اس میں حاضر اور موجود ہوا۔ اِطَّلَعَ عَلَيْهِ اس سے آگاہ ہوا۔ عَايَنَهٗ۔ اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ الْجُمُعَةَ اَدْرَكَهَا۔ نماز جمعہ میں وقت پر پہنچ کر شامل ہوگیا۔ عَلٰى كَذَا۔ اَخْبَرَ بِهٖ خَبَرًا قَاطِعًا۔ اس کے متعلق صحیح صحیح خبر یا اطلاع دی۔ عِنْدَ الْحَاكِمِ لِفُلَانٍ عَلٰى فُلَانٍ بِكَذَا شَهَادَةً اَدّٰى مَا عِنْدَهٗ مِنَ الشَّهَادَةِ۔ شہادت دی (اقرب)

۲۸ھ حل لغات۔ اَلصِّدْقُ بِالْكَسْرِ نَقِيْضُ الْكَذِبِ۔ خبر کا غلط نہ ہونا بلکہ واقع کے مطابق ہونا۔ یا کہنے والے کا واقع کے مطابق بات کہنا اور خلاف واقع نہ کہنا۔ هُوَ الَّذِيْ يَكُوْنُ مَا فِي الذِّهْنِ مِنْهُ مُطَابِقًا لِمَا فِي الْخَارِجِ۔ وہ بات جس میں انسان کا علم واقعات کے مطابق ہو۔ (اقرب)

اَلصِّدْقُ مُطَابَقَةُ الْقَوْلِ الضَّمِيْرَ وَالْمُخْبَرَ عَنْهُمَا صدق اسے کہتے ہیں کہ جو بات کہی جائے وہ متکلم کے ضمیر کے مطابق ہو اور نفس الامر کے بھی۔ وَمَتٰى انْخَرَمَ شَرْطٌ مِنْ ذٰلِكَ لَمْ يَكُنْ صِدْقًا تَامًّا اور جب دونوں شرطوں میں سے کوئی ایک شرط یا دونوں شرطیں مفقود ہوں تو صدق نہیں رہے گا۔ بَلْ اِمَّا اَنْ لَا يُوْصَفَ بِالصِّدْقِ۔ وَاِمَّا اَنْ يُوْصَفَ تَارَةً بِالصِّدْقِ وَتَارَةً بِالْكَذِبِ عَلٰى نَظَرَيْنِ مُخْتَلِفَيْنِ بلکہ یا تو اسے مطلقاً غیر صدق کہا جائے گا اور یا پھر کبھی اس کا نام صدق رکھا جائیگا۔ کیونکہ اس میں صدق کی ایک علامت موجود ہے۔ اور کبھی اسے کذب کہا جائے گا۔ کیونکہ کذب کی بھی ایک علامت اس میں موجود ہے (مفردات)

شہد

صدق کے معنوں کے متعلق اقرب الموارد اور مفردات راغب کے بیانات میں جو اختلاف نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ صدق اور کذب کی حقیقت اور ماہیت۔ اور اہلِ زبان کے محاورات اور استعمال کی رو سے ان کے مفہوم کے متعلق محققین ارباب لغت میں اختلاف ہے۔ اکثر محققین کا (جیسا کہ علامہ تفتازانی وغیرہ نے بیان کیا ہے) وہ خیال ہے جسے اقرب الموارد میں مقدم کیا گیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک متکلم کے اعتقاد اور ضمیر پر اس کا مدار اور انحصار ہے پس جو بات متکلّم کے ضمیر کے مطابق ہو وہ صدق ہوگی خواہ واقع میں صحیح ہو یا غلط۔ اور جو بات متکلّم کے نزدیک خلاف واقع ہو اور اس نے اسے غلط سمجھتے ہوئے کہا ہو وہ کذب متصور ہوگی خواہ فی الواقع صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ اور بعض محققین کے نزدیک صادق وہ خبر ہے جو ضمیر اور واقع ہر دو کے مطابق ہو۔ اور کاذب وہ ہے جو ہر دو کے خلاف ہو۔ اور جو بات واقع اور ضمیر متکلّم میں سے ایک کے مطابق اور ایک کے خلاف ہو وہ ان کے نزدیک حقیقی معنوں میں نہ صادق ہوگی نہ کاذب۔ بلکہ ان ہر دو کے درمیان درمیان اور ایک تیسری چیز ہوگی۔ جسے مجازی طور پر صادق بھی کہا جاسکتا ہے اور کاذب بھی۔ جیسا کہ جاحظ کا

صدق

قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ

کہ (یعنی یوسف کے) کُرتے کو دیکھا کہ پیچھے سے پھاڑا گیا ہے تو اس نے (اپنی بیوی سے) کہا یہ (جھگڑا) یقیناً تمہاری چالاکی سے (پیدا ہوا)

اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۝ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۫

ہے۔ تم عورتوں کی چالاکی یقیناً بہت بڑی (ہوتی) ہے ۲۹ یوسف! تو اس (عورت کی شرارت) سے چشم پوشی کر

عزیز کی بیوی کا نام

خیال ہے۔ اور امام راغب نے مفردات میں اسی کو اختیار کیا ہے ✦

حضرت یوسف کا حقیقت حال کے اظہار میں پہل نہ کرنا

تفسیر خدا تعالےٰ کے برگزیدوں کی یہی شان ہوتی ہے باوجود اس کے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مظلوم تھے آپ پہلے نہیں بولے اور عزیز کی بیوی کے فعل پر پردہ ہی ڈالا۔ لیکن جب اس نے الزام لگایا تو پھر مجبوراً حقیقت حال کو ظاہر کیا کہ میرے دل میں تو کبھی خیال نہیں آیا ہاں یہ میرے ارادہ کے خلاف کام پر مجبور کرتی رہی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے خود ہی یوسف علیہ السلام کے لئے سامان پیدا کر دیے اور ایک شخص ان کے حق میں گواہی دینے والا کھڑا ہو گیا۔ جس نے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ اگر یوسف بد ارادہ کرتا تو اس کا کرتہ آگے کی طرف سے پھٹنے کا زیادہ امکان تھا۔ لیکن پیچھے سے کرتے کا پھٹنا تو صاف بتاتا ہے کہ وہ بیچارہ بھاگ رہا تھا اور یہ عورت اسے روک رہی تھی ✦

حضرت یوسف کی بریت کا سامان

عورتیں گہری تدبیروں کی نسبتاً زیادہ عادی کیوں ہوتی ہیں۔

عزیز کی بیوی کے خوف سے شاہد کا ادائے شہادت میں ابہام رکھنا

چونکہ اس سے پہلے کرتے کے پھٹنے کا کوئی ذکر نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس گواہ نے خود ہی کرتہ پھٹا ہوا دیکھا ہے اور جب اس نے خود دیکھا تھا تو اس نے ساتھ ہی یہ بھی دیکھ لیا ہو گا کہ کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا تھا۔ پس ظاہر ہے کہ اس شخص نے عزیز کی بیوی کے لحاظ سے صاف طور پر یہ نہیں کہا کہ اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا ہے پس یہ مجرم نہیں بلکہ اس طرح بات کی ہے کہ گویا ایک قاعدہ بتا رہا ہے تا کہ عزیز کی بیوی اس پر ناراض نہ ہو ✦

عزیز کی بیوی کا نام مسلمانوں کی کتب میں زلیخا لکھا ہے۔ بائبل میں اس کا نام نہیں آتا۔ لیکن یہود کی روایات کی کتاب یعنی طالمود میں اس کا نام زلیخا ہی لکھا ہے معلوم ہوتا ہے انہی سے مسلمان مفسرین نے نقل کیا ہے ✦

یہ خدائی فیصلہ نہیں بلکہ عزیز کا قول ہے۔

۲۹ **تفسیر** یہ عزیز کا کلام معلوم ہوتا ہے اس شاہد کے توجہ دلانے پر اس نے کرتہ جب پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا تو حقیقت کو سمجھ گیا اور بیوی سے صاف کہہ دیا کہ یہ تیری چالاکی ہے۔ اس آیت سے بعض لوگ یہ مطلب نکالتے ہیں کہ عورتیں خاص طور پر مکار ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورتیں بوجہ ان مظالم کے جو ان پر کئے جاتے ہیں گہری تدابیر کی زیادہ عادی ہوتی ہیں اور بات کا پھرانا ان کا خاص فن ہو گیا ہے مگر اس کا سبب ان کے حقوق کا اتلاف ہے۔ جن قوموں یا گھرانوں میں عورتوں کے حقوق پورے طور پر ادا ہوتے ہوں انکی عورتیں ایسی نہیں ہوتیں اس کے برعکس جو اقوام ظالموں کے تصرف میں ہوتی ہیں ان کے مرد بھی اس مزاج کے ہو جاتے ہیں۔ پس یہ مادہ عورت سے مخصوص نہیں بلکہ ظلم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور مرد اور عورت دونوں اس میں شریک ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اللہ تعالےٰ کا قول نہیں ہے بلکہ عزیز کا قول ہے اور اس کا قول ہم پر حجت نہیں ہے اس نے غصہ کی حالت میں یہ بات کہدی ہے کہ عورتیں ایسی ہی

وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ ۝

ع ۳ ۹ ۱۳

اور تو (اے عورت) اپنے قصور کی بخشش طلب کر۔ یقیناً تو ظالموں میں سے ہے نمبر ۳۱

ہوتی ہیں اور جو لوگ اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکتے وہ ہمیشہ ایسی باتیں کہہ دیا کرتے ہیں۔ عورتیں مردوں کو کہتی رہتی ہیں کہ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں اور مرد عورتوں کو کہتے رہتے ہیں کہ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں اس کو ایک قاعدہ اور کلی صداقت قرار دینا محض نادانی اور ناواقفیت کی علامت ہے کہنے والے کی مراد اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ مخاطب یا اس کے ساتھی فعل زیر بحث میں غلطی پر ہیں۔ اور ہرگز یہ مُراد نہیں ہوتی کہ تمام افراد ایسے ہیں اور اگر یہ مراد ہو تو یقیناً وہ غلطی پر سمجھا جائے گا۔ جس جنس نے مریمؑ خدیجہؓ عائشہؓ اور ایسی ہی اور بہت سی عورتیں پیدا کی ہیں اس کی نسبت ایک قاعدہ کے طور پر ایسا کلام کہنا خود اپنی پردہ دری کرنا ہے ✤

نمبر ۳۱ حل لغات۔ اَعْرَضَ عَنْهُ اَضْرَبَ وَصَدَّ۔ اس سے رُخ ہٹا لیا۔ اور اس کی طرف سے ہٹ کر دوسری طرف توجہ کر لی وَحَقِيْقَتُهٗ جعل الهمزة لِلصَّيْرُوْرَةِ اے اخذت عرضاً اے جانباً غَيْرَ الجانبِ الَّذِىْ هُوَ فِيْهِ۔ اور اس کے یہ معنے باب افعال کی خاصیت صیرورۃ کے ماتحت پیدا ہوئے ہیں یعنی جس طرف دوسرا شخص ہے اسے چھوڑ کر کسی اور طرف رُخ کر لیا۔ اور دوسری جانب کو اختیار کر لیا (اقرب)

پس اعرض عن هٰذا کے یہ معنے ہوئے کہ اس بات سے چشم پوشی کر اور اسے خاطر میں نہ لا۔

تفسیر۔ یہ بھی عزیز کا کلام ہے۔ وہ ایک طرف تو اپنی بیوی کو نصیحت کرتا ہے اور دوسری طرف یوسف علیہ السلام کو پردہ پوشی کے لئے کہتا ہے۔

یہاں بھی بائبل اور قرآن کریم میں اختلاف ہے بائبل کہتی ہے کہ اس نے بیوی کی بات پر اعتبار کر لیا اور یوسف علیہ السلام کو مجرم قرار دیا اور اس پر ناراض ہوا۔ مگر بائبل ہی کے دوسرے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا بیان سچا ہے اور بائبل کا غلط ہے۔ چنانچہ کتاب پیدائش باب ۳۹ میں لکھا ہے۔ " اور قید خانہ کے داروغہ نے سب قیدیوں کو جو قید میں تھے یوسف کے ہاتھ میں سونپا۔ اور جو کام وہاں کیا جاتا تھا اس کا مختار وہی تھا " آیت ۲۲۔

اور بائبل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ قید خانہ عزیز فوطیفار کے ہی ماتحت تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ فرعون اپنے دو سرداروں پر جن میں ایک ساقیوں اور دوسرا نان پزوں کا داروغہ تھا غصے ہوا۔ اور اس نے انہیں نگہبانی کے لئے جلوداروں کے سردار کے گھر میں اس جگہ جہاں یوسف بند تھا قید خانہ میں ڈالا۔ جلوداروں کے سردار (یعنی عزیز) نے انہیں یوسف کے حوالہ کیا۔" نمبر ۴۰ آیت ۳تا۴۔ اب یہ عقل کے خلاف امر ہے کہ فوطیفار تو یوسف علیہ السلام کو اپنی عزت پر حملہ کرنے والا سمجھے اور اس کا نوکر داروغہ اس کو جیل کا افسر مقرر کر دے۔ اور یہ امر اور بھی عقل کے خلاف ہے کہ بادشاہ کے خاص قیدی جب عزیز کے سپرد کئے جائیں تو وہ خود انہیں یوسف علیہ السلام کی نگرانی میں دیدے۔ پس ان حوالجات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عزیز کو حضرت یوسفؑ کی براءت پر پورا یقین تھا۔ اور قرآن کریم کا بیان صحیح ہے۔ اور بائبل کا غلط ✤

حاشیہ: یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔

حاشیہ: بائبل کی شہادت کہ عزیز کو حضرت یوسف کی براءت کا یقین تھا۔

حاشیہ: اغراض

حاشیہ: عزیز نے اپنی بیوی کی بات پر اعتبار نہیں کیا تھا۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ

اور اس شہر کی بعض عورتوں نے (ایک دوسری سے) کہا (کہ) عزیز کی عورت اپنے غلام سے اس کی

تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ

مرضی کے خلاف (بُرا) فعل کروانا چاہتی ہے (اور) اس کی محبت نے اس کے دل کی گہرائیوں میں گھر

اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ فَلَمَّا سَمِعَتْ

کرلیا ہے۔ ہم (اس معاملہ میں) اسے یقیناً (کھلی) کھلی غلطی پر دیکھتی ہیں۔ ۳۱؎ اور جب اس نے ان کے (اس)

عَزِيْز **۳۱؎ حل لغات**۔ اَلْعَزِيْزُ۔ اَلشَّرِيْفُ۔ بڑا آدمی۔ اَلْقَوِيُّ۔ طاقت والا۔ اَلْمُكَرَّمُ۔ معزز۔ من اَسْمَآئِهٖ تعالٰی وَهُوَ الْمَنِيْعُ الَّذِيْ لَا يُنَالُ وَلَا يُغَالَبُ۔ یہ خدا تعالیٰ کا نام بھی ہے اور اس کے معنی ہیں وہ ذات جسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور نہ اس کا کوئی مقابلہ کرسکتا ہے۔ الملكُ لِغَلَبَتِهٖ عَلٰى اَهْلِ مَمْلَكَتِهٖ۔ بادشاہ کو بھی عزیز کہتے ہیں کیونکہ اپنی حکومت کے تمام لوگوں پر غلبہ رکھنے والا ہوتا ہے۔ وَلَقَبُ مَنْ مَلَكَ مِصْرَ مَعَ الْاِسْكَنْدَرِيَّةِ۔ مصر اور اسکندریہ کے حکمران کا لقب (اقرب)

پوتیفر بادشاہ نہیں تھا بلکہ بادشاہ کا حاجب تھا۔

شَغَف شَغَفَ شَغْفًا اَصَابَ شَغَافَهٗ اس کے شغاف (یعنی اندرونی دل) میں جا پہنچا۔ شَغَفَهٗ حُبُّهٗ شَغْفًا علق بِالشَّغَافِ۔ اس کی محبت اس کے دل کے اندر چلی گئی اور پختہ طور پر پیوستہ ہوگئی۔ اَلشَّغَافُ غلاف القلب وقيل حِجَابُهٗ وقيل سُوَيْدَاؤُهٗ۔ شغاف کے معنے ہیں۔ دل کا پردہ یا دل کا حجاب یا دل کا وسطی نقطہ (اقرب)

ان عورتوں کا حضرت یوسف کو بھی ملتوی ظاہر کرنا۔

اَلضَّلَال الضلال۔ الهَلَاكُ تباہی۔ الفَضِيحَةُ رسوائی اَلْبَاطِلُ۔ غلط بات۔ ضِدُّ الهُدٰى۔ راہ یابی کے خلاف یعنی درست راہ سے دوری۔ (اقرب)

اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ۔ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضلال مبين۔ اشارةٌ الٰی شَغَفِهٖ بِيُوسُفَ و شوقه اليه۔ وكذٰلك قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا۔ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ یعنی ان آیات میں ضلال سے مراد سخت اور پُرزور محبت و اشتیاق ہے۔ (مفردات) +

تفسیر عَزِیز کا ترجمہ عزیز ہی کیا گیا ہے۔ کیونکہ آجکل کی اصطلاح میں عزیز مصر کے بادشاہ کو کہتے ہیں لیکن عورت مصر کے بادشاہ کی نہیں بلکہ اس کے حاجب کی بیوی تھی پس معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزول کے وقت میں عزیز کا لفظ سرداران مصر کے متعلق بھی استعمال ہوتا تھا یا پھر عورتوں نے خوشامدانہ طور پر یہ لفظ استعمال کیا ہے جیسا کہ بڑے آدمیوں کو ان کے ماتحت بادشاہ وغیرہ کے الفاظ سے یاد کرلیتے ہیں +

جب یوسف علیہ السلام کو عزیز کی بیوی سے یہ واقعہ پیش آیا تو اس کا چرچا عزیز کے خاندان سے تعلق رکھنے والے گھرانوں میں بھی شروع ہوگیا بعض عورتیں جو معلوم ہوتا ہے کہ عزیز کی بیوی کی سہیلیاں تھیں جب انہیں یہ خبر پہنچی تو انہوں نے اس کا عام تذکرہ کرنا شروع کیا۔ لیکن عزیز کی بیوی کو مزید بدنام کرنے کے لئے ایسے الفاظ میں تذکرہ شروع کیا

بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ

منصوبہ کی خبر سنی تو انہیں (دعوت کا) پیغام بھیجا اور ان کے لئے ایک (خاص) مسند تیار کی

مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّ

اور (جب وہ آئیں تو) ان میں سے ہر ایک کو (کھانا کھانے کے لئے ایک) ایک چھری دی اور

قَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ

(یوسف علیہ السلام سے) کہا (کہ) ان کے سامنے آ۔ پس جب انہوں نے اسے دیکھا تو اسے (بہت) بڑی شان کا

وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا

(انسان) پایا اور (اسے دیکھ کر) اپنے ہاتھ کاٹے اور کہا (کہ یہ شخص محض) اللہ (تعالیٰ) کے لئے (بدی کے ارتکاب سے)

بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝ قَالَتْ

ڈرا ہے۔ یہ بشر (ہے ہی) نہیں۔ یہ (تو) صرف ایک معزز فرشتہ ہے۔ ۳۲؎ (اسپر) اس (عورت) نے انہیں کہا

جس سے یہ معلوم نہ ہو کہ اس نے کوئی کوشش کی تھی اور وہ ناکام رہی بلکہ یوں کہنا شروع کیا کہ گویا وہ فعل جاری ہے اور اس طرح گویا نتیجہ کو مشتبہ کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی ملوث قرار دیا قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا میں حبًّا تمیز ہے اور اس کا ترجمہ اسی طرح کریں گے جس طرح طابَ محمدٌ نفسًا کا کرتے ہیں یعنی جس طرح وہاں طاب محمد نفسہٗ مراد ہوتا ہے اسی طرح یعنی شغفہا حبّہٗ مراد لیا جائے گا اور معنے یہ ہوں گے کہ یوسف کی محبت اس کے دل کے پردوں میں گھس گئی ہے یعنی وہ شدید محبت میں مبتلا ہو گئی ہے کہ اب اسے چنداں بدنامی کا بھی ڈر نہیں رہا گویا وہ ظاہر الفاظ میں اس کی معذوری بیان کرتی ہیں اور اصل میں اس کے عیب کی اشاعت مقصود ہے۔

۳۲؎ حل لغات۔ سَمِعَ بِہٖ کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ بات شہرت پا گئی۔ اور اس ذریعہ سے اسے بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ اقرب الموارد میں سَمَّعَ کے معنی لکھے ہیں سَمَّعَ بکذا شَنَّعَہٗ اسے شہرت دی۔ بالرجل اَذَاعَ عنہ عَیبًا وندّدَ بہٖ وشَہَّرَہٗ وفضحہٗ۔ اس کے متعلق کوئی عیب کی بات پھیلائی اور اسے شہرت دے کر اس کو رسوا کیا۔ پس سَمِعَ بِہٖ کے معنے یہ ہوئے کہ اس کے متعلق بات مشہور ہوئی جسے اس نے بھی سنا۔ اِتَّكَأَ۔ جلسَ متمكّنًا۔ خوب جم کر بیٹھا۔ یقال اِتَّكَأَ علی السَّرِیْرِ چنانچہ تخت پر بیٹھنے کو اتکا ہی کہتے ہیں۔ القومُ عند فلانٍ طعموا عندہٗ۔ انہوں نے اس کے ہاں کھانا کھایا۔ قال جمیلٌ فظلِلْنا بنعمۃٍ وَاتَّكَأْنا۔ اسے طعمنا۔ چنانچہ جمیل اپنے ایک واقعہ کا ان اوپر کے الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔ یعنی ہم دن بھر عیش و عشرت کرتے رہے۔ اور خوب کھایا پیا۔ علٰی عصاہٗ تحمّلَ واعتمدَ علیہا۔ اپنی چھڑی پر ٹیک لگائی۔ اور

شَغَفَهَا حُبًّا کے معنے۔

اِتَّكَأَ

اُن عورتوں کی ایک چال کی

سَمِعَ بِہٖ

اپنا بوجھ اس پر ڈالا۔ قَالَ ابنُ الاثیرِ والعامّۃ لا تَعْرِفُ الِاتّکاءَ اِلّا المیلَ فی القعودِ معتمدًا علی اَحَدِ الشقّینِ۔ ابن اثیر کہتا ہے کہ عامۃ الناس اتّکاء کا لفظ صرف اس طور پر سہارا لگا کر بیٹھنے کے معنے میں استعمال کرتے ہیں جس میں کسی چیز سے اپنے پہلو کو لگایا جائے۔ وھو یُسْتَعْمَلُ فی المَعْنَیَیْنِ جمیعًا لیکن درست بات یہ ہے کہ خواہ کسی چیز کا سہارا دیا جائے یا پہلو کو۔ ہر دو صورتوں کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے یقال اِتّکَأَ اذا اَسْنَدَ ظَھْرَہٗ او جنبَہٗ الی شیءٍ معتمدًا علیہ چنانچہ جب کوئی شخص کسی چیز سے اپنی پیٹھ کو سہارا دے یا اپنے پہلو کو ٹکائے تو ان دونوں صورتوں میں یہ لفظ بولا جاتا ہے وکُلُّ مَنِ اعْتَمَدَ علی شیءٍ فقد اتّکَأَ علیہ۔ اور جس چیز کا بھی سہارا لے کر بیٹھیں اس کے لئے اتّکاء کا لفظ بولا جا سکتا ہے والمُتَّکَأُ مجلس یتکاء علیہ اور مُتّکا۔ ایسی بیٹھنے کی جگہ کو کہتے ہیں جس سے سہارا لیا جائے۔ (اقرب)

سِکِّین سِکّین۔ اسم جنس ہے جس کا واحد سِکّینۃ ہے۔ السِکّین آلۃ یُذْبَحُ بھا۔ چھری۔ السکّینۃ السِکّین وھی اخصّ منہ۔ سکینۃ کے معنے ایک چھری کے ہیں۔ یہ سکّین سے خاص ہے۔ کیونکہ یہ صرف واحد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور سکّین واحد اور جمع ہر دو کے لئے۔ الطمانینۃ کالسکّینۃ سکّینۃ کے معنے اطمینان اور سکینت کے بھی ہیں (اقرب)

خَرَجَ علیہ خَرَجَ کا صلہ علیٰ ہو تو اس کے معنی سامنے آنے کے ہوتے ہیں۔ جو ہر موقعہ کے مناسب حال الگ الگ صورت پر ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں خرج علیہ۔ اے بَرَزَ لِقِتَالِہٖ۔ جنگ کرنے کے لئے سامنے آیا۔ الرعیۃُ علی الوالی خلعت طاعتہ رعیت اپنے حاکم کی اطاعت کا جُوا اُتار کر اس کے مقابلہ پر آمادہ ہوگئی۔ الوالی علی السُّلْطَانِ تَمَرَّدَ کسی علاقہ کا والی اپنے بادشاہ سے سرکش ہو کر اس کے مقابل پر کھڑا ہوگیا (اقرب) پس اُخْرُجْ علیھن کے معنے ہوئے ان کے سامنے آ۔

اَکْبَرْنَہٗ اَکْبَرَہٗ۔ رَاٰہُ کبیرًا وعَظُمَ عندہ اس نے اسے بڑا سمجھا اور اس کی عظمت اس کے دل میں قائم ہوگئی (اقرب)

حَاشَ حَاشَ منہ یَحِیْشُ حَیْشًا۔ فَزِعَ۔ ڈر گیا ڈر کر دُور رہا (اقرب) حاشی زیدًا من القومِ اِسْتَثْنَاہُ۔ اسے دوسروں سے الگ رکھا۔ حاشا ویقال فیھا ایضا حاش وحشی۔ قال فی الایضاح کلمۃٌ استُعملت لِلاِستِثْنَاءِ فیما یُنزّہ فیہ المُسْتَثْنٰی عن مُشَارَکَۃِ المستثنٰی منہ فی حُکْمِہٖ۔ یعنی حاشا۔ حاش۔ یا حشی کا لفظ ایسے موقع پر استثناء کے لئے استعمال ہوتا ہے جہاں اس کے مدخول کا شرف ظاہر کرنا اور اس شرف میں اسے باقی سب سے ممتاز اور الگ بتانا مقصود ہو۔ (اقرب) پس اگر حاش کو یَحِیْشُ کی ماضی کا صیغہ سمجھا جائے تو حاش لِلّٰہِ کے معنے ہوں گے وہ خدا کے لئے (اس بات سے) ڈرا اور اس سے دُور رہا ہے۔

ابو البقاء جلالین کے حاشیہ میں لکھتا ہے حاش لِلّٰہِ فاعلُہٗ مُضمرٌ۔ تقول حاش یوسفُ بخوفِ اللّٰہِ۔ یعنی حاش کا فاعل مضمر ہے اور معنے یہ ہیں کہ یوسف خدا کی خاطر اس فعل سے ڈرا۔ اور اگر یہ حاشٰی میں سے فعل امر کا صیغہ ہو تو یہ معنے ہوں گے کہ اے مخاطب تو خدا کے لئے اسے دوسروں سے الگ رکھ اور اسے دوسروں جیسا مت سمجھ یہ ایسی باتوں سے پاک ہے اور اس صورت میں کسرہ بغرض تخفیف فتحہ سے تبدیل شدہ سمجھا جائے گا

اور اگر اسے فعلی صیغوں اور تصاریف پر نہ پرکھا جائے بلکہ محاورات اور امثال کی طرح سمجھا جائے تو بھی اس کے معنے یہی ہوں گے جیسا کہ اقرب الموارد کی اوپر کی عبارت میں بحوالہ ایضاح بیان ہوا ہے اس صورت میں بھی بعض نحوی اس کا نام فعل رکھتے ہیں۔ بعض اسے اسم اور بعض حرف کہتے ہیں۔ اور بعض اسے اسم الفعل کہتے ہیں۔ اور مغنی اللبیب میں ہے۔ والصحیح انہا اسمٌ مرادفٌ للبَرَاءَۃِ بدلیل قِرَاءَۃِ بعضہم حاشًا لِلّٰہِ بالتنوین کما یُقَالُ براءۃ للّٰہ من کذا۔ وعلی ھٰذا فقراءۃ ابن مسعود حَاشَ اللّٰہِ کَمَعَاذَ اللّٰہِ۔ یعنی صحیح قول یہ ہے کہ یہ اسم ہے جو براءۃ کا ہم معنے ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک قراءۃ میں حاشًا للّٰہ بھی آیا ہے جیسا کہ براءۃٌ لِلّٰہ محاورہ ہے اور اس تحقیق کی رو سے ابن مسعود والی قراءۃ حاش اللّٰہ میں معاذ اللّٰہ کی طرح حاش مفعول مطلق ہو گا +

تفسیر۔ یعنے اسے جب یہ معلوم ہوا کہ وہ عورتیں ایسے رنگ میں کلام کر رہی ہیں کہ لوگ یہ خیال کریں کہ گویا بدی کا ارتکاب ہو گیا ہے اور بظاہر خیر خواہانہ بات کرتی ہیں لیکن اصل میں بدنام کرنا مقصود ہے۔ تو اسے یہ خیال ہوا کہ ان کے نزدیک عزیز کی بیوی اور یوسف کا تعلق تو ہے صرف پردہ ڈالنے کے لئے یہ بات بنائی گئی ہے کہ تعلق کوئی نہیں صرف مبادی عزیز کی بیوی کی طرف سے ظاہر ہوئے تھے۔ پس ان کا یہ شبہ دُور کرنے کے لئے اس نے انہیں کھانے یا ناشتہ کی دعوۃ دی۔ میز وغیرہ لگائی گئی۔ اور ہر اک کے سامنے ایک ایک چھری رکھ دی گئی (اس سے معلوم ہوتا ہے پرانے زمانہ سے کھانے میں چھریوں کا استعمال چلا آتا ہے اور آجکل کی طرح یہ بھی قاعدہ تھا کہ چھریاں پہلے رکھ دی جائیں پھر کھانے کی اشیاء آئیں) اس کے بعد یوسفؑ کو حکم دیا کہ ان کے سامنے کھانا وغیرہ رکھے جب انہوں نے یوسف علیہ السلام کی شکل دیکھی تو شکل سے ہی سمجھ گئیں کہ یوسفؑ اس قسم کے آدمی نہیں ہیں اور ان کی بزرگی کی قائل ہو گئیں اور سمجھ گئیں کہ ان کا خیال غلط تھا۔ یوسف علیہ السلام عزیز کی بیوی کے ساتھ شریک کار نہ تھے۔ اور یہ جو فرمایا ہے کہ انہوں نے ہاتھ کاٹے۔ اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ ان کی سادگی اور شرافت کے نظارہ میں ایسی محو ہوئیں کہ بعض کے ہاتھوں کو چھریوں سے زخم لگ گئے اور یہ بھی مُراد ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اپنے دانتوں میں انگلیاں حیرت سے دبائیں کہ کیا ہم ایسے شخص کا نام اس طرح لیتی ہیں چنانچہ عربی میں عَضَّ الْاَنَامِل انگلیوں کو دانتوں سے کاٹنے کا محاورہ حیرت کے معنوں میں آتا بھی ہے اور یہ عربی کا محاورہ ہے کہ جزو کے لئے کل کا لفظ بعض دفعہ استعمال کر لیتے ہیں پس ہو سکتا ہے کہ ایدی انامل کی جگہ استعمال کر لیا گیا ہو +

ہاتھ کاٹنے سے مراد۔

عزیز کی بیوی کا ان عورتوں کو دعوت دینا۔

طالمود میں جو یہود کی حدیث کی کتاب ہے لکھا ہے کہ عزیز کی بیوی نے ان عورتوں کے سامنے سنگترے رکھے تھے اور انہیں ان کی خدمت کا حکم دیا وہ ان کی طرف دیکھتی رہیں اور بے توجہی میں ان کے ہاتھ زخمی ہو گئے +

دعوت میں سنگترے

حضرت یوسف علیہ السلام کی صورت دیکھ کر وہ عورتیں بے اختیار ان کی نیکی کی قائل ہو گئیں اور کہہ اٹھیں کہ یہ تو ایک بزرگ فرشتہ ہے۔ اس محاورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی فرشتہ کا لفظ انسانوں کے لئے بھی استعمال کر لیا جاتا ہے +

مَلَک سے مراد بزرگ آدمی

فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ

یہ وہی (شخص) ہے جس کے متعلق تم نے مجھے ملامت کی ہے اور میں نے اس سے اس کی مرضی کے خلاف (ایک برا) فعل

عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ

کروانے کی کوشش ضرور کی تھی (مگر) اس پر (بھی) یہ بچا رہا اور اگر اس نے وہ بات جس کے لئے میں اسے حکم

اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ○

دیتی ہوں نہ کی تو یقیناً اسے قید کر دیا جائے گا۔ اور یقیناً ذلیل ہو گا ۳۳؎

استعصم — **۳۳؎ حل لغات۔** اِسْتَعْصَمَ: اِمْتَنَعَ وَاَبَیٰ بدی کے ارتکاب سے رُک رہا اور اس سے انکار کر دیا۔ تَقُوْلُ دُعِیَ اِلٰی مَکْرُوْہٍ فَاسْتَعْصَمَ فلاں شخص کو بدی کی طرف بُلایا گیا تو اس نے اس کے ارتکاب سے انکار کر دیا۔ تَحَرّٰی مَا یَعْصِمُہٗ ایسی چیز تلاش کی جو اسے بچائے۔ بِہٖ: اِسْتَمْسَکَ وَلَزِمَہٗ اسے پکڑ لیا اور اس کے ذریعے اپنا بچاؤ کیا۔ من الشر والمکروہ اِلْتَجَأَ بدی سے بچنے کے لئے کسی چیز کی پناہ لی۔ (اقرب)

عزیز کی بیوی کا زبانی حضرت یوسف کی عصمت

لیکوناً — ولیکوناً میں نون تاکید خفیفہ ہے جسے اس جگہ تنوین کی شکل میں لکھا جاتا ہے۔

صغر — صَغُرَ۔ ضِدُّ عَظُمَ ذلیل ہوا۔ ھَانَ بالذُّلِّ بے قدر اور ذلیل ہوا۔ الشمسُ: مالت لِلغروبِ۔ سورج نیچے چلا گیا۔ اور ڈوبنے لگا۔ صغر القومَ: کان اصغرھم سب سے چھوٹا ہو گیا۔ (اقرب)

صغُر میں سے صفت مشبہ کا صیغہ صغیر آتا ہے اور صغِر میں سے صاغر آتا ہے۔ پس صَاغِرِیْن کے معنے ہوں گے چھوٹے لوگ یعنی پست اور چھوٹی حیثیت کے لوگ یا ذلیل و رسوا لوگ۔ الصَّاغِرُ المهانُ الرَّاضِی بالذُّلِّ والضَّیْمِ۔ صاغر کے معنے ہیں ذلیل کر کے رکھا جانے والا شخص جو ذلت پر اور مظلومیت پر راضی ہو اور ذلت میں رہتے رہتے اس کا خودداری کا احساس ہی مارا جائے (اقرب)

تفسیر۔ پہلے یہ بیان ہو چکا ہے کہ وہ عورتیں اس طرز پر بات کرتی تھیں۔ جس سے دوسرے لوگ یہ سمجھ لیں کہ فعل بد سرزد ہوا ہے۔ اور اسی کی تردید کے لئے ان عورتوں کو عزیز کی عورت نے بُلایا تھا اور ظاہر ہے کہ جب تک مرد کی طرف سے آمادگی نہ ہو اس فعل کا وقوع نہیں ہو سکتا۔ پس امرأة العزیز نے پہلے یوسف علیہ السلام کو ان عورتوں کے سامنے لا کر انہی کی زبانوں سے اس کا اقرار کرا لیا کہ یوسف سے یہ فعل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پھر اصل حقیقت بتائی کہ میں نے تو کوشش کی تھی لیکن یہ محفوظ رہا اور جیسا کہ الفاظِ آیت سے ظاہر ہے کہ وہ اس کی بدی میں شریک سہیلیاں تھیں ماضی کی براءة کر کے وہ آئندہ کے لئے خود کہتی ہے کہ اگر اس نے میری بات نہ مانی تو میں اسے قید کرا دونگی اور ذلیل کر دونگی +

یہ عجیب لطیفہ ہے کہ مفسرین تو کہتے ہیں کہ وہ بدی کی طرف جھک گئے تھے۔ لیکن وہ عورت جس کا واقعہ ہے اور جس کے لئے یوسف کا انکار نہایت ذلت کا موجب ہے وہ خود کہتی ہے کہ باوجود میری کوشش کے یوسفؑ میرے دام میں نہیں آیا بلکہ محفوظ رہا

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ

(یوسف نے) اس نے (دُعا کرتے ہوئے) کہا (کہ) اے میرے رب. جس بات کی طرف وہ مجھے بلاتی ہیں اس کی نسبت قیدخانہ (مجھے)

اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ

مجھے زیادہ پسند ہے اور اگر ان کی تدبیر (کے بدنتیجہ) کو تو مجھ سے نہیں ہٹائے گا تو میں ان کی طرف جھک جاؤں گا

وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ○ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ

اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔ ۳۴ پس اس کے رب نے اس کی دعا سُن لی

اللہ تعالیٰ کی قدرت عجیب ہے کہ عزیز کی بیوی نے جس چیز کی دھمکی یوسف کو دی تھی کہ میں ان کو قید کرا دونگی اور اس طرح یہ ذلیل ہو جائے گا وہی قید یوسف علیہ السلام کی عزّت کا موجب ہوگئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو اس قید کے ذریعہ سے بادشاہ کا مقرّب اور وزیر خزانہ بنوا دیا اس کی بات بھی پوری ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے اس ذریعہ سے اپنا وعدہ بھی پورا کر دیا اور بتا دیا کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے وہ چاہے تو ذلت کے اسباب سے عزّت کے سامان پیدا کر دے ؎

۳۴ حل لغات۔ اَحَبُّ اسم تفضیل کا صیغہ ہے مگر اس کے معنے زیادہ پیارے اور بہت محبوب کے نہیں بلکہ کم مکروہ اور کم مبغوض کا مفہوم مراد ہے۔ گویا کم بغض کو مجازاً محبت سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ حُب اور بغض دو متقابل چیزیں ہیں جن میں سے کسی ایک سے دوری اس کے مقابل کی چیز سے قرب کا موجب ہو جاتی ہے ؎

صَبَا يَصْبُوْ صَبْوًا وَصُبُوًّا وَصِبًا وَصِبَاءً مَالَ اِلَى الصَّبْوَةِ۔ جوانی کے جذبات کی طرف جھک گیا۔ ومنہُ اِنَّ نَفْسَهٗ تَصْبُوْا اِلَى الْخَيْرِ۔ وہ نیکی کے کاموں کی طرف بہت میلان رکھتا اور جھکا رہتا ہے۔ وھو يَصْبُوْ الى معالي الْاُمورِ۔ وہ اعلیٰ اور موجبِ شرف امور کی طرف مائل رہتا ہے۔ صَبَا اليه صَبْوَةً وصُبُوَّةً وصُبُوًّا حَنَّ اليه۔ اس کا مشتاق ہُوا (اقرب)

اَلْجَهْلُ عَلٰى ثَلَاثَةِ اَضْرُبٍ۔ جہل کی تین قسمیں ہیں۔ الاوّل خُلُوُّ النفسِ من العِلْمِ۔ ناواقف اور بے خبر ہونا۔ الثّانی اعتقادُ الشئِ بخلافِ ماھُوَ عَلَيْهِ کسی امر کے متعلق غلط خیال پر قائم ہونا۔ الثّالثُ فِعْلُ الشئِ بخلافِ ماحقّہ ان يفعلَ عملی غلطی کرنا۔ اور جس طرح کرنا چاہیئے اس کے برعکس کام کرنا۔ (مفردات)

تفسیر۔ جس طرح پچھلی آیت سے عزیز کی بیوی کے مُنہ سے یوسف علیہ السلام کی براءت کرائی گئی ہے یہاں خود حضرت یوسف علیہ السلام کے مُنہ سے ان کی براءت کرائی گئی ہے وہ کہتے ہیں کہ اے خدا اگر تو ان کے فریب کو مجھ سے نہیں پھرائے گا تو میں ان کی طرف جھک جاؤں گا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فعل بدی تو الگ رہا اب تک وہ ان کی طرف جھکے بھی نہ تھے تعجب ہے کہ عورت بھی کہتی ہے کہ یوسف نہیں جھکا یوسف بھی کہتا ہے کہ میں نہیں جھکا دوسری

قید یوسف کے لئے عزت کا موجب ہوئی۔

صَبَا

جہل

اَحَبُّ

صَبَا

فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ

اور ان کی تدبیر (کے بدنتیجہ) کو اس سے ہٹا دیا۔ یقیناً وہی ہے جو بہت ہی (دعائیں) سننے والا (اور لوگوں کے حالات کو)

الْعَلِيْمُ ۝ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ

خوب جاننے والا ہے ۳۵ پھر ان (لوگوں) کی (ان) آثار کو دیکھنے کے بعد (یہ) رائے ہوگئی کہ (بدنامی کو دور

لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ؑ وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ

ع ۱۴

کرنے کے لئے) وہ اسے (کم سے کم) کچھ وقت کے لئے ضرور قید کردیں ۳۶ اور قید خانہ میں اس کے ساتھ

دیکھنے والی عورتیں کہتی ہیں کہ اس سے بدی کا امکان بھی نہ تھا مگر ہمارے مفسرین ہزاروں سال بعد گھر بیٹھے فیصلہ کر دیتے ہیں کہ جھک تو وہ گیا تھا لیکن پھر ہوشیار ہوگیا +

یوسفؑ کے خلاف آنحضرتؐ کا ہمیشہ خیر ہی کا طلبگار رہنا

اس وقت تک یوسف علیہ السلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی مشابہتیں بیان ہوئی ہیں اس آیت کے مضمون سے دونوں کی طبیعت کا اختلاف بھی معلوم ہوتا ہے اور اس میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ہی ظاہر ہوتی ہے یوسفؑ ایک مصیبت سے بچنے کے لئے دوسری مصیبت مانگتے ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق یہ تھا کہ خدا تعالےٰ سے ہمیشہ خیر مانگتے کیونکہ وہ خیر کے ذریعہ سے بھی مصائب کو دُور کر سکتا ہے +

استجاب

۳۵ حل لغات۔ اِسْتَجَابَ اللّٰهُ فُلَانًا وله ومنه: قَبِلَ دُعَاءَهٗ وَقَضٰى حَاجَتَهٗ اللہ تعالیٰ نے اس کی دُعا قبول کرکے اس کی حاجت پوری کردی (اقرب)

تفسیر۔ یعنی انہیں اس کی طرف سے مایوس کر دیا۔ اور یوسف کے دل کو پہلے سے بھی زیادہ تقویت بخشی +

بدا

۳۶ حل لغات بَدَا لَهٗ فِي الْاَمْرِ نَشَأَ لَهٗ فِيْهِ رَأْيٌ۔ اسے ایک نئی بات سوجھی (اقرب) پس اس محاورہ کے مطابق بدا لھم میں بدا کا فاعل ضمیر مستتر ہے۔ جس کا مرجع رَأْيٌ مقدر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ جملہ لَيَسْجُنُنَّهٗ مفرد کی تاویل میں ہوکر اس کا فاعل ہو۔ اور اس کی نظیریں بھی بہت پائی جاتی ہیں +

یہ قید دُعا کے نتیجہ میں نہیں تھی

الآیات سے مراد

تفسیر۔ یہ قید یوسف علیہ السلام کی دعا کے نتیجہ میں نہ تھی کیونکہ قید کی دُعا تو درحقیقت اصل علاج نہ تھا خدا تعالےٰ نے پہلی آیت میں بتلایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے یوسف کی دُعا قبول کرکے اس فریب کو ہٹا دیا جو اس کے خلاف کیا جاتا تھا اس کے بعد پھر فرماتا ہے کہ پھر ان لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ اسے قید کر دیں پس جب اللہ تعالیٰ نے اس قید کو دعا کی قبولیت میں شامل نہیں کیا تو ہم کیوں کریں۔ یوسف علیہ السلام نے بیشک قید کی دُعا کی تھی لیکن اللہ تعالےٰ نے اس مصیبت کو اور اچھے ذریعہ سے ٹلا دیا اور اس کی وجہ سے قید نہیں کرایا ہاں بعد میں قید کا معاملہ بعض اور اسباب سے پیدا ہوا جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ جب انہوں نے بعض نشانات دیکھے تو قید کرنے کا فیصلہ کر لیا +

میرے خیال میں نشانات سے مُراد عزیز کی بیوی کی پھیلتی ہوئی بدنامی ہوگی آخر انہوں نے مناسب سمجھا کہ یوسف کو قید کر دیں تاکہ عزیز کی

فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ

دو اور جوان (بھی) داخل ہوئے جن میں سے ایک نے (تو اس سے یہ) کہا (کہ) میں (خواب میں) اپنے آپ کو (اس حالت میں) دیکھتا

وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا

ہوں کہ میں انگور نچوڑ رہا ہوں۔ اور دوسرے نے کہا (کہ) میں (خواب میں) اپنے آپ کو (اس حالت میں) دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر

تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ

روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں جن میں سے پرندے کھا رہے ہیں (اور ان دونوں نے اس سے کہا کہ) آپ ہمیں اس کی حقیقت سے آگاہ کریں ہم

مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ

آپ کو یقیناً نیکوکاروں میں سے سمجھتے ہیں ۵۳ اس نے کہا (کہ) جو کھانا تمہیں (اب) دیا جانے والا ہے وہ اس

بیوی کی کھوئی ہوئی عزت قائم ہو جائے اور لوگ اس شبہ میں پڑ جائیں کہ شاید یوسف کا ہی قصور ہوگا +

بائبل کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ کو ابتدائی جھگڑے کے وقت ہی عزیز نے قید کر دیا تھا لیکن قرآن کریم اس کے خلاف قید کو بعد کے حالات کا نتیجہ قرار دیتا ہے مگر جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں بائبل کے ہی حوالہ جات سے بائبل کے بیان کی تردید ہو جاتی ہے۔ مثلاً پیدائش باب ۳۹ میں لکھا ہے کہ وہ دو آدمی جن پر بادشاہ کا عتاب نازل ہوا تھا اور انکو قید کی سزا دی گئی تھی ان کو اس فوطی فار نے جو جلوداروں کا سردار تھا یوسف کے سپرد کر دیا۔ جس سے صاف معلوم ہوا کہ وہ یوسف علیہ السلام کو سچا سمجھتا تھا اور انہیں قید میں اس واقعہ کی وجہ سے نہیں بلکہ بعد کے دوسرے حالات کی وجہ سے مصلحتاً ڈالا تھا +

۵۳ حل لغات۔ عَصَرَ الْعِنَبَ وَنَحْوَهٗ يَعْصِرُ عَصْرًا: اِسْتَخْرَجَ مَاءَهٗ اسے نچوڑ کر اس کا رس نکالا۔ الثَّوْبَ اسْتَخْرَجَ مَاءَهٗ بِلَيِّهٖ نچوڑ کر پانی نکالا۔ الدُّمَّلَ اِسْتَخْرَجَ مِدَّتَهٗ۔ دبا کر مادہ فاسد نکالا۔ الرَّكْضُ الْفَرَسَ: عَرَّقَهٗ پسینہ پسینہ کر دیا۔ الشَّيْءَ عَنْهُ: مَنَعَهٗ اس سے روکا۔ فلانًا: اَعْطَاهُ الْعَطِيَّةَ عطیہ دیا۔ حَبَسَهٗ بند کر رکھا فلان عَاصِرٌ مُمْسِكٌ اَوْ قَلِيْلُ الْخَيْرِ بخیل۔ کنجوس۔ العُصْرُ العطیۃ عطیہ (اقرب) پس اَعْصِرُ خَمْرًا کے معنی ہوئے میں انگور نچوڑ کر شراب بناتا ہوں۔ شراب کا سٹور رکھتا ہوں شراب دیتا ہوں +

تفسیر۔ مَعَهٗ کے لفظ کے یہ معنے لینے ضروری نہیں کہ جس روز حضرت یوسفؑ قید خانہ میں داخل ہوئے تھے اسی دن اور اسی وقت وہ بھی داخل ہوئے ہوں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید خانہ میں رکھے گئے ہوں اور یہ بات بائبل سے ثابت ہے کہ "قید خانہ کے داروغہ نے سب قیدیوں کو جو قید میں تھے یوسف کے ہاتھ میں سونپا" (دیکھو پیدائش $\frac{39}{22}$) اور پھر لکھا ہے کہ "اور اس نے ان (دونوں سرداروں) کو نگہبانی کے لئے جلوداروں کے سردار کے گھر میں اسی جگہ جہاں یوسف بند تھا قید خانہ میں ڈالا" (پیدائش باب ۴۰ آیت ۳) پیدائش باب ۴۰ میں یہ خواب ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے مگر مضمون ایک ہی ہے۔ ان کے خواب کی تعبیر دریافت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا قید خانہ میں ایسا

[حاشیہ: ۱ یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک ہی دن قید کیا گیا تھا۔]

[حاشیہ: دَخَلَ مَعَهٗ کا مطلب۔]

[حاشیہ: عَصَرَ]

[حاشیہ: ۲ حضرت یوسف قید خانہ والوں کی نظر میں۔]

ــــــــــــ

ۓ خُبْزٌ اسم جنس ہے اور گو اس کی طرف ضمیر مِنْهُ میں مفرد آئی ہے۔ مگر اردو میں اس کے معنے جمع کرنے ضروری ہیں۔ ورنہ ترجمہ درست نہیں رہ سکتا اس لئے مِنْهُ کا ترجمہ جن میں کیا گیا ہے۔

تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ

حالت میں ہی تمہارے پاس آئے گا کہ تمہارے پاس اس کے پہنچنے سے پہلے میں تمہیں اس (خواب) کی حقیقت بتا چکا ہوں گا

يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ

یہ (تعبیر رؤیا کی اہلیت مجھ میں) اس وجہ سے (پائی جاتی) ہے کہ میرے رب نے مجھے علم بخشا ہے۔ میں نے ان لوگوں کے

مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ

دین کو جو اللہ (تعالیٰ) پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ آخرت کے بھی

هُمْ كٰفِرُوْنَ ○ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ

منکر ہیں چھوڑ دیا ہوا ہے ۳۸ٗ اور میں نے اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیم

رویہ تھا کہ سب لوگ ان کی بزرگی کے قائل ہو گئے تھے ورنہ معمولی نیکی کی وجہ سے خوابوں کی تعبیر لوگ دریافت نہیں کرتے پھر یہ قیدی تو صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ ہم تجھے اعلیٰ درجہ کے نیکوں میں سمجھتے ہیں ؏

۳۸ٗ حل لغات۔ نَبَّاَ — نَبَّاَهُ الْخَبَرَ وَبِالْخَبَرِ خَبَّرَهٗ۔ خبر دی۔ آگاہ کیا۔ وَيُقَالُ نَبَّأْتُ زَيْدًا عَمْرًا مُنْطَلِقًا۔ بتایا۔ علم دیا۔ النَّبَأُ الْخَبَرُ۔ خبر۔ وقال فی الکلیات النَّبَأُ وَالْاَنْبَاءُ لَمْ يَرِدَا فِى الْقُرْاٰنِ اِلَّا لِمَا لَهٗ وَقْعٌ وَشَاْنٌ عَظِيْمٌ۔ اور کلیات ابو البقاء میں ہے کہ نباء کا لفظ یا انباء کا لفظ جہاں بھی قرآن کریم میں آیا ہے کسی ذی عظمت اور ذی شان چیز یا بات کی خبر کے متعلق ہی آیا ہے (اقرب) ذٰلکما بھی ذٰلک کی طرح بعید کے لئے اسم اشارہ ہے۔ فرق ان میں صرف یہ ہے کہ ذٰلکما سے صرف اسی موقع پر اشارہ کیا جاتا ہے جب مخاطب دو شخص ہوں۔ اور ذٰلک کا استعمال وسیع ہے جو واحد شخص کو مخاطب کرتے وقت بھی بولا جاتا ہے اور کثیر کو مخاطب کرتے ہوئے بھی۔ یہ لفظ دراصل تین لفظوں سے مرکب ہے یعنی ذا۔ لام اور کاف سے۔ ذا اسم اشارہ ہے۔ لام جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہو اس کے مقام یا درجہ کے بُعد پر دلالت کرتا ہے اور کاف مخاطب کی علامت ہے۔ (اقرب)

حاشیہ: نَبَّاَ — حضرت یوسفؑ کا ان قیدیوں کو تسلی دینا کہ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔

حاشیہ: ذٰلکما — آنحضرتؐ نے بھی کفارِ مکہ کو کھانے کے موقع پر تبلیغ کی

تفسیر — حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے میں عجیب حکمت سے کام لیا ہے چونکہ خطرہ تھا کہ تبلیغ کرنے پر وہ گھبرائیں گے اس لئے پہلے انہیں تسلی دے دی کہ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا بلکہ کھانا آنے سے پہلے ہی تم کو فارغ کر دوں گا یہ اس لئے کیا کہ وہ گھبرا نہ جائیں اور غور سے سُنتے رہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی قیدیوں کو کھانے سے پہلے کچھ رخصت ملا کرتی تھی تا وہ آپس میں بات چیت کریں جیسا کہ آج کل بھی دستور ہے ؏

بارھویں مشابہت — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معاملہ میں بھی حضرت یوسف علیہ السلام سے مشابہت ہے۔ معلوم ہوتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کو تبلیغ کا موقع نہیں ملتا تھا انہوں نے ان کے سوال کو غنیمت جانا اور سمجھ لیا کہ ان کی ضرورت کے پورا ہونے سے پہلے تبلیغ کروں گا تو یہ سُننے پر مجبور

وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ

اور اسحاق اور یعقوب کی پیروی (اختیار) کی ہے۔ ہمیں کسی چیز کو بھی اللہ (تعالےٰ) کا شریک

بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَ

ٹھہرانے کا حق نہیں ہے۔ یہ (توحید کی تعلیم کا ملنا) ہم پر اور (دوسرے) لوگوں پر اللہ (تعالیٰ) کا

عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

(اس کے خاص فضلوں میں سے) ایک فضل ہے لیکن اکثر لوگ (اس کے احسانوں کا) شکر نہیں کرتے ۳۹؎

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ

اے (میرے) قید خانہ کے دونوں ساتھیو۔ کیا (ایک دوسرے سے) اختلاف رکھنے والے خدا بہتر ہیں

اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ

یا اللہ (تعالیٰ) جو یکتا (اور) کامل غلبہ رکھنے والا ہے ۴۰؎ تم اسے چھوڑ کر سوائے چند (فرضی)

ہوں گے ایسا ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا آپ ابتداء دعویٰ میں اعیانِ مکہ کو تبلیغ کرنا چاہتے تو وہ لوگ کترا جاتے اور تبلیغ نہ سنتے آخر آپؐ نے ان لوگوں کی دعوت کی اور کھانا کھلا کر تبلیغ کرنی چاہی مگر وہ لوگ اُٹھ کر چلے گئے اس پر آپؐ نے یہ تدبیر کی کہ پھر دعوت کی اور کھانا آنے سے پہلے ان کو اپنے دعویٰ سے آگاہ کر دیا وہ لوگ کھانے کے انتظار میں بیٹھنے پر مجبور تھے اس لئے آپ کو اپنی بات سنانے کا موقع مل گیا +

اس آیت سے انبیاء کے وعظ کا طریق بھی معلوم ہوتا ہے پس ان کی اتباع میں وعظ و نصیحت کرتے وقت ہمیشہ یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ بات کہی بھی جائے اور دوسرے پر گراں بھی نہ گذرے +

"یہ وہ علم ہے جو مجھے خدا تعالےٰ نے سکھایا ہے" کہکر حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ ثبوت دیا ہے کہ جس مذہب پر میں کاربند ہوں وہی سچا ہے کیونکہ اس کے تازہ پھل انسان کو ملتے رہتے ہیں اور خدا تعالےٰ سے تعلق پیدا ہوتا ہے +

۳۹؎ تفسیر یعنی جس مذہب پر میں ہوں اس کے ذریعہ سے ہمیشہ سے لوگ خدا تعالےٰ سے تعلق پیدا کرتے چلے آئے ہیں اور یہ اللہ تعالےٰ کا فضل ہے کہ اس نے ایسا راستہ بندہ کے لئے کھلا رکھا ہے لیکن افسوس کہ اللہ تعالیٰ کے احسان کی لوگ قدر نہیں کرتے۔

تعلق باللہ کے دروازہ کا کھلا ہونا بہت بڑا فضل الٰہی ہے۔

علینا و علی الناس کہہ کر بتایا ہے کہ نبوت کا انعام صرف اسی شخص کے لئے نہیں ہوتا جسے نبوت ملے بلکہ درحقیقت وہ سب دنیا کے لئے ہوتا ہے سب ہی علی قدر مراتب اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں حتیٰ کہ اگر غور کیا جائے تو کافر بھی اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں نبی کے بعد کئی فضول عقائد جن کو وہ رد کرتا ہے لوگ ترک کر دیتے ہیں گو نبی کی صداقت کا انکار ہی کرتے رہیں +

نبی کی بعثت کا انعام تمام قوم کے لئے ہوتا ہے۔

وعظ و نصیحت کو مخاطب کے علاوہ موجب ترغیب دینا چاہیے۔

مذہب وہی سچا ہے جو ہر وقت تازہ پھل دے۔

۴۰؎ حل لغات قَهَّار کا لفظ قَهَرَ میں سے قہر

إِلَّآ أَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ أَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ

ناموں کے جو (خود) تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے بنا رکھے ہیں (اور) جن کی بابت

أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ۚ

اللہ (تعالیٰ) نے (تمہاری تائید میں) کوئی بھی (تو حجت نہیں اُتاری۔ (کسی کی) عبادت نہیں کرتے (یاد رکھو) فیصلہ کرنا اللہ (تعالیٰ)

أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوْٓا إِلَّآ إِيَّاهُ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ

کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں ہے (اور) اس نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی درست مذہب ہے

وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ يٰصَاحِبَيِ

لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ۴۲ اے (میرے) قید خانہ کے دونوں ساتھیو

اسم فاعل کا صیغہ مبالغہ ہے۔ قَهَرَهٗ قَهْرًا غَلَبَهٗ فَهُوَ قَاهِرٌ۔ اس پر غالب ہوا۔ وتقول اَخَذْتُهُمْ قَهْرًا اے مِنْ غَيْرِ رِضَاهُمْ۔ اور اخذتُہم قہرًا کے معنے ہیں بغیر ان کی مرضی کے زبردستی ان کو پکڑ لیا۔ القَهَّارُ فَعَّالٌ لِلْمُبَالَغَةِ۔ وَاسْمٌ مِنَ الْاَسْمَاءِ الْحُسْنٰى۔ قہار اسم فاعل سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور خدا تعالےٰ کے ناموں میں سے بھی ہے ؛

جو امور منجانب اللہ ہوں ان کے ساتھ دلیل اور غلبہ کا ہونا ضروری ہے۔

تفسیر۔ فرمایا کہ دُنیا میں غلبہ جتھے کے ساتھ ہُوا کرتا ہے مگر میرے رب کا معاملہ بالکل نرالا ہے وہ اکیلا بھی ہے اور ساتھ ہی غالب۔ بلکہ بڑا غالب بھی ؛

قید کی حالت میں یوسف کا اللہ تعالیٰ کی صفات حسنہ کے ذکر پر زور دینا۔

اس قید کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی صفات حسنہ پر اس قسم کا زور دینا حضرت یوسف علیہ السلام کے کمالات باطنی کا مظہر ہے اور ایمان کو تازہ کرتا ہے ؛

۴۱ حل لغات۔ اَلْقَيِّمُ۔ دِيْنًا قِيَمًا اے ثَابِتًا مُقَوِّمًا لِاُمُوْرِ مَعَاشِهِمْ وَمَعَادِهِمْ۔ دین قیّم ثابت اور قائم رہنے والے اور دُنیا اور آخرت کے امور کو درست کرنے والے دین کو کہتے ہیں (مفردات) اَلْقَيِّمُ عَلَى الْاَمْرِ مُتَوَلِّيْهِ۔ جو کسی کام کا متولی ہو۔ اَلْقَيِّمَةُ

دین وہی سچا ہے جو دنیا و آخرت کی ضرورتوں کو پورا کرے

الدِّيَانَةُ الْمُسْتَقِيْمَةُ۔ صحیح راست و درست مذہب (اقرب)

تفسیر۔ یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جن چیزوں کا وجود صرف اس امر پر مبنی ہو کہ تم نے ایک نام تجویز کر لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی دلیل اور غلبہ ان کے ساتھ نہیں ہے تم ان کی عبادت کر کے کیا لوگے اور ایسی چیزوں کی عبادت کیا نفع پہنچا سکتی ہے ؛

اس آیت میں اس اصل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو امور خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوں ان کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی دلیل اور غلبہ بھی ہونا چاہیئے مختلف مذاہب یونہی آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور کوئی فیصلہ کی اس یقینی راہ کی طرف توجہ نہیں کرتا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مدعی کو کیا دلیل ملی ہے عقل کب اس امر کو تسلیم کر سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والا مذہب اپنے ثبوت کے لئے انسانی اور خالص عقلی دلائل کا محتاج ہو۔ جو چیز آسمان سے آئے اس کے لئے آسمانی دلیل کی بھی ضرورت ہے ؛

دین قیّم کہہ کر بتایا ہے کہ دین وہی سچا ہو سکتا

السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا

(اب اپنی اپنی خواب کی تعبیر سنو) تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا۔ اور

الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ

دوسرے کو سولی دیکر مارا جائے گا۔ پھر پرندے اس کے سر پر سے (گوشت وغیرہ) کھائیں گے

قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ؕ وَقَالَ

(لو) جس امر کے متعلق تم پوچھ رہے ہو۔ اس کا فیصلہ کر دیا گیا ہے ۵۴۲ اور ان میں

ہے جو دُنیا اور آخرت کی ضرورتوں کو پورا کرے اور ایسی تعلیم دے جس سے انسان کی رُوحانی اور جسمانی دونوں حالتیں درست ہوں اور اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ایسا دین وہی ہو سکتا ہے جو شرک سے لوگوں کو بچائے۔ یہ ایک زبردست صداقت ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شرک انسانی ترقی کے راستہ میں روک ہے بھلا جو قوم عناصر کو خدا سمجھے گی وہ ان کو چیر پھاڑ کر اپنی خدمت میں کب لگائے گی۔ قوانین قدرت سے تو وہی قوم فائدہ اُٹھائے گی جو سب کائنات کو خدا کی مخلوق اور اپنی خدمت کے۔ لئے پیدا کی ہوئی چیز سمجھے گی +

۵۴۲ حل لغات۔ صَلَبَہٗ۔ اى القاتل كضربہٗ صَلبًا جَعَلَہٗ مَصْلُوْبًا۔ اسے مصلوب کر دیا۔ وفی لسانِ العربِ والصَّلْبُ هذہ الِقتلۃُ الْمَعْروفۃُ اور لسان العرب میں ہے کہ صلب کے معنے صلیب کی موت سے مارنے اور قتل کر دینے کے ہیں۔ واصْلُہٗ من الصلیبِ وھو الوَدَكُ۔ اور اسی کا ماخذ صلیب ہے جس کے معنے چربی کے اور ہڈیوں کے گودے کے ہیں صلب اللحمَ شَوَاہ فَاَسَالَ الْوَدَكَ منہ گوشت کو سیخوں وغیرہ پر بھونا۔ جسکی وجہ سے اس کی چربی نیچے گرتی رہی۔ صَلَبَ العظامَ جَمَعَهَا وطَبَخَهَا واستخرجَ وَدَكَهَا لِيُؤْتَدَمَ بِہٖ۔ ہڈیوں کو گوشت سے الگ جمع کر کے اور انہیں پکا کر ان کا گودا سالن کے طور پر کھانے کے لئے نکالا۔ والصلیبُ اَلْوَدَكُ۔ اور صلیب کے معنے چربی اور گودے کے ہیں۔ وَفِي الصِّحاحِ وَدَكُ العِظامِ اور صحاح میں ہے کہ صلیب ہڈیوں کے گودے کو کہتے ہیں وبہٖ سُمِّيَ الْمَصْلُوْبُ اور اسی وجہ سے مصلوب کو مصلوب کہتے ہیں۔ لما یَسِیْلُ من وَدَکِہٖ۔ کیونکہ اس کی چربی اور گودا نکل کر بہتا ہے والصُّلْبُ هذہ القتلۃُ المعروفۃُ اور اسی طریق پر قتل کرنے اور ہڈیوں کا گودا نکالنے کو صلب کہتے ہیں۔ مُشْتَقٌّ مِنْ ذٰلِكَ۔ یہ لفظ اسی لفظ صلیب (چربی اور ہڈیوں کا گودا) سے ماخوذ ہے لِاَنَّ ودکہٗ وصدیدہٗ یسیلُ۔ کیونکہ مصلوب کی چربی اسکی ہڈیوں کا گودا۔ اور اس کی پیپ نکل کر بہتی ہے (تاج العروس)

دین وہی سچا ہے جو شرک سے بچائے

صلب

تفسیر۔ اس جگہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السّلام تو تعبیر کرنے والے تھے۔ پھر انہوں نے یہ کیوں کہا کہ فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ خواب کی تعبیر کا بھی اس کے پورا ہونے سے بہت کچھ تعلق ہوتا ہے جب تک خواب سنائی نہیں جاتی اسے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن جب سُنائی جاتی ہے اور اس کی تعبیر ہو جاتی ہے۔ تو پھر اللہ تعالےٰ کو اسکی غیرت ہو جاتی ہے۔ اور وہ حتی الوسع ضرور پوری کی جاتی ہے اسی وجہ سے صوفیاء نے لکھا ہے بلکہ احادیث

خواب کے پورا ہونے میں اسکی تعبیر کا بھی بہت دخل ہوتا ہے

لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ

سے اس سے جس کے متعلق اس نے یہ سمجھا تھا کہ وہ مخلصی پا جانے والا ہے اس نے کہا (کہ) اپنے آقا کے پاس میرا (بھی)

رَبِّكَ ؗ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي

ذکر کرنا۔ پھر شیطان نے اس (آزاد شدہ قیدی) کو اس کے آقا سے (یہ) ذکر کرنا فراموش کرا دیا۔ اور (اس کی اس

ع ۵ / ۱۵ السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ۝ وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى

غفلت کی وجہ سے) وہ (یعنی یوسفؑ) کئی سال قید خانہ میں (پڑا) رہا۔ ۴۳ اور (کچھ عرصہ کے بعد) بادشاہ نے (اپنے درباریوں

سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ

سے) کہا (کہ) میں (خواب میں) سات موٹی گائیں دیکھتا ہوں جنہیں سات دُبلی (گائیں) کھا رہی ہیں اور سات

سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ

(تر و تازہ اور) سبز بالیں (دیکھتا ہوں) اور چند اور (بالیں بھی جو) خشک (ہیں) اے سرکردہ لوگو!

میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ بُری خواب سُنانی نہیں چاہیئے پس جب ان لوگوں نے خوابیں حضرت یوسف علیہ السلام کو سُنا دیں اور انہوں نے تعبیر کر دی تو ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ اب یہ خوابیں پوری ہو کر رہیں گی +

۴۳ حل لغات۔ اَلْبِضْعُ۔ مَا بَیْنَ الثَّلَاثِ اِلَی التِّسْعِ۔ تین سے لے کر نو تک کو بضع کہتے ہیں (اقرب)

بِضْع

تفسیر۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسے جس کی نسبت انہیں یقین تھا کہ بچ جانے گا یہ کہا کہ بادشاہ کے پاس میرا ذکر بھی کرنا کہ فلاں شخص کو قید میں بلا وجہ ڈالا ہوا ہے۔ لیکن اس شخص کو اپنے بُرے مشاغل یعنی شراب پلانے کے کام میں یہ خیال نہ رہا کہ ذکر کرتا +

ذِکْرَ رَبِّہٖ کے معنے۔ (اپنے آقا کے پاس ذکر کرنا۔)

ظن کا لفظ یقیناً کرنے کی وجہ

بعض مفسرین نے اس جگہ یہ معنے کئے ہیں کہ شیطان نے یوسف علیہ السلام کو اپنے رب کا ذکر بھلا دیا یعنی انشاء اللہ کہنا یاد نہ رہا حالانکہ یہ موقع انشاء اللہ کہنے کا تھا ہی نہیں۔ اس آیت میں جب رب کا لفظ بادشاہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ یوسف علیہ السلام کو خدا تعالیٰ سے غافل ثابت کیا جاتا۔ اس کے سیدھے معنے یہ ہیں کہ اس شخص کو اپنے بادشاہ سے یوسف کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا یعنی اپنے شیطانی کاموں میں پڑ کر یوسف علیہ السلام کی صحبت کا نیک اثر جاتا رہا اور یوسفؑ کا خیال اسے نہ آیا اور بادشاہ کے پاس اس کا ذکر نہ کر سکا۔ ایسے صاف معنوں کی موجودگی میں کہ جن سے یوسف علیہ السلام کی برأت پر بھی کوئی الزام نہیں لگتا ہمیں دوسرے معنے کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے +

ظن کا لفظ اس لئے کہا کہ غیر نبی کی خواب خواہ کتنی بھی یقینی کیوں نہ ہو شبہ سے خالی نہیں ہو سکتی اور اس کو ظن سے ہی بیان کیا جا سکتا ہے۔ صرف نبی ہی کی یہ شان ہے کہ اس کے الہام پر قسم کھائی جا سکتی ہے کہ وہ سچا ہے اور کسی کے الہام یا خواب کو یہ شرف حاصل نہیں۔ اور یہ بھی نبی اور غیر نبی کے الہام میں ایک فرق ہے +

اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ○

اگر تم رؤیا کی تعبیر (کیا) کرتے ہو تو مجھے میری (اس) رؤیا کے متعلق (صحیح) حکم بتاؤ ۵۴۴

قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ

انہوں نے کہا (کہ یہ تو) پراگندہ خوابیں ہیں اور ہم (لوگ) ایسی پراگندہ

الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ○ وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا

خوابوں کی حقیقت نہیں جانتے ۵۴۵ اور ان (دو قیدیوں) میں سے اس نے جس نے خلاصی پائی تھی

۵۴۴ حل لغات۔ عَجِفَتِ الشَّاةُ عَجَفًا ذَهَبَ سِمَنُهَا وَضَعُفَتْ۔ دُبلی ہو گئی۔ والبلاد لم تمطر فلاں علاقہ میں بارش نہ ہوئی اور اس میں خشک سالی رہی ومنہ نَزَلوا فی بِلادٍ عِجَافٍ اے غیرِ مَمطُورَةٍ جب شہروں کے لئے لفظ عجاف آئے تو اس کے معنے ہوتے ہیں جن پر بارش نہیں برسی۔ اسی طرح جب دانوں کے لئے یہ لفظ آئے تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ دانے چھوٹے رہ گئے۔ العَجَفُ الھُزَالُ۔ دُبلا پن۔ الاَعْجَفُ المَهْزُولُ و ھی عَجْفَاءُ جمعہ عِجَافٌ شاذٌ۔ اس سے صفت کا صیغہ مذکر اَعْجَفُ اور مؤنث عَجْفَاءُ آتا ہے۔ اور انکی جمع دوسرے اس قسم کے الفاظ کے خلاف بجائے عُجْفٌ کے عِجَافٌ آتی ہے (اقرب)

عَبَرَ السَّبِيلَ عُبُورًا شَقَّهَا۔ اسے مَرَّ كَانَّه شقها و قَطَعَهَا۔ وہ راستہ پر ایسی سُرعت سے گذرا اور سیدھا چلا کہ گویا اس نے اسے چیر دیا اور اسے کاٹتا ہُوا اس میں گذرا۔ بِفُلانٍ الماءَ جَازَ۔ دریا کے پار پہنچا دیا۔ الکتاب تَدَبَّرَه فی نَفْسِه ولم يَرْفع صوتَه بقراءته۔ دل میں الفاظ پر غور کرتا گیا۔ الرُّؤْيَا عَبْرًا وعِبَارَةً فسَّرَهَا وَاَخْبَرَ بِاٰخِرِ مَا يَؤُولُ اِلَيْهِ اَمْرُهَا۔ خواب کا نتیجہ بتایا اسکی تعبیر بتائی (اقرب)

اَفْتَاه العَالِمُ فی مَسْئَلةٍ۔ اَبَانَ لَه الحُكْمَ فیها و اَخْرَجَ لَه فیها فَتْوٰی۔ عالم نے پیش آمدہ مسئلہ کے متعلق فتوٰی دیا اور اس کا حکم بتایا (اقرب)

عجف

تفسیر۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کو اپنی رؤیا پر اس قدر یقین تھا کہ وہ صرف تعبیر ہی نہیں پُوچھتا۔ بلکہ یہ پُوچھتا ہے کہ بتاؤ تعبیر معلوم ہو چکنے کے بعد کرنا کیا چاہیئے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے رؤیا ایسی وضاحت اور ہیبت کے ساتھ دکھائی تھی کہ اس کا نقشہ اس کے دل پر اثر کر گیا تھا پس وہ مجبور تھا کہ اسے سچا سمجھے اور اس کے نتائج سے بچنے کی کوشش کرے۔ اگر اس شان سے رؤیا نہ ہوتی اور اس کے دل پر گہرا اثر نہ ہوتا تو وہ دربار میں اس کا ذکر نہ کرتا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی رہائی کی صورت نہ پیدا ہوتی +

فرعون پہ کل رؤیا کا گہرا اثر

۵۴۵ حل لغات۔ الضِّغْثُ مِنَ الْخَبَرِ مَا كَانَ مُخْتَلِطًا لا حَقِيقَةَ لَهُ ضغث اس خبر یا بات کو کہتے ہیں جو پراگندہ ہو اور اسکی کوئی حقیقت نہ ہو۔ اَضْغَاثُ احلامٍ احلامٌ ملتبسةٌ لا يصحُّ تاويلها لِاختلاطها اضغاث احلام ایسی پراگندہ خوابوں کو کہتے ہیں جن کی سچ اور جھوٹ کی ملاوٹ کی وجہ سے تعبیر نہیں کی جاتی۔ (اقرب)

عبر
ضغث

اَحلام۔ حُلُمٌ کی یا حُلْمٌ کی جمع ہے۔ ما يَرَاه النَّائِمُ فی نومِه۔ لکنّہ قد غَلَبَ علٰى ما يراه من الشّرِ

حلم
فتی

وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ○

اور (جس نے) ایک عرصہ کے بعد (یوسفؑ کے ساتھ جو اس کا معاملہ گزرا تھا اسے) یاد کیا کہا (کہ) میں تمہیں اس کی حقیقت سے آگاہ کروں گا

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ

پس تم (اس کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے) مجھے بھیجو ۴۶ (اور اس نے یوسفؑ سے جا کر کہا کہ) اے یوسف! (ہاں) اے راستباز! ہمیں ان

والقبیحِ. کما غلبت الرُّؤیا علٰی مایراہُ مِنَ الخیرِ والحَسَنِ وربّما یُستَعمَلُ کُلٌّ مکان الآخرِ حلم اس نظارہ کو کہتے ہیں جو انسان نیند کی حالت میں دیکھے لیکن یہ لفظ عام طور پر بُرے اور قبیح نظارہ کے لئے بولا جاتا ہے جس طرح رؤیا کا لفظ عام طور پر اچھے اور نیک نظارہ کو کہتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ پر بھی بول لئے جاتے ہیں (اقرب) مجمع البحار میں لکھا ہے۔ الرُّؤیا مِنَ اللّٰہِ والحُلُمُ مِنَ الشَّیطَانِ فَھُمَا مَایَرَاہُ النَّائمُ لکن غلب الرُّؤیا علی الخیرِ والحلمُ علی الشرِّ والقبیحِ۔ یعنی رویا اور حلم دونوں لفظوں کے اصل معنے حالت خواب میں دیکھنے کے ہیں۔ لیکن عام محاورہ اور استعمال میں حلم بُری خواب کو کہتے ہیں۔ اور رؤیا اچھی کو جیسا کہ حدیث میں آیا ہے الرؤیا من اللّٰہِ والحلمُ مِنَ الشَّیطٰنِ۔ یعنی رؤیا اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور حلم شیطان کی طرف سے (اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والی خواب آتی ہی نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو اکثر ڈرانے والی خوابیں آتی رہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہونگی بلکہ شیطان کی طرف سے ہونگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا رحم اس کے غضب پر غالب ہے۔ اور جس کو اکثر اچھی خوابیں آئیں وہ سمجھے کہ وہ خوابیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں کیونکہ ان میں رحمت کا پہلو غالب ہے +

وہی خواب قابل تعبیر ہوتی ہے جس میں جھوٹ کی ملونی نہ ہو

اِدَّكَرَ

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ حلم یعنی بُرے خوابوں کا موجب شیطان ہے۔ اور رؤیا یعنی اچھے خوابوں

اُمَّة

کا موجب اللہ تعالیٰ ہے یعنی عذاب کا سبب شیطانی تعلق ہوتا ہے اور فضل و برکت کا سبب رحمانی تعلق ہوتا ہے۔ گویا یہ بتایا ہے کہ اگر بُری خوابیں اور ڈراؤنے منظر دیکھو تو سمجھ لو کہ شیطان سے تعلق پیدا ہو گیا ہے اور اپنی اصلاح کرو۔ اور اگر اچھے منظر دکھلائے جائیں تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ خوش ہے اور فضل کرنا چاہتا ہے پس نیکی میں اور ترقی کرو)

تفسیر۔ قالوا اضغاثُ احلامٍ۔ انہوں نے کہا کہ یہ خوابیں بُری بھی ہیں اور مخلوط بھی۔ یعنی سچ اور جھوٹ ملا ہوا ہے۔ دماغی دخل سے پاک نہیں ہیں۔ اور پوری طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں کہی جا سکتیں اس لئے ایسی خوابوں کی تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ جب تک جھوٹ اور سچ الگ الگ نہ ہو تعبیر کے متعلق حکم نہیں لگایا جا سکتا یہ جو انہوں نے کہا ہے کہ ہم احلام کی تعبیر نہیں جانتے اس کا یہ مطلب نہیں کہ بُری خوابوں کی تعبیر ہم نہیں کر سکتے بلکہ احلام کے اوپر جو آل ہے وہ عہد ذہنی کا ہے یعنی اس سے اشارہ اضغاث احلام کی طرف ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ جس قسم کی پراگندہ خوابوں کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں ویسی خوابوں کی تعبیر ہم نہیں کر سکتے نہ یہ کہ خالی ڈراؤنی خواب کی تعبیر ہم نہیں کر سکتے +

۴۶ حل لغات۔ اِدَّكَرَ۔ ذکر سے باب افتعال کا فعل ماضی ہے اِدَّكَرَہٗ ذَكَرَہٗ۔ اس نے یاد کیا۔ اسے یاد آیا (اقرب)

الاُمّةُ الحِینُ۔ وقت عرصہ۔ (اقرب) وقولہ تعالیٰ

سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ

سات گائیوں (کو رؤیا میں دیکھنے) کے متعلق جنہیں سات دُبلی (گائیں) کھا جائیں اور (نیز) سات

خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ

سبز بالوں اور (ان کے مقابل پر) چند اور خشک (بالوں کو دیکھنے) کے متعلق حکم بتایئے تاکہ میں ان لوگوں کے

لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ

پاس جاؤں کہ ان کو (بھی تیری صداقت کا) علم ہو جائے ۵۴۷ اس نے کہا (کہ) تم سات برس مسلسل بعد وجہد سے کاشت (کا کام) کرو گے

وادَّکَرَ بَعْدَ اُمَّۃٍ لے حِینٍ کچھ عرصہ کے بعد۔ وقد قُرِئَ بعد اَمَہٍ اے بعد نسیانٍ اور ایک قراءۃ میں اَمَہٍ بھی آیا ہے جس کے معنے ہیں بھول جانے کے بعد۔ و حَقِیْقَۃُ ذٰلِکَ بَعْدَ انْقِضَاءِ اَھْلِ عَصْرٍ او اھلِ دِیْنٍ اور اس کے اصل معنے عرصہ دراز کے ہیں۔ جس میں ایک زمانہ کے لوگ یا ایک دین کے اور ایک قرن کے لوگ گذر جائیں (مفردات)

تفسیر۔ مجھے بھیجو کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص کوئی بڑے سرداروں میں سے نہ تھا اور بادشاہ کے قول کا مخاطب نہ تھا۔ جب وہ لوگ اس خواب کی تعبیر نہ کر سکے اور انہوں نے پراگندہ خواب کہکر جس میں خیالات کی طونی ہوگئی ہو اپنا پیچھا چھڑایا تو اس شخص کو اپنا اور اپنے ساتھی کا خواب یاد آیا اور خیال گذرا کہ ہمارے خواب بھی بظاہر پراگندہ معلوم دیتے تھے لیکن یوسف علیہ السلام نے انکی معقول تعبیر کی اور اسی طرح ہو گیا۔ ممکن ہے وہ ان خوابوں کی بھی تعبیر کر سکیں اور امراء دربار سے اجازت چاہی کہ اگر مجھے جانے کی آپ لوگ اجازت دیں تو میں جاکر اس خواب کی تعبیر پوچھ آتا ہوں +

اس امر پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ بادشاہ امراء دربار سے تعبیر کیوں پوچھتا ہے؟ کیونکہ پُرانے زمانہ میں کاہنوں اور مذہبی آدمیوں کا خاص زور ہوتا تھا اور انہی میں سے عام طور پر امراء دربار مقرر کئے جاتے تھے +

پُرانے زمانہ میں بادشاہوں کے دربار میں زیادہ تر کاہن اور مذہبی لوگ ہی ہوتے تھے

حضرت یوسفؑ کی اور آنحضرتؐ کی ترقی و کامیابی میں فرق۔

اس آیت کے متعلق یہ لطیف امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کامیابی تو یوسف علیہ السلام کو بھی ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی۔ مگر طریق کامیابی دونوں کے الگ الگ تھے۔ یوسف علیہ السلام کو دوسروں کے ذریعہ سے ترقی دلائی تھی۔ اس لئے ان کے لئے دوسروں کو ہی خواب دکھائی۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ بلاواسطہ ترقیات ملنی تھیں اس لئے انکی ترقی کی خبر بھی براہ راست انہی کو ملتی رہی اور اللہ تعالےٰ نے یہ نہیں پسند کیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی کی آخری منازل کسی اور شخص کی مدد سے طے ہوں +

سمجھائے جانے والے شخص کا اس خواب کی تعبیر دریافت کرنیکی طرف توجہ دلانا۔

۵۴۷ حل لغات۔ صِدِّیق۔ صدق میں سے اسم فاعل سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنے ہیں الکثیرُ الصدقِ۔ بڑا راست گو۔ الدائمُ التصدیق۔ الکاملُ فیہ۔ سچائی کو فوراً مان لینے والا۔ الذی یُصدّق قولہُ بالعمل۔ جس کے قول کی اس کے فعل سے تصدیق ہوتی ہو۔ (اقرب)

صِدِّیق

تفسیر۔ فرعون کا ساقی حضرت یوسف علیہ السلام سے

دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا

پس (اس عرصہ میں) جو (کچھ) تم کاٹو اس (سب) کو سوائے (اس) تھوڑے سے حصہ کے جو تم کھالو

قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ○ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ

اس کی بالوں میں ہی رہنے دینا ۵۴۸ پھر اس کے بعد سات سخت (تنگی کے سال) آئینگے

لَعَلِّیْ اَرْجِعُ میں لفظ لعلّ کے لانے کی وجہ

خواب بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ شاید میں ان لوگوں کی طرف لوٹوں۔ حالانکہ شاید کا کوئی موقع نہ تھا۔ یوسف علیہ السلام اسے قید خانہ میں نہیں رکھ سکتے تھے پس اس جگہ پر لَعَلَّ مخاطب کی طمع کے لئے آیا ہے یعنی اگر میں اس تعبیر کو لے کر ان کی طرف لوٹوں تو انہیں آپ کے کمالات کا علم ہو جائے گا اور آپ کی براءت ان پر ظاہر ہو جائے گی +

تعبیر دریافت کرنے والے شخص کا اپنی غفلت کے متعلق عذر کا اظہار

اس کلام سے اس شخص نے اپنی براءت بھی کی ہے وہ وعدہ کر گیا تھا کہ میں فرعون سے ذکر کرونگا لیکن اس نے وہ وعدہ پورا نہیں کیا۔ اب وہ اس فقرہ سے کہ تاکہ وہ جان لیں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ گویا اس سے پہلے ان سے بات کرنی مناسب نہ تھی کیونکہ کامیابی کی امید نہ تھی اب موقع نکلا ہے کہ انہیں آپ کی براءت کا قائل کیا جاسکے تو میں فوراً آپ کے پاس آگیا ہوں +

دَاَبَ

آنحضرتؐ نے بھی سات سال کے قحط کی خبر دی تھی

ذَرْ

تیرھویں مشابہت

اس واقعہ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یوسف علیہ السلام کے ساتھ مشابہت ہے۔ جس طرح یوسفؑ کے زمانہ میں سات سال کے قحط کی خبر دی گئی تھی۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالےٰ نے سات سال کے قحط کی خبر دی تھی۔ جب مکہ والوں نے آپؐ کو بار بار عذاب لانے کے لئے کہا اور آپؐ پر طرح طرح کے اتہام لگائے تو جیسا کہ ابن مسعود سے صحیحین میں روایت ہے۔ دعا علیھم بسنین کسنی یوسف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالفین کے لئے ویسے ہی سالوں کی دُعا کی جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں گزرے تھے یعنی ویسے ہی شدید قحط کی آپؐ نے دُعا کی چنانچہ حجاز میں سخت قحط پڑا اور سات سال تک رہا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ ان ایام میں مُردار وغیرہ کھانے لگے اور سختیں اس قدر بڑھ گئیں کہ آنکھوں کے آگے دُھوئیں نظر آنے لگے آخر سات سال کی تکلیف کے بعد لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی کہ آپؐ مُضَر یعنی قبائل حجاز کے لئے دُعا کریں کہ وہ بالکل تباہ ہو گئے ہیں۔ آپؐ نے دُعا کی اور آپ کی دُعا سے اللہ تعالےٰ نے بارش کی اور قحط دُور ہوا +

۵۴۸ حل لغات

دَاَبَ فِیْ عَمَلِہٖ جَدَّ وَتَعِبَ وَاسْتَمَرَّ عَلَیْہِ۔ انتہائی حد تک محنت اور کوشش کی اور بلاوقفہ اس پر قائم رہا (اقرب) پس دَاَبًا کے معنی ہوئے متواتر محنت اور مشقت کے ساتھ تم اس کام میں مصروف رہو گے +

ذَرُوْا فعل امر ہے جس کے معنے ہیں چھوڑو۔ اس مادہ میں سے صرف فعل امر اور فعل مضارع استعمال ہوتا ہے۔ فعل ماضی۔ مصدر۔ اور اسمائے مشتقہ جیسے اسم فاعل وغیرہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ اقرب الموارد میں ہے۔ ذَرْہُ اے دَعْہُ اسے چھوڑ دے۔ وَاَمَاتَتِ العربُ ماضیہ ومصدرہ واسم الفاعل منہ اور عرب لوگ اسکی ماضی اور مصدر اور اسم فاعل کو استعمال نہیں کرتے بلکہ جب ان مادوں کے استعمال کی ضرورت ہو تو ترک کا لفظ استعمال کر لیتے ہیں (اقرب)

سَبْعٌ شِدَادٌ يَّأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا

سوائے اس قلیل مقدار کے جسے تم پس انداز کر لو جو اس (تمام غلہ) کو جو تم نے ان کے لئے پہلے سے

قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ○ ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْ بَعْدِ

جمع کر چھوڑا ہوگا کھا جائیں گے ۵۴؎ پھر اس کے بعد ایک (ایسا)

ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ○ ع ۶/۱۶

سال آئے گا جس میں لوگوں کی تنگی دُور کی جائے گی اور وہ اس میں (دوسروں کو) عطیے دینگے ۵۵؎

تفسیر گو الفاظ یہ ہیں کہ تم ایسا کرو گے مگر مُراد یہ ہے کہ تمہیں ایسا کرنا ہوگا تا کہ قحط کے ایام کے لئے غلہ موجود رہے۔ اگر ان دنوں میں محنت سے کام نہ لیا اور بہرا احتیاط سے غلہ خرچ نہ کیا تو قحط کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہو جائیگی ۔ یوسف علیہ السلام نے غلہ کو جمع کر کے محفوظ رکھنے کا طریق بھی ساتھ ہی بتا دیا ہے جو یہ ہے کہ اگر گندم کو اسکی بالوں میں ہی رہنے دیا جاوے تو وہ کیڑا وغیرہ لگنے سے زیادہ محفوظ رہتا ہے تم بھی اسی طرح کرنا۔ کوئی تعجب نہیں کہ یہ امر حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کے ہی الفاظ سے اخذ کیا ہو اور یہ خیال کیا ہو کہ گا یُں دکھا کر دوبلد جو بالیں دکھائی ہیں تو اس سے مُراد یہی ہے کہ غلہ کو بالوں میں ہی رہنے دینا چاہیئے ۔

۵۴؎ حل لغات اَلشَّدِيْدُ۔ اَلْبَخِيْلُ۔ کنجوس اَلْقَوِيُّ۔ سخت۔ جَمْعُهٗ شِدَادٌ۔ اسکی جمع شِدَادٌ آتی ہے اَلشَّدِيْدَةُ مُؤَنَّثُ الشَّدِيْدِ وَجَمْعُهٗ شَدَائِدُ۔ شَدِيْدَةٌ شَدِيْدٌ کی مؤنث ہے اور اسکی جمع شَدَائِدُ آتی ہے پس سَبْعٌ اور شِدَادٌ (یہ دونوں سِنُوْنَ کی جو محذوف ہے نعتیں ہیں) میں سے پہلی صفت اس کے موصوف کے صیغہ واحد کی تانیث کی بنا پر بصیغہ تانیث لائی گئی ہے اور دوسری صفت اپنے موصوف کے صیغہ کی رعایت سے جو جمع مذکر کا صیغہ ہے بصیغہ مذکر آئی ہے۔ حَصُنَ حَصَانَةً

تزرعون بقیہ فعل امر ہے۔ مَنُعَ۔ رُک گیا۔ محفوظ ہو گیا۔ اَلْمَرْءَةُ حُصْنًا وَحَصَانَةً كَانَتْ عَفِيْفَةً۔ عورت پاکباز رہی۔ (اقرب)

حصّن — اَحْصَنَ۔ مَنَعَ۔ روکا۔ (اقرب)

تفسیر یعنی اس کے بعد قحط کے دن آئیں گے جن میں پہلا جمع شدہ غلہ سب خرچ ہو جائے گا اور صرف تھوڑا سا جو تم بچا رکھو گے بچے گا۔

حضرت یوسفؑ کا تعبیر کے علاوہ تدبیر بھی بتانا۔ — بچا رکھو گے کے الفاظ سے مجبوری پائی جاتی ہے اور غلہ کے بچانے کی مجبوری بیج کی ہی ہوتی ہے پس مراد یہ ہے کہ بیج کے طور پر جو تم کو جبراً رکھنا پڑے گا وہی رہے گا باقی سب کھایا جائے گا۔ یا یہ کہ اس ڈر سے کہ قحط لمبا نہ ہو جائے جو کچھ تم اپنے پیٹ کاٹ کر بچا رکھو گے وہ بچے گا ورنہ سب خرچ ہو جائے گا ۔

عام — **۵۵؎ حل لغات**۔ اَلْعَامُ۔ اَلسَّنَةُ۔ سال۔ وَفِي الْمِصْبَاحِ لَا تَفْرِقُ عَوَامُّ النَّاسِ بَيْنَ الْعَامِ وَالسَّنَةِ اور مصباح میں ہے کہ عوام الناس عام کے معنوں میں اور سنۃ کے معنوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ وَيَجْعَلُوْنَهُمَا بِمَعْنًى۔ اور ان دونوں کو ہم معنے قرار دیتے ہیں فَيَقُوْلُوْنَ لِمَنْ سَافَرَ فِيْ وَقْتٍ مِّنَ السَّنَةِ اَيِّ وَقْتٍ كَانَ اِلٰى مِثْلِهٖ عَامٌ مثلاً اگر کوئی شخص کسی سال کے دوران میں اور اس کے کسی حصہ میں سفر کرے اور بارہ مہینے کے بعد واپس آئے تو اس عرصہ کو بھی عام کہہ دیتے ہیں۔ وَهُوَ غَلَطٌ لیکن یہ

استعمال صحیح نہیں۔ اَلسَّنَۃُ مِنْ اَیِّ یَوْمٍ عَدَدْتَہٗ اِلٰی مِثْلِہٖ سَنَۃٌ سے مراد ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ خواہ کسی دن سے شمار کیا جائے۔ وَالْعَامُ لَا یَکُوْنُ اِلَّا شِتَآءً وَ صَیْفًا۔ اور عام سے مراد شمسی سال کے مقررہ مہینوں میں سے پہلے مہینہ کے شروع سے لیکر بارھویں مہینہ کے آخر تک کا عرصہ ہوتا ہے جس کا حساب صیف و شتا کو ملحوظ رکھ کر کیا جاتا ہے (اقرب)

لفظ یُغَاثُ کے اختیار کرنے میں حکمت۔

غَاثَ غَاثَ اللّٰہُ الْبِلَادَ یَغِیْثُہَا غَیْثًا: اَنْزَلَ بِہَا الْغَیْثَ اَیِ الْمَطَرَ۔ اللہ تعالیٰ نے ملک میں بارش نازل کی..... وَغَاثَ یَغُوْثُ غَوْثًا۔ اَعَانَہٗ وَ نَصَرَہٗ۔ اسکی مدد اور نصرت کی۔ وَ اَغَاثَنَا اللّٰہُ بِالْمَطَرِ کَشَفَ الشِّدَّۃَ عَنَّا بِہٖ۔ خدا تعالیٰ نے بارش کے ذریعہ سے ہماری تکلیف دور کی (اقرب) عَصَرَ فُلَانًا: اَعْطَاہُ الْعَطِیَّۃَ۔ (اقرب)

یُغَاثُ کا لفظ بارش کے لئے مخصوص نہیں۔

تفسیر اس آیت پر مسیحی مشنری اعتراض کیا کرتے ہیں کہ مصر کی شادابی کا انحصار بارش پر نہیں بلکہ دریائے نیل کی طغیانی پر ہے۔ لیکن قرآن کریم میں لکھا ہے کہ قحط کے بعد بارش ہوگی اور لوگوں کی تکلیف دُور ہوگی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) قرآن کریم کے نازل کرنے والے کو جغرافیہ کی موٹی باتوں کا بھی علم نہیں۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں یُغَاثُ النَّاسُ کے لفظ استعمال ہوئے ہیں اور یُغَاثُ صیغہ مجہول ہے جو غَاثَ یَغِیْثُ سے بھی بن سکتا ہے جس کے معنے بارش نازل کرنے کے ہیں اور غَاثَ یَغُوْثُ سے بھی بن سکتا ہے جس کے معنی مدد کرنے کے ہیں اور اَغَاثَ یُغِیْثُ سے بھی بن سکتا ہے جس کے معنی فریاد کو پہنچنے کے ہیں۔ اور یُغَاثُ کے تینوں معنے ہوسکتے ہیں۔ (۱) بارش برسائی جائے گی (۲) مدد کی جائے گی (۳) ان کی فریاد سُنی جائے گی۔ اور ان کی تنگی دُور کی جائے گی۔ پس یہ کہنا کہ قرآن کریم نے مصر میں بارش کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ وہاں بارش نہیں ہوتی مغالطہ دینا ہے جب ان الفاظ کے دوسرے معنے موجود ہیں تو کیوں وہ معنے نہ کئے جائیں ہمارے نزدیک اس آیت میں بارش کی خبر نہیں دی گئی بلکہ یہ بتایا ہے کہ پھر لوگوں کی مدد کی جائے گی یا یہ کہ فریاد سُنی جائے گی اور انکی تنگی دُور کر دی جائے گی۔

نیل کے ذریعہ شاداب ہونا بھی بارش سے ہی وابستہ ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ ایسا مشتبہ لفظ استعمال کیوں کیا گیا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو کوئی اشتباہ ہے ہی نہیں جب عربی میں ایک لفظ ایک خاص معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے تو قرآن کریم کیوں اس لفظ کو استعمال نہ کرے دوسرے ہم کہتے ہیں کہ اس دو معنوں والے لفظ کے استعمال میں ایک حکمت تھی اور وہ یہ کہ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے بیان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی بھی پیشگوئی تھی اور اس قسم کا قحط آپؐ کے زمانہ میں بھی پڑنے والا تھا لیکن فرق یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں تو اس قحط کا علاج دریا کی طغیانی سے ہونا تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بارش کے ساتھ ہونا تھا پس قرآن کریم نے جس کا ہر لفظ حکمتوں سے پُر ہوتا ہے ایسا لفظ استعمال کیا کہ وہ ایک ہی لفظ دونوں زمانوں پر چسپاں ہو سکتا ہے۔ ایک مادہ سے اس کے معنی فریاد سُننے اور تنگی دُور کرنے کے ہیں اور ان معنوں میں وہ لفظ یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں پُورا ہُوا۔ دوسرے مادہ سے اس لفظ کے معنی بارش ہونے کے ہیں ان معنوں سے یہ لفظ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پورا ہُوا اور یہ لطیف پیرایۂ کلام قرآن کریم کی عظمت ثابت کرتا ہے نہ کہ اسے قابلِ اعتراض بناتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر بارش ہی کے معنے کریں تب بھی کوئی اعتراض نہیں پڑتا کیونکہ اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ مصر میں بارش ہوگی بلکہ یہ لفظ ہے کہ لوگوں کے لئے بارش نازل کی جائے گی اور اس میں کیا شک ہے کہ گو مصر کی شادابی نیل کی طغیانی پر منحصر ہے نہ کہ بارش پر۔ لیکن نیل کی طغیانی آگے بارش پر منحصر ہے جو گو مصر میں نہیں ہوتی لیکن ان علاقوں میں تو ہوتی ہے جہاں نیل کا

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ

اور بادشاہ نے (یہ بات سن کر ان سے) کہا کہ تم اسے میرے پاس لے آؤ پس جب (بادشاہ کا) پیغام رساں اس کے

قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ

پاس آیا تو اس نے (یعنی یوسف نے اس سے) کہا (کہ) تو اپنے آقا کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ (کہ) ان عورتوں

قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝

نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے انکی (اس وقت) کیا کیفیت ہے میرا رب ان کے منصوبے کو یقیناً خوب جاننے والا ہے ۵۱ف

ضیع ہے۔پس اگر بارش کے معنے لئے جائیں تب بھی کوئی اعتراض نہیں پڑتا ◆

۵۱ف حل لغات۔اَلْبَالُ۔ اَلْحَالُ۔ حالت کیفیت۔ اَلْقَلْبُ۔ دل (اقرب) اَلْبَالُ الْحَالُ الَّتِیْ یُکْتَرَثُ بِھَا۔ توجہ طلب حالت اور کیفیت ...... ولذٰلك یُقَالُ مَا بَالَیْتُ بِکَذَا بَالَۃً اَیْ مَا اکْتَرَثْتُ بِہٖ۔ چنانچہ مابالیتُ بکذا بالۃً کے معنے ہوتے ہیں میں نے فلاں بات کی کچھ بھی پروا نہ کی۔اور اسکی طرف توجہ نہ کی۔ قَالَ کَفَّرَ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَاَصْلَحَ بَالَھُمْ۔ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی اَیْ حَالُھُمْ وَخَبَرُھُمْ اور قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیات میں بال کے معنے حال اور خبر ہی کے ہیں۔ وَیُعَبَّرُ بِالْبَالِ عَنِ الْحَالِ الَّذِیْ یَنْطَوِیْ عَلَیْہِ الْاِنْسَانُ۔اور بال سے مُراد اندرونی اور قلبی کیفیت کے بھی ہوتے ہیں فَیُقَالُ خَطَرَ کَذَا بِبَالِیْ۔ چنانچہ اسی بنا پر خطر کذا ببالی کہا جاتا ہے جس کے معنے ہیں فلاں بات میرے دل میں آئی۔ (مفردات)

تفسیر بادشاہ نے یہ دیکھ کر کہ اس کے ہم مذہب کاہن تو تعبیر کرنے سے رہ گئے اور یوسف علیہ السلام نے ایک نہایت اعلیٰ تعبیر بیان کردی اور مصیبت کا علاج بھی بتادیا اور اپنے ساقی سے یہ سُن کر کہ پہلے بھی انکی بتائی ہوئی تعبیریں پوری ہوچکی ہیں انہیں قید سے آزاد کرنا چاہا۔لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کی غیرت نے برداشت نہ کیا کہ وہ اپنی براءت کرائے بغیر قید سے نکلتے۔معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یہ خیال ہوا کہ اگر میں اس وقت نکل آیا تو کسی آیندہ زمانہ میں لوگ میری شکایت بادشاہ سے کردیں گے اور وہ ان امور کو شاید سچا سمجھ لے۔ اس لئے مناسب ہے کہ ابھی سے سب معاملہ بادشاہ کے سامنے آجائے تاکہ وہ تحقیق کرکے اپنی تسلی کرلے اور آیندہ کسی کو ریشہ دوانی کا موقع نہ ملے ◆

بَال

حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول سے کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر میں بھی ہاتھ کاٹنے کا کوئی واقعہ ہوا تھا۔یا تو واقعہ میں ان میں سے کسی کا ہاتھ باتیں کرتے زخمی ہوگیا تھا جسکی طرف حضرت یوسف علیہ السلام نے اشارہ کیا ہے۔اور یا پھر انہوں نے مُنہ سے کہا ہوگا کہ ہم نے تو اس شخص کو بدنام کرکے اپنے ہاتھ کاٹ لئے ہیں جسے انہوں نے یاد دلایا ہے۔اگر صرف قرآن کریم نے ان کی کیفیت کو ان الفاظ سے ادا کیا ہوتا تو حضرت یوسف علیہ السلام کے مُنہ سے یہ فقرہ نہیں نکل سکتا تھا۔

عزیز مصر کی بیوی کی سہیلیوں نے واقعی اپنے ہاتھ کاٹے تھے۔

یہاں ایک عجیب نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے جسے لوگ عام طور پر نہیں سمجھتے اور وہ یہ کہ نیکیاں اور بدیاں بھی مختلف نقطہ ہائے نگاہ کے ماتحت ہوتی ہیں۔اور بعض دفعہ بالکل متخالف نظر آنے والے معاملات دونوں

محمد آنحضرت کو ایسا موقع پیش آتا تو آپ کیا کرتے۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ

(یہ پیغام سُن کر) اس نے (یعنی بادشاہ نے ان عورتوں سے) کہا (کہ) تمہارا (وہ) معاملہ جبکہ تم نے یوسف سے اسکی مرضی کے خلاف

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ

(ایک بُرا) فعل کروانے کی کوشش کی تھی (اصل میں) کیا تھا انہوں نے کہا (کہ) وہ اللہ (تعالیٰ) کی خاطر (بدی کے

قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْئٰنَ حَصْحَصَ

ارتکاب سے) ڈرا تھا (اور) ہم نے اس میں کوئی بھی بُرائی (کی بات) نہیں معلوم کی تھی (یہ سنکر) عزیز کی بیوی نے کہا (کہ) اب سچائی بالکل کھل

ہی نیکیاں یا دونوں ہی بدیاں ہوتے ہیں۔ اس آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے جس فعل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ بھی اسی قسم کے فعلوں میں سے ہے۔ جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو بادشاہ نے بُلایا ہے انکے لئے دو ہی راستے کُھلے تھے۔ یا فوراً نکل آتے یا پہلے براءت کرا کے نکلتے۔ یہ دونوں فعل بظاہر متضاد ہیں لیکن دو مختلف نقطۂ نگاہ کے رُو سے یا تو یہ دونوں فعل نیکی بن جاتے ہیں اور یا دونوں بدی۔ اور وہ اس طرح پر کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام تکبر اور خود پسندی کے ماتحت ایسا کرتے کہ پہلے لوگ گناہ کا اقرار کریں تب میں پھر نکلوں گا۔ تو یہ گناہ ہو جاتا۔ اسی طرح اگر وہ یہ طریق اختیار کرتے کہ اپنے نفس کے آرام کے لئے بغیر کسی دینی فائدہ کے مدِ نظر رکھنے کے فوراً باہر نکل آتے تو بھی یہ گناہ ہوتا لیکن انہوں نے نکلنے سے انکار کیا نہ اس لئے کہ وہ متکبر تھے بلکہ جیسا کہ انہوں نے خود بتایا ہے محض اس لئے کہ ان کا ایک محسن اس وہم میں مبتلا نہ رہے کہ یوسف (علیہ السلام) نے اس سے غداری کی ہے۔ اور اس اعلیٰ جذبہ کی وجہ سے ان کا یہ فعل ایک اعلیٰ درجہ کی نیکی تھا۔ مگر ایک چوتھا نقطۂ نگاہ بھی ہے جس کے ماتحت فوراً نکل آنا ایک نیکی بن جاتا ہے۔ اور اس نقطۂ نگاہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا ہے یہ نقطۂ نگاہ اپنے فرضِ منصبی کے پورا کرنے کا خیال ہے ایک نبی

ایک فعل ایک نقطۂ نگاہ کی رو سے نیکی ہوتا ہے اور دوسرے نقطۂ نگاہ کی رو سے بدی۔

حضرت یوسفؑ کا نقطۂ نگاہ۔

آنحضرتؐ کا نقطۂ نگاہ۔

آنحضرتؐ کا نقطۂ نگاہ بہت اعلےٰ اور بلند تر ہے۔

یا معلم خدا تعالےٰ کی طرف سے لوگوں کو تبلیغ کرنے کے لئے مامور ہوتا ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی ہر چیز کو اس غرض کے لئے قربان کر دے حتیٰ کہ اگر عزت اور نیکنامی بھی قربان کرنی پڑے تو وہ اس کی پرواہ نہ کرے۔ ایک نبی اگر قیدخانہ میں ہو تو وہ یا تو تبلیغ نہیں کر سکے گا یا اسکی تبلیغ محدود ہوگی۔ اگر وہ اس نقطۂ نگاہ سے اپنی آزادی کو دیکھے تو اسکی بہت بڑی قربانی ہوگی اگر وہ بغیر صفائی کے قید سے نکل آئے اور اپنے کام کے مقابلہ میں اپنی عزت کی پرواہ نہ کرے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے لئے آخری طریق کو پسند کیا ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ لَوْ لَبِثْتُ فِی السِّجْنِ مَا لَبِثَ یُوْسُفُ لَاَجَبْتُ الدَّاعِیَ اگر میں اس قدر دیر قید میں رہتا جس قدر یوسفؑ رہے تھے تو میں بُلانے والے کی بات کو قبول کر لیتا۔ (بخاری و مسلم ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے) اور مسند احمد حنبل میں ابو ہریرہؓ سے ہی روایت ہے لَاَسْرَعْتُ الْاِجَابَۃَ وَمَا ابْتَغَیْتُ الْعُذْرَ۔ میں فوراً بات قبول کر لیتا اور یہ عذر نہ کرتا کہ پہلے میری براءت کرو۔ ہر عقلمند انسان سمجھ سکتا ہے کہ دونوں مقامات میں سے وہ مقام زیادہ بلند ہے جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے پسند فرمایا ہے کیونکہ گو عزت کی حفاظت ایک اعلیٰ درجہ کا کام ہے لیکن اگر اس امر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ تبلیغ کے کام

الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ

گئی ہے میں نے (ہی) اس سے اس کی مرضی کے خلاف (ایک برا) فعل کرانے کی کوشش کی تھی اور وہ یقیناً

الصّٰدِقِيْنَ ○ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ

راستبازوں میں سے ہے ۵۲ (اور یوسف نے اسے یہ بھی کہا کہ) یہ (بات میں نے) اس لئے (کہی) ہے کہ اسکو (یعنی عزیز کو) علم

میں ہرج نہ ہو یا اور کسی ایسے کام کے لئے جو قومی یا شرعی یا دینی ہو انسان اپنی عزت کو قربان کر دے اور اپنے پر الزام کو رہنے دے تو یہ شخص یقیناً اس شخص سے جو اپنی عزت کی حفاظت کا مطالبہ کسی نیک ارادہ سے کرتا ہے زیادہ اعلیٰ مرتبہ پر ہے ۞

۵۲ حل لغات - اَلْخَطْبُ الشَّاْنُ۔ خاص حالت جو کسی لحاظ سے اہمیت رکھتی ہو۔ اَلْاَمْرُ صَغُرَ اَوْ عَظُمَ معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ سَبَبُ الْاَمْرِ وہ بات جسکی وجہ سے یا جس کے لئے کوئی کام یا کوئی معاملہ عمل میں لایا جائے۔ قَالَ مَا خَطْبُكَ اَیْ مَا شَاْنُكَ الَّذِیْ تَخْطُبُہٗ وَمَا الَّذِیْ حَمَلَكَ عَلَیْہِ۔ چنانچہ جب کسی سے کہیں کہ مَا خَطْبُكَ۔ تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ تم نے کس غرض سے فلاں کام کیا ہے۔ اور کیا بات تمہارے پیش نظر ہے (اقرب)

الْخَطْبُ۔ اَلْحَالُ۔ حالت۔ اَلْاَمْرُ الَّذِیْ یَقَعُ فِیْہِ الْمُخَاطَبَۃُ وہ معاملہ جس کے متعلق باہم گفتگو ہو۔ (تاج) حَصْحَصَ الْحَقُّ۔ بَانَ بَعْدَ کِتْمَانِہٖ۔ حق بات جو پہلے مخفی تھی ظاہر ہو گئی اور اصل حقیقت کھل گئی۔ (اقرب) ۞

تفسیر معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کو خوابوں کی تعبیر سُن کر حضرت یوسفؑ کی پاکیزگی کا اس قدر یقین ہو گیا تھا کہ جب اس نے یوسف علیہ السلام پر الزام سنا تو تحقیق سے پہلے ہی سمجھ لیا کہ یہ الزام غلط ہے۔ اسی وجہ سے اس نے عورتوں سے سوال کرتے وقت یہ الفاظ استعمال کئے ہیں کہ "جب تم نے یوسف کو اس کے منشاء کے خلاف بہکانا چاہا تھا" اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں عزیز کی بیوی کی سہیلیاں ہونے کے سبب سے ان عورتوں نے بھی حضرت یوسفؑ کو عزیز کی بیوی کی تائید میں پھسلانا چاہا تھا کیونکہ بادشاہ کا یہ کہنا کہ تم نے ورغلانا چاہا تھا بتاتا ہے کہ بادشاہ کو ایسی روایت پہنچی تھی۔ مگر یہ یقینی ہے کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام کو اپنی طرف مائل نہیں کرنا چاہا بلکہ عزیز کی بیوی کی طرف مائل کرنا چاہا ہے۔ ممکن ہے یوں کہا ہو کہ دیکھو یہ تم کو قید کرا دیگی تم اس کی بات مان جاؤ مگر بہرحال جو کچھ انہوں نے کیا وہ عزیز کی بیوی کے لئے کیا کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کا بھی علیحدہ ذکر قرآن کریم میں آتا۔ ضمناً بادشاہ کے مُنہ سے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ پہلے واقعہ کا حصہ ہی تھا۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب بادشاہ نے ان عورتوں سے ایسے الفاظ میں بات دریافت کی جن سے وہ سمجھ گئیں کہ بادشاہ یوسف علیہ السلام کی بات کو دوسرے کی بات پر مقدم کرتا ہے تو انہوں نے زیادہ اخفاء اپنے مصالح کے خلاف جانا اور حق کو ظاہر کر دیا لیکن جواب ایسا دیا جس سے یوسفؑ کی بریت ظاہر ہو اور عزیز کی بیوی پر بھی کوئی الزام نہ آئے لیکن اسے خود ہی فکر پڑ گئی اور اسے خیال گزرا کہ اب بات کھل جائیگی اور اب یہ عورتیں میرے قصور کا بھی اظہار کر دینگی پس میں خود ہی کیوں نہ اپنے قصور کا اقرار کر لوں تا کہ اگر بادشاہ کا ارادہ سزا دینے کا ہو تو اس سے محفوظ رہوں اس لئے وہ بغیر سوال کرنے کے آپ ہی بول پڑی کہ اَلْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ۔ اب تو حق ظاہر ہو گیا ہے

پھسلانے کی کوشش میں دوسری عورتیں بھی حصہ دار تھیں

خطب

عزیز کی بیوی کا خود بخود بول کر حضرت یوسفؑ کی بریت کا اقرار کرنا۔

حصحص

بادشاہ کو یوسفؑ کی بریت اور عورتوں کی چالاکی کا یقینی علم ہو چکا تھا۔

بِالْغَیْبِ وَاَنَّ اللّٰہَ لَایَھْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ ۝

ہو جائے کہ مَیں نے (اسکی) غیر موجودگی میں اسکے حق میں خیانت نہیں کی۔ اور یہ کہ (میرا ایمان ہے کہ) خیانت کرنیوالوں کی (مخالفانہ) تدبیر کو اللہ (تعالیٰ) کامیاب نہیں کرتا

حقیقت یہی ہے کہ مَیں نے ہی یوسف علیہ السلام کو انکے منشاء کے خلاف ایک بُرے فعل کے ارتکاب کی تحریص دلائی تھی ✦

۵۳ حل لغات۔ خَانَ — خَانَہٗ فِی کَذَا یَخُوْنُہٗ خَوْنًا وَخِیَانَۃً۔ اُؤْتُمِنَ فَلَمْ یَنْصَحْ۔ امانت میں خیانت کی اَلْعَھْدَ۔ نَقَضَہٗ۔ عہد شکنی کی۔ یُقَالُ خَانَہُ الْعَھْدَ وَالْاَمَانَۃَ اَیْ فِی الْعَھْدِ وَالْاَمَانَۃِ فَھُوَ خَائِنٌ یعنی خَانَہٗ فِی الْعَھْدِ اور خَانَہٗ فِی الْاَمَانَۃِ کی بجائے خَانَہُ الْعَھْدَ اور خَانَہُ الْاَمَانَۃَ بھی بولتے ہیں اور دونوں صورتوں میں معنے ایک ہی رہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ عہد کو توڑا اور امانت میں خیانت کی۔ (اقرب)

ھَدٰی — اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ۔ اَیْ لَا یُنْفِذُہٗ وَلَا یُصْلِحُہٗ۔ یعنی اس آیت میں لا یھدی کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں اور غداروں کی تدبیر اور ان کے منصوبہ کو کامیاب نہیں کرتا۔ (تاج)

اَلضِّلَالُ۔ فَقْدُ مَا یُوْصِلُ اِلَی الْمَطْلُوْبِ۔ ضلال کے معنے ہیں مطلوب چیز تک پہنچنے کے ذرائع اور اسباب کو کھو بیٹھنا اور اس بنا پر اس کو نہ پا سکنا۔ وَنَقِیْضُہٗ اَلْھِدَایَۃُ۔ اور ھدایۃ اس کی ضد ہے۔ پس ہدایت کے معنے ہیں مطلوب چیز تک پہنچنے اور اسے پانے کے یعنے تمام اسباب اور ذرائع کا میسر آجانا اور ان کا مطلوب چیز تک پہنچا دینا۔ یعنی کامیاب کرنا (تاج)

تفسیر۔ اس قول کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ کس کا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ عزیز کی بیوی کہتی ہے کہ مَیں نے غیبت میں یوسفؑ کی خیانت نہیں کی۔ لیکن یہ فقرہ اس کے مُنہ سے بہت بھدا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ اس نے خیانت کی ہے پس میرے نزدیک انہی لوگوں کا قول درست ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ قول حضرت یوسفؑ کا ہے

اور مراد یہ ہے کہ مَیں نے بادشاہ کو دھوکا نہیں دیا یعنی کسی نہ کسی دن یہ امر بادشاہ کے سامنے آنا تھا۔ اس وقت اسے یہ خیال ہو سکتا تھا کہ اس شخص نے مجھ سے ایسے امر کو پوشیدہ رکھ کر عہدہ لے لیا۔ اس وجہ سے مَیں نے اس کا ازالہ کر دیا ہے اب کبھی بادشاہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مَیں نے بادشاہ کو اصل حالات سے ناواقف رکھ کر دھوکا دیا ہے ✦

یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ یعلم کی ضمیر کو عزیز کی طرف پھیرا جائے اور مراد یہ لی جائے کہ عزیز یہ خیال نہ کرے کہ مَیں نے اس کی خیانت کی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یعلم کی ضمیر بادشاہ کی طرف جاتی ہو۔ اور لَمْ اَخُنْہُ کی ضمیر عزیز کی طرف اور مراد یہ ہو کہ بادشاہ جان لے کہ مَیں نے اپنے محسن عزیز کی خیانت نہیں کی تھی تاکہ آیندہ اسے شبہ نہ پیدا ہو کہ جس طرح اس محسن کی خیانت کی تھی ممکن ہے یہ میرا بھی خائن ہو۔

معلوم ہوتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی علم ہو گیا تھا کہ وہ فلاں کام پر مامور کئے جائیں گے اس لئے آپ نے یہ براءت پہلے کرالی۔ کہ آپ خائن نہیں ہیں تاکہ آیندہ آپ کے کام پر کوئی الزام نہ ہو ✦

آخری حصہ آیت سے یہ مُراد ہے کہ ایسے خائن جو ان لوگوں کا مقابلہ کرتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ خاص کام لینا چاہتا ہے۔ اور الؔ جو خائنین کے اوپر ہے ال عہد ذکری کا ہے یعنی جن کا ذکر پہلے ہوا ہے اور پہلے ذکر ایسے خائنوں کا ہوا ہے جنہوں نے یوسف علیہ السلام کے مقابلہ میں خیانت کی ہے جنہیں ایک خاص کام پر مقرر کرنے کا اللہ تعالیٰ فیصلہ کر چکا تھا پس یہ مُراد نہیں کہ کوئی خائن اپنی خیانت میں کامیاب ہی نہیں ہوتا۔ کئی لوگ خیانت کرتے ہیں اور اس دُنیا میں انکی خیانت چھپی رہتی

خَانَ

یعلم کا فاعل کون ہے۔

ھَدٰی

حضرت یوسفؑ نے پہلے ہی بریت کا اظہار کیوں کیا تھا۔

اس آیت میں ہر ایک خائن کے لئے خیانت میں ناکام رہنے کا ذکر نہیں۔

ذٰلک لیعلم حضرت یوسف کا قول ہے یا عزیز کی بیوی کا۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ

اور میں اپنے نفس کو (ہر قسم کی غلطی سے) بری قرار نہیں دیتا کیونکہ (انسانی) نفس سوائے اسکے جسپر میرا رب رحم کرے

اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَقَالَ

بُری باتوں کا حکم دینے پر بہت دلیر ہے۔ میرا رب (کمزوریوں پر) بہت پردہ ڈالنے والا اور بار بار رحم کرنیوالا ہے ۵۴ اور

ہے لیکن ایسے خائن کی خیانت کو اللہ تعالیٰ کبھی چُھپا نہیں رہنے دیتا جو اس کے ماموروں کے مقابلہ میں خیانت کرتے ہیں +

اس آیت سے یہ بھی مُراد ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ خائنوں کی نصرت نہیں کرتا۔ اور چونکہ یوسفؑ کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت تھی کہ پہلے بادشاہ کے دو خاص خدام کو خوابیں دکھائیں پھر خود بادشاہ کو خواب دکھائی پس وہ کہتے ہیں کہ مَیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ اللہ تعالےٰ کا میری مدد کرنا بلا وجہ نہ تھا۔ بلکہ میں حق پر تھا اس لئے وہ میری مدد کر رہا تھا +

۵۴ حل لغات۔ اَمَّارَةٌ:۔ امر سے بنا ہے اور یہ مبالغہ کا مؤنث کا صیغہ ہے۔ مذکر کا صیغہ اَمَّارٌ ہے جس کے معنے ہیں اَلْکَثِیْرُ الْاَمْرِ۔ بہت حکم دینے والا۔ وَالْمُغْرِیْ کسی کام کے کرنے کے لئے اُکسانے والا۔ چونکہ نفس عربی میں مؤنث ہے۔ اس لئے اَمَّارہ مؤنث کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے +

اَلسُّوْٓءُ:۔ کُلُّ مَا یَغُمُّ الْاِنْسَانَ مِنَ الْاُمُوْرِ الدُّنْیَوِیَّةِ وَالْاُخْرَوِیَّةِ وَمِنَ الْاَحْوَالِ النَّفْسِیَّةِ وَالْبَدَنِیَّةِ وَالْخَارِجَةِ مِنْ فَوَاتِ مَالٍ وَجَاهٍ وَفَقْدِ حَمِیْمٍ۔ دنیوی و اخروی معاملات اور نفسی و بدنی حالات یا انکے علاوہ اور خارجی واقعات یعنی مال و عزت کے کھوئے جانے یا دوست و احباب کی علیحدگی کی وجہ سے جو امور انسان کو اندوہگین بنائیں ان سب کو سُوء کے نام سے موسوم کرتے ہیں (مفردات) +

تفسیر۔ نبی کی فطرت بھی کیا ہی پاکیزہ ہوتی ہے حضرت یوسف علیہ السلام کہتے ہیں کہ میری یہ غرض نہ تھی کہ میں یہ ظاہر کروں کہ مَیں پاک ہوں۔ بلکہ میں ایک تو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے اور کبھی وہ ان خائنوں کی تدابیر کو کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ جو اس کے ماموروں کے مقابل پر کھڑے ہوتے ہیں پس مَیں نے جو کچھ تدبیر کی ہے اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے نہیں کی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کے اظہار کے لئے کی ہے۔ دوسرے مَیں نے اس لئے براءت کی کوشش کی ہے کہ تا بتاؤں کہ جن کو اللہ تعالےٰ بچاتا ہے انہیں کوئی شخص بدی میں نہیں ڈال سکتا ورنہ اپنے نفس کی بڑائی کی خاطر مَیں نے یہ کام نہیں کیا بلکہ مجھے تو اقرار ہے کہ نفس انسانی بغیر اللہ تعالیٰ کے رحم کے یعنی شریعت اور ہدایت اور فضل کے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ بلکہ پے در پے بُری باتوں کا حکم دیتا چلا جاتا ہے کیونکہ نیّرِ الہام ہی ہے جو اسے صحیح راستہ پر چلاتا ہے۔

قرآن کریم نے دوسری جگہ پر بتلایا ہے کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ رحمانیت سے ہی کلام الٰہی کا نزول ہوتا ہے پس اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ سے مراد وہی رحمت ہے یعنی کلام الٰہی۔ بغیر اس کے انسانی فطرت ایک ایسے شخص کی طرح ہے جو خطرناک تاریکی میں پہاڑ کی چوٹیوں پر سے گزر رہا ہو۔ کیونکہ باوجود آنکھوں کے ہر وقت خطرہ ہی ہوتا ہے اور بار بار غلطیاں کرتا ہے۔ جب الہام کا سُورج چڑھتا ہے۔ تبھی روحانی آنکھ بھی کام دیتی ہے +

دوسری جگہ قرآن کریم نے نفس کی دو اور حالتیں

نبی کی فطرت پاکیزہ ہوتی ہے

حضرت یوسفؑ کا بیان کہ اگر میں خائن ہوتا تو مجھے نصرت و تائید الٰہی نہ ہوتی۔

یوسفؑ کو اپنی براءت میں اپنی بڑائی مطلوب نہ تھی۔

اَمَّارہ

نیّرِ الہام ہی نفس کو صحیح راستہ پر چلاتا ہے۔

اَلسُّوْٓء

اِلَّا مَا رَحِمَ سے مراد کلام الٰہی ہے۔

نفس کی تین حالتیں

وَقَالَ الۡمَلِكُ ائۡتُوۡنِىۡ بِهٖۤ اَسۡتَخۡلِصۡهُ لِنَفۡسِىۡ‌ ۚ فَلَمَّا

اور بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے (یعنی یوسف کو) میرے پاس لاؤ (تاکہ) میں اسے اپنے (خاص کاموں کے) لئے منتخب کرلوں (جب یوسف آئے) اور جونہی اس نے

كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الۡيَوۡمَ لَدَيۡنَا مَكِيۡنٌ اَمِيۡنٌ ○

(یعنی بادشاہ نے) اس کے ساتھ بات چیت کی (تو اس نے کہا کہ) تو آج (سے) ہمارے ہاں معزز مرتبہ والا (اور ہر طرح سے) اعتباری آدمی (شمار) ہوگا۵۵

بتلائی ہیں۔ ایک نفس لوّامہ جیساکہ فرماتاہے کَلَّا اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ (سورۃ قیامۃ) اور دوسری نفس مطمئنہ جیسے کہ فرماتاہے يٰۤاَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ۖ ارۡجِعِىۡۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً ○ (سورہ فجر) پس اس جگہ نفس سے مُراد وہ ابتدائی حالت ہے جبکہ الہام سے نفس کو نا آشنائی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کے فضل کا وہ وارث نہیں ہوتا۔ ورنہ یہ مُراد نہیں کہ انسانی نفس ہمیشہ بدی کی تعلیم دیتاہے۔ اس کا رد خود اس آیت میں اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىۡ کہہ کر کردیاہے اور نہ یہ مراد ہے کہ انسان اپنی ذات میں گنہگار پیدا ہوتاہے کیونکہ اس جگہ پیدائش کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ دُنیاوی آلائشوں کا شکار ہونے کے بعد جو اسکی حالت ہوتی ہے اس کا ذکر ہے۔ ورنہ پیدائش کے متعلق تو اللہ تعالیٰ فرماتاہے کہ وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۙ ہم نفس کی قسم کھاتے ہیں۔ اور اسکی اس حالت کمال کی جو ہم نے پیدا کی ہے۔ پس نفس انسانی کو اللہ تعالیٰ نے پاک حالت میں پیدا کیاہے آگے وہ باہر اگر دوسروں کے اثر سے ناپاک ہوتاہے یا جو سے ناپاک نہ ہونے دے اس کو پاک رکھتاہے۔ غرض اس جگہ نفس کی پیدائش کی حالت کا ذکر نہیں ہے بلکہ دنیوی آلائشوں سے ملوث ہونے کے بعد کا ذکر ہے ✦

اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىۡ کے ایک تو یہ معنی ہیں کہ اِلَّا النَّفۡسَ الَّتِىۡ رَحِمَهَا رَبِّىۡ فَاِنَّهَا لَا تَاۡمُرُ بِالسُّوۡٓءِ یعنی وہ نفس جس پر خدا رحم کرے یعنی نفس مطمئنہ وہ بدی کا حکم نہیں کرتا ✦

دوسرے یہ کہ مَا مَنۡ کی جگہ استعمال ہُوا ہے اور مراد یہ ہے کہ اِلَّا الَّذِىۡ رَحِمَهٗ رَبِّىۡ۔ سوائے اس شخص کے جس پر اللہ رحم کرے۔ باقی لوگ نفس امارہ کے حملہ کا شکار ہوتے رہتے ہیں پس جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا رحم ہوتاہے وہ اپنے نفس کی بات نہیں مانتے ✦

تیسرے یہ کہ یہ استثناء منقطع ہے اور ما مصدریہ ہے اور معنے یہ ہیں۔ کہ ہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت جسے چاہے بچالے یہ تینوں معنے مختلف درجوں کے لوگوں کے لحاظ سے ہیں۔ یعنی (۱) بعض نفس پاک ہوجاتے ہیں۔ اور وہ برائی کا حکم ہی نہیں دیتے۔ یہ اعلےٰ درجہ کے ہیں ✦

(۲) اس سے ادنیٰ درجہ کے لوگ وہ ہیں کہ ان کا نفس تو بدی کا حکم دیتاہے لیکن وہ نفس سے مغلوب نہیں ہوتے یہ درمیانی درجہ کے ہیں ✦

(۳) اس سے ادنیٰ درجہ کے لوگ وہ ہیں کہ اپنے نفس امارہ سے مغلوب ہوجاتے ہیں۔ مگر خداوند تعالیٰ کی رحمت ان کو بچادیتی ہے اور انہیں توبہ کی توفیق مل جاتی ہے ✦

اِنَّ رَبِّىۡ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ کہہ کر اس طرف اشارہ کیاہے کہ مَیں تو غفور رحیم رب کا بندہ ہوں اس لئے میرا بھی یہی فرض تھا کہ دوسرے کے گناہوں پر پردہ ڈالتا۔ لیکن یہاں چونکہ سوال خدا تعالےٰ کی عزت کا تھا اس لئے میں خاموش نہیں رہا ✦

۵۵ حل لغات

:- اِسۡتَخۡلَصَ، الرَّجُلَ، اِخۡتَصَّهٗ بِدُخۡلُلِهٖ کسی کو اسکی باطنی صفائی کی وجہ سے خاص کرلیا۔ وَالشَّیۡءَ، اِخۡتَارَهٗ۔ کسی چیز کو منتخب کرلیا۔ چن لیا۔ (اقرب)

مَكِيۡنٌ:- مَكُنَ فُلَانٌ عِنۡدَ السُّلۡطَانِ مَكَانَةً: عَظُمَ عِنۡدَهٗ وَارۡتَفَعَ وَصَارَ ذَا مَنۡزِلَةٍ:۔ بادشاہ کے

لوّامہ

مطمئنہ

تینوں معنے مختلف درجوں کے لوگوں کے لحاظ سے ہیں۔

نفس امارہ سے مُراد

انسان اپنی ذات میں گنہگار پیدا نہیں ہوا۔

نفس کو خدا تعالیٰ نے پاک حالت میں پیدا کیاہے

اِنَّ رَبِّىۡ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ کہنے کی وجہ

استخلص

اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىۡ کے تین معنے۔

مکین

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ

(اس پر یوسفؑ نے) کہا۔ کہ مجھے (تو) ملک کے خزانوں پر (افسر) مقرر کر دیں کیونکہ میں یقیناً (خزانوں کی) بہترین حفاظت کرنیوالا اور (انکے خرچ

عَلِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ

کے وجوہ کو) خوب سمجھنے والا ہوں ۵۶ اور اسی طرح (مناسب حالات پیدا کر کے) ہم نے یوسفؑ کو (اس) ملک میں ایک با اختیار

يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۭ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ

عہدہ عطا کیا۔ وہ (اپنی مرضی کے مطابق) جہاں (کہیں) چاہتا ٹھہرتا۔ ہم جسے چاہتے ہیں (اس دنیا میں ہی) اپنی رحمت سے (حصہ)

نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَلَاَجْرُ

دیتے ہیں۔ اور ہم نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔ ۵۷ اور (اس دنیاوی اجر کے علاوہ)

ان صاحبِ قدر و منزلت ہوگیا۔ اور ایسے انسان کو مکین کہتے ہیں۔ اسکی جمع مکناء ہے (اقرب)

تفسیر۔ بادشاہ نے اس فقرہ سے ایک لطیف طرز پر عزیز کو جس کے پاس یوسف علیہ السلام رہے۔ کی ہے اور بتایا ہے کہ ایسے شخص کی تم قدر نہیں کر سکے۔ اب میں اسے خود اپنے قرب میں جگہ دے کر قدر کروں گا۔ یہ تو ملاقات سے پہلی حالت تھی جب ملاقات کی تو یوسف علیہ السلام کا اور بھی گرویدہ ہو گیا۔ اور کہا آپ کو میرے دربار میں خاص منزلت ملے گی اور امین کہہ کر بتایا ہے کہ میں آپ پر شبہ نہیں کروں گا۔ اور آپ پر پوری طرح اعتبار کروں گا ◆

بائبل میں لکھا ہے۔ کہ بادشاہ نے کہا سوائے تاج کے اور سب کچھ تجھ کو دوں گا۔ اور لکھا ہے کہ بادشاہ نے اپنی سواری کے بعد جو دوسرے درجہ کی سواری تھی وہ حضرت یوسفؑ کو سواری کے لئے دی بلکہ شہر میں اعلان کرایا۔ کہ میرے حکم کے بعد دوسرے درجہ پر حکومت اس شخص کی ہوگی ◆

۵۶ تفسیر۔ انہوں نے سمجھا کہ اگر وزیر ہوگیا تو روز کے جھگڑے پڑے رہیں گے۔ دوسرے اس لئے کہ اگر خزائن پر کوئی اور مقرر ہوا تو ممکن ہے کہ وہ حسد سے کام بگاڑ دے اور پھر الزام مجھ پر آئے کہ اس نے جو خواب کی تعبیر بتائی تھی وہ غلط نکلی اس لئے اپنے ہاتھ میں اس انتظام کو لینا چاہا حضرت یوسفؑ کی اس خواہش سے ایک نصیحت حاصل ہوتی ہے کہ جو شخص کسی کام کی سکیم تیار کرے اگر وہ اس کام کے قابل ہو تو زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہ کام اس کے سپرد کیا جائے ◆

بعض لوگ اس جگہ اعتراض کرتے ہیں کہ عہدہ مانگنا نہیں چاہیئے پھر حضرت یوسفؑ نے ایسا کیوں کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے در اصل عہدہ مانگا نہیں بلکہ اس سوال سے انہوں نے اپنا عہدہ گرایا ہے کیونکہ بادشاہ تو انہیں وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر مقرر کرنے لگا تھا۔ اور وہ فقط کے کام کا مطالبہ کرتے ہیں ◆

۵۷ حل لغات۔ يَتَبَوَّاُ۔ تَبَوَّاَ سے مضارع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ جس کے معنے کسی جگہ کو اپنی جائے رہائش بنا کر اس میں ٹھہرنے کے ہیں۔ مزید تشریح کے لئے دیکھئے یونس ۸۸ :۔ اَلْاَجْرُ۔ اَلثَّوَابُ۔ اجر کے معنے ہیں۔ ثواب بدلہ (اقرب) اَلْاَجْرُ۔ وَالْاُجْرَةُ مَا يَعُوْدُ مِنْ ثَوَابِ الْعَمَلِ دُنْيَوِيًّا كَانَ اَوْ اُخْرَوِيًّا۔ دنیوی یا اخروی کام کے بدلہ میں جو کچھ ملے اس کو اجر اور اُجرت کہتے ہیں جیسے

بادشاہ کی طرف سے عزیز کیلئے لطیف سرزنش

سکیم کے تیار کرنے والے کے سپرد کام کیا جائے۔

حضرت یوسفؑ کے عہدہ مانگنے کے متعلق اعتراض کا جواب

بادشاہ کے ہاں حضرت یوسف کا قرب۔

حضرت یوسفؑ کی خزائن پر متصرف ہونے کی خواہش کی وجہ۔

ع ۸ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ۝

آیندہ (زندگی کا) بدلہ ایمان لانے والوں اور (اللہ تعالےٰ کا) تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے (کہیں) بڑھ (چڑھ) کر ہوگا ۵۵۸

وَجَآءَ اِخْوَةُ یُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَیْهِ فَعَرَفَهُمْ

اور (اس قحط کے زمانہ میں) یوسفؑ کے بھائی (بھی اس ملک میں) آئے پھر وہ اسکے حضور میں حاضر (بھی) ہوئے اور اس نے انہیں دیکھتے ہی)

وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ

پہچان لیا۔ مگر وہ اسے نہ پہچان سکے ۵۵۹ اور جب اس نے انہیں ان کا سامان دیکر (واپسی کے لئے) تیار کیا تو

قرآن کریم میں ہے۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ یا اٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا (مفردات)

تفسیر:۔ یہاں بھی مکنّا فرمایا۔ اور پہلے بھی لیکن وہاں اس کے ساتھ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فرمایا تھا کہ ابھی ہم نے اس پر مصائب و مشکلات ڈال کر امتحان لینا ہے۔ اور یہاں نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ فرماکر بتایا ہے کہ ابتلاء کا زمانہ گذر گیا۔ اب ہم نے اسے ایسی عزت دی ہے۔ کہ اس کو کوئی تکلیف نہ ہوگی اور راحت پر راحت ہی رہے گی۔ وَلَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ جو شخص دُنیا میں محسن ہوتا ہے۔ اس کا اجر ضائع نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ (رعد ع ۲) لیکن خصوصًا محسن سے وہ شخص مراد ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا مقرب ہو۔ اور اس سے خاص تعلق رکھنے والا ہو۔ حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ احسان کیا ہے۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص خدا تعالےٰ کی عبادت پورے طور پر بجالائے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک شخص کے سوال پر کہ مَا الْاِحْسَانُ احسان کیا چیز ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاكَ۔ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب الایمان) محسن وہ ہے جو ایسے رنگ میں عبادت کرے۔ کہ گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر یہ مرتبہ اسے حاصل نہ ہو۔ تو کم سے کم اسے یہ نظر آئے کہ خدا تعالےٰ اسے دیکھ رہا ہے ✦

تمکّنا کے بھی دو مقام کے دو مختلف معنے۔ حضرت یوسفؑ کی طرح آنحضرتؐ بھی نکالے جانے کے بعد عزت پا گئے۔ محسن سے مراد خدا تعالےٰ کا مقرب ہے۔ آنحضرتؐ اور حضرت یوسفؑ میں فرق۔ اولیاء اور انبیاء ذلیل نہیں ہوتے۔ احسان کے معنے پورے طور پر عبادت بجالانے کے ہیں۔ دَخَل

آنحضرت صلعم کی حضرت یوسفؑ سے چودھویں مشابہت

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت یوسف علیہ السلام سے اس بارہ میں بھی مشابہت ہے جس طرح یوسف علیہ السلام کو انکے بھائیوں نے گھر سے اس حسد سے نکالا تھا کہ بڑا ہونے کی خوابیں دیکھتا ہے اسے یہاں سے نکال دیں تو یہ ذلیل ہو جائے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں نے بھی آپؐ کو اس نیت سے نکالا تھا لیکن جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو اس جگہ جہاں وہ جا کر بسے خدا تعالےٰ نے خاص عزت دی۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بجائے ذلت کے خاص عزت ملی۔ صرف فرق یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کی عزت نیابتی اور بادشاہ کی طرف سے تھی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے آزاد حکومت عطا فرمائی۔ اور خود بادشاہ بنادیا۔ اور یہی فرق ان دونوں وجودوں میں روحانیت کے لحاظ سے بھی تھا ✦

۵۵۸ تفسیر یعنی دُنیا میں بھی ہم انکو دیتے ہیں لیکن صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اولیاء و انبیاء ذلیل نہیں ہوتے۔ ہاں اصل اجر ان کا آخرت میں ہی ہے جو سب قسم کی نعمتوں سے بہتر ہے ✦

۵۵۹ حل لغات:۔ دَخَلَ الْبَیْتَ: ضِدُّ خَرَجَ دخل کے معنی ہیں۔ اندر آیا۔ دَخَلَ عَلٰی فُلَانٍ: زَارَهٗ۔ اس سے

ـــــــــ

۱؎ اور جو چیز لوگوں کو نفع دینے والی ہوتی ہے۔ وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے

قَالَ ائْتُوْنِیْ بِاَخٍ لَّکُمْ مِّنْ اَبِیْکُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ

(ان سے) کہا (کہ) تمہارے باپ کی طرف سے جو تمہارا ایک بھائی ہے (اسکے) اسے (بھی اپنے ساتھ) میرے پاس لانا کیا تم دیکھتے نہیں

۱۔(اقرب،) پس دَخَلُوْا عَلَیْہِ کے یہ معنے ہوئے کہ وہ اس کے پاس گئے یا وہ اس کے حضور حاضر ہوئے ۔

مُنْکِرُوْنَ۔ اَنْکَرَہٗ۔ جَھِلَہٗ۔ انکر کے معنے ہیں اسے نہ پہچانا۔ اس سے بے خبر رہا۔ اس سے اسم فاعل کا صیغہ مُنْکِرٌ بنتا ہے۔ اور منکرون اسکی جمع ہے۔ وَھُمْ لَہٗ مُنْکِرُوْنَ کے معنے ہوئے کہ وہ اسے نہ پہچان سکے ۔

تفسیر۔ مفسرین نے اس جگہ بہت بحث کی ہے کہ چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ڈاڑھی آگئی تھی۔ اور آپ موٹے ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کے بھائی انہیں نہ پہچان سکے۔ اگر ایسا ہی ہوا ہوتا۔ تو یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کا قرآن شریف میں ذکر کیا جاتا۔ میرے نزدیک اس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے شروع میں کہی تھی کہ یَخْلُ لَکُمْ وَجْہُ اَبِیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا مِنْ بَعْدِہٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ۔ ان کا خیال تھا کہ جب یوسفؑ باپ کے پاس نہ رہے گا تو ہماری عزت بڑھ جائے گی۔ سو اس آیت میں بتایا ہے کہ حضرت یوسفؑ تو اس جدائی کے سلسلہ میں اس قدر ترقی کر گئے۔ کہ ان کے بھائی انہیں پہچان ہی نہ سکے لیکن وہ ویسے کے ویسے ہی رہے ۔

آنحضرت صلعم کی حضرت یوسفؑ سے پندرھویں مشابہت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت یوسف علیہ السلام سے اس بات میں بھی مشابہت ہے کہ آپ کے بھائی بھی آپ کی ترقی کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے تھے۔ جب آپؐ نے بادشاہوں کو خطوط لکھے۔ اور اسی سلسلہ میں ایک خط روم کے بادشاہ ہرقل کو بھی لکھا۔ گو اس وقت ابوسفیان ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ ملک شام میں گیا ہوا تھا۔ ہرقل یہ خط پڑھ کر گھبرا گیا۔ اس نے پوچھا۔ یہ کون شخص ہے۔ جو اس جرأت سے مجھے خطاب کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ عرب کا ایک شخص ہے جو نبوت کا مدعی ہے۔ اس نے کہا۔ کہ ہمیں اس کے حالات دریافت کرنے چاہئیں۔ چنانچہ ابوسفیانؓ اور اس کے ہمراہیوں کو دربار میں حاضر کیا گیا۔ اور ہرقل نے یہ معلوم کر کے کہ ابوسفیان سب کا سردار ہے اس سے سوالات کرنے شروع کئے اور اس کے ساتھیوں کو کہا کہ اگر یہ جھوٹ بولے تو تم فوراً بتلا دینا۔ پھر اس نے ابوسفیان سے چند سوال کئے۔ جو آج تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے لئے ایک زبردست نشان کے طور پر قائم ہیں۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر اس طرح سے جرح کی ہے کہ دیکھ کر حیرت آتی ہے مثلاً اس نے پوچھا کہ اس کے باپ دادوں سے کوئی بادشاہ تھا۔ کیونکہ ایسا ہو تو سمجھا جائے گا کہ وہ گم شدہ حکومت و عزت کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ نہیں۔ اس نے پوچھا کیا وہ اس دعوے سے پہلے کبھی جھوٹ بولتا تھا۔ ابوسفیان نے کہا کہ نہیں پھر اس نے کہا کیا اس نے کبھی معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ ابوسفیانؓ نے کہا کہ نہیں مگر حال میں ہی اس کا ایک معاہدہ ہمارے ساتھ ہوا ہے معلوم نہیں وہ اس کے متعلق کیا کرے گا۔ ابوسفیانؓ کہتے ہیں کہ میں زیادہ سے زیادہ جو بات آپؐ کے خلاف کر سکا وہ یہی تھی۔ کیونکہ میں ڈرتا تھا کہ میرے ساتھی جھٹلا نہ دیں پھر اس نے پوچھا کہ اسے بڑے لوگ مانتے ہیں یا چھوٹے ابوسفیان نے کہا کہ چھوٹے۔ اسی طرح کی بہت سی باتیں ہوئیں اور آخر ہرقل نے کہا کہ اگر یہ باتیں صحیح ہیں۔ تو وہ ضرور اس علاقہ کا حاکم ہو جائے گا۔ جہاں میں اس وقت ہوں۔ کیونکہ پہلی کتب میں یہ پیشگوئی تھی کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم شام کو فتح کریں گے۔ اور شاہ روم اس وقت شام میں تھا۔ اس کے اس فقرہ سے درباریوں میں شور پڑ گیا۔ اور ابوسفیان گھبرا کر

(حاشیہ:) مُنْکِرُوْن — ہرقل کے ابوسفیانؓ سے سوالات — پہلا سوال — دوسرا سوال — تیسرا سوال — حضرت یوسفؑ کے بھائی انہیں انکی ترقی کے باعث نہ پہچان سکے۔ — چوتھا سوال — آنحضرتؐ کی حیرت انگیز ترقی۔ — آنحضرت صلعم کا ہرقل کے نام خط۔ — آنحضرتؐ کے متعلق پہلی کتب میں شام کو فتح کرنے کی پیشگوئی تھی۔

اَنِّیْٓ اُوْفِی الْکَیْلَ وَاَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ۝ فَاِنْ

کہ میں ماپ پورا دیتا ہوں اور (نیز) میں مہمان نوازوں میں سے بہترین (مہمان نواز) ہوں اور اگر

لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا کَیْلَ لَکُمْ عِنْدِیْ وَلَا

تم اسے میرے پاس نہ لائے تو میرے پاس تمہارے لئے کوئی (غلہ) بھی ماپ (کر دینے کے لئے) نہیں ہوگا

تَقْرَبُوْنِ ۝ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا

اور نہ تم میرے پاس آنا ۶۱ انہوں نے کہا ہم ضرور اس کے متعلق اس کے باپ کو پھسلانے کی کوشش کرینگے اور ہم یقیناً

باہر نکلا۔ اور نہایت تعجب سے کہا لَقَدْ اَمِرَ اَمْرُ ابْنِ اَبِی کَبْشَۃَ کہ ہم نے تو پہچانا ہی نہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت تو بہت بڑھ گئی ہے اور اس کا کام بہت ترقی کر گیا ہے (مکہ والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تحقیر کے طور پر ابن ابی کبشہ کہا کرتے تھے ابو کبشہ قبیلہ خزاعہ میں سے ایک شخص تھا جس نے بُت پرستی چھوڑ کر ستارہ پرستی شروع کر دی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابن ابی کبشہ کہنے سے مکہ والوں کی مراد یہ تھی کہ جس طرح ابو کبشہ نے آبائی دین کو چھوڑ دیا تھا اسی طرح محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے بھی آبائی دین کو چھوڑ دیا ہے اس لئے یہ گویا اس کا روحانی بیٹا ہے) غرض وہاں آ کر ان لوگوں کی آنکھیں کھلیں ورنہ مکہ میں وہ آپ کی حیثیت نہیں جانتے تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انکی حقیقت معلوم تھی +

ٹھ آنحضرتؐ کو ابن ابی کبشہ پکارنے کی وجہ

ٹا ثعلب امام لغت و دیگر محققین کا اختلاف

جُهِّزَهُمْ ۝ **حلِ لغات**۔ جَهَّزَهُمْ۔ جَهَّزَ الْقَوْمَ تَجْهِیْزًا۔ اِذَا تَکَلَّفَ لَهُمْ بِجَهَازِهِمْ لِلسَّفَرِ جَهَّزَ الْقَوْمَ کے معنے ہیں۔ جانے والوں کو پُر تکلف طور پر سامان دے کر رخصت کیا۔ تَجْهِیْزُ الْغَازِیْ، تَحْمِیْلُهٗ وَاِعْدَادُ مَا یَحْتَاجُ اِلَیْهِ فِیْ غَزْوِهٖ۔ جب غازی کے لئے تجہیز کا لفظ آئے تو اس کے معنے ہوتے ہیں۔ سپاہی کو سواری اور آلات جنگ وغیرہ دے کر میدان جنگ میں بھیجنا

جَهَاز وَالْجَهَازُ لِلْمَیِّتِ وَالْعَرُوْسِ وَالْمُسَافِرِ مَا یَحْتَاجُوْنَ اِلَیْهِ۔ اور جہاز اس سامان کو کہتے ہیں۔ جو دلہن یا مسافر کو رخصت کرتے وقت دیا جاتا ہے یا وہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ یا کفن جس میں میّت کو لپیٹ کر اسے دفن کیا جاتا ہے (تاج)

الکیل

اَلْکَیْلُ: کَالَ الطَّعَامَ کَیْلًا وَاکْتَالَهٗ بمعنے مکیل کال میں سے ہے۔ اور کَالَ اور اِکْتَالَ دونوں کے معنے ہیں۔ ماپا۔ اِکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ اَیْ مِنْهُمْ لِاَنْفُسِهِمْ وَقَالَ ثَعْلَبٌ مَعْنَاهُ مِنَ النَّاسِ یعنی آیت اِکْتَالُوا عَلَی النَّاسِ میں علیٰ کے معنے لینے کے اس وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ کہ وہ اس جگہ لینے کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ثعلب امام لغت کا یہی قول ہے۔ وَقَالَ غَیْرُهٗ اِکْتَلْتُ عَلَیْهِ اَخَذْتُ مِنْهُ اور باقی محققین لغت کہتے ہیں کہ یہ معنی علیٰ کی وجہ سے نہیں۔ اِکْتَالَ کے معنی ہی یہی ہیں۔ اور اس کا صلہ علیٰ ہوتا ہے۔ یُقَالُ کَالَ الْمُعْطِیْ وَاکْتَالَ الْاٰخِذُ۔ کَالَ کا لفظ ماپ کر دینے کے لئے مخصوص ہے۔ اور اکتال کا لفظ لینے کے لئے۔ کَالَهٗ طَعَامًا وَکَالَ لَهٗ بمعنٰی اور کال بغیر صلہ کے بھی متعدی ہوتا ہے۔ اور صلہ لام کے ساتھ بھی۔ اور دونوں صورتوں میں معنے ایک ہی ہوتے ہیں۔ یعنی ماپ کر دیا۔ وَالْکَیْلُ وَالْمِکْیَلُ مَا کِیْلَ بِهٖ حَدِیْدًا کَانَ اَوْ خَشَبًا اور کیل کے ایک معنے لفظ مِکْیَل کی طرح ماپنے کے آلہ کے بھی

لَفَاعِلُوْنَ ○ وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ

یقیناً (یہ کام) کر کے رہیں گے ۶۱ اور اس نے اپنے غلاموں سے کہہ دیا۔ کہ ان کی پونجی (واپس)

فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا

ان کے بوروں میں رکھ دو۔ شائد جب وہ لوٹ کر اپنے گھر والوں کے پاس جائیں

اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ فَلَمَّا رَجَعُوْٓا

تو ابن (احسان) کو مانیں (اور) شائد وہ (اسی سبب سے) پھر واپس آئیں ۶۲ پس جب وہ اپنے

ہیں خواہ لوہے کا ہو یا لکڑی کا۔ وَكَالَ الدَّ رَاهِمَ وَزَنَهَا سکون کے ساتھ یہ لفظ آئے تو اس کے معنے وزن کرنیکے ہوتے ہیں۔ كُلُّ مَا وُزِنَ فَقَدْ كِيلَ۔ وزن کرنے کا دوسرا نام کیل بھی ہے۔ اس لئے ہر تولنے کی چیز کے لئے وزن کی بجائے کیل کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے (تاج)

تفسیر۔ بائبل کہتی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے انہیں کہا۔ "اور اپنے چھوٹے بھائی کو میرے پاس لے آؤ۔ تب میں مانوں گا۔ کہ تم جاسوس نہیں بلکہ سچے ہو"۔ پیدائش ۴۲/۳۴ یعنی انہیں جاسوس قرار دیا گویا انہیں ڈرایا۔ لیکن اس کے بالمقابل قرآن شریف محبت کا پہلو پیش کرتا ہے یعنی حضرت یوسفؑ نے ان کے ساتھ ملاطفت کا سلوک کیا۔ جس سے ان کے دلوں میں آئندہ خود آنے اور بھائی کو لانے کی رغبت پیدا ہو۔ ممکن ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو پہچان کر حضرت یعقوبؑ اور دیگر خاندان کے افراد کے متعلق بہت سوالات کئے ہوں۔ اور اس طرح کرید کرید کر پوچھنے سے ان کے بھائیوں کو یہ شبہ پیدا ہو گیا ہو کہ حضرت یوسفؑ انہیں جاسوس سمجھ رہے ہیں۔ ورنہ ایک نبی کی شان سے یہ بہت بعید ہے کہ وہ انکو پہچانتا ہوا انہیں جاسوس قرار دے۔ یہ تو ایک قسم کا جھوٹ بن جاتا ہے پس میرے نزدیک بائبل نے بھائیوں کے خیال کو نقل کر دیا ہے۔ اور حقیقت بیان نہیں کی۔ اور یوں بھی بھائی کے نہ لانےکو جاسوسی کا ثبوت قرار دینا بہت بودی اور کچی دلیل ہے اور کوئی عقلمند ایسی بات نہیں کر سکتا۔ ◆

۶۱ حل لغات

سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ۔ سَنُرَاوِدُ رَاوَدَ سے مضارع متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں۔ ہم ضرور اس کے متعلق اس کے باپ کو پھسلانے کی کوشش کریں گے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھیں یوسف ۲۴

تفسیر۔ ایک گناہ کے نتیجہ میں دوسرا گناہ پیدا ہوتا ہے جب برادران یوسف نے گناہ کا طریق اختیار کیا۔ تو خیالات گناہ سے ملوث ہو گئے۔ اور اب ان کا طریق کلام بھی قابل اعتراض ہو گیا۔ وہ کس گستاخی سے کہتے ہیں۔ کہ ہم اس کے باپ کو ورغلا کر اسے لے آئیں گے۔ گویا ایک طرف اس کو اپنا باپ نہیں قرار دیتے اور دوسری طرف اسے بے وقوف بنانے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں ◆

۶۲ حل لغات

فِتْيَان۔ فِتْيَان جمع فتی کی ہے اس کے معنے جوان کے ہیں لیکن جب کسی کی طرف مضاف ہو تو اس کے معنے بیٹے یا نوکر کے ہوتے ہیں جیسے فَتَى زَيْدٍ زید کا بیٹا یا نوکر۔ اَلْبِضَاعَة۔ اَلْبِضَاعَةُ۔ طَائِفَةٌ مِنَ الْمَالِ تُعَدُّ لِلتِّجَارَةِ۔ بضاعۃ۔ اس مال کو کہتے ہیں جو تجارت کے لئے تیار کیا جائے (اقرب)

اَلرِّحَالُ۔ اَلرَّحْلُ اَيْضًا: مَرْكَبٌ لِلْبَعِيْرِ اَصْغَرُ مِنَ الْقَتَبِ۔ رِحَال رَحْل کی جمع ہے۔ اونٹ کے ہودج

بائبل یعنی حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کو جاسوس قرار دیکر

ایک گناہ کے نتیجہ میں دوسرا گناہ پیدا ہوتا ہے

قرآن شریف کا بائبل کے بیان سے اختلاف۔

بائبل کی غلطی کی وجہ۔

اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ

باپ کے پاس واپس گئے تو کہا (کہ) اے ہمارے باپ ہمیں (آئندہ کے لئے غلّہ) ماپ (کر دینے) سے محروم کر دیا گیا ہے

فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○

اس لئے (اب) ہمارے بھائی (بن یامین) کو (بھی) ہمارے ساتھ بھیج کہ ہم (پھر غلّہ) ماپ کر (کے) لے سکیں اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے ۵۶۳

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى

اس نے کہا (تم ہی بتاؤ) کیا (اب یوسف کو کھو بیٹھنے کے بعد بھی) میں اس کے متعلق تمہاری طرف سے مطمئن ہو سکتا ہوں سوائے اس کے کہ جس صورت میں

کو بھی کہتے ہیں۔ یہ قتب نامی ہودج سے چھوٹا ہوتا ہے مَاتَسْتَصْحِبُهٗ مِنَ الْاَثَاثِ۔ اسی طرح جو سامان مسافر ساتھ لے اسے بھی رحل کہتے ہیں۔ وَقَدْ يُطْلَقُ عَلَى الْوِعَاءِ كَالْعِدْلِ وَالْجِرَابِ اور بورے۔ تھیلے اور بیگ وغیرہ کی قسم کی چیزوں کو بھی جن میں سامان سفر بھرا جاتا ہے رحل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ (اقرب)

حضرت یوسف کا اپنے بھائیوں سے احسان۔

تفسیر۔ یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم ماتحت صبر کیا اور اس غیر معمولی رقت کو برداشت کیا جو قدرتاً بھائیوں کو دیکھ کر دل میں پیدا ہوئی تھی لیکن فطرتی محبت نے اس قدر احسان پر ضرور مجبور کر دیا۔ کہ چلتے وقت جو قیمت انہوں نے دی تھی واپس کر دی۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ انہوں نے شاہی مال میں خیانت کی وہ خود وزیر تھے۔ اور ایک قلیل رقم کا اپنی جیب سے ادا کر دینا ان کے لئے مشکل نہ تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے اس سلوک سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح محبت اور خوف کے بین بین سلوک سے ہوتی ہے پہلے ڈرایا تھا۔ اب روپیہ واپس دے کر دل میں امید بھی پیدا کر دی۔ تاکہ وہ ضرور واپس آئیں ✦

حضرت یوسفؑ کی طرح آنحضرت صلعم بھی اپنے بھائیوں سے ملنے کے لئے بیتاب تھے۔

اصلاح محبت اور خوف کے بین بین سلوک سے ہوتی ہے

لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَا۔ پہچان تو انہوں نے بہرحال لینا ہی تھا۔ کیونکہ ان کا اپنا مال تھا۔ مگر اس جگہ پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس حسنِ سلوک کی قدر کریں۔ کیونکہ ہیں خلانٌ لَا يَعْرِفُ الْاِحْسَانَ۔ وہ احسان کی قدر نہیں کرتا پس حضرت یوسف علیہ السلام کی مراد یہ ہے کہ وہ احسان کی قدر کریں۔ اور واپس آنے کی رغبت ان میں پیدا ہو ✦

دین کے احساس کی کمزوری کا نتیجہ

آنحضرت صلعم کی حضرت یوسفؑ سے سولھویں مشابہت

جیسا کہ ان آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے جذبۂ محبت کا ذکر کیا گیا ہے کہ باوجود بھائیوں کی مخالفت کے وہ اپنے بھائیوں کی ملاقات کے لئے بیقرار تھے۔ یہی حال آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ آپؐ کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ کیا تو اس غم میں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ اپنی جان کو ہلاک کر دے گا۔ غرض حضرت یوسفؑ کی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی باوجود اہل مکہ کی سخت عداوت کے ان کی ہلاکت کی خواہش کی جگہ یہ زبردست خواہش تھی کہ وہ ایمان لا کر آپؐ سے مل جائیں ✦

۵۶۳ تفسیر۔ خدا تعالیٰ کی قدرت ہے۔ اب تک برادرانِ یوسفؑ کو اپنی قوت و طاقت پر بھروسہ ہے۔ اور خدا تعالےٰ کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ حالانکہ اپنا ضعف ان پر ظاہر ہو چکا ہے۔ دین کا احساس کمزور ہو تو انسان کی یہی حالت ہوتی ہے۔ وہ سچے دل سے اپنے اندر کبر یا غرور محسوس کرتا ہے۔ یا پھر مایوس ہو جاتا ہے۔ درمیانی راہ جو توکّل کی

اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ

پہلے میں اسکے بھائی کے متعلق تمہاری طرف سے مطمئن ہوا تھا۔ اس لئے (میں اسے) اللہ (تعالیٰ) کی حفاظت میں چھوڑتا ہوں اور وہی (سب سے) بہتر حافظ ہے

الرّٰحِمِيْنَ ۝ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا

اور وہ سب رحم کرنیوالوں سے بڑھکر رحم کرنیوالا ہے ۶۴ؔ اور جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو انہوں نے دیکھا۔ کہ ان کی پونجی

بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ۭ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ۭ

ان کی طرف واپس کر دی گئی ہے (اسپر) انہوں نے (اپنے باپ سے) کہا۔ (کہ) اے ہمارے باپ (اس سے بڑھکر) ہم کیا چاہ سکتے ہیں (دیکھئے) یہ

هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَ

ہماری پونجی ہے اسے (بھی) ہماری طرف واپس کر دیا گیا ہے اور (اگر ہمارا بھائی ہمارے ساتھ جائے گا تو) ہم اپنے گھر والوں کو خوراک کا سامان لادینگے

نَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ۭ ذٰلِكَ كَيْلٌ

اور اپنے بھائی کی (ہر طرح سے) حفاظت کریں گے اور ایک بارِ شتر زیادہ لیں گے وہ (غلہ کا) وزن (جو ہم پہلے لائے ہیں)

يَّسِيْرٌ ۝ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ

تھوڑا ہے ۶۵ؔ اس نے کہا۔ میں اسے تمہارے ساتھ کبھی نہیں بھیجوں گا جب تک تم مجھ سے اللہ (تعالیٰ) کی طرف سے

ہے۔ جس میں نہ کبر ہوتا ہے نہ مایوسی۔ اس طرف نہیں آتا۔ برادرانِ یوسفؑ بھی ابھی اس مقام پر ہیں مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ میں مایوسی اور اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ میں اپنی طاقت کے گھمنڈ کا اظہار کرتے ہیں۔ مومن کو اس حالت سے بچنا چاہیئے ✦

۶۴ؔ حل لغات۔ اٰمَنُ ۔ اَمِنَ یامَن سے صیغہ واحد متکلم ہے امنہ کے معنے ہیں اس سے بے خوف ہو گیا۔ هَلْ اٰمَنُكُمْ کیا میں تم سے بے خوف و مطمئن ہو جاؤں عليه اس کے متعلق۔ علی اس جگہ متعلق کے معنے دیتا ہے ✦

تفسیر۔ حضرت یعقوبؑ نے انہیں توجہ دلائی کہ اب تو اللہ تعالیٰ کی حفاظت پر یقین کرو کہ دل کو گند سے اور ظاہر کو برے عمل سے وہی بچاتا ہے اور پہلے گناہوں کی بخشش بھی اسی کی طرف سے آتی ہے۔ اور وہ انہیں یہ بھی توجہ دلاتے ہیں کہ نہ میں نے پہلے تم پر یقین کر کے یوسف کو تمہارے ساتھ بھجوایا تھا۔ نہ اب اس کے بھائی کو تم پر اعتبار کر کے بھجواؤں گا۔ پہلے بھی میں نے اللہ کے حکم سے اور اس پر توکل کر کے یوسفؑ کو بھجوایا تھا اور اب بھی میرا اعتبار تم پر ویسا ہی ہو گا یعنی میں بھجوا تو دونگا لیکن تم پر اعتبار کر کے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت اور اسی پر توکل کر کے بھجواؤں گا ✦

هَلْ اٰمَنُكُمْ

۶۵ؔ حل لغات۔ متاع ۔ متاع ۔ عام ضروریات کی چیزوں کو کہتے ہیں۔ جیسے خوراک پوشاک گھر کے استعمال کا سامان آلات اور اجناس (اقرب) (مزید تشریح کے لئے دیکھیں یونس ۲۴ؔ و ہود ۵۷ؔ) ✦

بضاعة ۔ پونجی (دیکھو یوسف ۶۳ؔ) ✦

مَتَاع

اللہ تعالیٰ ہی دل کو گند سے اور ظاہر کو برے عمل سے بچاتا ہے۔

مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ

(مقررہ شدہ یعنی اسکی قسم سے موکد یہ) عہد نہ کرو۔ کہ تم اسے ضرور میرے پاس (واپس) لاؤ گے سوائے اس (صورت) کے کہ تم (خود کسی مصیبت میں)

فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝

گھر جاؤ۔ پس جب انہوں نے اسے اپنا پختہ قول دے دیا تو اس نے کہا جو (کچھ) ہم (اس وقت) کہہ رہے ہیں۔ اللہ اس کا نگران ہے ۶۶

نَمِيْرُ۔ مَارَ فُلَانٌ عِيَالَهٗ۔ اَتَاهُمْ بِمِيْرَةٍ مَلَاَ کے معنے ہیں اپنے اہل کو غلہ لا دیا۔ پس نمیر کے معنے ہوئے اپنے اہل کو غلہ لا کر دیں گے۔ (اقرب) +

بائبل اور قرآن مجید کے بیان میں اختلاف

تفسیر۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے علاوہ خریدے ہوئے غلہ کے اپنے بھائیوں کو راستہ کے خرچ کے لئے کچھ زاید غلہ دے دیا تھا۔ گو واضح الفاظ میں یہ بات بیان نہیں ہوئی۔ لیکن اونٹ کے بوجھ برابر غلہ لانیکے الفاظ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اونٹوں پر سفر کیا تھا لیکن بائبل کہتی ہے کہ انہوں نے گدھوں پر سفر کیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے۔ "اور اس شخص نے ان مردوں کو یوسفؑ کے گھر میں لاکر پانی دیا کہ پاؤں دھوئیں اور ان کے گدھوں کو دانہ گھاس دیا۔" (پیدایش ۴۳/۲۴) قرآن مجید میں اور موقع پر بھی جہاں صواع کی تلاش کا ذکر ہے۔ اونٹ کا ہی ذکر آیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ کہ صَوَاعَ الْمَلِكِ لانے والے کو ایک اونٹ کے بوجھ برابر غلہ دیا جائے گا۔ یہ ایک بہت بڑا اختلاف ہے۔ اور قرآن کریم کی تفسیر کرتے وقت ہمارا فرض ہے کہ ہم ان اختلافات پر بھی جہاں تک ہو سکے۔ روشنی ڈالیں کیونکہ گو ایمانی طور پر تو ہم قرآنی بیان کو مقدم مانتے ہیں۔ لیکن اہل کتاب کو سمجھانے کے لئے ہمارے پاس زائد دلیلیں ہونی چاہئیں میرے نزدیک اس اختلاف کا فیصلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ حضرت یعقوب اور ان کا گھرانہ کس سواری پر عام طور پر سواری کیا کرتا تھا۔ جو سواری دوسرے حوالجات سے ثابت ہو تاریخی طور پر اس سفر میں بھی اسی کو ترجیح دی جائے گی +

بائبل کا بیان کہ برادران یوسفؑ نے گدھوں پر سفر کیا۔

قرآن مجید کا بیان کہ برادران یوسفؑ نے اونٹوں پر سفر کیا

بائبل اور قرآن مجید کے بیانات میں تطبیق

اختلاف کا فیصلہ

بائبل میں حضرت یعقوبؑ کے ایک اور سفر کا ذکر ہے یعنی جبکہ وہ اپنی بیویوں کو اپنے سسرال کے ہاں سے لے کر واپس آئے ہیں اس سفر کے متعلق بائبل میں لکھا ہے:-

"تب یعقوبؑ نے اُٹھ کے اپنے بیٹوں اور اپنی جوروؤں کو اونٹوں پر بٹھایا۔" (پیدایش ۳۱/۱۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب اور ان کے گھرانے کو اونٹ پر سفر کرنے کی عادت تھی۔ پس بائبل کے اس ثبوت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور اس راستہ کی نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے جس میں اونٹ کا سفر گدھے کے سفر سے زیادہ آرام دہ رہتا ہے۔ ہمیں عقلاً بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے اونٹوں پر ہی سفر کیا ہوگا +

لیکن یہ تشریح اس امر کو فرض کر کے ہے کہ قرآن کریم سے اونٹوں پر سفر ثابت ہے۔ جو لوگ اس استدلال کو قوی نہ سمجھتے ہوں۔ وہ یوں اس مشکل کو حل کر سکتے ہیں کہ قرآن مجید کے الفاظ میں یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ اونٹوں پر سوار تھے حمل بعیر سے اونٹ کے اُٹھانے کے قابل وزن مراد ہے۔ آگے خواہ وہ اس کو گدھوں پر لادیں۔ اس صورت میں دونوں حوالوں میں کوئی اختلاف نہیں رہتا +

یُحاط بکم

۶۶ حل لغات۔ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ۔ اُحِيْطَ بِهٖ دَنَا هَلَاكُهٗ وَفِي الْقُرْاٰنِ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ:۔ اُحِيْطَ بِهٖ کے معنے ہیں۔ ہلاکت کے منہ میں آگیا۔ ہر طرف سے تباہی کے منہ میں گھر گیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے (اقرب) +

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ

اور اس نے (ان سے) کہا (کہ) اے میرے بیٹو (وہاں) تم (سب) ایک ہی دروازے سے اندر نہ جانا

ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ

اور (جب حاکم کے پاس جانا پڑے) الگ الگ دروازوں سے اندر جانا اور میں اللہ (تعالیٰ کی گرفت) سے (بچانے کے

مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ

لئے) کچھ بھی تمہارے کام نہیں آ سکتا۔ فیصلہ کرنا (دراصل) اللہ (تعالیٰ) ہی کا کام ہے۔ اُسی پر

تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ○

میں نے بھروسہ کیا ہے اور تمام بھروسہ کرنے والوں کو اُسی پر بھروسہ کرنا چاہیئے ۶۷؎

الموثق والمیثاق۔ العَهْدُ۔ عہد۔ اقرار۔ (اقرب)

وکیل۔ نگران۔ (مزید تشریح کے لئے دیکھو یونس ۱۰۵؎)

تفسیر۔ اس جگہ بن یامین کے ساتھ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مشابہت ہوگئی ہے۔ جب مدینہ والے لوگ آپؐ کو لینے کے لئے آئے۔ تو آپؐ کی طرف سے حضرت عباسؓ نے ان سے معاہدہ کیا کہ تم لوگ اپنی جان اور مال سے آپؐ کی حفاظت کروگے انہوں نے یہ اقرار کیا تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ مدینہ تشریف لے گئے۔

بائبل میں لکھا ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ نے عہد کا مطالبہ کیا تو روبن نے جو سب لڑکوں سے عمر میں بڑا تھا۔ کہا کہ میرے دو بیٹے ہیں۔ تو ان کو اپنے پاس رکھ لے۔ اگر میں بن یامین کو نہ لے آؤں۔ تو ان کو قتل کر دیجیو۔ مگر حضرت یعقوبؑ نے اسکی بات کو رد کر دیا۔ اور اس کے کہنے پر بن یامین کو نہ بھیجا۔ (پیدائش ۴۲/۳۷) لیکن جب یہودا نے اپنے باپ کے نزدیک آکر قسم کھائی۔ اور سب کی طرف سے معاہدہ کیا۔ تو حضرت یعقوبؑ نے اس کی بات مان لی (پیدائش باب ۴۳ آیت ۸ تا ۱۴) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی لحاظ سے وہی سب سے بڑا سمجھا جاتا تھا۔ یہ حوالہ اسی سورۃ کی ایک اگلی آیت کا مضمون سمجھنے میں کار آمد ہوگا۔

آنحضرتؐ کی بن یامین سے ایک مشابہت

۶۷؎ حل لغات۔ اَلْحُكْمُ۔ حَكَمَ بِالْاَمْرِ حُكْمًا وحُكُوْمَةً۔ حُكْم حَكَمَ يَحْكُمُ کا مصدر ہے اور حَكَمَ کے معنے ہیں قَضٰی اس نے فیصلہ کیا۔ والحُكْمُ۔ القضاء۔ اور حکم کے معنی ہیں فیصلہ کرنا (اقرب)

الحکم

حَكَمَ۔ اصلہ مَنَعَ مَنْعًا لِلْاِصْلَاحِ۔ حَكَمَ کے اصل معنی صلاح کی خاطر کسی کام سے روکنے کے ہیں۔ اور اسی وجہ سے جانور کی لگام کو حَكَمَةٌ کہتے ہیں۔ اَلْحُكْمُ بِالشَّيْءِ اَنْ تَقْضِيَ بِاَنَّهٗ كَذَا اَوْلَيْسَ كَذَا سَوَاءٌ اَلْزَمْتَ غَيْرَكَ اَوْلَمْ تُلْزِمْهُ اور حکم کے معنی ہیں۔ کہ کسی امر کے متعلق یہ فیصلہ کیا جائے کہ وہ اس طرح ہے یا اس اس طرح نہیں۔ خواہ وہ بات دوسرے پر واجب کی جائے یا نہ (مفردات)

تَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ:۔ اِسْتَسْلَمَ اِلَيْهِ وَاعْتَمَدَ وَوَثِقَ بِهٖ۔ توکل علی اللہ کے معنی ہیں کہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا اور اسی پر بھروسہ و اعتماد کیا۔ (اقرب)

توکل علی اللہ

تفسیر۔ چونکہ انہوں نے مصر کے حالات نہایت ڈر ڈر کر بیان کئے تھے اور یہ کہا تھا۔ کہ ہمیں وہاں جاسوس سمجھا گیا تھا اس لئے حضرت یعقوبؑ نے یہ نصیحت کی۔ کہ علیحدہ علیحدہ داخل ہونا۔ اکٹھے ایک جتھے کی صورت میں داخل نہ ہونا۔ تاکہ لوگوں کو غیرملکی

برادران یوسفؑ میں سے یہودا دینی لحاظ سے بڑا سمجھا جاتا تھا

حضرت یعقوبؑ کی اپنے بیٹوں کو علیحدہ علیحدہ داخل ہونے کی نصیحت۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ۭ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ۭ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ع ۲

اور جب اس طریق کے مطابق جس کا حکم ان کے باپ نے انہیں دیا تھا۔ وہ داخل ہوئے۔ تو (وہ غرض) پوری ہو گئی جس کے لئے انہیں یہ حکم دیا گیا تھا لیکن) وہ اللہ (کی گرفت) سے (بچانے کے لئے) انکے کچھ بھی کام نہیں آسکتا تھا۔ ہاں مگر یعقوبؑ کے دل میں ایک خواہش تھی جسے اس نے (اس طرح) پورا کر لیا۔ اور اس وجہ سے کہ اسے ہم نے علم بخشا تھا۔ وہ بڑے علم والا تھا۔ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔ ۵۶۸

سمجھ کر شبہ کا موقع نہ ملے مگر انہوں نے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ہاں اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی آفت مقدر ہے تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ یوسفؑ کے پاس جاتے ہوئے الگ الگ دروازوں سے جانا۔ اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ انہیں الہاماً حالات معلوم ہو گئے تھے۔ اور وہ چاہتے تھے کہ ان بیامین کو یوسفؑ سے الگ ملنے کا موقعہ ملجائے۔ تاکہ وہ انہیں گھر کے حالات سے مطلع کر دیں ؛

حضرت یعقوب کو یوسفؑ کے زندہ ہونے کا علم تھا۔

حضرت یعقوبؑ کو الہاماً حالات معلوم ہو گئے تھے۔

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ میرا اصل یقین خدا کی ذات پر ہے نہ اپنی تدبیر پر۔ اور اپنے لڑکوں کو جو ہمیشہ اپنی تدابیر پر بھروسہ کرتے تھے۔ سبق دیا ہے۔ کہ جب خدا تعالیٰ کے نبی جو عقلاً بھی دنیا سے ممتاز ہوتے ہیں۔ الٰہی نصرت کو ہی اصل چیز تصور کرتے ہیں۔ تو دوسرے کیوں ایسا نہ کریں۔

علیہ توکلت کا مطلب۔

وانہ لذو علم میں علم سے مراد توکل ہے۔

توکل کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان تدبیر نہ کرے بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ باوجود تدبیر کے خدا تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرے اور یقین رکھے کہ تدبیر بھی تبھی نفع دیتی ہے۔ جب خدا تعالیٰ کی نصرت ساتھ ہو ؛

علیحدہ علیحدہ داخل ہونیکی نصیحت نظر لگ جانے کے خوف سے نہ تھی۔

۵۶۸ حل لغات ۔ اَلْحَاجَةُ ۔ اَلسُّؤْلُ ۔ حاجت کے معنی ہیں مطلوب۔ خواہش (اقرب)

اَلْحَاجَةُ

تفسیر۔ گو حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ بتایا گیا تھا۔ کہ یوسفؑ زندہ ہیں لیکن انہیں قطعی طور پر اس کا علم نہ تھا کہ مصر کے غلہ بانٹنے والے وزیر وہی ہیں۔ پس اپنے بیٹوں کے اس خوف سے متاثر ہو کر کہ مصری ہمیں جاسوس سمجھتے تھے۔ بیٹوں کو یہ تجویز بتائی تھی ؛

چونکہ حضرت یوسفؑ نے پہلی دفعہ ان پر بہت سے ایسے سوال کئے تھے۔ جن سے انہیں شبہ پیدا ہوا کہ شائد یوسف ہمیں جاسوس سمجھتے ہیں۔ اور وہی باتیں انہوں نے حضرت یعقوبؑ کو بتائیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے ان کے شبہ کی وجہ سے احتیاطاً ہدایت کی۔ کہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔

وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ ۔ میں علم سے مراد توکل ہے۔ جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اور یہی وہ معرفت اور علم تھا جو اُن کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملا تھا یعنی انہوں نے تدبیر بھی کر لی۔ مگر توکل پھر بھی خدا پر ہی رکھا بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ کو نظر لگ جانے کا خوف تھا۔ اس تدبیر سے انہوں نے اس کو دور کر لیا۔ لیکن یہ معقول نہیں۔ ایک بھائی کے بڑھ جانے سے نظر لگ جانے کا خطرہ کس طرح پیدا ہو گیا تھا پہلے بھی تو دس بھائی اکٹھے گئے تھے۔ ممکن تو کیوں یہ تدبیر نہ کی۔ پس اصل بات یہی ہے کہ جب مصر سے واپسی پر

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْٓ

اور جب وہ یوسف کے حضور حاضر ہوئے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی۔ اور (اس سے) کہا (کہ) یقیناً

اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

میں ہی تیرا (مفقود) بھائی ہوں۔ پس جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کی وجہ سے (اب) تو غمگین نہ ہو۔ ۵۶۹

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ

پھر جب اس نے انہیں ان کا سامان دے کر (واپسی کے لئے) تیار کیا تو اس نے (پانی پینے کا ایک) کٹورا (بھی)

رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ

اپنے بھائی کے بورے میں رکھ دیا پھر (ایسا ہوا کہ) کسی اعلان کرنے والے (شاہی کارندہ) نے اعلان کیا (کہ) اے

لَسَارِقُوْنَ ○ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ○

قافلہ والو تم یقیناً چور ہو۔ ۵۷۰ انہوں نے ان (شاہی کارندوں) کی طرف رُخ کر کے کہا (کہ) تم کیا چیز گم پاتے ہو۔

برادران یوسفؑ نے جاسوسی کے احتمال کو پیش کیا۔ تو حضرت یعقوبؑ نے ان کو مزید احتیاط برتنے کا مشورہ دیا +

یا جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے۔ انہیں چونکہ الہام سے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ حاکم جو غلہ دیتا ہے۔ یوسفؑ ہے۔ انہوں نے الگ الگ ملنے کا حکم دیا۔ تاکہ بن یامین یوسفؑ سے علیحدگی میں مل سکیں +

۵۶۹ حل لغات۔ اٰوٰٓى اِلَيْهِ۔ اٰوَيْتُهٗ : اَنْزَلْتُهٗ اٰوَيْتُهٗ کے معنے ہیں میں نے اسے اپنے پاس اُتارا۔ اپنے ہاں ٹھہرایا وَمِنْهُ اَللّٰهُمَّ اٰوِنِيْٓ اِلٰى ظِلِّ كَرَمِكَ وَعَفْوِكَ۔ انہی معنوں میں اس دعا میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے کہ اے اللہ مجھے اپنے کرم اور عفو کے سایہ میں جگہ دے (اقرب) (نیز دیکھو ہود ۵۲۳)

لَا تَبْتَئِسْ۔ اِبْتَاَسَ بِهٖ۔ اِكْتَئَبَ وَاسْتَكَانَ غمگین اور دل شکستہ ہوا۔ اور لَا تَبْتَئِسْ کے معنے ہیں۔ لَا تَحْزَنْ وَلَا تَشْتَكِ۔ نہ غم کر اور نہ شکایت (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو ہود ۵۳۶

تفسیر۔ اگر تو یہ سمجھا جائے کہ بھائی کو کوئی علم حقیقت کا نہ تھا تو لَا تَبْتَئِسْ کا ایک تو یہ مطلب لیا جائے گا کہ تجھے جو خیال تھا کہ میں مر گیا ہوا ہوں۔ اور اس کا تجھے غم تھا۔ اب تو اس غم کو دور کر دے کیونکہ میں زندہ موجود ہوں۔ لیکن اگر یہ معنے کئے جائیں کہ بن یامین کو حضرت یعقوبؑ نے اطلاع دے دی تھی۔ تو پھر اس کا یہ مفہوم ہوگا کہ جو تکالیف وہ تجھ کو دیتے رہے ہیں۔ اب خدا تعالیٰ اس سے تجھے نجات دینے والا ہے +

۵۷۰ حل لغات۔ جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ۔ اس نے انہیں ان کا سامان دے کر تیار کیا (مزید تشریح کے لئے دیکھو یوسف ۵۶۰)۔

اَلسِّقَايَةُ۔ اَلْاِنَاءُ يُسْتَقٰى بِهٖ۔ سقایۃ کے معنی ہیں پانی پینے کا برتن۔ جیسے کٹورا۔ پیالہ وغیرہ (اقرب)

اَلْعِيْرُ۔ قَافِلَةُ الْحَمِيْرِ ثُمَّ كَثُرَتْ حَتّٰى سُمِّيَتْ بِهَا كُلُّ قَافِلَةٍ۔ عیر کے اصل معنے تو گدھوں پر مال لاد کر سفر کرنے والے قافلہ کے ہیں لیکن کثرت استعمال کے ماتحت ہر ایک قافلہ کو عِیْر کہا جاتا ہے (اقرب)

العیر۔ اَلْقَوْمُ الَّذِيْنَ مَعَهُمْ اَحْمَالُ الْمِيْرَةِ غلہ لیے

حضرت یعقوبؑ نے علیحدہ علیحدہ داخل ہونے کی نصیحت اس لئے کی تا بن یامین حضرت یوسفؑ کو مل سکیں۔

اٰوٰى اِلَيْهِ۔

جَهَّزَهُمْ۔

السقایۃ

لَا تَبْتَئِسْ۔

العیر

لَا تَبْتَئِسْ کے دو معنے۔

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ

انہوں نے کہا (کہ) ہم غلہ ماپنے کا شاہی پیمانہ گم پاتے ہیں۔ اور جو شخص اسے (تلاش کر کے) لے آئے تو ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر (غلہ)

بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ۝ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ

اس کا (انعام) ہو گا۔ اور (اعلان کرنیوالے نے یہ بھی کہا کہ) میں اس کا ذمہ وار ہوں ۷۲ انہوں نے کہا (کہ) اللہ (تعالیٰ) کی قسم (جیسا کہ) تمہیں یقیناً علم ہو چکا

والاقافلہ (مفردات) +

الرَّحْلُ:۔ بورا (مزید تشریح کے لئے دیکھو یوسف ۶۳ع)

جَعَلَ السِّقَايَةَ کے دو معنے

تفسیر۔ جعل السقایة کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔

۱۔ جان بوجھ کر پیالہ رکھ دیا۔ اور یہ محبت کے جذبہ کی وجہ سے تھا۔ کہ تا راستہ میں پیاس کے وقت اس میں پانی پئے۔

ملک کے لفظ کا استعمال حضرت یوسفؑ کیلئے خوشامدانہ ہے۔

۲۔ بھول کر رکھ دیا۔ اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ اپنے بھائی سے باتیں کرتے ہوئے پانی منگایا۔ اور پینے کے بعد وہیں بھول کر پیالہ رکھ دیا +

گمشدہ پیالہ قیمتی تھا

۷۲ حل لغات۔ اَقْبَلَ عَلَيْهِ۔ نَقِيْضُ اَدْبَرَ

اقبل علیہ کے معنی ہیں۔ اس کی طرف رُخ کیا۔ (اقرب)

اَلْاِقْبَالُ۔ التَّوَجُّهُ نَحْوَ الْقُبُلِ۔ سامنے آنا۔ رُخ کرنا۔ (مفردات)

قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ کے معنے ہوئے کہ انہوں نے ان کی طرف رُخ کر کے کہا +

صُوَاع

صُوَاعُ۔ اَلْمِكْيَالُ الَّذِيْ يُكَالُ بِهٖ۔ صُواع۔ غلہ ماپنے کا ایک خاص پیمانہ ہوتا ہے۔ اَلْجَامُ الَّذِيْ يُشْرَبُ فِيْهِ۔ پانی پینے کے جام کو بھی صواع کہتے ہیں۔ (اقرب) اَلزَّعِيْمُ اَلْكَفِيْلُ ذعیم کے معنے ضامن اور ذمہ وار کے ہیں (اقرب)

حضرت یوسف پر چوری کے الزام کی تردید۔

تفسیر۔ اس جگہ اختلاف ہوا ہے۔ بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے وہ برتن جان بوجھ کر بھائی کے اسباب میں رکھ دیا۔ اس کے بعد کہا کہ تم چور ہو۔ یہ یوسف علیہ السلام پر افترا ہے۔ ایک طرف تو بھائی کے ساتھ اتنی محبت دوسری طرف چند دن کی صحبت کی غرض سے اس کے اسباب میں۔ برتن رکھ کر اس پر چوری کا الزام لگانا اور ساری عمر کے لئے اسے داغ دار کر دینا۔ نہ صرف یوسف علیہ السلام کو جھوٹ کا بلکہ ظلم کا مرتکب بناتا ہے۔ اور یہ کام نبی تو کیا ایک معمولی شریف آدمی بھی نہیں کر سکتا +

دراصل یہ قصور بائبل کا ہے جس نے یہ قصہ پیش کیا۔ اور ہمارے مفسروں نے سادہ لوحی سے اسے نقل کر دیا۔

ملک کا لفظ یا تو حضرت یوسفؑ کے لئے خوشامدانہ رنگ میں استعمال کیا ہے جیسے غربا بڑے لوگوں کو بادشاہ کہہ کر پکارتے ہیں۔ یا پھر سرکاری کام کے وقت سرکاری برتن استعمال کئے جاتے ہوں گے اور انہیں بادشاہ کا برتن کہنا بالکل درست ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیالہ قیمتی تھا۔ تبھی اس کے ڈھونڈنے والے کے لئے ایک اونٹ کا بوجھ انعام رکھا ہے۔ اتنا انعام چاندی سونے کے برتن کے لئے ہی رکھا جا سکتا ہے +

یہ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کہ چاندی سونے کے برتن استعمال کرنے تو منع ہیں کیونکہ یہ اسلامی حکم ہے۔ یہود میں ایسی ممانعت نہیں۔ نہ فراعنۂ مصر اس کو بُرا سمجھتے تھے +

یہ سوال کہ یوسف علیہ السلام نے بھائی کے اسباب میں کیا چیز اور کس ارادہ سے رکھی۔ اور پھر چوری کا الزام ان پر کس طرح لگا۔ لوگوں کے لئے ہمیشہ زیر بحث رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے اوپر بتایا ہے یہود کا یہ خیال ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جا کر ایک برتن رکھ دیا۔ پھر چوری کا الزام لگا کر ان کو اپنے پاس رکھ لیا۔ لیکن یہ اتنا بڑا ظلم ہے کہ نبی کی طرف اس کا منسوب کرنا کفر ہے +

میرے نزدیک اس مشکل کا حل خود قرآن کریم سے ہی ہو جاتا ہے قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک پانی پینے کا برتن خود اپنے ہاتھ سے اپنے بھائی کے اسباب میں رکھا تھا۔ پھر اس میں یہ بھی ہے کہ ایک صواع یعنی ماپنے کا برتن بھی گم ہو گیا

مَا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ ○

ہم (یہاں) اس لئے نہیں آئے۔ کہ اس ملک میں فساد کریں۔ اور نہ (ہی) ہم چور ہیں

قَالُوا فَمَا جَزَآؤُهٗ إِنْ كُنْتُمْ كَاذِبِينَ ○ قَالُوا

انہوں نے کہا (کہ) اگر تم جھوٹے (ثابت) ہوئے تو اس (فعل یعنی چوری) کی سزا کیا ہوگی انہوں نے کہا

جَزَآؤُهٗ مَنْ وُجِدَ فِي رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ط

(کہ) اس کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کے سامان میں وہ (کٹورا) پایا جاوے وہ (خود ہی اس (فعل) کا بدلہ ہو

كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِينَ ○ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ

ہم (لوگ) ظالموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں ۵۲ پس اس نے اس کے (یعنی یوسف کے) بھائی کے

قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ

بورے سے پہلے ان (دوسروں) کے بوروں کو (دیکھنا) شروع کیا۔ پھر اس کے بھائی کے بورے (کو دیکھا

اَخِيهِ ط كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۰ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ

اور اس میں اس پیالہ کو پاکر اس) میں سے اسے نکالا۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لئے (ایک) تدبیر کی (ورنہ) وہ

جونکہ شخص پر حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی کے اسباب میں سے نکلا برتن کا بھائی کے اسباب میں رکھنا کوئی ایسا واقع نہ تھا کہ جسے قرآن کریم ذکر کرتا جب تک اس میں کوئی غرض نہ ہوتی اور وہ غرض یہی معلوم ہوتی ہے کہ پینے کا برتن بغیر بھائی کو علم دینے کے حضرت یوسف علیہ السلام نے رکھ دیا۔ تا اس طرح اپنی محبت کا اظہار کریں۔ اس برتن کے رکھتے ہوئے ماپنے کا سرکاری برتن جو غالباً اس وقت ان کے ہاتھ میں تھا بھول کر ساتھ ہی رکھا گیا۔ جب وہ برتن نہ ملا تو نوکروں نے اسے چوری قرار دیکر تلاشی لینی شروع کی سب قافلے کے ساتھ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی بھی تلاشی لینی ضروری تھی۔ مگر حضرت یوسف کی مہربانی کو دیکھو اعلان کرنے والے نے بن یامین کی تلاشی بعد میں لی۔ اور علاوہ اس پیالے کے جو حضرت یوسف علیہ السلام نے خود رکھا تھا۔ ماپنے کا برتن بھی اسباب میں سے نکل آیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام فوراً سمجھ گئے کہ کیا غلطی ہوئی ہے لیکن انہوں نے اس واقعہ میں الٰہی تدبیر دیکھ کر اس وقت تک خاموشی رکھی۔ جب تک بھائیوں کا قافلہ چلا نہیں گیا۔ اور اس طرح ان کا بھائی ان کے پاس ہی رہ گیا +

بن یامین کو حضرت یوسف پاس رکھنے کی الٰہی تدبیر

۵۲ تفسیر یہ خدا تعالیٰ کی تدبیر تھی کہ بھائیوں نے جوش میں آکر کہہ دیا کہ جس کے اسباب میں سے پیالہ نکلے۔ اسی کو اپنے پاس رکھ لینا۔ ان کے منہ سے یہ نہ نکلا کہ جس نے چوری کی ہو۔ اگر وہ یہ کہتے۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کو شائد نہ رکھ سکتے کیونکہ بس سے اس پر حتمی طور پر چوری کا الزام لگتا ہے لیکن چونکہ انہوں نے لفظ ہی یہ کہے کہ جس کے اسباب میں سے پیالہ نکلے۔ اسے رکھ لینا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو بغیر چوری کا الزام لگانے کے بھائی کو پاس رکھنے کا موقع مل گیا +

حضرت یوسف نے پانی پینے کا برتن اپنا محبت کے اظہار کے لئے بھائی کے سامان میں رکھا تھا

اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ نَرْفَعُ

بادشاہ کے قانون کے اندر (رہتے ہوئے) اپنے بھائی کو روک (کر اپنے پاس) نہیں (رکھ) سکتا تھا۔ سوائے اس (صورت) کے کہ اللہ (تعالیٰ)

دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۭ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ○

کی (یہی) مشیت ہوتی۔ ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کرتے ہیں۔ اور ہر علم والے کے اوپر (اس سے) زیادہ علم والا (شخص پایا جاتا) ہے ۷۷ؐ

۷۷ؐ حل لغات

بَدَاَ بدات بالشئ کے معنے ہیں۔ اِبْتَدَأْتُ بِهٖ سے شروع کیا بَدَاَ بِفُلَانٍ۔ قَدَّمَهٗ۔ اسے پہلے رکھا۔ اور

قَدَّمَهٗ بَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ کے معنے ہونگے۔ پہلے ان دوسروں کے بوروں کو دیکھنا شروع کیا۔ (اقرب) (مزید تشریح کے لئے دیکھو یونس ۸۸ ؏)

بن یامین کی تلاشی سب کے آخر میں انکے ادب کی وجہ سے لی۔

اَلْوِعَاءُ اَلْوِعَاءُ۔ الظَّرْفُ يُوْعٰى فِيْهِ الشَّيْءُ۔ وعاء ایسی چیز کو کہتے ہیں جس میں سامان کو محفوظ کر کے رکھا جائے۔ اس کی جمع اَوْعِيَةٌ ہے (اقرب)

کِدْنَا لِيُوْسُفَ سے معلوم ہوتا ہے کہ بن یامین کو حضرت یوسف کے پاس رکھنے کی تدبیر خدا کی طرف سے تھی۔

كَادَ لَهٗ۔ اِحْتَالَ لَهٗ۔ جب کاد کا صلہ لام آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں۔ اس کے حق میں تدبیر کی۔ اور کِدْنَا لِيُوْسُفَ کے معنے ہوئے ہم نے یوسف کے لئے تدبیر کی (اقرب)

يَاْخُذَ يَاْخُذُ۔ اَخَذَ میں سے ہے۔ جس کے معنے ہیں حَبَسَهٗ۔ اسے روک لیا۔ (اقرب)

اَلدِّيْن الدينُ:۔ دَانَ دِيْنًا۔ اطاعَ۔ دان جس کا مصدر دین ہے۔ اس کے معنے ہیں۔ اطاعت کی۔ فلانًا خدمہٗ خدمت کی۔ خدمت اولکی حَكَمَ عليه۔ حکم لگایا۔ فیصلہ کیا۔ الدِّيْنُ۔ الطاعةُ دین کے معنی ہیں۔ فرمانبرداری۔ اَلْقَضَاءُ۔ فیصلہ (اقرب) واستُعِيْرَ لِلشَّرِيْعَةِ۔ اور یہ لفظ بالواسطہ شریعت یا قانون کے معنے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (مفردات)

مَاكَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ میں فِی کے معنے سبب کے ہیں

بَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ میں تلاشی لینے والا اعلان کرنے والا ہی تھا۔

تفسیر بَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ میں تلاشی لینے والا وہی شخص معلوم ہوتا ہے جس نے اعلان کیا تھا۔ نہ کہ حضرت یوسفؑ اور قبل وعاء اخیہ سے مُراد حضرت یوسفؑ کے بھائی سے ہے چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر پاس ہی گزرا ہے اس طرح ضمیر کو پھیرا جاسکتا تھا +

اس تلاشی لینے والے نے بن یامین کی تلاشی سب سے آخر اس لئے نہیں لی۔ کہ وہ جانتا تھا کہ آخر میں ان کے اسباب سے پیالہ نکلے گا بلکہ اس لئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی ان پر مہربانی دیکھ کر وہ طبعًا ان کا ادب کرنا چاہتا تھا اور ان پر گمان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہ ان کے اسباب میں سے پیالہ نکلے گا +

کِدْنَا لِيُوْسُفَ سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ تدبیر کی تھی پھر تعجب ہے کہ مفسرین یوسف علیہ السلام پر ہی الزام دھرتے چلے جاتے ہیں۔ حق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سامان پیدا کر دیا کہ یوسف علیہ السلام نے بھول کر برتن رکھ دیا بھائیوں کے منہ سے نکل گیا کہ جس کے اسباب میں برتن نکلے اسے پکڑ لینا اور اس طرح وہ بھائی کو پیچھے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ انکے جانے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے اصل حقیقت ظاہر کر دی ہوگی۔ اور بن یامین کی برأت لوگوں کی نظر میں ہو گئی ہوگی۔ پس یہ سب ایک الٰہی تصرف کے ماتحت ہوا بھائیوں کو شور کرنے کا موقع بھی نہ ملا۔ اور بن یامین یوسف علیہ السلام کے پاس رہ بھی گئے +

مَاكَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ۔ فِی کے معنی سبب کے بھی ہوتے ہیں جیسے حدیث میں آتا ہے۔ اِنَّ امْرَاَةً دَخَلَتِ النَّارَ فِيْ هِرَّةٍ حَبَسَتْهَا فَمَاتَتْ۔ یعنی ایک عورت عذاب میں مبتلا کی گئی صرف اس وجہ سے کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا اور وہ بیچاری بھوکی مر گئی۔ فِی کے ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے آیت کے یہ معنے ہونگے کہ قانونِ شاہی کی وجہ سے وہ اپنے بھائی کو روک نہیں سکتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انکے روکنے کی ایک تدبیر پیدا کر دی +

اس آیت سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ جب کسی بادشاہ کی حکومت میں رہے۔ تو اس کے قانون کی فرمانبرداری کرے حضرت یوسف علیہ السلام

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ

انہوں نے (یعنی اس کے بھائیوں نے) کہا (کہ) اگر اس نے چوری کی ہو تو (کچھ عجب نہیں کیونکہ) اس کا ایک بھائی (بھی) پہلے چوری کر چکا ہے[۴]

فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ

اس پر یوسفؑ نے اس (بات کی اصل حقیقت) کو اپنے دل میں پوشیدہ رکھا اور ان پر اسے ظاہر نہ کیا (ہاں اتنا)

قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ○

کہا (کہ) تم (لوگ) بدترین حیثیت کے (معلوم ہوتے) ہو۔ اور جو بات تم کہتے ہو اسے اللہ (تعالیٰ ہی) بہتر جانتا ہے[۶۵]

نبی تھے لیکن فرعون کے قانون کی پابندی کرتے تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی شان کے خلاف تھا۔ کہ بادشاہ کے قانون کے خلاف اپنے بھائی کو زبردستی رکھ لیتے۔ پس معلوم ہوا کہ کسی کے قانون کے ماتحت رہنا نبی کی شان کے خلاف نہیں بلکہ کسی کی حکومت میں رہ کر قانون شکنی کرنا شان کے خلاف ہے مگر افسوس کہ مسلمان عام طور پر اس مرض میں مبتلا ہیں۔ کہ غیر مذہب کے بادشاہ کی اطاعت کو جائز نہیں سمجھتے۔ اس غداری کی روح نے ان کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اور انکی دیانت کی روح نکل گئی ہے۔ مسلمان کو بیشک ترقی کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے لیکن دھوکے سے نہیں صفائی اور سچائی سے۔ جب کسی ملک میں کوئی رہتا ہے تو عملاً اقرار کرتا ہے کہ فرمانبرداری سے گزارہ کرے گا۔ ظاہر میں یہ اثر ڈال کر دل میں غداری کا خیال رکھنا بہت بے انصافی ہے۔ اور خود اپنے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ ایسا آدمی اپنے نفس میں سمجھتا ہے۔ کہ میں منافقت کر رہا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کی موجودہ بُزدلی بہت کچھ اس گندے عقیدہ کی وجہ سے ہے ✦

ہم جس کا چاہتے ہیں درجہ بڑھاتے ہیں۔ اس میں یہ بتایا ہے۔ کہ ایسی فرمانبرداری انسان کو حکومت سے محروم نہیں کردیتی۔ اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کی ترقی کے لئے خود ہی سامان پیدا کر دیتا ہے کیونکہ وہ تمام علموں کا سرچشمہ اور سب سامانوں کا مالک ہے ✦

[۶۵] حل لغات۔ مَكَانًا۔ كَانَ مِنَ الْعِلْمِ وَالْعَقْلِ بِمَكَانٍ اَىْ رُتْبَةٍ وَمَنْزِلَةٍ۔ كَانَ مِنَ الْعِلْمِ وَالْعَقْلِ بِمَكَانٍ کے معنے ہیں۔ کہ عقل اور علم میں بڑے پایہ اور حیثیت کا تھا پس مکان کے معنے حیثیت کے ہوئے (اقرب)

مَكَانًا

تفسیر۔ جرم کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آیندہ جرم کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے پہلے یوسفؑ کو جان سے مارنا چاہا تھا۔ اب انکی اخلاقی موت کے طالب ہوتے ہیں۔ اور کس ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ بن یامین نے چوری کی تو کیا ہوا۔ اس کا بھائی یعنی یوسفؑ بھی اس سے پہلے چوری کر چکا ہے انکے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک بھی توبہ ان کو نصیب نہیں ہوئی تھی ✦

[۱] کسی کے قانون کے ماتحت رہنا نبی کی شان کے خلاف نہیں۔

[۲] ایک جرم سے دوسرے جرم کی جرأت پیدا ہوتی ہے۔

مفسرین پر تعجب ہے کہ بجائے یہ کہنے کے کہ بھائیوں نے جھوٹ بولا۔ یوسف کی چوری کی تلاش میں لگ گئے ہیں۔ بعض نے تو یہاں تک کمال کیا ہے کہ لکھ دیا ہے کہ جب وہ بچے تھے۔ تو اپنی پھوپھی کے ہاں کی بعض چیزیں اُٹھا لائے تھے سُبْحَانَكَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ یوسف علیہ السلام کے دل کی جو کیفیت انکی اس بات کو سنکر ہوئی ہوگی۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے مگر باوجود طاقت کے خاموش ہو گئے۔ اور غصہ پی گئے۔ دل میں افسوس کر چھوڑا۔ یہ کیسا اعلیٰ درجہ کا مقام ہے بہت لوگ بے طاقت ہو کر غصہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو سزا دینے کی طاقت تھی مگر خاموش ہو رہے

مفسرین کا حضرت یوسفؑ پر چوری کا الزام۔

[۱] فرمانبرداری انسان کو حکومت سے محروم نہیں کر دیتی۔

[۲] حضرت یوسفؑ کے اخلاق کا اعلیٰ نمونہ۔

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا

انہوں نے کہا (کہ) اے بادشاہ اس کا ایک بہت بوڑھا باپ ہے (اے اسکے صدمہ سے

فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

بچانے کے لئے) اسکی بجائے آپ ہم میں سے کسی ایک کو پکڑ لیجئے ہم آپ کو یقیناً محسنوں میں سے سمجھتے ہیں ۷۵

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا

اس نے کہا (کہ ہم) اس بات سے اللہ (تعالیٰ) کی پناہ (چاہتے ہیں) کہ جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے ہم اسکے سوا

عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ۝ فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا ع ۹ ۳

کسی (اور) کو پکڑیں۔ اس صورت میں ہم یقیناً ظالموں میں سے ہونگے (نہ کہ محسنوں میں سے) ۷۶ پس جب وہ اس (یعنی یوسف) سے

مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا

ناامید ہوگئے تو آپس میں باتیں کرتے ہوئے (لوگوں سے) الگ ہوگئے (تب) ان میں سے بڑے نے کہا (کہ) کیا تمہیں معلوم نہیں کہ

اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ

تمہارے باپ نے تم سے پکا قول لیا (ہوا) ہے۔ جو اللہ (تعالیٰ کی قسم) سے (مؤکد) ہے اور

مَعَاذَ اللّٰهِ [1] — مَكَان [1] — اَلْمَتَاع [2] — کفارہ کا رد [3] — برادران یوسف کی سنگدلی [4]

اور بھائیوں کے ناپاک الزام کو برداشت کرلیا۔ یہ ایک اعلیٰ نمونہ ہے جسکی اتباع یقیناً مومن کو اعلیٰ مراتب پر پہنچا سکتی ہے۔

۷۵ حل لغات ۔ یُقَالُ هٰذَا مَكَانُ هٰذَا :۔ اسے بدلہ۔ (اقرب) جب ھذا مکان ھذا کہا جائے تو اسکے معنے ہوتے ہیں یہ اسکی بجائے ہے۔ پس مکان کے معنے ہوئے بجائے۔

تفسیر ۔ سنگدلی کی حد ہوگئی۔ اوّل تو جھوٹا الزام بھائی پر چوری کا لگایا پھر اس پر اس قدر غیرت جتلاتے ہیں اور ایسی بےتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ گویا وہ ان کا بھائی ہی نہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ آپ اسے معاف فرمائیں کہ ہمارا باپ بڈھا ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ اس کا باپ بڈھا ہے۔ گویا اس غیرت کی حالت میں اپنے آپ کو اس باپ کی اولاد ظاہر کرنے سے بھی شرماتے ہیں جس نے بن یامین اور یوسف جیسے بچے جنے تھے۔

۷۶ حل لغات ۔ مَعَاذَ اللّٰهِ اے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَوْ بِوَجْهِ اللّٰهِ مَعَاذًا ۔ معاذاللہ کے معنے ہیں۔ کہ (میں) اللہ کی پناہ (چاہتا ہوں) (اقرب)

اَلْمَتَاعُ :۔ سامان۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو یونس ۲۴ [۵۹] و ہود

تفسیر ۔ اس آیت سے کفارہ کا بھی رد نکلتا ہے یوسف علیہ السلام کہہ رہے ہیں کہ ایک کے بدلہ میں دوسرے کو رکھنا ظلم ہے حالانکہ وہ اپنی مرضی سے اپنے آپ کو پیش کر رہے تھے۔

عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح نے ہمارے لئے اپنی مرضی سے صلیب کو قبول کیا۔ اس لئے وہ ہمارے گناہوں کا کفارہ ہوئے لیکن بائبل بھی اس قسم کے کفارہ کو ظلم قرار دیتی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ہی لکھا ہے۔ کہ جب

مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ

یہ کہ (اس سے) پہلے تم یوسف کے بارہ میں (بھی) کوتاہی کر چکے ہو۔ اس لئے جب تک میرا باپ مجھے (خاص طور پر)

الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَ

اجازت (نہ) دے یا (خود) اللہ (تعالیٰ) میرے حق میں فیصلہ (کی کوئی راہ پیدا نہ) کرے۔ میں اس ملک کو نہیں چھوڑوں گا۔

هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۞ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا

اور وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) سب فیصلہ کرنیوالوں سے بہتر (فیصلہ کرنیوالا) ہے [۸۲] تم اپنے باپ کی طرف (لوٹ) جاؤ اور (اس سے جاکر) کہو (کہ)

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے آپ کو پیش کیا کہ بن یامین کی جگہ ہم میں سے کسی کو قید کرلو تو یوسف علیہ السلام نے کہا "خدا نہ کرے۔ کہ میں ایسا کروں۔ یہ شخص جس کے پاس سے میرا پیالہ نکلا وہی میرا غلام ہوگا" (پیدائش باب ۴۴/۱۷) معلوم ہوا کہ بے گناہ کو گنہگار کی جگہ پکڑ کر سزا دینا خواہ وہ بے گناہ راضی ہی کیوں نہ ہو۔ بائبل کے نزدیک بھی ظلم ہے +

حل لغات ۔ اِسْتَايْئَسُوْا ۔ يَئِسَ مِنْهُ واسْتَايْئَسَ بمعنے يَئِسَ۔ يَئِسَ اور اِسْتَايْئَسَ کے معنی ہیں بالکل مایوس و نا امید ہوگیا۔ اور اِسْتَايْئَسُوْا اِسْتَايْئَسَ سے جمع کا صیغہ ہے جس کے معنے ہوئے وہ نا امید ہوگئے (اقرب)

خَلَصَ اِلَيْهِ وَبِهِ الشَّيْءُ کے معنے ہیں وَصَلَ کہ کوئی چیز کسی تک پہنچی (اقرب) پس خَلَصُوْا نَجِيًّا کے معنے ہوں گے کہ وہ باتیں کرتے ہوئے کسی الگ جگہ پہنچے۔

النَّجِيُّ ۔ السِّرُّ نجی کے معنے ہیں۔ راز ۔ مَنْ تُسَارُّهُ۔ راز دار وَقَدْ يَكُوْنُ لِلْجَمْعِ اَيْضًا مِثْلَ الصَّدِيْقِ ۔ یہ لفظ راز داروں کے معنے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ وَمِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا اَيْ مُتَنَاجِيْنَ ۔ اور خَلَصُوْا نَجِيًّا ۔ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے کہ ایک دوسرے سے راز کی باتیں کہتے ہوئے الگ ہوئے قَالَ الْفَرَّاءُ قَدْ يَكُوْنُ النَّجِيُّ وَالنَّجْوٰى اِسْمًا وَمَصْدَرًا اور فراء کے نزدیک نجی اور نجویٰ کا لفظ کبھی تو اسم کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی مصدر کے معنوں میں یعنی راز کی باتیں یا راز کی باتیں کرنا۔ الْمُتَحَدِّثُ ۔ راز کی باتیں کرنے والا۔ بات سنانے والا السَّرِيْعُ ۔ تیز (اقرب)

خَلَصُوْا نَجِيًّا ۔ اَيْ انْفَرَدُوْا خَالِصِيْنَ عَنْ غَيْرِهِمْ ۔ خَلَصُوْا نَجِيًّا کے معنے ہیں۔ دوسروں سے علیحدہ ہوئے (مفردات)

كَبِيْرُهُمْ ۔ فُلَانٌ كَبِيْرٌ اَيْ مُسِنٌّ ۔ کبیر کے معنے ہیں عمر میں بڑا۔ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمْ اَيْ رَئِيْسُكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمْ کے معنے ہیں رفعت و منزلت کی رو سے بڑا سردار (مفردات)

الْمِيْثَاقُ ۔ عَقْدٌ مُؤَكَّدٌ بِيَمِيْنٍ وَعَهْدٍ ۔ میثاق کے معنے ہیں ایسا عہد کرنا جو قسم سے مؤکد ہو۔ وَالْمَوْثِقُ الْاِسْمُ مِنْهُ اور موثق کے معنے ہیں وہ عہد جو قسم سے مؤکد کیا گیا ہو (مفردات)

فَرَّطْتُّمْ ۔ فَرَطَ الشَّيْءَ وَفَرَطَ فِيْهِ ۔ ضَيَّعَهٗ وَقَدَّمَ الْعَجْزَ فِيْهِ ۔ فَرَطَ جب بغیر صلہ کے یا فی کے صلہ کے ساتھ استعمال ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو ضائع کر دیا۔ اور اس کی حفاظت اور بچاؤ کے سامان سے پوری طرح کام نہ لیا۔ ....

فَرَّطَ فِيْهِ ۔ قَصَّرَ فِيْهِ ۔ کوتاہی کی (اقرب) اور فَرَّطْتُّمْ کے معنے ہونگے۔ تم نے کوتاہی کی +

لَنْ اَبْرَحَ ۔ مَا بَرِحَ فُلَانٌ كَرِيْمًا ۔ اَيْ بَقِيَ عَلٰى كَرَمِهٖ اَبْرَحُ بَرِحَ سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور مَا بَرِحَ فُلَانٌ كَرِيْمًا کے معنے ہیں اپنی سخاوت پر قائم رہا۔ (اقرب)

بَرِحَ وَزَالَ اِقْتَضَيَا مَعْنَى النَّفْيِ وَلَا لِلنَّفْيِ وَالنَّفْيَانِ يَحْصُلُ مِنِ اجْتِمَاعِهِمَا اِثْبَاتٌ ۔ بَرِحَ اور زَالَ کے اندر نفی

حضرت یوسف کا بن یامین کی جگہ کسی اور کو لینے سے انکار

خَلَصُوْا نَجِيًّا

كَبِيْرُهُمْ

اِسْتَايْئَسُوْا

الْمِيْثَاق

فَرَّطْتُّمْ

لَنْ اَبْرَحَ

برح اور زال میں نفی کے معنے پائے جاتے ہیں۔

يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا

اے ہمارے باپ آپ کے (چھوٹے) بیٹے نے ضرور چوری کی ہے۔ اور ہم نے (آپ سے) سوائے اس بات کے جس کا ہمیں (ذاتی) علم ہے (قطعاً) کچھ

کے معنے پائے جاتے ہیں کیونکہ کسی جگہ سے چلے جانے کے مفہوم میں نہ موجود رہنا بھی داخل ہے۔ جو نفی پر مشتمل ہے پس جب ان پر ما یا لا وغیرہ کوئی کلمہ داخل ہوگا۔ تو نفی پر نفی داخل ہونے کی وجہ سے اُن میں اثبات کے معنے یعنی کسی جگہ پر موجود رہنے کے معنے پیدا ہو جاتے ہیں (مفردات) پس لن ابرح کے معنے ہونگے کہ میں اس ملک کو نہیں چھوڑوں گا بلکہ وہیں رہونگا

تفسیر ۔ وہی بھائی جو مجلس میں یوسف پر چوری کا الزام لگا رہے تھے الگ ہو کر اپنے جرم کے شریکوں کے سامنے صاف اقرار کر رہے ہیں کہ یوسفؑ کے بارہ میں ہم سے غلطی ہوئی تھی۔ خدا کی شان ہے یوسف علیہ السلام ایسے مرتبہ پر فائز تھے کہ بھائیوں کے لئے ان کا پہچاننا ناممکن ہوگیا تھا۔ ورنہ یہ جانتے ہوئے کہ یہی یوسفؑ ہے۔ وہ کب اس جھوٹ کے مرتکب ہوسکتے تھے ؞

بائبل کی شہادت قرآن کریم پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔

کبیرھم جس بھائی کی نسبت آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کے دل میں کسی قدر خشیت اللہ تھی۔ کیونکہ ایک تو وہ اپنے باپ سے غدّاری کرنے سے بھائیوں کو ڈراتا ہے۔ دوسرے اپنے عہد کی پابندی پر مصر ہوا ہے۔ کہ جب تک میرا باپ اجازت نہ دے۔ یا خدا تعالیٰ ہی کوئی فیصلہ کر دے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤنگا خدا تعالیٰ کے فیصلہ سے مُراد ہو سکتا ہے کہ اس کے دل میں یہ ہو کہ کسی طرح بن یامین آزاد ہو جائیں۔ اور میں اُن کو ساتھ لیکر واپس چلا جاؤں ؞

بڑے بھائی کے دل میں خشیت اللہ تھی۔

قرآن کریم میں کبیرھم ہے نہ کہ اکبرھم

حضرت یوسف کے سب سے بڑے بھائی کا نام روبن تھا اور بائبل کی رو سے جس بھائی نے اس موقعہ پر گھر واپس جانے سے انکار کیا ہے۔ وہ یہودا تھے۔ جو بھائیوں میں سے چوتھے درجہ پر تھے مسیحی مصنّف اس جگہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کے مصنّف کو تاریخ کا بھی علم نہیں۔ وہ یہودا کی بات کو روبن کی طرف منسوب کر رہا ہے۔ مجھے مسیحی مصنفوں کے ایسے اعتراضوں پر ہمیشہ تعجب آیا کرتا ہے۔ وہ یُوں بائبل کا ذکر کرتے ہیں۔ گویا وہ سب سے زیادہ مستند تاریخی کتاب ہے۔ حالانکہ خود مسیحی لٹریچر ان دلائل سے بھرا پڑا ہے۔ جو تاریخی طور پر بائبل کے رُتبہ کو بہت گرا دیتے ہیں پُرانی تاریخ تو الگ رہی۔ موسیٰ کی کتب میں موسیٰ کے سفروں کے جو حالات درج ہیں۔ مسیحی محققین خود انکی صحت کے قائل نہیں۔ اور جغرافیہ اور اس زمانہ کی دوسری تاریخوں سے اور خود بائبل کی اندرونی شہادتوں سے ان حالات کو خلاف واقعہ ظاہر کرتے ہیں ایسی کتاب کی روایت پر قرآن کریم پر اعتراض قابل تعجب ہے۔ ہم بیشک بائبل کی بعض روایات کو تاریخی شہادت کے طور پر نقل کرتے ہیں۔ لیکن اسی وقت جبکہ وہ عقل اور دوسری تاریخیں یا قرآن کریم کے مطابق ہوں۔ ورنہ بائبل میں اس قدر دست بُرد ہو چکی ہے کہ اسکی تاریخ بھی محفوظ نہیں کہی جاسکتی۔ پس ان حالات میں بائبل کی شہادت پر قرآن کریم پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ جس کے یہودی تاریخ کے بتائے ہوئے واقعات اس وقت تحقیق سے صحیح ثابت ہو رہے ہیں۔ جبکہ یہودی تاریخ کے بیانات غلط ثابت ہو رہے ہیں۔ مثلاً ہارون کا بچھڑے کو پُوجنا فرعون موسیٰ کی لاش کا محفوظ رہنا وغیرہ ؞

قرآن مجید اور بائبل کے بیان میں تطبیق

مسیحی مصنفین کا اعتراض لفظ "کبیرھم" پر

لیکن اگر ہم اس بارہ میں توریت کے بیان کو صحیح سمجھ لیں تو بھی کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے کبیرھم کہا ہے۔ اکبرھم نہیں کہا۔ بارہ بیٹوں میں سے چوتھا بیٹا بھی یقیناً کبیر کہلا سکتا ہے۔ کیونکہ کبیر کے معنے صرف بڑے کے ہیں نہ کہ سب سے بڑے کے۔ اس کے علاوہ یُوں بھی بائبل کے بیان اور قرآن مجید کے بیان میں تطبیق دی جاسکتی ہے کہ کبیرھم سے مراد عمر میں بڑا نہ لئے جائیں۔ بلکہ درجہ میں بڑے کے لئے جائیں چنانچہ زیر آیت قال لن ارسله معكم الخ ۶۷ میں ثابت کر آیا ہوں۔ کہ حضرت یعقوب کو جو اعتبار یہودا پر تھا۔ روبن پر نہ تھا۔ بن یامین کو انہوں نے بھیجا بھی یہودا کی ضمانت پر تھا۔ پس اس معاملہ میں یہودا ہی سب سے بڑے تھے ؞

عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ۝ وَسْـَٔلِ

نہیں کہا۔ اور ہم (اپنی نظر سے) پوشیدہ بات کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے ۵۸؎ اور آپ (بیشک)

الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا

ان لوگوں سے (بھی) دریافت کر لیں جن میں ہم (رہتے) تھے۔ اور اس قافلہ سے (بھی) جس کے ساتھ ہم آئے ہیں

فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ

اور یقین جانئے کہ ہم (اس بات میں) سچے ہیں ۵۹؎ اس نے (یعنی یعقوبؑ نے) کہا کہ یہ بات درست) نہیں (معلوم ہوتی) بلکہ

اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ

(معلوم ہوتا ہے کہ) تمہارے نفسوں نے کوئی بات خوبصورت کر کے تمہیں دکھائی ہے (اور اسکے تم مرتکب ہوئے ہو) پس (اب میرا کام تو) اچھی طرح صبر کرنا (ہی) ہے

۵۸؎ **تفسیر**۔ بعض مفسرین نے اس قول کو یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ تفسیر میری سمجھ سے باہر ہے۔ عبارت کا ربط بھی ان معنوں کے خلاف ہے۔ میرے نزدیک تو یہ اس بڑے بھائی کا قول ہے۔ جس کا قول اس سے پہلے درج ہوا ہے۔

وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ ہمیں پوری واقفیت نہیں۔ ہم نے ظاہر میں جو کچھ دیکھا اسے بیان کر دیا۔ ہم غیب سے واقف نہیں۔ دوم یہ کہ یہ فقرہ عہد کے متعلق ہو کہ جب ہم نے عہد کیا تھا۔ اس وقت ہمارے ذہن میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ہم ایسی خبر تیرے پاس لائینگے۔ ہم نے اس وقت عہد دیانتداری سے ہی کیا تھا +

۵۹؎ **حل لغات**۔ اَلْقَرْيَةُ اِسْمٌ لِلْمَوْضِعِ الَّذِيْ يَجْتَمِعُ فِيْهِ النَّاسُ۔ قریہ اس جگہ کو کہتے ہیں۔ جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ وَلِلنَّاسِ جَمِيْعًا۔ اور جمع شدہ لوگوں کو بھی قریہ کہتے ہیں۔ وَيُسْتَعْمَلُ فِيْ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا۔ اور قریہ ان ہر دو معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ قَالَ تَعَالٰى وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ قَالَ كَثِيْرٌ مِّنَ الْمُفَسِّرِيْنَ مَعْنَاهُ اَهْلَ الْقَرْيَةِ مذکورہ بالا آیت میں وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ کے معنے اکثر مفسرین نے اہل قریۃ یعنی بستی کے رہنے والے کئے ہیں۔ وَقَالَ بَعْضُهُمْ بَلِ الْقَرْيَةُ هٰهُنَا الْقَوْمُ اَنْفُسُهُمْ اور بعض مفسرین نے یوں کہا ہے۔ کہ قریۃ سے مُراد خود لوگ ہی ہیں۔ اہلِ قریہ نہیں (مفردات)

(مزید تشریح کے لئے دیکھو یونس ۹۵؎)

تفسیر۔ یہ قول اسی بھائی کا ہے جو اپنے والد کے پاس جا کر جو کچھ کہنا چاہیئے۔ اسکی تلقین کر رہا ہے +

صداقت کس طرح انسان کا لہجہ ہی بدل دیتی ہے وہی بھائی یوسفؑ کی دفعہ فریب کر کے آئے۔ تو کس طرح اپنی بات پر زور دینے سے ہچکچاتے تھے۔ لیکن اب جو بن یامین کی خبر دینے چلے ہیں۔ تو کس زور سے اپنے سچے ہونے کا اظہار کرتے ہیں اور گواہ بھی پیش کرتے ہیں +

اس جگہ اہل مصر کو قریۃ کے نام سے اور قافلہ والوں کو عیر کے نام سے یاد کیا ہے۔ حالانکہ عیر گدھوں کو کہتے ہیں ایسا انہوں نے اپنی بات پر زور دینے کے لئے کیا۔ اصل میں اہل القریۃ واصحاب العیر ہے۔ مگر اصحاب کا لفظ اُڑا دیا۔ اور یہ عربی کا عام دستور ہے۔ تو جہ کھینچنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ شہر کا بچہ بچہ اور قافلہ کا فرد فرد اس حقیقت سے آگاہ ہے۔ آپ کسی سے پُوچھ کر دیکھ لیں۔ وہ ہماری تصدیق کرے گا +

ارجعوا الی ابیکم حضرت یوسف کا قول نہیں۔

۱ ماکنا للغیب

۲ صداقت انسان کا لہجہ بدل دیتی ہے

۱ القریۃ ۲ قریہ اور عیر سے مراد اہل قریہ اور اصحاب العیر ہے

يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝

(کچھ بعید نہیں کہ اللہ (تعالیٰ) ان سب کو میرے پاس لے آئے یقیناً وہی ہے جو خوب جاننے والا (اور) حکمت والا ہے ۵۸۰

وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ وَ

اور اس نے ان کی طرف سے اپنا رُخ پھیر لیا۔ اور (الگ جا کر دُعا کی اور) کہا اے (میرے خدا!) یوسف پر میرے (اس) غم

ابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ۝

(و اندوہ کا سلسلہ کب ختم ہوگا) اور غم کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں سفیدی آگئی۔ مگر وہ اپنے غم کو (ہمیشہ اپنے دل کے) اندر (ہی) دبائے رکھتا ۵۸۱

سَوَّلَتْ

۵۸۰ حل لغات ۔سَوَّلَتْ لَهُ نَفْسُهُ كَذَا۔ زَيَّنَتْهُ لَهُ وَسَهَّلَتْهُ لَهُ وَهَوَّنَتْهُ اس کے نفس نے اس کے لئے اس کام کو خوبصورت کرکے یا اسے ایک معمولی بات قرار دیکر اور آسان کرکے دکھایا۔ (اقرب)

برادران بن یامین نے دشمنی کے باعث اس کی طرف چوری کا عیب منسوب کر دیا

اَلتَّسْوِيلُ تَزْيِينُ النَّفْسِ لِمَا تَحْرِصُ عَلَيْهِ وَتَصْوِيرُ الْقَبِيحِ مِنْهُ بِصُورَةِ الْحَسَنِ مِنْهُ جس بات کی طرف میلان ہو۔ اسے نفس کا پسندیدہ کرکے دکھانا اور بُری بات کو اچھے رنگ میں پیش کرنے کا نام تسویل ہے (مفردات) پس سَوَّلَتْ کے معنے ہونگے کہ تمہارے نفسوں نے کوئی بات خوبصورت کرکے تمہیں دکھائی ہے +

یہود اکے اپنے قول پر قائم رہنے کا حضرت یعقوب پر اثر

تفسیر - یہاں قرآن کریم کے طریق کے مطابق اس ذکر کو چھوڑ دیا ہے۔ کہ پھر بھائی آئے اور انہوں نے اپنے والد کو یہ باتیں کہیں۔ بلکہ والد کا جواب بیان کر دینا شروع کر دیا ہے۔ قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں۔ وہ زائد باتیں چھوڑ دیتا ہے۔ اس جگہ اس درمیانی بات کو چھوڑ دینے کی غرض یہ ہے۔ کہ جو سبق دیا جا رہا ہے۔ اس میں وقفہ نہ پڑے۔ اور پڑھنے والے کا ذہن سیدھا اس مضمون کی طرف منتقل ہو۔ جو اس کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے

تَوَلّٰى عنه

يَا اَسَفٰى

حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کی باتیں سُنکر کہا کہ اصل میں تمہارے نفس کی خواہشات نے بری بات کو اچھا کر دکھایا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بن یامین رو کا نہیں گیا۔ اور تم

اِبْيَضَّتْ عينه

جھوٹ بولتے ہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بن یامین کی دشمنی کی وجہ سے تمہارا ذہن ادھر نہیں گیا کہ وہ چوری کا مرتکب نہیں ہو سکتا ضرور اس واقعہ میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور تم نے اس سے دشمنی رکھنے کے باعث فوراً اسکی طرف اس عیب کو منسوب کر دیا ہے +

یہ کہہ کر کہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو لے آئے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ یوسف بھی اب تک زندہ ہے اور شائد خدا تعالیٰ یوسفؑ اور بن یامین اور یہودا سب کو واپس لے آوے۔ اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودا کے اپنے قول پر قائم رہنے کا ایک اثر حضرت یعقوبؑ کے دل پر ہوا ہے اور اسکی نسبت بھی ان کے دل میں درد پیدا ہونے لگ گیا ہے +

وہ بہت جانتا اور بہت حکمت والا ہے۔ اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھ پر حقیقت کھول دی ہے۔ اور میں اب سمجھتا ہوں کہ اس نے جو کچھ کیا ہمارے فائدہ ہی کے لئے کیا۔ گذشتہ تکلیف درحقیقت ہمارے خاندان کی آئندہ ترقی کا ایک پیش خیمہ تھی +

۵۸۱ حل لغات ۔تَوَلّٰى عَنْهُ۔ اَعْرَضَ وَتَرَكَهُ تولّٰی عنہ کے معنے ہیں۔ رُخ پھیر لیا اور چھوڑ دیا۔ (اقرب)

يَا اَسَفٰى وَيَا اَسَفَا عَلٰى كَذَا تَوَجُّعٌ وَتَحَسُّرٌ عَلٰى مَافَاتَ کسی چیز کے ضائع ہونے پر دُکھ و درد کا اظہار کرنے کے لئے یا اسفٰی کے الفاظ بولے جاتے ہیں (اقرب)

اِبْيَضَّتْ عَيْنُهُ۔ يُقَالُ لِلْمَهْمُومِ اَظْلَمَتْ عَلَيْهِ الدُّنْيَا

وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ (مجمع البحار جلد دوم ۲۴۹) جو غمزدہ ہو۔ اس کے متعلق عرب یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں کہ دنیا اس پر تاریک ہو گئی ہے۔ اور یہ بھی کہ غم سے اسکی آنکھیں سفید ہو گئی ہیں ✦

اَلْحُزْنُ - خُشُوْنَةٌ فِي النَّفْسِ لِمَا يَحْصُلُ فِيْهِ مِنَ الْغَمِّ۔ دل کی بے قراری جو غم کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے۔ وَيُضَادُّهُ الْفَرَحُ۔ اور اس کے بالمقابل فرح کا لفظ بولا جاتا ہے۔ (مفردات)

اَلْكُظُوْمُ: اِحْتِبَاسُ النَّفَسِ۔ کظوم کے معنے ہیں۔ سانس کا رکنا۔ وَيُعَبَّرُ بِهِ عَنِ السُّكُوْتِ۔ خاموشی کے موقعہ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ كَظَمَ الْغَيْظَ حَبَسَهٗ۔ غیظ کے ساتھ جب کَظَمَ کا لفظ آئے۔ تو اس کے معنے ہوتے ہیں غصہ کو روک لیا۔ كَظَمَ السِّقَاءَ شَدَّهٗ بَعْدَ مَلْاِهٖ مَانِعًا لِنَفَسِهٖ۔ اور جب سقاء کے لئے کظم کا لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں۔ مشکیزہ بھر کر پانی کو محفوظ رکھنے کے لئے اس کا منہ بند کر دیا۔ پس کظیم ایسے شخص کو کہیں گے کہ جو اپنے اندر غصہ کو دبائے رکھے اور ظاہر نہ ہونے دے۔ (مفردات)

تفسیر - اِبْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ۔ غم کی وجہ سے ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ اس کے متعلق بڑا اختلاف ہوا ہے۔ مفسرین کہتے ہیں۔ کہ ان کی آنکھیں اندھی ہو گئی تھیں اور ان پر سفیدی ہی سفیدی چھا گئی تھی۔ اس کے متعلق ان میں اختلاف ہے کہ سفیدی کیوں چھا گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ روتے روتے۔ اور اس رونے کی مدت بعض نے چالیس سال اور بعض نے ۸۰ سال بیان کی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دوسرے بیٹے کی خبر سن کر صدمہ سے بینائی جاتی رہی۔ کہ اب تو دوسرا بھی جدا ہو گیا ✦

دراصل اِبْيَضَّ کے ایک معنے بھی ایسے نہیں کہ جنسے اندھا ہونے کا مفہوم نکل سکے۔ صرف ایک معنوں کو کھینچ تان کر یہ مفہوم نکالا گیا ہے۔ عربی میں کہتے ہیں کہ

بَيَّضَ السِّقَاءَ - مشکیزہ کو دودھ یا پانی سے بھر دیا۔ یہ معنی جوہری اور صاغانی نے لکھے ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں۔ بَيَّضَهٗ مشکیزہ کو خالی کر دیا۔ گویا یہ لفظ اضداد معنے رکھتا ہے۔ یہ امر صاغانی اور لسان العرب نے بیان کیا ہے۔ اور تاج العروس والا کہتا ہے کہ یہ مجازی معنے ہیں۔ عام معنی اِبْيَضَّ اور اِبْيَاضَّ کے اِسْوَدَّ اور اِسْوَادَّ کے خلاف ہیں یعنی جس طرح اسودّ اور اسوادّ کے معنی سیاہ ہونے کے ہیں۔ ابیضّ اور ابیاضّ کے معنی سفید ہونے کے ہیں۔ اور ابیضّ اور ابیاضّ کبھی بیضّ کا مطاوع ہو کر بھی استعمال ہوتا ہے یعنی سفید ہو گیا۔ اب اس آخری بات سے بعض نے یہ معنی نکالے ہیں کہ چونکہ بیّض کے معنی مجازاً خالی کر دینے کے ہیں جیسے کہ لسان العرب میں آیا ہے۔ اور چونکہ اِبْيَضَّ بَيَّضَ کا مطاوع ہو کر استعمال ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ مجازی معنے بیّض کے یہاں ابیضّ میں بھی آسکتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ کے معنے یہ کئے ہیں کہ اسکی آنکھیں غم کے مارے بہ پڑیں۔ اور خالی ہو گئیں اور بعض مفسرین نے سفید ہونے سے بھی اندھا ہونا مراد لیا ہے ✦

بَيَّضَ کے معنے

اَلْحُزْن

اِبْيَاضّ کے معنے

اَلْكَظِيْم

گر ہم کہتے ہیں۔ کہ جب اِبْيَضَّ کے معنے لغت میں اندھا ہونے کے نہیں ہیں۔ تو کیوں نہ ابیضّت کے معنے پانی سے بھر جانے کے کئے جاویں۔ جبکہ پانی اور دودھ کو اَبْيَضَان کہنے کا محاورہ عربی میں مستعمل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آنکھوں میں پانی بھر آنے کا یہی مطلب ہے کہ آنسو بھر آئے۔ اور دوسرے معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انکی آنکھیں آنسوؤں سے بہ پڑیں۔ یعنی کثرت سے آنسو ٹپک پڑے ✦

اِبْيَضّ کے معنے لغت میں اندھا ہونے کے نہیں۔

اَبْيَضَّت عينه کے معنوں میں مفسرین کا اختلاف۔

پھر ہم کہتے ہیں۔ کہ اگر ابیضّت سے ہم نے مجاز ہی لینا ہے تو کیوں نہ وہ مجاز لیں جو اعلیٰ ہو۔ یعنی یہ کہ غم کے مارے ان کی آنکھیں چمک پڑیں۔ اور یہ ایک قدرتی بات ہے کہ غم کے وقت انسان کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوتی ہے۔ بشرطیکہ وہ غم دیر تک نہ لگا رہے ✦

اِبْيَضّ سے مراد معنے آنکھوں غم سے چمک پڑنے کے ہیں۔

ادیب لوگ بھی اس غم کی حالت کو بیان کرتے ہوئے جس میں ابھی امید کی جھلک باقی ہو۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہونے

ادیب بھی ان معنوں میں آنکھوں میں چمک پیدا ہونے کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ

انہوں نے کہا (کہ) اللہ کی قسم (یوں معلوم ہوتا ہے کہ) آپ یوسف کا ذکر کرتے ہی رہیں گے۔ یہاں تک کہ

حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَآ

آپ بیمار پڑ جائیں۔ یا آپ ہلاک ہو جانے والوں میں سے ہو جائیں ۵۸۲ اس نے کہا (کہ) میں

کے الفاظ استعمال کر لیا کرتے ہیں۔ تو گویا جب تازہ غم میں جس میں امید کی شعاع نظر آتی ہو۔ جب ایک جھلک اور چمک آنکھوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ تو کیوں نہ یہ معنے کئے جائیں کہ انکی آنکھیں اس تازہ غم کی وجہ سے چمک اٹھیں۔ کیونکہ انہوں نے محسوس کر لیا کہ غم اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ اور اب ضرور خدا تعالےٰ کا فضل نازل ہوگا۔ مگر جیسا کہ حل لغات کے نیچے لکھا گیا ہے اِبْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ کے معنے شدید غم میں مبتلا ہونے کے بھی ہوتے ہیں۔ پس ان معنوں کی موجودگی میں اور معنی کرنا صرف عجوبہ پسندی ہی کہلا سکتا ہے۔ جس کا قرآن کریم محتاج نہیں۔ اور جبکہ اس کے معاً بعد اللہ تعالےٰ نے وهو كظيم کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جن کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے غم کو دبانے میں کامیاب ہو گئے۔ تو پھر کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے رو رو کر آنکھیں ضائع کر دیں۔ رو رو کر آنکھیں کھو دینے والے کو کوئی غم دبانے والا نہیں کہہ سکتا۔ اس لفظ کی موجودگی میں تو اگر اِبْيَضَّتْ کے معنے رو رو کر اندھا ہونے کے لغت میں ہوتے بھی تب بھی وہ اس جگہ چسپاں نہ ہو سکتے تھے ✦

حضرتؑ کے گیارہ بچے فوت ہوئے۔

اِبْيَضَّتْ عَيْنٰهُ کے معنے شدید غم میں مبتلا ہونے کے ہیں۔

کظیم کا لفظ رو رو کر اندھا ہونے کو رد کرتا ہے۔

علاوہ ازیں حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنا قول قرآن کریم نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ میں اعلیٰ درجے کے صبر کا نمونہ دکھاؤں گا۔ اگر رو رو کر انہوں نے آنکھیں ضائع کر دی تھیں۔ تو اعلیٰ درجہ کے صبر کا نمونہ دکھانے کا وہ کیونکر دعویٰ کر سکتے تھے ✦

صبر جمیل

صبر کا مفہوم ایک حدیث سے اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو اپنے بیٹے کی قبر پر روتے دیکھا۔ تو فرمایا کہ صبر کرو۔ عورت نے جواب دیا کہ اگر تیرا بیٹا فوت ہو جاتا۔ تو کیسے صبر کرتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسکو معلوم نہیں ہوا۔ کہ اسے نصیحت کرنے والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی بات سن کر فرمایا۔ کہ میرے تو گیارہ بچے فوت ہو چکے ہیں اور میں نے صبر کیا ہے۔ یہ کہہ کر حضور چلے گئے۔ بعد میں جب لوگوں نے اسے ملامت کی کہ تو نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا نامناسب جواب دیا۔ تو وہ نادم ہوئی۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہا کہ یا رسول اللہ میں نے آپ کو پہچانا نہ تھا۔ میں اب صبر کیا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الصبر لِاَوَّلِ وَهْلَةٍ۔ صبر تو مصیبت کے پہلے صدمہ کے موقع پر ہوتا ہے بعد میں تو سب ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔ پس جب چند گھنٹے رو دھو کر خاموش ہو جانے سے بھی انسان بے صبر کہلا سکتا ہے۔ تو چالیس سال رونے والا کس منہ سے صبر کا اور پھر صبر جمیل کا دعویٰ کر سکتا ہے ✦

صبر کا مفہوم ایک حدیث سے۔

اصل بات یہ ہے کہ غم کی کیفیت کو ایسا لمبا کرنا جو انسان کو ناکارہ کر دے۔ خواہ اس غم کا لوگوں پر اظہار ہو یا نہ ہو۔ اسی کا نام جزع فزع ہے جو ناپسندیدہ ہے۔ اور نبی کی شان سے بالکل بعید ہے کہ کسی بات پر وہ اس قدر غم کرے۔ کہ اسکی ہلاکت کا مترادف ہو اگر وہ روتے رہتے تھے۔ تو دین کی خدمت کس طرح کرتے تھے۔ پس مجازی معنوں کی صورت میں بھی وہ معنے لینے چاہئیں جو حضرت یعقوبؑ کی شان کے مطابق ہوں نہ وہ جو انہیں عام مومن کے درجہ سے بھی گرا دیں ✦

جزع فزع

۵۸۲ حل لغات۔ مَافَتِئَ۔ مَا فَتَاَ يَفْعَلُ كَذَا۔ وَمَا فَتِئَ اَیْ مَا زَالَ۔ مافتئ کے معنے ہیں۔ کوئی کام لگاتار کرنا اور اس کا سلسلہ نہ توڑنا (اقرب)۔ اور تَفْتَؤُا تَذْكُرُ کے معنی ہونگے۔ کہ آپ ذکر کرتے ہی رہیں گے۔ حَرَضٌ۔ حَرِضَ حُرُوْضًا۔ كَانَ مُضْنًا مَرَضًا وَسَقَمًا۔ حَرَضٌ کے معنی ہیں

مَافَتِئَ

اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ

اپنی پریشانی اور غم کی فریاد اللہ (تعالٰے) ہی کے حضور کرتا ہوں اور میں اللہ (تعالٰی) کی طرف سے

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ

وہ علم رکھتا ہوں جو تم نہیں رکھتے ۵۸۳ اے میرے بیٹو! جاؤ اور (جا کر) یوسف اور اس

يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ

کے بھائی کی جستجو کرو۔ اور اللہ (تعالٰے) کی رحمت سے ناامید مت ہو

بیماری کی وجہ سے لاغر ہو گیا۔ الرَّجُلُ نفسَهٗ: اَفْسَدَهَا۔ اپنی حالت کو خراب کر لیا۔ حَرِضَ حَرَضًا:۔ فَسَدَ بَدَنُهٗ لَا يَقْدِرُ عَلَى النُّهُوْضِ:۔ جب اس کا مصدر حَرَضًا آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں بدن اتنا کمزور ہو گیا۔ کہ حرکت کے قابل نہ رہا۔ اور حَرُضَ حَرَاضَةً کے معنے ہیں طَالَ هَمُّهٗ: غم لمبا ہو گیا۔ اَلْحَرَضُ۔ الفَسَادُ فِي الْبَدَنِ۔ وَفِي الْمَذْهَبِ وَفِي الْعَقْلِ۔ بدن۔ مذہب یا عقل میں کسی خرابی کے پیدا ہو جانے کو حَرَضٌ کہتے ہیں اَلْمُشْرِفُ عَلَى الْهَلَاكِ تَسْمِيَةً بِالْمَصْدَرِ لِلْمُبَالَغَةِ۔ اور ہلاکت کے کنارہ پر پہنچے ہوئے شخص کو بھی حَرَضٌ کہتے ہیں مصدر مبالغہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جیسے کہتے ہیں زَيْدٌ عَدْلٌ کہ زید تو مجسمہ عدل ہے۔ حَرَضٌ کے اور بھی کئی معانی ہیں مثلاً مَنْ لَا خَيْرَ عِنْدَهٗ وَقِيْلَ مَنْ لَا يُرْجٰى خَيْرُهٗ وَلَا يُخَافُ شَرُّهٗ جس سے نہ تو کسی بھلائی کی امید ہو اور نہ ہی کسی تکلیف کا خطرہ ہو مَنْ اَذَابَهُ الْحُزْنُ اَوِ الْعِشْقُ جس کو غم یا عشق گھلا دے۔ السَّاقِطُ لَا خَيْرَ فِيْهِ۔ نکما۔ الرَّدِيُّ مِنَ النَّاسِ ناکارہ شخص۔ الْمُضْنٰى مَرَضًا وَسَقَمًا وَمِنْهُ فِي الْقُرْاٰنِ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اے مُدْنَفًا۔ بیماری کی وجہ سے لاغر۔ اور انہی معنوں میں قرآن مجید میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے (اقرب)

تفسیر۔ لَا تَفْتَؤُا استمرار و نفی کے لئے آتا ہے اور لَا یَزَالُ کے معنوں میں آتا ہے کبھی بغیر قسم کے استعمال ہوتا ہے کبھی وہ ساتھ ملحوظ ہوتی ہے یعنی تو ہمیشہ ایسا ہی کرتا رہے گا یہاں تک کہ تو کمزور ہو جائے گا۔ تو حَرَضٌ کے معنے بالکل نکما یا ہلاک ہونے کے ہوئے۔

یوسفؑ کے بھائی تو اعتراض کرتے ہیں کہ تُو اس طرح نکما ہو جائے گا۔ مگر وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اندھے ہو کر نکمے ہو گئے تھے۔ وہ گویا کہتے ہیں کہ وہ اس خطرہ کے اظہار سے پہلے ہی نکمے ہو چکے تھے۔ حالانکہ خدا تعالٰے کے نبی ہمیشہ صبر کرتے ہیں۔ اور اس طرح گھبراتے نہیں۔ ہم نے خود ایک نبی کو دیکھا ہے۔ اور اس کے حالات کو بھی دیکھا ہے

۵۸۳ حل لغات۔ اَلْبَثُّ۔ الحال بث کے معنے ہیں حال۔ اَشَدُّ الْحُزْنِ سخت غم۔ (اقرب) ....

اَصْلُ الْبَثِّ التَّفْرِيْقُ وَاِثَارَةُ الشَّيْءِ۔ بث کے اصل معنے بکھیرنے اور منتشر کرنے کے ہیں۔ وَبَثُّ النَّفْسِ مَا انْطَوَتْ عَلَيْهِ مِنَ الْغَمِّ وَالسِّرِّ۔ اور بث النفس کے معنے ہیں غم اور راز۔ اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ اے غَمِّيَ الَّذِيْ يَبُثُّهٗ عَنْ كِتْمَانٍ اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ کے معنے ہیں۔ کہ میں اپنے اس غم کی فریاد کرتا ہوں جس کا اظہار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ غَمِّيَ الَّذِيْ بَثَّ فِكْرِيْ۔ ایسا غم جس نے فکر اور سوچ کی طاقت کو پراگندہ کر دیا ہو۔ (مفردات)

تفسیر۔ میں تو اپنی حالت اور غم کی شکایت صرف اللہ کے پاس کرتا ہوں۔ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ اور میں اس کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اس میں اشارہ ہے

اَلْبَثُّ

لَا تَفْتَؤُا استمرار و نفی کے لئے آتا ہے۔

اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۝

(اصل) بات یہی ہے کہ اللہ (تعالیٰ) کی رحمت سے کافر لوگوں کے سوا کوئی (انسان) ناامید نہیں ہوتا ۵۸۴

حضرت یعقوبؑ کو یوسفؑ کے زندہ ہونے کا علم دیا گیا تھا۔

کہ ان کو حضرت یوسفؑ کے زندہ ہونے کا علم خداوند تعالیٰ کی جانب سے دیا گیا ہُوا تھا +

تَحَسَّسُوا

۵۸۴ حل لغات - تَحَسَّسُوْا - تَحَسَّسَ اِسْتَمَعَ لِحَدِيْثِ الْقَوْمِ:- تَحَسَّسَ کے معنے ہیں۔ قوم کی باتوں کو غور سے سُنا۔ وَطَلَبَ خَبَرَهُمْ فِي الْخَيْرِ۔ اور ان کی اچھی بات کی جستجو کی۔ وقیل التَّحَسُّسُ شِبْهُ التَّسَمُّعِ وَالتَّبَصُّرِ اور بعض نے یوں بیان کیا ہے کہ تحسّس کے معنوں میں ویسا ہی زور پایا جاتا ہے جیسے تسمع اور تبصّر کے معنوں میں۔ یعنی کسی چیز کو غور سے سُننا اور دیکھنا۔ چنانچہ مثال کے طور پر اُخْرُجْ فَتَحَسَّسْ لَنَا کا فقرہ ہے۔ جس کے معنے ہیں کہ اے مخاطب جا اور جا کر مطلوبہ چیز کو اپنے حواس سے اچھی طرح طلب کر یعنی خوب غور سے اسکی جستجو کر۔ وقال ابُوعُبَيْدٍ تَحَسَّسْتُ الْخَبَرَ وَتَحَسَّبْتُ" اور ابوعبید نے کہا ہے کہ تحسّستُ اور تحسّبت جس کے معنے کسی چیز کو حواس سے طلب کرنے کے ہیں ہم معنے ہیں عن الشَّيْءِ تَخَبَّرَ خَبَرَهٗ۔ تَحَسَّسْتُ مِنَ الشَّيْءِ کے معنے ہیں کہ کسی خبر کی جستجو کی۔ وَبِكُلِّ مَا ذُكِرَ فُسِّرَ قَوْلُ الْقُرْاٰنِ۔ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ۔ مذکورہ بالا سارے معنے آیت فتحسّسوا میں چسپاں ہوسکتے ہیں (اقرب)

ترقی کا بے عدیل گُر

تَايْـَٔسُوْا

لَا تَايْـَٔسُوْا :- يَئِسَ قَنَطَ اَوْ قَطَعَ الْاَمَلَ۔ فَهُوَ يَائِسٌ۔ یَئِسَ کے معنے ہیں ناامید ہوگیا۔ یا امید کو چھوڑ دیا۔ اور ایسے شخص کو یَائِسٌ کہتے ہیں۔ (اقرب) وَلَا تَايْـَٔسُوْا کے معنے ہونگے۔ تم ناامید نہ ہو +

تمام ناکامیوں کی جڑ ہمت ہارنا ہے۔

رَوْحٌ

رَوْحٌ - رَاحَ۔ رَوْحًا ذَهَبَ اِلَيْهِمْ فِي الرَّوَاحِ۔ رَوْحٌ رَاحَ کا مصدر ہے۔ اور راح کے معنے ہیں کسی کے پاس شام کو گیا۔ رَاحَ الْيَوْمُ۔ اِذَا كَانَ رَيِّحًا طَيِّبًا۔ راح الیومُ کے معنی ہیں۔ ہُوا دار خوشگوار دن۔ وَالرَّوْحُ بِمَعْنَى الرَّاحَةِ۔ اور روح کے معنے ہیں۔ راحت۔ وَنَسِيْمُ الرِّيْحِ تَقُوْلُ وَجَدْتُ رَوْحَ الشَّمَالِ۔ بادِ نسیم۔ اور ایسا ہی معنوں میں وَجَدْتُ رَوْحَ الشَّمَالِ کا فقرہ استعمال ہُوا ہے۔ کہ میں نے شمال کی طرف سے بادِ نسیم کو محسوس کیا۔ وَالنُّصْرَةُ۔ مدد۔ وَالْعَدْلُ الَّذِيْ يُرِيْحُ الْمُشْتَكِيْ۔ ایسا عدل جو شکایت کرنے والے کو تسلی دیدے۔ وَالْفَرَحُ وَالسُّرُوْرُ۔ خوشی وَالرَّحْمَةُ۔ رحمت۔ وَمِنْهُ لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ۔ اور اس آیت میں یہی آخری معنے مُراد ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے۔ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے زندہ ہونے اور پھر مصر میں ہونے کی خبر خدا تعالےٰ کی طرف سے حاصل تھی۔ ورنہ ممکن نہیں یک لڑکے کے متعلق جسے وہ سمجھتے ہوں۔ کہ بھیڑیا کھا گیا ہے یا اور کسی ذریعہ سے مر چکا ہے۔ وہ اپنے بیٹوں کو تلاش کا حکم دیتے اور خصوصًا مصر میں تلاش کا حکم دیتے +

اس آیت میں روحانی اور جسمانی ترقی کا بے عدیل گُر بتایا ہے تمام ناکامیوں کی جڑ ہمت ہار دینا ہے۔ جو شخص قطعی اور یقینی علم کے بغیر کام ترک کر دیتا ہے ہمیشہ اپنے پیشہ میں یا اپنے مقصد میں ناکام رہتا ہے۔ معمولی سے معمولی پیشوں میں بھی یہ اصل کام دے رہا ہے۔ ایک بڑے آہنگر اور ایک معمولی آہن گر میں یہی فرق دیکھو گے۔ کہ ایک ہر مشکل کام کے وقت کہے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا دوسرا اس کے حل کرنے پر لگا رہے گا۔ اور آخر کامیاب ہو جائے گا۔ پیشوں میں ہی نہیں۔ قدرت کے افعال میں بھی یہ اصل کام کر رہا ہے۔ جو بیمار صحت کی امید دل سے نکال دیتا ہے اسے صحت ہونی مشکل ہو جاتی ہے۔ جو طالب علم کامیابی کا خیال چھوڑ دیتا ہے اس کا حافظہ کُند ہونا شروع کر دیتا ہے۔ روحانی حالتوں میں بھی یہی اصل کام کر رہا ہے۔ جو قومیں گناہ کی معافی کی قائل نہیں۔ وہ گناہ کے دُور کرنے کے لئے پوری جد وجہد بھی نہیں کرتیں۔ جو فطرت کی پاکیزگی کی قائل نہیں۔ وہ رُوحانی

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا

پس جب وہ (واپس ہو کر پھر) اس کے (یعنی یوسف کے) حضور حاضر ہوئے۔ تو (اس سے) کہا (کہ) اے بادشاہ

وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ

ہمیں اور ہمارے (تمام) کنبہ کو (سخت) تنگی پہنچی (ہوئی) ہے۔ اور ہم (بالکل) تھوڑی سی پونجی لائے ہیں

لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي

پس آپ (محض احسان کے طور پر) ہمیں (غلہ کا) پیمانہ پورا دیدیں اور ہمیں صدقہ (کے طور پر حق سے بھی کچھ زیادہ)

الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۝ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ

دیں اللہ (تعالیٰ) صدقہ دینے والوں کو یقیناً (بڑا) اجر دیتا ہے ۵۸۵ اس نے کہا (کہ) کیا تمہیں (اپنا وہ سلوک) معلوم ہے جو تم نے

طاقتوں کو ان کے کمال تک پہنچانے کی طرف بھی متوجہ نہیں ؛

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مایوسی کی حالت کو دور کرنے کی طرف خاص توجہ فرمائی ہے جیسے فرمایا کہ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ اِلَّا الْمَوْت ہر مرض کی سوائے موت کے کہ اس کا آنا ضروری ہے۔ دوا موجود ہے۔ یا فرمایا مَنْ قَالَ هَلَكَ الْقَوْمُ فَهُوَ اَهْلَكَهُمْ جو کہے کہ قوم ہلاک ہو گئی ہے۔ وہی قوم کا ہلاک کرنے والا ہے۔ کیونکہ وہ قوم کی امید کو توڑ کر اس کو ہلاکت کے قریب کر دیتا ہے پس چاہیئے کہ انفرادی طور پر بھی اور قومی طور پر بھی امید کی روح کو ترقی دی جائے۔ مگر یہ امر مدنظر رہے کہ امید ہو جس کے ساتھ قوتِ عملیہ ترقی کرتی ہے۔ نہ کہ امانی یا بیہودہ خواہشات ہوں جو سستی اور غفلت پیدا کرتی ہیں جیسے مسلمانوں میں بجائے کوشش کر کے اپنی حالت درست کرنے کے خیال کے یہ خیال غالب رہا ہے کہ مسیح آکر سب دنیا کی نعمتیں ان کو دیدیگے۔ امانی یعنی محض خواہشات جب مستقل طور پر دل میں بیٹھ جائیں۔ تو وہ بھی ناامیدی کی طرح مہلک ہوتی ہیں ؛

۵۸۵ حل لغات۔ الضُّرُّ ضِدُّ النَّفْعِ۔ ضُرّ کے معنے ہیں نقصان۔ سُوْءُ الْحَالِ وَالشِّدَّةُ۔ تنگ حالی ہو۔ فی الکلیات الضَّرُّ بالفتحِ شائِعٌ فِی کُلِّ ضَرَرٍ و بالضمِّ خَاصٌّ بِمَا فِی النفس کمرضٍ وھزالٍ۔ کلیات میں یوں لکھا ہے کہ ضُرّ کے معنے خاص اس تکلیف کے ہیں۔ جو خود نفس میں ہو جیسے بیماری یا لاغر پن وغیرہ لیکن ضَرّ کا لفظ عام ہے اور ہر تکلیف پر بولا جاتا ہے (اقرب) اَلْمُزْجٰى۔ الشَّیْءُ الْقَلِیْلُ۔ مزجی کے معنے ہیں تھوڑی سی چیز۔ بِضَاعَةٌ مُّزْجَاةٌ۔ اَیْ قَلِیْلَةٌ۔ بضاعۃ مزجاۃ کے معنی ہیں تھوڑی سی پونجی۔ وقیل ردیئۃ لم یتم صلاحہا فتردّ و تدفع رغبۃ عنہا۔ ایسی پونجی جس میں نقص ہو اور لوگ اس کو اچھا نہ سمجھ کر واپس کر دیویں۔ پس جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ کے معنی یہ ہوئے کہ ہم تیرے پاس حقیر اور تھوڑی چیز لائے ہیں (اقرب)

تفسیر۔ عزیز عربی لفظ ہے۔ اور اس کے معنی معزز یا کامیاب کے ہوتے ہیں۔ یہ کوئی خاص عہدہ نہیں معلوم ہوتا گو اب بعد کے زمانہ میں بادشاہ کے لئے بھی عزیز مصر کا لفظ استعمال ہونے لگا ہے لیکن مصریوں کی زبان عربی نہ تھی۔ کہ ہم یہ خیال کریں ان کے وزراء عزیز کہلاتے تھے۔ پس میرے نزدیک یہ صرف سردار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس صورت میں اس سے پہلے جو امرأۃ العزیز کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کے معنے بھی یہی ہیں کہ اس سردار یا اس عہدیدار کی عورت۔ یوسف کے بھائیوں کا رویہ اس موقعہ پر ناقابل فہم ہے۔ یا تو وہ گناہ کی وجہ سے

رسول کریم نے مایوسی کی حالت کو دور کرنے کی طرف خاص توجہ فرمائی
مزجٰىۃ

محض خواہشات بھی ہلاکت کا موجب ہوتی ہیں
عزیز کا لفظ صرف سردار کے معنے میں استعمال ہوتا ہے
الضُّرّ

بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ○ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ

یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا تھا جبکہ تم (اپنے فعل کی برائی سے) ناواقف تھے ۵۸۵ انہوں نے کہا (کہ) کیا واقع میں

لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ؗ قَدْ

آپ (ہی تو) یوسف (نہیں) ہیں۔ اس نے کہا (کہ) میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔

مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ

اللہ (تعالیٰ) نے ہم پر فضل کر دیا ہے۔ بات یقیناً یہی (درست) ہے۔ کہ جو (شخص) تقویٰ اختیار کرے اور صبر کرے تو

اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ○ قَالُوْا تَاللّٰهِ

(ضرور اس کا اجر پاتا ہے کیونکہ) اللہ (تعالیٰ) نیکوکاروں کے اجر کو ضائع ہرگز نہیں کرتا ۵۸۶ انہوں نے کہا۔ اللہ کی قسم!

اخلاق میں گرتے چلے جاتے ہیں کہ آئے تو بھائیوں کی تلاش میں تھے لیکن کیا صرف یہ کہ غلہ کا سوال کرنا شروع کر دیا یا یہ ہے کہ اس خوف سے کہ ہمیں کوئی سازشی نہ سمجھے سوال عزت پردہ کے طور پر کیا۔ اور اس طرح اپنے واپس آنے کی غرض کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا +

بلکہ ان یوسف کا سہ بارہ مصر آنا

۵۸۶ تفسیر۔ معلوم ہوتا ہے۔ اس موقع پر حضرت یوسفؑ کو غیرت آگئی۔ اور وہ ڈرے کہ بھائی اپنے آپ کو اور ذلیل نہ کریں۔ اور اپنے ظاہر کرنے کا ارادہ کر لیا +

حضرت یوسفؑ کے اخلاق کا نمونہ۔

رُوحانی آدمی اور دنیادار میں کس قدر فرق ہوتا ہے یوسفؑ کے بھائیوں نے یوسفؑ پر جسمانی طور پر ہی ظلم نہیں کیا۔ ان کی عزت کو بھی برباد کرنا چاہا۔ اور چوری کا الزام لگایا۔ اس کے برخلاف حضرت یوسفؑ ان کی غلطی کا ذکر کرتے ہیں تو اسے اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ کہہ کر ہلکا کر دیتے ہیں۔ یعنی جو کچھ تم لوگوں نے یوسف سے کیا تھا۔ ایک بچپن کا کھیل تھا۔ ورنہ تم لوگ تو بہت اچھے ہو۔ اخلاق کی ایسی ہی نمائشیں ہیں جو انسانیت کے حسن کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور جن کی نقل کرنے کی ہر شخص کو کوشش کرنی چاہیئے +

رُوحانی آدمی اور دنیادار میں فرق۔

حضرت یوسفؑ کے اخلاق کی ایک جھلک۔

۵۸۷ تفسیر۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے

حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں کے ساتھ بن یامین کو بھی بلالیا تھا۔

جس اعلیٰ رنگ میں گزشتہ واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سے اور حضرت یعقوبؑ کے زور دینے پر کہ یوسف زندہ ہے۔ اس کی تلاش کرو۔ اور مصر میں تلاش کرو۔ ان کے ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو گئے۔ کہ کہیں یہی تو یوسف نہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے اخلاق کا پھر نمونہ دیکھو کہ انہیں ایک منٹ کے لئے شک میں نہیں رکھا۔ اور فوراً اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ اور کس محبت سے تقوے اور صبر کی بھائیوں کو نصیحت بھی کی۔ اور بتایا کہ سوال کرنے اور اپنے آپ کو ذلیل کرنے سے انسان مشکلات پر غالب نہیں آتا۔ بلکہ اصل گر تقوئی اللہ اور صبر ہے۔ یعنی خدا پر توکل رکھے۔ اور عمل کو جاری رکھے۔ مصائب سے گھبرائے نہیں۔ الفاظ قرآن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت انہوں نے بن یامین کو بھی بلا لیا تھا تبھی فرمایا کہ یہ میرا بھائی ہے +

لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ ○

اللہ نے آپ کو ہم پر ضرور فضیلت دی ہے اور ہم یقیناً خطا کار تھے ۵۸۸

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ

اس نے کہا۔ اب تمہیں (قطعاً) کوئی ملامت نہ ہوگی (اور) اللہ ابھی تمہیں بخش دے گا۔

وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ○ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا

اور وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے ۵۸۹ تم میرا یہ کرتہ لے جانا اور اسے

۵۸۸ حل لغات۔ اٰثَرَهٗ اِيْثَارًا۔ اِخْتَارَهٗ وَاَكْرَمَهٗ۔ اٰثَرَهٗ کے معنے ہیں۔ اس کو چُن لیا۔ اور اعزاز دیا فَضَّلَهٗ اس کو بزرگی اور فضیلت دی۔ اور قَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ کے معنے ہونگے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فضیلت دی ہے (اقرب)

تفسیر۔ اب یوسفؑ کے بھائیوں کی نیک فطرت نے بھی سر اُٹھایا۔ اور انہوں نے یوسف کی خواب کی صحت کو تسلیم کرلیا اور کہا۔ کہ تیرا خواب آخر پورا ہو کر رہا۔ اور باوجود ہماری مخالفت کے جس غلطی کا اب ہم اقرار کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے تجھ کو فضیلت دی +

۵۸۹ حل لغات:۔ اَلتَّثْرِيْبُ۔ اَلتَّقْرِيْعُ تثریب کے معنے ہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ۔ والتَّقْرِيْرُ بِالذَّنْبِ۔ قصور پر سرزنش۔ (مفردات)

ثَرَبَهٗ لَامَهٗ وَعَيَّرَهٗ بِذَنْبِهٖ۔ ثَرَبَهٗ کے معنے ہیں غلطی پر ملامت کی۔ اور قصور پر بُرا بھلا کہا۔ المریضَ۔ نَزَعَ عَنْهُ ثَوْبَهٗ۔ جب ثرب کا مفعول مریض ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں۔ اس سے کپڑا اُتارا۔ وَفِي الْمِصْبَاحِ ثَرَّبَ عَلَيْهِ۔ عَتَبَ وَلَامَ۔ مصباح میں ثَرَّبَ علیہ کے یہ معنے لکھے ہیں۔ کہ قصور پر ملامت و سرزنش کی۔ وَثَرَّبَهٗ وَثَرَّبَ عَلَيْهِ۔ قَبَّحَ عَلَيْهِ فِعْلَهٗ يُقَالُ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ:۔ ثرّبہ اور ثرّب علیہ کے معنے ہیں کسی کے فعل کی بُرائی کا اظہار کیا۔ پس لَا تَثْرِيْبَ کے معنے ہوئے۔ کہ تمہاری بُرائی کو کبھی ظاہر نہ کیا جائے گا۔ اور اس پر ملامت نہ کی جائے گی (اقرب) +

تفسیر۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے پھر اعلےٰ اخلاق کا نمونہ دکھایا۔ اور فوراً ان کی معافی کا اعلان کر دیا۔ ورنہ اس وقت جبکہ ان کے بھائی غیر ملک میں تھے۔ اور بالکل بے یار و مددگار تھے نہ معلوم کیا کیا خیال آ رہے ہونگے کہ اب یوسف کس کس طرح ہم سے بدلہ لے گا۔ پس حضرت یوسفؑ نے فوراً ہی اعلانِ عفو کرکے ان کے دلوں کو وساوس کی تکلیف سے بچا لیا۔ جو اصل عذاب کی تکلیف سے کم نہیں ہوتی۔ اور نہ صرف خود ہی معاف کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ سے بھی ان کی مغفرت کی دُعا کی۔ اور اپنے بھائیوں کو اس مغفرت کی امید دلائی۔ یوسف علیہ السلام کا یہ کام اس قدر عظیم الشان ہے کہ صرف اس ایک کام کی وجہ سے وہ زندہ جاوید کہلانے کے مستحق ہیں

حضرت یوسفؑ کا اپنے بھائیوں کو معاف کرنا۔

قرآن کریم اور بائبل دونوں میں اس واقعہ کو لیا گیا ہے لیکن دونوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ایک نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو صرف اس امر کے اظہار کے لئے بیان کیا ہے کہ تا یہ معلوم ہو کہ ابراہیم کی اولاد مصر کس طرح پہنچی۔ اور دوسرے نے اس واقعہ کو اس کی اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے بیان کیا ہے۔ اور خصوصاً اس امر کے اظہار کے لئے کہ اہل اللہ مصائب سے گھبراتے نہیں۔ اور ان کے اخلاق مظالم سے اور بھی ترقی کر جاتے ہیں۔ دشمنوں کا ظلم ان کے اندر کینہ کی آگ نہیں بلکہ عفو اور سکینت کا گلزار پیدا کرتا ہے

قرآن مجید نے حضرت یوسف کے واقعہ کو انکی اخلاق خوبیوں کی وجہ سے بیان کیا ہے۔

سترھویں مشابہت | رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت

فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ

میرے باپ کے سامنے (جا) رکھنا (اس سے) وہ (میرے متعلق) بصیرت پاکر (میرے پاس) آئیں گے

بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۞ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ

ع ۱۰ — ۴

اور تم اپنا سارا کنبہ (بھی) میرے پاس لے آنا ۹۵ اور جب (ان کا) قافلہ (مصر سے) چل پڑا تو ان کے

آنحضرتؐ کو بھی حضرت یوسفؑ کی طرح ہجرت کے بعد ترقی ملی۔

یوسفؑ سے اس امر میں بھی مشابہت ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بھی ہجرت کے بعد ترقی دی۔ اور آخر وہی شہر جس سے آپؐ کو رات کے وقت نکلنا پڑا تھا۔ آپؐ اس میں دن کے وقت دس ہزار قدوسیوں سمیت فاتحانہ طور پر داخل ہوئے۔ اس وقت آپؐ نے اہل مکہ سے سوال کیا۔ کہ اب بتاؤ۔ تم مجھ سے

بَصِيْر

کس سلوک کی امید رکھتے ہو۔ وہ چونکہ اب آپؐ کا مقام سمجھ چکے تھے۔ اور اب ان پر سورۃ یوسف کی وحی کی حقیقت ظاہر ہو چکی تھی۔ انہوں نے فوراً ہی جواب دیا کہ ہم اس سلوک کی اُمید رکھتے ہیں۔ کہ جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔

آنحضرتؐ کا اہل مکہ کو معاف کرنا

آپ نے فرمایا۔ بہت اچھا لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ آج تم سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ تمہارے سب گناہوں کو معاف کیا جاتا ہے۔ اللہ اللہ وہ کیسا عجیب نظارہ ہوگا۔ بیس سال کے متواتر اور دل ہلا دینے والے ظلموں کے بعد آپؐ کے دشمن آپؐ کے سامنے پیش ہوئے۔ کون ہے جو ان سے دس گنے کم ظلموں کو بھی معاف کر سکتا تھا۔ مگر آپؐ نے بغیر ماتھے پر شکن ڈالنے کے سب کو معاف کر دیا۔

حضرت مسیح موعودؑ سورۃ یوسف کی یہ آیات اکثر پڑھا کرتے تھے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام جب بوجہ بیماری مسجد میں تشریف نہ لے جا سکتے تھے۔ تو اکثر مغرب اور عشا کی نماز گھر میں باجماعت ادا فرماتے تھے۔ اور عشا کی نماز میں قریباً بلاناغہ سورۃ یوسف کی یہ آیات تلاوت فرماتے تھے مجھے خوب یاد ہے کہ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ سے لے کر اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ تک کی آیات آپؐ اس قدر درد ناک لہجہ میں تلاوت فرماتے کہ دل بے تاب ہو جاتا تھا۔ وہ آواز آج تک میرے کانوں میں گونجتی ہے اور شاید میں اب تک اس لہجہ کو صحیح طور پر نقل کر سکتا ہوں۔ اس کا موجب بھی وہی تھا کہ آپؐ کے اور آپؐ کی قوم کے درمیان بھی یوسفؑ اور اس کے بھائیوں والا معاملہ گزر رہا تھا۔ اگلی آیت کے متعلق مجھے شبہ ہے کہ آیا یہ بھی پڑھتے تھے یا نہیں اور یہ بھی شبہ ہے کہ سب آیات ایک ہی رکعت میں پڑھتے تھے یا دونوں رکعتوں میں تقسیم کر کے پڑھتے تھے ❖

۹۵ حل لغات — اَلْبَصِيْرُ۔ اَلْمُقْتَدِرُ عَلَى النَّظْرِ خِلَافُ الضَّرِيْرِ۔ بصیر کے معنے ہیں صحیح سالم نظر والا۔ رَجُلٌ بَصِيْرٌ بِكَذَا: عَالِمٌ بِهِ خَبِيْرٌ۔ عالم واقف کار شخص (اقرب)

تفسیر — لوگ کہتے ہیں کہ اس فقرہ سے ان کو ملامت کی ہے کہ جیسے تم نے پہلے قمیص ڈالی تھی۔ ویسے ہی اب بھی قمیص لے جاؤ تاکہ شرمندہ ہوں مگر میرے نزدیک یہ کمال عفو ہے کہ پہلے وہ قمیص لے جانے سے ہی ناراض ہوئے تھے۔ اب بھی قمیص کے ذریعہ بشارت دو۔ تاکہ وہ تم سے خوش ہوں۔ اور تمہارے گناہوں کی خدا تعالیٰ سے معافی مانگیں۔ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ کہہ کر جب خود معاف کر دیا۔ تو قمیص دے کر یہ خواہش ظاہر کی۔ کہ باپ بھی ان کے لئے دُعا کرے ❖

يَاْتِ بَصِيْرًا کے معنے

يَاْتِ بَصِيْرًا سے یہ مراد ہے کہ پہلے اس کو مومنانہ شان سے علم تھا۔ کہ میرا بیٹا زندہ ہے۔ مگر اب وہ بصیرت ظاہری پاکر میرے پاس آئے گا۔ کہتے ہیں رَجُلٌ بَصِيْرٌ بِكُنْهِهٖ اَیْ عَالِمٌ بِهٖ خَبِيْرٌ یعنی رجل بصیر کے معنے عالم اور واقف کار کے بھی ہوتے ہیں۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ پہلے الہام کے ماتحت جو حضرت یعقوبؑ کو ایمان تھا۔ وہ اب امر واقعہ کے علم کی صورت میں بدل جائے۔ آخر میں بھائیوں کو عفو سے بڑھ کر حُسنِ سلوک کی بشارت دی۔ اور انہیں اپنے

اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ○

باپ نے (لوگوں سے) کہا (کہ) اگر ایسا نہ ہو کہ تم مجھے جھٹلانے لگو تو (میں ضرور کہونگا کہ) مجھے یقیناً یوسف کی خوشبو آرہی ہے [۵۹۱]

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ○ فَلَمَّآ

انہوں نے کہا تو یقیناً اپنی پُرانی غلطی میں (پڑا ہوا) ہے [۵۹۲] پس جونہی کہ

اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ج

(یوسف کے مل جانے کی) بشارت دینے والا (شخص حضرت یعقوبؑ کے پاس) آیا اس نے اس (کُرتے) کو اسکے سامنے رکھ دیا۔ جسپر وہ

اہل ساتھ لاکر ان نعمتوں میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ جو خدا تعالےٰ نے یوسف علیہ السلام کو عطا فرمائی تھیں +

۵۹۱ حل لغات ۔ فَصَلَ مِنَ الْبَلَدِ فُصُوْلًا۔ خَرَجَ مِنْهُ. فَصَلَ من البَلَدِ کے معنے ہیں کہ شہر سے نکل چلا (اقرب)

اَلْفَصْلُ۔ اِبَانَةُ اَحَدِ الشَّيْئَيْنِ مِنَ الْاٰخَرِ حَتّٰى يَكُوْنَ بَيْنَهُمَا فُرْجَةٌ۔ فصل کے معنے ہیں ایک چیز کو دوسری سے ایسے طور پر الگ کرنا کہ دونوں کے درمیان کچھ فاصلہ ہو جائے۔ وَفَصَلَ الْقَوْمُ عَنْ مَكَانِ كَذَا اَىْ اِنْفَصَلُوْا۔ فلاں قوم کسی جگہ سے علیحدہ ہوئے۔ (مفردات)

اَلتَّفْنِيْدُ۔ نِسْبَةُ الْاِنْسَانِ اِلَى الْفَنَدِ۔ وَهُوَ ضُعْفُ الرَّاْىِ۔ تفنید کے معنے ہیں کسی کی طرف ضعف رائے منسوب کرنا۔ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ : قِيْلَ اَنْ تَلُوْمُوْنِىْ۔ بعض نے لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ کے معنے یہ کئے ہیں۔ کہ اگر تم مجھے ملامت نہ کرو۔ (مفردات)

فَنَدَ الرَّجُلُ فَنَدًا۔ خَرِفَ وَاَنْكَرَ عَقْلَهٗ لِهَرَمٍ اَوْ مَرَضٍ۔ فَنَدَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں۔ کہ بیماری یا بڑھاپے سے عقل کمزور ہوگئی۔ فِي الْقَوْلِ وَالرَّاْىِ۔ اَخْطَاَ کسی بات یا رائے میں غلطی کرنا۔ كَذَبَ۔ جھوٹ بولا۔ تفنّدون۔ فَنَّدَ ماضی سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور فَنَّدَ کے معنے ہیں كَذَّبَهٗ۔ اسکو جھٹلایا جَهَّلَهٗ۔ اس کو نادان قرار دیا۔ عَجَّزَهٗ۔ عاجز قرار دیا۔ لَامَهٗ اس کو ملامت کی۔ خَطَّاَ رَاْيَهٗ وَضَعَّفَهٗ۔ رائے کو غلط اور کمزور قرار دیا۔ (اقرب)

فصل

تفسیر ۔ ریح یوسف سے مُراد ان کی خبر ہے جب کسی چیز کے قریب عرصہ میں ملنے کی امید ہو۔ تو کہتے ہیں کہ مجھے اسکی خوشبو آرہی ہے۔ یہی مُراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی فرماتے ہیں +

آ رہی ہے اب تو خوشبو میرے یوسف کی مجھے
گو کہو دیوانہ میں کرتا ہوں اس کا انتظار

لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ سے یہ مُراد نہیں۔ کہ تم مجھے پاگل نہ کہو بلکہ یہ فقرہ زور دینے کے لئے ہے یعنی اگر تم مجھے پاگل نہ سمجھو۔ تو مَیں یہ کہتا ہوں کہ یوسف کی ملاقات کا وقت قریب آگیا ہے۔ اور گو یہ امر تمہاری سمجھ سے بالا ہے لیکن ہے بالکل سچا اور درست +

اَلتَّفنید

۵۹۲ تفسیر ۔ ملہم اور غیر ملہم میں کتنا فرق ہوتا ہے ملہم خدا تعالےٰ کے کلام پر ایمان لاکر جس یقین کے مقام پر ہوتا ہے دوسروں کو وہ کب نصیب ہو سکتا ہے۔ باوجود حضرت یعقوبؑ کے بتادینے کے ان کے گھر کے لوگ پھر بھی اس خبر کی تصدیق کرنا ناممکن سمجھتے ہیں۔ اور آپ کو غلطی پر قرار دیتے ہیں +

ملہم اور غیر ملہم میں فرق۔

ضلال کے معنے غلطی پر ہونے کے بھی ہوتے ہیں۔ اور محبت سے کسی امر پر قائم ہونے کے بھی ہوتے ہیں۔ گو اس فقرہ کے کہنے والے دوسرے لوگ ہیں لیکن چونکہ پھر بھی وہ مومن تھے خواہ کس قدر کمزور کیوں نہ ہوں۔ اس جگہ پر یہی معنے چسپاں

ضلال کے معنے غلطی پر قائم ہونے کے بھی ہیں۔

قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ ۚۙ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا

(اس معاملہ میں) صاحب بصیرت ہوگیا (اور ان سے) کہا۔ کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا۔ کہ میں یقیناً اللہ (تعالیٰ) کی طرف سے (علم پاکر وہ کچھ)

تَعۡلَمُوۡنَ ۝ قَالُوۡا یٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ

جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۹۲؎ (تب) انہوں نے (یعنی حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے) کہا اے ہمارے باپ! آپ ہمارے حق میں (خدا تعالیٰ سے) ہمارے

قمیص کے سامنے آنے سے الہامی علم واقعاتی ہوگیا

ہوتے ہیں کہ آپ اپنی شدت محبت کی وجہ سے ایسا خیال کرتے ہیں کہ آپ کے الہام کے ظاہری معنے ہیں۔ ورنہ یوسف کا ملنا اب کہاں ممکن ہے +

ارتد

۹۳؎ **حل لغات** :۔ اِرْتَدَّ عَلٰی اَثَرِہٖ: رَجَعَ۔ اِرْتَدَّ علی اثرہٖ کے معنے ہیں۔ اپنے نشانوں پر واپس لوٹا۔ الی حَالِہٖ عَادَ۔ اپنی اصل حالت پر آگیا۔ وَفِی الْقُرْاٰنِ فَارْتَدَّ بَصِیْرًا لہ عَادَ بَصِیْرًا بَعْدَ الْعَمٰی۔ اور قرآن مجید کی آیت فارتد بصیرا کے معنے ہیں۔ نا واقفیت کے بعد پھر صاحب بصیرت اور صاحب علم ہوگیا۔

ارتد بصیرا اندھے پھر بینا ہونا مراد نہیں

بصیرًا :۔ بَصُرَ بِہٖ وَبَصِرَ بَصَارَۃً وَبَصَرًا :۔ عَلِمَ بِہٖ جب بصر کے ساتھ ب کا صلہ آئے یا اس کا مصدر بصارۃ اور بصر ہو۔ تو اس کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کے متعلق اس کو اچھی طرح علم اور واقفیت حاصل ہوگئی۔

انبیاء کا دو قسم کا علم روحانی۔ اور ظاہری حواس سے۔

بَصِیْرٌ

اَلْبَصِیْرُ :۔ رَجُلٌ بَصِیْرٌ بِکَذَا: عَالِمٌ بِہٖ خَبِیْرٌ۔ رجل بصیرٌ کے معنے ہوتے ہیں۔ کہ خوب واقف کار عالم آدمی (اقرب) پس ارتد بصیرًا کے معنے ہونگے۔ کہ حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کے معاملہ میں اچھی طرح صاحب بصیرت ہوگئے +

اَلْقٰی عَلٰی وَجْہِہٖ کے معنے۔

تفسیر۔ اَلْقٰی عَلٰی وَجْہِہٖ کے ظاہری معنے تو یہی ہیں۔ کہ ان کے منہ پر ڈال دی لیکن قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جو کچھ ظاہر ہوا۔ حضرت یوسفؑ کا معجزہ نہ تھا بلکہ حضرت یعقوبؑ کا۔ ورنہ قمیص سے آنکھیں اچھی ہونے پر انہیں چاہیئے تھا۔ کہ کہتے کہ دیکھو یوسفؑ نے کتنا بڑا معجزہ دکھایا ہے۔ کہ اسکی قمیص سے میری آنکھیں اچھی ہوگئی ہیں۔ مگر وہ قمیص ڈالنے کے نتیجہ میں کہتے یہ ہیں کہ دیکھو میری بات سچی ہوگئی کہ یوسفؑ زندہ ہے۔ پس اس سے ظاہر ہے کہ مطلب آیت کا یہی ہے۔ کہ جب یوسفؑ کی قمیص حضرت یعقوبؑ کے سامنے رکھی گئی تو جو علم پہلے الہامی تھا۔ اب وہ واقعاتی بن گیا۔ اور حضرت یعقوبؑ نے جیسا کہ انبیاء کی سنت ہے۔ اپنی خوشی کو بھول کر اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرنی شروع کر دی۔ کہ دیکھو جو خدا تعالیٰ نے کہا۔ وہ سچ نکلا +

ارتد بصیرًا۔ سے یہ مُراد نہیں۔ کہ اندھے تھے پھر بینا ہو گئے۔ بلکہ یہ کہ جس امر کو پہلے ایمان سے تسلیم کرتے تھے۔ اب ظاہری علم کے ماتحت امر واقع کی طرح اس کو ماننے لگ گئے۔ الہام کی حقیقت پر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کا علم دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک جو رُوحانی طور پر انہیں عطا ہوتا ہے۔ اور دوسرا ظاہری حواس سے۔ جب کسی الہام کے ذریعہ سے کوئی خبر ملے تو ایمانی طور پر اس کا علم ہوتا ہے۔ لیکن وقوعہ کے طور پر نہیں پھر جب ظاہری حواس سے اس خبر کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ تو ایک دوسری قسم کا علم ان کو حاصل ہوتا ہے۔ جس میں دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اسی دوسرے علم کے حصول کے اظہار کے لئے فَارْتَدَّ بَصِیْرًا کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ کیونکہ جب باطنی اور ظاہری حواس دونو ایک خبر کے مصدق ہوں۔ تو علم کامل ہوجاتا ہے جب تک ظاہری حواس سے وقوعہ کا علم نہ ہو۔ یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ شائد آسمانی خبر تعبیر طلب ہو۔ یا اس کی کوئی اور توجیہہ ہو لیکن جب ظاہر میں بھی خبر پُوری ہو جاتی ہے۔ تو انسان کو بصیرت کامل حاصل ہوجاتی ہے اور شبہ کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہتا +

اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ ○ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ

گناہوں کی بخشش طلب کریں۔ ہم یقیناً خطاکار ہیں ۹۴ــہ اس نے کہا میں (ضرور) تمہارے لئے اپنے رب سے بخشش طلب کروں گا

اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى

یقیناً وہی (ہے جو) بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے ۹۵ــہ پھر جب وہ (سب) یوسف کے

يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ

پاس پہنچے۔ تو اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور (سب سے) کہا (کہ) اگر اللہ (تعالیٰ) کی مشیت

اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ؕ○ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى

(شاملِ حال) ہو تو تم امن (اور سلامتی) کے ساتھ مصر میں داخل ہو جاؤ ۹۶ــہ اور اس نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور

۹۴ــہ تفسیر ۔ جب تک انسان کا گناہ بخشا نہیں جاتا اس کے دل پر اس کا اثر رہتا ہے۔ چنانچہ یوسفؑ کے بھائیوں سے اس وقت تک ایسی حرکات سرزد ہوتی رہی ہیں۔ جو قلب کی صفائی کے نقص پر دلالت کرتی تھیں لیکن جب حضرت یوسفؑ کی طرف سے لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ کہا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے عفو کے ساتھ اپنے عفو کو شامل کر دیا۔ تو یوسفؑ کے بھائیوں کی بھی حالت بدل گئی اور انہوں نے اپنی توبہ کو کافی نہ سمجھ کر اپنے باپ سے بھی درخواست کی کہ تُو ہمارے لئے خدا سے استغفار طلب کر۔ عام طور پر ایسے موقعہ پر لوگ کہا کرتے ہیں کہ آپ ہمیں معاف کر دیں۔ مگر اب وہ یہ نہیں کہتے کہ تو ہمیں معاف کر۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ تُو ہمارے لئے خدا سے مغفرت طلب کر۔ کیونکہ توبہ کے ساتھ ہی ان کے دل پر یہ روشن ہو گیا ہے کہ انسانی سزا یا ناراضگی خدا تعالیٰ کی ناراضگی کے مقابل پر کوئی شے نہیں اس لئے سب سے پہلے انہیں خدا تعالیٰ سے صلح کرنی چاہیئے اور اس کے نبی کے توسط سے اس کا عفو طلب کرنا چاہیئے۔ اس درخواست میں حضرت یعقوبؑ کی معافی خود ہی آگئی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ سے ان کے لئے معافی وہ تب ہی طلب کر سکتے تھے جبکہ خود معاف کر چکے ہوں ✦

۹۵ــہ تفسیر ۔ اس جگہ ایک عجیب نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے حضرت یعقوبؑ نے سَوْفَ کا لفظ بولا ہے۔ جو مستقبل بعید کے لئے اور کلام پر زور دینے کے لئے آتا ہے۔ اس میں انہوں نے گویا انسانی فطرت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ اور بتایا ہے کہ رنج اور غصہ زائل ہو کر فوراً انکی محبت پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسان کے دل سے رنج و غصہ کے اثرات مٹنے کے لئے ایک زمانہ چاہیئے۔ حضرت یوسفؑ تو چونکہ دیر سے تیار ہو رہے تھے کہ معاف کر دیں۔ اس لئے انہوں نے سَوْفَ نہیں کہا بلکہ فوراً لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ کہہ دیا۔ مگر حضرت یعقوبؑ کو اچانک یہ خبر ملی۔ اس لئے انہوں نے کہا۔ کہ کچھ وقت چاہیئے تا قلب سے ناراضگی کا اثر دُور ہو کر استغفار کی تحریک ہو۔ مگر ساتھ ہی انہوں نے اپنے بیٹوں کے اس ملال اور گھبراہٹ کو جو سَوْفَ کے لفظ کی وجہ سے پیدا ہو سکتا تھا۔ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ کہہ کر دُور کر دیا کہ گھبراؤ نہیں اللہ تعالیٰ تمہارے زنگ دھو دے گا اور بہت رحم کرے گا ✦

حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ کے معافی کے الفاظ میں فرق۔

ہمارے ملک میں بعض لوگ قصور کر کے اسی وقت اڑ بیٹھتے ہیں کہ آپ معاف کریں گے۔ تو اُٹھوں گا۔ اور انکی مراد اس معافی سے یہ ہوتی ہے کہ دل میں انکے متعلق وہی محبت پیدا ہو جائے۔ حالانکہ یہ بات قدرتی قاعدہ کے خلاف ہے معافی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ سزا نہ دی جائے۔ یہ تو ایک منٹ میں ہو سکتی ہے۔ دوسرا یہ کہ پھر وہی تعلقات محبت ہو جائیں۔ سو اس کے لئے کچھ وقت ہوتا ہے۔ اور یہ جبر یا سیتہ گری سے نہیں ہو سکتی ✦

معافی کی دو اقسام

ایک نکتہ

۹۶ــہ تفسیر ۔ اللہ تعالیٰ نے بار بار اَبَوَيْهِ کا لفظ رکھ کر

الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا

وہ (سب) اس کی وجہ سے (خدا کا شکر کرتے ہوئے) سجدہ میں گر گئے اور اس نے (یعنی یوسف نے) کہا اے میرے باپ یہ

تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ؗ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَ

میری پہلے سے (خواب میں) دیکھی ہوئی بات کی حقیقت کا اظہار ہے اللہ (تعالیٰ) نے اسے پورا کر دیا ہے اور

قَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ

اس نے مجھ پر (بہت بڑا) فضل کیا ہے۔ کیونکہ اس نے (پہلے) مجھے قید خانہ سے نکالا اور (مجھ پر عزت کے

یہ بتایا ہے کہ باوجودیکہ حضرت یوسفؑ کی حقیقی والدہ فوت ہو چکی تھیں۔ اور موجودہ والدہ ان کی سوتیلی والدہ تھیں۔ مگر وہ ان کا پورا ادب اور لحاظ و احترام کرتے تھے۔ اس میں یہ نصیحت ہے کہ اولاد کو یہ مد نظر رکھنا چاہیئے کہ سوتیلی مائیں بھی مائیں ہی ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ سلوک کرنے میں اور ان کے احترام میں اسلام کوئی فرق نہیں کرتا۔ پس اولاد کو چاہیئے کہ وہ ان کا بھی ویسا ہی لحاظ کریں جیسا کہ حقیقی ماؤں کا کرنا چاہیئے ✦

سوتیلی ماؤں کا لحاظ بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے جیسے حقیقی ماؤں کا

اُدْخُلُوْا مِصْرَ سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنے باپ کے استقبال کے لئے آگے آئے تھے جس سے ثابت ہوا کہ ایک نبی بھی اپنے والدین کے استقبال کے لئے باہر جاتا ہے۔ تو استقبال نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ امر ہے ✦

حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین کا استقبال کیا

استقبال پسندیدہ امر ہے۔

حضرت یوسفؑ کی روحانیت دیکھو کہ ان کے بھائی تو بڑے بڑے کاموں کے لئے انشاء اللہ نہیں بولتے اور تمام کاموں کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں مگر یہ ہیں کہ اس حالت میں بھی کہ شہر سامنے ہے سواریاں موجود ہیں اور خود گویا وزیر اعظم ہیں مگر انشاء اللہ کہہ رہے ہیں کہ باوجود ان سامانوں کے ممکن ہے کہ اگر خدا نہ چاہے تو ہم داخل نہ ہو سکیں ✦

حضرت یوسفؑ کی روحانیت

ذکر الٰہی اور توکل روحانیت کی جان ہیں۔

سچے دل سے انشاء اللہ کہنا روحانی ترقی سے بہت کچھ تعلق رکھتا ہے۔ زندگی سے ماضی انسان کے بس سے نکل چکا ہوتا ہے حال اتنا چھوٹا عرصہ ہے کہ درحقیقت وہ ماضی اور مستقبل کی سرحد کا نام ہے باقی رہا مستقبل۔ سو وہی اصل زمانہ ہے جس سے انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے پس جب انسان مستقبل کے کاموں کے ساتھ انشاء اللہ کہتا ہے تو اپنے ارادہ اور فعل میں خدا تعالیٰ کو شامل کر لیتا ہے اور اس طرح انہیں شیطانی تصرف سے بچانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ یقینی امر ہے کہ جو شخص سچے دل سے انشاء اللہ کہہ کر اپنے کام میں اللہ تعالیٰ کو شامل کرے گا جب اس کام کا وقت آئے گا تو وہ اسے نیکی اور تقویٰ کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کرے گا ✦

انشاء اللہ کہنے سے روحانی ترقی۔

دوسرے جب کوئی شخص انشاء اللہ سوچ سمجھ کر کہنے اور پھر مستقبل کے کام کے متعلق کہنے کی عادت ڈال لے تو وہ گناہ کا ارادہ کرنے سے بچ جاتا ہے کیونکہ گناہ کے متعلق انشاء اللہ نہیں کہا جا سکتا۔ پس جب کبھی کسی بدفعل کے متعلق وہ ارادہ ظاہر کرنے لگے گا۔ انشاء اللہ کی عادت اس کے دل میں ندامت اور شرمندگی پیدا کر دیگی۔ علاوہ ازیں انشاء اللہ کہنے کی عادت ذکر الٰہی کا باعث ہوتی ہے اور توکل کا سبق دیتی ہے اور یہی باتیں روحانیت کی جان ہیں ✦

اُدْخُلُوْا اٰمِنِيْنَ کے الفاظ گو دعائیہ نہیں لیکن مراد اس سے دعا ہے۔ شاید حضرت یوسفؑ کو الہاماً ان خطرات کا علم دیا گیا ہو جو آئندہ آل یعقوب کو مصر میں پیش آنے والے تھے پس انہوں نے ان کے لئے دعا کر دی کہ اللہ تعالیٰ ان خطرات کے تباہ کن اثرات سے ان کو محفوظ رکھے۔ اس معاملہ میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت یوسفؑ سے مشابہت ہے کیونکہ

حضرت یوسفؑ کو مصر میں آل یعقوب کے لئے پیش آمدہ خطرات کا علم دیا گیا تھا۔

بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ

مقام پر پہنچا کر اس کے بعد) وہ تمہیں جنگل (کے علاقہ) سے (نکال کر میرے پاس) لایا۔ بعد اس کے کہ شیطان نے

بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ

مجھ میں اور میرے بھائیوں میں بگاڑ پیدا کر دیا تھا۔ میرا رب جس سے چاہتا ہے لطف (واحسان) کا معاملہ کرتا ہے

اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ

یقیناً وہی (ہے جو) خوب جاننے والا (اور) حکمت والا ہے ۹۷؎ اے میرے رب! تُو نے مجھے حکومت کا ایک حصہ (بھی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہر میں داخل ہونے سے پہلے دعا کیا کرتے تھے۔ آپ شہر میں داخلے سے پہلے ان الفاظ میں دُعا کرتے۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَمَا اَظْلَلْنَ وَرَبَّ الْاَرَضِيْنَ السَّبْعِ وَمَا اَقْلَلْنَ وَرَبَّ الشَّيٰطِيْنِ وَمَا اَضْلَلْنَ وَرَبَّ الرِّيَاحِ وَمَا ذَرَيْنَ۔ فَاِنَّا نَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ وَخَيْرَ اَهْلِهَا وَخَيْرَ مَا فِيْهَا وَنَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ وَشَرِّ اَهْلِهَا وَشَرِّ مَا فِيْهَا اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهَا وَارْزُقْنَا جَنَاهَا (یا جَيَاهَا) وَاَعِذْنَا مِنْ وَبَاهَا وَحَبِّبْنَا اِلٰى اَهْلِهَا وَحَبِّبْ صَالِحِيْ اَهْلِهَا اِلَيْنَا +

میرا اور دوسرے دوستوں اور ہم سے پہلے بزرگوں کا بھی یہ تجربہ ہے کہ جو لوگ یہ دُعا پڑھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتا ہے اور ان کو آفات سے بچاتا ہے +

۹۷؎ حل لغات

۔ رَفَعَ رَفْعًا ضِدُّ وَضَعَهٗ۔ رفع کے معنے ہیں بلند کرنا۔ زَيْدًا اِلَى الْحَاكِمِ رَفْعًا وَرُفْعَانًا قَدَّمَهٗ اِلَيْهِ لِلْمُحَاكَمَةِ۔ زید کو حاکم کے سامنے مقدمہ کے فیصلہ کے لئے حاضر کیا۔ اِلَى السُّلْطَانِ رِفْعَانًا قَرَّبَهٗ۔ بادشاہ کے حضور پیش کیا (اقرب)

اَلرَّفْعُ يُقَالُ تَارَةً فِي الْاَجْسَامِ الْمَوْضُوْعَةِ اِذَا اَعْلَيْتَهَا عَنْ مَقَرِّهَا وَتَارَةً فِي الْمَنْزِلَةِ اِذَا شَرَّفْتَهَا۔ رفع کا لفظ جب اجسام کے لئے استعمال ہو۔ تو کبھی اس کے معنے ان کو ان کی اصل جگہ سے بلند کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور کبھی درجہ اور رتبہ میں فضیلت دینے کے۔ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ اِشَارَةٌ اِلَى الْمَعْنَيَيْنِ اِلٰى اِعْلَاءِ مَكَانِهٖ وَاِلٰى مَا خَصَّ بِهٖ مِنَ الْفَضِيْلَةِ وَشَرَفِ الْمَنْزِلَةِ۔ چنانچہ آیت الی السماء کیف رفعت میں رفع کے دونوں مذکورہ بالا معنے مُراد ہیں۔ بلندی مکان اور فضیلت وشرف۔ (مفردات)

آنحضرت صلعم کی حضرت یوسف سے مشابہت۔ شہر میں داخل ہونے کی دعا۔

اَلْعَرْشُ۔ سَرِيْرُ الْمَلِكِ۔ اورنگ شاہی (اقرب)

العرش

اَلْعَرْشُ فِي الْاَصْلِ شَيْءٌ مُسَقَّفٌ۔ عرش کے اصل معنی چھتی ہوئی چیز کے ہیں۔ وَمِنْهُ قِيْلَ عَرَشْتُ الْكَرْمَ وَعَرَّشْتُهٗ۔ اِذَا جَعَلْتَ لَهٗ كَهَيْئَةِ سَقْفٍ چنانچہ انہی معنوں میں عرشت الکرم کا فقرہ استعمال ہوتا ہے کہ انگوروں کی بیل کے پھیلنے کے لئے چھت کی قسم کی کوئی چیز بنا دی۔ وَسُمِّيَ مَجْلِسُ السُّلْطَانِ عَرْشًا اِعْتِبَارًا بِعُلُوِّهٖ۔ اور بادشاہ کی مجلس کو اسکی رفعت کی وجہ سے عرش کہہ دیتے ہیں۔ وَكُنِيَ بِهٖ عَنِ الْعِزِّ وَالسُّلْطَانِ وَالْمَمْلَكَةِ۔ نیز عرش سے عزّ او کنایۃً عزّت وغلبہ اور بادشاہت بھی لی جاتی ہے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو یونس ۴؎ پس رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ کے معنے ہوئے کہ اس نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا یا بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ (مفردات)

خَرُّوْا۔ خَرَّ ماضی سے جمع غائب کا صیغہ ہے جس کے معنے ہیں۔ سَقَطَ۔ سُقُوْطًا لِمَا يُسْمَعُ مِنْهُ خَرِيْرٌ۔ ایسے طور پر گرنا کہ اس سے آواز سنائی دے۔ وَالْخَرِيْرُ يُقَالُ لِصَوْتِ الْمَاءِ وَالرِّيْحِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ مِمَّا يَسْقُطُ مِنْ عُلُوٍّ۔ اور خریر

خَرَّ
رفع

اس آواز کو کہتے ہیں۔ جو کسی چیز کے اوپر سے گرنے یا ہوا اور پانی کے چلنے سے پیدا ہو۔ وقولہ خَرُّوْا سُجَّدًا فاستعمال الخَرِّ تنبیہٌ علی اجتماع امرَین۔ السُّقوطُ وحصولُ الصَّوتِ فیہم بالتسبیح۔ اور خَرُّوْا سُجَّدًا کے الفاظ سے دو باتوں کی طرف اشارہ ہے (۱) گرنا (۲) تسبیح کرنے کی وجہ سے آواز کا پیدا ہونا (مفردات)

نَزَغَہٗ۔ طَعَنَ فِیْہِ۔ نَزَغَ کے معنے ہیں طعنہ زنی کی اِغْتَابَہٗ کسی کی غیبت کی۔ وَذَکَرَہٗ بِقَبِیْحٍ۔ اور اس کے متعلق بدگوئی کی۔ اور نَزَغَ بَیْنَ الْقَوْمِ کے معنی ہیں۔ اَغْرٰی وَاَفْسَدَ وَحَمَلَ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ کہ قوم کے درمیان بگاڑ و فساد ڈالا۔ اور ایک کو دوسرے کے خلاف برانگیختہ کیا۔ اور نَزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنَھُمْ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ شیطان نے ان کے درمیان بگاڑ ڈال دیا۔ (اقرب)

شَیْطٰن کا لفظ دو مختلف مادوں سے بن سکتا ہے۔ (۱) شَطَنَ۔ (۲) شَاطَ۔ یا تو یہ شَطَنَ سے فَیْعَالٌ کے وزن پر ہے اور شَطَنَ عَنْہُ کے معنے ہیں اَبْعَدَ۔ دُور ہوگیا۔ اور شَطَنَتِ الدَّارُ کے معنے ہیں۔ گھر دُور ہوگیا۔ پس اس مادہ کے لحاظ سے اس کے معنے ہونگے کہ وہ ہستی جو حق سے خود بھی دُور ہے۔ اور دوسروں کو بھی دُور کرنے والی ہے۔ اور اگر شَاطَ اس کا مادہ مانا جائے تو اس کے معنے ہونگے کہ وہ ہستی جو حسد اور تعصب کی وجہ سے جل جائے یا ہلاک ہو جائے کیونکہ شَاطَ الشَّیْءُ کے معنے ہیں اِحْتَرَقَ۔ جل گئی۔ اور شَاطَ فُلَانٌ کے معنی ہیں ھَلَکَ۔ ہلاک ہوگیا۔ شیطٰن اس سے فعلان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ ان معنوں کے علاوہ شیطٰن کے معنے لغت میں مندرجہ ذیل لکھے ہیں۔ رُوْحٌ شَرِیْرٌ۔ بد رُوح کُلُّ عَاتٍ مُتَمَرِّدٍ۔ سرکش اور حد سے بڑھنے والا۔ اَلْحَیَّۃُ سانپ (اقرب)

لَطِیْفٌ۔ لطف میں سے بنا ہے جس کے معنے ہیں۔ لَطَفَ بِہٖ وَلَہٗ لُطْفًا۔ رَفَقَ بِہٖ۔ نرمی کی۔ لَطَفَ اللّٰہُ بِالْعَبْدِ وَبِالْعَبْدِ۔ رَفَقَ بِہٖ۔ اللہ نے بندے پر شفقت کی۔ وَاَوْصَلَ اِلَیْہِ مَا یُحِبُّ بِرِفْقٍ۔ اور اس کی مُراد اچھی طرح پُوری کر دی۔ وَفَّقَہٗ۔ نیک کام کی توفیق دی۔ عَصَمَہٗ۔ اس کو شر سے محفوظ رکھا۔ لَطُفَ الشَّیْءُ لطافۃً۔ صَغُرَ وَدَقَّ۔ لطف الشیءُ کے معنے ہیں کہ کوئی چیز چھوٹی اور باریک ہوگئی۔ مِنَ الْاَسْمَآءِ الْحُسْنٰی مَعْنَاہُ الْبَرُّ بِعِبَادِہٖ الْمُحْسِنُ اِلٰی خَلْقِہٖ بِاِیْصَالِ الْمَنَافِعِ اِلَیْھِمْ بِرِفْقٍ وَلُطْفٍ اَوِ الْعَالِمُ بِخَفَایَا الْاُمُوْرِ وَدَقَائِقِھَا۔ اور جب لطیف کا لفظ اللہ تعالےٰ کے لئے بولا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ بندوں پر اور مخلوق پر احسان اور شفقت و مہربانی کرنے والا۔ اور محبت و احسان کے ساتھ ان کو نفع پہنچانے والا مخفی باتوں کو جاننے والا۔ (اقرب) ؎

تفسیر

.... دَفَعَ کے معنے اعلیٰ پایہ کے انسان کے سامنے پیش کرنے کے بھی ہوتے ہیں کہتے ہیں۔ دَفَعَ اِلَی السُّلْطَانِ اَیْ قَرَّبَہٗ۔ بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ پس اس آیت کے دو معنے ہوسکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ انہوں نے اپنے والدین کو بادشاہ کے پیش کیا۔ بائبل سے انہی معنوں کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو بادشاہ کے پیش کیا۔ دوسرے یہ معنے ہوسکتے ہیں کہ ان کو اپنے تخت پر بٹھایا۔ پُرانے زمانہ میں رواج تھا کہ نائب سلطنت کے لئے بھی ایک تخت ہُوا کرتا تھا۔ پس ممکن ہے کہ حضرت یوسفؑ کے لئے بھی ایک تخت مقرر ہو اور حضرت یوسفؑ نے بادشاہ کی اجازت سے ان کو اپنے تخت پر بٹھایا ہو ؎

رَفَعَ اَبَوَیْہِ عَلَی الْعَرْشِ کے دو معنے۔

وَخَرُّوْا لَہٗ سُجَّدًا۔ خَرَّ الْمَآءُ یَخِرُّ خَرِیْرًا۔ صَاتَ پانی نے بہتے ہوئے آواز پیدا کی۔ وَکَذٰلِکَ الرِّیْحُ وَالْقَصَبُ اسی طرح ہُوا کے چلنے اور سرکنڈوں کے ہلنے سے جب آواز پیدا ہو تو خَرَّ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ العقابُ۔ صَاتَ خَفْوقُ جَنَاحَیْھَا۔ عقاب کے لئے جب خرّ کا لفظ بولا جائے تو یہ مُراد ہوگی۔ کہ اس کے بازوؤں کے ہلنے سے آواز پیدا ہوئی النَّائِمُ۔ غَطَّ۔ سونے والے نے اونچی آواز سے خراٹے لئے۔ خَرَّ سَاجِدًا۔ اِنْکَبَّ عَلَی الْاَرْضِ۔ سجدہ کرتے ہوئے زمین پر

گر گیا وَانْجَرَّ صَوْتَ مَنْدُدًا۔ پتھر کے گرنے سے آواز پیدا ہوئی (اقرب الموارد)

خرّ کے جتنے معنے بیان ہوئے ہیں۔ ان سب میں آواز کے معنے پائے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ خرّ ساجدًا یہ اُس وقت بولیں گے جبکہ کوئی شخص بے تحاشا سبحان اللہ کہتا ہوا گر پڑے۔ اگر آواز ساتھ نہ ہو تو خالی سَجَدَ بولا جائے گا۔ تو خرّوا لہ سُجّدًا کے معنے یہ ہوئے کہ وہ بے تحاشا سبحان اللہ کہتے ہوئے سجدے میں گر گئے یا انہوں نے بڑے جوش و خروش سے سجدہ کیا اور ان کے اس طرح سجدہ میں گرنے سے ایک آواز بھی پیدا ہوئی +

خرّوا لہ سجدًا کے دو معنے۔

یہ مُراد نہیں کہ انہوں نے بادشاہ کو سجدہ کیا۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ یوسفؑ کی ترقی کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر گئے پس یوسف علیہ السلام سجدہ کے باعث تھے نہ کہ مسجود +

حضرت یوسف سجدہ کے باعث تھے نہ کہ مسجود۔

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْ۔ اس آیت سے نبیوں کے اعلیٰ آداب کا پتہ چلتا ہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ لوگ قحط اور تنگی سے نکل کر عزت اور آرام کے مقام پر چلے آئے تھے مگر حضرت یوسف علیہ السلام کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ آپ لوگوں کو یہاں لے آیا ہے۔ مومن کو کلام کرتے ہوئے ہمیشہ اس اصل کو مدنظر رکھنا چاہیئے کہ دوسرے کی دل شکنی نہ ہو۔ بلکہ اس کا ادب اور احترام کلام سے ظاہر ہو۔ یہ نہ صرف تمدن کی ترقی کا موجب ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا بھی موجب ہوتا ہے۔ بعض لوگ کلام میں بے احتیاطی کرتے ہیں۔ اور اس کا نام سادگی رکھتے ہیں حالانکہ نبیوں کا یہ طریق ہے کہ وہ ہمیشہ کلام میں دوسرے کا ادب اور احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور یہی طریق مومنوں کو اختیار کرنا چاہیئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آتا ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سے کلام کرتے تو اس کی طرف متوجہ ہو کر کلام کرتے۔ اور اگر کوئی آپ سے کلام کرتا تو اس کی طرف متوجہ ہو کر سنتے۔ آج کل بڑے لوگوں میں یہ عادت ہو گئی ہے کہ جب کسی سے کلام کرتے ہیں تو اس کی طرف آدھا رُخ رکھتے ہیں اور جب کوئی ان سے کلام کرے تو اسکی طرف پورے متوجہ نہیں ہوتے۔ یہ سب غیر مومنانہ افعال ہیں۔ ان سے مومن کو کلی اجتناب چاہیئے ورنہ دل پر زنگ لگ کر کبر پیدا ہو جاتا ہے +

نبیوں کے آداب

رسول کریمؐ ہر ایک کی طرف متوجہ ہو کر بات کرتے۔

پوری توجہ سے کسی کی بات نہ سننا کبر پیدا کرتی ہے

ہر بُری تحریک جس کا منبع معلوم نہ ہو قرآن اسے شیطان کی طرف منسوب کرتا ہے کیونکہ وہ باریک خیالات کا نتیجہ ہوتی ہے اور شیطان کا لفظ اپنے مادہ شطن کے لحاظ سے ایک ایسی ہستی پر دلالت کرتا ہے جو دُور سے وساوس پیدا کرتی ہے۔ اور کبھی یہ لفظ اس بدرُوح کے لئے استعمال ہوتا ہے جو فرشتوں کے مقابلہ پر بدی کے اسباب کی محرک ہوتی ہے اور کبھی ان پوشیدہ تحریکات پر جو گذشتہ اعمال کے نتیجہ میں دل میں پیدا ہو کر انسان کو ایسے موقع پر گناہ کی طرف لے جاتی ہے جبکہ بظاہر اس کے بدی میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی +

شیطان کا مفہوم

اللہ تعالیٰ کے لئے جب لطیف کا لفظ آوے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ مخفی باتوں کو جاننے والا لوگوں کی خبر گیری کرنے والا اور محبت اور احسان کے ساتھ ان کو نفع پہنچانے والا ہے۔ گویا وہ خبر گیری کرتا ہے اور اس کی خبر گیری کا منبع محبت ہوتی ہے۔ وہ خبر گیری کرنے کے ذرائع پیدا کرتا ہے۔ اور اس کا محرک بھی محبت ہی ہوتی ہے۔ اور احسان کرتا ہے تو وہ بھی رفق اور لطف کے ساتھ کرتا ہے یعنی باوجودیکہ وہ غنی ہے مگر اپنے استغناء کو بندے سے چھپاتا ہے تا بندے کی محبت خدا کے ساتھ بڑھے۔ گویا اس کے تمام افعال میں محبت ہی محبت نظر آتی ہے۔ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ کہہ کر بتایا کہ وہ اپنی مشیت کے مطابق لُطف کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہ اس کا لُطف ہر ایک کی استعداد کے مطابق اس پر نازل ہوتا ہے +

صفت لطیف کی تشریح۔

اَلْحَکِیْمُ کہہ کر اللہ تعالیٰ سے الزام دُور کیا کہ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خواب تو ترقی کی دکھائی تھی مگر ہوا یہ کہ ایک لمبا عرصہ تک سخت مصائب میں سے گذرنا پڑا لیکن اگر غور کریں تو یہی تکالیف اگر ایک طرف حضرت یوسف علیہ السلام کی ترقی کا موجب ہوئیں تو دوسری طرف ان کے بھائیوں کی پاکیزگی اور توبہ کا موجب ہوئیں۔ پس خدا تعالیٰ کا یہ فعل حکمت سے خالی نہ تھا۔ ان تکالیف کے بغیر اگر حضرت

الحکیم کہنے کی وجہ۔

الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ

عطا کیا ہے اور اپنی باتوں کی حقیقت کا بھی کچھ علم تُو نے مجھے بخشا ہے۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ

(اے) آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے تو (ہی) دُنیا اور آخرت (دونوں) میں

الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝

میرا مددگار ہے (جب بھی میری موت کا وقت آئے) مجھے اپنی کامل فرمانبرداری کی حالت میں وفات دے اور صالحین (کی جماعت) کے ساتھ ملا دے۔ ۹۵

یوسف کو جو عاشق تو وہ خدا تعالیٰ کے وعدوں کی عظمت کو اس قدر ثابت نہ کرتی اور نہ یوسف کے بھائیوں کے دلوں کی صفائی ہوتی بس جو کچھ ہوا حکمت کے ماتحت ہوا نہ کہ بے سبب +

ویری کا اعتراض اور اس کا جواب

فاطر

۹۵ حل لغات ۔ فاطر، فَطَرَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے جس کے معنے ہیں پیدا کرنے والا۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو ہود ۵۲ توفنی مجھ کو وفات دے مزید تشریح کے لئے دیکھو یونس ۴۷ تاویل حقیقت مزید تشریح کے لئے دیکھو یوسف ۲۲

تاویل

ملک سے مراد تصرف ہے نہ کہ بادشاہت

تفسیر ۔ یہ آیت اس عشق پر دلالت کرتی ہے جو خدا تعالیٰ کے برگزیدہ لوگوں کے دلوں میں موجزن ہوتا ہے ان کے رشتہ داروں کی ملاقات پر خوشی کا اظہار کرتے کرتے یکدم اللہ تعالیٰ کی محبت کا شعلہ اُٹھتا ہے اور وہ سب کچھ بھول بھال کر خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں دنیا و مافیہا ان کی نظر سے غائب ہو جاتے ہیں اور وہ بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ اے خدا یہ سب کچھ تیرا ہی دیا ہوا ہے یہی وہ حقیقی سجدہ ہے جو انسان کو رُوحانی میدان میں ترقی بخشتا ہے۔ ظاہری سجدہ تو ایک وقتی سجدہ ہے اصل سجدہ یہی ہے کہ خوشی اور غم کے موقع پر انسان کی نگاہ اللہ تعالیٰ کی طرف اُٹھ جائے اور اس کا دل بے تاب ہو کر اسکی طرف جھک جائے۔ اس مقام کے حصول کے بغیر کوئی رُوحانی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی اور اس جنت میں انسان داخل نہیں ہو سکتا جس کے بغیر اگلے جہان کی جنت کا ملنا ناممکن ہے۔

برگزیدہ لوگوں کا خدا تعالیٰ سے عشق

انبیاء کا وجود صفات الٰہیہ کا ثبوت ہوتا ہے

ویری نے اس جگہ اعتراض کیا ہے کہ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ میں وہی قرآن والا کبر ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ قرآن والا کبر نہیں بلکہ قرآن والی محبت ہے کہ ہر بات میں خدا کا ذکر کر دیتے ہیں بائبل والی خود غرضی نہیں کہ کام ہو گیا تو نام لینا ہی چھوڑ دیا +

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بادشاہت مل گئی تھی۔ مگر اس سے یہ مراد نہیں۔ ملک سے مراد تصرف اور قبضہ ہے اور وہ ان کو بادشاہِ وقت کے حکم سے حاصل تھا۔ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ۔ تُو نے مجھے خوابوں کی حقیقت سکھا دی یعنی انہیں پورا کر کے دکھا دیا۔ یا یہ کہ تُو نے مجھے تعبیر الرؤیا کا علم سکھا دیا +

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ انبیاء کا وجود صفات الٰہیہ کا ثبوت ہوتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام یہ کہتے ہیں کہ میری زندگی اللہ تعالیٰ کے فاطر السموٰت والارض ہونے کا ثبوت ہے جب میں اکشر محض تھا خدا تعالیٰ نے مجھے اعلیٰ ترقیات کی خبر دی اور پھر میں جو ایک معمولی حیثیت کا انسان تھا مجھے طاقت دے کر ایک بڑی حکومت بخشی اور گویا ایک نیا آسمان اور زمین پیدا کر دیا۔ پس میرے وجود سے اللہ تعالیٰ کے فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہونے کا ثبوت مل گیا ہے +

اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ درحقیقت دُعا بھی

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ

(اے ہمارے رسول!) یہ (بیان) غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اسے تجھ پر وحی کے ذریعہ سے ظاہر کرتے ہیں۔ اور جب انہوں نے (یعنی

لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝ ۹۹

تیرے دشمنوں نے) اپنی بات پر اس حال میں اتفاق کر لیا کہ وہ (سب کے سب) تیرے خلاف کوششیں کر رہے تھے تو تو (اس وقت) انکے پاس (موجود) نہیں تھا

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا

اور خواہ تو (کتنا ہی) چاہے (کہ سب لوگ ہدایت پا جائیں) اکثر لوگ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے ۱۰۰ اور تو

تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ۱۰۱ ع ۱۱ ۵

اسے (تبلیغ و تعلیم) کی بابت ان سے کوئی اجر نہیں مانگتا یہ تو تمام جہانوں (اور سب لوگوں) کے لئے (خود) سراسر شرف (کا موجب) ہے

لئے خدا تو میرا دُنیا و آخرت میں مددگار بن۔ چنانچہ اسی کی تشریح میں فرمایا تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ یعنی اس دُنیا میں میرا انجام بخیر ہو اور اگلے جہان میں میں ان لوگوں میں شامل رہوں جو ترقی کے قابل ہیں۔ ولایت دنیوی کی تفسیر تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا کے الفاظ سے کی ہے اور ولایت اُخروی کی تفسیر اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ کے الفاظ سے اگر کوئی یہ سوال کرے کہ جب تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا کہہ دیا تو اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ کی کیا ضرورت تھی جو مُسلم فوت ہوگا صالحین میں اُٹھے گا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مسلم کا لفظ عام ہے۔ ایک شخص جس کا اسلام حقیقت میں کمزور ہے وہ ظاہری شریعت کی رو سے مسلم کہلا سکتا ہے اور ایسا شخص تھوڑی سی سزا پاکر جنت میں داخل ہو جائے گا مگر حضرت یوسف علیہ السلام چاہتے ہیں کہ اس دُنیا سے وہ ایسا مسلم ہونے کی حالت میں جائیں کہ آگے جاکر صالحین کے ساتھ الحاق ہو یعنی ایسے کامل مسلم ہوں کہ بغیر کسی روک کے مرنے کے بعد ترقیات ہی کی طرف قدم اُٹھے اور یہی وہ مقام ہے جس کی جستجو مومن کو ہونی چاہیئے ۔

۹۹ حل لغات۔ اَجْمَعُوْا۔ اَجْمَعَ ماضی سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور اَجْمَعَ الْقَوْمُ عَلَى الْاَمْرِ کے معنے ہیں۔ اتفقوا علیہ قوم نے کسی بات پر اتفاق کر لیا (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں واضح کر دیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا واقعہ قصہ کے طور پر بیان نہیں ہوا ہے بلکہ یہ غیب کی خبریں ہیں یعنی اس واقعہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آئندہ زندگی کے متعلق خبریں ہیں چنانچہ جیسا کہ اس سورۃ کی مختلف آیات کی تفسیر میں بتایا گیا ہے حضرت یوسفؑ کی زندگی کے تمام اہم حالات آنحضرت صلعم کی زندگی میں پورے ہوئے ہیں۔ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ان تمام لوگوں کے پاس نہ تھا جب انہوں نے تیرے متعلق اپنا منصوبہ کیا اور وہ مختلف تدبیریں کرتے تھے ۔

اس جگہ یوسفؑ کے بھائی مراد نہیں بلکہ آنحضرت صلعم کے بھائی مراد ہیں اور بتایا ہے کہ جو سلوک مکہ والوں نے تجھ سے یوسفؑ کے بھائیوں کی مماثلت میں کرنا ہے۔ وہ تیرے اختیار کی بات تو نہیں پس یہ اخبار غیب کسی انسانی دماغ کا اختراع نہیں کہلا سکتیں بلکہ عالم الغیب کی بتائی ہوئی ہیں ۔

۱۰۰ تفسیر یعنی تیری ذاتی کوشش تو یہی ہوگی کہ تیری قوم تجھ پر فوراً ایمان لائے لیکن منشائے الٰہی یہی ہے کہ ان سے یوسف کے بھائیوں والے کام ہوں اور تیری خارق عادت ترقی کے بعد وہ ایمان لائیں نہ کہ اس سے پہلے ۔

۱۰۱ حل لغات۔ اَلذِّكْرُ۔ اَلتَّحَفُّظُ بِالشَّيْءِ وَاِحْضَارُهُ۔ اَلذِّكْرُ

حضرت یوسفؑ کا واقعہ قصے کے طور پر بیان نہیں ہوا۔

ولایت دُنیوی اور ولایت اُخروی کی تفسیر۔

اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ میں آنحضرت کے بھائی مُراد ہیں

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ

اور آسمانوں اور زمین میں بہت سے نشان (موجود) ہیں جن کے پاس سے یہ لوگ ان سے

عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ

اعراض کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں ۱۰۲؎۱۰۵ اور ان میں سے اکثر (لوگ) اللہ (تعالیٰ) پر ایمان نہیں

فِی النَّفْسِ بِحَیْثُ لَا یَغِیْبُ عَنْہُ کسی چیز کو منہ سے ذکر کرنا اور اس کو اپنے مستحضر فی النّاس کرنا کہ وہ بھول نہ جائے۔ اَلصِّیْتُ وَمِنْہُ لَہٗ ذِکْرٌ فِی النَّاسِ۔ شہرت۔ اور انہی معنوں میں لَہٗ ذِکْرٌ فِی النَّاسِ کا فقرہ بولتے ہیں کہ فلاں شخص کو لوگوں میں شہرت حاصل ہے۔ اَلثَّنَاءُ تعریف۔ اَلشَّرَفُ شرف۔ وَفِی الْقُرْاٰنِ اِنَّہٗ لَذِکْرٌ لَّکَ وَلِقَوْمِکَ۔ اور قرآن مجید میں اِنَّہٗ لَذِکْرٌ لَّکَ وَلِقَوْمِکَ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے کہ قرآن مجید کا نزول تیرے اور تیری قوم کے لئے شرف کا موجب ہے۔ وَالصَّلٰوۃُ لِلّٰہِ تَعَالٰی وَالدُّعَاءُ اللہ کے حضور دُعا۔ چنانچہ انہی معنوں میں یہ فقرہ استعمال ہوتا ہے۔ اِذَا حَزَبَہٗ اَمْرٌ فَزِعَ اِلَی الذِّکْرِ کہ جب مصیبت کا سامنا ہوا۔ تو اس نے دُعا کی طرف جلدی کی۔ اَلْکِتَابُ فِیْہِ تَفْصِیْلُ الدِّیْنِ وَوَضْعُ الْمِلَلِ۔ ایسی کتاب جس میں دین کی تفصیل اور شریعت کے اصول ہوں۔ مِنَ الرِّجَالِ۔ اَلْقَوِیُّ الشُّجَاعُ الْاَبِیُّ۔ ایسا بہادر شخص جو کسی کا رُعب برداشت نہ کرے۔ مِنَ الْمَطَرِ۔ اَلْوَابِلُ الشَّدِیْدُ سخت موسلا دھار بارش۔ مِنَ الْقَوْلِ۔ اَلصُّلْبُ الْمَتِیْنُ۔ پکی بات (اقرب)

حضرت یوسفؑ اور رسول کریمؐ کے تذکرہ میں ایک امتیازی فرق۔

كَاَيِّنْ

تفسیر۔ جس طرح یوسفؑ کے بھائیوں نے ان کی رؤیا سے یہ سمجھ لیا کہ اسکی بڑائی ہماری ذلت کا موجب ہوگی۔ حالانکہ انکی ترقی میں خود بھائیوں کی ترقی مقدر تھی۔ اسی طرح فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو وعدے ہوئے ہیں ان سے آپ کی قوم کے لوگ ناراض ہوتے ہیں اور ان میں اپنی ذلت محسوس کرتے ہیں حالانکہ وہ اپنی عزت کے لئے ان سے کوئی مدد طلب نہیں کرتا کہ جس سے ان کو یہ خیال ہو کہ اسکی بڑائی میں ہماری کمزوری ہے ÷ پس فرماتا ہے کہ اے ہمارے رسول! تو اگر ان سے مدد کا

حضرت یوسفؑ کی ترقی میں ان کے بھائیوں کی ترقی مقدر تھی۔

خواہاں ہو کر اپنی بڑائی کا طالب ہوتا۔ تو ان کے غصہ کی کوئی وجہ ہوتی لیکن تو تو وہ چیز ان کو دیتا ہے جو نہ صرف ان کی عزت کا بلکہ سب دُنیا کی عزت کا موجب ہوگی پس ان کی ناراضگی بے سبب اور ان کا غصہ بلا وجہ ہے ÷

آنحضرتؐ کی حضرت یوسف سے اٹھارھویں مشابہت

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معاملہ میں بھی حضرت یوسف علیہ السلام سے مشابہت ہے یوسف علیہ السلام نے تو ایک بادشاہ کے ماتحت اپنے بھائیوں کو عزت بخشی مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بھائیوں کو آزاد حکومتوں کا مالک بنا دیا۔ اور آپ کے دو خسر کہ وہ بھی رشتہ کے لحاظ سے باپ کی جگہ ہوتے ہیں زبردست بادشاہتوں کے مالک ہوئے یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ ÷

۱۰۵؎ حل لغات۔ كَاَيِّنْ وَكَاَيٍّ اِسْمٌ مُرَكَّبٌ مِنْ كَافِ التَّشْبِيْهِ وَاَيِّ الْمُنَوَّنَةِ وَلِذٰلِكَ جَازَ الْوَقْفُ عَلَيْهَا بِالنُّوْنِ وَفِيْهَا لُغَاتٌ اُخْرٰى وَهِيَ كَيْئِنْ وَكَائِنْ وَكَاْءٍ وَكَاءٍ۔ وَهِيَ تُوَافِقُ كَمْ فِيْ خَمْسَةِ اُمُوْرٍ وَهِيَ الْاِبْهَامُ وَالْاِفْتِقَارُ اِلَى التَّمْيِيْزِ وَالْبِنَاءُ وَلُزُوْمُ التَّصْدِيْرِ۔ وَاِفَادَةُ التَّكْثِيْرِ تَارَةً وَهُوَ الْغَالِبُ نَحْوُ كَاَيِّنْ مِنْ رَجُلٍ وَالْاِسْتِفْهَامِ اُخْرٰى وَهُوَ نَادِرٌ۔ كَقَوْلِ اُبَيِّ بْنِ اَبِيْ كَعْبٍ لِابْنِ مَسْعُوْدٍ كَاَيِّنْ تَقْرَءُ سُوْرَةَ الْاَحْزَابِ فَقَالَ ثَلَاثًا وَسَبْعِيْنَ۔ وَتُخَالِفُهَا فِيْ سَبْعِ اُمُوْرٍ۔ الْاَوَّلُ اَنَّهَا مُرَكَّبَةٌ۔ وَالثَّانِي اَنَّ مُمَيِّزَهَا مَجْرُوْرٌ بِمِنْ غَالِبًا وَالثَّالِثُ اَنَّهَا لَا تَقَعُ اِسْتِفْهَامِيَّةً عِنْدَ الْجُمْهُوْرِ۔ وَالرَّابِعُ اَنَّهَا لَا تَقَعُ

بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۝ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ

لاتے مگر اس حالت میں کہ وہ (ساتھ) ساتھ شرک بھی کرتے جاتے ہیں ۱۰۳؎ تو کیا یہ (لوگ) اس بات سے (محفوظ اور)

غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ

بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر اللہ کے عذابوں میں سے کوئی سخت عذاب آجائے۔ یا اچانک ان پر وہ گھڑی آجائے

مَجْرُوْرَةً۔ اَلْخَامِسُ اَنَّ خَبَرَهَا لَا يَقَعُ مُفْرَدًا (اقرب) یعنی کاین کاف تشبیہ اور ایّ سے مرکب ہے اور اس کا نون تنوین کا ہے۔ اسے کئی طرح سے بولا جاتا ہے جسکی حسب ذیل مختلف صورتیں ہیں کاین۔ کائ۔ کاین۔ کأیٍ۔ کایٍ۔ کاءٍ۔ کاءٍ اور یہ لفظ پانچ باتوں میں لفظ کم کے مطابق ہے۔ اور پانچ باتوں میں اس کے خلاف ہے۔ جن پانچ باتوں میں کم کی طرح ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) یہ بھی مبہم ہوتا ہے (۲) اور تمیز کا بھی محتاج ہوتا ہے۔ (۳) یہ بھی مبنی ہوتا ہے (۴) اس کو بھی جملہ کے صدر میں لانا ضروری ہے (۵) عام طور پر کثرت پر دلالت کرتا ہے اور کبھی استفہام کے لئے بھی آتا ہے۔ جیساکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ابی ابن کعبؓ سے اسی لفظ کے ساتھ یہ سوال کیا تھاکہ سورہ احزاب کی تمہاری قراءۃ کی رو سے کتنی آیتیں ہیں جس کا انہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ ۷۳۔ اور جن باتوں میں کم سے کاین اختلاف رکھتا ہے وہ یہ ہیں (۱) کاین مرکب ہے۔ اور کم بسیط (۲) کاین کے مجرور پر عام طور پر حرف مِنْ آتا ہے اور کم کے مجرور پر اس طرح پر نہیں آتا (۳) کاین استفہام کے لئے جمہور کے نزدیک نہیں آتا (۴) کاین پر حرف جر یا مضاف نہیں آتا (۵) اسکی خبر ہمیشہ جملہ ہوتی ہے؛

تفسیر یعنی آسمانوں اور زمین میں بہت سے نشانات ہیں جن کے پاس سے یہ اعراض کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں اور ان سے فائدہ نہیں اُٹھاتے +

کافر اور مومن میں یہی فرق ہے کہ مومن تو آنکھیں کھول کر چلتا ہے اور اللہ تعالےٰ کے ہر اشارہ کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کافر اندھے کی طرح بڑے سے بڑے نشان کو دیکھنے سے محروم رہ جاتا ہے حالانکہ حقیقت دونوں کے سامنے ایک ہی ہوتی ہے۔ اور کافر و مومن کی طاقتیں بھی ایک ہی سی ہوتی ہیں۔ ہاں جب عذاب آنے شروع ہوتے ہیں تب کفار کی آنکھیں کُھلنی شروع ہوتی ہیں۔ اور آہستہ آہستہ حسب مراتب وہ اللہ تعالےٰ کے نور کو دیکھنا شروع کرتے ہیں +

اللہ تعالیٰ کے انبیا درحقیقت ایک ابتلاء ہوتے ہیں کیونکہ ان کے زمانہ میں انسانوں کی طاقتیں اور انکے اندرونے ظاہر ہوجاتے ہیں جس سرعت یا تاخیر سے انسان مانتا ہے اسی نسبت سے اسکی روحانی طاقتوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے

انبیا ایک ابتلاء ہوتے ہیں۔ کائ پانچ باتوں میں کم کے مطابق ہے اور پانچ میں مخالف۔

کیا عجیب نظارہ ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو ذرہ ذرہ میں خدا تعالےٰ کے نشانات نظر آنے لگتے ہیں بعض کو لاکھوں بعض کو ہزاروں بعض کو سینکڑوں۔ اور بعض کو بیسیوں نشان نظر آتے ہیں۔ اور بعض یہی شور مچاتے چلے جاتے ہیں کہ ایک بھی نشان نہیں دکھایا گیا۔ کوئی نشان نظر آئے تو مانیں +

۱۰۳؎ تفسیر۔ ان میں سے اکثر اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے مگر ایسے حال میں کہ وہ مشرک ہوتے ہیں ہر کام کو دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اصل باعث کو نہیں سمجھتے مثلاً زید مرجاتا ہے تو کہتے ہیں فلاں بیماری کی وجہ سے مر گیا ہے یہ نہیں دیکھتے کہ یہ شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی وجہ سے مرا ہے اگر کسی کو ترقی کرتا ہوا دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنی عقل کے زور سے ترقی کر گیا ہے یہ نادان نہیں دیکھتے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے آپ کی سچی اتباع کی بدولت ترقی کر گیا ہے

کافر و مومن میں فرق۔

بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا

(جسکی پہلے سے خبر دی جا چکی ہے) اور انہیں پتہ بھی نہ لگے ۱۰۴ تو کہہ (کہ) یہ میرا طریق ہے میں (تو)

اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ

اللہ (تعالیٰ) کی طرف بلاتا ہوں۔ میں اور جنہوں نے (سچے طور پر) میری پیروی اختیار کی ہے (ہم سب) بصیرت پر قائم ہیں۔ اور

آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے پہلے بھی تو وہ ان میں موجود تھا؟ اس وقت کیوں ترقی نہ کی ؟

کامل توحید بغیر روحانی بینائی تیز نہیں ہوتی۔

اس آیت میں کفار کی نابینائی کی وجہ بتائی ہے کامل توحید کے بغیر روحانی بینائی تیز نہیں ہوتی۔ چونکہ عام طور پر لوگوں کے عقیدوں میں شرک کی ملونی پائی جاتی ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے جلوہ کو دیکھ نہیں سکتے۔ اور اگر دیکھ لیں تو پہچان نہیں سکتے۔ کیونکہ شرک تب ہی پیدا ہوتا ہے جب صفات الٰہیہ کو صحیح طور پر نہ سمجھا جائے۔ شرک کرنے والے کو دائما اللہ تعالےٰ کی صورت بدلنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ تا جھوٹے معبودوں کو اس کا ہم شکل ثابت کر سکے۔ اور اس کا ایک گہرا اثر اس کے دل پر یوں پڑ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی شکل یعنی اسکی پاک اور مکمل صفات اسکی یاد سے اتر جاتی ہیں اور وہ اس کے جلوہ کو پہچاننے کے قابل نہیں رہتا چنانچہ

مشرک خدا تعالیٰ کے کاموں کو معبودان باطلہ کی طرف منسوب کرتا ہے

مشرک ہمیشہ اللہ تعالےٰ کے کاموں کو دوسروں کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اگر کسی معین بت یا دیوتا کی طرف منسوب نہیں کرتا۔ تو اسباب کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ اگر کسی کا خیال اس کے دل سے کلی طور پر محو ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کا خلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب کفار تباہی کے نشان دیکھتے۔ تو ان کے دوسرے اسباب تلاش کرتے جب آپ کو اور آپ کے صحابہ کو غیر معمولی ترقی پاتے ہوئے دیکھتے۔ تو اس کے بھی مادی اسباب تلاش کرتے اور یہ نہ دیکھتے کہ یہ سب اسباب دعویٰ سے پہلے بھی موجود تھے۔ مگر نتائج ویسے نہ تھے ؟

۱۰۵ حل لغات ۔ اَمِنَ۔ اِطْمَاَنَّ۔ بے خوف اور مطمئن ہوگیا۔ اَلْاَسَدَ وَمِنْهُ۔ سلم۔ شیر کے حملہ سے محفوظ رہا۔ پس اَفَاَمِنُوْا کے معنی ہوئے۔ کیا وہ بے خوف ہوگئے۔ (اقرب)

اَلْغَاشِيَةُ۔ یہ غاشی کا مؤنث ہے جو غَشِيَ يَغْشٰى سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ غشی کے معنی ہیں ڈھانپ لیا اور الغاشیہ کے معنی ہیں اَلْغِطَاءُ پردہ۔ اَلْقِيَامَةُ لِاَنَّهَا تَغْشٰى بِاَفْزَاعِهَا قیامت کو بھی غاشیہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اسکی گھبراہٹ سب کو ڈھانپ لے گی۔ نَارُ جَهَنَّمَ۔ جہنم کی آگ۔ اَلدَّاهِيَةُ مصیبت۔ وَمِنْهُ "تَاْتِيَهٗ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ" اَیْ نَائِبَةٌ تَغْشَاهُ اور تَاْتِيَهٗ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ۔ انہی مذکورہ بالا معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہ عذاب کی کوئی ایسی عام مصیبت آئے جو سب پر چھا جائے۔ الغاشیہ کے معنوں میں یہ بات ملحوظ ہے کہ ایسی مصیبت یا ایسا عذاب ہو جو عام ہو۔ اور سب پر چھا جائے کیونکہ غشی کے معنے جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ ڈھانپ لینے کے ہیں۔ اور ڈھانپ وہی عذاب لیتا ہے جو عام ہو۔ (اقرب)

اَلْبَغْتَةُ۔ اَلْفَجْاَةُ۔ کسی واقعہ کا ناگہانی طور پر ایسی جگہ سے وقوع پذیر ہونا جہاں سے توقع بھی نہ ہو وَهُوَ اَمَّا حَالٌ فِيْ تَاْوِيْلِ بَاغِتًا اَوْ مَصْدَرٌ فِيْ تَاْوِيْلِ اَبْغَتَ بَغْتَةً۔ بغتۃ کے استعمال کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل یا تو اس کو حال قرار دیں یعنی ایسی حالت میں کوئی چیز واقع ہوئی کہ اس کا واقعہ ہونا اچانک ہی تھا۔ یا پھر اَبْغَتَ پہلے فعل محذوف ہوگا۔ اور یہ اس کا مفعول مطلق ہوگا۔ جو مصدر کی صورت میں ہوگا۔ وَالْاَوَّلُ اَصَحُّ۔ پہلی تاویل زیادہ صحیح ہے۔ (اقرب)

شَعَرَ بِهٖ۔ عَلِمَ بِهٖ۔ معلوم کیا۔ لِكَذَا۔ فَطِنَ لَهٗ۔ اس کو سمجھا۔ عَقَلَهٗ۔ اس کو پہچانا۔ اَحَسَّ بِهٖ محسوس کیا (اقرب)

هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔ کے معنے ہونگے کہ ان پر عذاب اتنا اچانک آئے کہ اس کے آنے کا ان کو علم بھی نہ ہو سکے ؟

اللّٰہِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ○ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ

اللہ (تعالیٰ سب قسم کے نقائص سے) پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں ۱۰۵؎ اور تجھ سے پہلے (بھی) ہم (لوگوں کی

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ چونکہ کفار نشان عذاب کو ہی حقیقی نشان سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان پر وہ عذاب بھی آجائے گا۔ مگر سنت اللہ کے مطابق پہلے ادنیٰ عذاب آئینگے آخر میں فیصلہ کردینے والا عذاب آئے گا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح عذاب آئے کہ پہلے علاوہ اور عذابوں کے معمولی معمولی شکستیں کفار کو ہوئیں اور آخر فتح مکہ کا واقعہ ہوا کہ خود مکہ میں لشکر اسلام داخل ہوگیا اور کفار کو ذلت کے ساتھ ہتھیار پھینک دینے پڑے اور اس آیت میں ساعت سے مراد وہی فتح مکہ کی ساعت ہے کیونکہ اس کے بعد وہ زبردست مشابہت جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت یوسفؑ سے تھی پوری ہوئی یعنی دشمن کو پورے طور پر زیر کر لینے کے بعد آپؐ نے اس کی سب شرارتوں کو بھلا دیا اور بغیر کسی سزا دینے کے کلی طور پر اسے معاف کر دیا ✦

۱۰۵؎ حل لغات۔ اَلْبَصِیْرَۃُ کے معنے ہیں۔ اَلْعَقْلُ عقل۔ اَلْفِطْنَۃُ ذہانت۔ مَا یُسْتَدَلُّ بِہٖ جس کے ذریعہ سے کسی کے متعلق استدلال کیا جائے۔ اَلْحُجَّۃُ دلیل۔ اَلْعِبْرَۃُ یُعْتَبَرُ بِھَا عبرت۔ اَلشَّاھِدُ گواہ۔ وَمِنْہُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ اے علیہا شاھدٌ بعملہا۔ اور عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ میں بصیرۃ کے معنی گواہی کے ہیں یعنی نفس کے اعمال پر ایک گواہ مقرر ہے اسکی جمع بصائر آتی ہے (اقرب) اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ای عَلٰی مَعْرِفَۃٍ وَتَحْقِیْقٍ۔ آیت ادعوا الی اللّٰہ علٰی بصیرۃ میں بصیرۃ کے معنے معرفت اور تحقیق کے ہیں (مفردات)

تفسیر۔ یعنی جو باتیں اوپر مذکور ہوئی ہیں یعنی آیات اور نشانات سے فائدہ اٹھانا اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور شرک سے اجتناب کرنا یہی میرا راستہ ہے۔ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ میں گویا اس پہلے مضمون کو دوبارہ دُہرایا گیا ہے۔ پہلے اسکی طرف ھٰذِہٖ کے ساتھ اشارہ کیا اور پھر ادعوا الی اللّٰہ کے ساتھ اس تفصیل کا خلاصہ بیان فرمادیا۔ نیز پہلے فرمایا تھا مَا تَسْئَلُھُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ یعنی تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ اب فرماتا ہے۔ کہ بجائے تم سے مانگنے کے جو کچھ اسے ملا ہے اس میں تم کو شریک کرنا چاہتا ہے ✦

خدا بندوں کے حقوق الٰہی سنت۔

کیا عجیب فرق ہے سچے ولی اللہ اور جھوٹے ولیوں میں جھوٹے ولی مخفی اذکار کے مدعی ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں اسم اعظم حاصل ہے یا خاص وظیفہ معلوم ہے جو وہ کسی کو بتا نہیں سکتے مگر اس کے برخلاف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مجھے خدا مل گیا ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تم کو بھی مل جائے اور اسی کے لئے میں تم کو بلا رہا ہوں نہ کہ تم سے کچھ لینے کے لئے ✦

سچے ولیوں اور جھوٹے ولیوں میں فرق۔

ساعت سے مراد فتح مکہ کی ساعت ہے۔

پھر فرمایا کہ تو کہہ دے کہ اس عظیم الشان خدمت میں بھی میں جبر سے کام نہیں لیتا بلکہ دلائل اور براہین سے تم پر حقیقت کو آشکار کرتا ہوں تعجب ہے کہ اس تعلیم کی موجودگی میں مسلمانوں میں سے بعض جبر کے طریق کو پسند کرتے اور اس طرح اسلام کو دشمنوں کی نگاہ میں رسوا کرتے ہیں ✦

یہ آیت بتاتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی کامل متبع کہلا سکتا ہے جو عقل اور دلیل کے ماتحت آپ کو مانتا ہے۔ جو مسلمان ایسا ہے کہ وہ اسلام کو یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کو نبیوں کو قیامت اور حشر نشر کو تقدیر اور فرشتوں کو عقل اور دلائل کے ماتحت سمجھ کر نہیں مانتا بلکہ محض نقل اور تقلید کے طور پر مانتا ہے وہ اس آیت کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا متبع نہیں کہلا سکتا۔ خالی کہہ دینا کہ میں قرآن کو مانتا ہوں جبکہ نہ قرآن کریم کی صداقت کے دلائل معلوم ہوں نہ ان امور کے جو اس میں مذکور ہیں کسی کو رسول کریم کا متبع نہیں بنا سکتا۔ آپؐ کے متبع تو بینا ہوتے ہیں اور ایسا شخص اندھا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے لوگ دوسری کتب کے اندھے ہیں یہ شخص قرآن کریم کا اندھا ہے

آنحضرتؐ کا کامل متبع وہی ہے جو آپؐ کو عقل اور دلیل سے مانتا ہے۔

ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْ سے مراد۔

اس آیت نے مسلمانوں کی ذمہ داری بہت بڑھا دی ہے جب تک وہ اپنی نسلوں کو اسلام کی صداقت کے دلائل سے آگاہ نہیں

اپنی نسلوں کو اسلام کی حقیقت سے آگاہ کرنا فرض ہے

قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ

رہنمائی کے لئے ہمیشہ) انہی (دنیا کی) بستیوں کے رہنے والے مردوں ہی کو جن پر ہم (اپنی) وحی نازل کرتے تھے رسالت دیکر بھیجے

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ

ہے ہیں تو کیا یہ (لوگ) زمین میں نہیں پھرے تا دیکھتے (کہ) جو (لوگ) ان سے پہلے (انبیاء کے منکر) تھے ان کا

عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ

انجام کیسا ہوا تھا۔ اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے حق میں

خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَا

جنہوں نے تقوی اختیار کیا یقیناً زیادہ بہتر ہے۔ پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ۱۱۰۔ یہاں تک کہ جب

رکھنے اور دلائل بھی وہ جو بصیرت پیدا کرتے ہیں صرف عقل نہیں بلکہ عقل اور مشاہدہ کا مجموعہ دلائل۔ اس وقت تک وہ رسول کریمؐ کے متبع نہیں پیدا کرتے بلکہ ایک بے سر فوج پیدا کر رہے ہیں +

افسوس آج کل مسلمان اس دَور انحطاط سے گذر رہے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے سر کفار کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اور ان کی باتیں بے اثر ہوگئی ہیں۔ بجائے غیر قوموں میں تبلیغ اسلام کے اسلام سے لوگ مرتد ہونے لگے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون +

سُبْحٰنَ اللّٰهِ کہہ کر بتایا ہے۔ کہ خدا تعالے کو زبردستی مسلمان بنانے کی کیا ضرورت۔ زبردستی کا ایمان بے فائدہ شئے ہے زبردستی تو وہ لوگ کرتے ہیں جو لوگوں کی اتباع میں اپنی شان دیکھتے ہیں اور اللہ تعالے عیبوں سے پاک ہے۔ اس میں کونسی کمی آتی ہے اگر لوگ اس پر ایمان نہ لائیں۔ پھر جبر وہ کرتا ہے جو دلائل سے نہ منوا سکے۔ اور یہ بھی نقص ہے اور اللہ تعالیٰ نقصوں سے پاک ہے +

وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ گو یہ کام جو میں نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ بہت بڑا ہے لیکن میں شرک سے کُلّی پاک ہوں اور میری نگاہ میں یہ کام بڑا نہیں۔ میں خدا تعالے پر کامل توکل رکھتا اور غیر اللہ کو حقیر سمجھتا ہوں پس خواہ کام کتنا بڑا ہو مجھے اپنی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں۔ دوسرے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ جب بھی ایمان بغیر بصیرۃ کے ہوگا۔ قوم میں ضرور شرک پیدا ہو جائے گا +

۱۱۰ تفسیر۔ اس آیت سے نتیجہ نکلتا ہے کہ نبی صرف مردوں میں سے آتے ہیں۔ عورت بعض حکمتوں کی وجہ سے اس عہدہ پر مقرر نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مرد اور عورت کو اللہ تعالی نے الگ الگ کام کے لئے بنایا ہے۔ اور چونکہ نبوت کا منصب عورت کے دائرہ عمل سے باہر ہے اس لئے اس پر صرف مردوں کو مقرر کیا جاتا ہے۔ باقی انعامات چونکہ عورتوں کے دائرہ سے باہر نہیں ان میں وہ مردوں کے ساتھ شریک ہیں۔ وہ صدیقہ ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں ولیہ ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں قانتہ ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں غرض سوائے نبوت کے کہ وہ ایک عہدہ ہے باقی سب انعامات ان کو مل سکتے ہیں اور ملتے رہے ہیں۔ مفہوم آیت کا یہ ہے کہ پہلے بھی نبی انسانوں اور ان میں سے بھی مردوں میں سے آتے رہے ہیں پس یہ خیال کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو ہمارے جیسا انسان ہے نبی کس طرح ہوگیا ایک وسوسہ ہے اس وسوسہ کے دھوکے میں آکر اپنے آپ کو تباہ نہ کر لینا جو پہلے نبیوں کے دشمنوں سے ہوا وہی اس کے مخالفوں سے ہو کر رہے گا +

[1] ایمان بغیر بصیرت کے قوم میں شرک پیدا کرتا ہے۔

[2] نبی صرف مردوں میں سے آتے ہیں۔

[3] نبوت کا منصب عورت کے دائرہ عمل سے باہر ہے۔

[4] سُبحان اللہ کہنے کی وجہ۔

اسْتَايْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا

(ایک طرف تو) رسول (ان کی جانب سے) ناامید ہو گئے اور (دوسری طرف) ان (منکروں) کا (یہ) پختہ خیال ہوگیا

جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ

کہ ان سے (وحی کے نام سے) جھوٹی باتیں کہی جا رہی ہیں تو (اس وقت) ان (رسولوں) کے پاس ہماری مدد آگئی

بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ لَقَدْ كَانَ فِيْ

اور جنہیں ہم بچانا چاہتے تھے (انہیں) بچا لیا گیا۔ اور مجرم لوگوں سے ہمارا عذاب (ہرگز) نہیں ہٹایا جاتا ۱۳۵ ان (لوگوں) کے

وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ آخر میں فرمایا کہ کفار اپنی موجودہ شان و شوکت کا خیال نہ کریں اگر کم غور کریں کہ جو قوم عدل و انصاف کرے اور خدا سے ڈرے انجام کار اسی کی فتح ہوتی ہے اور یہ قاعدہ ایسا بدیہی ہے کہ تعجب ہے لوگ اسے کس طرح بھول جاتے ہیں۔ دُنیا کو ایک وقت تک دھوکا دیا جا سکتا ہے ایک لمبے عرصہ تک دھوکا نہیں دیا جا سکتا آخر لوگ اپنے نفع نقصان کو دیکھتے ہوئے ان لوگوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ کا خوف رکھتے ہوئے بنی نوع انسان کی بھلائی کرتے ہیں اور اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور اس وقت ظلم کرنے والوں کی حقیقت کھل جاتی ہے۔

خیر کے لفظ سے جس کے معنے زیادہ بہتر کے ہوتے ہیں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ موجودہ حالت بھی متقی کی اچھی ہوتی ہے گو وہ دوسروں کی نگاہوں سے مخفی ہو کیونکہ بے غرضی سے اور صرف خدا تعالیٰ کے لئے کام کرنا دل میں ایک ایسی طاقت پیدا کر دیتا ہے کہ باوجود ظاہری کمزوری کے بشاشت اور اطمینان ایسے ہی شخص کو نصیب ہوتا ہے برخلاف اس کے خدا تعالیٰ سے دُوری اور لالچ اور خود غرضی کی حالت عدم اطمینان پیدا کرتی ہے اور حقیقی آرام میسر نہیں آنے دیتی۔

پس ابتدائی حالت بھی مومن ہی کی اچھی ہوتی ہے مگر آخری تو ایسی نمایاں طور پر اچھی ہوتی ہے کہ دشمن کو بھی انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔

۱۳۵ **حل لغات** ۔كُذِبُوْا۔ كَذَبَ سے جمع مذکر غائب مجہول کا صیغہ ہے اور كَذَبَهُ الْحَدِيْثَ کے معنے ہیں اِذَا نَقَلَ الْكَذِبَ وَقَالَ خِلَافَ الْوَاقِعِ۔ اس نے جھوٹی بات بیان کی اور خلاف واقع کہا۔ كُذِبَ الرَّجُلُ:۔ اُخْبِرَ بِالْكَذِبِ یعنی اسے جھوٹی خبر سُنائی گئی (اقرب) پس ان مذکورہ بالا معنوں کے لحاظ سے وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا کے معنے ہونگے کہ کفار نے یہ خیال کر لیا کہ ان سے عذاب کے آنے کے متعلق جھوٹی خبریں سُنائی گئیں ہیں۔ كَذَبَتْهُ نَفْسُهُ:۔ اِذَا مَنَّتْهُ الْاَمَانِيَّ وَخَيَّلَتْ اِلَيْهِ مِنَ الْآمَالِ مَا لَا يَكَادُ يَكُوْنُ۔ کذبته نفسه کے معنی ہیں کہ اس کو اس کے نفس نے ایسی امیدیں دلائیں۔ جو پوری نہ ہونے والی تھیں۔ اور اس کے دل میں ایسی آرزوئیں ڈالی گئیں جو بعید از قیاس تھیں (اقرب) اس محاورہ کے لحاظ سے ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا کے معنے یُوں ہونگے۔ کہ نبیوں نے خیال کیا کہ شاید ان کے نفسوں نے کلام الٰہی کے غلط معنے سمجھ کر ایسی امیدیں دلا دیں جو منشائے الٰہی کے خلاف تھیں۔ كَذَبَتْكَ عَيْنُكَ۔ اَرَتْكَ مَا لَا حَقِيْقَةَ لَهُ آنکھ نے ایسی چیز دکھائی جس کی کوئی حقیقت نہ تھی (اقرب) اس محاورہ کے رُو سے ظنوا انهم قد كذبوا کے معنے یہ ہونگے کہ نبیوں نے کفار کے حالات سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ ایمان لے آئینگے لیکن ان کا خیال بے حقیقت نکلا۔

قَالَ ابْنُ اَنْبَارِيْ اِنَّ الْكَذِبَ يَنْقَسِمُ اِلٰى خَمْسَةِ اَقْسَامٍ وَالثَّانِيْ اَنْ يَقُوْلَ قَوْلًا يُشْبِهُ الْكَذِبَ وَلَا يَقْصِدُ بِهِ اِلَّا الْحَقَّ

خیر کا لفظ استعمال کرنے کی وجہ۔

مومن کی ہر حالت اچھی ہوتی ہے۔

والرَّابِعُ كذب الرجل بمعنى بطل عليه امله وما جاهٗ (تاج العروس) ابن انباری نے کذب کی پانچ اقسام بیان کی ہیں اور دوسری قسم یہ بیان کی ہے۔ کہ کذب اس صدق پر بولتے ہیں۔ جو بظاہر جھوٹ نظر آئے۔ اور چوتھی قسم یہ بیان کی ہے کہ کذب الرجل کے معنے ہوتے ہیں۔ اُسکی امید درست ثابت نہ ہوئی۔ پس مندرجہ بالا کذب کے معنوں کے لحاظ سے ظنوا انہم قد کذبوا کی یہ تشریح ہوگی کہ جب نبی کفار کے ایمان سے مایوس ہو گئے۔ تو انہوں نے یہ سمجھا کہ خدا تعالیٰ نے جو خبر انہیں دی تھی کہ وہ لوگ ایمان لائیں گے وہ ذو المعانی تھی۔ جو معنے اس کے سمجھے گئے۔ وہ معنے اس کلام کے نہیں تھے۔

الباس — اَلْبَاسُ۔ اَلْعَذَابُ۔ باس کے معنے ہیں۔ عذاب۔ وَالشِّدَّةُ فِي الْحَرْبِ۔ لڑائی میں سختی۔ وَالْقُوَّةُ۔ قوت۔ وَمِنْهُ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ۔ اَیْ قُوَّةٌ۔ اور آیت اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ میں باس کے معنے قوت کے ہیں۔ وَالْخَوْفُ۔ خوف (اقرب)

یہ آیت مشکل آیات میں سے قرار دی گئی ہے۔

تفسیر۔ اس آیت کو نہایت مشکل آیات میں سے قرار دیا گیا ہے کیونکہ بظاہر اس کے یہ معنے بنتے ہیں کہ رسول ناامید ہو گئے اور انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ ان سے جو فتوحات کے وعدے کئے گئے تھے وہ جھوٹے تھے۔ اور یہ دونوں باتیں رسالت کی منافی ہیں۔ کیونکہ اسی سورۃ میں آتا ہے اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ - یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کافر لوگوں کے سوا کوئی انسان نا اُمید نہیں ہوتا۔ پس خدا تعالیٰ کے فضل سے مایوسی نبیوں کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ نبی خدانخواستہ یہ خیال کرنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے جھوٹ بولا کیونکہ اگر نبی جو معلّم اور نمونہ ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ پر ایسی بدگمانی کریں تو دوسرے لوگوں کو وہ یقین کب میسر آ سکتا ہے جو ہر شک و شبہ سے انسان کو بچا لیتا ہے +

لیکن یہ شبہ سطحی نظر کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ اس آیت کے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ مندرجہ ذیل معانی ہیں:-

آیت کے چار معانی۔

(۱) جس طرح پہلی آیت میں نبیوں اور ان کے مخالفوں کا ذکر تھا اس آیت میں بھی دونوں ہی کا ذکر ہے اور پہلے جملہ میں نبیوں کا ذکر ہے اور دوسرے یعنی ظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا میں کفار کا۔ اور مُراد یہ ہے کہ لوگ شرارت میں بڑھتے چلے گئے اور نبیوں نے خیال کر لیا کہ جس قدر لوگوں کے لئے ایمان مقدر تھا وہ ایمان لا چکے بقیہ لوگ ایمان نہیں لائینگے اور ان کی ہدایت سے مایوس ہو گئے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے۔ اور باقی بالمقابل کفار بھی جو پہلے ڈر رہے تھے کہ شائد نبیوں کی پیشگوئیاں پوری ہو کر انہیں تباہ کر دیں عذاب اور فتح میں دیر ہونے کے سبب سے مطمئن ہو گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ ان پر کوئی عذاب نہیں آئے گا اور جو خبریں نبیوں نے دی تھیں جھوٹی تھیں تو عین اس وقت خدا تعالیٰ کی نصرت آ گئی اور آئمۃ الکفر کو تباہ کر کے راستہ صاف کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو سب انبیاء کے وقت میں ظاہر ہوئی۔ ہر نبی کے زمانہ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ آخری فیصلہ میں اس قدر دیر کر دی گئی کہ بظاہر لوگ مطمئن ہو گئے۔ تب خدا کی نصرت یکدم نازل ہوئی اور نبی اپنے دشمنوں پر غالب آ گئے +

(۲) كُذِبُوْا کا فاعل نفس کو سمجھا جائے اور یہ معنے کئے جائیں کہ انبیاء نے جب کفار کو شرارت میں بڑھتا دیکھا اور ادھر نصرت الٰہی میں دیر دیکھی تو یہ خیال کر لیا کہ انہوں نے کلام الٰہی کے جو معنے سمجھے تھے شائد وہ درست نہ تھے۔ نصرت الٰہی نے کسی اور رنگ میں نازل ہونا ہو گا۔ ان معنوں کے رُو سے كُذِبُوْا کے معنی غلط امید دلانے کے ہونگے اور مراد یہ ہوگی کہ نبیوں نے خیال کیا شائد ہمارے نفسوں نے کلام الٰہی کے غلط معنے سمجھ کر ایسی امیدیں دلا دیں جو منشاء الٰہی کے خلاف تھیں۔ اور یہ معنی بھی مقام نبوت کے خلاف نہیں کیونکہ نبی الٰہی کلام کے سمجھنے میں اجتہادی غلطی کر سکتا ہے۔ پس کسی وقت نبی کو یہ خیال ہو جانا کہ جو معنے پیشگوئی کے پہلے سمجھے تھے شائد اس میں اجتہادی غلطی لگ گئی ہو اور نصرت الٰہی کسی اور رنگ میں آنی ہو قابلِ اعتراض امر نہیں +

(۳) كُذِبُوْا کا فاعل کفار کو سمجھا جائے اور نائب فاعل بدستور رسولوں کو۔ اور معنے یہ ہوں کہ یہاں تک کہ ایک لمبا عرصہ

قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۔ مَا کَانَ حَدِیْثًا

ذکر میں عقل مندوں کے لئے ایک عبرت (کا نمونہ موجود) ہے۔ یہ ایسی بات (ہرگز) نہیں ہے۔ جو

یُّفْتَرٰی وَلٰکِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ

(اپنے پاس سے) گھڑی گئی ہو۔ بلکہ (یہ) اس (کلام الٰہی کی پیشگوئی) کو کامل طور پر پورا کرنے والی ہے جو اس کے سامنے (پہلے سے موجود) ہے اور ہر بات کی

تَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ ۱۲ ع ۷

پوری تفصیل کرنے والی ہے اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کیلئے ہدایت اور رحمت ہے ۱۱۲

گذر جانے پر رسولوں کو بقیہ کفار کے ایمان لانے سے مایوسی ہوگئی اور انہوں نے سمجھا کہ ہمیں جو ان کفار کی حالت سے یہ یقین پیدا ہوگیا تھا کہ یہ ایمان لے آئیں گے درست نہ تھا۔ ان کی درمیانی حالت نے ہمیں دھوکا دیا ان معنوں کے رو سے قَدْ کُذِبُوْا اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ کی تشریح یہ سمجھا جائے گا کہ گویا نبیوں کی مایوسی کے معنے یہ ہیں کہ انہوں نے خیال کر لیا کہ بقیہ کفار کی حالت سے جو ہم خیال کرتے تھے کہ یہ آخر ایمان لے آئیں گے یہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ اور یہ حالت بھی حق کو اکثر پیش آتی ہے۔ بسا اوقات حق کو محسن کر درمیانی عرصہ میں منکروں کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ خیال ہوتا ہے اب یہ تسلیم کر لیں گے لیکن پھر شامت اعمال یا ضد یا تکبر کی وجہ سے وہ حق سے منکر ہو جاتے ہیں ✦

(۴) قَدْ کُذِبُوْا کا فاعل اللہ تعالےٰ ہی کو سمجھا جائے اور نائب فاعل نبیوں کو لیکن کذب کے معنے جھوٹ کے نہ لئے جائیں بلکہ بظاہر جھوٹ نظر آنے والے صدق کے لئے جائیں اور یہ معنے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے لغت سے ثابت ہیں اس صورت میں معنے یہ ہونگے کہ نبی کفار کے ایمان سے مایوس ہوگئے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ خدا تعالےٰ نے جو یہ خبر انہیں دی تھی کہ یہ لوگ ایمان لائیں گے وہ ذو المعانی تھی۔ ہم نے جو معنے اس کے سمجھے تھے اور جو اب بظاہر پورا ہوتے نظر نہیں آتے وہ معنے کلام الٰہی کے نہیں تھے وہ ہماری اجتہادی غلطی تھی خدا تعالےٰ کی مراد کچھ اور تھی جو ہم سمجھ نہیں سکے۔ تب یکدم اللہ تعالےٰ کی نصرت آگئی اور نقشہ کچھ کا کچھ ہو گیا اور نبیوں کو غلبہ نصیب ہوگیا ✦

قصص

۱۱۱ حل لغات۔ قَصَّ عَلَیْهِ الْخَبَرَ وَالرُّؤْیَا (قَصَصًا) حَدَّثَهٗ بِهِمَا عَلٰی وَجْهِهِمَا وَ مِنْهُ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ۔ قصص۔ قَصَّ یَقُصُّ کا مصدر ہے جس کے معنے کسی واقعہ کو بعینہٖ اور صحیح طور پر بیان کرنے کے ہیں (اقرب)

الالباب

الالباب۔ اَللُّبُّ خَالِصُ کُلِّ شَیْءٍ۔ لُبّ ہر چیز کے خالص حصہ کو کہتے ہیں۔ وَالْعَقْلُ عقل اَوِ الْخَالِصُ مِنَ الشَّوَائِبِ اَوْ مَا ذَکَی مِنَ الْعَقْلِ۔ ایسی عقل جو تعصب ضد وغیرہ کی ملونی سے خالص ہو یا اعلیٰ پایہ کی ہو۔ فَکُلُّ لُبٍّ عَقْلٌ وَلَا عَکْسَ پس جب لب کا لفظ بولیں۔ تو اس کے معنے عقل کے کر سکتے ہیں لیکن ہمیشہ عقل کے لفظ پر لب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ و معناها القلبُ لب کے ایک معنی دل کے بھی ہیں۔ اسکی جمع اَلْبَاب۔ اَلُبٌّ اور اَلْبُبٌ آتی ہے (اقرب) اولوا الالباب کے معنے یہ ہوں گے کہ ایسی عقل والے لوگ جو اسے ضد و تعصب وغیرہ سے علیحدہ رکھتے ہیں۔ اور بات کو جلدی سمجھ جاتے ہیں

آنحضرت صلعم کی پیشگوئیاں ضرور پوری ہوکر رہینگی

تفسیر فرماتا ہے اگر یہ لوگ ذرہ بھر بھی غور سے کام لیتے تو پہلے نبیوں کے کلام سے نتیجہ نکال سکتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا کیونکہ آپ

بہاء اللہ کے دعوے کے رد میں ایک دلیل۔

پہلی پیشگوئیوں کے مطابق آئے ہیں۔ اگر آپ کو جھوٹا خیال کریں گے تو پہلی کتابوں کو بھی جھوٹی ماننا پڑے گا۔ جیسے مثلاً بائبل وغیرہ میں آپؐ کے متعلق پیشگوئیاں موجود ہیں۔ اگر آپ کے دعویٰ کی صداقت کو تسلیم نہ کیا جائے تو ساتھ ہی

آنحضرتؐ کا انکار پہلی الہامی کتب کا انکار ہے۔

ان کتب کا بھی انکار کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ آپؐ کے سوا ان کتب کی پیشگوئیوں کا کوئی مصداق نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی کہے کہ شائد

ھُدًی کی تشریح۔

آیندہ ظاہر ہو تو اس کا یہ جواب ہے کہ جب وہ علامات آپؐ کے وجود میں پائی جا چکیں تو آیندہ کسی کے ظاہر ہونے کی امید نہیں رہتی اور اگر فرض کر لیا جائے کہ آئندہ بھی کوئی شخص ایسا آئے گا تب بھی وہ پیشگوئیاں غلط جاتی ہیں کیونکہ جو پیشگوئیاں ایک جھوٹے شخص پر چسپاں ہوگئیں ان کا اعتبار کیا رہا اور آیندہ آنے والے شخص کے متعلق کس طرح سمجھا جا سکے گا کہ وہ ضرور سچا ہے +

قرآن مجید ہر دینی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

دوسری دلیل یہ دی کہ آپؐ پر نازل ہونے والی کتاب ہر دینی ضرورت کو پورا کرتی ہے جب سب کچھ اس میں بیان ہو چکا تو اب اور کسی کتاب نے آکر کرنا کیا ہے یہ ایسی دلیل ہے کہ آیندہ مدعیان شریعت کے دعووں کو بھی باطل کر دیتی ہے۔ مثلاً بہاء اللہ کا دعویٰ ہے کہ وہ نئی شریعت لائے ہیں ان سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ وہ کونسی شئے ہے جس کی ضرورت تھی اور قرآن میں نہیں۔ اس دلیل کے سامنے نہ بہائی اور نہ کسی اور مدعی شریعت کے پیرو ٹھیر سکتے ہیں قرآن کریم ایک ایسی جامع کتاب ہے کہ اس کے مطالب سے اعلیٰ مطالب تو بڑی بات ہے۔ اس کے بیان کردہ مسائل کی انواع تک بھی اور کوئی کتاب خواہ نئی ہو یا پُرانی نہیں پہنچ سکتی +

پھر فرمایا کہ آپؐ کی لائی ہوئی کتاب ھُدًی بھی ہے یعنی صرف تفاصیل بتا کر انسان کو نہیں چھوڑ دیتی بلکہ اسے خدا تعالیٰ تک پہنچاتی بھی ہے اور عقلی مقام سے گذار کر مشاہدہ کے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔ اور آخری کام آپؐ کی لائی ہوئی کتاب کا یہ بتایا کہ اس کے متبع صرف منہ سے لاف و گزاف نہیں مارتے کہ ہم خدا رسیدہ ہو گئے ہیں بلکہ یہ ان کے لئے رحمت بھی ثابت ہوتی ہے۔ یعنی انوار الٰہیہ ان پر نازل ہوتے ہیں۔ اور خدا تعالےٰ کی نصرت اور تائید اس طرح ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں نازل ہوتی ہے کہ دیکھنے والے دیکھ لیتے ہیں۔ کہ خدا تعالےٰ کی رحمت کی چادر نے ان کو چھپا لیا ہے۔ اور یہ اس کے مقرب ہو گئے

ہیں +

سُوْرَةُ الرَّعْدِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ رعد۔ یہ سورۃ مکی ہے

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ أَرْبَعٌ وَّأَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّسِتَّةُ رُكُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اس کی چوالیس آیتیں ہیں اور چھ رکوع ہیں

سلہ سورۃ رعد کی نسبت حسن۔ عکرمہ۔ ابن جبیر کی تحقیق ہے کہ یہ ساری مکی ہے۔ عطاء کا قول ہے کہ سب مکی ہے۔ سوائے وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا والی آیت کے بعض اور علماء کے نزدیک سب مکی ہے سوائے هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ والی آیت کے جو لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ والی آیت تک ختم ہوتی ہے۔ قتادہ سے بھی ایک روایت میں ہے کہ سب سورۃ مکی ہے سوائے وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا والی آیت کے۔ حضرت علیؓ سے بھی یہی مروی ہے کہ یہ مکی ہے لیکن کلبی مقاتل اور ابن عباسؓ کا قول ہے کہ یہ مدنی ہے اور قتادہ سے بھی ایک روایت میں اس کا مدنی ہونا مروی ہے۔ قاضی منذر بن سعد کی بھی یہی تحقیق ہے حضرت ابن عباسؓ تین آیتوں کو بیچ میں سے مکی قرار دیتے ہیں (۱و۲) وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ سے شروع کر کے دو آیتیں اور (۳) وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الاٰیۃ عام محققین کا رجحان اس کے مکی ہونے کی طرف ہی ہے۔

اور اس کے مضامین اس کے مکی ہونے پر ہی دلالت کرتے ہیں۔ اور غالباً اس کے مدنی ہونے کا خیال اسکی بعض آیتوں کی وجہ سے جو مدنی ہیں پیدا ہؤا ہے۔ اس کے بارہ میں اکابر صحابہ میں سے صرف ایک کی شہادت ہے یعنے حضرت علی کی۔ اور وہ اسے مکی قرار دیتے ہیں۔ پس جبکہ اس کے مضامین بھی اس امر کے مؤید ہیں اس کا مکی ہونا یقینی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ چونکہ رسول کریمؐ کے زمانہ میں بچے تھے۔ ان کی رائے حضرت علی کی شہادت کا مقابلہ نہیں کر سکتی +

اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق یہ ہے کہ سورۃ یونس میں بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالٰے اپنے نبیوں کے زمانہ میں دنیا کو دو طرح ہدایت کی طرف لاتا ہے (۱) سزا سے اور (۲) رحم سے۔ اس کے بعد سورہ ہود میں سزا کے پہلو پر زور دیا۔ اور سورہ یوسف میں رحم کے پہلو پر روشنی ڈالی گئی۔ اس سورۃ میں اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی کا اعلان جو پہلی تین سورتوں میں کیا گیا ہے وہ کس رنگ میں پورا ہوگا کونسے ذرائع سے کام لے کر دوسرے مذاہب پر اور اپنی قوم پر ان کو غلبہ دیا جائے گا +

اس سورۃ کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ غیر مرئی سامانوں سے کام لیتا ہے انسان کو علم صرف نتائج کے ظہور پر ہوتا ہے۔ بظاہر ایک ہی قسم کی زمین ہوتی ہے اور ایک ہی قسم کا پانی مگر پھل مختلف ہو جاتے ہیں پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر پر قیاس نہ کرو۔ اسکی کامیابی پر تعجب نہ کرو اسکی کامیابی قابل تعجب نہیں بلکہ ایسے وقت میں رسول نہ آتا تو قابل تعجب ہوتا۔ پھر بتایا کہ کامیابی کیسے ہوگی اور دشمنوں کی تباہی کیسے۔ اور بتایا کہ ان کی اولادیں مسلمان ہو جائینگی۔ بڑے بڑے لوگوں سے اللہ تعالٰے اپنی حفاظت واپس لے لیگا۔ اور ان کا رُعب جاتا رہے گا۔ قوانین قدرت اللہ تعالٰے کے تابع ہیں وہ قانون قدرت کے ہر ایک شعبہ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں لگا دے گا۔ تم جن کو پوجتے ہو وہ بے بس ہیں وہ تمہاری نصرت نہ کریں گے۔ اس کو ایسی رُوحانی طاقتیں ملی ہیں کہ یہ اکیلا ہی جیت سکتا ہے۔ جیسے ایک بینا بہت سے اندھوں پر غالب آجاتا ہے۔ اسکی توحید کی تعلیم کے مقابلہ میں تمہارے شرک کی تعلیم کیسے ٹھیر سکتی ہے جس طرح کہ سیلاب یا پگھلے ہوئے سونے چاندی پر جھاگ بالا بالا دکھائی دیتی ہے

شروع کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف۔

سورۃ کے مضمون کا خلاصہ۔

سورۃ کے مضامین اس کے مکی ہونے پر دلالت کرتے ہیں

مدنی ہونے کا خیال پیدا ہونے کی وجہ۔

اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

مَیں اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر (شروع کرتا ہوں) جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے

الٓمّٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

الٓمّٓرٰ یہ کامل کتاب کی آیات ہیں۔ اور جو (کلام) تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اُتارا گیا ہے

مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

وہ بالکل حق ہے۔ لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ۲؎

ویری کا ایک غلط خیال اعتادان خیال کرتا ہے کہ شائد یہ جھاگ ہی جھاگ ہے وہی حال آپ کے دشمنوں کا ہے وہ اوپر کی جھاگ کو دیکھتے ہیں نیچے کے سیلاب یا سونے کو نہیں دیکھتے حالانکہ قانونِ قدرت کے مطابق جھاگ ضائع ہو جانے والی چیز ہے۔ آخر پانی یا سونا ہی رہ جاتا ہے پس ظاہری **سورۃ رعد اور پہلی تین سورتوں کی ابتدا میں فرق** اور سطحی باتیں دیر تک نہیں رہ سکتیں اسکی ٹھوس اور مفید تعلیم ہی باقی رہ جائیگی۔ اسکی تعلیم فطرت کے مطابق ہے اور آہستہ آہستہ طبعی مناسبتوں کی وجہ سے فطرتیں اسی کو قبول کرینگی۔

نیز اس تعلیم پر عمل کرنے والے اور اس کے رد کرنے والوں کی حالتوں میں فرق دیکھ کر بھی لوگوں کی آنکھیں کھلیں گی نیز قرآن کریم کے ذریعہ سے زبردست معجزات دکھائے جائینگے اور دل فتح **کتاب کو بغیر صفت کے بیان کرنے کی وجہ** کئے جائیں گے ظاہری نشانات بھی ہونگے اور باطنی بھی ان ظاہری نشانوں میں سے ایک یہ نشان بتایا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ والے اپنے ملک سے نکال دینگے اور آخر تلوار کی نوبت پہنچے گی پہلے چھوٹی چھوٹی جنگیں ہونگی پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غلبہ ملنا شروع ہوگا اور آخر فتح مکہ پر اس جنگ کا خاتمہ ہوگا۔ یہ سب معجزات خدا تعالیٰ کی طرف سے **الکتٰب کے معنے یا تو کامل کتاب کے ہیں یا پہلی سورتوں کی طرف اشارہ ہے** ہونگے نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی طاقت سے۔ خدا تعالیٰ زبردست حملوں سے آپ کی سچائی کو ظاہر کر دیگا اور اپنے سچے دین کو قائم۔ اس مضمون کی مناسبت کی وجہ سے اس **سورۃ کا نام** سورۃ کا نام رعد رکھا گیا ہے گویا یہ برسنے والا بادل جو آیا ہے اس کے ساتھ کڑک بھی چاہئے تھی سو وہ بھی آگئی ہے +

رومن اردو قرآن کے مصنف ریونڈ ویری صاحب لکھتے ہیں کہ اس سورۃ میں معجزات نہ دکھانے کی اس قدر معذرتیں آئی ہیں کہ اس کا نام بجائے رعد کے معذرتوں والی سورۃ ہونا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ اس سورۃ میں اس قدر انذاری پیشگوئیاں ہیں کہ رعد اس کا طبعی نام ہے +

سورہ یونس کے شروع میں کتاب کی صفت حکیم بیان فرمائی تھی۔ سورہ ہود میں فُصِّلَتْ سورہ یوسف میں مُبِیْن۔ اور اس جگہ بغیر کسی صفت کے کتاب کو بیان کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سورہ یونس میں انذار و تبشیر دونوں پہلوؤں کو یکجا لیا گیا تھا اور بتایا تھا کہ حکیم خدا اپنی حکمتوں کے ماتحت موقع کے مطابق سلوک کرتا ہے۔ سورہ ہود میں سزا کے پہلو پر زور تھا۔ اس لئے فصلت اس کی آیات کی صفت بیان ہوئی کیونکہ تفصیل پھاڑنے اور جدا کرنے کے معنوں پر مشتمل ہے۔ سورہ یوسف میں ایک طرف غلبہ کے فوراً نہ حاصل ہونے کی حکمتوں کا بیان۔ دوسری طرف عفو اور صلح پر زور تھا۔ اس لئے مبین کہا جو عذر و معذرت پر دلالت کرتا ہے۔ سورہ رعد میں چونکہ ذرائع حصول مطالب پر بحث تھی۔ اس لئے بغیر صفت کے رکھا جسکی وجہ سے الکتٰب کے معنے یا تو کامل کتاب کے ہوگئے یا پہلی تین سورتوں کی طرف اشارہ ہو گیا کہ وہ تین صفات جو پہلی تین سورتوں میں بتائی گئی تھیں وہ پورے طور پر اب اس سورۃ کے ذریعہ سے ظاہر کی جائیں گی +

۲؎ **حل لغات**۔ تِلْكَ اٰيٰتُ اور الْكِتٰبُ کی

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا

اللہ (تعالیٰ) وہ ہے جس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر بلند کیا ہے جو تمہیں نظر آتے ہوں (اور)

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ

پھر وہ عرش پر قائم ہوا ہے۔ اور سورج اور چاند کو اس نے بغیرِ مزدوری کے (تمہاری) خدمت پر لگایا

كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ

ہے (چنانچہ) ہر ایک (سیارہ) ایک معیّن میعاد تک (اپنی مقررہ گردش کے مطابق) چل رہا ہے وہ ہر امر کا انتظام کرتا ہے

تشریح کے لئے دیکھو یونس ۳ اور ذٰتِ مضمون کے لئے دیکھو یونس

تفسیر (المّرٰ) پہلی تینوں سورتوں کے شروع میں الـرٰ تھا۔ اس سورہ کے شروع میں ان تینوں حروف میں میم زائد کر دیا گیا ہے۔ جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ اس کا مضمون پہلی تین سورتوں سے کسی قدر مختلف ہو گیا ہے۔ جیسا کہ سورہ یونس کے شروع میں حروف مقطعات کی بحث میں بتایا گیا ہے مرا علم کا قائم مقام ہے پس ان حروف کے معنے یہ ہوئے میں اللہ سب سے زیادہ جاننے والا اور دیکھنے والا ہوں۔ گویا دیکھنے کی صفت کے ساتھ علم کی صفت کو شامل کر دیا گیا ہے ؂

پہلی سورتوں کے مقطعات اور اس سورۃ کے مقطعات میں فرق۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ انسان کے متعلق جب دیکھنے کا لفظ بولا جائے تو اس سے مراد رنگ اور طول و عرض کا نظر آنا ہوتا ہے اور جاننا زیادہ وسیع ہوتا ہے کیونکہ ناک سے کان سے چھونے سے جن چیزوں کا پتہ لگتا ہے ان کے لئے بھی جاننے کا لفظ اسی طرح استعمال ہوتا ہے جس طرح دیکھی ہوئی چیزوں کے متعلق۔ مگر سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو آنکھوں اور دوسرے حواس سے بے نیاز ہے اس کے متعلق جاننے اور دیکھنے کے الفاظ کن معنوں میں استعمال ہوتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کے لئے مجازاً استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے نفسانی استعمال پر ان کا قیاس کر لینا چاہیئے۔ پس جس طرح انسان کے لئے دیکھنے کا لفظ ایک محدود ظہور کے موقع پر بولا جاتا ہے اور جاننا باریک محسوسات کے لئے بھی۔ اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ رؤیت کا لفظ بولتا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ جن چیزوں کو انسان دیکھتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو اس سے بھی زیادہ دیکھتا ہے۔ اور جن چیزوں کو انسان دوسرے حواس یا شعور سے محسوس کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ مکمل طور پر انہیں جانتا ہے۔ پس گو خدا تعالیٰ کے لئے سب چیزوں کا علم یکساں ہے مگر اس جگہ یہ دو لفظ انسان کی رؤیت اور اس کے علم کے مقابل پر استعمال ہوئے ہیں یعنی ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جنہیں انسان دیکھتا ہے اور ان کو بھی جن کو دوسرے حواس سے جانتا ہے خواہ ظاہری ہوں یا باطنی ؂

خدا تعالیٰ اور انسان کے متعلق دیکھنے کے لفظ کے استعمال میں فرق۔

المرٰ کے معنی

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ. یعنی وہ آیات جو اس سورۃ یا قرآن کریم میں مذکور ہیں اس موعود کتاب کا حصہ ہیں جس کی نسبت سب دنیا کے ذہنوں میں انتظار چلا آ رہا تھا یا اس کامل کتاب کی جس کی خبر پہلے دی جا چکی ہے۔ اس لئے تم اس کے مقابلے پر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیا جس چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ ہر نبی کی معرفت خبر دیتا چلا آیا ہے آج وہ اس کو یونہی چھوڑ دے گا یا اس کے کمالات کے مقابلہ میں تمہارے غلط دعوے ٹھہر سکیں گے ؂

تلک ایت الکتب کے معنے۔

وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ ..... الْحَقُّ. فرماتا ہے کہ اس کتاب میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں آخر ہو کر رہنے والی ہیں انہیں کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ساری آیت کا یہ مطلب ہے کہ انسان کی جستجو ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ مجھے صحیح علم حاصل ہو جائے لیکن ان لوگوں پر تعجب ہے کہ جب وہ کتاب انہیں ملی جو سب شبہات سے

والذی انزل الیک من ربک الحق کی تشریح

الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝ وَهُوَ

(اور) وہ (اپنی) آیات کو کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم (لوگ) اپنے رب سے ملنے کا یقین رکھو ۳۵ اور وہی ہے

پاک ہے تو یہ اس پر ایمان لانے سے گریز کرتے ہیں اور یقین کو چھوڑ کر شکوک میں مبتلا ہیں +

آیت میں کفار کے شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے

۳۵ حل لغات۔ عَمَدٌ عِمَادٌ کی اسم جمع ہے۔ اور اَلْعِمَادُ کے معنی ہیں مَا يُسْنَدُ بِهٖ۔ وہ چیز جس پر سہارا لیا جائے۔ اَلْاَبْنِيَةُ الرَّفِيْعَةُ۔ اونچی اونچی بلند دیواروں اور عمارتوں کو بھی عِماد کہتے ہیں (اقرب)

سَخَّرَهٗ۔ كَلَّفَهٗ عَمَلًا بِلَا اُجْرَةٍ۔ سَخَّرَهٗ کے معنے ہیں کہ اس کو بغیر اُجرت یا بدلہ کے کسی کام پر لگا دیا۔ ذَلَّلَهٗ اس کو مطیع کر دیا۔ وَكُلُّ مَقْهُوْرٍ لَا يَمْلِكُ لِنَفْسِهٖ مَا يُخَلِّصُهٗ مِنَ الْقَهْرِ فَذٰلِكَ مُسَخَّرٌ۔ اور ہر وہ شخص جو کسی کے قبضہ میں ہو۔ اور آزاد رہنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اسے مسخر کہتے ہیں (اقرب)

ہر چیز کا سہارا ایک قسم کا نہیں ہوتا۔

مندرجہ ذیل الفاظ کی تشریح کے لئے حل لغات کے دیگر مقامات کو دیکھئے۔ رفع یوسف ۱۰۱۔ السموٰت۔ استوٰی۔ العرش یونس ۴۔ الاجل یونس ۱۲۔ یدبر یونس ۴۔ یفصل یونس ۶۔

آیت کے دو معنے

تفسیر۔ اس آیت کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم دیکھتے ہو کہ آسمان بغیر ستونوں کے کھڑے ہیں اور ایک یہ کہ آسمان بغیر ایسے ستونوں کے کھڑے ہیں جنہیں تم دیکھ سکو یعنے سہارا تو ہے لیکن وہ سہارا تم کو نظر نہیں آتا اور یہ دونوں معنے ہی صحیح ہیں اور آیت کے مفہوم کے مطابق ہیں اگر اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے کہ ستون عرف عام میں ان مادی ستونوں کو کہتے ہیں جو دوسری چیزوں کا وزن اپنے اوپر اٹھا لیتے ہیں تو آسمان بغیر ستونوں کے کھڑے ہیں۔ اور اگر اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے کہ جس چیز کے ذریعہ سے کوئی چیز اپنی جگہ کھڑی ہے وہ مجازاً اس کا ستون ہے تو پھر آسمانی اجرام ایسے ستونوں پر کھڑے ہیں جو لوگوں کو نظر نہیں آتے جیسے کشش ثقل یا حرکات مخصوصہ سیارگان یا اور دوسرے ذرائع جو علماء طبعیات نے دریافت کئے ہیں یا جو اب تک دریافت نہیں ہوئے۔ اس آیت میں کفار کے اس شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے سامان ہیں فتح اور غلبہ کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ انہیں میسر نہیں ہیں پھر وہ کس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس شبہ کا ازالہ علاوہ پہلی آیت کے مضمون کے کہ جس میں الحق کہہ کر قرآن کریم کے قائم ہونے کی خبر دی گئی تھی۔ اس طرح کیا گیا ہے کہ بیشک چیزوں کا قیام مناسب سہاروں کے اوپر ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ تمام چیزوں کا سہارا ایک قسم کا ہو مادی اجرام کا سہارا ستون ہوتے ہیں ایک چھوٹی سی چھت بغیر دیوار یا ستون کے کھڑی نہیں ہو سکتی لیکن اللہ تعالیٰ کی ایک اور صنعت دیکھو کہ کتنے کتنے بوجھل ستارے بغیر کسی ایسی چیز کے جسے عرف عام میں ستون کہہ سکیں یا بغیر کسی نظر آنے والے ستون کے اپنی اپنی جگہوں پر قائم ہیں اور ایک لمبا عرصہ گذرنے پر بھی ان کے نظام میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پس انسانی فعل اور خدائی فعل میں فرق ہے۔ انسان تو بیشک بغیر ستون کے چھت نہیں کھڑی کر سکتا لیکن اللہ تعالیٰ نے تو لاکھوں کروڑوں ستارے بغیر ستونوں کے کھڑے کر چھوڑے ہیں اور ایسے مخفی سہارے ان کے بنائے ہیں کہ جو انسان کو نظر بھی نہیں آتے۔ اسی طرح روحانی معاملات کو سمجھ لو کہ بیشک انسان جب اپنی کوشش سے غالب ہونا چاہے تو اس کے لئے ظاہری سامانوں کی ضرورت ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی کو غالب کرنا چاہے تو اس کے لئے ظاہری سامانوں کی ضرورت نہیں۔ اس کے سامان باریک اور غیر مرئی ہوتے ہیں۔ اور اسی وقت حقیقت کھلتی ہے جبکہ نتیجہ نکل آتا ہے اس سے پہلے سب لوگ نبی کے غلبہ کو ناممکن قرار دیتے چلے جاتے ہیں۔

کفار جن سامانوں کو کامیابی کے لئے ضروری سمجھتے تھے وہ

سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۱۰ میں بیان ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں (۱) اس کے پاس آدمیوں اور جانوروں کے استعمال کے لئے چشمے ہوں (۲) باغات کا مالک ہو اور زمینوں کے آباد کرنے کے لئے نہریں کھودے (۳) اس کے دشمن فوراً برباد کئے جائیں اور پکڑے جائیں (۴) خدا تعالیٰ اور فرشتے اسکی مدد کے لئے لوگوں کے بالمقابل آکھڑے ہوں (۵) دولت بے انتہا اس کے پاس ہو (۶) وہ غیر معمولی طاقتوں کا مالک ہو آسمان پر لوگوں کے سامنے چڑھ جائے اور وہاں سے لکھی ہوئی کتاب لیکر آئے جسے لوگ اپنے ہاتھوں میں پکڑ سکیں اور پڑھ سکیں یعنی یہ نہ کہے کہ مجھے زبانی حکم ملا ہے بلکہ لکھا ہوا پروانہ جسے لوگ خود پڑھ سکیں اس کے ساتھ ہو ✦

ان مطالبات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے نزدیک غلبہ کے ذرائع دو قسم کے ہیں۔ ایک دنیوی یعنی زمینوں مال و دولت پانیوں اور سبزا و جواء کی طاقت کا حاصل ہونا۔ دوسرے دینی یعنی غیر معمولی اور خارق سنت سامانوں کا پیدا ہونا۔ جیسے کہ خدا تعالیٰ کا ظاہر ہونا فرشتوں کا ظاہر ہونا۔ آسمان پر جاکر لکھی ہوئی کتاب کا لے آنا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ ان دونو قسم کی طاقتوں سے محروم پاتے تھے۔ ان کے نزدیک بادشاہ کے پاس جو کچھ ہونا چاہیئے وہ بھی آپ کے پاس نہ تھا۔ اور ایک نبی کے پاس جو کچھ ہونا چاہیئے وہ بھی آپ کے پاس نہ تھا پس وہ خیال کرتے تھے کہ یہ شخص ایک بے ستون اور بے سہارے کی چھت قائم کرنا چاہتا ہے پس کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا شائد کہا جائے کہ دنیا میں بہت سے ایسے لوگ بادشاہ ہوئے ہیں جو بے حیثیت تھے اور جن کو سامان میسر نہ تھے۔ جیسے قریب زمانوں میں نادر شاہ ایران یا نپولین شاہ فرانس۔ اور ایسے لوگ ہمیشہ ہوتے رہے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے تعجب کی کیا وجہ تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک ایسے لوگ کبھی کبھی دنیا میں ہوتے رہے ہیں لیکن انکی ابتدائی حالت میں بھی لوگوں نے کبھی خیال نہیں کیا کہ وہ اس طرح بادشاہ ہو جائیں گے جب وہ بادشاہ ہو گئے تبھی لوگوں کی آنکھ کھلی۔ علاوہ اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے ایسے لوگوں میں بہت بڑا امتیاز تھا۔ وہ لوگ جب بادشاہ ہو گئے تب انہوں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اپنی ابتدائی حالت میں انہوں نے نہ یہ دعویٰ کیا اور نہ ان کو اس امر کا خیال ہی تھا پس لوگوں میں تعجب پیدا نہیں ہو سکتا تھا برخلاف اسکے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو قبل از وقت دعویٰ کر رہے تھے جسکی وجہ سے لوگوں کو اس عجیب دعویٰ پر حیرت ہو رہی تھی۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ جو لوگ ادنیٰ حالت سے بادشاہ بنتے ہیں وہ بادشاہ بننے کے ذرائع اختیار کرتے ہیں مثلاً نادر شاہ نے ترقی کا ارادہ کیا تو ساتھ ہی کچھ نہ کچھ فوج اپنے ارد گرد جمع کرنی شروع کی۔ اور ڈاکے ڈالنے شروع کئے اور پہلے ارد گرد کے چھوٹے رؤساء کو زیر کیا۔ پھر بڑے رؤساء کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ ایران کا بادشاہ ہو گیا۔ یہی حال نپولین کا تھا کہ جہاں ذرہ حرکت دیکھتا بجلی کی طرح کوند کر جا پہنچتا۔ اور اس طرح اس نے حکومت وقت کو مرعوب کر کے اپنی جگہ لوگوں کے دلوں میں پیدا کر لی اور فوج کی وفاداری حکومت فرانس سے ہٹ کر اس کے ساتھ ہو گئی۔ تمام ان لوگوں کی زندگیوں میں جو ادنیٰ سے اعلیٰ مقامات پر ترقی پاتے ہیں یہ اصول کام کرتا ہوا نظر آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جن لوگوں نے اس طرح ترقی کی۔ انکی زندگیوں میں بھی یہ بات پائی جاتی تھی پس اس تجربہ کی بناء پر مکہ کے لوگ آپ کے غلبہ پا جانے اور حاکم ہو جانے کے دعویٰ کے ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ غلبہ کے سامان یہ کیا جمع کرتا ہے اور جو کچھ ان کو نظر آتا تھا وہ یہ تھا کہ بڑے بڑے بہادروں اور جانبازوں کو آپ نرم دل اور مسکین بنا دیتے تھے۔ بجائے رعب بٹھانے کے اپنے ساتھیوں کو ظلم کی برداشت اور عفو کی تعلیم دیتے تھے کسی پر حملہ کرنا تو الگ رہا جہاں تک ہو سکے دوسرے کے حملہ کو خاموشی سے سہہ لینے کا ارشاد ہوتا رہتا تھا اور یہ تعلیم ایسی تھی کہ ان کے نزدیک اس رستہ پر چلکر بادشاہت کا دروازہ بند ہوتا تھا نہ کہ کھلتا تھا۔ اللہ تعالیٰ دلوں کے حالات جانتا ہے وہ ان کے

کفار کے نزدیک غلبہ کے دو قسم کے ذرائع دنیوی و دینی۔

ظاہری اعتراضوں کے ساتھ ساتھ ان کے سلسلۂ خیالات کو بھی جانتا تھا جن کے نتیجہ میں یہ اعتراض پیدا ہوتے تھے اور اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ یہ شخص روحانی آسمان کے قیام کا مدعی ہے نہ کہ کسی دنیوی حھت کا۔ تمہاری ستونوں والی چھتیں تو آخر گر جاتی ہیں لیکن بغیر ستونوں والا آسمان بے شمار سالوں سے مضبوطی سے کھڑا ہے اس کے سلسلہ کا بھی یہی حال ہے کہ آسمان کی طرح تمہاری نظروں سے اوجھل سامان جو اندرونی بھی ہیں کہ خود اس تعلیم میں پائے جاتے ہیں جو یہ دیتا ہے اور بیرونی بھی ہیں کہ جو خدا تعالیٰ کی حفاظت سے تعلق رکھتے ہیں اس کے لئے پیدا کئے گئے ہیں پس اس کا سلسلہ ظاہری سامانوں کی احتیاج سے بالا ہے اور انسانی طاقت سے بالا یعنے آسمانی سامانوں پر قائم کیا گیا ہے اور اس پر تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ اجرام فلکی کی مادی مثال میں خدا تعالیٰ کی صفات کے اس قسم کے ظہور کی ایک بیّن دلیل موجود ہے +

عرش کے لغوی معنے

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اوّل دنیا کے اجرام کو بغیر سہارے کھڑا کرکے پھر اپنی صفات کو کامل طور پر ظاہر کرنا شروع کیا اسی طرح اب روحانی دُنیا میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے آسمان رُوحانی کی تکمیل ہو کر صفات الٰہیہ کا کامل ظہور ہوگا اور کامل تعلیم بنی نوع انسان کو دی جائے گی۔ عرش کا لفظ قرآن کریم میں روحانی یا جسمانی قوانین کی تکمیل کے لئے بولا جاتا ہے اور یہ محاورہ دنیوی نظام سے مستعار لیا گیا ہے۔ دُنیا میں بادشاہ جب کوئی خاص اعلان کرنا چاہیں تو تخت پر سے کرتے ہیں اسی محاورہ کے مطابق قرآن کریم میں صفات اللہ کے کامل ظہور کے لئے استوٰی علی العرش کے الفاظ آتے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ عرش الٰہی کیا ہے اور کس قسم کا ہے۔ اس کا عام جواب تو وہ ہے جو علامہ راغب نے اس لفظ کے معنوں پر بحث کرتے ہوئے دیا ہے وہ لکھتے ہیں۔ وَعَرْشُ اللّٰهِ مَالَا يَعْلَمُهُ الْبَشَرُ عَلَى الْحَقِيْقَةِ اِلَّا بِالْاِسْمِ وَلَيْسَ كَمَا تَذْهَبُ اِلَيْهِ اَوْهَامُ الْعَامَّةِ فَاِنَّهُ لَوْ كَانَ كَذٰلِكَ لَكَانَ حَامِلًا لَهُ تَعَالٰى لَا مَحْمُولًا وَاللّٰهُ تَعَالٰى يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَا اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ۔ (مفردات)

استوٰی علی العرش۔

کنایۃً عرش کے معنے

عرش کے لفظ کا استعمال

قرآن کریم میں عرش کے لفظ کا استعمال

استوٰی علی العرش کے الفاظ صفات الٰہیہ کے کامل ظہور کے لئے آتے ہیں

علامہ راغب کی عرش کے متعلق بحث۔

یعنی اللہ تعالیٰ کا عرش ایک ایسی چیز ہے جس کی حقیقت کو انسان نہیں جانتا صرف نام جانتا ہے لیکن بہر حال وہ اس قسم کا نہیں جیسا کہ عام لوگ خیال کرتے ہیں کیونکہ اگر وہ کوئی تخت کے قسم کی چیز ہو تو اس کے یہ معنے بنیں گے کہ اللہ تعالیٰ کو اس نے اٹھایا ہوا ہے اور خدا تعالیٰ نے اس کو نہیں اٹھایا ہوا حالانکہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں صاف فرماتا ہے کہ آسمان و زمین کو اللہ تعالیٰ نے ہی اُٹھایا ہوا ہے ورنہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں اور اگر وہ ہٹ جائیں تو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی ان کو ان کی جگہ پر نہیں رکھ سکتا +

عرش کے لغوی معنے درحقیقت چھت کے ہیں اور تمام معنے اس کے ہیر پھیر کر چھت کے معنوں کی طرف لوٹ آتے ہیں تخت کے معنے بھی چھت سے ہی مستنبط ہیں کیونکہ عرش سلطانی بھی تخت کا نام ہوتا ہے اور تخت چند پاؤں پر ایک چھت ڈالنے سے بنتا ہے غرض عرش کے اصل معنے چھت کے ہیں خواہ سر پر سایہ کے لئے ہو خواہ زمین پر ذرا اونچی کرکے بیٹھنے کے لئے ڈالی جائے۔ علاوہ ان معنوں کے عرش کنایۃً عزت۔ حکومت غلبہ اور قوام امر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے (تاج العروس) اور یہ معنی بھی چھت کے لفظ سے ہی نکالے گئے ہیں۔ کیونکہ پرانے زمانہ میں بڑے لوگ اونچی جگہیں بنا کر یا چھت دار کرسیوں یا تختوں پر بیٹھتے تھے قرآن کریم میں یہ لفظ چھت کے معنوں میں بھی آیا ہے جیسے فرمایا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا (بقرہ ع ۳۵) یعنی گاؤں اپنی چھتوں کے بل گرا ہوا تھا۔ اور تخت کے معنوں میں بھی آیا ہے جیسے سورۂ یوسف میں آتا ہے وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ (یوسف ع ۱۱) اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا۔ انہی معنوں میں چار دفعہ سورۂ نمل میں ملکہ سبا کے ذکر میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے ان کے علاوہ ۲۱ جگہ اس خاص عرش کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے مخصوص ہے جس کے معنوں کے لئے دیکھو

نوٹ نمبرہ سورہ یونس +

تفسیر رُوح المعانی میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں کا قول ہے کہ استوٰی علی العرش کے معنے صرف حکومت کرنے اور تدبیر امور کرنے کے ہیں اور اسکی سند وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ سورہ یونس میں ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ آتا ہے اور یدبّر الامر استوٰی علی العرش کی تفسیر ہے جو معنے یدبّر الامر کے ہیں وہی معنے استوٰی علی العرش کے ہیں مصنّف رُوح المعانی نے اس قول کے قائل کا نام نہیں لکھا بعض نئے مفسرین نے بھی ان معنوں کو نقل کیا ہے مگر یہ معنے درست نہیں۔ اس لئے کہ عرش کا ذکر اس قدر تواتر سے قرآن کریم اور احادیث میں آتا ہے۔ اور ایسے ایسے رنگ میں آتا ہے کہ یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ کی مُراد عرش سے محض حکومت کرنا ہے بالکل بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اور جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سورۂ یونس کی آیت میں یدبّر الامر جملہ تفسیریہ کے علاوہ استوٰی کی ضمیر کا حال اور اِنَّ رَبَّکُم کی خبر ثانی بھی بن سکتا ہے اور اس کے یہ معنے ہو سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ عرش پر قائم ہوا اس حال میں کہ اس نے تمام نظام عالم کی تدبیر شروع کی یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین پیدا کئے اور عرش پر قائم ہوا۔ اور وہ تمام امور کا انتظام بھی کرتا ہے تو یہ معنی اور بھی کمزور ہو جاتے ہیں اور پھر جب ہم دیکھتے ہیں کہ گو سورۂ رعد کی آیت زیر بحث میں بھی یدبّر الامر کے الفاظ ہیں لیکن استوٰی علی العرش کے معًا بعد نہیں بلکہ دوسرے جملوں کے بعد آئے ہیں پس اس جگہ یہ الفاظ استوٰی علی العرش کے لئے جملۂ مفسرہ نہیں بن سکتے

غرض استوٰی عَلَی العرش کے نہ تو یہ معنے ہیں کہ عرش کوئی مادی شئے ہے اور نہ اس سے یہ مراد ہے کہ عرش کوئی چیز ہی نہیں صرف حکومت کے معنوں میں اس لفظ کو استعمال کر لیا گیا ہے بلکہ اس سے مُراد صفات تنزیہیہ کا مجموعی نظام ہے جس کے لئے صفات تشبیہہ بطور حامل کے ہیں۔ یا یوں کہو کہ بطور پاؤں کے ہیں آسمان و زمین کو بغیر ستونوں کے کھڑا کرنے کے ذکر کے بعد پھر عرش پر قائم ہونے کا ذکر یہ بتانے کے لئے کیا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ایک نیا آسمان زمین تیار کرتا ہے تو اس کی صفات کامل طور پر ظاہر ہوتی ہیں اور کسی ایک صفت کا ظہور نہیں ہوتا۔ بلکہ صفات تنزیہیہ کے مرکز کے تابع جس قدر صفات تشبیہہ ہیں سب کی سب اپنے کام میں لگ جاتی ہیں گویا جس طرح بادشاہ خاص اعلان تخت پر بیٹھ کر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ بھی خاص فیوض صفات تنزیہیہ کے مرکز سے نازل کرتا ہے تا سب صفات تشبیہہ اس کے تابع ہونے کے سبب سے کامل طور پر ظاہر ہونے لگیں اس سے یہ اشارہ کیا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید کسی ایک صفت کے ذریعہ سے نہ ہوگی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات جو بندے سے تعلق رکھتی ہیں آپؐ کی تائید میں لگ جائیں گی +

رُوح المعانی میں عرش کے معنی حکومت کرنے اور تدبیر امور کرنے کے لکھے ہیں۔

استوٰی علی العرش اور یدبّر الامر کے ایک معنی لینے درست نہیں۔

پھر فرمایا کہ آسمانوں کے بغیر ستون کھڑے ہونے کے علاوہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح سورج چاند کو بغیر کسی اُجرت کے تمہارے کام پر لگایا ہوا ہے تمہارے تنخواہ دار نوکر چون و چرا کر سکتے ہیں مگر یہ اجرام فلکی کامل اطاعت سے تمہاری خدمت میں لگے ہوئے ہیں آخر وہ کونسا ظاہری خوف یا لالچ ہے جو ان کو درست رکھ رہا ہے خدا تعالیٰ کا ایک قانون ہی ہے نہ سو ہی قانون اگر محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں جاری ہو کر ہر شئے کو اس کے تابع کر دے تو اس میں کیا استعجاب ہے +

استوٰی علی العرش اور یدبّر الامر کے ایک معنی نہ لینے کی وجوہات۔

پھر فرمایا کہ یدبّر الامر یعنی جس طرح یہ دنیوی قانون جاری ہے اور بغیر بظاہر نظر آنے والے ستونوں کے چل رہا ہے اسی طرح تمہارے دلوں میں یقین اور ایمان پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کو جاری کرے گا۔ اور کھُلے کھلے نشانات اس کی تائید میں ظاہر کرے گا یا یہ کہ تمام عالم کو اسکی تائید کے لئے واضح احکام دے گا۔ اور عالم کا ذرّہ ذرّہ اس کی تائید میں لگ جائے گا +

عرش سے مراد کوئی مادی چیز نہیں۔

الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَ

جس نے زمین کو پھیلایا ہے اور اس میں استحکام کے ساتھ ٹھہرے رہنے والے پہاڑ اور (نیز) دریا بنائے ہیں اور

مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي

اس میں تمام (اقسام کے) پھلوں سے دونوں قسمیں (یعنی نر و مادہ) بنائی ہیں وہ

الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

رات کو دن پر لا ڈالتا ہے۔ جو لوگ سوچتے ہیں۔ ان کے لئے (بلاشک و شبہ) اس (بات) میں کئی نشان (پائے جاتے) ہیں ؎

؎ **حل لغات** ۔ مَدَّ۔ مَدَّہٗ۔ بَسَطَہٗ۔ مَدَّہٗ کے معنے ہیں۔ اسے پھیلایا۔ اَلْمَدْیُوْنَ۔ اَمْهَلَہٗ۔ اگر یہ لفظ مدیون کے ساتھ استعمال ہو۔ تو یہ معنے ہوتے ہیں کہ اس کو ڈھیل دی۔ مَدَّ اللّٰہُ عُمُرَہٗ۔ اَطَالَہٗ۔ اس کی عمر لمبی کی۔ مَدَّ الشَّیْءَ۔ جَذَبَہٗ۔ کسی چیز کو کھینچا۔ اَلْقَوْمَ۔ صَارَ لَهُمْ مَدَدًا۔ قوم کی مدد کی۔ وَاَغَاثَهُمْ بِنَفْسِہٖ۔ اور خود اُن کی اعانت کے لئے پہنچا۔ وَفِی اللِّسَانِ مَدَدْتُ الْاَرْضَ مَدًّا اِذَا زِدْتَ فِيْهَا تُرَابًا اَوْ سَمَادًا مِنْ غَيْرِهَا۔ فَيَكُوْنُ اَعْمَرَ لَهَا وَاَكْثَرَ رِيْعًا لِمَزْرِعِهَا۔ لسان العرب میں ہے۔ کہ مددت الارض اس وقت بولا جائے گا جب اس میں باہر سے کچھ مٹی اور کھاد وغیرہ ڈالی جائے۔ تاکہ وہ زمین اچھا غلہ پیدا کرنے لگ جائے (اقرب) تو معنے یہ ہوئے کہ وہ خدا ہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور وسیع کیا ہے۔ اور وہ خدا ہی ہے۔ جس نے زمین میں باہر سے لا کر اور مٹی ڈالی۔ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ قابل پیدائش بن سکے۔ یہ بات جغرافیہ سے ثابت ہے کہ اس زمین پر دوسرے کروں کے باریک باریک ذرات پڑ رہے ہیں جن کی وجہ سے یہ زمین زیادہ پیدائش کے قابل ہو رہی ہے۔ اور زمین کی مدد کرنے کا یہ مطلب ہے۔ کہ اس میں غیر محدود سامان رکھے ہیں تاکہ اس میں رہنے والے تباہ نہ ہوں۔

اَلرَّوَاسِیْ۔ اَلْجِبَالُ الثَّوَابِتُ الرَّوَاسِخُ (اقرب) مضبوط پہاڑ۔ ان معنوں کے لحاظ سے رواسی کا مفرد نہیں آتا ؛

مدّ الارض میں آسمان اور زمین کے ملکر کام کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

رُوحانی زمین اور رُوحانی آسمان کی ضرورت

تفسیر مَدَّ الارض میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ آسمان و زمین مل کر کام کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ رفع السمٰوٰت آسمان کو بلند کیا ہے۔ اور مدّ الارض زمین کو نیچے بچھا دیا ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح یہ دونوں آپس میں زوج ہیں جن کے ملنے سے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ کل کاروبار زمینی اور آسمانی طاقتوں کے ملنے سے چلتے ہیں۔ اور اسی طرح رُوحانی عالم کا حال ہے۔ اس میں بھی ایک روحانی آسمان اور ایک روحانی زمین کی ضرورت ہے یعنی ایک طرف قبول کرنے والی طبائع کی اور دوسری طرف آسمانی پانی اور آسمانی نور کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جس طرح آسمانی پانی کے نزول کے بعد قابل زمین اپنے خزانے نکالنے سے رُک نہیں سکتی۔ اسی طرح وہ طبائع جو کہ اس روحانی سماء کے لئے بمنزلہ زمین ہوتی ہیں۔ آسمانی پانی کے نزول کے بعد اپنے خزانوں کو روک نہیں سکتے۔ اور جس طرح لوہا مقناطیس کے پیچھے چلا آتا ہے۔ وہ اللہ تعالےٰ کے نبی کے پیچھے چلے آتے ہیں۔ پس محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے پھیلنے پر تعجب کی بات نہیں۔ اگر نہ پھیلے تو تعجب ہے کہ اچھی زمین نے عمدہ بارش کے نازل ہونے کے بعد سبزہ کیوں نہیں اُگایا ؛

ظاہری پہاڑوں اور دریاؤں کی طرح روحانی دنیا میں پہاڑ اور دریا ہوتے ہیں۔

پھر فرماتا ہے زمین میں ہم نے پہاڑ بنائے ہیں جن کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ان میں برف جم کر پانی کا ذخیرہ رکھتی ہے اور سال بھر چشموں اور دریاؤں کی صورت میں وہ پانی دنیا کو سیراب کرتا

وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ

اور زمین میں ایک دوسرے کے پاس پاس کئی (اقسام کے) قطعات ہیں۔ اور کئی (طرح کے) انگوروں کے باغات اور (کئی قسم کی) کھیتی اور (طرح طرح کے)

وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى

کھجور کے درخت (جن میں سے بعض) ایک ایک جڑ سے کئی کئی نکلنے والے (ہوتے ہیں) اور (بعض) ایک ایک جڑ سے کئی کئی نکلنے والوں کے خلاف (ایک ہی تنے کے

ہے اگر وہ برفوں کا ذخیرہ ختم ہو جائے تو چشمے اور دریا بھی بند ہو جائیں اور زمینیں بھی خشک ہو جائیں۔ یہی حال روحانی دُنیا کا ہے۔ اس میں بھی بعض وجود پہاڑ کی طرح ہوتے ہیں کہ خدا کے کلام کے لئے ذخیرہ کے طور پر ہوتے ہیں۔ اور بعض وہ وجود ہیں جو فائدہ تو پہنچاتے رہتے ہیں مگر جمع نہیں کر سکتے مگر ایک وہ ہیں جو صرف فائدہ ہی اُٹھا سکتے ہیں۔ پہاڑ تو انبیاءؑ ہیں۔ اور نہریں علماء ہیں۔ اور عام لوگ زمین کی طرح ہیں۔ جو اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ پس دو اسی کو اگر اُڑا دیا جائے تو پانی نہ رہے گا۔ اور دُنیا تباہ ہو جائے گی۔

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ۔ اور تمام پھلوں سے اس نے جوڑے یعنی نر و مادہ بنائے ہیں۔ گو یہاں صرف پھلوں کا ذکر کیا ہے مگر دوسرے مقامات سے ثابت ہے کہ ہر چیز کا جوڑا ہے۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس کے اظہار میں قرآن کریم منفرد ہے۔ عربوں نے سب سے پہلے کھجور کے نر و مادہ کا علم حاصل کیا مگر اس سے زیادہ وہ دریافت نہ کر سکے۔ قرآن کریم نے بتایا کہ سب پھل دار درختوں کے جوڑے ہیں بلکہ ہر شئے کے جوڑے ہیں۔ جس وقت یہ سچائی نازل ہوئی دنیا اس کی حقیقت کے سمجھنے سے قاصر تھی۔ مگر اب سائنس تیرہ سو سال بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ تمام اشیاء کے جوڑے ہیں حتّٰی کہ جمادات کے ذرّات تک میں نر و مادہ کی دریافت ہو رہی ہے۔ اس مثال سے بھی یہ بتایا ہے کہ جس طرح باقی ہر چیز کو خدا تعالےٰ نے جوڑا بنایا ہے۔ اسی طرح انسانی دماغ کا حال ہے جب تک اس پر خدا تعالےٰ کا نور نازل نہ ہو۔ اسے صحیح معرفت جو الہام اور عقل کا نتیجہ ہے حاصل نہیں ہوتی۔ اور اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ جب عقل صحیح اور الہام آسمانی مِل جاویں تو انہیں بار دار ہونے سے بھی کوئی روک نہیں سکتا۔ پس جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کے بغیر معرفت الٰہی کا پیدا ہونا ناممکن تھا اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ آپ کا لایا ہوا کلام صحیح طریق پر پہنچنے کے بعد انسانی عقول اسے قبول کرنے سے باز رہ سکیں ✤

دماغ کا جوڑا الہام آسمانی ہے۔

انبیاء پہاڑ کی طرح ہوتے ہیں اور علماء نہروں کی طرح۔

يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ سے ایک اور مثال تعلیم قرآن کے پھیل جانے کی دی۔ موجودہ تاریکی سے یہ دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے کہ قرآنی تعلیم کس طرح پھیل سکے گی۔ جس طرح روحانی دُنیا میں تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح خدا تعالےٰ رات کو دن کے بعد لاتا ہے اگر رات مستقل وجود ہو تو اس کا ہٹنا مشکل ہو لیکن تاریکی کا زمانہ بھی خدا تعالیٰ کے قانون کے ماتحت ہے اور اس کے حکم سے آتا ہے پس جو چیز تابع ہے اس کے متعلق کس طرح خیال کیا جا سکتا ہے کہ حکم کے باوجود ٹھہری رہے گی۔ سورج کی ایک شعاع تاریکی کے بادلوں کو پھاڑ دیتی ہے۔ اسی طرح اب ہو گا خدا تعالےٰ کے قبضہ میں نور ہی نہیں تاریکی بھی ہے۔ پس جب وہ چاہے کہ تاریکی ہٹ جائے تو تاریکی قائم نہیں رہ سکتی۔ جو لوگ فکر کرنے والے ہوں۔ وہ ان مثالوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور اُٹھائیں گے۔ باقی وہ گروہ جو دوزخ کے بھرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہا ہے۔ وہ بے شک رہ جائے گا ✤

قرآن کریم کے پھیلنے کی مثال۔

ہر چیز کا جوڑا ہوتا ہے۔

سائنس کی تحقیق کہ ہر چیز کا جوڑا ہوتا ہے۔

بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي

ہوتے) ہیں جنہیں ایک ہی (طرح کے) پانی سے سیراب کیا جاتا ہے۔ اور (باوجود اس کے) پھل کے لحاظ سے ہم ان میں سے بعض (درختوں)

الْاُكُلِ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

کو بعض پر فضیلت دیتے ہیں۔ اس میں (بھی) ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں کئی نشان (موجود) ہیں ۵ے

۵ے حل لغات۔ قِطَعٌ کا مفرد اَلْقِطْعَةُ ہے جس کے معنی ہیں۔ اَلْحِصَّةُ مِنَ الشَّيْءِ۔ یعنی ساری چیز کا ایک جزو قطعہ کہلاتا ہے (اقرب) مُتَجَاوِرَاتٌ۔ تجاوُرٌ سے ہے اور تَجَاوَرَ الْقَوْمُ کے معنے ہیں جَاوَرَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا۔ کہ ایک قوم دوسری قوم کی ہمسایہ بن گئی (اقرب) وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ کے معنی ہیں کہ زمین میں ایسے ٹکڑے ہیں جو ایک دوسرے کے آس پاس ہیں۔ صِنْوَانٌ کا مفرد صِنْوٌ ہے اور الصنو کے معنے ہیں۔ اَلْاَخُ الشَّقِيْقُ حقیقی بھائی۔ اَلْاِبْنُ بیٹا۔ اَلْعَمُّ چچا۔ وَاِذَا خَرَجَ نَخْلَتَانِ اَوْ اَكْثَرُ مِنْ اَصْلٍ وَاحِدٍ فَكُلُّ وَاحِدَةٍ مِنْهُنَّ صِنْوٌ وَصُنْوٌ۔ اور جب کسی کھجور سے دو یا دو سے زیادہ تنے نکل پڑیں۔ تو ہر ایک کو صنو کہتے ہیں۔ وَالْاِثْنَتَانِ صِنْوَانِ وَصنیان وَالْجَمْعُ صِنْوَانٌ اور دو کو صِنْوَان یا صِنْيَان کہتے ہیں۔ اور اس کی جمع صِنْوَانٌ ہے۔ وَقِيْلَ الصِّنْوُ عَامٌّ فِيْ كُلِّ فَرْعَيْنِ يَخْرُجَانِ مِنْ اَصْلٍ وَاحِدٍ فِي النَّخْلِ وَغَيْرِهٖ۔ اور بعض کے نزدیک صنو عام ہے۔ صرف کھجور سے تعلق نہیں رکھتا۔ پس صنوان وغیر صنوان کے معنے یہ ہوئے کہ ایسے کھجور کے درخت جو دو یا دو سے زائد تنوں والے ہیں (اقرب) اَلْاُكُلُ۔ اَلثَّمَرُ۔ اکل کے معنی ہیں پھل۔ اَلرِّزْقُ الْوَاسِعُ۔ وسیع رزق۔ (اقرب) وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ کے معنے ہوئے کہ ایک کا میوہ اعلیٰ اور زیادہ ہوتا ہے۔ اور دوسرے کا اعلیٰ بھی نہیں ہوتا۔ اور زیادہ بھی نہیں ہوتا۔

زمین کے مختلف حصوں کی مختلف طاقتیں۔

آنحضرتؐ کے نبی بنجانے پر ایک لطیف دلیل

تفسیر یعنی یہ نہ سمجھو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے ہی شخص ہے جس طرح یہ عبدالمطلب کا پوتہ ہے اور بھی کئی اس کے پوتے ہیں پس ان سب کو پیچھے چھوڑ کر یہ کیسے آگے نکل جائیگا یاد رکھو ایک ہی جگہ کی زمین کے مختلف ٹکڑوں میں مختلف طاقتیں ہوتی ہیں۔ ایک زمین کے پاس ہی دوسری زمین ہوتی ہے لیکن ایک ٹکڑے میں ایک درخت پیدا ہوتا ہے۔ اور دوسرے میں نہیں ہوتا۔ یہ نظارہ کشمیر میں خوب نظر آتا ہے۔ کہ ایک خاص زمین میں زعفران ہوتا ہے اور بالکل متصل ساتھ ہی کی زمین میں زعفران نہیں ہوتا۔ اسی طرح صوبہ سرحد میں ایک ٹکڑا زمین کا ہے جسے غالباً باڑہ کہتے ہیں اس میں خاص قسم کے اعلیٰ چاول ہوتے ہیں۔ پاس کے کھیتوں میں وہ چاول نہیں ہوتے زمینوں کو چھوڑ کر جانوروں کو لے لو۔ مشک کا ہرن ایک خاص علاقہ میں اچھا مشک دیتا ہے وہاں کے پاس ہی دوسرے علاقہ میں لے جاؤ تو پہلے تو مشک ناقص ہونے لگے گا پھر بالکل مشک ہی پیدا نہ ہوگا ÷

تو فرمایا جب مٹی میں ہی ایسے فرق ہو جاتے ہیں تو انسانوں میں کیوں نہیں ایسا فرق ہو سکتا کہ ایک آسمانی بن جائے اور ایک زمینی۔ يُسْقٰى کے لفظ سے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ چیزیں باوجودیکہ ان کو ایک ہی پانی ملتا ہے مختلف رنگ و مزے کی ہوتی ہیں لیکن تم کو تو پانی بھی علیحدہ علیحدہ قسم کا پلایا جاتا ہے۔ اس کو آسمانی پانی ملتا ہے۔ اور تم کو تو شیطانی کیونکہ تم تو اس کلام کو سننے سے انکاری ہو۔ اور شیطانوں کی باتیں سنتے رہتے ہو ÷

يُسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ ہمارے جیسا آدمی اور ہمارے جیسے ہی سامانوں والا ہم سے آگے کیسے نکل جائے گا۔ تو اس کا جواب یہ ہے

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا

اور (اے مخاطب) اگر تجھے (ان منکران حق پر) تعجب آئے تو (وہ بجا ہے کیونکہ) ان کا (یہ) کہنا (کہ) کیا جب ہم (مرکر) مٹی ہو جائیں گے تو

ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

کیا ہمیں واقع میں (پھر) کسی نئے جنم میں آنا ہوگا (واقعی) عجیب (قول) ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کا انکار کر

بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ

دیا ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی گردنوں میں طوق (پڑے) ہوں گے اور یہ (لوگ

اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ

دوزخ کی) آگ (میں پڑنے) والے ہیں وہ اس میں رہا کریں گے ۵ؐ اور وہ

کہ کیا ایک ہی پانی پی کر مختلف بیج مختلف مزے نہیں پیدا کر دیتے۔ پس یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ سامان ایک قسم کے ہیں بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ سامان کو استعمال کرنے کی قابلیت مختلف ہے ایک تلوار ایک اناڑی کے ہاتھ میں بیکار ہوتی ہے وہی تلوار شمشیر زن کے ہاتھ میں فتح و شکست کی ضامن ہو جاتی ہے۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ انہی مکہ والوں میں سے تھے جب تک ان کے ساتھ رہے معمولی آدمی رہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آئے دُنیا کے بہترین دماغ بن گئے اور دوست و دشمن نے انہیں خراج تحسین دیا اور دے رہے ہیں ؛

۵ؐ حل لغات ۔ اَلْغُلُّ۔ طَوْقٌ مِنْ حَدِيْدٍ اَوْقِدٍّ يُجْعَلُ فِى الْعُنُقِ۔ اَوْفِى الْيَدِ۔ غُلّ اس طوق کو کہتے ہیں جو لوہے یا چمڑے کا ہوتا ہے۔ اور ہاتھ میں یا گردن میں ڈالا جاتا ہے وَمِنْهُ قِيْلَ لِلْمَرْاَةِ السَّيِّئَةِ الْخُلُقِ۔ غُلٌّ قَمِلٌ۔ انہی معنوں میں بدخلق عورت کو غُلٌّ قَمِلٌ کہتے ہیں۔ وَاَصْلُهٗ اَنَّ الْغُلَّ كَانَ يَكُوْنُ مِنْ قِدٍّ عَلَيْهِ شَعْرٌ فَيَقْمَلُ فِى عُنُقِ الْاَسِيْرِ فَيُؤْذِيْهِ فَيَكُوْنُ الْغُلُّ الْقَمِلُ اَنْكٰى مِنْ غَيْرِهٖ۔ اور اصل اس کی یوں ہے کہ غل ایسے چمڑے سے ہوتا تھا جس میں بال ہوتے تھے اور قیدی کی گردن میں ڈالنے کے بعد اس میں جوئیں پڑ جاتی تھیں اور وہ طوق اسے تکلیف دیتا اس طرح وہ جوؤں والا غل نیا دہ تکلیف دہ ہو جاتا تھا۔ وَجَمْعُهٗ اَغْلَالٌ وَغُلُوْلٌ۔ اس کی جمع اغلال بھی آتی ہے اور غلول بھی۔ اور جب یہ محاورہ بولتے ہیں کہ هٰذَا غُلٌّ فِى عُنُقِكَ تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ یہ عمل تیرے گلے کا ہار بن گیا ہے اور تجھ کو اس کے بدلے میں عذاب ملیگا (اقرب)

تفسیر ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی میں اور ان کے ذریعہ سے دنیا کی اصلاح ہونے میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔

تعجب تو اس بات پر ہونا چاہیئے کہ دُنیا اس قدر خراب ہو جائے اور اللہ تعالیٰ اسکی اصلاح کی فکر نہ کرے۔ یہ امر خلاف سنت ہے کہ آنکھ تو ہو مگر اس سے کام لینے کے لئے روشنی نہ ہو سادہ تو ہو مگر اسکی طاقتوں کو ظاہر کرنے کے لئے نر نہ ہو پھر تعجب اس امر پر تو ہو سکتا ہے کہ نر و مادہ ملیں مگر نتیجہ پیدا نہ ہو۔ اس پر کیا تعجب ہے کہ ان دونوں کے ملنے سے بچہ کس طرح ہو گیا پس اس پر تعجب نہ کرو کہ اس کے ذریعہ سے دُنیا کی اصلاح کس طرح ہوگی۔ تعجب تو تم کو اپنے اس احمقانہ خیال پر کرنا چاہیئے کہ ہم گرنے کے بعد اُٹھیں گے کس طرح۔ مرنے کے بعد

سامان سب ہر شخص حسب استعداد فائدہ حاصل کرتا ہے

آنحضرت کے مخالفین کا آپکی ترقی پر تعجب۔

اَلْغُلّ

بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ

نیک جزا پر سزا کو مقدم کرتے ہوئے تجھ سے (اسکے) جلدی (آنے) کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان سے پہلے (ایسے لوگوں پر)

الْمَثُلٰتُ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى

تمام (قسم کی) عبرتناک عذاب آچکے ہیں اور تیرا رب لوگوں کو ان کے ظلم کے باوجود (بھی) بلاشک وشبہ (بہت ہی)

ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ وَيَقُوْلُ

بخشنے والا ہے۔ اور (اسی طرح) تیرا رب یقیناً سخت سزا دینے والا (بھی) ہے ؎ اور

زندہ کس طرح ہونگے۔ جب آسمانی سہارا آجائے جب زندگی کا پانی مل جائے۔ پھر ان باتوں میں کیا تعجب ہے +

اولٰئک الذین کفروا بربھم

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ الآیۃ۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ یہ مایوسی خدا تعالیٰ کے فضلوں سے کفر اور انکار کی وجہ سے ہوئی ہے +

اللہ تعالیٰ کے طریق کو چھوڑ کر خودساختہ قواعد کی اتباع ناکام کرتی ہے۔ اُمید کے بغیر ہمیشہ فضل کے بجائے عذاب کے طلب ہوتے ہیں۔

جو لوگ خودساختہ قواعد کی اتباع کرتے اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریق کو چھوڑتے ہیں ان کے لئے مایوسی کا شکار ہوجانا کوئی عجیب بات نہیں۔ اور مایوسی کا لازمی نتیجہ ناکام ہونا اور حسرتوں کے جہنم میں جلنا ہے افسوس کہ اس وقت یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریق کو چھوڑ کر خودساختہ علاجوں کی طرف متوجہ ہیں بجائے اشاعت اسلام۔ اصلاح اخلاق دعا اور انابت اور تسلیم لامر اللہ کے سود اور بنک اور انگریزی تعلیم اور بیمہ اور کیا کیا علاج تجویز کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بعض خلاف اسلام اور مضر ہیں۔ اور بعض بغیر روحانی طاقتوں کے غیر مفید ہیں +

المثلٰت انبیاء کے بھیجنے سے لوگوں کو تباہ کرنا مقصود نہیں ہوتا۔

؎ حل لغات ۔ اَلْمَثُلٰتُ۔ اس کا مفرد اَلْمَثُلَةُ ہے جس کے معنے ہیں۔ اَلْعُقُوْبَۃُ۔ سزا۔ یُقَالُ حَلَّتْ بِهٖ الْمَثُلَةُ اور حَلَّتْ بِهٖ الْمَثُلَةُ کا محاورہ مذکورہ بالا معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے کہ اس پر سزا وارد ہوئی۔ وَمَا اَصَابَ الْقُرُوْنَ الْمَاضِيَةَ مِنَ الْعَذَابِ وَهِيَ عِبَرٌ يُعْتَبَرُ بِهَا۔ اور گزرے ہوئے لوگوں پر جو عذاب نازل ہوئے اور جو دوسری اقوام کے لئے موجب عبرت ہیں۔ ان کو بھی مَثُلَةٌ کہتے ہیں (اقرب)

تفسیر ۔ جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اگر تم نے اپنے اعلال کو دور نہ کیا اور خدا تعالیٰ کے سامانوں سے فائدہ نہ اٹھایا اور اپنی طاقتوں سے کام نہ لیا تو تم خشک لکڑی کی طرح ہو جاؤ گے جس کا کام سوائے جلنے کے اور کچھ نہیں۔ تو جھٹ کہہ دیتے ہیں کہ اچھا پھر وہ آگ لاؤ جس میں ہم نے جلنا ہے۔ ہم جو نیکی کی بات بتاتے ہیں اس کو تو قبول نہیں کرتے اور جو عذاب کا ڈراوا دیتے ہیں اس کو جلدی مانگنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ نبیوں کے ساتھ عذاب بھی آتا ہے اور اب بھی آئے گا مگر انہیں یہ نہ چاہیئے تھا کہ بجائے اصلاح کے فضل الٰہی طلب کرنے کے ضد کر کے عذاب طلب کرتے +

ہر نبی کے وقت میں ایسا ہی ہوتا ہے ان کے نادان دشمن فضل نہیں مانگتے یہ نہیں کہتے کہ سچا ہے تو ہمیں اسکی اطاعت نصیب ہو بلکہ یہ کہتے ہیں کہ سچا ہے تو ہم پر عذاب نازل ہو +

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ۔ اس آیت میں اس عظیم الشان حکمت کو بیان فرماتا ہے کہ ہماری غرض انبیاء کے بھیجنے سے لوگوں کو تباہ کرنا نہیں بلکہ انہیں بچانا ہے۔ دُنیا کے لوگ ظلم پر ظلم کرتے چلے جاتے ہیں پھر بھی ہم مغفرت سے کام لیتے جاتے ہیں پس تمہارے عذاب جلدی مانگنے سے ہم عذاب جلدی نہ لے آئیں گے کیونکہ یہ ہماری سنت کے خلاف ہے ہماری خواہش تو یہ ہے کہ تم کو بخشش ملے۔ پس انہی ذرائع کو ہم کام میں لائیں گے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو نجات دینے کا موجب ہوں +

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔

جن لوگوں نے انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں (کہ) اس (شخص) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشان کیوں نہیں اُتارا گیا (حالانکہ)

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۝ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا ع

تو صرف آگاہ (اور ہشیار) کرنے والا ہے۔ اور ہر ایک قوم کے لئے (خدا تعالیٰ کی طرف سے) ایک راہنما (مقرر) ہے ۵۸ اللہ (خوب) جانتا ہے

تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۔

اسے (بھی) جو ہر مادہ اٹھاتی ہے اور جسے رحم ناقص کر (کے گرا) دیتے ہیں۔ اور (اسے بھی) جسے وہ بڑھاتے

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ

ہیں۔ اور ہر چیز کا اس کے پاس ایک خاص اندازہ میں موجود ہے ۵۹ وہ غائب اور حاضر (دونوں) کا جاننے والا ہے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے تم بچ جاؤ گے تمہاری اصلاح کی پوری کوشش کی جائیگی لیکن تم نے اصلاح نہ کی تو پھر خدا تعالیٰ سزا بھی ضرور دیگا۔ اور اسکی سزا کی شدت کا مقابلہ کوئی اور عذاب نہیں کر سکے گا۔

اس جملہ کے یہ معنی نہیں کہ خدا تعالیٰ عذاب دینے میں سختی سے کام لیتا ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب دوسروں کے عذاب سے سخت ہوتا ہے کیونکہ وہ جن راہوں سے عذاب محسوس کرا سکتا ہے انسان نہیں کرا سکتے۔ عِقَاب کے لفظ سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ خدا تعالیٰ کا عذاب بلاوجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کے اعمال کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کیونکہ عِقَاب اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو ایڑیوں سے لگی ہوئی ہو یعنی اپنے کئے کا نتیجہ ہو جیسے بچہ ماں کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔

۵۸ تفسیر۔ باوجود بار بار نشانات ظاہر ہونے کے اور آئندہ کے لئے نشانات کی خبر دینے کے کفار کہتے کہ نشان تو کوئی دکھاتے نہیں ہم مانیں کیونکر۔ اور اس نشان سے انکی مراد عذاب الٰہی کا نزول ہوتا ہے کیونکہ انکے نزدیک نشان یہی تھا کہ وہ تباہ ہو جائیں۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار جب بھی آیت کا مطالبہ کریں جب تک کوئی دوسرا قرینہ اور معنوں پر دلالت نہ کرے ہمیشہ اس کے معنے عذاب کے ہوتے ہیں۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ فرمایا۔ یہ نادان سوچتے نہیں کہ تیرا تو ایک نام مُنْذِر ہے۔ بلکہ نہ ماننے والوں کے لئے تیرا یہی نام ہے پس جواب تیرے نام ہی سے بتادی گئی ہے۔ اب یہ اسکی اور وضاحت کیا چاہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ان کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ہر قوم کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ مامور بھیجتا ہے اگر ہدایت سے پہلے عذاب آجائے تو ھَادِ کی صفت باطل جائے پس صبر کریں پہلے یہ ہادی بن جائیگا اس کے بعد جو رہ جائیں گے ان کے لئے منذر بن جائے گا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایسا ہی ہوتا رہا کچھ عرصہ تک آپ کے ذریعہ سے لوگ ہدایت پاتے پھر اس طبقہ کے بچے کھچے لوگ عذاب سے تباہ ہو جاتے۔ پھر ایک اور طائفہ ہدایت پاتا۔ پھر ان کے سرکردہ عذاب میں مبتلا ہوتے اسی طرح آخر تک ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کے آخری فیصلہ نے تمام غلبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو بخش دیا۔ اور آپ کے دشمن بالکل تباہ ہو گئے۔

۵۹ حل لغات تَغِيْضُ غَاضَ ماضی سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور غَاضَ الْمَاءُ غَيْضًا کے معنی ہیں نَقَصَ۔ پانی کم ہو گیا۔ اَوْغَارَ فَذَهَبَ فِي الْاَرْضِ۔ یا جذب

شَدِيْدُ الْعِقَابِ

خدا تعالیٰ کا عذاب دوسروں کے عذاب سے سخت ہوتا ہے

عقاب کے معنے ... کہ خدا تعالیٰ کا عذاب بلاوجہ نہیں ہوتا۔

کفار کے نزدیک نشان سے مراد عذاب ہوتا ہے۔

ہوکر زمین کی تہ میں چلا گیا۔ وَفِی الصِّحَاحِ قَلَّ فَنَضَبَ اور

الزیادۃ

صحاح میں غَاضَ الْمَاءُ کے یہ معنی کئے گئے ہیں کہ پانی کم ہوکر خشک ہوگیا۔ ثَمَنُ السِّلْعَۃِ۔ نَقَصَ جب غَاضَ کا لفظ ثمن کے ساتھ استعمال ہو تو یہ معنے ہوتے ہیں کہ سامان کی قیمت جو پہلے زیادہ تھی کم ہوگئی۔ وَیُقَالُ "غَاضَ الْمَاءَ وَالثَّمَنَ" اور جب غاض کا لفظ متعدی ہوکر استعمال ہو۔ اور اس کا مفعول "الماء" اور "الثمن" ہو تو یوں معنے کئے جائیں گے۔ کہ سامان کی قیمت کو گرا دیا۔ اور پانی کو کم کر دیا۔ وَمَا تَغِیْضُ الْاَرْحَامُ۔ اَیْ مَا تَنْقُصُ نُطْفَۃً اَشْہُرٍ۔ پس اقرب الموارد والے نے مَا تَغِیْضُ الارحام کے معنے یہ کئے ہیں کہ اللہ خوب جانتا ہے)

تغیض

رحم اپنی مقررہ مدت ولادت میں جو کمی کرتے ہیں۔ نیز اَلْغَیْضُ جو غَاضَ کا مصدر ہے اس کے ایک معنی لغت میں یہ بھی کئے گئے ہیں اَلسِّقْطُ الَّذِیْ لَمْ یَتِمَّ خَلْقُہٗ۔ کہ غیض اس بچے کو کہتے ہیں جس کی پیدائش ابھی مکمل نہ ہوئی ہو اور وہ ناقص حالت میں گر جائے۔ پس غیض کے اس معنے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ما تغیض الارحام کے معنے یہ ہوں گے۔ کہ اللہ اسے خوب جانتا ہے جسے رحم ناقص کرکے گرا دیتے ہیں (اقرب)

تزداد

تَزْدَادُ۔ اِزْدَادَ ماضی سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور اِزْدَادَ۔ زَادَ سے بنا ہے جس کے معنے ہیں

اللہ یعلم ما تحمل کل انثیٰ کا مطلب۔

زیادہ ہوگیا یا زیادہ کر دیا۔ اور اِزْدَدْتُ مَالًا و اِزْدَادَ الْاَمْرُ صُعُوْبَۃً کے معنے ہیں۔ یعنی مال کو بڑھایا۔ اور معاملہ پیچیدگی اور مشکل میں بڑھ گیا۔ یعنی یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اور جب اِزْدَادَ الرَّاھِنُ دَرَاھِمَ مِنَ الْمُرْتَھِنِ کا محاورہ بولا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اَخَذَھَا زِیَادَۃً عَلٰی رَاْسِ الْمَالِ کہ رہن رکھنے والے نے مرتہن سے اصل مال پر بطور نفع کچھ رقم زیادہ لی۔ اور جب کوئی چیز دینے والا لینے والے کو کہے ھَلْ تَزْدَادُ تو اس کے معنے ہوتے ہیں ھَلْ تَطْلُبُ

تحمل سے ظاہری حمل بھی مراد ہو سکتا ہے۔

زِیَادَۃً عَلٰی مَا اَعْطَیْتُکَ۔ کیا اس کے علاوہ جو تجھے دیا گیا تو اور زیادہ طلب کرتا ہے؟ پس مَا تَزْدَادُ کے معنے یہ ہوں گے کہ (اللہ خوب جانتا ہے) رحم اپنی مقررہ مدت ولادت میں جو زیادتی کرتے ہیں (اقرب) نیز اَلزِّیَادَۃُ جو زَادَ کا مصدر ہے۔ اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں۔ کہ اَنْ یَنْضَمَّ اِلٰی مَا عَلَیْہِ الشَّیْءُ فِیْ نَفْسِہٖ شَیْءٌ اٰخَرُ کہ جن عام حالتوں میں کوئی چیز پائی جاتی ہو اس پر بطور زیادتی کوئی اور چیز اس کے ساتھ مل جائے پس ان معنوں کے مدنظر ما تزداد کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ اسے خوب جانتا ہے جسے رحم اصل چیز میں بڑھاتے اور زیادہ کرتے ہیں۔ (اقرب) مقدار کے معنے ہیں "بڑا" کا لفظ تنوین کا ترجمہ ہے جو کبھی بڑے کے معنے دیتی ہے۔

تفسیر۔ پہلے بتایا تھا کہ ہم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید مخفی ذرائع سے کریں گے۔ اسی کے ذکر میں یہ بھی بتایا تھا کہ تمام دنیا میں جوڑے پیدا کئے گئے ہیں حتّٰی کہ زمین و آسمان بھی گویا ایک قسم کے جوڑے ہیں۔ ایک اثر ڈالتا ہے اور دوسرا اسے قبول کرتا ہے۔ ایک مخفی ذرائع سے دوسرے کی حیات کو قائم رکھتا ہے۔ اور دوسرا قائم رہتا ہے۔ ایسا ہی روحانی سلسلہ میں بعض لوگ نر کا درجہ رکھتے ہیں اور بعض مادہ کا۔ اوّل الذکر اثر ڈالتے ہیں۔ اور ثانی الذکر قبول کرتے ہیں۔

اب فرمایا کہ اس قانون کے ماتحت اب بھی ایک شخص کا ظہور ہوا ہے۔ جو روحانی طور پر نر کا مقام رکھتا ہے جس سے تعلق کے بغیر کوئی روحانی درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اَللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ کُلُّ اُنْثٰی۔ یعنی ہم جانتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن اپنے اندر کیا رنگ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اندر کونسے مادہ کو قبول کیا ہے۔ روحانیت کا یا شیطنت کا۔ اور یہ کہ کس کا مادہ بڑھے گا اور کس کا گھٹے گا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کو قبول کرنے والے ہیں۔ وہ بڑھیں گے اور ان کے اندر اعلیٰ قابلیتیں پیدا ہوں گی۔ اور جو آپ کے مقابل شیطانوں کے اثر قبول کر رہے ہیں ان کی ظاہری اور باطنی نسل تباہ ہوگی۔ ظاہری حمل بھی اس جگہ مراد ہو سکتا ہے اور اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ ہمیں معلوم ہے کہ تمہاری قوم کی آیندہ نسلیں کیا بننے والی ہیں۔ آیندہ تمہاری عورتوں کے ہاں وہی اولاد ہوگی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتگذار ہوگی

اَلْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ

بڑے مرتبہ والا (اور) بڑی شان والا ہے ؎ جو تم میں سے بات چھپاتا ہے۔ اور وہ بھی جو اسے ظاہر کرتا ہے

مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ

(اس کے علم کے لحاظ سے دونوں) برابر ہیں نیز وہ بھی جو رات کو چھپ رہتا ہے

آپؐ کی مخالفت اولاد ضائع ہی ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا مکہ کی نئی نسل کثرت سے آپؐ کے خدام میں داخل ہوئی۔ اور بزرگ ان کو دیکھ دیکھ کر جلتے رہے۔ انکے ظلم اور قہر نئی نسل کو ایمان لانے سے روک نہ سکے۔ یہ تدبیر بھی آپؐ کی ترقی کے لئے نہایت ممد ہوئی۔ گو ابتداءً اس کو جانچنے کے لئے کفار کے پاس کوئی سامان نہ تھے۔

؎ حل لغات - الغیب:- یہ غَابَ - یَغِیْبُ کا مصدر ہے۔ اور غَابَتِ الشَّمْسُ وغیرُھا اذا اسْتَتَرَتْ مِنَ الْعَیْنِ غَابَ کا لفظ سورج کیلئے یا کسی اور چیز کیلئے اس وقت بولتے ہیں کہ جب سورج غروب ہو جاوے یا کوئی اور چیز آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ اِسْتُعْمِلَ فِیْ کُلِّ غَائِبٍ عَنِ الحَاسَّةِ جو بات حواس سے بالا اور پوشیدہ ہو۔ اس پر بھی غیب کا لفظ اطلاق پاتا ہے۔ اور شہادة کا لفظ غیب کے بالمقابل بولا جاتا ہے (مفردات) پس غیب اور شہادت کے دو معنی ہیں۔ (۱) شہادة جو لوگ ظاہر کرتے ہوں۔ اور غیب جسے وہ چھپاتے ہوں۔ (۲) جو حواس ظاہری سے معلوم ہو سکے وہ شہادت ہے اور جو باتیں حواس سے بالا اور پوشیدہ ہیں۔ . . . . . . وہ غیب ہیں۔ تو عالم الغیب والشہادة کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم تمہاری ہر ایک تدبیر کو جانتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنے دشمن کی باتوں کو نہ جانتا ہو لیکن دشمن اسکی باتوں سے واقف ہو۔ تو وہ انسان اس سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پس تمہیں احتیاط کرنی چاہیئے۔

اَلْمُتَعَالُ - تَعَالٰی - اِرْتَفَعَ - تعالیٰ کے معنے ہیں بلند ہوا۔ وَالمتعال - رَفِیْعُ الشَّانِ - بڑی شان والا - اَلْكَبِيْرُ ذُو الْكِبْرِ۔ کبیر کے معنے ہیں۔ کبر والا۔ اور کبر کے معنے ہیں۔ اَلشَّرَفُ بزرگی اَلرِّفْعَةُ فِی الشَّرَفِ۔ شرف کے لحاظ سے رفعت۔ العَظَمَةُ وَالتَّجَبُّرُ عظمت و جبروت (اقرب) پس کبیر کے معنی ہونگے بزرگی والا۔ عظمت و جبروت والا۔ شرف کے لحاظ سے رفعت والا۔

کبیر اور متعال دونوں میں یہ فرق ہے کہ کبیر اس بڑائی پر دلالت کرتا ہے جس سے دوسروں پر اثر ڈالنے والی بلندی مراد ہو جیسے متکبر ہوتا ہے یعنی دوسروں کے مقابلہ میں بڑا بننا چاہتا ہے۔ ایسا ہی کبیر میں خدا تعالیٰ کی وہ بڑائی مراد ہے۔ جو بہ نسبت اس کی مخلوق کے ہے۔

متعال۔ اس بڑائی پر دلالت کرتا ہے۔ جو تنزہ والی ہوتی ہے یعنی اسکی ایسی ارفع شان ہے۔ کہ بندوں سے واسطہ ہی نہیں رہتا۔ پس جو رفعت استغناء پر دلالت کرتی ہے وہ متعال کے لفظ سے بیان کی گئی ہے۔ اور جو رفعت بندوں سے تعلق پر دلالت کرتی ہے اس کو الکبیر کے لفظ سے واضح فرمایا ہے۔

ان دونوں کے اس جگہ پر ذکر کرنے کی یہ وجہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ ہم کبیر ہیں۔ تمہاری طاقتیں ہمارے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں ہم تمہاری مخالف کوششوں کو بالکل ذلیل اور حقیر بنا کر بیکار کر دینگے یعنی جب چاہیں گے پیس ڈالیں گے اور ہم غنی ہیں تمہاری تباہی سے ہماری حکومت میں کوئی کمی نہ آوے گی۔

تفسیر - اس آیت میں یہ گر بتایا ہے کہ دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کے لئے اسکی تدابیر کا علم حاصل کرنا ضروری ہے اگر ہم اسکی کوششوں سے واقف ہیں۔ تو ان کے اثر کو دور کر سکینگے ورنہ ہر وقت خطرہ میں رہیں گے۔

(حاشیہ: خمبیر — کبیر و متعال میں فرق۔ — الغیب — غیب اور شہادت کے دو معنے۔ — دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کا گر — المتعال)

بِالنَّهَارِ ۝ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ

اور جو دن کو چلتا ہے ۱۱ ؎ اس کی (یعنی اللہ کی) طرف سے اس کے آگے بھی اور اس کے

خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ

پیچھے بھی (ایک دوسرے کے) پیچھے آنے والی (ایک ملائکہ کی) جماعت (حفاظت کے لئے) مقرر ہے جو اس کی اللہ کے حکم سے حفاظت کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ

کبھی بھی کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا۔ جب تک کہ وہ اپنی اندرونی حالت کو نہ بدلے اور جب اللہ (تعالیٰ)

بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ

کسی قوم کے متعلق عذاب کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس (عذاب) کو ہٹانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اور اس (یعنی اللہ) کے سوا ان کا اور

عالم الغیب کہنے کا مطلب۔

عَالِمُ الْغَيْبِ کہہ کر بتایا کہ اے نادانو! اتنا تو سوچو۔ تمہارا مقابلہ کس ہستی سے ہے۔ کیا اس خدا سے کہ جو تمہاری تدبیروں کو جانتا ہے۔ اور پھر وہ کبیر ہے۔ تمہاری تمام تدابیر کو ایک منٹ میں توڑ کر رکھ سکتا ہے۔ پھر اس کی شان تمہارے علم سے نہایت ارفع ہے۔ یعنی وہ تمہاری تدابیر کو جانتا ہے اور تم کو علم نہیں کہ وہ تمہارے ہلاک کرنے کے کیا کیا سامان کر رہا ہے۔ پس غور کرو کہ کیا تم ایسی ذات کا مقابلہ کر سکتے ہو۔

کبیر کے لفظ سے ان کی تدابیر کے توڑنے پر دلالت کی ہے۔ اور متعال سے بتایا کہ تم خدا کی تدابیر سے واقف نہیں ہو سکتے۔ پھر اسی کی تشریح میں آگے فرمایا۔

ہو بع

۱۱؎ **حل لغات۔** سَارِبٌ۔ سَرَبَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور سَرَبَ الْبَعِيْرُ سُرُوْبًا کے معنی ہیں تَوَجَّهَ لِلْمَرْعٰى۔ اونٹ چرنے کے لئے گیا۔ اِبِلٌ سَارِبَةٌ مُتَوَجِّهَةٌ لِلْمَرْعٰى۔ اور ابل سَارِبَة۔ ان اونٹوں کو کہتے ہیں جو چرنے کے لئے جا رہے ہوں۔ الماء المجری اور جب سَرَبَ الْمَاءُ کا فقرہ استعمال کیا جائے۔ تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے۔ پانی بہ پڑا۔ فُلَانٌ فِي الْاَرْضِ۔ ذَهَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ فِيْهَا وَمَضٰى اور جب سَرَبَ فُلَانٌ فِي الْاَرْضِ کہا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ زمین میں چلا۔ (اقرب)

آنحضرت کے مقابل کفار کے دو طریق۔

تفسیر۔ کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں دو ہی طریق استعمال کیا کرتے تھے۔ کبھی پبلک میں دھمکیاں دیا کرتے تھے کہ ہم اس اس طرح آپ کو تباہ کر دیں گے۔ تا آپ ڈر جائیں۔ اور کبھی مخفی طور پر مشوروں اور منصوبوں کے ذریعہ سے آپ کو ہلاک کرنے کی کوششیں کرتے تھے۔ کبھی آپ پر دن کو حملہ کرتے تھے۔ جیسا کہ اوجھری کے سر پر ڈال دینے یا آپ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کے واقعات ہیں اور کبھی رات کو حملہ کرتے تھے۔ جیسا کہ ہجرت کی رات کو وہ حملہ آور ہوئے تھے۔ اور دنیا میں دشمن کو خوف زدہ کرنے کے یہی دو طریق ہوا کرتے ہیں۔ یعنی علی الاعلان دھمکیاں۔ یا مخفی مشورے و منصوبے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا مقابلہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ پھر تمہارے ظاہری اور مخفی حملے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

وَّالٍ ○ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّ

کوئی (بھی) مددگار نہیں (ہو سکتا) وہی ہے جو تمہیں بجلی (کی چمک) دکھاتا ہے خوف کے لئے (بھی) اور طمع کے لئے (بھی) اور

۱۲ حل لغات - مُعَقِّبَاتٌ عَقَّبَ میں سے ہے اور عَقَّبَہٗ کے معنے ہیں جَاءَ بِعَقِبِہٖ. اس کے پیچھے پیچھے آیا آتی بِشَیْءٍ بعدہٗ یا اس کے بعد کوئی کام کیا۔ عَقَّبَ فُلَانٌ کے معنے ہیں غزا علی العدوِّ ثمّ ثنّٰی من سَنَتِہٖ کہ دشمن پر ایک حملہ کرنیکے بعد پھر اسی سال دوسرا حملہ کیا۔ اور جب عَقَّبَ فی الامر کہا جائے تو اسکے معنے ہوتے ہیں تَرَدَّدَ فی طلبہٖ مُجِدًّا کسی بات کی تلاش میں بار بار کوشش کی علاوہ ازیں عقّب کے کئی اور استعمال ہیں مثلاً عَقَّبَ فِی الصَّلٰوۃِ۔ مَکَثَ فِیْ مَوْضِعِہٖ ینتظر صلوٰۃ اُخْرٰی۔ نماز پڑھ کر اپنی جگہ بیٹھ کر دوسری نماز کا انتظار کرتا رہا الحاکمُ علیٰ حکمِ سلفِہٖ حَکَمَ بعدَ حکمِہٖ۔ حاکم نے اپنے سے پہلے کے فیصلے کے بعد کوئی اور فیصلہ کر دیا۔ اور المُعَقِّبَات کے معنی ہیں ملائکۃُ اللَّیْلِ وَالنَّہَارِ دن اور رات کے فرشتے۔ التسبیحات یخلف بعضہا بعضًا۔ تسبیحات۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کے بعد آتی ہیں۔ اَللَّوَاتِیْ یَقُمْنَ عِنْدَ اَعْجَازِ الْاِبِلِ الْمُعْتَرِکَاتِ عَلَی الْحَوْضِ فَاِذَا انْصَرَفَتْ نَاقَۃٌ دَخَلَتْ مَکَانَہَا اُخْرٰی وہ اونٹنیاں جو اونٹوں کے پانی پر اِزْدِحام کے وقت پیچھے کھڑی رہتی ہیں۔ اور جب ایک اونٹنی پانی پی کر چلی جاتی ہے تو دوسری اس کی جگہ آ جاتی ہے (اقرب) اس جگہ مُعَقِّبَات سے مراد پہرہ دار اور توابع۔ آگے پیچھے چلنے والے ہیں۔
لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ ای ملائکۃ (۲) یَتَعَاقَبُوْنَ عَلَیْہِ حَافِظِیْنَ۔ معقّبات سے مراد وہ فرشتوں کی جماعت ہے جو حفاظت کے لئے یکے بعد دیگرے آتے ہیں (مفردات)
مَرَدٌّ رَدَّ کا مصدر ہے۔ اور رَدَّ عَنْ وجہہٖ کے معنے ہیں۔ صَرَفَہٗ اس کو پھیر دیا۔ عَلَیْہِ الشَّیْءَ۔ لَمْ یَقْبَلْہُ۔ رَدَّ علیہ الشیءَ کے معنے ہیں عطیہ کو قبول نہ کیا۔ اور واپس کر دیا۔ الٰی مَنْزِلِہٖ اَرْجَعَہٗ اس کو واپس اس کے مکان کی طرف لوٹا دیا۔ پس مرد مصدر کے جو اسم فاعل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ معنے ہونگے ہٹانے والا واپس کرنے والا۔ (اقرب) اور لا مَرَدَّ لَہٗ کے معنے ہونگے اسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔

مُعَقِّبَات

وَالٍ۔ وَلِیَ سے اسم فاعل ہے۔ اور وَلِیَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں مَلَکَہٗ اسْتَوْلٰی وَ قَامَ بِہٖ کسی بات کا مالک بنا۔ اور اسکی ذمہ داری کو اٹھایا۔ فلانًا وعلیہ نَصَرَہٗ۔ اور وَلِیَ فلانًا کے معنے ہیں اسکی مدد کی فلانًا وِلَایَۃً۔ اَحَبَّہٗ اور جب وِلایۃً مصدر ہو تو اس کے معنے ہونگے محبت کی۔ (اقرب) پس وَالٍ کے معنے ہوں گے (۱) مددگار (۲) نگران (۳) محافظ +

تفسیر۔ لہٗ کی ضمیر میرے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات کی طرف پھرتی ہے یعنی جیسے بادشاہوں کے گرد پہرہ دار ہوتے ہیں۔ ویسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے پیچھے معقّبات ہیں۔ ان معنوں کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے چنانچہ ابو نعیم نے الدلائل میں اور طبرانی نے اپنی معجم کبیر میں نقل کیا ہے کہ عامر ابن طفیل اور عرید ابن قیس دو شخص حضور کے پاس آئے۔ عامر نے کہا۔ کہ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو کیا ولایت امر یعنی اپنے بعد خلافت مجھے دے دی جائے گی؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ تمہاری اس شرط کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خلافت تمہیں اور تمہاری قوم کو کبھی نہ ملے گی۔ اس نے اس بات سے ناراض ہو کر کہا۔ کہ پھر میں ایسے سوار لاؤں گا کہ تم یاد رکھو گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تمہیں اسکی توفیق ہی نہ دیگا۔ اسپر وہ دونوں ناراض ہو کر چلے گئے۔ راستہ میں عرید نے کہا۔ آؤ پھر واپس چلیں۔ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو باتوں میں لگاؤں کا تم پیچھے سے تلوار کے ذریعہ سے ان کا کام تمام کر دینا۔ عامر نے کہا کہ اس طرح بڑا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اور آپ کے ساتھی ہمیں قتل کر دینگے۔ اس نے جواب دیا کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ ہم دیت دے دیں گے چنانچہ وہ دونوں واپس آئے۔ عرید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

لَہٗ معقّبات کی ضمیر آنحضرت کے لئے ہے۔

مُعَقِّبَات سے مراد

مَرَدَّ

ص۔ پس لہٗ مُعَقِّبَات کے معنے ہوئے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کیلئے آگے پیچھے فرشتوں کی ایک جماعت ہے (۲) اس کیلئے دشمنوں کے حملوں کو روکنے والے اور اس کی تائید میں بار بار حملہ کرنے والے مقرر ہیں۔ (۳) لہٗ کی ضمیر کا مرجع مَنْ ہُوَ مُسْتَخْفٍ سے القول من تقدیر ہو تو یہ مراد ہوگی کہ ہر انسان کی حفاظت کیلئے خدا نے پہرہ دار مقرر کر رکھے ہیں

سے باتیں کرنے لگا۔ اور عامر نے چاہا کہ آپ کو پیچھے سے تلوار مار دے۔ مگر وہ تلوار سونت کر رہ گیا۔ اور وار نہ کر سکا۔ حدیثوں میں تو آتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر فالج گرا۔ لیکن چونکہ انہی حدیثوں میں یہ ذکر بھی ہے کہ بعد میں وہ سوار ہو کر گیا۔ اور ہاتھ کا استعمال کرتا رہا اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فالج نہیں گرا تھا۔ بلکہ

آنحضرت کی حفاظت کا ثبوت۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے دل پر رُعب طاری کر دیا۔ اور اسے حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رُعب سے اس کا ہاتھ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ لکھا ہے کہ اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مُڑ کر دیکھا۔ تو اس نے ہاتھ تلوار کے قبضہ پر رکھا ہوا تھا حضور اس کے ارادہ کو بھانپ گئے اور پیچھے ہٹ گئے۔ مگر ان دونوں سے کچھ تعرض نہ کیا۔ اس کے بعد وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ عربد پر راستہ میں بجلی گری اور عامر کا رنگل سے ہلاک ہو گیا۔ صحابہؓ کہتے ہیں۔ کہ ہم اس واقعہ پر لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ والی آیت چسپاں کیا کرتے تھے (روح المعانی) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صحابہؓ اس آیت کو عام سمجھنے کی بجائے خاص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سمجھا کرتے تھے +

معقبات میں صحابہ کرام بھی داخل ہیں۔

صحابہ معقبات والی آیت آنحضرت صلعم کے متعلق سمجھتے تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام زمانہ نبوت اس حفاظت کا ثبوت دیتا ہے چنانچہ مکہ معظمہ میں آپ کی حفاظت فرشتے ہی کرتے تھے۔ ورنہ اس قدر دشمنوں میں گھرے ہوئے رہ کر آپ کی جان کس طرح محفوظ رہ سکتی تھی۔ ہاں مدینہ تشریف لانے پر دونوں قسم کی حفاظت آپ کو حاصل ہوئی۔ آسمانی فرشتوں کی بھی۔ اور زمینی فرشتوں یعنی صحابہؓ کی بھی +

آنحضرت کی حفاظت فرشتے کرتے تھے

بدر کی جنگ اس ظاہری اور باطنی حفاظت کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔ حضور جب مدینہ تشریف لے گئے تھے تو آپ نے اہل مدینہ سے معاہدہ کیا تھا۔ کہ اگر آپ مدینہ سے باہر جا کر لڑینگے تو مدینہ والے آپ کا ساتھ دینے پر مجبور نہ ہوں گے بدر کی لڑائی میں آپ نے انصار اور مہاجرین سے لڑنے کے بارہ میں مشورہ فرمایا۔ مہاجرین بار بار آگے بڑھ کر مقابلہ کرنے پر زور دیتے تھے۔ لیکن حضور انکی بات سُنکر پھر فرما دیتے۔ کہ

معقب کے معنے روکنے والے کے بھی ہوتے ہیں۔

اے لوگو مشورہ دو۔ جس پر ایک انصاری (سعد بن معاذ) نے کہا۔ کیا حضور کی مراد ہم سے ہے حضور نے فرمایا۔ ہاں اس نے کہا کہ بیشک ہم نے حضور سے معاہدہ کیا تھا۔ کہ اگر باہر جا کر لڑنے کا موقع ہوگا۔ تو ہم حضور کا ساتھ دینے پر مجبور نہ ہونگے۔ لیکن وہ وقت اور تھا۔ جبکہ ہم نے دیکھ لیا کہ آپؐ خدا کے رسول برحق ہیں تو اب اس مشورہ کی کیا ضرورت ہے۔ اگر حضور ہمیں حکم دیں۔ تو ہم اپنے گھوڑے سمندر میں ڈال دینگے۔ ہم اصحاب موسیٰ کی طرح یہ نہ کہیں گے۔ کہ تُو اور تیرا رب جا کر لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ بلکہ ہم حضور کے دائیں بائیں۔ آگے اور پیچھے لڑینگے اور دشمن آپ تک ہرگز نہ پہنچ سکے گا۔ جب تک کہ وہ ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ گزرے +

یہ مخلصین بھی میرے نزدیک ان معقبات میں سے تھے جو خدا تعالیٰ نے حضور کی حفاظت کے لئے مقرر فرما دیئے تھے۔ ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں تیرہ جنگوں میں شریک ہوا ہوں۔ مگر میرے دل میں بارہا یہ خواہش پیدا ہوئی ہے۔ کہ میں بجائے ان لڑائیوں میں حصہ لینے کے اس فقرہ کا کہنے والا ہوتا جو سعد بن معاذ کے مُنہ سے نکلا +

مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ۔ خدا کے حکم کے ماتحت حفاظت کرتے ہیں یعنی قومیت یا ضد کے خیال سے نہیں کرتے۔ اور نہ رشتہ داری یا حکومت کے خوف سے۔ بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے۔ دین کے سوا کوئی چیز ان کو جمع کرنے والی نہیں تھی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر ایک کافر کو یہ امر محسوس بھی ہوا۔ اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہہ بھی دیا۔ کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں پر اعتماد نہ کرنا۔ یہ بن بن کی لکڑیاں تیرے کس کام آئینگی مگر باوجود کسی دنیوی واسطہ کی عدم موجودگی کے وہ لوگ سب سے زیادہ وفادار ثابت ہوئے۔ معقب کے معنے روکنے والے کے بھی ہوتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے آیت کا یہ مطلب ہوا۔ کہ اس کے لئے دشمنوں کے حملہ کو روکنے والے اور اسکی تائید میں بار بار حملہ کرنے والے مقرر ہیں۔ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ ہر انسان کی حفاظت کے لئے بھی خدا نے پہرہ دار مقرر کر

يُنشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۝ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ

بھاری　بادل　اُٹھاتا　ہے　۵۱۳ اور کڑک اسکی تعریف کے ساتھ (ساتھ) اسکی پاکیزگی کا اظہار

رکھے ہیں۔ اس صورت میں لَهٗ کی ضمیر کا مرجع سَوَاۤءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ ہوگا +

اگر انسان غور کرے تو اسے معلوم ہو جائے۔ کہ ہر لحظہ اس کے اندر کس قدر زہر جا رہا ہے۔ ایک دوسرے کے سانس کے زہریلے کیڑے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ مگر اللہ تعالےٰ نے ان تمام زہروں کے لئے ایسا قانون مقرر کر دیا ہے کہ جو جسم میں داخل ہوتے ہی زہر کو تباہ کر دیتا ہے۔ انسان کے لئے ہر آن ہزاروں خطرات ہیں۔ بیماریاں عقل کے صدمات۔ اموال کے نقصان۔ اور عزت کے صدمات وغیرہ طرح طرح کے خطرات ہر وقت پیش آتے رہتے ہیں۔ ان سب سے اللہ تعالیٰ ہی انسان کی حفاظت فرماتا ہے۔ اور جب کسی پر موت یا کوئی اور صدمہ آتا ہوتا ہے تو وہ اپنی حفاظت اُٹھا لیتا ہے +

اس مضمون سے کافروں کو یہ سبق دیا ہے کہ اگر تم شرارتوں میں ہی بڑھتے رہو گے۔ تو یاد رکھو تمہارا آرام سب ہماری ہی حفاظت کے سبب سے ہے۔ اس صورت میں ہم اپنی حفاظت تم سے واپس لے لینگے۔ اور تم تباہ ہو جاؤ گے +

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ خدا تعالیٰ بُروں کے ساتھ نیک سلوک نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ نیکوں کے متعلق اپنے رویہ کو نہیں بدلتا۔ جب تک ان میں تبدیلی واقع نہ ہو جائے۔ اور وہ بُرے نہ بن جائیں۔ یعنی بُرے کے ساتھ تو خدا کا سلوک نیک ہو سکتا ہے۔ مگر نیک کے ساتھ بُرا نہیں ہوا کرتا۔ جب تک وہ بدل نہ جائے۔ یہ اللہ تعالےٰ کی سنت ہے +

جب کسی قوم کی حالت خراب ہو رہی ہو۔ اور اسے ایسے ابتلا پیش آویں۔ جو اسے پراگندہ کر دیں اور تباہ کر دیں۔ جیسا کہ تغیر کا حقیقی منشاء ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قوم کی حالت بدل چکی ہے +

وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۤءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ۔ سُوْۤء کے معنے بدی یا تکلیف کے ہوتے ہیں فرمایا۔ اگر اللہ تعالےٰ تمہیں تکلیف دینے کا فیصلہ کرے۔ تو پھر کوئی اس کو روکنے والا نہ ہوگا۔ وَلِيُّ الْاَمْرِ کے معنے مَلَكَهٗ آتے ہیں۔ تو فرمایا۔ کہ خدا کے مقابلہ میں کوئی ان کا نگران۔ والی و محافظ نہ ہوگا۔ اس میں وحدت ملکیت کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی جب ایک ہی مالک ہے۔ تو اسکی چھوڑی ہوئی چیز کو کون حفاظت میں لے سکتا ہے۔ پس اگر ہم چھوڑ دیں گے تو بے مدد ہی رہ جاؤ گے کیونکہ دوسرا کوئی آقا تمہارا نہیں۔ اس آیت میں صاف طور پر کفار کو بتلا دیا گیا۔ کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو حفاظت کروں گا۔ مگر تم سے حفاظت کو چھین لوں گا +

لَهٗ کی ضمیر کا مرجع سَوَاۤءٌ مِّنْكُمْ ہو سکتا ہے +

مِنْ وَّالٍ کے معنے۔

۵۱۳ حل لغات

يُنْشِئُ۔ اَنْشَاَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور اَنْشَاَهٗ اِنْشَاءً کے معنے ہیں۔ رَبَّاهُ۔ اسکی پرورش کی۔ الشَّيْءَ۔ اَحْدَثَهٗ اور اَنْشَاَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں کسی چیز کو بنایا۔ اَللّٰهُ الشَّيْءَ۔ خَلَقَهٗ اللہ نے کسی کو پیدا کیا۔ اور اَنْشَاَ اللّٰهُ الْخَلْقَ کے معنے ہیں اَنْشَاَ اِبْتَدَاَ۔ خَلْقَهُمْ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنے کی ابتدا کی۔ فُلَانٌ الْحَدِيْثَ۔ وَضَعَهٗ۔ جب حدیث کے لئے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں۔ کوئی بات بنائی۔ اَللّٰهُ السَّحَابَ رَفَعَهَا اور اَنْشَاَ اللّٰهُ السَّحَابَةَ کے معنے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے بادلوں کو بلند کیا۔ فُلَانٌ دَارًا بَدَاَ بِنَاءَهَا مکان کے بنانے کی ابتداء کی۔ زَيْدٌ اَنْشَاَ شِعْرًا اَوْ خَطِيْبٌ بِخُطْبَةٍ۔ فَاَحْسَنَ فِيْهِمَا۔ زید نے اچھی طرح شعر کہے۔ اور لیکچرار نے بلند پایہ تقریر کی (اقرب)۔ پس يُنْشِئُ السَّحَابَ کے معنے ہونگے (۱) بادلوں کو بناتا ہے۔ بادلوں کو اٹھاتا ہے۔

اَنْشَاَ کے معنے

کافروں کو ایک سبق۔

پراگندہ کر دینے والے ابتلا آنا قوم کی حالت کے تغیر پر دال ہے۔

اَلسَّحَابُ۔ اَلْغَيْمُ كَانَ فِيْهِ مَاءٌ اَوْ لَمْ يَكُنْ فِيْهِ اَلسَّحَابُ سَحَابَةٌ کی جمع ہے اور اس کے معنے ہیں۔ بادل خواہ

اَلسَّحَاب

وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ

بھی کرتی ہے اور فرشتے بھی اس کے خوف کے سبب سے (ایسا ہی کرتے ہیں) اور وہ گرنے والی بجلیاں بھیجتا ہے۔

فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ

پھر جن پر چاہتا ہے انہیں نازل کرتا ہے اور وہ اللہ کے بارہ میں جھگڑ رہے ہیں

وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ۞ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۭ وَ

حالانکہ وہ سخت عذاب دینے والا ہے ۱۴ نہ ٹلنے والا بلاوا اسی کا ہے اور

وہ برسنے والا ہو یا نہ ہو اَلْوَاحِدَةُ سَحَابَةٌ۔ یہ اسم جنس ہے۔ مفرد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ السَّحَابُ الْمُسَخَّرُ میں واحد ہے اور السَّحَابَ الثِّقَالَ میں جمع۔ ثِقَالٌ کا لفظ ثَقِيْلٌ (بھاری) کی جمع ہے جو خفیف (ہلکے) کی ضد ہے (اقرب)

تفسیر۔ برق سے لوگوں کے لئے خوف اور طمع دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ خوف اس لئے کہ بجلی گر کر ہلاک نہ کر دے۔ اور طمع اس لئے کہ عام طور پر بجلی زیادہ تبھی چمکتی ہے جب بادل زیادہ برسنے والا ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمارے ملک میں یہی مشہور ہے کہ جو "گرجتے ہیں برستے نہیں" مگر وہ خاص قسم کی گرج ہوتی ہے۔

بجلی کی چمک میں خوف اور فوائد

علاوہ ازیں بجلی کی چمک سے رحم مادر میں بچوں کو اور ایسا ہی بعض پودوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اسکی چمک سے کئی بیماریوں کے کیڑے ہلاک ہو جاتے ہیں وبائیں دُور ہو جاتی ہیں گویا بجلی کی چمک میں خوف بھی ہے۔ اور فوائد بھی۔ یہی حال بھاری بادلوں کا ہوتا ہے کبھی وہ رحمت بن کے دُنیا کی آبادی کا باعث ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی وہی زحمت بن جاتے ہیں۔ اور فصلوں کو برباد اور شہروں کو غرق کر دیتے ہیں۔

قوموں کی ترقی اور تنزل کی ایک لطیف مثال۔

اس مثال سے بتایا ہے کہ ایک ہی چیز بعض کی تباہی کا اور بعض کی ترقی کا موجب بن جاتی ہے۔ بجلی چمکتی ہے۔ بادل آتے ہیں۔ ان سے کئی تباہ ہو جاتے ہیں اور کئی بیشمار فوائد حاصل کرتے ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ اچھے یا بُرے نتائج صرف کسی چیز کے اچھے یا بُرے ہونے سے متعلق نہیں۔ بلکہ اس تعلق سے متعلق ہیں۔ جو اس چیز کو کسی دوسری چیز سے جا کر پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی پوچھے کہ بھاری بادل اچھے ہوتے ہیں یا کہ نہیں۔ تو اس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ تاوقتیکہ موقع و حالات کو نہ دیکھ لیا جائے۔ جب بارش آتی ہے۔ تو جس کی عمارت بن رہی ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر بارش آگئی۔ تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ مگر اسی وقت زمیندار جس کا کھیت خشک سالی کی وجہ سے تباہ ہو رہا ہوتا ہے کہتا ہے کہ اگر بارش نہ ہوئی تو میں برباد ہو جاؤں گا۔ پس فرمایا کہ چند دن کا فائدہ یا ضرر نسبتی امر ہے پس کفار کو ظاہری سامانوں پر گھمنڈ نہ کرنا چاہئے مال۔ رشتہ دار اور حکومتیں ہر اک کے لئے اچھی ہی نہیں ہوتیں۔ یہ اگر ایک کو بچا لیتی ہیں۔ تو دوسرے کو تباہ کر دیتی ہیں۔ اس لئے وہ ان سامانوں کو نہ دیکھیں کہ جو ان کے پاس ہیں۔ بلکہ اپنے دل کی حالت کو دیکھیں۔ اگر دل خراب ہو چکے ہیں۔ تو ظاہری سامان ترقی کا نہیں۔ تنزل کا موجب ہونگے یہ ایک اتنا لطیف اور وسیع مضمون ہے کہ اس کے ذریعہ سے قوموں کے تنزل اور ترقی کے اسباب پر ضخیم مجلدات لکھی جا سکتی ہیں +

يُسَبِّحُ

۱۴ حل لغات

يُسَبِّحُ۔ سَبَّحَ ماضی سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور سَبَّحَ لِلّٰهِ کے معنے ہیں عزّ کہ اللہ کی پاکیزگی کا اظہار کیا۔ اور کبھی سَبَّحَ کے ساتھ ل کا صلہ لا کر بھی اس کو متعدی بنایا جاتا ہے (اقرب) اور يُسَبِّحُ الرَّعْدُ

الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ

جنہیں وہ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ ان (کی دعاء) کا کوئی جواب نہیں دیتے (ہاں)

بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَ

مگر اس (شخص) کی طرح جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا رہا ہو لیکن وہ (یعنی پانی)

کے معنے ہونگے کہ کڑک اللہ کی پاکیزگی کا اظہار کرتی ہے

الرَّعْدُ۔ رَعَدَ کا مصدر ہے۔ اور رَعَدَ السَّحَابُ کے معنے ہیں۔ صَاتَ وَضَجَّ لِلْاِمْطَارِ۔ بادل برسنے کیلئے گرجا الرَّعْد کے معنے ہیں صَوْتُ السَّحَابِ۔ بادل کی آواز۔ کڑک (اقرب)

الصَّوَاعِقُ۔ صَاعِقَةٌ کی جمع ہے۔ اور صاعقہ کے معنی ہیں۔ اَلْمَوْتُ۔ موت۔ كُلُّ عَذَابٍ مُهْلِكٍ۔ ہر مہلک عذاب صَيْحَةُ الْعَذَابِ۔ عذاب کی آواز۔ نَارٌ تَسْقُطُ مِنَ السَّمَاءِ فِيْ رَعْدٍ شَدِيْدٍ لَا تَمُرُّ عَلٰى شَيْءٍ اِلَّا اَحْرَقَتْهُ۔ وہ آگ جو بادل سے کڑک کے ساتھ نازل ہوتی ہے۔ اور جس چیز پر گرے اسے جلا دیتی ہے (اقرب)

اَلْمِحَال۔ مَاحَلَ کا مصدر ہے۔ اور مَاحَلَهٗ کے معنی ہیں۔ مَاكَرَهٗ وَكَايَدَهٗ۔ کسی کی تدبیر کے خلاف تدبیر کی۔ عادلہٗ۔ بالمقابل دشمنی کا اظہار کیا۔ قَاوَاهُ کسی کے بالمقابل قوت وغلبہ کا اظہار کیا۔ اور اَلْمِحَال کے معنی ہیں۔ الکیدُ۔ تدبیر۔ رَوْمُ الْاَمْرِ بِالْحِيَلِ۔ حیلوں کے ذریعوں سے کسی کام کے کرنے کا قصد کرنا۔ التدبیر۔ تدبیر۔ المکر۔ تجویز۔ القدرۃ طاقت۔ اَلْجِدَالُ۔ جھگڑا۔ اَلْعَذَابُ۔ عذاب۔ اَلْعِقَابُ۔ سزا اَلْعَدَاوَةُ دشمنی۔ اَلْقُوَّةُ وَالشِّدَّةُ۔ طاقت ورعب۔ الھلاکُ ہلاک ہونا۔ اَلْاِهْلَاكُ۔ کسی کو ہلاک کرنا (اقرب) بعض نے محال کو حَوْل اور حیلة سے مشتق قرار دیا ہے (مفردات) پس هُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ کے معانی ہونگے۔ کہ اللہ کی تدبیر بڑی سخت ہے۔ اسکی پوشیدہ تدبیریں کارگر ہو کر رہتی ہیں۔ اسکی قدرت بھاری ہے۔ جب وہ بندوں کے حقوق دلواتا ہے۔ تو اس کی سزا سخت ہوتی ہے۔ جب اسکی طرف سے ہلاکت آتی ہے تو سخت ہوتی ہے +

الرعد

تفسیر۔ فرمایا تم مسلمانوں کو مصائب اور آفات کا شکار دیکھ کر خوش ہوتے ہو۔ کہ یہ بجلیاں انہیں تباہ کر دینگی مگر تم اس میں دھوکا کھا رہے ہو۔ نہ بجلی ہر حالت میں اور ہر شے کے لئے ہلاکت کا موجب ہوتی ہے اور نہ بادل ہر حالت میں اور ہر شئے کے لئے فائدہ کا موجب ہوتا ہے مصائب مومن کے لئے تباہی کا موجب نہیں ہوتے۔ بلکہ ترقی کا۔ وہ اس کی چھپی ہوئی طاقتوں کو ابھارنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں وہ اس کے حوصلوں کو بلند کر دیتے ہیں۔ وہ اسے اپنے رب کے اور بھی قریب کر دیتے ہیں۔ آخر کڑک اور بجلی بھی تو خدا تعالٰے کی مخلوق ہے وہ اس کے مخلص بندوں کی تباہی کا موجب کس طرح ہو سکتی ہے۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی جس سے خدا کی ذات پر عیب لگتا ہو۔ وہ بھی خدا تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے۔ اگر وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گر کر ان کو تباہ کر دے (نعوذ باللہ) تو خدا تعالیٰ کی ذات پر اعتراض آتا ہے پس جس کے ساتھ خدا ہو۔ وہ اس کا تو بھلا ہی کرے گی۔ اگر گریگی تو وہ تم پر ہی گریگی۔ فرشتے بھی اس کے خوف سے تسبیح کر رہے ہیں یعنی رعد خود تو کوئی چیز نہیں فرشتے بھی جو پہلو سبب ہیں اور سب اسباب انکے اشارہ پر نتائج ظاہر کرتے ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہیں پس جس کے ساتھ خدا تعالیٰ ہوگا۔ دنیا کے سامان بھی خواہ کسی صورت میں ظاہر ہوں آخر کار اس کے فائدے کے نتائج پیدا کریں گے +

الصواعق

المحال

جس کے ساتھ خدا تعالٰے ہوگا سب سامان اسکے فائدے کے نتائج پیدا کریں گے

وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ

مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۭ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝

اس تک کبھی نہ پہنچے گا اور کافروں کی (چیخ و) پکار ضائع ہی جائیگی ۱۵

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ

اور جو (ذوی الارواح) آسمانوں میں ہیں یا زمین میں ہیں اور ان کے سامنے بھی خوشی ہو کر (کریں) یا

يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ۔ یعنی تم کو غور کرنا چاہیئے کہ یہ چمکنے والی بجلیاں کن پر گر سکتی ہیں۔ خدا جو ان کو گرانے والا ہے۔ کیا ان پر گرائے گا جو اسکی تائید میں کھڑے ہوئے ہیں۔ یا ان پر جو اس کے متعلق جھگڑ رہے ہیں۔ اور اسکے دین کی مخالفت میں کھڑے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ انہی پر گرائیگا جو اس کے مخالف ہیں۔ هُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ۔ کہہ کر اس بات کو صاف طور سے بتا دیا۔ کہ یہ عام قانون قدرت کا ذکر نہیں ہو رہا بلکہ دشمنانِ اسلام اور خدا تعالےٰ کے بارہ میں جھگڑنے والوں کے لئے ایک سخت عذاب کی پیشگوئی ہے شَدِيْدُ الْمِحَالِ کہہ کر اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اللہ سے جھگڑا کرنا آسان نہیں۔ کیونکہ اسکی تدابیر باریک در باریک اور مضبوط ہوا کرتی ہیں۔ اور پھر ان کے نتائج بھی بہت سخت نکلا کرتے ہیں ؞

يَسْتَجِيْبُوْنَ ۲ — ضَلٰل ۲

حل لغات۔ دَعْوَةٌ۔ دَعَا کا مصدر ہے۔ اور دَعَا فُلَانًا دَعْوَةً کے معنے ہیں۔ طَلَبَهٗ لِيَاْكُلَ عِنْدَهٗ۔ کہ اسے کھانے پر بلایا پس دعوۃ کے معنے ہونگے "بلاوا" (اقرب)

دَعْوَة ۱

اَلْحَقُّ۔ حَقَّ کا مصدر ہے۔ اور حَقَّهٗ حَقًّا کے معنے ہیں غَلَبَهٗ عَلَى الْحَقِّ۔ حق کی وجہ اس پر غالب آیا۔ وَالْاَمْرَ اَثْبَتَهٗ وَاَوْجَبَهٗ۔ کسی امر کو ثابت کیا۔ اور واجب کیا۔ كَانَ عَلٰى يَقِيْنٍ مِنْهُ۔ کسی معاملہ پر یقین سے قائم تھا۔ الْخَبَرَ وَقَفَ عَلٰى حَقِيْقَتِهٖ۔ اور حَقَّ الْخَبَرَ کے معنے ہونگے۔ اسکی حقیقت سے آگاہ ہوا۔ اور الْحَقُّ کے معنے ہیں۔ ضِدُّ الْبَاطِلِ سچ۔ اَلْاَمْرُ الْمَقْضِيُّ فیصلہ شدہ بات۔ اَلْعَدْلُ۔ عدل۔ اَلْمِلْكُ ملکیت اَلْمَوْجُوْدُ الثَّابِتُ۔ موجود و قائم

الحق ۱

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ کے چار معنے ۲

اَلْيَقِيْنُ بعد الشَّكِّ۔ یقین۔ الموتُ۔ موت۔ اَلْحَزْمُ دانائی۔ (اقرب) پس لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ کے معنے ہوں گے (۱) سچائی کی تائید میں اُٹھنے والی آواز صرف خدا ہی کی ہوتی ہے۔ (۲) خدا تعالیٰ ہی کی آواز ضرور غالب ہو کر رہتی ہے (۳) جو پکارنا فائدہ مند ہو سکتا ہے وہ اللہ تعالےٰ ہی کے حضور پکارنا ہے (۴) وہی پکارے جانے کا مستحق ہے (۵) تقدیر کا ٹلانا اسی کا کام ہے ؞

يَسْتَجِيْبُوْنَ۔ اِسْتَجَابَ سے ہے اور اِسْتَجَابَ کے معنے ہیں۔ رَدَّ لَهُ الْجَوَابَ۔ اس کو جواب دیا۔ اور لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ کے معنے ہوئے۔ وہ جواب نہیں دیتے (اقرب) ضَلٰل ضَلَّ کا مصدر ہے اور ضَلَّ عَنِّيْ كَذَا کے معنے ہیں ضَاعَ۔ ضائع ہو گیا۔ فُلَانٌ الْفَرَسَ وَالْبَعِيْرَ ذَهَبَ عَنْهُ۔ اونٹ اور گھوڑا اس سے ضائع ہو گئے۔ اور ضلال کے معنے ہوئے۔ ضَيَاعٌ ضائع ہونا (اقرب) اور مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ کے معنے ہوئے کہ کافروں کی چیخ و پکار ضائع ہی جائے گی۔

تفسیر۔ جیسا کہ حل لغات میں لکھا گیا ہے۔ اس آیت کے کئی معنی ہیں (۱) سچائی کی تائید میں اُٹھنے والی آواز صرف خدا ہی کی ہوتی ہے۔ یعنی عمدہ تعلیم جو سراسر حق ہو۔ جو غلطی سے پاک ہو۔ وہ صرف خدا تعالےٰ ہی کی طرف سے آسکتی ہے انسان کی بنائی ہوئی تعلیم میں غلطیاں اور جھوٹ ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ مت سمجھو کہ تمہاری تعلیمات اس کے مقابلہ میں ٹھہر سکینگی اس پاک تعلیم کا مقابلہ جب تمہاری غلطیوں سے پُر تعلیم کے ساتھ ہوگا تو دُنیا کو خود بخود اسکی برتری کا یقین ہو جائے گا ؞

(۲) خدا تعالیٰ ہی کی آواز ہے۔ جو ضرور غالب ہو کر رہتی ہے

دُنیا کے بادشاہوں کی آوازیں بھی دب جایا کرتی ہیں بادشاہ ایک مجرم کی سزا کا اعلان کرتا ہے۔ مگر وہ ملک سے بھاگ جاتا ہے یا کسی کی ذلّت کا سامان کرتا ہے مگر خود مر جاتا ہے مگر ایک اللہ کی آواز ہے جو پوری ہو کر رہتی ہے۔ اور کوئی اس میں روک نہیں ڈال سکتا۔

(۳) پکارنے کا فاعل بندہ کو قرار دیا جائے تو یہ معنے ہونے ہیں کہ جو پکارنا حق کا موجب ہو سکتا ہے۔ یعنی فائدہ اور کامیابی والا ہو سکتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو ہی پکارنا ہے۔ یعنی اسی سے عجز کے ساتھ دُعائیں مانگنا ہی کامیابی کی کلید ہے ✦

(۴) وہی مستحق ہے سب عبادات کا جو اس کے سوا دوسرے کو پکارتا ہے وہ کسی کا حق کسی کو دیتا ہے۔ اور اس طرح ظالم اور ناشکر گزار بنتا ہے ✦

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۹

بِشَيْءٍ سے بتلایا کہ جھوٹے معبودوں کی طرف سے انہیں قدر بھر بھی نفع نہیں پہنچتا۔ اگر کوئی دُعا پوری ہو جاتی ہے تو وہ اتفاق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ان معبودان باطلہ کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا ✦

اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ۔ یعنی ان کی پکار اپنے دونوں ہاتھ پھیلانے والے کی طرح ہوتی ہے ✦

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جس طرح اعلیٰ چیز کو ادنیٰ مقام دینے والا انسان فوائد سے محروم رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ادنیٰ کو اعلیٰ مقام دینے والا بھی اس کے فوائد سے محروم رہ جاتا ہے کھرے سکّہ کو کھوٹا سمجھنے والا بھوکا مرے گا۔ کیونکہ سکّے کو استعمال نہ کرے گا۔ مگر کھوٹے کو کھرا سمجھنے والا بھی وقت پر تکلیف اٹھائیگا کیونکہ وہ اس کے کام نہ آئے گا۔ جو خدا تعالیٰ کی صفات سے آگاہ نہیں۔ وہ اس کی رحمتوں سے محروم رہے گا۔ لیکن جو مخلوقات کو خدا بنائے گا۔ وہ بھی ان مخلوقات کے فائدہ سے محروم رہے گا مثلاً پانی انسان کے فائدہ کی ایک چیز ہے اور انسان کے کام آنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ اگر کوئی پانی کو انسان کا ہی مقام دیدے اور جس طرح آدمی آدمی کو بُلاتا ہے۔ ہاتھ پھیلا کر اسے بُلانا شروع کر دے۔ تو پانی اس کے پاس نہ آئے گا اور وہ پانی کے فوائد سے محروم رہ جائے گا۔ اسی طرح جو لوگ مخلوقات کو خدا بناتے ہیں۔ وہ ان فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ جو ان مخلوقات میں مخفی ہیں۔ ستاروں اور دریاؤں کو خدا بنانے والے کب ان پر حکومت کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ اور انسانوں کو خدا بنانے والے کب ان سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ ایک نبی کو خدا بنانے والا نبی والا فائدہ اٹھاتا نہیں۔ اور خدا والا فائدہ نبی پہنچا نہیں سکتا۔ پس اس کے اصل فائدہ سے یہ شخص محروم رہ جاتا ہے

حق ہی کی آواز پوری ہو کر رہتی ہے

ہندوستان کے ترقی کے میدان میں سب سے پیچھے رہ جانے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے پانی اور آگ کو خدا بنا لیا۔ اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئے۔ جو ترقیات کے عمدہ ذریعے تھے۔ مگر یورپین لوگوں نے ان سے کام لیا اور ترقی کر کے آگے نکل گئے۔ ہندوؤں کی تو یہاں تک حالت ہے کہ جب دریائے گنگا سے انگریز نہر نکالنے لگے۔ تو انہوں نے شور مچا دیا۔ کہ ہمارے خدا کو کاٹنے لگے۔ مسلمان بھی اپنے تنزل کے وقت بزرگوں کو خدائی صفات دے کر ان سے دعائیں مانگنے لگے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ عمدہ نمونہ کے طور پر کام آنا جو ان بزرگوں کا اصل فائدہ تھا۔ اس سے محروم ہو گئے۔ اور دُعائیں سُننے کی ان وفات یافتہ بزرگوں میں طاقت ہی نہ تھی پس انہیں اعلیٰ مقام دے کر ان کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ آپ فوائد سے محروم رہ گئے۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ شرک انسانی ترقی میں ایک زبردست روک ہے۔ اور شرک کی وجہ سے انسان مخلوقات سے وہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا جو خدا تعالیٰ نے ان میں پوشیدہ رکھا ہے۔ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ۔ ان کی دُعا ضائع اس طرح ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنے موقع پر نہیں پہنچتی۔ دُعا تو وہ ہے جو خدا تعالیٰ کے پاس جائے۔ اگر خط یا پیغامبر کسی دوسری جگہ چلا جائے۔ تو اس کا جانا نہ جانا برابر ہوتا ہے۔ اسی

ہندوستان کے ترقی کے میدان میں پیچھے رہ جانے کی بڑی وجہ

ادنیٰ چیز کو اعلیٰ مقام دینے والا بھی اعلیٰ کو ادنیٰ دینے والا فائدہ سے محروم رہ جاتا ہے

الضلال کے معنے

كَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ قُلْ مَنْ

ناخوش ہوکر (ہر) صبح اور شام سجدہ اللہ ہی کو کرتے ہیں ؁ تو (ان سے) کہہ (کہ بتاؤ)

تفعل کے معانی کا استعمال قرآن کریم اور لغت میں: طرح فرمایا۔ کہ کافروں کی دُعا بے نتیجہ جاتی ہے۔ دُعا کی قبولیت کا اصل مقام تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ لوگ اپنی دُعاوں پر اللہ تعالیٰ کا پتہ لکھتے تو انکی دُعائیں خدا تک ضرور پہنچتیں۔ اور ان کو جواب آجاتا۔ مگر ان لوگوں نے تو مخلوقات کا پتہ لکھنا شروع کر دیا۔ جو دُعا کو قبول کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس لئے انکی دُعا ضائع ہوجاتی ہے۔ اور تدبیریں ناکام رہتی ہیں +

تقدیر کا ٹونا خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے: لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ میں یہ بھی بتایا ہے کہ تقدیر کا ٹلانا خدا کے قبضہ میں ہے پس جو اس سے تعلق نہیں رکھتا۔ تقدیر اسکی مؤید نہیں ہوتی۔ اور وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ میں فرمایا کہ انکی تدبیریں بھی ناقص غلط اور بے محل ہیں۔ گویا نہ تقدیر ان کے ساتھ رہی اور نہ تدبیر۔ تو اب ان کی کامیابی کی اور کونسی صورت باقی رہ گئی +

یسجد: ؁ حل لغات۔ يَسْجُدُ۔ سَجَدَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور فُلَانٌ سَاجِدُ الْمَنْخِرِ کے معنے ہیں ذَلِيْلٌ خَاضِعٌ۔ کہ وہ عاجز و ذلیل ہے۔ اَلْبَعِيْرُ خَفَضَ رَاْسَهٗ۔ اور سَجَدَ الْبَعِيْرُ کے معنے ہیں۔ اونٹ نے اپنا سر نیچے گرایا۔ السَّفِيْنَةُ لِلرِّيَاحِ۔ طَاعَتْهَا۔ وَمَالَتْ بِمَيْلِهَا کشتی کو جدھر ہوا نے چلایا۔ وہ چل پڑی (اقرب) لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے معنے ہونگے۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر رہی ہے اور اس کے آگے عاجزی کرتی ہے +

ظللهم: ظِلٰلُهُمْ۔ ظِلَالٌ۔ ظِلٌّ کی جمع ہے۔ اقرب الموارد میں ہے اَلظِّلُّ نَقِيْضُ الضَّحِّ وَهُوَ الْفَيْءُ۔ دھوپ کے مقابل کی چیز یعنی سایہ۔ جہاں سورج کی روشنی براہ راست نہ پہنچتی ہو۔ روشنی کا نور اثر ڈال رہا ہو۔ اَوْ هُوَ بِالْغَدَاةِ۔ وَالْفَيْءُ بِالْعَشِيِّ۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ ظل صبح کے سایہ کو کہتے ہیں۔ جو دوپہر تک رہتا ہے۔ اور فَے دوپہر کے بعد سے لے کر شام تک کے سایہ کو کہتے ہیں لیکن یہ قرآن کریم کے محاورہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس جگہ آیا ہے کہ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ۔ یعنی صبح اور شام دونوں کے سایوں کو ظلال کہا ہے) وقال رُؤْبَةُ كُلُّ مَوْضِعٍ تَكُوْنُ فِيْهِ الشَّمْسُ فَتَزُوْلُ عَنْهُ فَهُوَ ظِلٌّ۔ اور روبہ کے نزدیک ظل کے یہ معنی ہیں کہ ہر وہ جگہ جہاں سورج ہو۔ اور پھر وہاں سے ہٹ جائے۔ يُقَالُ ظِلُّ الْجَنَّةِ وَلَا يُقَالُ فَيْؤُهَا ظل الجنۃ تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے متعلق فَے کا لفظ نہیں استعمال کیا جا سکتا۔ انما هی دائمًا ظلٌّ۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ظل ہی رہتا ہے۔ نیز ظل کے معنے ہیں۔ مايُرىٰ من الجنِّ وغيره۔ بھوت وغیرہ۔ العزُّ۔ عزت۔ المنعة۔ غلبہ اَلرَّفَاهَةُ۔ خوشحالی۔ اَللَّيْلُ اَوْ جُنْحُهُ اَوْ سَوَادُهٗ۔ رات یا رات کا حصہ یا اسکی سیاہی مِنْ كُلِّ شَيْءٍ شَخْصُهٗ اَوْ كِنُّهٗ۔ ہر حیوان کا جسم۔ یا ہر چیز کا وہ حصہ جو اس کے مغز کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو بیرونی اثرات سے حفاظت میں رکھتا ہے مِنَ الشَّبَابِ اَوَّلُهٗ جوانی کا ابتدا۔ وَفِی الْاَسَاسِ وَكَانَ ذٰلِكَ فِي ظِلِّ الشِّتَاءِ اَيْ فِي اَوَّلِ مَا جَاءَ۔ اور اساس میں ظل کے لفظ کے ماتحت لکھا ہے کہ ظل الشتاء کے معنے ہیں موسم سرما کا ابتدا۔ وَمِنَ الْقَيْظِ شِدَّتُهٗ۔ گرمی کے لئے آئے تو اس کے معنی ہیں۔ اسکی شدت تقول سِرْتُ فِي ظِلِّ الْقَيْظِ۔ اَيْ فِي شِدَّتِهٖ۔ یعنی سِرْتُ فِي ظِلِّ الْقَيْظِ کے معنے ہونگے میں تیز گرمی میں چلا۔ ومن السَّحَابِ مَا وَارَى الشَّمْسَ مِنْهُ اَوْ سَوَادُهٗ۔ بادل کا وہ حصہ جو سورج کو ڈھانپ لیتا ہے یا اس کا سایہ۔ من النَّهَارِ لَوْنُهٗ اِذَا غَلَبَتْهُ الشَّمْسُ۔ چمکتی ہوئی دھوپ (اقرب) هُوَ فِي ظِلِّهٖ۔ اَيْ كَنَفِهٖ۔ اور هو فی ظله کے معنے ہیں۔ وہ اسکی حفاظت میں ہے۔ اس کے علاوہ ظِلَالٌ۔ ظُلَّةٌ کی بھی جمع ہے

؁ الفاظ جمع ہیں۔ مگر اردو میں مفرد کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔

جس کے معنی ہیں اَلْغَاشِیَۃُ۔ ڈھانپنے والی چیز۔ سائبان وَالبُرْطُلَّۃ ای المظلّۃ الضیقۃ۔ چھوٹا سائبان۔ چھتری۔ وفی التعریفات اَلظُّلَّۃُ ھی التی اَحَدُ طرفی جذعِھا علٰی حَائطِ ھذہِ الدارِ وطرفھا الاخر علٰی حَائطِ الجارِ المقابل اور تعریفات میں ہے کہ ظُلَّۃ اس چھپر کو کہتے ہیں۔ کہ جس کو راستہ پر سایہ کے لئے ڈالا جاتا ہے۔ اور اس کا ایک کنارہ ایک گھر کی ایک دیوار پر ہو۔ اور دوسرا کنارہ سامنے کی دیوار پر ہو۔ اَوَّلُ سَحَابَۃٍ تُظِلُّ۔ موسم کا سب سے پہلا سایہ کرنے والا بادل۔ ما اَظَلَّکَ من شجرٍ جو درخت سایہ دے۔ شَیْءٌ کَالصُّفَّۃِ یُسْتَتَرُ بِہٖ مِنَ الحَرِّ والبَرْدِ۔ ایسا چھپر جو سردی اور گرمی سے بچاؤ کے لئے بنایا گیا ہو (اقرب) اور مجمع البحار میں ہے الظِّلُّ۔ الفیءُ الحاصلُ مِنَ الحاجزِ بَیْنَکَ وبینَ الشمسِ مطلقاً سورج اور انسان کے درمیان کسی روک کے آنے کی وجہ سے جو سایہ ہوتا ہے۔ ظل کہلاتا ہے۔ وَمِنْہُ سَبْعَۃٌ فِی ظِلِّ العَرْشِ ای فِی ظِلِّ رَحْمَتِہٖ۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن سات شخص عرش کے سایہ تلے ہونگے یعنی اسکی رحمت کے سایہ میں ہونگے۔ وجاءَ سَبْعَۃٌ فِی ظِلِّہٖ ای فی ظلّ اللّٰہِ اور بعض حدیثوں میں سبعۃٌ فی ظلّہٖ آیا ہے۔ کہ وہ اللہ کے سایہ میں ہونگے۔ کہتے ہیں۔ ھو فی عَیْشٍ ظَلِیْلٍ والمرادُ ظلّ الکرامۃِ وہ خوب مزے کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وقد یکنّٰی من الکَنَفِ۔ اور کبھی اس سے مراد حفاظت بھی لی جاتی ہے۔ وفی الحَدِیْثِ الکافِرُ یَسْجُدُ لِغَیْرِ اللّٰہِ وظلّہٗ یَسْجُدُ لِلّٰہِ ای جسمہٗ۔ یعنی حدیث میں ہے کہ کافر غیر اللہ کے لئے سجدہ کرتا ہے۔ اور اس کا سایہ یعنی جسم خداتعالیٰ کے لئے۔ (مجمع البحار) اور مفردات راغب میں ہے اَلظِّلُّ ضِدُّ الضَّحِّ۔ ظل دُھوپ کے مقابل کی چیز کو کہتے ہیں وَھُوَ اَعَمُّ مِنَ الفَیْءِ۔ اور یہ فیء سے عام ہے۔ فَاِنَّہٗ یُقَالُ ظِلُّ اللَّیْلِ وَظِلُّ الجَنَّۃِ۔ کیونکہ ظل کا لفظ رات اور باغ کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں ظِلُّ اللَّیْلِ اور ظِلُّ الجَنَّۃِ۔ باغ کا سایہ۔ وَیُقَالُ لِکُلِّ مَوْضِعٍ لم تَصِلْ

الیہ الشمسُ ظِلٌّ۔ اور وہ جگہ جہاں دُھوپ نہ پہنچے اسے ظل کے نام سے پکارتے ہیں۔ وَلَا یُقَالُ الفَیْءُ اِلَّا لِمَا زَالَ عنہ الشمسُ۔ اور فیء صرف اسی کو کہتے ہیں جہاں سے دھوپ زائل ہو چکی ہو۔ وَیُعَبَّرُ بِالظِّلِّ عَنِ العِزَّۃِ وَالمَنَعَۃِ وَعَنِ الرَّفَاھَۃِ۔ اور ظل سے مراد عزت۔ غلبہ اور عیش و آرام لیا جاتا ہے۔ قال اِنَّ المُتَّقِیْنَ فِی ظِلٰلٍ ای فِی عِزَّۃٍ و مَنَاعٍ۔ اور اِنَّ المُتَّقِینَ فی ظِلٰلٍ کے معنے ہیں متقی عزت اور غلبہ و حفاظت میں رہیں گے۔ اَظَلَّنِی فُلَانٌ حَرَسَنِی وَجَعَلَنِی فِی ظِلِّہٖ وَعِزِّہٖ وَمَنَاعَتِہٖ۔ اور اظلّنی فلانٌ کے معنے ہیں۔ اس نے مجھے اپنے بچاؤ میں لے لیا۔ وَقَدْ یُقَالُ ظِلٌّ لِکُلِّ سَاتِرٍ۔ ہر ڈھانپنے والی چیز کو ظل کہتے ہیں مَحْمُوْدًا کَانَ اَوْ مَذْمُوْمًا۔ وہ چیز اچھی ہو۔ یا بُری جیسے آیت وَلَا الظِّلُّ وَالحَرُوْرُ میں اچھی چیز کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور آیت ظِلٌّ مِنْ یَحْمُوْمٍ میں مذموم کے لئے (مفردات) جیسا کہ حل لغات سے ظاہر ہے ظِلَال ظِلٌّ اور ظُلَّۃ کی جمع ہے۔ اور ظل کے ایک معنے سایہ کے ہیں۔ وہ یہاں مراد نہیں۔ پس اگر یَسْجُدُ ظِلٰلُھُمْ میں ظلال ظل کی جمع سمجھا جائے تو معنی ہونگے تمام اشیاء کے وجود قانونِ الٰہی کے ماتحت ہیں۔ اور اگر ظُلَّۃ کی جمع سمجھا جائے۔ تو معنے ہونگے کہ سردار حکمران جو ان کو آرام پہنچانے والے ہیں اور بطور سایہ کرنے والے کے ہیں وہ بھی خداتعالےٰ کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔ اَلْغَدَاۃُ اَلْبُکْرَۃُ صبح۔ اَوْ مَا بَیْنَ صَلٰوۃِ الفَجْرِ وَطُلُوْعِ الشَّمْسِ۔ صبح کی نماز سے لیکر سورج کے طلوع ہونے تک کا وقت۔ اسکی جمع غُدُوٌّ ہے (اقرب)

[illegible]

تفسیر۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قانون کی پابندی کر رہی ہے خوشی سے یا ناپسندیدگی سے مومن۔ کافر مشرک۔ اور دہریہ تک سب قانون قدرت کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔ زبان چکھنے پر مجبور ہے۔ اور کان سُننے پر۔ یعنی جو آواز کان میں پڑے گی۔ وہ اس کو سُنے گا۔ جو چیز زبان پر رکھی جائے گی۔ وہ اس کو چکھے گی۔ اس حد تک اطاعت کرھاً ہے۔ مگر پھر اس میں ایک حصہ طوعًا کا

ہر چیز اللہ تعالےٰ کے قانون کی پابند کر رہی ہے۔

بھی شامل ہو جاتا ہے مثلاً بھوک پر کھانا کھانا۔ بظاہر یہ
اپنی مرضی سے کھاتا ہے۔ ایسا ہی عمدہ نظارے دیکھنا یا
سیر کرنا۔ مگر در اصل یہ بھی خدا کے قانون کو ہی پورا
کرتا ہے۔ گویا قانون قدرت میں بھی ایک حصہ کی اطاعت
طَوْعًا ہے۔ اور دوسرے حصہ کی کَرْهًا۔ مقصد یہ کہ گو
بظاہر انسان آزاد نظر آتا ہے لیکن غور سے دیکھنے پر اس
کے ہر فعل میں ایک جبر بھی نظر آتا ہے۔ جو کسی بالا ہستی
کے دخل پر دلالت کرتا ہے ۔

دوسرے اس آیت میں تصرفات الٰہیہ کا طریق بتلایا ہے
کہ بعض تصرفات اللہ تعالیٰ رسول کریم صلعم کی مدد کے لئے
ایسے کرے گا کہ کفار اس میں اپنے آپ کو مجبور سمجھیں گے
اور دل میں کڑھیں گے۔ اور بعض تصرفات ایسے کرے گا کہ
کفار خیال کریں گے۔ کہ ہم ان کاموں میں اپنا فائدہ کر رہے
ہیں۔ حالانکہ ان کا جو نتیجہ پیدا ہوگا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے حق میں پیدا ہوگا۔ طوعًا کی مثال صلح حدیبیہ ہے کہ اس کی
شرائط کفار نے زور سے منوائیں۔ اور یہ سمجھ کر منوائیں کہ ان
میں ہمارا فائدہ ہے۔ مگر در اصل ان میں تھا مسلمانوں کا فائدہ
جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ
سے اخراج کہ پہلے انہوں نے سمجھا۔ اس طرح ہم نے مسلمانوں
کو اپنے مرکز سے نکال دیا لیکن اس سے اسلام کی آزادی
اور ترقی کی بنیاد رکھی گئی۔ کرھًا کی مثال فتح مکہ ہے۔ کہ مجبوراً
آنحضرت صلعم کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ دوسری مثال اسکی
ایسے صحابہ سے حسن سلوک تھا جن کے خاندانوں اور قبائل
سے وہ ڈرتے تھے ۔

طوعًا و کرھًا کا مطلب

پھر طوعًا و کرھًا کا فرق نیک و بد جماعت کے لحاظ سے
بھی ہو سکتا ہے یعنی مومن خدا کی اطاعت طوعًا کرتے ہیں
اور کافر کرھًا ۔

ظلّ کے مختلف معانی

وَظِلٰلُهُمْ۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ظِلَال۔ ظِلّ کی بھی
جمع ہے اور ظُلَّةٌ کی بھی۔ ظلّ کے ایک معنے سایہ کے ہیں۔
سایہ چونکہ عدم نور کے معنی رکھتا ہے۔ اس جگہ وہ مراد نہیں ہو
سکتا۔ کیونکہ غیر موجود چیز کے لئے سجدہ کا لفظ نہیں آسکتا۔
ظلّ کے دوسرے معنے کسی چیز کے وجود اور شخص کے بھی
ہوتے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے آیت کے یہ معنے ہونگے

(۱) تمام اشیاء کے وجود قانون الٰہی کے ماتحت ہیں

کہ دلی اور قلبی سجدہ کے علاوہ تمام اشیاء کے وجود قانونِ الٰہی
کے ماتحت ہیں حتیٰ کہ کافر کا جسم بھی خدا تعالیٰ کے قانون کے
ماتحت ہوتا ہے اور اس طرح گو اس کا ذہن اور ایمان
خدا تعالیٰ کا منکر ہوتا ہے مگر اس کا جسم خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری
میں لگا ہوا ہوتا ہے۔ مجازاً ظلّ توابع کے لئے بھی استعمال ہوتا
ہے جیسے کہتے ہیں سلطانٌ ظِلُّ اللّٰهِ بادشاہ اللہ کا سایہ
ہے یعنے اس کے ماتحت۔ پس اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے

(۲) تمام ذی روح اور ان کے تابع وجود اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔

ہیں کہ تمام ذی رُوح اور ان کے تابع وجود اللہ تعالیٰ کی
فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔ ظُلَّةٌ جو اس لفظ کا دوسرا
مفرد ہے اس کے معنی سایہ کرنے والے کے ہیں جیسے سائبان
وغیرہ۔ یا مجازاً سردار اور حکمران۔ اور معنے یہ ہونگے کہ ان کے
بڑے یا ان کو آرام پہنچانے والے وجود بھی اللہ تعالیٰ کی
فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔ بہترین معنے یہ ہیں کہ دونو
معنے اس جگہ مراد ہیں۔ ظلّ والے بھی اور ظُلَّةٌ والے بھی۔ اور

(۳) تمام موجودات اور انکے تابع اور حکمران اللہ کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔

معنے یہ ہیں کہ تمام موجودات اور ان کے تابع اور انکے حکمران
سب کے سب اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں
پس ان لوگوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیئے کہ اگر محمد رسول اللہ صلعم
کی مخالفت انہوں نے ترک نہ کی تو جو ان سے اوپر کے وجود
اور طاقتیں ہیں وہ بھی انکی مخالف ہو جائیں گی۔ اور جو ان کے تابع
ہیں وہ بھی ان کے مخالف ہو جائینگے۔ ان معنوں کی تصدیق اسی
سورۃ کی ایک دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے فرماتا ہے اَوَلَمْ
یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (رعد ع ۶)
یعنے کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم انکی حکومت کو دونوں طرف سے
کم کرتے چلے آتے ہیں۔ یعنے بڑے خاندانوں میں سے بھی اور
مزدور لوگوں میں سے بھی۔ اور روز بروز کچھ لوگ نکل کر محمد رسول اللہ صلعم
کے ساتھ ملتے جاتے ہیں۔ آخر اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ یہ آئمۃ الکفر
اکیلے رہ جائینگے اور سب کا سب ملک محمد رسول اللہ صلعم کے ساتھ ہو جائیگا۔

رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ

آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے (اس کا جواب وہ تو کیا دیں گے) تو (خود ہی) کہدے (کہ) اللہ (اور پھر) تو (ان سے)

مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا

کہہ (کہ) کیا پھر (بھی) تم نے اس کے سوا اور (اور لیئے) مددگار بنا رکھے ہیں۔ جو (خود) اپنے لئے (بھی) کسی نفع (کو حاصل کرنے)

ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ

کی قدرت نہیں رکھتے اور نہ کسی نقصان (کو روکنے) کی (اور ان سے) کہہ (کہ) کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر (ہوسکتا) ہے یا

هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ

کیا تاریکی[^] اور روشنی برابر (ہوسکتی) ہے یا کیا انہوں نے اللہ کے ایسے شریک تجویز کئے

شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ

ہیں۔ جنہوں نے اسکی مخلوق کی طرح (کچھ) پیدا کیا ہے کہ (جسکی وجہ سے اسکی اور دوسروں کی) مخلوق انکے لئے مشتبہ ہوگئی ہے؟

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝

تو (ان سے) کہہ (کہ) اللہ (ہی) ہر ایک چیز کا خالق ہے۔ اور وہ کامل (طور پر) یکتا (اور ہر ایک چیز پر) کامل اقتدار رکھنے والا ہے ۱۷؎

بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ۔ یہ اس لئے فرمایا۔ کہ ایک تو ان وقتوں میں سایہ لمبا ہوتا ہے۔ اور دوسرے سایہ کا کامل ظہور سورج کے ادھر ادھر ہونے سے ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح تابع کی طاقت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے۔ جب آقا پاس نہیں ہوتا۔ اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جبکہ حکومت وسیع پھیلی ہوئی ہو پس بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ کہہ کر بتایا۔ کہ خواہ تمہاری حکومت کتنی بھی وسیع کیوں نہ ہو۔ تب بھی خدا تعالےٰ کے ماتحت ہو۔ اور ایسا ہی یہ بتایا کہ خواہ تم خود محمد رسول اللہ کے مقابلہ پر آؤ۔ یا جب تم اپنے نوکروں یا غلاموں کو بھیجو۔ دونوں صورتوں میں ہم تمہاری تدبیروں کو توڑ ڈالینگے۔ یعنی نہ تم کچھ کرسکتے ہو۔ اور نہ تمہارے سامان و تدابیر +

لطیفہ | اس جگہ ظل کا ذکر کیا ہے۔ اور جیسا کہ معنے لغت کی رو سے ذکر کیا ہے۔ ظل کے لئے اصل کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر سورج نہ ہو۔ تو کوئی ظل ہی نہیں۔ پس یہ کہنا۔ کہ ظلی نبوت خاتم النبیین کی نبوت کو توڑ دیتی ہے بالکل غلط ہے۔ ظلی نبوت تو اصل کے وجود کو ثابت اور روشن کرتی ہے نہ کہ منسوخ۔ وہ اس کے لئے ایک زبردست شہادت ہے۔ نہ کہ اس کے منافی +

ظلی نبوت خاتم النبیین کی نبوت کو توڑ نہیں دیتی

۱۷؎ حل لغات۔

رَبّ۔ اَوْلِيَاء

رب کی تشریح کے لئے دیکھو یونس ۱۷؎ اَوْلِيَآءَ۔ وَلِیٌّ کی جمع ہے۔ اور اَلْوَلِیُّ کے معنے ہیں اَلْمُحِبُّ الصَّدِيْقُ۔ دوست۔ اَلنَّصِيْرُ۔ مددگار۔ (اقرب) يَمْلِكُوْنَ مَلَكَ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور مَلَكَ کے معنے ہیں۔ اِحْتَوَاهُ قَادِرًا۔ کسی چیز پر قادرانہ طور پر قبضہ کیا۔ مَلَكَ عَلَى الْقَوْمِ۔ اِسْتَوْلٰى عَلَيْهِمْ۔ کسی قوم پر غالب ہوا۔ عَلٰی

[^]: ظلمات کا لفظ جمع ہے لیکن اردو میں ترجمہ مفرد کیا گیا ہے۔

فُلَانٍ اَمْرَهٗ کسی کے کام کا متولی ہوا۔ اَلْخَشْفُ اُمَّہٗ قَوِیَ وَقَدَرَ اَنْ یَتْبَعَھَا۔ ہرن کا بچہ توانا و مضبوط ہو کر اس قابل ہو گیا۔ کہ وہ اپنی ماں کے پیچھے چل سکے (اقرب) پس لَا یَمْلِکُوْنَ کے معنے ہوں گے وہ قادر نہیں ہو سکتے۔ وہ طاقت نہیں رکھتے۔ اَلْوَاحِدُ بِمَعْنَی الْاَحَدِ اَیِ الْمُنْفَرِدُ الَّذِیْ لَا نَظِیْرَ لَہٗ اَوْ لَیْسَ مَعَہٗ غَیْرُہٗ۔ ایسا یکتا کہ جس کا کوئی نظیر نہ ہو۔ یا اس کا کوئی شریک نہ ہو۔ اور انہی معنوں میں یہ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوا ہے (اقرب)

قَہَّار قَہَرَہٗ۔ قَھْرًا۔ غَلَبَہٗ۔ قَہَرَہٗ کے معنے ہیں کسی پر غالب آیا۔ (اقرب) اور اَلْقَہَّارُ مبالغہ کا صیغہ ہے اس کے معنے ہوں گے۔ بہت غالب ۔

تفسیر ۔ یہ عجب خدا کی قدرت ہے۔ کہ جتنے لوگوں کو دنیا نے خدا بنایا۔ ان کی زندگی دکھ اور تکلیف میں ہی گزری ہے حضرت مسیح کو ملک چھوڑنا پڑا۔ اور مختلف تکالیف کا سامنا ہوا۔ حضرت حسینؓ تو شہید ہی کر دیئے گئے۔ رامچندر جی بھی مصائب میں مبتلا رہے۔ لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِہِمْ میں بتایا ہے کہ جب وہ اپنی جانوں کی بھی حفاظت نہ کر سکے۔ تو تم کو کیا نفع پہنچا سکتے ہیں۔

(حاشیہ: جسے لوگوں کو دنیا نے خدا بنایا اُن کی زندگی دکھوں میں گزری۔)

هَلْ يَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں یعنی تم لوگوں کو اپنی کثرت پر ناز ہے۔ مگر یہ تو سوچو کہ کیا ہمیشہ کثرت مفید ہوا کرتی ہے۔ بہت سے اندھوں کا اجتماع قوت کا موجب ہوتا ہے یا ضعف کا۔ ایک آنکھوں والا ہزاروں اندھوں پر غالب ہوتا ہے۔ ایسا ہی اس نبی اور اس کے متبعین کو خدا سے علم ملتا ہے۔ اور تمہارے منصوبوں اور تدبیروں سے خدائی وحی اسے آگاہ کر دیتی ہے۔ پس اس کی مثال بینا کی ہے۔ مگر تمہیں کچھ پتہ نہیں کہ اس کی طرف سے کیا کیا تدابیر کی جا رہی ہیں۔ کیونکہ اس کی تائید میں اکثر کوششیں خدا تعالیٰ کی طرف سے قانونِ قدرت کے مخفی اثرات کے ذریعہ سے ہو رہی ہیں۔ جن سے تم بالکل ناواقف ہو۔ پھر سوچو تو سہی کہ تم اس کا اور اس کے ساتھیوں کا مقابلہ کیونکر کر سکتے ہو یہ تھوڑے ہیں تو کیا ہوا۔ ہیں تو آنکھوں والے۔

(حاشیہ: حضرت مسیح موعودؑ کا ایک مولوی سے حضرت مسیحؑ کے پرندے پیدا کرنے کے متعلق سوال)

هَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ۔ اسی طرح فرمایا ظلمات اور نور کا بھی کوئی مقابلہ نہیں۔ تھوڑی سی روشنی سارے کمرے کا اندھیرا پاش پاش کر دیتی ہے۔ ظلمات عدم نور کا نام ہے اور نور وجود کا۔ اور وجود کے سامنے عدم کی حیثیت ہی کیا ہے یعنی تمہارے پاس الٰہی تعلیم نہیں۔ اس کے پاس ہے پس تمہارا اور اس کا کیا مقابلہ۔ اس کی تعلیم کی بنیاد تو حقائق پر ہے اور تمہاری تعلیم کی بنیاد صرف جہالت اور انکار پر۔

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ۔ یہ بات مشرکین کے سامنے بطور اعتراض پیش کی گئی ہے۔ یعنی تم باوجود مشرک ہونے کے بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ کہ معبودانِ باطلہ نے کوئی خلق کی ہے۔ جو خدا کی خلق سے مشابہ ہے۔ چنانچہ مکہ کے مشرکین اس بات کی جرأت نہ کر سکے۔ گو بعض اور ممالک کے مشرک اپنے معبودوں کے متعلق ایسے دعاوی بھی پیش کرتے ہیں۔ افسوس مسلمانوں نے بھی اس زمانہ میں ایسی بات کہنی شروع کر دی ہے اور حضرت مسیح کو پرندوں کا خالق قرار دے دیا ہے اور بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اب پتہ نہیں لگ سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے پرندے کونسے ہیں اور حضرت مسیح کے بنائے ہوئے کونسے ۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ایک مولوی سے پوچھا۔ کہ تم جو دعویٰ کرتے ہو کہ حضرت مسیحؑ ناصری پرندے پیدا کیا کرتے تھے۔ آخر انہوں نے کیا چیز پیدا کی تھی۔ تو اس نے جواب دیا۔ کہ چمگادڑ۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ مسیح کی چمگادڑیں کونسی ہیں۔ اور خدا کی بنائی ہوئی چمگادڑیں کونسی ہیں۔ تو ان مولوی صاحب نے فرمایا۔ اب پتہ نہیں لگتا اور پنجابی میں کہا کہ "اوہ ہُن رل مِل گیاں نے" یعنی اب تو وہ خدا تعالیٰ کی بنائی ہوئی چمگادڑوں سے مل جل گئی ہیں ۔

افسوس کہ جس بات کی جرأت مکہ کے مشرکوں کو نہ ہوئی وہ کام مسلمانوں نے کس دلیری سے کیا۔ اور نہ سوچا کہ اس بے دلیل

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا

اس نے آسمان سے کچھ پانی اُتارا۔ پھر (اس سے) کئی وادیاں اپنی (اپنی) مقدار کے مطابق بہ نکلیں

فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ

اور اس سیلاب نے اوپر آجانے والی جھاگ کو اُٹھا لیا اور جس (دھات) کو وہ کسی

عَلَيْهِ فِى النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ

زیور یا کسی (اور) سامان کی طلب میں آگ میں تپاتے ہیں۔ اس میں (بھی) اس جیسا ایک جھاگ (ہوتا)

مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ

ہے اسی طرح اللہ حق اور باطل (کے فرق) کو بیان کرتا ہے

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ

پھر جھاگ تو پھینکا جا کر تباہ ہو جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کو نفع

النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ

دینے والی ہوتی ہے وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے۔ اللہ (تعالے) تمام باتوں کو

دعویٰ کو کون تسلیم کرے گا +

اَلْوَاحِدُ الْقَهَّارُ قرآن کریم میں خدا تعالےٰ کی وحدانیت کو ظاہر کرنے کے لئے دو نام آتے ہیں۔ ایک وَاحِد۔ دوسرا اَحَد۔ اَحَد نام تنزیہی ہے۔ اور اس کے معنے ہیں۔ اکیلا۔ اس کے ذکر پر دو یا تین کا خیال تک بھی ذہن میں نہیں آتا۔ یہ فردیت پر دلالت کرتا ہے۔ اور کسی دوسرے یا تیسرے وجود کا خیال ذہن میں نہیں آتا۔ لیکن واحد کا لفظ جس کے معنے پہلے کے ہیں یہ نام ابتدائی نقطہ پر دلالت کرتا ہے کیونکہ وہ دوسرے تیسرے کے وجود کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور اس سے یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ منبع ہے ساری مخلوق کا۔ باوجودیکہ کوئی مخلوق کمالات میں اسکی مشابہ نہیں۔ اور اسکی ذات تمام دنیا سے مستغنی ہے۔ پھر بھی ہر چیز اس کی طرف رہنمائی کرتی ہے

جس طرح دوسرے اور تیسرے کا وجود لازمی طور پر پہلے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ کی دلیل کے طور پر صفت واحد کو پیش کیا ہے یعنی اگر تم اس کو خالق نہ مانو گے تو وہ واحد نہیں رہتا پھر تو بعض اشیاء اس پر دلالت کرینگی بجائے کسی اور منبع کی طرف اشارہ کرینگی پس اگر کوئی دوسرا خالق مانو گے تو اسکی وحدانیت سے انکار کرنا پڑے گا۔ اور اگر اسے واحد مانو گے تو اس امر کا اظہار کرنا پڑے گا کہ اس کے سوا کوئی اور بھی خالق ہے۔

القہار میں یہ بتایا ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ کہ کوئی چیز پیدا ہو کر پھر پیدا کرنیوالے کے قبضہ سے نکل جائے۔ اور اسکے لئے قبضہ میں رکھنے کے لئے کسی اور مددگار کی ضرورت ہو۔ مگر اس جگہ یہ بات بھی نہیں۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ اور اسی کی محتاج ہے پس سب معبودان باطلہ بھی اسکے ماتحت ہیں۔ اور کوئی بھی ان میں سے

واحد اور احد میں فرق۔

اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۞ لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ

اسی طرح (کھول کر) بیان کرتا ہے ۱۸؎ اور جنہوں نے اپنے رب کا کہا مانا ان کے لئے

اَوْدِيَةٌ
زَابِيًا

۱۸؎ حل لغات۔ اَوْدِيَةٌ وَادٍ کی جمع ہے اور وَادِی وَدٰی سے مشتق ہے۔ وَدَی الشَّیْءُ وَدْیًا کے معنے ہیں سَالَ۔ بہ پڑی۔ اور اَلْوَادِی اس سے اسم فاعل ہے یعنی بہنے والی نیز اَلْوَادِی کے معنے ہیں مُنْفَرَجٌ بَیْنَ جِبَالٍ اَوْ تِلَالٍ اَوْ آکَامٍ یکون مَنْفذًا لِلسَّیْلِ۔ کہ وادی پہاڑوں یا ٹیلوں کی درمیانی جگہ کو کہتے ہیں۔ جس میں سیلاب کا پانی بہتا ہے۔ وَفِی مفردات الرَّاغِبِ اَلوادی الموضع الذی یَسِیْلُ فیه الماءُ ومنه سُمِّیَ لِمفرج بَیْنَ الْجَبَلَیْنِ وَادِیًا۔ اور مفردات راغب میں ہے کہ وادی اس جگہ کو کہتے ہیں۔ جہاں پانی بہتا ہو۔ اور اسی وجہ سے پہاڑوں کی درمیانی فراخ جگہ کو وادی کہتے ہیں (اقرب)

اَلسَّیْل
جُفَاءً

السَّیْلُ۔ اَلْمَاءُ الْکَثِیْرُ بہت پانی۔ وَالْعربُ تقولُ "سَالَ بِہِمُ السَّیلُ وَجَاشَ بِنَا الْبَحْرُ" اَیْ وَقَعُوْا فِی اَمْرٍ شَدِیْدٍ ونحنُ فی اشدِّ مِنْه۔ اور عرب سَالَ بِہِمُ السَّیْلُ وَجَاشَ بِنَا الْبَحْرُ کا محاورہ بولتے ہیں جس کے معنے ہیں کہ دوسرے لوگوں کو کثرت پانی نے بہایا۔ اور ہم پر سمندر نے جوش مارا۔ اور مطلب ان کا یہ ہوتا ہے کہ پہلے لوگ بھی مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ لیکن ہم ان سے بڑھ کر مصائب میں مبتلا ہوئے اس محاورہ میں السَّیْلُ کا لفظ مصیبت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ (اقرب)

اَلزَّبَد

الزَّبَدُ۔ مَا یَعْلُو الماءَ وغیرہ مِنَ الرغْوَةِ۔ جھاگ۔ الخبثُ۔ بُری چیز۔ وَقَوْلُ الحریری ثُمَّ اَقْبَلْنَا عَلَى الْحَدِيْثِ مَخْضُ زُبَدَہٖ ونُلْقِی زَبَدَہٗ کَنّٰی بالزُّبَدِ وھی جمع زُبْدَةٍ عَنْ خِیَارِ الکَلَامِ وبالزَّبَدِ عَمَّا لَاخَیْرَ فِیْهِ۔ اور حریری نے اپنے اس قول میں زُبَد اور زَبَد کا استعمال کیا ہے زُبَد سے مُراد اعلیٰ درجہ کا کلام ہے۔ اور زَبَد کے معنے ہیں۔ وہ کلام جس میں کوئی خوبی نہ ہو۔ (اقرب)

رَابِيًا۔ رَبَا یَرْبُو المالُ۔ زَادَ وَنَمَا۔ مال زیادہ ہوا اور بڑھا۔ فُلَانٌ الرَّابِیَةَ۔ عَلَاھَا۔ ٹیلے پر چڑھا۔ الفرسُ رَبْوًا: انْتَفَخَ فی عَدْوٍ اوفزعٍ وَاَخَذَہُ الرَّبْوُ۔ گھوڑے کو دوڑ کی وجہ سے سانس چڑھ گیا۔ فُلَانٌ السَّوِیْقَ۔ صَبَّ عَلَیْهِ الْمَاءَ فَانْتَفَخَ۔ ستوؤں کو پانی میں بھگویا۔ تو وہ پھول گئے۔ فی حِجْرِہٖ۔ رَبْوًا ورُبُوًّا۔ نَشَأَ۔ فلاں کی گود میں پلا۔ وکلّمتُه فما رَبَا بِرَاسِه۔ اَیْ لَمْ یَعْبَأْ۔ مینے اس سے بات کی۔ لیکن اس نے توجہ نہ کی۔ الرَّابِیَةُ۔ مَا ارْتَفَعَ مِنَ الْاَرْضِ ٹیلہ اَخَذَہٗ اَخْذَةً رَابِیَةً۔ شَدِیْدَةً۔ سختی سے پکڑنا۔ (اقرب) پس زَبَدًا رَّابِیًا کے معنے ہونگے اوپر آنے والی جھاگ (۲) پھولنے والی جھاگ (۳) ناقابل توجہ جھاگ یعنی حقیر۔

جُفَاءً۔ مَانَفَاہُ السَّیْلُ اِذَا رَمٰی بِه جس کو سیلاب پھینک دیتا ہے۔ قَالَ ابنُ السّکّیتِ۔ وذھب الزَّبَدُ جُفَاءً ای مَدْفُوعًا عَنْ مَائِه۔ اور ابن سکیت نے ذھب الزَّبَدُ جُفَاءً میں جُفَاءً کے معنے کئے ہیں۔ پانی سے ہٹائی ہوئی۔ دُور کی ہوئی۔ پھینکی ہوئی۔ الباطلُ تَشْبِیْهًا لَه بِزَبَدِ القِدْرِ الَّذِیْ لَا یُنْتَفَعُ بِه۔ باطل بے حقیقت۔ بے فائدہ۔ چونکہ ہنڈیا کی جھاگ بھی بے فائدہ جاتی ہے۔ اس لئے باطل کو اسپر قیاس کر لیا کیونکہ وہ بھی بے فائدہ ہے۔ اس لئے جفاء کا لفظ اس کے لئے استعمال کر لیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس جگہ اس مضمون کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ کہ پانی جب آسمان سے اُترتا ہے اور مختلف راستوں سے بہ پڑتا ہے۔ تو اس وقت ان گلیوں میں جو پہلے بظاہر صاف معلوم ہوتی تھیں۔ پانی کے گزرتے وقت اس قدر جھاگ پیدا ہوتی اور میل اُٹھتی ہے۔ کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اور شروع شروع میں تو جھاگ کی اس قدر کثرت ہوتی ہے۔ کہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا جھاگ ہی جھاگ ہے

الْحُسْنٰی ؕ وَالَّذِیْنَ لَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ

کامیابی (مقدر) ہے اور جنہوں نے اس کا کہا نہیں مانا (انکی یہ حالت ہوگی کہ) اگر جو کچھ بھی

مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا

زمین میں ہے (سب) انکے لئے ہوتا۔ اور اس کے برابر اور بھی۔ تو بھی وہ اسے دے کر (اپنے

بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ

آپ کو) چھڑا لیتے۔ ان کے لئے بہت ہی بُرا عذاب (مقدر) ہے اور ان کا ٹھکانا

مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ سمٹ کر صرف کناروں پر تھوڑی تھوڑی رہ جاتی ہے۔ اور پانی کا غلبہ ظاہر ہو جاتا ہے۔

دوسری مثال یہ دی۔ کہ زیور بنانے کے لئے یا برتن وغیرہ بنانے کے لئے معدنیات کو پگلایا جاتا ہے۔ تو انکے اوپر بھی ایسی ہی جھاگ آجاتی ہے۔ مگر سُنار یا ٹھٹھیار اس کو صاف کر لیتا ہے۔ اور نیچے سونا یا دوسری کارآمد اشیاء ہی رہ جاتی ہیں۔

اس جگہ پر حق کی مثال پانی سے اور باطل کی مثال جھاگ سے دی ہے۔ جو حق پر غالب نظر آتی ہے۔ یعنی ابتداءً لوگ باطل کی کثرت اور غلبہ کو دیکھ کر خیال کرتے ہیں۔ کہ اسی کا زور دُنیا میں ہے مگر انجام کار جھاگ مٹ جاتی ہے۔ اور اصل پانی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح حق کی مثال سونے یا دوسری معدنیات سے دی ہے کہ جن کو پگھلانے پر کچھ میل نکلتی ہے لیکن اس میل کو پھینک دیا جاتا ہے۔ اور صرف معدن کو الگ نکال کر رکھ لیا جاتا ہے۔ کفّار کو بتایا کہ بیشک تم اس وقت جھاگ کی طرح اُٹھ رہے ہو۔ اور غالب نظر آتے ہو۔ اور اسلام کا سونا تمہارے نیچے دبا ہُوا نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے۔ مگر جب ہماری نصرت کی ہَوائیں چلیں گی۔ تو جھاگ ہی کی طرح بیٹھ جاؤ گے۔ اور حق کا غلبہ نظر آئے گا۔ اور صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہی باقی رہ جائیگی۔

یا اس کا یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے۔ کہ فطرت انسانی کو تو اللہ تعالٰی نے پاک بنایا ہے لیکن اس میں رسم و رواج کا گند مل کر اُسے خراب کر دیتا ہے اللہ تعالٰی اپنے نبیوں کے ذریعہ سے پھر فطرت کے پاک تقاضوں کو جگا دیتا ہے اور طبائع میں ایک ایسا جوش پیدا کر دیتا ہے کہ جس طرح تیز بھٹی یا بڑھتے ہوئے سیلاب میں ہوتا ہے اس ہیجان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبائع کا جمود جاتا رہتا ہے ایک طرف فطرت میں بیداری پیدا ہو جاتی ہے دوسری طرف رسوم و عادات کی محبت میں جوش آتا ہے اس حرکت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے فطرت صحیحہ اور رسوم و عادات کے ایک ملے جُلے ڈلے کے یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہو جاتی ہیں اور انسان کچھ عرصہ کے لئے دو متضاد جذبات کا حامل ہو جاتا ہے۔ آخر جسکی فطرت زیادہ پاک ہوتی ہے وہ رسوم و عادات کی میل کو باہر نکال کر پھینک دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور جو یہ کوشش نہیں کرتا اسکی طبیعت پھر ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور پھر رسوم و عادات کی جھاگ فطرت کے سونے سے مل کر پہلے کی طرح ایک ناصاف ڈلا بنکر رہ جاتی ہے

حق کی مثال پانی سے اور باطل کی مثال جھاگ سے دی ہے۔

حق کی مثال سونے یا دوسری معدنیات سے

بِقَدَرِهَا کے الفاظ سے یہ بتایا۔ کہ اشاعت تعلیم انسانی ظرف کے مطابق ہوتی ہے جس کا قلب وسیع اور سلیم ہوگا وہ زیادہ حصہ لے گا۔

تعلیم انسانی ظرف کے مطابق ہوتی ہے۔

جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ

جہنم ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے ۱۹؎ جو شخص جانتا ہے کہ جو (کلام)

اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۚ

تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اُتارا گیا ہے وہ بالکل حق ہے۔ کیا وہ اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھا ہے

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ قرآن کریم بدی اور نیکی کو ممتاز کر کے دکھا دے گا۔ اور جب دونوں کا فرق لوگوں پر روشن ہو جائے گا تو اچھے لوگ خود ہی بدی کو پرے اُٹھا کر پھینک دینگے اور نیکی کو اختیار کر لیں گے۔

۱۹؎ حل لغات۔

اِسْتَجَابُوْا — اِسْتَجَابُوْا۔ اِسْتَجَابَ سے مضارع ہے اور اِسْتَجَابَ لَهٗ وَمِنْهُ کے معنے ہیں قَبِلَ دُعَاءَهٗ اسکی دعا قبول کی (اقرب) پس اسْتجابوا کے معنے ہونگے بات قبول کی۔ کہا مانا۔

الحسنٰی — اَلْحُسْنٰى۔ ضِدُّ السُّوْئِ۔ حُسْنٰى۔ سُوْئٰى۔ یعنی برائی کے مقابل کا لفظ ہے اور اس کے معنے ہیں اَلْعَاقِبَةُ الْحَسَنَةُ۔ اچھا انجام۔ اَلظَّفَرُ۔ کامیابی (اقرب)

افتدوا — اِفْتَدَوْا۔ اِفْتَدٰى سے ہے۔ اور افتدٰی کے معنے ہیں اِسْتَنْقَذَهٗ بِمَالٍ وَقِيْلَ اَعْطٰى شَيْئًا فَانْقَذَهٗ۔ مال یا کچھ اور بدلہ میں دے کر چھڑا لیا۔ اَلْمَرْاَةُ نَفْسَهَا مِنْ زَوْجِهَا: اَعْطَتْهُ مَالًا حَتّٰى تَخَلَّصَتْ مِنْهُ بِالطَّلَاقِ۔ عورت نے خاوند کو مال دیکر خلاصی حاصل کی۔ اور طلاق لی۔ (اقرب) پس اِفتدوا کے معنے ہونگے۔ انہوں نے فدیۃً کچھ دے کر اپنے نفوس کو چھڑانے کی کوشش کی۔

جَهَنَّم — جَهَنَّمُ۔ دَارُ العِقَاب کا نام ہے۔ یہ ممنوع من الصرف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ عجمی ہے۔ بعض اسے اصل میں فارسی یا عبرانی قرار دیتے ہیں لیکن یہ درست نہیں کہ عربی کے الفاظ کو غیر زبانوں کی طرف منسوب کیا جائے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے۔ کہ یہ لفظ ایسے قاعدہ سے بنایا گیا ہے کہ جسکی مثال نہیں ملتی۔ اس وجہ سے اس کو انہوں نے غیر زبان کا قرار دے دیا۔ عربی میں جَهَقَ۔ جَهُوْنًا کے معنے قَرُبَ۔ وَدَنَا کے ہوتے ہیں۔ اور اس سے جہنّم بنا ہے یا یہ لفظ جَهَمَ سے بنا ہے۔ عربی زبان میں زیادۃِ نون فی وسط الکلمہ کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ پس جَهَمَ سے جَهَنَّم کا بنا خلاف قواعد نہیں۔ اور جَهَمَ کے معنے ہیں اِسْتَقْبَلَهٗ بِوَجْهٍ مُتَفَهِّمٍ۔ کہ اس کو تیوری چڑھا کر ..... ملا اور تَجَهَّمَهٗ کے معنے ہیں۔ اِسْتَقْبَلَهٗ بِوَجْهٍ كَرِيْهٍ بُرے چہرے سے ملا۔ (اقرب) پس جَهَنَّم کے معنے ہوئے ایک ناپسندیدہ جگہ جو ناراضگی سے لینے کو بڑھتی ہے۔ یہ نام اس کے شعلے مارنے کی وجہ سے رکھا گیا۔

اَلْمِهَاد۔ اَلْفِرَاشُ۔ بچھونا۔ اَلْاَرْضُ۔ زمین۔ اس کی جمع اَمْهِدَةٌ ہے (اقرب)

تفسیر۔ فرمایا جو لوگ اپنے رب کی باتوں کو قبول کرینگے ان کے لئے حُسنٰی ہوگی۔ یعنی ان کا انجام نیک ہوگا۔ وہ دیدار الٰہی کریں گے۔ انہیں کامیابی حاصل ہوگی۔ اور ان کی عقلوں میں روشنی پیدا کر دی جائے گی۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بات کو نہ مانیں گے۔ قرآن مجید کی اطاعت نہ کریں گے۔ انکی حالتیں گرتی ہی چلی جائینگی۔ یہاں تک کہ وہ ایسی مشکلات میں مبتلا ہو جائینگے کہ اگر وہ زمین اور اسکی چیزیں اور اسکی مانند اور چیزیں فدیہ میں دے سکتے۔ تو ضرور دے دیتے۔ ان سے جو محاسبہ کیا جائے گا۔ وہ ان کے لئے سخت تکلیف دہ ہوگا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اور وہ بہت بُری اور تکلیفوں کی جگہ ہے۔

سُوْءُ الْحِسَاب کا یہ مطلب نہیں۔ کہ ان سے حساب میں

إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يُوفُونَ

عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں ۵۲۰ جو

بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ ۝ وَالَّذِينَ

اللہ (تعالیٰ) کے (ساتھ کئے ہوئے) عہد کو پورا کرتے ہیں اور اس پختہ عہد کو نہیں توڑتے۔ ۵۲۱ اور جو (لوگ)

خرابی کی جائیگی۔ بلکہ یہ مطلب ہے۔ کہ ان کے اعمال کے نتائج خراب نکلیں گے۔ اور وہ ان طاقتوں کا حساب نہیں پیش کرسکیں گے جو اللہ تعالےٰ نے انہیں ترقی کے لئے دیں مگر انہوں نے غلط استعمال سے ضائع کردیں۔

بِئْسَ الْمِهَادُ میں بتایا۔ کہ اگرچہ جہنم شفاخانہ ہے۔ اور وہاں حصول صحت کی خاطر رکھا جائے گا۔ مگر تاہم وہ تکلیف کا مقام ہے۔ خلاصہ یہ کہ مومن ترقی کرتے جائیں گے۔ اور کافر گرتے جائیں گے اس لئے اے منکرو تم کب تک نتائج کو دیکھ کر آنکھیں بند کئے رہوگے کب تک اس نبی کو نہ مانوگے۔ ایک دن دو دن جنبہ داری کرلوگے۔ قوم پروری کرلوگے مگر آخر ایک نہ ایک دن حق قبول کرنے پر مجبور ہوجاؤگے

۵۲۰ حل لغات یَتَذَکَّرُ تَذَکَّرَ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور تَذَکَّرَ کے معنے ہیں ذَکَرَ الشَّیْءَ وَحَفِظَہٗ فِیْ ذِہْنِہٖ کسی چیز کو ذہن میں محفوظ کیا یعنی یاد کیا۔ مَا کَانَ قَدْ نَسِیَ۔ نَطَقَ بِہٖ بھولی ہوئی بات کو بیان کیا۔ اَللّٰہَ مَجَّدَہٗ وَسَبَّحَہٗ۔ اللہ کی بزرگی بیان کی اور اسکی تسبیح کی۔ (اقرب) اَلْاَلْبَاب لُبّ کی جمع ہے اس کے معنی عقل کے ہیں۔ مزید تشریح کے لئے دیکھیں یوسف ۱۰۸ پس اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَاب کے معنے ہونگے کہ صرف عقل والے بات کو سمجھتے ہیں یا عقل والے بات کو یاد رکھتے ہیں۔ یا عقل والے اگر غلطی کر جائیں تو پھر احکام الٰہی کو یاد کرکے سنبھل جاتے ہیں۔

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ یہ تعلیم اس قسم کی ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہر قسم کی ترقیات انسانوں کو ملینگی پس جو شخص اس کو سمجھ لیتا ہے۔ اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ کیا وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے۔ جو اندھا ہے۔

جب دو چیزوں میں مقابلہ کیا جائے تو ہمیشہ یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ جو چیز پہلے مذکور ہو۔ اس کو دوسری پر قیاس کیا جاتا ہے۔ اگر پہلی اچھی ہو۔ تو مراد یہ ہے۔ کہ کیا یہ شئے بُری شئے کی طرح مضر ہوسکتی ہے۔ اور اگر پہلے بُری مذکور ہو۔ تو یہ مراد ہوتی ہے کہ کیا یہ بُری شئے اچھی چیز کی طرح فوائد پیدا کرسکتی ہے۔ مثلاً اگر یہ کہیں کہ کیا اندھا آنکھوں والے کے برابر ہوسکتا ہے تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ آرام اور فوائد جو آنکھوں والے کو حاصل ہیں وہ اندھے کو نہیں حاصل ہو سکتے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ کیا آنکھوں والا اندھے کی طرح ہوسکتا ہے۔ تو اس وقت زور اس بات پر ہوتا ہے کہ اندھے کو جو تکالیف پہنچتی ہیں۔ کیا وہی آنکھوں والے کو پہنچ سکتی ہیں۔ پس اس آیت میں اس پر زور ہے کہ مسلمان کسی طرح بھی ان نقصانات میں مبتلا نہیں ہوسکتے جو کفار کو پہنچ سکتے ہیں۔

بِئْسَ الْمِهَاد

اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَاب میں ایک نیا مضمون بیان کیا ہے فرماتا ہے۔ اس تعلیم سے وہی لوگ نصیحت و نفع حاصل کرتے ہیں جو اُولُوا الْاَلْبَاب ہیں۔ یعنی جو دینی لُبّ اور عقل رکھتے ہیں۔ یہ مقابلہ جو پیچھے مسلمانوں اور کافروں کی حالت کا کیا گیا ہے۔ اس سے نفع حاصل کرنا عقلمندوں کا کام ہے۔ جو دینی عقل کو مار دیتا ہے اور اسے ضائع کر دیتا ہے۔ وہ اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ پس دین کی باتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے عقل کو محفوظ رکھنا اور اسے عادات وجذبات سے گندہ نہ ہونے دینا ضروری ہوتا ہے مگر افسوس کہ اکثر لوگ اس قیمتی جوہر کو عادات وجذبات کے پردوں میں چھپا دیتے ہیں اور بظاہر انسان لیکن بباطن حیوان ہوتے ہیں کاش کوئی اس پر غور کرے اور فائدہ اٹھائے۔

یَتَذَکَّرُ

اَلْاَلْبَاب

اس تعلیم کے ذریعے ہر قسم کی ترقیات ملیں گی۔

۵۲۱ حل لغات۔ اَلْعَہْد۔ اَلْوَصِیَّۃ۔ وصیت ۔ الیمین

يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ

کہ ان تعلقات کو قائم کرتے ہیں جن کے قائم کرنے کا اللہ (تعالےٰ) نے حکم دیا ہے اور اپنے

رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِيْنَ

رب سے ڈرتے ہیں اور بُرے (انجام والے) حساب سے خوف رکھتے ہیں ۝۲۲ اور جنہوں نے

يَحْلِفُ بِهَا الرَّجُلُ قسم۔ اَلْمَوْثِقُ بختہ بات۔ اَلْمِيْثَاقُ بختہ اقرار الَّذِيْ يَكْتُبُهُ وَلِيُّ الْاَمْرِ لِلْوُلَاةِ اِيْذَانًا بِتَوْلِيَتِهِمْ۔ بادشاہ اپنے ماتحت افسران کو جو انکی تقرری کا حکمنامہ لکھکر دیتا ہے (اقرب)

الخشية

تفسیر۔ چونکہ باوجود اس کے کہ ہر شخص میں اللہ تعالیٰ نے عقل کا مادہ رکھا ہے۔ لوگ عام طور پر اس کو استعمال نہیں کرتے۔ اور عدم استعمال کی وجہ سے اسے بالکل مار دیتے ہیں مگر باوجود اسکے اس امر کے مدعی ہوتے ہیں کہ وہ عقلمند ہیں اللہ تعالےٰ اولوالالباب کی علامات بیان فرماتا ہے تاکہ انسان اس مخفی جوہر کو اسکی علامتوں کے ذریعہ سے پہچان سکے پہلی علامت یہ بتاتا ہے کہ وہ لوگ جو حقیقت شناس ہوتے ہیں۔ اور چھلکے کے پیچھے پڑنے سے اپنے آپ کو روک دیتے ہیں۔ اس عہد کو جو انہوں نے اللہ تعالےٰ سے باندھا ہے۔ کامل طور پر پورا کرتے ہیں عقل کا کام یہی ہے۔ کہ وہ موازنہ کرتی ہے۔ اور جو اعلیٰ شئے ہو۔ اس کو قبول کر لیتی۔ اور جو ادنیٰ شئے ہو۔ اسے رد کر دیتی ہے پس یہ لوگ اس امر کو دیکھ کر کہ سب برکت اللہ تعالےٰ کے عہد کے پورا کرنے میں ہے۔ ہمہ تن اس عہد کو پورا کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے سب امور کو اس عہد کے تابع کر دیتے ہیں۔ اگر وہ اس عہد کے مطابق ہوں تو انہیں اختیار کرتے ہیں۔ اور اگر خلاف ہوں۔ تو انہیں رد کر دیتے ہیں۔ اور عہد کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔

عقلمندوں کی پہلی علامت

يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ

عقلمندوں کی دوسری علامت

يَصِلُوْنَ

۲۲ حل لغات۔ يَصِلُوْنَ وَصَلَ سے ہے۔ اور وَصَلَ الشَّيْءَ بِالشَّيْءِ کے معنے ہیں لَاْمَهٗ وَجَمَعَهٗ ضِدُّ فَصَلَهٗ کسی چیز کو ملایا۔ جوڑا۔ (اقرب) پس يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ کے معنے ہونگے۔ کہ ان تعلقات کو قائم رکھتے ہیں جنکے قائم رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ۔ يَخْشَوْنَ خَشِيَ سے ہے اور اَلْخَشْيَةُ کے معنے ہیں۔ خَوْفٌ يَشُوْبُهٗ تَعْظِيْمٌ وَاَكْثَرُ مَا يَكُوْنُ ذٰلِكَ عَنْ عِلْمٍ بِمَا يُخْشٰى مِنْهُ ولذلك خصّ العلماء بها في قوله اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا یعنی خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جس میں اس شخص کی جس سے خشیت کی جائے تعظیم بھی ملی ہوئی ہو۔ اور اسکی بزرگی کا احساس بھی ہو۔ اور لفظ خشیت کا اکثر استعمال اس جگہ ہوتا ہے۔ جہاں خوف کی وجہ کا بھی علم ہو یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ کہ خدا تعالےٰ کی خشیت صرف اس کے عالم بندوں کے دل میں ہوتی ہے۔ ورنہ خوف تو عام لوگوں کے دل میں بھی ہوتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے (مفردات) پس يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ کے معنے ہونگے۔ کہ وہ اپنے رب سے ایسی خشیت کرتے ہیں جس میں اسکی تعظیم اور بزرگی پائی جاتی ہے۔ اور وہ علم پر مبنی ہوتی ہے۔

تفسیر۔ دوسری علامت عقلمندوں کی یہ بتائی ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کے عہد کی پابندی کے بعد اور اس سے کامل تعلق پیدا کر لینے کے بعد اس کے ان بندوں کی طرف جھکتے ہیں۔ جن سے تعلق رکھنے کا اس نے حکم دیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے رسول۔ ملائکہ۔ خلفاء پھر اولیاء و ابرار اور اس کے بعد تمام مخلوقات حسب مراتب مثلاً قومی نظام کے چلانے والے رشتہ دار محسن ہمسائے۔ غرباء و مساکین اہل وطن مسافر باقی افراد انسانیت۔ حیوانات جن سے وہ کام لیتا ہے۔

صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ

اپنے رب کی رضا کی طلب میں ثابت قدمی سے کام لیا۔ اور نماز کو عمدگی سے ادا کیا۔ اور

اور پھر تمام چرند پرند حتّٰی کہ درندے اور کیڑے کوڑے پھر نباتات اور جمادات غرض تعلق باللہ کے بعد عقلمند انسان کا کام ہے کہ جن جن چیزوں سے اور جس جس حد تک اللہ تعالیٰ نے تعلق کا حکم دیا ہے اس حد تک اور اس صورت میں ان سے تعلق رکھے۔ اس علامت میں گویا شفقت علیٰ خلق اللہ اور مادی اسباب سے استمداد اور انکے استعمال کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ نکتہ بتایا ہے۔ کہ عقلمند وہ نہیں جو دنیا کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی جستجو کرتا ہے بلکہ عقلمند وہ ہے جو خدا تعالیٰ کو پا کر اس کے ارشاد کے ماتحت دنیا کی طرف جھکتا ہے اسی کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتی ہے کہ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى (نجم ع ۱) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اوّل تو خدا تعالیٰ کے قریب ہوئے۔ پھر اس کے حکم کے ماتحت اس مقام سے اُتر کر مخلوق کی طرف جھکے۔ اور شفقت علیٰ خلق اللہ کا اعلیٰ نمونہ دکھایا۔ اور خدا تعالیٰ اور مخلوق کے درمیان واسطہ بن گئے جس طرح کمان کا چلّہ ہوتا ہے کہ ایک سرا ایک طرف۔ اور ایک سرا ایک طرف بندھا ہوا ہوتا ہے اس آیت میں لطیف پیرایہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کوشش کا ذکر کیا ہے۔ جو آپؐ نے بنی نوع انسان کو خدا تعالیٰ سے ملانے کے لئے کی۔ لیکن چونکہ یہ موقع اس آیت کی تفسیر کا نہیں۔ میں نے درمیانی مطالب کو ترک کر کے صرف نتیجہ بیان کر دیا ہے۔

غرض آیت زیر تفسیر میں اللہ تعالیٰ نے عقلمندوں کی دوسری علامت یہ بتائی ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور محبت میں کمال حاصل کر کے اس کے حکم اور اسکی ہدایت کے ماتحت مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور مخلوق سے رشتہ اتحاد و اخوت اور احسان جوڑتے ہیں۔

عقلمندوں کی تیسری علامت

تیسری علامت یہ بتائی ہے کہ عقلمند لوگ اپنے رب کی خشیت دل میں رکھتے ہیں جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے

خشیت کے معنے

خشیت کسی اعلیٰ صفات والی چیز کے کمال و حسن کو پہچاننے کے بعد اس کے ہاتھ سے جاتے رہنے کے خوف کو کہتے ہیں۔

خشیت کے لفظ پر اس چیز کی معرفت کا بھی مفہوم ہے جس سے خوف کیا گیا ہو

گویا خشیت کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ اس چیز کی معرفت حاصل ہو جس سے خوف کیا گیا ہو۔ نیز خوف نقصان یا ضرر کا نہ ہو۔ بلکہ اس وجہ سے ہو کہ انسان یقین کرے۔ کہ وہ چیز نہایت اعلیٰ اور عظمت والی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اپنی کسی غفلت کی وجہ سے میں اس کا قرب کھو بیٹھوں پس اللہ تعالیٰ کی خشیت کے یہ معنے ہوئے۔ کہ جب تعلق باللہ کے مقام کو انسان حاصل کر لیتا ہے۔ تو چونکہ اس پر کھل جاتا ہے کہ یہی مقام انسان کی حقیقی راحت اور کمال کا مقام ہے وہ اس کے جاتے رہنے کے خیال کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اور ہر وقت اسکی حفاظت کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور پوری طرح اس کا خیال رکھتا ہے۔ کہ جو مقام قرب اسے حاصل ہُوا ہے وہ کسی غفلت کی وجہ سے کھویا نہ جائے۔

اسی علامت کا دوسرا حصہ یہ بتایا ہے کہ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ یعنی ایک طرف اگر اسے اللہ تعالیٰ کے قرب کے مقام کی حفاظت کا خیال دامنگیر ہوتا ہے۔ تو دوسری طرف وہ اس امر سے بھی خائف رہتا ہے کہ شفقت علیٰ خلق اللہ کا جو مقام اسے حاصل تھا۔ اس میں کسی کوتاہی کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مستوجب نہ ہو جائے۔ پہلی دو علامتوں میں چونکہ تعلق باللہ کو اصل اور شفقت علیٰ خلق اللہ کو اس کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ تیسری دلیل میں اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے تعلق کے نقص کے لئے خشیت کا لفظ اور مخلوق کے تعلق کے نقص کے متعلق خوف کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ اوّل الذکر لفظ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جس چیز سے ڈرا جاتا ہے۔

عقلمندوں کی دوسری علامت

اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ

جو (کچھ) ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے چھپکر (بھی) اور ظاہر (بھی ہماری راہ میں) خرچ کیا اور (جو)

بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۙ

بدی کو نیکی کے ذریعہ دُور کرتے ہیں انہی کے لئے اس گھر کا (بہترین) انجام (مقدر) ہے ۲۲

صبر کے تین معنی وہ مقصود بالذات ہے اور خوف کا لفظ ضروری نہیں کہ مقصود بالذات کے لئے بولا جائے بلکہ بسا اوقات یہ لفظ ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس سے دُور بھاگنا مقصود ہو۔ گو کبھی مقصود بالذات شئے کی ناراضگی کے لئے بھی استعمال ہو جاتا ہے۔

صبروا **۲۲ حل لغات** صَبَرُوْا۔ صَبَرَ سے جمع کا صیغہ ہے اور صبر کے معنے ہیں۔ تَرْكُ الشَّكْوٰى مِنْ أَلَمِ الْبَلْوٰى

یدرءون لِغَيْرِ اللّٰهِ لَا اِلَى اللّٰهِ کہ مصیبت کے دُکھ کا شکوٰی خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کے پاس نہ کرنا۔ فَاِذَا دَعَا اللّٰهَ الْعَبْدُ فِي كَشْفِ الضُّرِّ عَنْهُ لَا يُقْدَحُ فِي صَبْرِهِ۔ اگر بندہ اپنی دفع مصیبت کے لئے خدا تعالیٰ کے پاس فریاد کرے تو اس کے صبر پر اعتراض نہ کیا جائے گا۔ وَقَالَ فِي الْكُلِّيَّاتِ۔

عقبی اَلصَّبْرُ فِي الْمُصِيبَةِ۔ اور کلیات میں لکھا ہے کہ صبر مصیبت کے وقت ہوتا ہے۔ وَصَبَرَ الرَّجُلُ عَلَى الْاَمْرِ نَقِيْضُ جَزِعَ اَيْ جَرُؤَ وَشَجُعَ وَتَجَلَّدَ۔ اور صبر جزع یعنی شکوٰی کرنے اور گھبرانے کے مقابل کا لفظ ہے۔ اور صَبَرَ کے معنے ہوتے ہیں

اولوالالباب کی چار اور علامتیں دلیری دکھائی۔ جرأت دکھائی۔ ہمت دکھائی۔ اور صَبَرَ عَنِ الشَّيْءِ کے معنے ہیں اَمْسَكَ عَنْهُ کسی چیز سے رُکا رہا۔ لِلدَّابَّةِ حَبَسَهَا بِلَا عَلَفٍ۔ اور صبر کا مفعول دابہ ہو۔

صبر کے معنے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں۔ کہ جانور کو بغیر چارہ دینے کے روکے رکھا۔ صَبَرْتُ نَفْسِيْ عَلٰى كَذَا کے معنے ہیں میں نے اپنے نفس کو کسی چیز پر قائم رکھا۔ یا کسی چیز سے روکے رکھا چنانچہ انہی معنوں میں صَبَرْتُ عَلٰى مَا اَكْرَهُ وَصَبَرْتُ عَمَّا اُحِبُّ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ تکلیف دہ حالت پر میں نے نفس کو استقلال سے قائم رکھا۔ اور پسندیدہ امور سے نفس کو باز رکھا۔ گویا صبر کے تین معنے ہوئے۔ گناہ سے بچنا۔ اور اپنے نفس کو اس سے روکے رکھنا۔ (۲) نیک اعمال پر استقلال سے قائم رہنا۔ (۳) جزع فزع سے بچنا۔ (اقرب) اور وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ کے معنے ہونگے۔ جو اپنے رب کی رضا کے لئے جزع فزع سے بچے۔ بدیوں سے رُکتے رہے۔ اور نیکیوں پر ہمت سے قائم رہے۔

يَدْرَءُوْنَ۔ دَرَأَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور دَرَأَ کے معنے ہیں۔ دَفَعَهٗ وَقِيْلَ دَفَعَهٗ شَدِيْدًا۔ اس کو ہٹایا۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ دَرَأَ میں سختی سے ہٹانے کے معنے پائے جاتے ہیں۔ (اقرب) اور يَدْرَءُوْنَ کے معنی ہوں گے سختی سے ہٹاتے ہیں۔

عُقْبٰى۔ جَزَاءُ الْاَمْرِ۔ کام کی جزا۔ اٰخِرُ كُلِّ شَيْءٍ۔ ہر چیز کا آخر۔ انجام۔ اَلْاٰخِرَةُ۔ آخرت (اقرب) اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ کے معنے ہونگے۔ انہی کے لئے اس آخرت کے گھر کا بہترین انجام مقدر ہے۔

تفسیر۔ اس آیت میں چار اور علامات اولوالالباب کی بیان فرمائی ہیں۔ پہلی وجہ جو پچھلی آیات کو ملا کر چوتھی ہے۔ یہ بتائی ہے کہ وہ لوگ اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لئے صبر کرتے ہیں۔ جیسا کہ حل لغات سے ظاہر ہے۔ صَبْر کے تین معنی ہیں (۱) گناہ سے بچنا۔ اور جذبات کو بُری راہ پر پڑنے سے روکنا (۲) نیک اعمال پر استقلال سے قائم رہنا (۳) جزع فزع سے بچنا۔ پس اس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ چوتھی علامت عقلمندوں کی یہ ہے کہ وہ بدی سے مجتنب رہتے ہیں۔ نیکی پر قائم رہتے ہیں

اور جزع فزع سے رُکتے ہیں - اور اسی پر کفایت نہیں کرتے بلکہ اپنی نیتوں کی بھی اصلاح کرتے ہیں - اور ان کا یہ کام اللہ تعالٰے کی رضا کے حصول کے لئے ہوتا ہے نہ کہ کسی ذاتی یا قومی غرض کے ماتحت یا کسی طبعی نقص کے سبب یعنی ان کا صبر کم ہمتی یا کمزوری اور بزدلی کی وجہ سے نہیں ہوتا - نہ اپنے ذاتی اور قومی فوائد کے حصول کے لئے ہوتا ہے بلکہ محض اللہ تعالٰے کی رضا کی خاطر ہوتا ہے - باوجود طاقت انتقام کے وہ صبر کرتے ہیں - اور اس میں ان کے مدنظر یہ ہوتا ہے - کہ اللہ تعالٰے ان سے راضی ہو جائے -

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں - عفت اس شخص کی نہیں جس کے اندر گناہ کی طاقت نہیں - عفت تو اسی کی ہے جس کے اندر بدی کی طاقت ہے - اور بدی کی طاقت کے ہوتے ہوئے وہ بدی سے مجتنب رہتا ہے - جو شخص رات کے وقت ڈر کے مارے اپنے مکان سے باہر نہیں نکل سکتا - وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ ڈکیتی کا مرتکب نہیں ہوتا - ایک شخص جو کمزور اور نحیف الجثہ ہے وہ اگر ایک مضبوط آدمی سے مار کھا کر کہے کہ میں صبر کرتا ہوں - تو وہ صابر نہیں کہلائے گا - بلکہ بے بس کہلائے گا - ہاں اگر وہ جرأت اور طاقت کے ہوتے ہوئے اللہ تعالٰی کی رضا کی خاطر صبر اختیار کرتا ہے - تو وہ بیشک صابر کہلانے کا مستحق ہے -

پانچویں علامت اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ کی بیان فرمائی - نماز کو باقاعدہ اور باشرائط ادا کرتے ہیں - یعنے اللہ تعالٰی کے ساتھ تعلقات میں باقاعدگی کی عادت ہوتی ہے اور بے استقلالی ان کے اعمال میں نہیں ہوتی -

چھٹی علامت یہ بتائی وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اس سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں پوشیدہ تو اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ تا دوسرے پر احسان نہ ہو اور علانیہ اس لئے کرتے ہیں کہ تا دوسروں کو صدقہ اور نیکی کی تحریک پیدا ہو - اور دوسرے لوگ بھی انہیں دیکھ کر نیکیوں میں حصہ لیں -

ساتویں علامت یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ بیان فرمائی اس میں بدی کو دُور کرنے کے یہ گُر بتائے ہیں (۱) وہ نیک اعمال کرتے ہیں تا کہ لوگ ان کے نمونہ کو دیکھ کر بدی کو ترک کریں - گویا کہ صرف زبانی وعظ پر بس نہیں کرتے - کہ وہ اتنا مؤثر نہیں ہوتا - بلکہ عملاً نیکی کا نمونہ دکھاتے ہیں - اور اس طرح بدی کی جڑ کھوکھلی کرتے ہیں (۲) دوسرے معنی اس کے یہ ہیں کہ وہ نیک باتوں کا وعظ کرتے ہیں - اور اس طرح آپ ہی آپ بُرائی کا رواج مٹتا جاتا ہے یعنی فحش کی تشریحات پر اتنا زور نہیں دیتے - جتنا کہ نیک اعمال کی خوبیوں پر اور اس طرح ذہنوں کو بدی سے ہٹا کر نیکیوں کی طرف پھیرتے ہیں (۳) تیسرے معنے یہ ہیں کہ وہ بہتر اور مصلح اور مناسب موقعہ اعمال اس غرض کو مدنظر رکھ کر بجالاتے ہیں کہ تا ان کے ذریعہ بدی مٹ جائے - تورات کے مطابق انکی یہ غرض نہیں ہوتی - کہ ضرور سزا ہی دی جائے - اور نہ انجیل کے مطابق انکی یہ غرض ہوتی ہے - کہ ضرور نرمی سے ہی ہر موقعہ پر کام لیا جائے - اور ایک گال کے بعد دوسری گال بھی پھیر دی جائے بلکہ ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ بدی مٹ جائے - اس غرض کو پورا کرنے کے لئے جو مناسب طریق ہو - اسے اختیار کرتے ہیں - اگر سزا سے بدی مٹ سکتی ہے - تو وہ سزا دیتے ہیں - اور سختی سے کام لیتے ہیں - اور اگر نرمی اور عفو کے ساتھ بدی مٹ سکتی ہے - تو اس وقت نرمی اور عفو سے بدی کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں - اور اگر عفو کے علاوہ احسان کی ضرورت سمجھتے ہیں تو بدی کے مقابل عفو اور احسان کے ذریعہ بدی کی جڑ کاٹ دیتے ہیں - پس جو بدی کے مٹانے کے لئے بہتر عمل ہو - اُسے اختیار کرتے ہیں ÷

(۴) چوتھے معنے اس کے یہ ہو سکتے ہیں - کہ وہ شرارت کے مقابلہ میں شرارت سے کام نہیں لیتے - بلکہ ہمیشہ انصاف کو اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں - ایسا نہیں ہوتا کہ وہ شرارت کے مقابلہ میں انصاف اور راستی کو چھوڑ دیں - اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی الدَّارِ - عقبٰی عام طور پر عاقبت محمودہ کے معنے میں استعمال ہوتا ہے یعنی اچھا انجام جس کا بُرا انجام ہو - وہ گویا انجام ہی نہیں سمجھا جاتا -

ساتویں علامت

بدی کو دُور کرنے کے چار گر

بدی کی طاقت رکھتے ہوئے اس سے بچنا اصل عفت ہے

صبر

پانچویں علامت اقاموا الصلوٰۃ

چھٹی علامت خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ہے

عقبی الدار

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ

یعنی مستقل رہائش کے باغات۔ جن میں وہ (خود بھی) داخل ہونگے اور ان کے

اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ

بڑوں اور ان کی بیویوں اور ان کی نسلوں میں سے بھی جنہوں نے نیکی اختیار کی ہوگی۔ اور فرشتے

يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ

ہر ایک دروازہ سے ان کے پاس آئیں گے ۲۲ (اور کہیں گے) تمہارے لئے سلامتی ہے۔

عقبیٰ

الدار سے مراد جنّت ہے کیونکہ اصل گھر وہی ہے یہ دُنیا تو عارضی سفر ہے۔ پس اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ کے معنے ہوئے کہ آخرۃ میں بہتر انجام انہیں کا ہوگا۔

جنّٰت

۲۲ حل لغات۔ جَنّٰت۔ جَنَّةٌ کی جمع ہے۔ اور اَلْجَنَّةُ جَنَّ میں سے ہے۔ وَاَصْلُ الْجَنِّ سَتْرُ الشَّيْءِ۔ جَنّ کے اصل معنے کسی چیز کو ڈھانپنے کے ہیں یُقَالُ جَنَّهُ اللَّيْلُ چنانچہ جَنَّهُ اللَّيْلُ کا محاورہ انہی معنوں میں مستعمل ہے کہ رات نے اس کو ڈھانپ لیا۔ وَالْجَنَّةُ كُلُّ بُسْتَانٍ ذِي شَجَرٍ يَسْتُرُ بِاَشْجَارِهِ الْاَرْضَ۔ اور جنّت ہر اس باغ کو کہتے ہیں جس میں کثرت سے درخت ہوں۔ اور وہ درختوں کے جھنڈ سے زمین کو ڈھانپ لے۔ وَقَدْ تُسَمَّى الْاَشْجَارُ السَّاتِرَةُ جَنَّةً۔ اور ڈھانپنے اور چھپانے والے یعنی گھنے درختوں کو بھی جَنَّةٌ کہتے ہیں۔ وَسُمِّيَتِ الْجَنَّةُ اِمَّا تَشْبِيْهًا بِالْجَنَّةِ فِي الْاَرْضِ وَاِنْ كَانَ بَيْنَهُمَا بَوْنٌ۔ وَاِمَّا لِسَتْرِهِ نِعَمَهَا عَنَّا الْمُشَارِ اِلَيْهِ بِقَوْلِهٖ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ۔ اور جنّت کو اس لئے جنّت کے نام سے پکارا گیا ہے کہ یا تو وہ دنیاوی باغات کے مشابہ ہے۔ اگرچہ ان میں اور اس میں بہت فرق ہے یا اس وجہ سے کہ اس کی نعمتیں ہم سے پوشیدہ ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ میں فرمایا ہے۔ کہ جنت کی نعماء کا کسی کو علم نہیں (مفردات)

عَدْنٍ۔ عَدَنَ بِالْمَكَانِ عَدْنًا۔ اَقَامَ بِهٖ۔ عَدَنَ کے معنے ہیں کسی جگہ میں ٹھہرا۔ تَوَطَّنَهٗ۔ اس کو وطن بنایا۔ وَقِيْلَ مِنْهُ جَنّٰتُ عَدْنٍ اَيْ جَنّٰتُ اِقَامَةٍ لِمَكَانِ الْخُلُوْدِ اور بعض محققین لغت نے کہا ہے۔ وَجَنّٰتُ عَدْنٍ میں عدن اقامت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہ رہ پڑنے کے باغات۔ کیونکہ ان میں ہمیشہ رہا جائے گا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ عقبی الدار سے مراد وہ جنّات ہیں کہ جو ہمیشہ رہنے والی ہیں یا یہ مراد ہے کہ اولوالالباب ہمیشہ رہنے والی جنتوں کے وارث ہونگے وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ۔ اور ان کے ماں باپ اور ازواج اور اولادیں جو نیک ہونگے۔ وہ بھی ان کے ساتھ جنّات میں داخل ہوں گے۔ اس آیت میں ایک عظیم الشان اصلیّت اور صداقت کا اظہار کیا ہے۔ اس اصل اور صداقت کو صرف قرآن کریم نے ہی بیان کیا ہے۔ دنیا کی اور کسی کتاب نے اس مسئلہ کو نہیں لیا۔ دُنیا میں کوئی شخص کوئی ایسی نیکی اور بدی نہیں کرتا۔ جس میں دوسرے لوگ کسی نہ کسی رنگ میں شریک نہ ہوں۔ تاجر کی تجارت کی کامیابی۔ زراعت پیشہ کی زراعت کی کامیابی سینکڑوں ہزاروں دوسرے افراد کے دانستہ یا نادانستہ تعاون سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے زکوٰۃ مقرر کی ہے۔ اور اس طرح دوسرے لوگوں کا حق دلایا ہے۔ یہی حال دوسرے کاموں کا ہے مثلاً فرض

اس آیت میں ایک عظیم الشان اصلیت اور صداقت کا اظہار

جنّات میں مومنوں کے رشتہ داروں کے داخل کئے جانے کی وجہ۔

بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝ وَالَّذِيْنَ

کیونکہ تم ثابت قدم رہے پس (اب دیکھو کہ تمہارے لئے) اس گھر کا کیا ہی اچھا انجام ہے ۲۵ اور جو

کرو ایک شخص تبلیغ کے لئے جاتا ہے۔ تو اس تبلیغ میں اسکی بیوی کا حصّہ بھی ہے کیونکہ وہ اسکی عدم موجودگی میں بھی اسکے گھر اور اس کے بال بچہ کا انتظام کرتی ہے۔ انکی پرورش کرتی ہے۔ اگر وہ بال بچوں کی حفاظت نہ کرے۔ تو مبلغ کو تبلیغ کے لئے جانے میں بڑی دقت ہوگی۔ اسی طرح اگر والدین نے اچھی طرح تربیت نہ کی ہوئی ہو۔ تو وہ کس طرح دین کے کاموں میں حصّہ لے سکے گا۔ یا اگر اولاد والدین کو مطمئن نہ بیٹھنے دے۔ تو وہ کس طرح نیکیوں میں حصّہ لے سکتے ہیں۔ پس چونکہ انسان نیکیوں میں ترقی اپنے رشتہ داروں کی مدد سے کرتا ہے۔ اس کے انعام میں ان کا حصّہ رکھا۔ اور یہ قانون مقرر کیا۔ کہ سب خاندان میں جو سب سے اعلیٰ مقام کو حاصل کرے۔ دوسرے سب اس کے پاس ہی رکھے جائیں نہ کہ اپنے چھوٹے مقاموں پر۔ بشرطیکہ وہ نجات یافتہ ہوں۔

زوج کا لفظ جو اس آیت میں استعمال ہوا ہے۔ میرے نزدیک اس کے یہاں جوڑے کے معنے ہیں۔ یعنی ساتھی کے۔ نہ کہ مرد عورت کے۔ اور میرے نزدیک اس میں تمام وہ لوگ شامل ہیں جو نیکیوں میں اس کے ممد اور معاون ہوئے ہوں۔ نہ کہ صرف میاں اور بیوی اس سے عورتوں کے متعلق بھی سوال حل ہوجاتا ہے کہ وہ نبوت کے مقام پر کیوں نہیں پہنچائی جاتیں کیونکہ اس آیت سے نکلتا ہے۔ کہ نبی کی بیویوں کو بھی اس مقام پر رکھا جائے گا۔ جس مقام پر نبی ہونگے یعنی گو ان کی بناوٹ کے لحاظ سے ان کو دنیا میں نبی نہیں بنایا جاتا۔ لیکن وہ انہی انعامات میں شریک ہونگی۔ جو انبیاء کو ملیں گے اب دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک شخص ہیں۔ مگر عورتیں گیارہ ان کے ساتھ ان کے انعامات میں شریک ہونگی۔ اسی طرح نبی کا زوج صدیق ہوتا ہے۔ اور عورتوں کو صدیق کے درجہ پانے سے روکا نہیں گیا۔ اب جو عورتیں صدیقیت کے مقام پر پہنچ جائیں۔ وہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچائی جائینگی جس طرح تمام صدیق پہنچائے جائینگے کیونکہ وہ مرتبۂ صدیقیت کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں شامل ہونگی۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سے یہ بتانا مطلوب نہیں کہ جنّت بڑا مقام ہے اور اس کے بہت سے دروازے ہیں۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ اخلاق حسنہ اور نیکیاں کہ جنکی وجہ سے وہ جنّت میں داخل ہونگے۔ وہ اس جہان میں جنّت کے دروازوں کی شکل میں متمثل ہونگی۔

مومن کی نیکیوں میں انکے رشتہ دار بھی شریک ہوتے ہیں۔

۲۵ تفسیر۔ ہر دروازہ سے ملائکہ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ کہتے ہوئے داخل ہونگے۔ یعنی ان کو ملائکہ بتائیں گے۔ کہ تم فلاں نیکی کی وجہ سے اس دروازہ سے داخل ہوئے ہو۔ اور فلاں خلق فلاں دروازہ کی شکل میں متمثل ہے اور ان کو سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ کہیں گے یہ یاد دلانے کے لئے کہ تم نے جو نیکیاں کی تھیں ان کی وجہ سے اب تم پر ہر طرف سے سلامتی ہی سلامتی نازل ہوگی جس طرح تم نے ہر رنگ میں نیکی کی تھی۔ اسی طرح اب ہر رنگ میں تم پر سلامتیاں نازل ہونگی۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ کہنے کا مطلب

اس آیت میں زوج کے معنے ساتھی کے ہیں۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ دوام سلامتی پر دلالت کرتا ہے۔ اور بِمَا صَبَرْتُمْ کہہ کر اس دوام کی وجہ بھی بتا دی۔ جو یہ ہے کہ جس طرح تم استقلال سے نیکی پر قائم رہے۔ اور باوجود روکوں کے رُکے نہیں۔ ہم بھی اب دائمی سلامتی تم پر نازل کرینگے۔ اس آیت میں آریوں کے اس اعتراض کا جواب بھی آجاتا ہے کہ جب عمل محدود ہیں تو ثواب غیر محدود کس طرح مل سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ تم نے زندگی بھر نیکی کو نہ چھوڑا۔ تو اپنا فرض ادا کر دیا۔ موت کا آنا تمہارے بس کی بات نہ تھی۔ جب تک تمہارا بس تھا تم نے نیکی کے مقام کو نہ چھوڑا۔ اور عمل کرتے رہے۔ پس اب مجھ پر واجب ہے کہ میں تم کو ہمیشہ کی کامیابی اور سلامتی عطا کروں۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ دوام سلامتی پر دلالت کرتا ہے

يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ

اللہ کے (ساتھ کئے ہوئے) عہد کو اسے پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں ۔اور جس (تعلق) کے

مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ

قائم کرنے کا اللہ (تعالیٰ) نے حکم دیا تھا اسے توڑتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں

اُولٰۤىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۤءُ الدَّارِ ۝ اَللّٰهُ

ان کے لئے (اللہ کی جناب سے) دوری (مقدر) ہے اور (اسی طرح) ان کے لئے بُرا گھر (مقرر) ہے اللہ (تعالیٰ)

جو شخص تھوڑے تھوڑے ابتلاؤں پر گھبرا جاتا ہے وہ جنت کا مستحق نہیں ہوگا۔

اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ جو شخص تھوڑے تھوڑے ابتلاؤں پر گھبرا جاتا ہے اور حق پر قائم نہیں رہتا۔ وہ جنت کا مستحق نہیں ہوگا۔ جنت کا وہی شخص مستحق ہو سکتا ہے جو کسی ابتلاء پر گھبرائے نہیں اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ تعلق کو کبھی قطع نہ کرے۔ اور نیکیوں میں برابر لگا رہے۔

اسلام علیکم پر چکڑالویوں کے اعتراض کا جواب

چکڑالوی لوگ کہا کرتے ہیں۔ کہ قرآن کریم میں تو سلامٌ علیکم آتا ہے۔ پھر مسلمان السلام علیکم کیوں کہتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب ہم السلام علیکم کہتے ہیں۔ تو ہماری مراد اس سے یہ نہیں ہوتی۔ کہ تم پر سلامتی نازل ہو۔ بلکہ یہ مراد ہوتی ہے کہ خدا تعالےٰ تم کو وہ سلام سُننے کا موقع دے۔ جو قرآن کریم میں بیان ہُوا ہے۔ جیسے وہ سلام جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خاص سلام کی طرف اشارہ کیا جائے گا تو عربی کے قاعدہ کے مطابق السلام علیکم ہی کہا جائے گا۔

السلام علیکم کہنے سے یہ مراد ہے کہ اللہ تمہیں خاص سلام سننے کا موقع دے

اس آیت کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی سلام کا ذکر ہے مثلاً سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ۔ سورہ زمر کے آخر میں ہے۔ اور سورۃ یٰس میں ہے لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ۔ پس جب ہم السلام علیکم کہتے ہیں تو ہماری مُراد یہ ہوتی ہے کہ اے بھائی خدا تعالےٰ تم کو جنت میں داخل کرے۔ اور خدا تعالےٰ کے فرشتے حسب وعدہ ہر دروازے سے داخل ہوکر خدا تعالےٰ کا سلام تم کو پہنچائیں۔ جو اعلےٰ دعا اس طرح سے پہنچتی ہے وہ ہمارے مُنہ سے نکلے ہوئے سلام سے کہاں پہنچ سکتی ہے پس سلامٌ علیکم کی جگہ السلام علیکم ہی صحیح ہے +

۲۶ حل لغات۔ اَللَّعْنَةُ۔ لَعَنَهٗ لَعْنًا۔ طَرَدَهٗ وَاَبْعَدَهٗ مِنَ الْخَيْرِ لعن کے معنے ہیں۔ اس کو دھتکارا اور بھلائی سے دُور کیا۔ محروم کیا۔ وَاَخْزَاهُ وَسَبَّهٗ۔ اس کو ذلیل کیا اور اس کو گالی دی۔ اللعنةُ اسمٌ من اللعن۔ لعنة لعن کا اسم ہے۔ اور اس کے ایک معنی عذاب کے بھی ہیں (اقرب)

تفسیر۔ نقض اور عہد اللہ دونوں کو ملا کر دو باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ یعنی نیکیوں کو بھی چھوڑ دیتے ہیں اور بدیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور جن سے تعلق جوڑنے کا خدا نے حکم دیا تھا۔ ان سے قطع کرتے ہیں یعنی بجائے صلہ رحمی کے قطع رحمی کرتے ہیں۔ کوئی نظام قومی کو توڑتا ہے۔ کوئی انبیاء کے ساتھ تعلق پیدا کر نے کی بجائے انکی مخالفت کرتا ہے۔ کوئی شفقت علی الناس کو چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی اللہ تعالےٰ کو چھوڑتا ہے۔ یہ سب قطع کرنا ہے۔ ان باتوں کو جن کے ملانے کا اللہ تعالےٰ نے حکم دیا ہے۔

وصل کے مقابل پر افساد کے لفظ کے رکھنے کی وجہ

وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ۔ وصل کے مقابلہ میں افساد رکھا ہے یعنی صرف یہی نہیں کہ جن سے وصل اور ملاپ کرنے کا خداوند تعالےٰ نے حکم دیا ہُوا ہے۔ ان سے وصل نہیں کرتے بلکہ بجائے وصل کے وہ ظلم کرنے لگتے ہیں۔ اور قطع تعلق سے بڑھ کر مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا

جس کے لئے پسند کرتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور (جس پر چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے۔ اور یہ

بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ

(لوگ) اس ورلی زندگی پر (ہی) خوش ہو گئے ہیں۔ حالانکہ یہ ورلی زندگی آخرت کے مقابلہ میں محض ایک

اِلَّا مَتَاعٌ ۝ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ

وقتی سامان ہے۔ ۲۷؎ اور جن لوگوں نے (تمہارا) انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں۔ اس پر اس کے

عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ

رب کی طرف سے کوئی نشان کیوں نہیں اُتارا گیا۔ تو کہہ اللہ جسے چاہتا ہے ہلاک کر دیتا ہے

يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝ۖ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اور جو (اسکی طرف) مائل ہو۔ اسے اپنی طرف رہنمائی کرتا ہے ۲۸؎ یعنی جو ایمان لائے ہوں

ع ۴ ۹

اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ۔ چونکہ وہ خدا سے قطع تعلق کرتے ہیں اس لئے خدا تعالےٰ سے دُور کئے جائینگے لعنت کے معنی دُوری کے ہیں اور لعنت کا لفظ گالی کے طور پر استعمال نہیں ہُوا۔ بلکہ اس سے حقیقت بتائی گئی ہے کہ جو لوگ خدا تعالےٰ سے خود قطع تعلق کریں۔ انہیں قُرب کس طرح نصیب ہو سکتا ہے۔

۲۷؎ حل لغات يَقْدِرُ قَدَرَ سے ہے اور قَدَرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْاَمْرَ کے معنی ہیں قَضٰى وَحَكَمَ بِهٖ۔ اللہ نے کسی کام کا فیصلہ کیا۔ عَلَيْهِ الرِّزْقَ قَسَمَهٗ۔ رزق کو تقسیم کیا۔ ضَيَّقَهٗ رزق کو تنگ کیا۔ عَلَى الشَّيْءِ۔ جَمَعَهٗ وَاَمْسَكَهٗ۔ کسی چیز کو جمع کیا۔ اور اس کو روکے رکھا۔ (اقرب) پس اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ کے معنی ہوئے۔ اللہ جسے چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے۔ اور جس پر چاہتا ہے تنگ کرتا ہے

تفسیر۔ یعنی اگر یہ لوگ کہیں کہ دُنیا کی ترقی تو ہمیں ملی ہوئی ہے۔ اور اگلے جہان کی موہوم ہے۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم نے مان لیا۔ تو اگلے جہان کی ترقیات تو خدا جانے ملیں یا نہ ملیں جو کچھ ملا ہُوا ہے۔ وہ تو ہاتھ سے جاتا رہے گا پنجابی کی مثل ہے "ایہہ جہان مٹھا اگلا کس ڈٹھا"۔ یعنی یہ زندگی تو شیریں ہے۔ دوسری زندگی کسی نے دیکھی نہیں۔ کہ اسکی خاطر اسے تلخ کیا جائے اس وسوسہ کا جواب یہ دیا کہ دُنیا کی دولتیں اور حکومتیں اور ترقیات بھی تو اللہ تعالےٰ کے قبضہ میں ہیں۔ اگر وہ تم سے چھین کر محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے متبعین کو دیدے تو تم اسکو روک نہیں سکتے۔ بلکہ ہم تم کو بتا چکے ہیں۔ کہ عنقریب ہم یہ نعمتیں مخالفوں سے چھین کر محمد رسول اللہ صلعم کے متبعین کو دیدینگے۔ پس انکے ماننے سے دنیا کے نقصان کا نہیں دنیا کے فائدہ کا ہی احتمال ہے۔ اور اسکے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ لیکن بفرض محال محمد رسول اللہ صلعم کو ماننے سے دنیوی نقصان ہو بھی۔ تو بھی اسکی تعلیم میں قائم رہنے والے ایسے اصول نکو (؟) ہیں کہ انکے مقابل پر دنیا کی نعمتیں حقیقت کیا رکھتی ہیں۔ اس میں بتایا ہے کہ ذہنی اور فکری ترقیات مادی ترقیات سے جبکہ قوتِ عملیہ کو مُردہ نہ کر دیا جائے افضل ہوتی ہیں۔ کیونکہ مادی ترقیات ہمیشہ ان کے تابع ہوتی ہیں۔

لعنت کے معنے دھتکار کے ہیں

يَقْدِرُ

۲۸؎ حل لغات۔ يَهْدِيْ هَدٰى سے ہے۔ اور يَهْدِيْ

وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ

اور ان کے دل اللہ کی یاد سے اطمینان پاتے ہوں سُنو! اللہ کی یاد ہی سے

تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ؕ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

دل اطمینان پاتے ہیں ۵۲۹ جو (لوگ) ایمان لائے ہیں اور

هَدَاهُ الطَّرِيْقَ وَاِلَيْهِ وَلَهٗ کے معنے ہیں۔ بَيَّنَهٗ لَهٗ وَعَرَّفَهٗ بصراستہ دکھایا۔ بتلایا۔ اور واضح کیا۔ هَدٰى فُلَانًا۔ تَقَدَّمَهٗ اس کے آگے آگے چل کر منزلِ مقصود تک لے گیا۔ هَدَاهُ اللّٰهُ اِلَى الْاِيْمَانِ۔ اَرْشَدَهٗ ایماں کی طرف رہنمائی کی۔ (اقرب)

خدا تعالیٰ ہلاک اسی کو کرتا ہے جو اس سے دور بھاگتا ہے

اَنَابَ۔ اَنَابَ۔ نَابَ سے ہے۔ اور نَابَ اِلَيْهِ کے معنے ہیں رَجَعَ مَرَّةً بَعْدَ اُخْرٰى۔ بار بار لوٹا۔ اِلَى اللّٰهِ۔ تَابَ توبہ کی۔ نَابَ فُلَانٌ۔ لَزِمَ الطَّاعَةَ۔ اطاعت کو لازم پکڑا (اقرب) يَهْدِيْ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ کے معنے ہونگے۔ جو اس کی طرف مائل ہو۔ اسے اپنی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

تفسیر۔ چونکہ پہلی آیت میں ذکر تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ رزق چھین بھی سکتا ہے۔ اس پر کفار کا اعتراض بیان کیا۔ کہ جب انہیں خدا تعالیٰ کی ان طاقتوں کی طرف توجہ دلائی جائے۔ تو جھٹ کہتے ہیں۔ کہ بہت اچھا۔ اگر ایسا ہے۔ تو یہ نشان ہمیں دکھاؤ یعنی ہمارا رزق چھینا جائے تب مانیں۔

تَطْمَئِنُّ

اس کا جواب یہ دیا۔ کہ نشانات تو اللہ تعالیٰ کے بہت نازل ہوئے ہیں۔ لیکن تم ان سے فائدہ نہیں حاصل کرنا چاہتے اور صرف یہی مطالبہ کرتے ہو۔ کہ تم پر عذاب آئے۔ گویا رحمت کے نشان علمی نشان روحانی نشان سب بے حقیقت ہیں تمہارے نزدیک صرف یہی نشان ماننے کے قابل ہے کہ عذاب آجائے۔ حالانکہ تباہ کردینے والا عذاب آنے کے بعد ہدایت کا تو موقعہ ہی باقی نہیں رہتا۔ پھر اس نشان سے یہ کیا فائدہ اٹھائیں گے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے گناہوں کے سبب سے ہلاکت کے مستحق ہوگئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے تباہ کرنے کا فیصلہ کردیا ہے۔ ورنہ ہدایت کے نشانوں سے کیوں فائدہ نہ اٹھاتے۔ چونکہ اس جگہ شبہ پیدا ہوسکتا تھا کہ گویا خدا تعالیٰ زبردستی کسی کو گمراہ یا ہلاک کردیتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ خدا تعالیٰ بلا وجہ نہیں ہلاک کرتا۔ بلکہ اسکی سنت ہے۔ کہ جو اسکی طرف جھکے وہ اسے ہدایت دیتا ہے۔ ہلاک اسی کو کرتا ہے جو اس سے دور بھاگتا ہے۔ اور ہدایت قبول کرنے سے خود انکار کردیتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کا رد آگیا جو مشیئت کا لفظ دیکھ کر کہدیا کرتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کردیتا ہے۔ خدا تعالیٰ زبردستی گمراہ نہیں کرتا۔ بلکہ صرف اسے گمراہ کرتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ گمراہ قرار دیتا ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی طرف آنا چاہتا ہی نہیں۔

۵۲۹ حل لغات۔ تَطْمَئِنُّ۔ اِطْمَاَنَّ سے مضارع مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور اِطْمَئَنَّ اِلٰى كَذَا کے معنے ہیں سَكَنَ۔ وَآمَنَ لَهٗ۔ سکون پکڑا اور تسلی پائی۔ (اقرب) تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کے معنے ہونگے۔ دل آرام محسوس کرتے ہیں دل تسلی پاتے ہیں۔

تفسیر۔ لوگ مال کماتے ہیں۔ حکومتیں کرتے ہیں۔ انکو اچھی اولاد ملتی ہے۔ اچھی بیویاں ہوتی ہیں۔ اچھے دوست ملتے ہیں۔ تجارت میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ زراعت میں نفع حاصل کرتے ہیں علم میں کمال حاصل کرتے ہیں۔ غرضیکہ ہر چیز میں ترقی کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی دل مطمئن نہیں ہوتا۔ ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دو اور تکلیف دہ خواہشات دل میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور ہر وقت دل میں یہ احساس رہتا ہے۔ کہ گویا اصل چیز جسکی انہیں خواہش تھی۔ انہیں ابھی نہیں ملی۔ جس طرح کہ ایک بچہ جسکی ماں

جُدا ہوگئی ہو۔ کبھی کسی کی چھاتی سے لگتا ہے۔ کبھی کسی کی چھاتی سے مگر چین کسی جگہ نہیں پاتا۔ کیونکہ اسے وہ مقصود جسکی اسے تلاش تھی۔ حاصل نہیں ہوا یعنی اسکی حقیقی ماں اس کو نہیں ملتی۔ اسی طرح دنیوی ترقی کرنے والے لوگوں کا حال ہوتا ہے حدیث میں آتا ہے۔ کہ ایک جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو دیکھا۔ اس کا بچہ گم ہو گیا تھا۔ وہ جس بچہ کو دیکھتی تھی۔ اسے اپنی چھاتی سے لگا لیتی۔ پیار کرتی اور پھر اسے چھوڑ کر آگے چلی جاتی۔ آخر اس کو اپنا بچہ مل گیا اور اسے لے کر اطمینان سے بیٹھ گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو متوجہ کر کے فرمایا۔ کہ جیسے اس عورت کو اپنے بچے کے مل جانے سے خوشی ہوئی ہے۔ اس سے کئی گنا زیادہ اللہ تعالٰے کو خوشی ہوتی ہے۔ جب اس کا گنہگار بندہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کا ایک دوسرا سبق آموز پہلو بیان فرمایا ہے مگر میرا مقصد اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ ہے۔ کہ اس عورت کو کس قدر تڑپ تھی۔ جب تک اس کا اصلی مقصد نہیں ملا تھا۔ مگر جب مقصود ملا۔ تو اسے اطمینان حاصل ہو گیا۔ یہی حال ہر انسان کا ہے۔ اصلی مقصد کے ملنے کے ساتھ ہی تڑپ دُور ہو جاتی ہے اور اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ پس چونکہ اصل مقصد انسانی پیدائش کا خدا تعالٰے کی یاد اور اس کا ذکر ہی ہے۔ جب خدا مل جاتا ہے۔ تو کوئی جلن اور تڑپ نہیں رہتی۔ بلکہ اطمینان ہی رہتا ہے۔ جو لوگ دُنیا کی جستجو میں رہتے ہیں۔ ان کو جس قدر ترقی ملتی ہے۔ ان کی جلن بڑھتی جاتی ہے۔ مگر جو خدا تعالٰے کی طرف جاتا ہے اور جس قدر اسکی طرف متوجہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کے دل کا اطمینان بڑھتا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے اپنی ذات کی جستجو ہی ہماری زندگی کا اصل مقصد قرار دیا ہے۔ پس جب وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ انسان کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ ہماری ریاستوں کو ہی دیکھو۔ باوجود یکہ انکی حفاظت گورنمنٹ کے ذریعہ ہے۔ مگر بعض رؤسا کے ڈر کا یہ حال ہے۔ کہ ولایت سے بند ہو کر پانی آتا ہے ان کے سامنے کھولا جاتا ہے پھر بھی پہلے دوسروں کو پلایا جاتا ہے پھر راجہ صاحب پیتے ہیں۔ اسی طرح ان کا کھانا ہے۔ کہ ہزار احتیاطوں میں لگایا جاتا ہے۔ پھر اس سے پہلے خود اسی کو کھلایا جاتا ہے جو پکانے والا ہو۔ پھر اس کو ڈاکٹر کھاتا ہے۔ پھر ان کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ گویا ہر دم خطرہ ہے۔ اور احتیاط ہوتی رہتی ہے مگر دم بے چینی رہتی ہے۔ مگر ہمارے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو ہر طرف دشمن ہی دشمن ہیں۔ مگر کوئی خطرہ نہیں۔ اطمینان و سرور ہے۔ دشمن بھی اگر کھانے کی دعوت دیتا ہے۔ تو بے دھڑک چلے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک یہودن عورت نے زہر بھی دے دیا مگر پھر بھی اللہ تعالٰے کے الہام سے آپؐ کو یہ امر معلوم ہو گیا۔ اور آپؐ اس سے محفوظ رہے۔ آپؐ کو اس قدر اطمینان کیوں تھا؟ اسی وجہ سے کہ آپؐ نے ایک ایسی ہستی سے تعلق قائم کیا ہوا تھا جو غیب کو جانتی ہے۔ اور اس سے جب کسی کا تعلق ہو جاتا ہے۔ تو وہ اپنے غیب سے بندے کو بھی حسب ضرورت حصّہ دیتا رہتا ہے پس اس سے تعلق رکھنے والا مطمئن رہتا ہے۔ دینی ترقی میں اطمینان کی زیادتی اور دنیوی ترقی میں عدم اطمینان کی زیادتی کی ایک رُوحانی وجہ بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ دنیوی ترقی جس قدر انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کا مال زیادہ سے زیادہ مشتبہ ہوتا جاتا ہے۔ اور دوسرے لوگوں کا حصّہ اس میں زیادہ سے زیادہ شریک ہوتا جاتا ہے لیکن دینی ترقی کی یہ صورت نہیں دینی ترقی میں انسان کس قدر بھی ترقی کرے۔ وہ اپنا ہی حصّہ لیتا ہے دوسروں کا حصّہ نہیں مارتا۔ اسی کی طرف قرآن کریم میں دوسری جگہ اشارہ ہے کہ مومن کو جنّت ملتی ہے جسکی کیفیت یہ ہے کہ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (آل عمران ع ۱۴) یعنی جنّت کی تمام لمبائی چوڑائی ہر مومن کو حاصل ہوگی فرق صرف یہ ہوگا۔ کہ ہر مومن بقدر ذوق و استعداد اس سے فائدہ حاصل کر رہا ہوگا پس روحانی ترقی میں کسی کا حق مارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور چونکہ مومن کسی کا حق نہیں مارتا۔ اس کا دل مطمئن ہوتا ہے اور اس کی رُوح پر گناہ اور حق تلفی کا بوجھ نہیں ہوتا۔

۱؎ اصل مقصود ملنے سے تڑپ ختم ہو جاتی ہے۔

۱؎ انسانی پیدائش کا اصل مقصود خدا تعالیٰ کی یاد اور ذکر ہے۔

۲؎ چونکہ مومن کسی کا حق نہیں مارتا اسلئے اس کا دل مطمئن ہوتا ہے۔

الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ○ كَذٰلِكَ

اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں۔ ان کے لئے (بڑی) قابل رشک حالت اور بہترین واپسی کی جگہ (مقدر) ہے ۳۰ اسی لئے

اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ

ہم نے تجھے ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے کئی قومیں (آنے والے کی راہ دیکھتی) گزر چکی تھیں بھیجا ہے

لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ

تا کہ جو (کلام) ہم نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ تو وہ انہیں اس حالت میں پڑھ کر سنائے کہ وہ

يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۭ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا

رحمٰن (کے فیضان) کا انکار کر رہے ہیں۔ تو کہہ وہ میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں

هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ○ وَلَوْ اَنَّ

اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف (ہر آن) میرا رجوع ہے ۳۱ اور اگر کوئی

طُوْبٰى ۳۰ حل لغات طُوْبٰى مَصْدَرٌ بِمَعْنَى الطِّيْبِ۔ طُوْبٰى مصدر ہے جو طیب کے معنے دیتا ہے۔ اصلہٗ طُيْبٰى قُلِبَتِ الْيَاءُ وَاوًا لِسُكُوْنِهَا بَعْدَ ضَمَّةٍ۔ عربی کے قاعدہ کے مطابق یا واؤ سے تبدیل ہوگئی۔ نیز طیبۃٌ کی جمع ہے۔ اور اطیب کی تانیث ہے اور اس کے معنے ہیں۔ اَلْغِبْطَةُ رشک۔ اَلسَّعَادَةُ نیک بختی اَلْحُسْنٰى۔ اچھا انجام۔ الخیر بھلائی (اقرب) طوبٰی کی صفت محذوف ہے یعنی الحالۃ۔ معنے یہ ہونگے۔ کہ قابل رشک حالت۔ اچھی حالت۔

مَاٰب اَلْمَاٰبُ۔ المرجع۔ لوٹنے کی جگہ۔ المنقلب واپسی کی جگہ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی مومن کو نیکی اور سعادت حاصل ہوگی اور ایسے انعامات ملیں گے۔ جن سے بڑھ کر ذہن میں نہیں آ سکتے۔ اور آخری ٹھکانا نہایت اعلےٰ ہوگا اور اچھا وہی ہے جس کا انجام اچھا ہو۔

قوموں کی اصلاح کا ذریعہ توکل اور دُعا ہے۔

مَتَاب ۳۱ **حل لغات**۔ مَتَاب۔ تَابَ کا مصدر ہے اور تَابَ اِلَى اللّٰهِ مِنْ ذَنْبِهٖ کے معنے ہیں۔ رَجَعَ عَنِ الْمَعْصِيَةِ گناہ سے لوٹا۔ اور مَتَاب کے معنے ہوئے۔ گناہ سے لوٹ کر آنا۔ (اقرب) مَتَابِ۔ اصل میں مَتَابِیْ تھا۔ یاء کو حذف کر دیا گیا اور باء کے کسرہ پر اکتفا کیا گیا

تفسیر۔ کیا لطیف بات بیان فرمائی ہے کہ یہ عذاب مانگ رہے ہیں۔ مگر باوجود اسکے ہم اپنی رحمانیت کے ماتحت عذاب میں تاخیر ڈال رہے ہیں۔ پھر بھی یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رحمان نہیں ہے۔ اگر ہم رحمان نہ ہوتے تو تم کب کے تباہ ہو چکے ہوتے۔ تمہارا وہ کونسا عمل ہے جس کی وجہ سے تم بچے ہوئے ہو۔ آخر ہماری رحمانیت ہی تو تمہاری حفاظت کر رہی ہے۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ سے یہ بتایا ہے کہ جس قسم کے مطمئن دل والے اور اچھے انجام کا ذکر ہم نے کیا ہے۔ تیری بعثت اسی غرض سے ہے کہ ایسے اعلیٰ روحانی اور اخلاقی مقام والے لوگ تیرے ذریعہ سے پیدا ہوں۔

قُلْ هُوَ رَبِّيْ الآیہ میں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ لوگ اعتراض کرینگے کہ تم عرب جیسی سخت دل قوم کو کہاں اس قسم کا بنا سکو گے۔ مگر تم کہنا کہ یہ میرا کام تو نہیں خدا تعالیٰ کا کام ہے۔ میں اسپر توکل کروں گا۔ اور بار بار اسکی طرف جھکوں گا۔ تو یہ مقصد پورا ہو جائے گا۔

پس قومی اصلاح کا اصل ذریعہ توکل اور دُعا ہے۔ جو لوگ ظاہری اسباب سے دلوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ظاہری تغیر۴۴

۴۴ اسباب سے ظاہر ہی درست ہوسکتا ہے۔ دلوں میں ایمان اور اطمینان نہیں بھرا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ باوجود پوری سعی کے اخلاقی ترقی میں کوئی اعلےٰ معیار پیش نہیں کر سکا۔ جیسا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود سامان نہ میسر آنے کے صحابہ کے ذریعہ سے پیش کیا

قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ

ایسا قرآن ہو۔ جس کے ذریعہ سے (نشان کے طور پر) پہاڑوں کو (انکی جگہ سے ہٹاکر) چلایا گیا ہو۔ یا اس کے ذریعہ سے زمین کو ٹکڑے

اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ

ٹکڑے کیا گیا ہو یا اسکے ذریعہ سے مُردوں سے باتیں کی گئی ہوں (تو کیا یہ لوگ اس پر ایمان لے آئینگے) نہیں۔ بلکہ (ایسا ہونا یا نہ ہونا) معاملہ پورے طور پر اللہ

يَايْئَسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى

کے اختیار میں ہے پھر کیا جو (لوگ) ایمان لائے ہیں۔ انہیں (اب تک) معلوم نہیں ہُوا۔ کہ اگر اللہ (تعالیٰ) چاہتا۔ تو سب لوگوں کو

النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

ہدایت دے دیتا۔ اور (اے رسول) جن لوگوں نے (تمہارا) انکار کیا ہے ان کے (اس) عمل کی وجہ سے

تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا

ہمیشہ کوئی (نہ کوئی) سخت آفت ان پر آتی یا ان کے گھر کے قریب نازل ہوتی رہے گی

مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا

یہاں تک کہ اللہ (تعالیٰ) کا (آخری) وعدہ آجائے گا۔ اللہ (تعالیٰ)

يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ ع ۵ ۱

اس وعدہ کے خلاف ہرگز نہیں کرے گا ۳۲؎ اور یقیناً تجھ سے پہلے رسولوں سے استہزاء ہو گیا

۳۲؎ **حل لغات**۔ سُیِّرَتْ۔ سَیَّرَہٗ کے معنے ہیں۔ جَعَلَهٗ سَائِرًا۔ اس کو چلایا۔ سَيَّرَ الرَّحْلَ عَنْ ظَهْرِ الدَّابَّةِ۔ اَلْقَاہُ۔ سواری کا پالان اُتار کر زمین پر رکھ دیا۔ اَلْمَثَلَ۔ جَعَلَهٗ يَسِيْرُ بَيْنَ النَّاسِ کسی مثال کو لوگوں میں مشہور کیا۔ مِنْ بَلَدِہٖ۔ اَخْرَجَهٗ وَاَجْلَاہُ۔ کسی کو شہر بدر کیا۔ اور جلا وطن کیا۔

اَلْجِبَالُ۔ الجبل کی جمع ہے۔ اور اَلْجَبَلُ کے معنے ہیں كُلُّ وَتَدٍ لِلْاَرْضِ عَظُمَ وَطَالَ۔ زمین پر اونچے ٹیلے کو جبل کہتے ہیں خِلَافُ السَّهْلِ۔ پتھریلی زمین۔ سَيِّدُ الْقَوْمِ وَعَالِمُهُمْ۔ قوم کا سردار اور عالم۔ يُقَالُ فُلَانٌ جَبَلُ قَوْمِهٖ۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فلاں شخص اپنی قوم کا جبل ہے۔ یعنی سردار ہے یا قوم میں عالم کی حیثیت رکھتا ہے (اقرب) پس سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ کے معنی ہونگے۔ کہ اس کے ذریعے سے پہاڑ اپنی جگہ سے ہلا دئے جائیں یعنی زلزلے آئیں (۲) سردار یا عالم اُڑا دئیے جائیں۔ (۳) بادشاہتوں کو اُڑا دیا جائے۔ جبل کا لفظ روحانیات میں مشکلات پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اس لحاظ سے معنے ہونگے کہ مشکلات کو دُور کیا جاوے۔

سُیِّرَتْ

اَلْجِبَال

تُقَطِّعَتْ

قُطِّعَتْ۔ قَطَعَ کے معنی ہیں کاٹا۔ اور قَطَّعَ۔ قَطَعَ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قَطَّعَ میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اور قَطَّعَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْعَذَابَ کے معنے ہیں۔ لَوَّنَہٗ وَجَزَّاَہٗ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر قسم قسم کے عذاب نازل کئے۔ یہاں تک کہ اس کے بال سفید ہو گئے۔ اور جھتا ٹوٹ گیا۔ (اقرب) قَطْعُ الْاَرْضِ یعنے زمین کاٹنے سے مُراد یا تو یہ ہے کہ دشمنوں کا علاقہ کاٹ کر مسلمانوں کو دیا جائے گا۔ یا یہ تعلیم فوراً زمین کو طے کرتی ہوئی پھیل جائے گی۔

یَایْئَسْ۔ یَئِسَ سے فعل مضارع واحد مذکر کا صیغہ ہے۔ اور یَئِسَ کے معنے ہیں قَنَطَ۔ نا اُمید ہو گیا۔ عَلِمَ جان لیا۔ (اقرب)

آیت اَفَلَمْ یَایْئَسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا میں یَایْئَسْ کے معنے جاننے کے ہیں۔ یعنی کیا انہیں معلوم نہیں ہوا۔

اَلْقَارِعَۃُ

اَلْقَارِعَۃُ کے معنے ہیں۔ اَلدَّاھِیَۃُ۔ بلائے ناگہانی صدمہ۔ اَلْقِیَامَۃُ۔ قیامت۔ یُقَالُ قَرَعَتْھُمْ قَوَارِعُ الدَّھْرِ اَیْ اَصَابَتْھُمْ نَوَازِلُہُ الشَّدِیْدَۃُ۔ اور جب قَرَعَتْھُمْ قَوَارِعُ الدَّھْرِ کا محاورہ بولیں۔ تو یہ معنی مُراد ہوتے ہیں کہ ان کو سخت تکالیف پہنچیں۔ اَلنَّکْبَۃُ الْمُھْلِکَۃُ ہلاک کر دینے والی مصیبت۔ سَرِیَّۃُ النَّبِیِّ الْمُسْلِمِیْنَ آنحضرتؐ کے چھوٹے لشکر کو بھی قَارِعَہ کہتے تھے۔ قَارِعَۃُ الطَّرِیْقِ۔ معظمہ و اعلاہ۔ رستے کے اونچے بڑے حصہ کو بھی قَارِعَۃ کہتے ہیں۔

حَلَّ

حَلَّ الْمَکَانَ اور حَلَّ بِہٖ کے معنے ہیں۔ نَزَلَ بِہٖ کسی جگہ اُترا۔ بِہٖ فِی الْمَکَانِ۔ اَحَلَّہٗ اِیَّاہُ۔ اس کو کسی جگہ اُتارا۔ اَلرَّجُلُ۔ عَدَا۔ زیادتی کی۔ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی اگر کوئی ان صفات والا قرآن ہو۔ جو اس آیت میں بیان ہوئی ہیں۔ تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لائیں۔ یہ مراد نہیں کہ قرآن میں یہ صفات نہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ قرآن کریم سے یہ صفات ظاہر ہونگی۔ مگر پھر بھی یہ لوگ فائدہ نہ اُٹھائینگے جیسے حدیث میں ہے لَوْکَانَ الْاِیْمَانُ مُعَلَّقًا بِالثُّرَیَّا لَنَالَہٗ رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ۔ اس سے یہ مراد نہیں۔ کہ نہ ایمان ثریا پر چلا گیا ہے۔ اور نہ رجل فارس اسے واپس لائے گا۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ ایمان ایک دن ثریا سے معلّق ہو جائے گا۔ اور رجل فارس اسے واپس لائے گا۔ پس اس جگہ کفار کی سنگدلی ظاہر کرنی مقصود ہے۔

جو صفات اس جگہ قرآن کریم کی بتائی ہیں وہ یہ ہیں (۱) سُیِّرَتْ بِہِ الْجِبَالُ۔ اس کے ذریعہ سے پہاڑوں کو انکی جگہ سے ہٹا دیا جائے۔ ظاہری معنے لئے جاویں۔ تو مراد یہ ہوگی کہ اس میں شدید زلازل کی خبر دی گئی ہو۔ جن سے پہاڑوں کی چوٹیاں اپنی جگہوں سے ہل جائیں۔ قرآن کریم میں ایسی زبردست پیشگوئیاں مادی تغیرات کی موجود ہیں۔ جیساکہ سورۂ زلزال ہیں۔ اور اگر استعارہ مراد لیا جائے۔ تو معنے یہ ہونگے کہ بڑی بڑی مشکلات دُور کر دی جائیں کیونکہ پہاڑ استعارۃً مصیبت اور مشکل کو بھی کہتے ہیں۔ یہ صفت بھی قرآن کریم میں موجود ہے کہ علمی۔ اخلاقی۔ رُوحانی۔ تمدنی۔ اقتصادی سیاسی قومی مشکلات کا حل قرآن کریم نے ایسا کیا ہے۔ کہ کوئی دوسری کتاب اس میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور اگر جبل کے دوسرے معنے لئے جائیں۔ جو سردار قوم یا عالم کے ہیں۔ تو اس طرح بھی ٹھیک ہے کیونکہ قرآن کے ذریعہ سے پرانے سردار بھی اُٹھ گئے اور پرانے عالم بھی۔ اس نے سیادت کا بھی رنگ بدل دیا بادشاہت کی جگہ خلافت کو قائم کیا۔ اور علم کا پُرانا مفہوم جو وہم اور تخمین پر مبنی تھا۔ اسکی جگہ تجربہ مشاہدہ اور خواص اشیاء پر علم کی بنیاد رکھی۔ تمام قرآن کریم اس مضمون سے پُر ہے۔ کہ وہم کی جگہ فکر اور عقل سے کام لو۔ اور سیاروں، پہاڑوں دریاؤں، شہروں موسمی تغیرات اور خواص اشیاء کو اپنی آنکھوں سے دیکھو اور مشاہدہ سے اسکی حقیقت دریافت کرو۔ کہ یہ سب کچھ تمہارے فائدہ اور خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے پس قرآن کریم نے پرانی سیاست اور پُرانے علم کو بالکل بدل دیا اور دونوں امور کے متعلق نیا نقطۂ نگاہ دُنیا کے سامنے پیش کر کے گویا ایک نئی دنیا بسا دی۔

(۲) دوسری صفت قَطْعُ الْاَرْض بتائی۔ قطع ارض کے معنے مسافت کے چھوٹا ہو جانے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی وہ کتاب سب زمین میں آسانی سے پھیل جائے۔ اور یہ بھی کہ زمین اس کے ذریعہ سے کاٹ لی جائے۔ یعنی اسکی پیشگوئیوں کے مطابق دشمنوں کا علاقہ کاٹ کر مسلمانوں کو دے دیا جائے۔ یہ دونوں باتیں بھی قرآن کریم کو حاصل ہوئیں۔ یعنی آناً فاناً وہ دُنیا میں پھیل بھی گیا۔ اور اس نے اپنے ماننے والوں کے دلوں میں ایسا جوش پیدا کر دیا۔ کہ وہ قرآن ہاتھ میں لے کر سب دُنیا میں پھیل گئے اور ایک نسل کے اندر ساری دُنیا پر اس کے ماننے والے چھا گئے۔ اور یہ بھی ہوا کہ اسکی برکت سے اور اسکی پیشگوئیوں کے مطابق اسکے مخالفوں کے ملک کاٹ کاٹ کر مسلمانوں کی املاک میں شامل کر دیئے گئے۔

(۳) تیسری صفت یہ بتائی کہ اس کے ذریعہ سے مُردوں کو بُلوایا جائے۔ اس کے بھی کئی معنے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کی شہادت میں مُردے بولنے لگ جائیں۔ چونکہ مُردوں کا اس دُنیا میں زندہ ہونا قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس لئے ان معنوں کو مدِنظر رکھ کر اس کے یہ معنے ہونگے۔ کہ مُردے خواب میں آکر بولیں یا کشف میں بولیں۔

تجربہ شاہد ہے کہ لوگ اپنے آباء کی شہادت کو بہت مانتے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی دیکھا گیا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق کئی لوگ دلائل سے مان لیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ خواہش کرتے ہیں۔ کہ اگر رسول کریم صلعم کی زیارت ہو۔ اور وہ کہہ دیں تو ہم مان لینگے۔ یورپ میں اس وقت سپر چولزم کی طرف شدید میلان بھی اسی خواہش کی وجہ سے ہے۔ پس اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ بھی اپنے آباء سے شدید تعلق رکھتے ہیں۔ اور بظاہر دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے وفات یافتہ آباء کہہ دیں۔ تو ہم مان لینگے۔ لیکن جب آباء کی شہادتیں تورات انجیل سے پیش کی جائیں تو پھر انکار کر دیتے ہیں۔ یا حضرت ابراہیم کی شہادت مکہ والوں کو پیش کی جائے۔ تو بھی منکر ہی رہتے ہیں۔ یا پھر لوگوں کو خوابوں اور کشوف میں ان کے آباء آکر قرآن کریم کی صداقت

قطع ارض کے معنے۔

پر گواہی دیں۔ تب بھی ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی میں نے دیکھا ہے کہ کئی لوگ تو رؤیا پر ایمان لاتے ہیں۔ کئی لوگوں کو رسول کریم صلعم یا دوسرے بزرگ بھی رؤیا میں نظر آکر مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کی شہادت دے جاتے ہیں مگر لوگ نہیں مانتے۔ میں نے دیکھا ہے۔ کہ ہزارہا آدمیوں کو رؤیا اور کشوف میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سچائی وفات یافتہ بزرگوں کی زبانی بتائی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہی سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی تھا۔ مگر آج کل کی طرح اس زمانہ میں بھی کئی لوگ ان رؤیا اور کشوف سے فائدہ نہ اُٹھاتے تھے۔

مُردوں کے بلوائے جانے سے مراد روحانی مردوں کا زندہ ہو کر بولنا ہے۔

مُردوں کے بُلوائے جانے کے دوسرے معنے یہ ہو سکتے ہیں کہ جو لوگ رُوحانی مُردے تھے۔ قرآن کریم کے ذریعہ سے انہیں بُلوا دیا جائے گا۔ یعنی وہ صرف زندہ ہی نہ ہو جائیں گے بلکہ بولنے بھی لگیں گے۔ یعنی اعلیٰ علوم ان کی زبان پر جاری ہو جائیں گے۔ اور وہ دُنیا کے لئے ہادی ہو جائیں گے۔ قرآن کریم میں متواتر روحانیت سے محروم لوگوں کو مردہ کہا گیا ہے۔ اور انکے روحانیت حاصل کرنے کو زندگی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مثلاً فرماتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ (انفال ع۳) اے مومنو! جب خدا اور اس کا رسول تم کو زندہ کرنے کے لئے بلایا کریں۔ تو ان کی آواز کو قبول کیا کرو۔ پس معلوم ہوا کہ قرآنی اصطلاح کی رو سے رُوحانیت سے بُعد موت اور اس کا حصول زندگی کہلاتا ہے۔

سپر چولزم کی طرف میلان

ان معنوں کی رُو سے مُردوں کے بُلوا دینے کے معنے روحانیت سے دُور لوگوں کا اسلام لانا اور رُوحانیت میں ترقی کر کے دُنیا کے لئے ہادی ہو جانا لئے جائیں گے۔ چنانچہ اسکی مثالیں کثرت سے شروع اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ حضرت عمرؓ جیسے اشد مخالف جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے لئے گھر سے نکلے تھے اسلام لاکر انہوں نے کس قدر اسلام کے لئے قربانی کی اور اسلام کی اشاعت میں کس قدر حصہ لیا۔ ایسا ہی خالدؓ بن ولید جو بڑے مخالف اور دشمن تھے۔ بعد میں مسلمان ہو کر اسلام کے لئے

قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ

گیا تھا۔ جس پر میں نے ان لوگوں کو جنہوں نے انکار کیا (تھا ایک مدت تک) مہلت دی۔ پھر میں نے انہیں ہلاک کر دیا

فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ○ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى

اور (دیکھو) میری سزا کیسی (سخت) تھی ۵۳۳ تو کیا وہ (خدائے برتر) جو ہر

اسلام کے اشد ترین دشمنوں کا اسلام لانا۔

ایک نہایت مفید وجود ثابت ہوئے۔ ایسا ہی عکرمہ جو ابوجہل کے لڑکے تھے۔ اور اسلام کے خطرناک مخالف تھے۔ آخر اسلام لائے اور اشاعت اسلام میں جان تک کی پرواہ نہ کی۔

لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ سے مراد

بَلِ لِلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيعًا۔ سب امور خدا تعالےٰ کے ہی قبضہ میں ہیں یعنی مذکورہ بالا امور بظاہر ناممکن معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن تم دیکھ لوگے کہ کس طرح یہ نشان قرآن کریم کی تائید میں ظاہر ہوتے ہیں۔

اس آیت میں یا پئس کے معنی یعلموا کے ہیں۔

اَفَلَمْ يَايْئَسِ۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے يَايْئَسِ کے معنے اس جگہ يَعْلَمُ کے ہیں۔ یعنی کیا کفار کو یہ معلوم نہیں کہ خدا تعالےٰ کے اختیار میں ہے کہ سب کو ہدایت دے۔ اور آگے اس ہدایت کا وقت بتایا۔ کہ اس قوم پر عذاب پر عذاب آئیں گے۔ اور لشکر کے بعد لشکر چڑھائی کرے گا (قارعہ سے مراد لشکر ہے) اور آخری لشکر ان کے گھروں کے پاس جا کر اُترے گا یعنی مکہ پر حملہ ہوگا تب وہ اوپر کا وعدہ پورا ہوگا۔ یعنی یہ وعدہ کہ خدا چاہے تو سب کو ہدایت دے دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا متواتر اسلام اور اس کے دشمنوں میں جنگیں جاری رہیں۔ اور وہ لوگ جن کے متعلق پیشگوئی تھی کہ سب نشان دیکھ کر بھی نہ مانینگے۔ ہلاک ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اسلامی لشکر مکہ کے قریب جا اُترا۔ یعنی فتح مکہ کا دن آگیا۔ تب خدا کا وعدہ پورا ہُوا اور سب ہی کو اس نے ہدایت دے دی۔ تمام عرب ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسلام لے آیا۔ اللہ! اللہ! کیسی زبردست یہ پیشگوئی ہے۔ اور کس طرح تفصیلاً اسلام کی ترقی کا ذکر قبل از وقت کیا گیا ہے۔ جو لفظاً لفظاً پورا ہو کر قرآن کریم کی صداقت کا شاہد ہے

اُسْتُهْزِئَ

اَمْلَيْتُ

مگر افسوس کہ دل کے اندھے اب بھی ایمان نہیں لاتے۔ بلکہ خود مسلمان کہلانے والے ان علوم سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ خدا تعالےٰ یقیناً اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا کوئی وعدہ ہے جس کے متعلق فرمایا ہے کہ خدا تعالےٰ اپنے اس وعدے کے خلاف نہیں کرے گا سو وہ وعدہ وہی ہے جو دوسری جگہ فرمایا۔ کہ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ یعنی ہم ضرور تجھ کو معاد میں یعنی مکہ میں واپس لائیں گے۔ جو دُنیا کے لئے رُجوع کا مقام ہے یہ سورۃ مکّی ہے۔ اس میں اس آیت کا آنا کئی پیشگوئیوں کو اپنے اندر رکھتا ہے (۱) یہ کہ آپ مکہ سے ہجرت کرکے جائیں گے (۲) پھر وہاں سے مکہ واپس آئیں گے (۳) پھر یہ بھی کہ اس جانے کے بعد لڑائیاں ہونگی۔ ٹھکرانے والے لشکر حملہ آور ہوتے رہیں گے۔ (۴) حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے پاس آ اُتریں گے (۵) تب اللہ تعالےٰ کا وعدہ کامل طور پر پورا ہوگا۔ یعنی مکہ فتح ہوگا۔

۵۳۳ حل لغات

اُسْتُهْزِئَ۔ اِسْتَهْزَأَ سے مجہول کا صیغہ ہے اور اسْتَهْزَأَ۔ هَزَأَ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس کے معنے ہیں۔ سَخِرَ مِنْهُ۔ اس سے ٹھٹھا کیا (اقرب)

اَمْلَيْتُ۔ اَمْلٰى سے واحد متکلم کا صیغہ ہے اور اَمْلٰى فِىْ غَيِّهٖ کے معنے ہیں اَطَالَ لَهٗ۔ اس کو گمراہی میں مہلت دی۔ اَلْبَعِيْرَ وَسَّعَ لَهٗ فِىْ قَيْدِهٖ اونٹ کی رسّی کو لمبا کیا۔ وعبارۃ الاساس اَمْلَيْتُ الْقَيْدَ لِلْبَعِيْرِ اَرْخَيْتُهٗ وَ اَوْسَعْتُهٗ اور اساس میں اَمْلَيْتُ الْقَيْدَ لِلْبَعِيْرِ کے معنے یوں کئے گئے ہیں۔ کہ میں نے اونٹ کے باندھنے کی رسّی کو لمبا اور ڈھیلا کر دیا۔ اَللّٰهُ الظَّالِمَ

كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ

ایک شخص کا جو کچھ اس نے کمایا ہو اس کے مطابق نگران ہے (ان سے نہ پوچھے گا) اور انہوں نے (تو) اللہ

قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي

کے کئی ایک شریک (بھی) بنائے (ہوئے) ہیں (ان سے) کہو تم ان (نئے خداؤں) کے نام (تو) بتاؤ یا (کیا) تم (لوگ) اس

الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ

(یعنی خدا تعالیٰ) کو کوئی ایسی بات بتاؤ گے جو زمین پر (موجود) تو ہے لیکن وہ (اسے) نہیں جانتا یا کوئی اور کھلی بات (کہو گے؟ مگر)

كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَنْ

نہیں (تم کوئی ایسی بات نہیں بتا سکتے) بلکہ جن لوگوں نے انکار کیا ہے۔ ان کو ان کی (اپنی ہی) فریب کاری خوبصورت (شکل میں) دکھائی

يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ لَهُمْ عَذَابٌ

گئی ہے۔ اور انہیں (درست) راستہ سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اور جسے اللہ ہلاک کرے پھر اسے راہ دکھانے والا کوئی نہیں (مل سکتا) انکے لئے ایک عذاب

اَمْهَلَهٗ۔ اللہ نے ظالم کو مہلت دی (اقرب) پس اَمْلَيْتُ کے معنے ہونگے یعنے مہلت دی۔ ڈھیل دی۔ اَخَذَهُ اللّٰهُ اَهْلَكَهٗ۔ اللہ نے اسے ہلاک کیا۔ فُلَانًا بِذَنْبِهٖ۔ عَاقَبَهٗ عَلَيْهِ کسی کے گناہ پر اسے سزا دی (اقرب) اور اَخَذْتُهُمْ کے معنے ہونگے (۱) یعنے ان کو ہلاک کر دیا (۲) یعنے ان کو گناہوں پر سزا دی۔

تفسیر چونکہ کفار بار بار اعتراض کرتے تھے کہ عذاب فوراً کیوں نہیں آتا۔ اور ان کو جواب دیا گیا تھا کہ ہماری غرض ہدایت ہے۔ اس لئے ڈھیل کا دیا جانا ضروری ہے اب فرمایا کہ یہ ڈھیل کا دینا تیرے زمانہ کے منکروں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ کہ اعتراض ہو۔ بلکہ سب رسولوں کے زمانہ میں ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ منکرین کو ڈھیل ملتی رہی۔ اور فوراً انہیں پکڑے گئے۔ پس اگر کسی مدعی کے منکروں کو ڈھیل کا ملنا اس کے جھوٹ کی علامت ہے تو پھر پہلے نبیوں کو بھی نعوذ باللہ جھوٹا ماننا پڑے گا۔ مکہ والے کم از کم حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمعیلؑ کو تو ضرور سچا مانتے تھے اور ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو بے انتہا تکالیف دی گئیں حتیٰ کہ آگ میں ڈالا گیا۔ مگر خداوند تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو فوراً نہ پکڑا۔ بلکہ لمبی ڈھیل کے بعد پکڑا۔ آیت کے آخر میں اس امر کو بھی پیش کیا ہے کہ اصل میں دیکھنے والی بات یہ نہیں کہ ڈھیل کیوں مل رہی ہے۔ بلکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ منکرین جب پکڑے گئے تو ان کے ساتھ کیسا معاملہ ہوا کیا ان کا انجام نہایت عبرتناک نہیں ہوا۔ پھر ڈھیل پر کیا اعتراض ہے۔ ڈھیل پر اعتراض تو تب ہو۔ جب اس کا نتیجہ انبیاء کے حق میں مضر ہو۔ درمیانی ڈھیل تو بعثت انبیاء کی غرض یعنی خلق اللہ کی ہدایت کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

پہلے انبیاء کے منکروں کو ڈھیل دی گئی۔

منکرین کو ڈھیل دی جانی ضروری ہوتی ہے۔

۳۴ حل لغات۔ قَآئِمٌ قَامَ سے اسم فاعل ہے۔ اور قَامَ عَلَيْهِ کے معنے ہیں۔ رَاقَبَهٗ۔ اس پر نگہبان رہا۔ عَلَى غَرِيْمِهٖ۔ طَالَبَهٗ۔ اپنے قرضدار سے قرض کا مطالبہ کیا،

قَآئِمٌ

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰی کُلِّ نَفْسٍ اَیْ حَافِظٌ لَہَا (مفردات)
یعنی اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ میں قَآئِمٌ کے معنے محافظ و نگران کے ہیں۔ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ کے آگے یہ جملہ محذوف ہے۔ کَمَنْ هُوَ لَیْسَ بِقَآئِمٍ۔ اور معنے یہ ہونگے۔ کہ کیا وہ ذات جو نگہبان ہے اس جیسی ہو سکتی ہے جو نگہبان نہیں۔

تُنَبِّئُوْنَ۔ نَبَّأَ سے ہے اور نَبَّاہُ الْخَبَرَ وَ بِالْخَبَرِ کے معنے ہیں۔ خَبَّرَہٗ۔ اس کو خبر دی۔ یُقَالُ نَبَّأْتُ زَیْدًا عَمْرًا مُنْطَلِقًا۔ اَیْ اَعْلَمْتُہٗ یعنے زید کو بتایا کہ عمرو جا رہا ہے (اقرب) پس اَمْ تُنَبِّئُوْنَہٗ کے معنے ہوئے۔ کیا تم اسے بتاؤ گے۔

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ کا جواب محذوف ہے۔

تفسیر۔ اس آیت میں اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ کے جواب کا جملہ یعنی کَمَنْ هُوَ لَیْسَ بِقَآئِمٍ محذوف ہے۔ اور یہ عربی زبان کا عام قاعدہ ہے کہ مقابل کا فقرہ لفظاً چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور معناً اسے مدنظر رکھ لیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ذات جو انسانی اعمال میں سے چھوٹے سے چھوٹے عمل کو ضائع نہیں جانے دیتی اور سب کے نتائج پیدا کرتی ہے اور جس کے ہاتھ سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اس جیسی ہو سکتی ہے۔ جس میں یہ طاقت نہیں؟ قَآئِمٌ عَلٰی کُلِّ نَفْسٍ کے معنے ہیں کہ نگران کے طور پر سر پر کھڑا ہے۔ کوئی اس سے دُور نہیں۔ اور اس کی گرفت سے بھاگ نہیں سکتا۔ پس اسے سزا میں جلدی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سزا میں جلدی تو وہ کرتا ہے جس میں طاقت نہیں ہوتی۔ اور جو اپنے مخالف کو پکڑ لینے پر ڈرتا ہے کہ میں نے فوراً سزا نہ دی۔ تو شاید ہاتھ سے نکل جائے۔ اور پھر میں اس پر قدرت نہ پاؤں۔ جب اللہ تعالےٰ ہر وقت قادر ہے۔ اور پوری طرح قادر ہے۔ تو وہ کمزوروں کی طرح جلدی کیوں کرے۔ پس ان کو سزا کی تاخیر پر ہنسنے یا تعجب کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں تو اس امر کا محاسبہ کرنا چاہیئے کہ آیا یہ خدا تعالےٰ کے مجرم ہیں یا نہیں۔ اگر خدا تعالےٰ کے مجرم ہیں۔ تو پھر بے فکری اور خوشی کی کوئی وجہ نہیں۔

شرک کے خلاف ایک زبردست دلیل۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَکَآءَ سے بتایا۔ کہ اگر یہ اپنے عقائد اور اعمال پر غور کریں۔ تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ اس ذات کے مجرم ہیں، جو سب کام خود کر رہی ہے۔ اور کسی کی امداد کی محتاج نہیں لیکن یہ اس کے شریک مقرر کر رہے ہیں۔ پس جب یہ اپنی ذات میں سزا کے مستحق ہو چکے ہیں۔ تو یہ خیال ہی کس طرح کر سکتے ہیں۔ کہ انہیں سزا نہیں ملے گی۔

قُلْ سَمُّوْهُمْ۔ قرآن مجید کا قاعدہ ہے کہ جب کسی اہم مسئلہ کا ذکر ضمنی طور پر بھی ہو۔ تو وہ اس کی تفاصیل پر روشنی ڈال دیتا ہے۔ اس جگہ پر جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَکَآءَ دراصل اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ کے مضمون کی تشریح کے طور پر لایا گیا تھا۔ لیکن چونکہ شرک کا ذکر آ گیا۔ اس لئے اس عقیدہ کی بیہودگی ثابت کرنی ضروری سمجھی۔ چنانچہ شرک کے ردّ میں فرمایا۔ قُلْ سَمُّوْهُمْ اگر شرکاء ہیں تو ذرا ان کے کام تو بتاؤ سَمُّوْهُمْ سے یہ مراد نہیں کہ نام بتاؤ کیونکہ نام تو بتوں کے انہوں نے رکھے ہی ہوئے تھے۔ خود قرآن کریم نے بھی کئی نام گنائے ہیں پس مُراد اسماء ذات نہیں بلکہ صفاتی نام ہیں ایک اور جگہ پر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَا (نجم ع ۱) یہ بُت جن کو تم معبود قرار دیتے ہو نام ہی نام ہیں اور ہے کیا یعنی ان میں کوئی صفات تو ہیں نہیں۔ آیت زیر تفسیر میں بھی یہی مُراد ہے کہ ان شرکاء کے ذرا کام تو بتاؤ۔

یہ ایسی زبردست دلیل ہے۔ جس کا کوئی مشرک جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اگر وہ یہ کہے کہ مثلاً اس بُت کا کام بیٹا دینا ہے تو اس میں سب صفات الٰہیہ ماننی پڑینگی کیونکہ بیٹا دینے کے لئے ایک طرف تو رحم کی اصلاح کی ضرورت ہوگی اور دوسری طرف اگر مادہ تولید میں نقص ہے تو مرد کی اس مرض کو دُور کرنا ہوگا۔ اور اس کے لئے غذاؤں اور دواؤں اور ان کے اثرات پر تصرف ضروری ہے۔ اور جب ایک بُت کو یہ بات حاصل ہوگی تو پھر ماننا پڑے گا کہ غذاؤں پر بھی اسے تصرف حاصل ہے اور انسانی مشین کا چلانے والا دواؤں کے اثرات کو قبضہ میں رکھنے والا بھی وہی بُت ہے نہ کہ خدا۔ اور دواؤں کا اثر اجرام فلکیہ کے اثر کے تابع ہے۔ اس لئے اس کا تصرف اجرام فلکیہ

پر بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ایسا ہی پھر اس کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ اُسے علم غیب ہو۔ورنہ وہ کیسے جانے گا۔کہ مریض کے موجودہ حالات میں اس کے لئے فلاں دوا ہی مفید ہے۔اور پھر اسے صرف عالم الغیب ہی نہیں۔بلکہ معلّم بھی ہونا چاہیئے تا وہ حکیم کے ذہن میں یا اسکی بیوی یا خود اس مریض کے ذہن میں یہ بات پیدا کرے کہ اس کو یہ چیز کھلاؤ یا تم کو یہ چیز کھانی چاہیئے۔جس سے مادہ تولید درست ہوگا۔وغیرہ۔

غرض جب تک تمام صفات نہ ہونگی۔صرف کوئی ایک صفت کام نہ کرسکے گی۔اور اگر باقی تمام صفات بھی اس میں مان لی جائیں۔تو پھر خدا جیسا ایک دوسرا خدا ماننا پڑے گا۔اور یہ تسلیم کرنا ہوگا۔کہ دنیا کا کارخانہ ہزاروں خدا جن میں سے ہر اک آزاد طور پر اس کارخانہ کو چلا سکتا ہے ملکر چلا رہے ہیں اور یہ ایسا فضول کام ہے کہ معبود تو الگ رہا عام انسان کے بارہ میں بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

مینے ایک مرتبہ ایک عیسائی سے پوچھا کہ دُنیا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اس نے جواب دیا۔کہ مسیح نے۔مینے کہا۔کیا خدا میں بھی طاقت ہے۔کہ دُنیا کو پیدا کرسکے؟ اس نے کہا۔ہاں۔ مینے کہا۔پھر کیا وہ معطّل اور بے کار بیٹھا ہے؟ اس نے کہا۔ نہیں وہ بھی پیدا کر رہا ہے۔اور پھر یہی بات رُوح القدس کے متعلق کہی۔تب مینے ان سے کہا۔کہ آپ کے سامنے اپکی میز پر ایک پنسل پڑی ہے۔اگر آپ اپنے نوکر سے کہیں کہ یہ پنسل مجھے اُٹھا دو۔اور وہ جاکر دو اور آدمیوں کو بھی بلا لائے اور پھر تینوں ملکر اس پنسل کو اُٹھا کر آپ کے سامنے لانے کی کوشش کریں۔تو آپ ان کو کیا سمجھیں گے؟ اس نے کہا پاگل مینے کہا۔جب ہر ایک خدا الگ الگ دُنیا کو پیدا کرسکتا تھا تو پھر یہ تین ملکر اس کام کو کیوں کر رہے ہیں۔جسے ایک ہی کر سکتا تھا۔گھبرا کر بولا۔اصل میں تثلیث کا مسئلہ ایسا باریک ہے۔کہ انسان کی عقل میں نہیں آسکتا۔یہ سَمُّوْهُم والی دلیل ہی تھی۔کہ جسے مینے استعمال کیا۔اور پادری بالکل حیران رہ گیا۔

عربی محاورہ کے رو سے سَمُّوْهُمْ کے دوسرے معنے یہ بھی ہوسکتے ہیں۔کہ ان کی حقیقت ہی کیا ہے۔عربی میں حقارت کے لئے کہتے ہیں۔سَمِّهِ۔اس کا نام تو لو۔مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی ذلیل چیز ہے کہ اس کا نام لیتے ہی تم شرمندہ ہو جاؤ گے۔ہوسکتا ہے۔کہ یہاں بھی ان معنوں میں سَمُّوْهُمْ کہا گیا ہو مطلب یہ کہ ذرا نام تو لو۔نام لیتے ہی خود ہی شرمندہ ہو جاؤ گے۔اُردو میں نام لینے کی بجائے کہتے ہیں "مُنہ تو دکھا"

اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ۔شرک کے خلاف دوسری دلیل یہ دی ہے۔کہ اگر کوئی خدا کا شریک ہوتا۔تو اس کی خبر خدا کی طرف سے آنی چاہیئے تھی۔جیسا کہ ڈپٹی کمشنر گورنمنٹ مقرر کرتی ہے تو وہی اعلان کرتی ہے۔نہ یہ کہ ضلع کے لوگ۔یعنی اگر خدا نے ان کو اپنا شریک بنایا تھا۔تو ان کے لئے کوئی نبی آتا۔اور اعلان کرتا۔کہ یہ خدا کے شریک ہیں۔یا فرشتے اُترتے۔اور وہ اعلان کرتے۔مطلب یہ کہ یا لواسطہ اعلان ہوتا۔یا بلاواسطہ اور یا پھر کم از کم وہ شریک خود ہی یہ اعلان کرتے۔کہ ہمیں خدا نے اپنا شریک مقرر کیا ہے۔مگر یہاں تو ان تینوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں۔اس لئے فرمایا۔کہ کیا تم اللہ کو اطلاع دیتے ہو۔جس بات کا اسے زمین میں علم نہیں؟ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ اس کے دو معنے ہیں (۱) اَمْ تَقُوْلُوْنَ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ۔یعنی یہ بات تم صرف زبان سے کہتے ہو۔دل میں اس کے منکر ہو۔دل میں اسکی عظمت نہیں۔کیونکہ دل میں کسی چیز کی عظمت دلیل سے پیدا ہوا کرتی ہے۔معنے یہ ہوئے کہ جو کچھ کہہ رہے ہو۔کیا خود تمہارے دل اس کو مانتے ہیں؟ اس طرح فطرت سلیمہ سے اپیل کی جو بسا اوقات نہایت کامیاب طریقہ صداقت کی طرف لانے کا ہوتا ہے۔

دوسرے معنے یہ بھی ہوسکتے ہیں۔کہ اسکی کوئی نقلی دلیل بتاؤ۔کیا کوئی خدا کا کلام یا اس کی وحی ہے جس کی بنا پر تم

اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ میں شرک کے خلاف دوسری دلیل۔

ایک پادری سے اُلوہیت مسیح کے متعلق سوال۔

اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ کے دو معنے۔

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ج

(تو) اس ورلی زندگی میں (ہی مقدر) ہے اور آخرت کا عذاب یقیناً اور (بھی) سخت ہوگا۔

پہلے توحید تھی بعد میں شرک پیدا ہوا

ایسا کہتے ہو لیکن جب کوئی بھی صورت نہیں۔ تو انہیں شریک قرار دینا کیونکر درست ہوسکتا ہے۔

سَمُّوْهُمْ کہہ کر یہ بتایا تھا۔ کہ ان بتوں میں کوئی ذاتی کمال نہیں۔ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ میں عقلی دلیل اور الٰہی شہادت کی عدم موجودگی بیان فرمائی ہے۔ اور بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ میں نقلی دلیل کا بھی انکار کیا ہے۔ اور فطرت کی شہادت کا بھی۔

بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ۔ جب انسان کوئی فریب کرتا ہے۔ اور لوگوں کو دھوکا دے کر ٹھگنا چاہتا ہے۔ تو آہستہ آہستہ وہ خود اور اس کی اولاد بھی اس فریب کا شکار ہو جاتی ہے۔ زُيِّنَ کا محذوف فاعل خدا تعالےٰ نہیں۔ بلکہ ان کے اپنے نفس ہیں۔ یعنی پہلے تو بعض لوگ دوسروں کو لوٹنے کے لئے شرک کا ڈھکوسلا بناتے ہیں مگر آخر کار خود بھی انہیں وہ بات اچھی لگنے لگ جاتی ہے۔ اور اولاد تو اس وہم کا بالکل ہی شکار ہو جاتی ہے۔

صُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ۔ یعنی جب وہ خدا کے تعلق کو چھوڑتے ہیں۔ تو شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انسان بغیر ساتھی کے نہیں رہ سکتا۔ خدا کو چھوڑنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ پھر چھوٹی چھوٹی چیزوں کا سہارا ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اور اسی طرح شرک پیدا ہو جاتا ہے۔ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا۔

قرآن مجید اور کمپیرٹیو ریلیجن کے ماہرین کا اختلاف

اس مسئلہ میں قرآن مجید اور کمپیرٹیو ریلیجن کے ماہرین کا اختلاف ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ پہلے توحید تھی۔ بعد میں شرک پیدا ہوا۔ مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے شرک تھا۔ آہستہ آہستہ خدا کا خیال پیدا ہوا۔ اور توحید دنیا میں آئی۔

مشاہدہ اور تاریخ ہماری تائید میں ہیں۔ مسلمان اور یہودی پہلے موحد تھے۔ یورپ کے لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل توحید کی تعلیم دی تھی۔ مگر آج مسلمان اور یہودی دونوں کامل توحید کے بعد مشرک بن گئے۔ اسی بات کو اس جگہ بیان کیا ہے کہ جب انہوں نے خدا سے تعلق توڑ لیا۔ تو مخلوق کا سہارا ڈھونڈنے لگے۔ اس طرح سے شرک شروع ہوگیا۔ میں کہتا ہوں جس طرح یہود اور مسلمانوں میں توحید کے بعد شرک پیدا ہوا۔ کیوں نہ تسلیم کیا جائے کہ اسی طرح ابتداء عالم میں توحید تھی۔ پھر بگڑ کر لوگ مشرک ہوگئے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ کے معنی

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ۔ (۱) جس کے متعلق اللہ تعالےٰ گمراہ ہونے کا فیصلہ کردے۔ اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں۔ (۲) جس کو خدا تعالےٰ ہلاک کرے اس کو کامیابی کا راستہ دکھانے والا کوئی نہیں۔

اَضَلَّ کے تین معنی

اضلّ کے تین معنے ہوتے ہیں۔ ہلاک کیا یا گمراہ کیا۔ یا گمراہ قرار دیا۔ چونکہ قرآن مجید کی رو سے گمراہ کرنا خدا کا کام نہیں۔ بلکہ ہدایت کرنا خدا کا کام ہے۔ جیسے اس سورۃ کے چوتھے رکوع میں آچکا ہے کہ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا۔ اگر اللہ تعالےٰ چاہتا۔ تو سب کو ہدایت ہی دیتا۔ پس گمراہ کرنے کے معنے تو کئے نہیں جاسکتے۔ دوسرے دونوں معنے باقی رہ جاتے ہیں۔ ہلاک کرنا یا گمراہ قرار دینا۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ چونکہ خدا تعالےٰ عالم الغیب ہے وہ اسی کو گمراہ قرار دے گا۔ جس نے اپنے لئے سب راہیں ہدایت کی بند کر لی ہونگی۔

اسی مضمون پر مزید روشنی آیت وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (بقرۃ ع ۳) سے بھی پڑتی ہے یعنے خدا تعالےٰ کا کلام بدوں کو گمراہ قرار دیتا ہے۔ نہ کہ نیکوں کو۔

وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ

اور انہیں اللہ (تعالیٰ کے عذاب) سے کوئی بھی بچانے والا نہیں ہوگا۔ اس جنت کا (مثالی) بیان جس کا

وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ

پرہیزگاروں کو وعدہ دیا گیا ہے۔ (یہ ہے کہ) اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی

اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ

اس کا پھل (بھی) ہمیشہ رہنے والا ہوگا اور اس کا سایہ (بھی) ۔ یہ ان (لوگوں) کا انجام ہوگا۔ جنہوں نے تقوےٰ

وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ

اختیار کیا (ہوگا) اور انکار کرنے والوں کا انجام (دوزخ کی) آگ ہے ۵۳۵ اور جن (لوگوں) کو ہم نے

۵۳۵ حل لغات - اَشَقُّ۔ شَقَّ سے ہے اور شَقَّ کے معنے ہیں۔ صَدَعَہٗ اس کو پھاڑا۔ فَرَّقَہٗ۔ ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ علیہ الامرُ شقًّا صَعُبَ۔ معاملہ مشکل ہوگیا۔ عَلٰی فُلَانٍ۔ اَوْقَعَہٗ فِی المشقۃ۔ کسی کو مشقت میں ڈال دیا (اقرب) اَشَقُّ کے معنے ہوئے بہت سخت۔

اَلْمَثَلُ۔ الشِّبْہُ۔ مشابہ النظیرُ۔ نظیر۔ اَلصِّفَۃُ۔ بیان الْحُجَّۃُ۔ دلیل۔ یُقَالُ اَقَامَ لَہٗ مثلًا اَیْ حُجَّۃً اور اَقَامَ لَہٗ مَثَلًا میں مثلًا دلیل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ....

الحدیث۔ عام بات۔ اَلْقَوْلُ السَّائِرُ۔ ضرب المثل۔ الاٰیۃ۔ نشان۔ جنۃ کے معنوں کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۵۲۲

تفسیر - جیسا کہ حل لغات میں بیان ہوچکا ہے جنت اس زمین کو نہیں کہتے جس میں درخت ہوں۔ بلکہ اصل میں سایہ کرنے والی چیز کو کہتے ہیں۔ پس تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ سے مراد یہ ہوئی کہ باغوں کے اندر درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہونگی گویا اس سے ایک تو پانی کے قرب کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے اس طرف اشارہ کیا۔ کہ وہ خود نہروں کے مالک ہوں گے۔

اشقّ

نہر۔ سہولت سے چلنے والے پانی کو کہتے ہیں۔ پس نہر سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہاں انہیں بے روک ٹوک ترقیات حاصل ہونگی۔ نیز نہر سے وسعتِ عمل پر بھی دلالت ہوتی ہے۔ کیونکہ دس بیس گھماؤں زمین کے لئے نہر نہیں جاری کی جاتی بلکہ وسیع رقبوں کے لئے جاری کی جاتی ہے پس اس سے اشارہ کیا گیا ہے کہ مومن کے اعمال بہت وسیع ہوتے ہیں۔ وہ کنوئیں کے مینڈک کی طرح محدود نگاہ نہیں رکھتا۔ پھر جمع کا لفظ انہار بولکر یہ بھی بتا دیا۔ کہ نہر کے لفظ سے جن فوائد کی طرف اشارہ ہے۔ وہ کئی اقسام کے ہونگے۔

نہر سے وسعت عمل پر دلالت ہوتی ہے

المثل

نہر کا لفظ روحانی عالم میں عمل کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے پس بتایا ہے کہ جس طرح مومن کے عمل مختلف اور کئی اقسام کے ہوتے ہیں۔ ویسے ہی روحانی عالم میں ان کا تمثل بھی کئی نہروں کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اور ہر قسم کے عمل کے مقابل پر ایک نہر جاری ہوگی اور ہر وقت مومن کو توجہ دلاتی رہے گی۔ کہ یہ تمہارا فلاں عمل کام دے رہا ہے۔

نہر کا لفظ روحانی عالم میں عمل کی جگہ استعمال ہوتا ہے

اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا۔ ظِلُّهَا میں یہ بتایا ہے کہ وہاں خزاں کبھی نہ آئے گی پتے ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی جنت کی راحتوں اور نعمتوں میں وقفہ نہ ہوگا بلکہ ہمیشہ ہی رہیں گی۔

اَلْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ

کتاب دی ہے وہ اس (کلام الٰہی) سے جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے خوش ہوتے ہیں۔ اور ان (مختلف) گروہوں میں سے

مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ

(بعض) ایسے (بھی) ہیں۔ جو اس کے بعض (حصہ) کا انکار کرتے ہیں۔ تم کہو مجھے (تو) یہی حکم دیا گیا ہے۔ کہ میں اللہ کی عبادت کروں

وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ○

اور (کسی کو) اس کا شریک نہ ٹھہراؤں۔ میں اسی کی طرف (تم کو) بلاتا ہوں۔ اور اسی کی طرف میں (بھی) رجوع کرتا ہوں ۵۳۶

اُکُل سے باطن کو راحت ہوتی ہے اور ظل سے ظاہر کو۔

پھر اُکُلُهَا دَآئِمٌ وَظِلُّهَا میں یہ بھی اشارہ ہے کہ ظاہری اور باطنی نعمتیں قائم رہیں گی۔ اکل سے باطن کو راحت ہوتی ہے۔ اور ظل سے ظاہر کو۔

وَعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ۔ انہوں نے اپنی روحانی ترقیات کو مدنظر نہ رکھا۔ بلکہ دوسروں کے پیچھے چل پڑے اور کہہ دیا کہ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا پر ہم قائم رہیں گے گویا ان کی زندگی اپنے لئے نہ رہی دوسروں کے لئے ہو گئی اس لئے فرمایا۔ ہم بھی تمہیں آگ میں ڈالیں گے جو دوسروں کو فائدہ دیتی ہے اور خود جلتی ہے۔

اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ سے مراد مسلمان بھی ہو سکتے ہیں۔

الاحزاب

۵۳۶ حل لغات۔

اَلْاَحْزَابُ۔ اَلْحِزْبُ کی جمع ہے۔ اور اَلْحِزْبُ کے معنے ہیں اَلطَّائِفَةُ۔ گروہ جَمَاعَةُ النَّاسِ لوگوں کی جماعت۔ جُنْدُ الرَّجُلِ وَاَصْحَابُهُ الَّذِيْنَ عَلٰى رَأْيِهٖ۔ ایسے دوست اور ساتھی جو ہم خیال اور ہم رائے ہوں۔ النَّصِيْبُ۔ حصہ۔ كُلُّ قَوْمٍ تَشَاكَلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاَعْمَالُهُمْ فَهُمْ اَحْزَابٌ وَاِنْ لَّمْ يَلْقَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا۔ تمام وہ لوگ جن کے اعمال اور دل آپس میں مشابہ ہوں۔ اگرچہ وہ آپس میں ملے نہ ہوں۔ احزاب کہلاتے ہیں (اقرب)

ینکر کے دو معنے

مکی زندگی میں بعض اہل کتاب ایمان لے آئے تھے

تفسیر۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ مکی زندگی کے دوران میں بھی بعض اہل کتاب ایمان لے آئے تھے وَالَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ میں جن لوگوں کی خوشی کا ذکر کیا ہے میرے نزدیک وہ نجاشی اور اس کے ساتھی تھے۔ جو ہجرت حبشہ کے وقت سے ہی ایمان لا چکے تھے۔ حضرت جعفرؓ نے جب ان کو قرآن مجید سنایا تو نجاشی نے کہا کہ میرا بھی یہی ایمان ہے۔ مگر چونکہ ابھی ان کا ایمان ظاہر نہ ہوا تھا۔ وہ صرف مومنوں کی ترقیات کو دیکھ کر ہی خوش ہوتے تھے۔ اس لئے يُؤْمِنُوْنَ نہیں فرمایا۔ بلکہ يَفْرَحُوْنَ فرمایا ہے اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ کہ وہ اسلام کی ترقی کی بشارتوں اور اپنے نیک انجام کی خوشخبریوں کو پا کر خوش ہوتے ہیں۔ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ۔ احزاب سے مراد وہ تمام قومیں ہیں۔ جو نبی کی مخاطب ہوتی ہیں۔ مگر ایمان نہیں لاتیں اس میں یہودی۔ عیسائی مشرک اور دوسری تمام اقوام مراد ہیں۔

ینکر کے دو معنے ہیں۔ ایک انکار کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یا عجیب سمجھتے ہیں بعضہ اس لئے فرمایا۔ کہ جو حصے ان کے مطابق تھے۔ ان سے وہ خوش ہوتے تھے۔ صرف اپنے مذہب یا خیالات کے مخالف حصوں پر ہی ان کو اعتراض تھا۔

قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ سے یہ بتایا کہ ہر نبی کی تعلیم کا مرکزی نقطہ توحید ہوتا ہے۔ اسی نقطہ کے گرد میری تعلیم چکر لگا رہی ہے۔ پھر میں اس کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ دوسرے ینکر بعضہ سے جو اس طرف

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ

اور اسی طرح ہم نے اسے ایک مفصل حکم کی صورت میں اُتارا ہے اور اگر (اے مخاطب) تو نے

اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ

اس علم کے بعد جو تجھے حاصل ہو چکا ہے ان (کفار) کی پیروی کی تو

مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا ع ۵ ۱۱

اللہ کے مقابلہ میں نہ (تو) تیرا کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا (ہوگا) ۳۷؎ اور ہم نے

اشارہ تھا کہ کفار قرآن کریم کے بعض حصہ کو بدلوانا چاہتے تھے۔ اس کا بھی جواب دیا۔ کہ میں تو تابع ہوں۔ جو حکم ہوتا ہے کہتا ہوں۔ خدا کے کلام کے بدلنے کا مجھے کہاں حق ہو سکتا ہے۔ اگر میں اس کو بدلوں تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ میں خدائی کا دعویدار ہوں۔ بس یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کیونکہ مجھے تو حکم ہی یہی ہے۔ کہ میں ایک خدا کی عبادت کروں۔

اِلَيْهِ اَدْعُوْ سے بتایا کہ میرا تو شروع سے دعویٰ ہے۔ کہ میں اپنی ذات میں کچھ نہیں۔ صرف خدا تعالےٰ کی طرف بلانے والا ہوں۔ پھر میں تمہاری ناپسندیدگی پر اس قرآن کریم میں کیونکر تبدیلی کر سکتا ہوں۔

اِلَيْهِ مَاٰبِ۔ میں بتایا کہ میرا سارا معاملہ خدا کے ساتھ پیش آنا ہے تو میں اسکی نافرمانی کیسے کر سکتا ہوں۔ تم مانو نہ مانو۔ مجھے اس سے کیا غرض۔ مانو گے تو خود فائدہ اُٹھاؤ گے نہ مانو گے تو میرا کیا نقصان ہے۔ پس میں تمہاری خوشی کے لئے خدا تعالےٰ کے کلام میں تبدیلی کس طرح کر سکتا ہوں۔

۳۷؎ حل لغات۔ عَرَبِيًّا۔ اَعْرَبَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں۔ اَبَانَهٗ وَاَوْضَحَهٗ۔ کسی چیز کو خوب بیّن اور واضح کر دیا۔ عَنْ حَاجَتِهٖ۔ اَبَانَ عَنْهَا۔ حاجت کو کھول کر بیان کیا۔ كَلَامَهٗ۔ حَسَّنَهٗ وَاَفْصَحَ وَلَمْ يَلْحَنْ فِي الْاِعْرَابِ بات میں حسن پیدا کیا۔ اور اُسے خوب واضح کیا۔ اور تلفظ میں بھی کوئی غلطی نہ کی بِحُجَّتِهٖ۔ اَفْصَحَ بِهَا۔ اپنی بات کھول کر مدلّل طور پر بیان کی۔ اور مفردات راغب میں ہے اَلْاِعْرَابُ اَلْبَيَانُ کہ اعراب کے معنے بات کو کھولنے اور خوب واضح کرنے کے ہیں۔ پس حُكْمًا عَرَبِيًّا کے معنے ہوئے مفصل حکم۔ عَرَبِيًّا کی مزید تشریح کے لئے دیکھو یوسف ۳؎

اَهْوَآءَ ۲

اَهْوَآءَ هَوٰى کی جمع ہے۔ اور اَلْهَوٰى کے معنے ہیں اِرَادَةُ النَّفْسِ۔ ارادہ۔ خواہش۔ فُلَانٌ اِتَّبَعَ هَوَاهُ اِذَا اُرِيْدَ ذَمُّهٗ۔ اور جب فُلَانٌ اِتَّبَعَ هَوَاهُ کا محاورہ بولتے ہیں۔ تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی خواہشات کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اور یہ بول کر مذمت مقصود ہوتی ہے۔ (اقرب)

اِلَيْهِ اَدْعُوْا کا مطلب

تفسیر۔ عَرَبِيًّا کے لفظ میں صرف عربی ہونا مراد نہیں کیونکہ عربی تو ہر عرب بولتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے الفاظ میں معانی کی ایسی وسعت ہے۔ کہ سوائے خدا تعالیٰ کے اس وسعت کو کوئی پیدا نہیں کر سکتا۔ پس اگر اسے بدلا جائے تو فوراً اسکی شان میں کمی آجائے گی۔ کہتے ہیں کسی امیر نے ایک ادیب سے کہا کہ قرآن کی مثل تو بناؤ۔ اس نے کہا۔ اس کے لئے فارغ دماغ چاہیئے۔ عمدہ باغ عمدہ مکان اور فراغت کی ضرورت ہے امیر نے سب کچھ مہیا کر دیا۔ نوکر چاکر دے دیئے۔ وہ عمدہ لباس پہنتا۔ عیش کرتا۔ اور خوب سیر کرتا رہتا۔ چھ ماہ کی مقررہ میعاد کے بعد جب اس امیر نے سوال کیا کہ کیا کچھ تیار کیا۔ تو ادیب نے

۲ عَرَبِيًّا کے لفظ سے عربی ہونا مراد نہیں

۱ عَرَبِيًّا

رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ

تجھ سے پہلے (بھی) یقیناً کئی رسول بھیجے تھے اور انہیں بیویاں اور بچے (بھی) دیئے تھے

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ

اور کسی رسول کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اللہ (تعالیٰ) کے اذن کے سواء (اپنی قوم کے پاس) کوئی نشان لاتا

اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ

ہر زمانہ کی انتہا کے لئے (خدا تعالیٰ کی طرف سے) ایک (خاص) حکم ہوتا ہے ۳۸ جس چیز کو اللہ (تعالیٰ) چاہتا ہے مٹاتا ہے

کاغذوں کا ایک انبار دکھا کر کہا۔ کہ میں اس عرصہ میں فارغ نہیں بیٹھا رہا۔ میں نے دیانتداری سے کام کیا ہے۔ اور یہ ڈھیر اس کی شہادت ہے۔ مگر قرآن کی مثل مجھ سے نہیں بن سکی۔ کیونکہ جو آیت نکالتا ہوں۔ اس میں لکھا ہوتا ہے۔ ہم یوں کر دینگے۔ تیرے دشمنوں کو یوں تباہ کیا جائے گا۔ اور تیرے دوستوں کو یوں ترقی دی جائے گی۔ مگر میں ان باتوں میں سے کوئی بھی نہیں لکھ سکتا۔ میں تو روٹی بھی تیری کھاتا ہوں۔ پس مجھ سے قرآن کی مثل نہیں بن سکی۔

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَاب کے معنے۔

عَرَبِيًّا کا یہی مطلب ہے۔ کہ اس میں غیر معمولی وسعتِ مضامین رکھی گئی ہے۔ جو انسانی طاقت سے بالا تر ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ میں ہر مخاطب بھی مراد ہے اور آنحضرتؐ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ۔ اس میں ہر مخاطب بھی مراد ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی مراد ہو سکتے ہیں اور اس صورت میں شان ایزدی کا اظہار ہوگا۔ کہ تیری اپنی کوئی ہستی نہیں۔ یہ نَے تو اسی وقت تک دل لبھانے والی آواز سے بجتی ہے جب تک کہ آسمانی بادشاہ کے منہ میں ہے اس کے منہ سے ہٹا لو۔ تو خالی لکڑی ہی لکڑی ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔

اَلْاِذْنُ

۳۸ حل لغات - اَلْاِذْنُ کے معنے ہیں اَلْاِجَازَةُ۔ اجازت۔ اَلْاِرَادَةُ۔ ارادہ۔ اَلْعِلْمُ۔ علم (اقرب)

اَلْاَجَلُ

اَلْاَجَلُ کے معنے ہیں۔ مُدَّةُ الشَّيْءِ کسی چیز کی مدت۔ وَوَقْتُهُ الَّذِي يَحِلُّ فِيْهِ کسی امر کی وہ مدت جب جاکر وہ واقعہ ہوتا ہے (اقرب)

اَلْكِتَاب

اَلْكِتَابُ کے معنے ہیں اَلْحُكْمُ۔ حکم۔ اَلْفَرْضُ۔ فرض۔ اَلْقَدَرُ۔ قدر۔ اندازہ (اقرب) لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ کے معنے ہوئے ہر مدت کے لئے فیصلہ الٰہی میں حکم موجود ہے۔ کتاب کی اجل نہیں کہا۔ بلکہ اجل کی کتاب کہا ہے۔ یعنی ہر عمل کا نتیجہ نکلنے کے لئے ایک خاص حکم ہے۔ ایک خاص وقت ہے۔

تفسیر - اس آیت میں پہلے مضمون کو دُہرایا ہے یعنی جو مضمون پہلے رکوع میں آیا تھا۔ اسی کو آخر میں دوبارہ بیان کیا ہے۔ جو یہ ہے کہ جس قسم کے حالات میں پہلے رسول آتے رہے۔ اُنہی حالات کے ماتحت تو آیا ہے۔

کفار کا یہی سوال تھا کہ تُو بے سامان آیا ہے۔ سو اس کا یہ جواب فرمایا۔ کہ تجھ سے پہلے بھی جو رسول ہم نے بھیجے تھے وہ بھی تو اسی طرح بے سامان ہی آئے تھے ان کے ساتھ بھی تیری طرح انسانی حاجتیں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے بھی بیوی بچے تھے۔ جن کی پرورش کا انہیں انتظام کرنا پڑتا تھا جسمانی ذمہ داریاں تھیں۔ جنہیں ادا کرنا پڑتا تھا۔ مگر باوجود حاجات کی موجودگی کے اور سامانوں کے فقدان کے وہ کامیاب ہوئے۔

بیوی بچوں کا ذکر یہ بتانے کے لئے کیا۔ کہ آزاد انسان زیادہ دلیری سے قربانی کر سکتا ہے۔ لیکن بیوی بچے کام میں قدم قدم پر روک ہوتے ہیں۔ پس گویا دوہری روکیں انکے راستہ میں بھی تھیں اوّل سامان نہ تھے۔ پھر جو سامان بشر

وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ

اور (جسے چاہتا ہے) قائم کرتا ہے اور اسی کے پاس (تمام) احکام کی اصل (اور جڑ) ہے ۳۹ اور جس (عذاب کے بھیجنے) کا ہم ان سے

تھے۔ ان کے استعمال میں بھی بیوی بچوں کی وجہ سے رکیں تھیں۔ مگر پھر بھی وہ کامیاب ہوئے۔ اسی طرح اب محمد رسول اللہ صلعم کامیاب ہوں گے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا۔ کہ گو ہم نے انہیں کامیاب کیا۔ اور یہ عظیم الشان صداقت کا نشان ان کو ملا لیکن ہم نے یہ نہیں کیا۔ کہ ان کے لئے لوگوں کی مرضی کے مطابق نشان دکھایا ہو۔ جو نشان ہم نے مناسب سمجھا۔ وہ دکھایا۔ قرآن کریم میں جہاں کفار کی طرف سے نشان کے مطالبہ کا ذکر ہو۔ اور ساتھ تشریح نہ ہو۔ وہاں نشان سے مراد عذاب ہوتا ہے۔ پس اس جگہ بھی عذاب ہی مراد ہے۔ اور چونکہ اس جگہ سوال پیدا ہوتا تھا۔ کہ اگر خدا تعالیٰ نے نبیوں کو دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا۔ تو کیا روک تھی۔ کہ ان کے ہاتھوں میں سزا بھی رکھ دیتا۔ تاکہ لوگوں کو حق کی مخالفت کی جرأت نہ رہتی۔ آخر دنیوی حکومتیں بھی تو اپنے ماتحتوں کو ایک حد تک سزا کا اختیار دیتی ہیں۔ اس کا جواب لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ کے الفاظ میں دیا جس کا یہ مطلب ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی حالت کا اندازہ لگا کر نہ صرف یہ فیصلہ کیا ہے کہ کس کس عمل کی کیا کیا پاداش چاہیئے۔ بلکہ یہ بھی کہ کس عمل کا نتیجہ کس وقت نکلنا اس شخص اور دوسرے شخصوں کے لئے زیادہ مفید ہوگا۔ اور ہر سزا کے لئے اس نے ایک وقت مقرر کر چھوڑا ہے۔ اگر وہ سزا نبیوں کے ہاتھ میں رکھتا۔ تو وہ چونکہ عالم الغیب نہ ہوتے۔ وہ سزا لوگوں کے مطالبہ پر دیکر اس حکمت کو باطل کر دیتے۔ دنیوی حکومتوں اور آسمانی حکومت میں یہ بھی ایک فرق ہے کہ دنیوی حکومتیں جُرم کے مطابق سزا تجویز کرکے ہر جرم پر سزا دے دیتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ صرف یہی نہیں دیکھتا کہ کس نے جُرم کیا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ اس جرم کی سزا کو کس وقت جاری کیا جائے۔ تو زیادہ مؤثر یا زیادہ مفید ہوگی۔ یہ ایک اہم سوال ہے۔ کہ سزا کا وقت سزا کے اثر کو بہت کچھ بڑھا گھٹا دیتا ہے۔ اور اس لئے کامل اور بے عیب فیصلہ وہی ہو سکتا ہے جس میں سزا کی تعیین ہی نہ ہو۔ بلکہ سزا کے وقت کو بھی حکمت کے ماتحت معین کیا جائے۔

اس آیت کو مفسرین نے بڑا غلط سمجھا ہے انہوں نے اس میں تقدیم تاخیر مانی ہے۔ اور اس کے یہ معنی سمجھے ہیں کہ ہر کتاب کے لئے ایک وقت ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کو تقدیم و تاخیر کی ضرورت نہیں۔ جو لفظ اس آیت میں ہے جس ترتیب سے ہے۔ وہی صحیح ہے۔ کتاب کی اجل نہیں بتائی بلکہ اجل کی کتاب کا ہی ذکر ہے۔ اور کوئی تقدیم و تاخیر نہیں بلکہ یہ فرما کر کہ ہر مدت کے لئے فیصلہ الٰہی میں حکم موجود ہے ایک نہایت لطیف اور جدید مضمون پر روشنی ڈالی ہے جس کا ذکر اجمالاً اوپر آ چکا ہے۔

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ میں تقدیم و تاخیر نہیں۔

خلاصہ یہ کہ نبیوں کو سزا جزاء کا اس لئے اختیار نہیں دیا۔ کہ وہ عالم الغیب نہیں۔ اور نہیں جان سکتے تھے کہ کس وقت کونسا حکم جاری ہونا چاہیئے۔ آیا سزا کا یا عفو کا یا تاخیر سزا کا۔ اگلی آیت اسی مضمون کی تصدیق کرتی ہے۔

۳۹ حل لغات۔ يَمْحُو۔ مَحَا سے مضارع کا صیغہ ہے اور مَحَا الشَّیْءُ کے معنے ہیں۔ زَالَ وَذَهَبَ اَثَرُهٗ کوئی چیز مٹ گئی۔ اور اس کا نشان جاتا رہا مَحَا الشَّیْءَ۔ اَزَالَهٗ وَاَذْهَبَ اَثَرَهٗ کسی چیز کو مٹایا اور اس کا اثر دُور کیا۔ یعنی مَحَا کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے (اقرب)

يَمْحُو

يُثْبِتُ۔ اَثْبَتَ ماضی سے مضارع کا صیغہ ہے اور اَثْبَتَ کے معنے ہیں۔ عَرَفَهٗ حَقَّ الْمَعْرِفَةِ کسی بات کو خوب واضح کیا۔ حَبَسَهٗ وَجَعَلَهٗ ثَابِتًا فِی مَكَانِهٖ لَا يُفَارِقُهٗ کسی چیز کو اس کی جگہ پر ایسا مضبوط کیا۔ کہ وہ اپنی جگہ سے علیحدہ نہ ہو سکے۔ الحق

يُثْبِتُ

بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا

وعدہ کرتے ہیں۔ اگر ہم اس کا کوئی حصہ (تیرے سامنے بھیج کر) تجھے دکھا دیں (تو تو بھی انکا انجام دیکھ لیگا) اور (اگر) ہم (اس گھڑی سے پہلے تجھے وفات

اُمُّ الکتاب کے دو معنے

اَکَّدَہٗ۔ حق کو پختہ کیا۔ اِثْمُہٗ فِی الدِّیْوَانِ۔ کتبہٗ۔ نام رجسٹر میں لکھا (اقرب) پس یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ کے معنے ہوئے کہ جسے چاہتا ہے۔ مٹاتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے۔ قائم رکھتا ہے یعنی اگر چاہتا ہے۔ عذاب دیتا ہے اگر چاہتا ہے عذاب ٹال دیتا ہے۔

اَلْاُمُّ

اَلْاُمُّ کے معنے ہیں۔ اَلْوَالِدَۃُ۔ ماں۔ اُمُّ الشَّیْءِ اصلہ کسی چیز کا اصل۔ اُمُّ الطَّرِیْقِ۔ معظمہٗ۔ راستے کا فرخ حصہ۔ (اقرب) اُمُّ الْکِتَابِ کے معنے ہوئے کتاب کی اصل۔ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ سے یہ مراد ہے (۱) کہ احکام کی حکمت خدا کو معلوم ہے۔ (۲) تمام احکام شریعت صفات الٰہیہ پر مبنی ہیں پس شریعت کی جڑ گویا خدا تعالیٰ کے پاس ہے۔ کیونکہ شریعت کے احکام اسی کی صفات کی شاخیں ہیں۔

تفسیر۔ یہ کبھی نہیں ہوتا۔ کہ عذاب کا وقت نہ آیا ہو مگر اللہ تعالیٰ پھر بھی عذاب دے دے۔ ہاں یہ ہوجاتا ہے۔ کہ عذاب کا وقت تو آجائے۔ مگر اسکی کسی حکمت کے ماتحت وہ عذاب ٹل جائے۔ عذاب کے متعلق دو قانون بیان فرمائے ہیں۔ ایک یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ دوسرے وَیُثْبِتُ یعنے یا عذاب کو مٹا ڈالتا ہے۔ عذاب دیتا ہی نہیں۔ یا عذاب کو قائم رکھتا ہے۔ مگر بغیر استحقاق کے عذاب کبھی نہیں آتا۔ نہ استحقاق سے زیادہ آتا ہے۔ استحقاق کی حد تک عذاب دینا یا اس سے کم دینا۔ یہ اصول ہمیشہ آسمانی عذابوں میں مدنظر رہتا ہے۔ اور یہی اصل ہر شخص کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ جو با اخلاق بننا چاہے۔ جو لوگ غصہ کی حالت میں دشمن کو پیس کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔ یا عفو کرنا نہیں چاہتے۔ وہ صفات الٰہیہ کے خلاف چلتے ہیں۔ اور کبھی سچے مسلمان نہیں کہلا سکتے۔

عذاب کے متعلق دو قانون

نیکی کی تعریف

اُمّ کے معنے جڑ کے ہیں پس عِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ کے دو معنے ہوں گے۔ (۱) احکام کی حکمت خدا تعالیٰ کو ہی معلوم ہے۔ اس لئے اسی کی ہدایت سے تم صحیح راستہ معلوم کرسکتے ہو۔ انسان اپنی ذاتی اغراض اور نفسانی خواہشات کے اثر کے نیچے کبھی بھی اس قدر بلند نہیں ہوتا۔ کہ تمام عالم کی ضرورت کو مدنظر رکھ سکے۔ وہ جو احکام تجویز کرتا ہے نفسانیت سے ملوث ہوتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی نظر سب عالم کی ضرورت اور آئندہ نتائج پر بھی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا حکم کامل اور صحیح ہدایت کے مطابق ہوتا ہے۔ دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ تمام احکام شریعت صفات الٰہیہ پر مبنی ہیں۔ پس شریعت کی جڑ گویا خدا تعالیٰ کے پاس ہوئی۔ کیونکہ شریعت کے احکام اسی کی صفات کی شاخیں ہیں۔ اس میں یہ لطیف نکتہ بیان کیا ہے۔ کہ اخلاق کامل اللہ تعالیٰ کی صفات کی کامل اتباع اور پوری نقل کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتے جو شخص اچھے یا برے اخلاق کی تشریح انسانی اعمال کو سامنے رکھ کر کرنا چاہے۔ کامیاب نہ ہوگا۔ نیکی کی تعریف یہی ہے۔ کہ صفات الٰہیہ کی نقل ہو۔ اور بدی کی تعریف یہی ہے۔ کہ صفات الٰہیہ کے مخالف ہو۔ اس تعریف سے وہ سب مشکلات حل ہوجاتی ہیں۔ جو فلسفیوں کو نیکی اور بدی کی تعریف کرنے میں پیدا ہوتی ہیں۔ تیسرے معنے یہ ہیں۔ کہ چونکہ احکام کا مقصد اسی کو معلوم ہے اس لئے سزا اسی کے اختیار میں ہونی چاہیئے کئی شدید دشمن بعد میں ایمان لے آتے ہیں۔ جیسے اسلام میں عکرمہؓ۔ خالدؓ اور عمروؓ بن عاص کے وجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی جانتا تھا۔ کہ باوجود اسلام کی مخالفت کے وہ لوگ عذاب سے بچانے کے قابل ہیں کیونکہ کسی دن اسلام کی عظیم الشان خدمات کا موقع پائینگے

عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا

دیدیں) تو تجھ بعد الموت اسکی حقیقت معلوم ہو جائیگی کیونکہ) تیرے ذمہ (ہمارے حکم اور پیغام کا) صرف پہنچا دینا ہے۔ اور (انکا) حساب لینا ہمارے ذمہ ہے ۱۴۰

اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ

اور کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ہم ملک کو اس کی (تمام) اطراف سے کم کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور فیصلہ

يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

(تو) اللہ (تعالیٰ) کرتا ہے کوئی اس کے فیصلہ کو تبدیل کرنے والا نہیں۔ اور وہ جلد حساب لینے والا ہے ۱۴۱

۱۴۰ حل لغات۔ نَتَوَفَّيَنَّكَ۔ ہم تجھے وفات دے دیں۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ یونس ۴۷۔ بَعْضُ كُلِّ شَيْءٍ کے معنے ہیں اٰنۓ طَائِفَةٌ مِنْهُ ساری چیز کا ایک بڑا حصہ۔ وَقِيْلَ جُزْءٌ مِنْهُ۔ اور بعض محققین کے نزدیک کسی چیز کے ایک تھوڑے سے حصہ پر بھی بَعْضٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ وَيَجُوْزُ كَوْنُهٗ اَعْظَمَ مِنْ بَقِيَّتِهٖ كَالثَّمَانِيَةِ مِنَ الْعَشَرَةِ۔ اور بعض کا لفظ کسی چیز کے بڑے حصہ کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے جیسے دس میں سے آٹھ کو بعض کہیں۔ حالانکہ آٹھ بقیہ دو سے بہت زیادہ ہیں (اقرب) تو اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ کے معنے یہ ہوئے کہ اگر وعدے کا کوئی حصہ ہم تجھے دکھا دیں۔ زیادہ ہو یا کم۔

تفسیر۔ یعنی جب ہماری سزا کا اصل ہی اصلاح اور انصاف ہے۔ نہ کہ غصہ نکالنا۔ تو پھر اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ عذاب کی بعض پیشگوئیاں ٹل جائیں۔ ہو سکتا ہے۔ کہ بعض پیشگوئیاں جو عذاب کے متعلق ہیں۔ پوری ہو جائیں اور تو انہیں دیکھ لے۔ اور بعض ٹل جائیں۔ مگر اس سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ آخری حساب تو اللہ تعالیٰ نے ہی کرنا ہے۔ جو لوگ ان ٹل جانے والی پیشگوئیوں پر اعتراض کرنے والے ہیں۔ وہ آخر خدا تعالیٰ کے سامنے پیش ہونگے اور سب حقیقت ان پر کھل جائے گی جب اصل غرض بلاغ یعنی تبلیغ ہے۔ تو پھر ہر امر تبلیغ کے مقصد کے تابع ہی رکھا جائے گا۔ نہ کہ تبلیغ و اصلاح کو نظر انداز کیا جائے۔ اور سزا کو مقدم ۔

۱۴۱ حل لغات۔ نَاْتِى۔ اَتٰى سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اَتٰى اَتَاهُ کے معنے ہیں۔ جَاءَهٗ۔ اس کے پاس آیا۔ وَالْاَمْرَ فَعَلَهٗ۔ اور جب اتی کا مفعول اَلْاَمْرَ ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں۔ کام کو کیا۔ اَتَى الْمَكَانَ۔ حَضَرَهٗ۔ کسی جگہ گیا اَتَى عَلَى الشَّيْءِ۔ اَنْفَدَهٗ۔ اس کو ختم کیا۔ وَبَلَغَ اٰخِرَهٗ۔ اور اسکے انتہا تک پہنچا۔ اَتٰى عَلَيْهِ الدَّهْرُ۔ اَهْلَكَهٗ۔ زمانہ نے اُسے ہلاک کیا۔ (اقرب)

اَطْرَافِهَا۔ طَرَفٌ۔ اور طرف کی جمع ہے اور الطَّرَفُ اَطْرَافُهَا کے معنے ہیں حَرْفُ الشَّيْءِ وَنِهَايَتُهٗ۔ کسی چیز کا کنارہ اور اسکی انتہا۔ النَّاحِيَةُ۔ جانب۔ طَائِفَةٌ مِنَ الشَّيْءِ کسی چیز کا بڑا حصہ۔ الرَّجُلُ الْكَرِيْمُ۔ شریف آدمی۔ الطَّرَفُ کے معنے ہیں۔ مُنْتَهٰى كُلِّ شَيْءٍ ہر چیز کا انتہاء اَلْكَرِيْمُ مِنَ الْفِتْيَانِ وَالرِّجَالِ۔ معزز نوجوان ہو یا بڑا آدمی۔ اَلْاَطْرَافُ مِنَ النَّاسِ۔ خِلَافُ الرُّؤُوْسِ۔ عام لوگ۔ مِنَ الْاَرْضِ۔ اَشْرَافُهَا وَعُلَمَاؤُهَا۔ اطراف من الارض کے معنے ہیں۔ معزز یا عالم لوگ۔ هُوَ مِنْ اَطْرَافِ الْعَرَبِ۔ اَيْ مِنْ اَشْرَافِهَا وَاَهْلِ بُيُوْتَاتِهَا جب کسی کے متعلق هُوَ مِنْ اَطْرَافِ الْعَرَبِ کا محاورہ

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ

اور جو (لوگ) ان سے پہلے تھے۔ انہوں نے (بھی انبیاء کے خلاف اسی طرح مخالفانہ) تدبیریں کی تھیں (مگر ان کی کوئی پیش نہ گئی) ایسی تدبیر

جَمِيْعًا ۖ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ

کرنا تو کلی طور پر اللہ (تعالیٰ) ہی کے اختیار میں ہے۔ ہر شخص جو کچھ (بھی) کرتا ہے وہ (یعنی اللہ) اسے جانتا ہے

استعمال کریں۔ تو یہ معنے ہوتے ہیں۔ کہ وہ عرب معزز ترین خاندان میں سے ہے۔ گویا یہ لفظ اضداد میں سے ہے (اقرب)

لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ کے معنے ہیں۔ اَیْ لَا رَادَّ لَهٗ وَلَا نَاقِضَ لَهٗ۔ اس کے فیصلہ کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں یا اس کے حکم کو کوئی توڑنے والا نہیں (اقرب)

تفسیر۔ عیسائی مصنفین اعتراض کیا کرتے ہیں کہ قرآن کریم سے ثابت نہیں ہوتا۔ کہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی کوئی آیت (یعنی نشان) دکھائی ہو۔ ہاں یہ دعویٰ بیشک ہے کہ دکھائیں گے۔ اس آیت میں اس کا کیسا کھلا جواب موجود ہے۔ فرماتا ہے ہم نے ان کو نشان تو دکھایا ہے۔ مگر یہ دیکھتے نہیں کیا ان کو معلوم نہیں کہ ہم زمین کو اس کے اطراف سے کم کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یعنی سابق پیشگوئیوں کے مطابق اسلام کی فتح کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں ہر گھر میں سیندھ لگ رہی ہے۔ اُن کی اولادیں مسلمان ہو رہی ہیں۔ اور غلام مسلمان ہو رہے ہیں۔ بڑے لوگوں میں سے بھی ایک حصہ ایمان لا رہا ہے۔ اور عوام میں سے بھی۔ غرض سوسائٹی کے ہر طبقہ میں سے کچھ لوگ ایمان لا رہے ہیں۔

اَلْاَرْض سے مراد عرب بھی ہو سکتا ہے یعنی عرب کے اطراف میں اسلام کی اشاعت ہو رہی ہے۔ مثلاً یمن میں لوگ مسلمان ہو رہے ہیں۔ غفار میں سے ابو ذر غفاریؓ ایمان لے آئے۔ مدینہ منورہ میں لوگ اسلام لائے۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں سے بعض یہودی اور عیسائی بھی اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔

نَاْتِي الْاَرْضَ سے یہ مُراد بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ہر قسم کے کفّار فنا ہو رہے ہیں۔ کیونکہ اَتَی اللّٰہُ کے معنی قرآن کریم میں سزا اور عذاب کے بھی آتے ہیں جیسے کہ فرماتا ہے۔ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا (حشر ع ۱) اللہ تعالےٰ کفّار کے پاس وہاں سے آیا۔ جہاں سے آنے کا ان کو خیال بھی نہ تھا یعنی ان کو ایسی سزا دی۔ جس کا انہیں گمان بھی نہ تھا۔ اس صورت میں یہ معنے ہوں گے۔ کہ ان کے بڑے لوگ بھی سزا پا رہے ہیں۔ اور عوام بھی۔ یا یہ کہ عرب کے چاروں گوشوں میں عذاب آ رہے ہیں۔

مطلب یہ کہ کفّار ان امور سے نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کے نشان ان میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ اور اسلام کی ترقی کے سامان پیدا ہو رہے ہیں۔

وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔ یعنی اصل چیز تو یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اس کے ساتھ ہے۔ جب خدا تعالےٰ اس رسول کے ساتھ ہے تو اس کے راستہ میں کون روک بن سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے حُکم کو ٹالنے کی طاقت ہی کسے ہے۔

اس آیت سے سبق ملتا ہے کہ مومن کو چاہئے کہ دشمن کی باتوں سے نہ گھبرائے۔ اللہ تعالےٰ کے حکم کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جلدی حساب لینا شروع کر دیتا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ جب وہ حساب لینے لگے گا۔ تو جلدی سے لے لے گا۔ یوں تو وہ عذاب میں تاخیر ہی کرتا ہے مگر جب

الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور ان کافروں کو ضرور (اور جلد معلوم) ہو جائے گا۔ کہ اس (آنے والے) گھر کا (اچھا) انجام کس کے لئے (مقدر) ہے۔ اور جن لوگوں نے

لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ

(تیرا) انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں تو (خدا کا) بھیجا ہوا نہیں ہے۔ تو (انہیں کہہ کر) اللہ (تعالیٰ) میرے درمیان اور تمہارے

وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝

درمیان کافی گواہ ہے اور (اسی طرح پر) وہ (شخص بھی گواہ ہے) جس کے پاس اس (مقدس) کتاب کا علم (آچکا) ہے۔ ۵۴۳

ع ۶ ۱۲

حساب لینے پر آتا ہے تو فوراً لے لیتا ہے۔ اور اس کے حکم میں کوئی روک نہیں بن سکتا۔

۵۴۲ حل لغات۔ مَكَرَهٗ کے معنے ہیں خَدَعَهٗ۔ اس کو دھوکا دیا۔ اَللّٰهُ فُلَانًا۔ جَازَاهُ عَلَى الْمَكْرِ۔ جب اللہ تعالیٰ کے لئے مَكَرَ کا لفظ آئے۔ تو اس کے معنے ہوتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو مکر کا بدلہ دیا۔ قِيْلَ الْمَكْرُ صَرْفُ الْاِنْسَانِ عَنْ مَقْصِدِهٖ بِحِيْلَةٍ۔ بعض نے کہا۔ کہ کسی کو اس کے قصد سے کسی حیلہ کے ذریعہ سے پھیرنے کا نام مکر ہے۔ وَهُوَ نَوْعَانِ مَحْمُوْدٌ يُقْصَدُ فِيْهِ الْخَيْرُ وَمَذْمُوْمٌ يُقْصَدُ فِيْهِ الشَّرُّ۔ اور مکر اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی (اقرب)

تَكْسِبُ۔ كَسَبَ میں سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور كَسَبَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں۔ جَمَعَهٗ اس کو جمع کیا۔ اور جب كَسَبَ مَالًا وَعِلْمًا کہا جائے تو یہ معنی ہونگے کہ طَلَبَهٗ وَرَبِحَهٗ۔ یعنی اس نے مال و علم حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور کامیاب ہو گیا۔ وَالْاِثْمَ تَحَمَّلَهٗ اور جب كَسَبَ کا مفعول الاثم ہو۔ تو اس کے معنے ہوں گے۔ تَحَمَّلَهٗ۔ گناہ کا مرتکب ہوا۔ اور كَسَبَ لِاَهْلِهٖ کے معنے ہیں۔ طَلَبَ الْمَعِيْشَةَ اپنے اہل و عیال کے لئے روزی کو حاصل کیا۔ (اقرب)

تفسیر يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ۔ تمہاری تدبیر کس طرح کارگر ہو سکتی ہے۔ جبکہ وہ تمہاری تمام تدبیر کو جانتا ہے۔ اس لئے وہ ان کو توڑ ڈالے گا۔ جیسے ایک آنکھوں والا کئی اندھوں کی سرکوبی کے لئے کافی ہوتا ہے۔

مَكَرَهٗ

وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ یعنی کفار جو تدابیر کرتے ہیں۔ ان کو تو ہم جانتے ہیں مگر ان کے برخلاف جو تدابیر ہم اختیار کر رہے ہیں ان کا ان کفار کو کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جب کفار کو نقصان پہنچ جائے گا۔ تبھی انہیں معلوم ہوگا کہ انجام کس کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں س زور دینے کے لئے آیا ہے۔ یعنی کفار ضرور جان لیں گے۔ کہ انجام کس کا اچھا ہے۔ اور س کے معنوں میں قریب کے زمانہ پر بھی دلالت ہوتی ہے۔ اور جاننے کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ بالضرور انجام مسلمانوں کا ہی اچھا ہوگا۔ دوسرے اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ بڑے بڑے کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی کو دیکھ کر مریں گے۔

۵۴۳ تفسیر۔ نبی کے مخالفین کی دماغی خرابی کی یہ علامت ہے کہ وہ ہر دلیل کو سن کر انکار کرتے ہیں۔ اور واضح سے واضح برہان پر شک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ دلیل بجائے خود نبی کے

سچا ہونے کی علامت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب کسی قوم کے علماء کی یہ حالت ہو۔ کہ وہ واضح اور ظاہر بات کو نہ سمجھ سکیں۔ تو عوام کی حالت لازماً قابلِ رحم ہو گی اور اگر وہ وقت نبی کی آمد کا نہ ہو۔ تو اور کونسا وقت اس کی بعثت کے مناسب ہو سکتا ہے۔ اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ ان سب دلائل کو سُنکر بھی دشمن یہی کہے گا۔ کہ خواہ کچھ کہو۔ میں تو نہ مانوں گا۔ اور یہی کہوں گا۔ کہ تُو رسُول نہیں ہے مگر تو اس سے چڑ بو نہیں۔ تو یہی جواب دیجیو۔ کہ میری شہادت خدا تعالےٰ دے رہا ہے۔ تو مجھے انکار کی کیا پرواہ ہے۔

اسی طرح جو لوگ کتب سماویہ کا صحیح علم رکھتے ہیں۔ وہ میرے شاہد ہیں۔ پس ان شہادتوں کی موجودگی میں تمہارے انکار کی کیا قدر ہے۔

یہی دو شہادتیں نبیوں کو فتح دیتی ہیں یعنی تازہ آسمانی شہادت اور پہلے انبیاء کی پیشگوئیاں۔ ان دو گواہوں سے بڑھ کر کبھی کوئی اور شہادت کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ اس وقت بھی انہی دو شہادتوں پر زور دے کر اسلام کی ترقی کی مہم سر کی جا سکتی ہے۔

سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ مَكِّيَّةٌ

سورۃ ابراہیم [1] یہ سورت مکی ہے

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ ثَلٰثٌ وَّخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اس کی ترپن آیتیں ہیں اور سات رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر (شروع کرتا ہوں) جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ

الٓرٰ (یہ) ایک کتاب ہے جسے ہم نے تجھ پر اس لئے اتارا ہے کہ تو تمام لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے

[1] جمہور کے نزدیک یہ سورۃ سب کی سب مکی ہے لیکن ابن عباس اور قتادہ کے نزدیک اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا سے اِلَى النَّارِ تک مکی نہیں۔ باقی مکی ہے۔ نحاس نے جبر سے روایت کی ہے۔ کہ یہ آیتیں بدر کے مشرک مقتولین کے متعلق ہیں۔ ابوالشیخ نے بھی اسی قسم کی روایت قتادہ سے کی ہے۔ اس سورۃ میں بھی وہی پہلا مضمون جاری رکھا گیا ہے مگر رؤیت پر بنیاد ہے یعنی واقعات سے مسائل کا زیادہ استخراج کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ ایسے ہی حالات محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ اور پھر بھی وہ رسول بغیر اس کے کہ ظاہری سامان ان کی تائید میں ہوں کامیاب ہوتے رہے ہیں۔

خلاصہ مضمون اس سورۃ کا یہ ہے کہ قرآن کریم کے نزول کی اصل غرض ہدایت ہے۔ لوگ تاریکی میں تھے۔ اب تُو انہیں تاریکی سے نور کی طرف نکالیگا اس غرض کے لئے ہم پہلے بھی رسول بھیج چکے ہیں۔ چنانچہ موسٰی علیہ السلام بھی اسی غرض سے آئے تھے۔ اور پھر موسٰی کی زبانی بتایا ہے۔ کہ پہلے رسول بھی اسی غرض سے آئے تھے۔ پھر ان سب کی کامیابی کا ذکر بتایا۔ کہ چونکہ ان کے ساتھ حق تھا۔ اس لئے آخر ان کی بات غالب آئی۔ پھر پیچھے کلام کی علامتیں بتائی ہیں۔ اور فرمایا ہے۔ کہ تمہیں دیکھنا چاہیئے کہ آیا یہ علامتیں قرآن کریم میں موجود ہیں۔ یا نہیں پھر جو اندھیرے سے باہر نکالے گئے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کو بتایا ہے کہ اس اعلیٰ کلام سے تم کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ پھر بتایا ہے کہ یہ تغیر جو عرب میں پیدا ہونے والا ہے۔ اس کا آج ہی ہم نے ارادہ نہیں کیا۔ کہ ہم اس کو بدل ڈالیں۔ بلکہ یہ قدیم سے ہمارے مدنظر ہے۔ جن تغیرات کو ہم آج پیدا کرنا چاہتے ہیں انہیں کے لئے ہزاروں سال پہلے ابراہیم نے دعا کی تھی بلکہ مکہ کو قائم ہی انہیں تغیرات کے لئے کیا گیا ہے۔ اور ہم جو غیر معمولی طور پر مکہ کے لوگوں کو رزق پہنچاتے رہے ہیں۔ وہ بھی ان آئندہ آنے والے تغیرات کی وجہ سے تھا پھر ہم آج انہیں کس طرح بھلا سکتے ہیں۔ پھر مومنوں کو توجہ دلائی ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ہم تمہارے فرائض بیان کر چکے ہیں۔ تمہیں وہ ذمہ واریاں کبھی نہیں بھلانی چاہئیں۔ اور کفار کو ڈرایا ہے کہ ابراہیم نے اس نیت سے مکہ کی بنیاد رکھی تھی۔ کہ یہ توحید کا مرکز ہو۔ اب اگر تم شرک نہ چھوڑو گے۔ تو تم کو یہاں سے دور کر دیا جائیگا۔ اور تمہاری ہلاکت توحید کی تصدیق کے لئے ایک دلیل بن جائے گی۔

سورۃ ابراہیم مکی ہے [1]

سورۃ ابراہیم کا سورۃ رعد سے تعلق [2]

سورۃ ابراہیم کا خلاصہ مضمون [3]

الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ

ظلمات سے نکال کر نور کی طرف یعنی (اس) کامل (طور پر) غالب (اور) کامل محمود (ہستی تک پہنچنے) کے

الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

راستہ کی طرف لائے ؂ یعنی اللہ تعالےٰ کے راستہ کی طرف) کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے

؂ حل لغات - لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ - اَخْرَجَهٗ اور اَخْرَجَهٗ مِنْ كَذَا اِلٰى كَذَا کے معنوں میں فرق ہوتا ہے اخرجہ کے یہ معنے ہیں کہ اس کو نکالا۔ اور اخرجہ من کذا الیٰ کذا کے معنے یہ ہیں۔ کہ اس کو وہاں سے نکال کر دوسری جگہ لے گیا۔ پس لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ کے یہ معنے ہوں گے۔ کہ تو لوگوں کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لائے۔

بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔ ان کے رب کے حکم کے ساتھ اس راستہ کی طرف جو عزیز وحمید کا ہے۔ عزیز کے معنے ہیں۔ اَلْمَنِيْعُ الَّذِيْ لَا يَنَالُ وَلَا يُغَالَبُ وَلَا يُعْجِزُهٗ شَيْءٌ وَلَا مِثْلَ لَهٗ۔ غالب۔ طاقتور جسے کوئی چیز عاجز نہ کر سکے اور اس کا کوئی شریک نہ ہو۔ (اقرب) حمید۔ جو کامل حمد والا ہو۔

صفت عزیز و حمید علمی و عملی روشنی پر دلالت کرتی ہیں

تفسیر - کتابٌ خبر ہے۔ مبتداء محذوف کی جو مثلاً هٰذَا الْقُرْاٰنُ ہے۔ یعنی یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے۔ جو ہم نے تجھ پر اتاری ہے۔

قرآن کریم ایک روشنی ہے

اس آیت میں بتایا ہے۔ کہ قرآن کریم ایک روشنی ہے جس کے ذریعہ سے محمد رسول اللہ لوگوں کو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکال لے جائیں گے۔ پھر روشنی کی تشریح الیٰ صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ سے کی۔ یعنی عزیز وحمید خدا کا راستہ ہی اصل روشنی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں روشنی کو تو ہر ایک پسند کرتا ہے لیکن روشنی کی تشریح میں لوگوں کو اختلاف ہوتا ہے۔ آج کل لوگ کہتے ہیں۔ یہ نئی روشنی کے آدمی

آنحضرتؐ کے ذریعہ سے عربوں میں پہلی تبدیلی

روشنی کی تشریح

ہیں۔ اور مراد جدید فلسفہ اور تہذیب اور اباحت اور لامذہبی کی اتباع ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے مسیحیت خدا کا نور ہے کوئی ہندو مذہب کو کوئی اسلام کو خدا کا نور قرار دیتا ہے۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ رسم و رواج اور قشر اور چھلکا خدا کا نور نہیں کہلا سکتا۔ نور تو خدا تعالےٰ کی طرف جانے کا نام ہے جس کا قدم خدا تعالےٰ کی طرف نہیں اٹھا۔ اسے نور کو حاصل کرنیوالا کسی صورت میں نہیں کہہ سکتے۔ نور کو وہی پاتا ہے جو اللہ تعالےٰ کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ وجود باری پر دلالت کرنے کے لئے اس جگہ دو صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ عزیز اور حمید۔ عزیز کے معنے غالب اور حمید کے معنے قابل تعریف کے ہیں ان دو صفات کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ ایک عملی روشنی پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا علمی پر۔ عزیز سے مل کر انسان اپنے دشمنوں پر غالب آجاتا ہے۔ اور ظاہری اندھیرے یعنی تکالیف اور مصائب دور ہو جاتے ہیں۔ اور حمید سے مل کر انسان اپنے اندرونی دشمن شیطان پر غالب آجاتا ہے۔ اور باطنی اندھیرے یعنی وساوس اور شبہات اور جہالت دور ہو جاتے ہیں۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے یہ دونوں کام ہوئے۔ عربوں کی ذلت اور نکبت و ادبار بھی دور ہوا۔ اور ان کی جہالت اور شرک اور اخلاقی کمزوری بھی دور ہوئی۔ ایک طرف وہ سب دنیا کے بادشاہ ہو گئے۔ دوسری طرف وہ سب دنیا کے معلم ہو گئے۔ عربوں کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی حالت اور آپ کے بعد کی تبدیلی کا اس تاریخی واقعہ

وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ

اور جو کچھ زمین میں ہے - اور (اس کا) انکار کرنے والوں کے لئے ایک (بہت) بڑی آفت یعنی ایک سخت

شَدِيْدِ ۙ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا

عذاب (مقدر) ہے ۵۳ جو آخرت کے مقابلہ میں (اس) ورلی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں اور (دوسرے

سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے - کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب ایران پر چڑھائی ہوئی - تو ایران کے بادشاہ نے اپنے کمانڈر انچیف کو یہ کہلا بھیجا - کہ ان لوگوں کو کچھ انعام کا وعدہ دے کر جنگ کو ختم کرو - اور انعام بھی نہایت حقیر تھا - یعنی فی سپاہی ایک ایک دو دو دینار - اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے - کہ عرب اپنی ہمسایہ قوموں کی نظر میں نہایت غریب اور محتاج اور کم ہمت تھے - لیکن اسلام نے ان کو کیا بنا دیا - وہ اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے نہ صرف ایران کو فتح کیا - بلکہ شام، فلسطین، مصر، اناطولیہ، آرمینیا، عراق، شمالی افریقہ، ہسپانیہ، افغانستان، ہندوستان، چین تک بھی پہلی صدی کے اندر فتح کر لئے -

صفت عزیز کے ماتحت صحابہ دنیا پر حکمران ہوگئے

صحابہ جو غریب اور متوسط الحال لوگ تھے - ایسے ایسے دولت مند ہو گئے - کہ ایک صحابی عبد الرحمٰن بن عوف جب فوت ہوئے - تو اڑھائی کروڑ روپیہ ان کا ترکہ نکلا - جو آج کل کے لحاظ سے بہت بڑی دولت ہے - کیونکہ اس وقت روپیہ کی قیمت بہت زیادہ ہوتی تھی -

آنحضرت کے ذریعہ سے عربوں میں دوسری تبدیلی

دوسری تبدیلی بھی ظاہر ہے - عرب کے لوگ یا تو لکھنے کو عیب سمجھتے تھے - اور کسی قسم کا علم بھی ان میں نہ پایا جاتا تھا - ساری دنیا کے علوم کے حامل ہو گئے - تاریخ کی بنیاد انہوں نے ڈالی - صرف و نحو، معانی، بیان، لغت کو انہوں نے کمال تک پہنچا دیا - فقہ اور فلسفہ فقہ اور منطق اور حکمت اور طب اور سیاست اور انجنیئرنگ اور ہندسہ اور الجبرا اور علم کیمیا اور ہیئت وغیرہ بیسیوں علوم یا ایجاد کئے یا انہیں ادنیٰ حالت سے بڑھا کر کمال تک پہنچایا - اور آج یورپ کے محققین تسلیم کرتے ہیں - کہ اگر مسلمان عرب نہ ہوتے - تو آج دنیا علم کی اس منزل پر نہ ہوتی جہاں اب ہے - اور روحانیت میں جو عربوں نے ترقی کی - اس کی مثال تو ابتداء عالم سے اس وقت تک کسی قوم میں پائی ہی نہیں جاتی -

علوم کی ایجاد

۵۳ حل لغات - اَلْوَيْلُ - حُلُوْلُ الشَّرِّ - ویل کے معنے ہیں مصیبت کا نازل ہونا وَقِيْلَ هُوَ تَفْجِيْعٌ اور بعض محققین لغت کہتے ہیں کہ یہ لفظ کسی کے مبتلائے مصیبت ہونے پر اس پر اظہار افسوس کے لئے بولا جاتا ہے - وَوَيْلٌ كَلِمَةُ عَذَابٍ - نیز یہ لفظ عذاب کیلئے استعمال ہوتا ہے - وَالرَّفْعُ عَلَى الْاِبْتِدَاءِ اور چونکہ وہ اس مقام پر مبتدا ہوتا ہے اس پر رفع آتا ہے - وَالْوَيْلَةُ - اَلْفَضِيْحَةُ وَالْبَلِيَّةُ اور ویلۃ کے معنی رسوائی کے اور مصیبت کے ہیں (اقرب)

تفسیر - اللہ عزیز و حمید کے بعد آیا ہے - اس لئے کہ یہاں وہ عطف بیان کے طور پر استعمال ہوا ہے - اور معنے یہ ہوئے - کہ عزیز و حمید کے راستہ کی طرف جس سے مراد ہماری اللہ ہے - اسی کا آسمان اور زمین ہے یعنی تمام مخلوق اس کے غالب ہونے پر شاہد ہے - زمین و آسمان میں ایک ہی قانون نظر آتا ہے - اور اسی طرح زمین و آسمان اس کے حمید ہونے پر بھی شاہد ہیں - کیونکہ کہیں کوئی نقص یا عیب نظر نہیں آتا پس جو لوگ ایسے خدا کی طرف جائیں گے - وہ یقیناً اپنے اندر ایک خاص اور نیک تبدیلی محسوس کریں گے - اور زمین و آسمان پر انہیں بھی حکومت ملے گی

یہ وعدہ کس شان سے پورا ہوا - ایک خلیفہ مدینہ میں بیٹھا ہوا حکم دیتا ہے - اور فوراً ساری دنیا اس پر عمل کرنے لگ جاتی ہے -

عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا

(لوگوں کو بھی) اللہ (تعالٰے) کے راستہ سے روکتے ہیں۔ اور اسے کجی اختیار کر کے (حاصل کرنا)

مسلمانوں کے ایثار اور ایفائے عہد کی ایک مثال

اس قسم کی حکومت کی مثال اور کہاں ملتی ہے۔

ایسا ہی نفظ حمید کے ماتحت مسلمانوں کی وہ عہد ہوتی۔ کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ مسلمان کا لفظ ایک ضمانت ہوتی تھی جس میں کوئی شک نہ کرتا تھا۔ اس کا وعدہ ایک سماوی تقدیر سمجھی جاتی تھی۔ جسے کوئی رد نہ کر سکتا تھا۔ ان کی تعریفوں کی گونج آج بھی دنیا میں سنائی دے رہی ہے۔ مثلاً ایک یہی واقعہ لو۔ کہ ایک دفعہ ایک شخص سے کوئی ایسا جرم ہوا۔ جو اُسے سزائے قتل کا حقدار بناتا تھا جب وہ خلیفہ وقت کے سامنے پیش ہوا۔ تو اس نے سزا کے سننے کے بعد عرض کی۔ کہ میرے پاس کچھ امانتیں اور ذمہ واریاں اپنے یتیم بھتیجوں کی ہیں۔ اُن کو میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ مجھے کل اس وقت تک آپ مہلت دیں۔ وہ کام کر کے پھر حاضر ہو جاؤں گا۔ خلیفہ نے کہا۔ کوئی ضامن پیش کرو۔ اس نے خلیفہ کی مجلس میں ایک صحابی (ابوذر) کی طرف اشارہ کیا۔ کہ یہ میرے ضامن ہیں۔ حالانکہ وہ صحابی اس کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ مگر صرف مسلمان ہونیکی وجہ سے اور اس لئے کہ اس نے آپ پر ایک بڑی ذمہ واری کی امید کی تھی۔ اپنی شرافت اور وقار کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کی ضمانت دے دی۔ لیکن مقررہ وقت قریب آگیا۔ اور وہ نہ پہنچا۔ لوگوں نے حضرت ابوذرؓ سے پوچھا۔ کہ وہ کون تھا۔ تو انہوں نے کہا میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھا۔ ایک مسلمان جان کر میں نے اس کی ضمانت دے دی۔ جب اس نے مجھ پر اعتبار کیا تو میں اس پر کیوں اعتبار نہ کرتا۔ آخر وقت ختم ہونے کو ہوا۔ تو لوگوں کو حضرت ابوذرؓ کی جان کا خطرہ پیدا ہوا۔ لیکن عین وقت پر ایک شخص دور سے بے تحاشا گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ اور بے جان ہو کر آگرا۔ اور حضرت ابوذرؓ سے معذرت کی۔ کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ بمشکل عین وقت پر پہنچ سکا ہے۔ اور آپ کی تشویش کا موجب ہوا ہے۔ . . . . ایک طرف ابوذرؓ کے

پہلے زمانہ کے مسلمانوں اور آج کے مسلمانوں میں فرق

جماعت احمدیہ کی ذمہ واری

ایثار کی اور دوسری طرف اس شخص کے ایفائے عہد کی مثال دوسری قوموں میں کہاں ملتی ہے۔ اس واقعہ کو انگریزوں نے اپنی کہانیوں اور نظموں میں بھی درج کیا ہے۔ ایسی ہی ایک اور مثال ہے۔ شام کے فتح ہو جانے کے بعد ایک دفعہ عیسائی لشکر عارضی طور پر غالب ہو گیا۔ اور اسلامی لشکر کو کچھ علاقہ چھوڑنا پڑا۔ اس وقت حضرت عمرؓ کے حکم کے ماتحت مسلمانوں نے اس علاقہ کے سب وصول شدہ ٹیکس واپس کر دئے۔ کہ جب ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے۔ تو ہم تمہارا ٹیکس اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ یہ علاقہ بھی عیسائیوں سے آباد تھا۔ لیکن باوجود اس کے کہ ان کے ہم مذہب فتح پا کر آ رہے تھے۔ وہ مسلمانوں کی اس نیک نفسی سے اس قدر متاثر ہوئے۔ کہ زن و مرد روتے ہوئے شہر کے باہر تک انہیں چھوڑنے آئے۔ اور کہتے جاتے تھے۔ کہ اگر عیسائی لشکر آپ کی جگہ ہوتا۔ تو ٹیکس کی واپسی کی جگہ جاتے ہوئے جو کچھ ہمارا تھا۔ وہ بھی لُوٹ کر لے جاتا۔ اور دعائیں کرتے جاتے تھے۔ کہ اللہ تعالٰے آپ کو پھر واپس لائے (الفاروق حصہ اول)

افسوس کجا وہ زمانہ تھا۔ اور کجا اب مسلمان سب سے زیادہ بے اعتبار سمجھا جاتا ہے۔ علماء نے غیر مذاہب کو لوٹ لینے کا فتویٰ دیا ہوا ہے۔ غیر مذہب کی حکومت سے غداری کو دین کا جزو قرار دیا ہوا ہے۔ غیر مسلموں کے قتل کو ثواب کا موجب بتلاتے ہیں غرض ہر وہ نیکی جس پر مسلمان کو فخر تھا۔ آج ان میں سے مفقود ہے۔ اِنّا لله وانّا الیہ راجعون۔ کاش جماعت احمدیہ اپنی ذمہ واری کو سمجھے اور اسلام کے کھوئے ہوئے متاع کو پھر واپس لاتے۔ اور پھر وہی اخلاق محمد رسول اللہ صلعم کے غلاموں میں دنیا دیکھے۔ جنہیں دیکھ کر انسان کو خدا تعالیٰ نظر آ جاتا ہے۔ وہ امین ہوں۔ اور ایسے امین کہ خود بھوکے مر جائیں، بیوی بچے بھوکے مر جائیں۔ لیکن دوسرے کی امانت میں خیانت نہ ہو۔ وہ سچے ہوں۔ اور ایسے سچے کہ جان جائے، مال و دولت جائے، عہدہ جائے۔ لیکن

يَمَوَجًا ۖ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ

چاہتے ہیں۔ یہ لوگ دور کی گمراہی میں (پڑے ہوئے) ہیں۔ ۵۴ اور ہر ایک رسول کو ہم نے

رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ

اس کی قوم کی زبان میں ہی (وحی دیکر) بھیجا ہے۔ تاکہ وہ انہیں (ہماری باتیں) کھول کر بتاتے۔ پھر (اس کے بعد) اللہ تعالیٰ جسے ہلاک کرنا

جھوٹ کا ایک لفظ زبان پر نہ آتے۔ اور نہ آتے وعدہ کریں۔ تو جان کے ساتھ نباہیں۔ اور ارادہ کریں۔ تو سر ہتھیلی پر رکھ کر اُسے پورا کریں۔

۵۴ حل لغات۔ يَسْتَحِبُّوْنَ۔ اِسْتَحَبَّ سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے۔ اور اِسْتَحَبَّهٗ کے معنی ہیں اَحَبَّهٗ یعنی اس سے محبت کی۔ اُسے چاہا۔ اِسْتَحْسَنَهٗ۔ اُسے پسند کیا۔ اَلْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ۔ اٰثَرَهٗ۔ کفر کو ایمان پر ترجیح دی یعنی مقدم کیا۔ (اقرب)

يَبْغُوْنَ۔ بَغَى سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے۔ اور بغاهٗ يَبْغِيْهِ کے معنے ہیں طَلَبَهٗ۔ اسے طلب کیا۔ چاہا۔ يُقَالُ اِبْغِنِيْ ضَالَّتِيْ۔ اَيْ اُطْلُبْهَا لِيْ چنانچہ ابغنی ضالّتی کا فقرہ بول کر یہ مراد لیتے ہیں۔ کہ میری گمشدہ چیز میرے لئے تلاش کر۔ (اقرب) پس يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا کے معنے ہوں گے۔ اُسے کجی اختیار کر کے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

تفسیر۔ جو لوگ ایسی تعلیم کو چھوڑیں گے ان کا انجام واضح ہے۔ عزیز و حمید کو چھوڑ کر عزت اور حمد کہاں باقی رہ سکتی ہے۔ مگر فرمایا۔ کفار کو دیکھو۔ خود ہی اللہ تعالیٰ کے انعامات سے محروم نہیں ہوتے۔ دوسروں کو بھی روکتے ہیں۔ اور لوگوں کو ہی روکتے نہیں۔ بلکہ تعلیم الٰہی میں خرابیاں پیدا کر کے ہمیشہ کیلئے اور لوگوں کو اس کے فوائد سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔

یہ انسان کی سخت بدقسمتی ہوتی ہے۔ کہ ضد میں آکر صداقت کو مٹانے لگ جاتا ہے۔ اور نہیں سمجھتا کہ اس طرح ہزاروں آدمیوں کی روحانی موت کا گناہ اس کی گردن پر رکھا جاتا ہے۔

کجی اختیار کر کے اُسے حاصل کرنا چاہتے ہیں کا یہ مطلب ہے۔ کہ ایک طرف ان کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے۔ کہ خدا کا راستہ مل جائے۔ اور دوسری طرف اپنے غلط رویہ اور گندی عادات کو بھی بدلنا نہیں چاہتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے نفس کو دھوکا دینے اور اپنی ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے وہ اپنی خود ساختہ باتوں کا نام دین رکھ لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اور اُن کی اولادیں بھی جھوٹی تسلی پا کر نورِ ہدایت سے محروم رہ جاتے ہیں۔

يستحبون

ان معنوں کے رُو سے سبیل اللہ سے مراد صداقت مطلقہ لی جائیگی۔ ان معنوں سے ان لوگوں کے خیالات کا رد بھی ہو جاتا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ ہر مذہب میں نیک اور پارسا لوگ پائے جاتے ہیں۔ پھر انہیں کیوں خدا رسیدہ نہ قرار دیا جائے۔ اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے والی راہ کو تو وہی پا سکتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اصول کی اتباع کرے۔ اگر وہ اس پر مصر ہو کہ اپنے باپ دادا کے راستہ کو نہیں چھوڑوں گا۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کا متلاشی نہیں۔ باپ دادا کے راستہ کا متلاشی ہے۔ پھر جس کا رُخ مخالف طرف ہو۔ وہ اس راستہ کی طرف کس طرح پہنچ سکتا ہے جو عِوَجًا چل پڑے۔ یعنی غلط زاویہ کی طرف بڑھنا شروع کرے یقیناً اس کی منزل کسی غیر جگہ ہی جا کر ختم ہو گی۔

سبیل اللہ سے مراد صداقت مطلقہ

يبغون

اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ بظاہر کفار اسلام کے بارہ میں بحث مباحثہ میں لگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہیں اسلام کا نقطۂ نگاہ سمجھنے کی خواہش ہے لیکن درحقیقت وہ ضد اور تعصب سے کام لیکر اسلام کے بارہ میں گفتگو کر رہے ہوتے ہیں۔ اور چونکہ اللہ کے راستہ کو صداقت کی راہوں سے ہی پایا جا سکتا ہے۔ اس لئے وہ ہدایت پانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان معنوں کے لحاظ سے سبیل اللہ کے معنے مخصوص طور پر اسلام کے ہوں گے ؏

سبیل اللہ سے مراد اسلام بھی ہو سکتا ہے

يبغونها عوجا کے معنے

مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

چاہتا ہے ہلاک کرتا ہے۔ اور جسے (کامیاب کرنا) چاہتا ہے (اُسے منزل مقصود پر پہنچا دیتا ہے۔ اور وہ کامل (طور پر) غالب (اور) صاحب حکمت ہے ۵

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ

اور (تجھ سے پہلے) ہم نے موسیٰ کو (بھی) اپنے نشانات کے ساتھ (یہ حکم دے کر) بھیجا تھا۔ کہ اپنی قوم کو

مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ

ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لا۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کے انعام اور اس کے عذاب یاد دلا۔

۵ حل لغات۔ يُضِلُّ۔ اَضَلَّ سے مضارع ہے اور اَضَلَّهٗ کے معنے ہیں اَهْلَكَهٗ اُسکو ہلاک کر دیا (اقرب) فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ کے یہ معنے ہوں گے۔ کہ اللہ تعالیٰ جسے ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ ہلاک کرتا ہے۔ بَيَّنَهٗ۔ اَوْضَحَهٗ کھول کر بیان کیا (اقرب) اور لِيُبَيِّنَ کے معنے ہوں گے۔ کہ وہ کھول کر بیان کرے۔

اس آیت سے ویری کا آنحضرتؐ کی ذات پر اعتراض

الا بلسان قومہ کے معنے

تفسیر۔ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ کے معنے بعضوں نے تو یہ کئے ہیں کہ رسول کی وحی صرف اس کی قوم کی زبان میں ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے۔ کہ اس کی قوم کی زبان میں ضرور وحی ہونی چاہیئے۔ کیونکہ وہ پیغام جو اس نے اپنی قوم کو پہنچانا ہے۔ اگر دوسری زبان میں ہوا۔ تو اس کی تبلیغ اس کے لئے مشکل ہو جائے گی لیکن بطور نشان اور معجزات کسی اور زبان میں الہام ہو۔ تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

ویری کے اعتراض کا جواب

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہاموں پر اعتراض اور اسکا جواب

بعض لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہاموں پر یہ آیت پیش کر کے اعتراض کرتے ہیں حالانکہ عربی اور اردو کے سوا آپ کو جن زبانوں میں الہام ہوئے۔ وہ بطور نشان اور معجزات کے ہیں۔ عربی میں آپکو اس لئے الہام ہوئے کہ وہ اسلام کی مذہبی زبان ہے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی قومی زبان ہے۔ اور اردو میں اس لئے کہ آپ کے پہلے مخاطب اردو دان تھے۔ اور اگر دیکھا جائے۔ تو آپ کے الہامات کا اصولی حصہ سب کا سب یا عربی میں ہے یا اردو میں۔ دوسری زبانوں میں جو الہام ہوئے ہیں۔ وہ ایسے نہیں کہ ان کے بغیر تبلیغ میں روک پیدا ہو۔ وہ صرف ایک مزید تائید اور نشان کے طور پر ہیں۔

آنحضرتؐ کے سب دنیا کیطرف مبعوث ہونیکے قرآن مجید سے پانچ دلائل

عیسائیوں نے اور بالخصوص ویری نے اس آیت سے رسول کریم صلعم کی ذات پر اعتراض کیا ہے۔ ویری صاحب کہتے ہیں۔ کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلعم صرف عرب کے لئے تھے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں۔ کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ قرآن کریم کا ترجمہ کرنا جائز ہے۔ انکی یہ دونوں باتیں آپس میں متضاد ہیں۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف عرب کے لئے تھے۔ تو ترجمہ کا سوال ہی کہاں رہا۔ جب دوسری قوموں کا اس سے تعلق ہی نہیں۔ تو ترجمہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اور اگر اس آیت سے ترجمہ کرنا جائز ثابت ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ آپ کی رسالت دوسری قوموں کے لئے بھی تھی۔ حقیقی جواب اس سوال کا یہ ہے۔ کہ یہ مفہوم اس آیت کا ہو ہی نہیں سکتا کہ آنحضرت صلعم عرب کے لئے ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے صاف ثابت ہے۔ کہ آپ سب دنیا کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ چنانچہ سورۃ اعراف ع ۲۰/۱۹ میں فرماتا ہے۔ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ○ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ

وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ یعنی میری رحمت ہر چیز پر حاوی ہے اور اب میں خاص طور پر اس کو ان لوگوں کیلئے لکھدونگا جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دینگے۔ اور جو لوگ پورے طور پر ہماری آیات پر ایمان لائینگے نیز جو کامل طور پر ہمارے اس موعود رسول کی اطاعت کرینگے جس کی بعثت کی بشارات کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ رسول وقت پر مبعوث ہوکر انہیں نیک کاموں کی تلقین کر رہا ہے۔ اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام قرار دیتا ہے۔ اور وہ ان سے سخت حکموں کے بوجھوں کو اور رسومات کے پھندوں کو جو ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے تھے دور کرتا ہے۔ پس جو لوگ اس پر کامل طور پر ایمان لائے اور پھر انہوں نے اسکی حمایت اور مدد کے لئے ہر ممکن کوشش سے کام لیا اور اس نور کی انہوں نے اتباع کی جو اس رسول کے ساتھ اتارا گیا صرف ایسے لوگ ہی کامیاب ہونگے۔ اے ہمارے رسول تو یہ اعلان کر کہ اے بنی نوع انسان میں تم سب کیطرف اس خدا کیطرف سے رسول ہوکر آیا ہوں کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اسی کی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور معبود قابل پرستش نہیں۔ وہ زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے۔ پس اے لوگو اللہ پر اور اس کے موعود بھیجے ہوئے نبی پر ایمان لاؤ۔ جو خود اللہ کی ذات پر اور اس کے کلمات پر پورا ایمان رکھتا ہے۔ اور اس کی کامل پیروی کی راہوں پر چلو۔ تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

اس میں پانچ دلیلیں اس امر کی دی گئی ہیں۔ کہ نبی کریم صلعم ساری دنیا کے لئے ہیں۔

پہلی دلیل۔ اہل کتاب کو آپ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔

اوّل:- اہل کتاب کو حکم دیا گیا ہے۔ کہ اس کو تسلیم کریں فرمایا۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ یعنی اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو خدا تعالیٰ کی رحمت کا انعام دیا جائیگا۔ جو آنحضرت صلعم کو مانیں گے۔ اگر آپ صرف عرب کے لئے تھے۔ تو اہل کتاب کو رحمت کا انعام حاصل کرنے کے لئے آپ کی اتباع کا کیوں حکم دیا گیا۔

دوسری دلیل تورات و انجیل میں آنحضرت کی پیشگوئی تھی۔

دوم:- اس آیت میں ذکر ہے۔ کہ تورات و انجیل میں آنحضرت صلعم کی پیشگوئی ہے۔ اگر آپ ان کی طرف مبعوث ہی نہ تھے۔ تو ان کے لئے پیشگوئی کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ جن کو فائدہ ہو سکتا ہے۔ وہ مکہ والے تھے۔ اور وہ تورات و انجیل کو نہیں مانتے تھے۔ اور پیشگوئی اس لئے کی جاتی ہے۔ کہ لوگوں کو اس کے ذریعہ سے ہدایت ہو۔ پس تورات اور انجیل میں اسی لئے پیشگوئیاں کی گئی تھیں۔ کہ یہود اور مسیحیوں کے لئے آنحضرت صلعم کا ماننا ضروری تھا۔ اور قرآن کریم ان پیشگوئیوں کی طرف اسی لئے اشارہ کرتا ہے۔ کہ اس کے نزدیک ان کتب کے ماننے والوں کے لئے بھی آپ کا ماننا ضروری تھا۔

تیسری دلیل آنحضرت کا انہیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا ہے۔

سوم۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں۔ اگر وہ مخاطب نہ تھے۔ تو پھر ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کیا ضرورت تھی۔

چوتھی دلیل آپ پر یہود و نصاریٰ سے ایمان لانیوالے انعام کے وارث ہوں گے۔

چہارم۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ کہ جو یہود و نصاریٰ میں سے آپ پر ایمان لائیں گے۔ وہ کامیاب و منظفر ہوں گے اگر آپ صرف عرب کی طرف تھے۔ تو پھر تو یہود و نصاریٰ کو ایمان لانے پر سزا ملنی چاہئے تھی۔ نہ کہ انعام ملنا چاہئے تھا۔

پس ان چاروں دلیلوں سے ثابت ہے۔ کہ اور کسی قوم کی طرف آپ مبعوث تھے یا نہ تھے۔ یہود و نصاریٰ کی طرف تو ضرور تھے۔ لیکن پانچویں دلیل نے تو بات کو بالکل ہی کھول دیا ہے

دلیل پنجم آنحضرت ساری دنیا کے لئے رسول ہو کر آئے ہیں۔

پنجم۔ دلیل پنجم یہ ہے۔ کہ قرآن کریم نے اوپر کے دلائل کا نتیجہ نکال کر خود ہی فرما دیا ہے۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ کہہ دے کہ اے بنی نوع انسان میں تم سب کی طرف رسول ہو کر آیا ہوں۔ اس دعویٰ نے تو بات کو بالکل

صاف کر دیا۔ اور یہود و نصاریٰ کے علاوہ دوسری اقوام کو بھی آپ کا مخاطب بنلوایا۔

ایک اور آیت میں فرماتا ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (سبا ع) کہ ہم نے تجھے تمام جہان کی طرف بشیر و نذیر کر کے بھیجا ہے۔ پھر حدیث میں بھی آتا ہے۔

آنحضرت کا ساری دنیا کے لئے مبعوث ہونے کا حدیث سے ثبوت

بُعِثْتُ اِلَى الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ۔ میں ہر کالے گورے کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ عرب کبھی بھی اپنے آپ کو اسود نہیں کہتے۔ بلکہ ہمیشہ احمر کہتے ہیں۔ اب اسود قوم کونسی باور نکالنی پڑیگی۔ عربی زبان کے محاورہ کے مطابق وہ عجم ہی رہیں۔ لغت میں بھی اَلْاَسْوَدُ وَالْاَحْمَرُ کے معنے اَلْعَجَمُ وَالْعَرَبُ لکھے ہیں۔ (مجمع البحار)

پھر ایک اور حدیث میں آتا ہے۔ بُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً میں سب انسانوں کی طرف مبعوث ہُوا ہوں (مسند احمد بروایت حضرت جابر)

ہندوستان کی آئندہ زبان اردو ہوگی

ایک اور روایت میں ان کی جگہ یہ الفاظ ہیں۔ اُرْسِلْتُ اِلَى الْخَلْقِ كَآفَّةً۔ میں سب لوگوں کیطرف بھیجا گیا ہوں (مشکوۃ المصابیح)

ان تمام آیات و احادیث سے ثابت ہُوا۔ کہ آنحضرت صلعم کی بعثت تمام دنیا کے لئے تھی۔ اور مسیحی مصنفین کا اعتراض باطل ہے۔ اسی طرح ان آیات و احادیث سے یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ جس قوم کو نبی پہلے مخاطب کرتا ہے۔ اس کی زبان میں اس کو الہام ہوتا ہے۔ اور پھر وہ لوگ بات کو سمجھ کر دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔

جس قوم کو نبی پہلے مخاطب کرتا ہے اسی زبان میں اس کو الہام ہوتا ہے

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ عربی ام الالسنہ ہے۔ کیونکہ جو رسول عرب میں آیا۔ اسی کے سپرد سب دنیا کی اصلاح کی گئی۔ پس عربی میں نازل ہونیوالی وحی کو سب دنیا کے لئے ہدایت قرار دینے سے یہ امر ثابت ہوتا ہے۔ کہ عربی کسی نہ کسی رنگ میں ساری زبانوں کی ماں ہے۔ اور دوسری زبانیں اس کی بیٹیوں کی طرح ہیں۔

تبیین کے بعد ہی گمراہی کا فتوےٰ لگایا جاسکتا ہے۔

غیر مبائعین کے الزام کی تردید

آریوں کے ایک اعتراض کا رد

اس آیت میں آریوں کے اس اعتراض کا بھی رد ہوجاتا ہے۔ جو وہ یوں کرتے ہیں۔ کہ کلام الٰہی ایسی زبان میں آنا چاہیئے۔ جسکو کوئی بولتا نہ ہو۔ تاکہ سب میں برابری رہے۔ مگر قرآن کریم کہتا ہے۔ کہ ایسی زبان میں وحی ہونی چاہیئے جس کو لوگ بولتے ہوں۔ تاکہ نبی ان کو سمجھا سکے۔ اور وہ سمجھ سکیں۔ جس زبان کو دُنیا نہ

آریوں کے عقیدہ اور قرآن کریم کے بیان میں فرق

ھو العزیز الحکیم کے معنے

بول سکتی ہے۔ نہ سمجھ سکتی ہے اس میں کلام الٰہی آنے کا فائدہ کیا ہُوا۔ آریوں کا یہ عقیدہ اس طرح بھی غلط ہے۔ کہ جب وید نازل ہوئے۔ اگر اسی وقت رشیوں نے اُسے نہیں سمجھا۔ تو ان کا نزول بے فائدہ ہوجاتا ہے۔ اور اگر ان کو وید سمجھادیا گیا تھا۔ تو پھر برابری نہ رہی۔ اور اگر اس وقت لوگ موجود تھے۔ اور انہیں بھی سمجھادیا گیا تھا۔ تو گو اس وقت کے لوگوں کے لئے برابری ہوگئی مگر جو لوگ بعد میں پیدا ہوئے۔ اُن کے لئے برابری کہاں رہی۔ اب تو پنڈت تک ویدوں کی زبان سے ناواقف ہو رہے ہیں۔

چونکہ اس زمانہ کے مامور حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر عربی کے بعد اُردو میں الہام زیادہ کثرت سے ہُوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ اس آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے۔ کہ آئندہ زبان ہندوستان کی اردو ہوگی۔ اور دوسری کوئی زبان اس کے مقابل پر نہیں ٹھہر سکے گی۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمْ کے بعد يُضِلُّ اللّٰهُ لانے میں اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ فرمایا ہے۔ کہ اگر سمجھنے کے سامان نہ ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ گمراہ قرار نہیں دیتا۔ الزام ہمیشہ اسی وقت قائم کیا جاتا ہے۔ جبکہ پہلے سمجھایا جاچکا ہو۔ گویا تبیین کے بعد ہی گمراہی کا فتویٰ لگایا جاسکتا ہے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ جس قوم کو کسی بات کا یقینی علم نہ پہنچے۔ اس وقت تک ان کو نہ ماننے کی وجہ سے سزا نہیں دی جاسکتی۔ اس ضمن میں ہی میں وہ الزام بھی دُور کرنا چاہتا ہوں۔ جو غیر مبایعین کی طرف سے ہم پر لگایا جاتا ہے۔ کہ گویا ہم ہر شخص کو قابل سزا سمجھتے ہیں۔ خواہ اس کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دعویٰ پہنچا ہو یا نہ۔ یہ الزام غلط ہے۔ ہم یہ اعتقاد کیسے رکھ سکتے ہیں جبکہ قرآن شریف میں صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ تباہی کا فتویٰ اُسی وقت لگتا ہے جبکہ تبیین ہوچکی ہو۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ وہ غالب ہے۔ سزا دے سکتا ہے لیکن حکیم ہے اس لئے جب تک سزا کے وجوہ نہ ہوں۔ اس وقت تک سزا دیتا نہیں۔

۵ مسند احمد بروایت حضرت جابر

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ وَاِذْ

(کیونکہ) بلاشبہ اس میں ہر ایک پورے صابر (اور) پورے شکر گذار کے لئے کئی نشان (پائے جاتے) ہیں۔ ۵۶ اور (اے مخاطب

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

تو اس وقت کو بھی یاد کر) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے میری قوم) تم اپنے پر اللہ (تعالیٰ) کا (اس وقت کا) انعام یاد کرو

اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ

جب اس نے تمہیں فرعون کے ساتھیوں سے اس حالت میں بچایا تھا۔ کہ وہ تمہیں سخت عذاب

الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ

دیتے تھے اور تمہارے بیٹوں کو مار دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے۔

۵۶ **حل لغات**۔ وَذَكِّرْهُمْ ذَكَّرَ النَّاسَ وَعَظَهُمْ۔ ذَكَّرَ النَّاسَ کے معنے ہیں۔ کہ اس نے لوگوں کو نصیحت کی۔ ذَكَّرَهٗ۔ جَعَلَهٗ يَذْكُرُ۔ اس کو یاد دلایا (اقرب) اَيَّامِ اللّٰهِ۔ نِعَمُهٗ وَنِقَمُهٗ۔ ایام اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے انعامات اور عذاب ہیں (اقرب) پس ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ کے یہ معنے ہونگے۔ کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب اور انعامات یاد دلا۔ صَبَّار۔ صَبَرَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنے بہت صبر کرنے والا۔ صبر کے لئے دیکھو رعد ۵۲۳ شَكُوْر۔ شَكَرَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اور شکر کبھی بغیر صلہ اور کبھی "لَ" کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی شَكَرَهٗ وَشَكَرَ لَهٗ اور اگر شکر کا "لَ" صلہ آئے۔ تو یہ زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے۔ اور شَكَرَهٗ وَشَكَرَ لَهٗ کے معنے یہ ہوتے ہیں اَثْنٰى عَلَيْهِ بِمَا اَوْلَاهُ مِنَ الْمَعْرُوْفِ۔ کہ کسی کے احسان کے باعث اس کی تعریف کی۔ گویا اقرارِ احسان اظہارِ قدر کے ساتھ شکر کہلاتا ہے۔ اور کثرت کے ساتھ اقرارِ احسان کرنے والے کو شکور کہتے ہیں۔

تفسیر:۔ فرمایا کہ جو کام تیرے سپرد ہوا ہے۔ ویسا ہی کام موسیٰ علیہ السلام کے سپرد ہوا تھا۔ پس تیرے متعلق بحث کرتے ہوئے مخالف اور موافق کو موسیٰ کے حالات مدنظر رکھنے چاہئیں۔ یہ بھی فرمایا۔ کہ موسیٰ کے معاملے میں ہر صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے کے لئے نشانات ہیں۔ یعنی جیسے موسیٰ کی قوم نے صبر کیا تھا۔ اور نتیجہ اچھا نکلا تھا۔ بعینہٖ اسی طرح معائب آئیں گے۔ جب تک مسلمان استقلال سے کام نہیں کرینگے کامیابی مشکل ہے۔ اسی طرح یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ موسیٰ کی قوم نے انعام کے بعد شکر نہ کیا۔ اور سزا پا گئی۔ تمہیں چاہیئے کہ انعاماتِ الٰہیہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا کرو۔ اور ان کی بے قدری نہ کیا کرو۔ اگر تم ایسا نہ کروگے۔ تو تمہارے لئے بھی اچھا نتیجہ نہ نکلیگا۔

ؔ مسلمانوں کو صبر اور شکر کرنے اور استقلال سے کام کرنے کی نصیحت

ؔ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ سے یہ بتایا ہے۔ کہ ظلمات سے نور کی طرف نکالنے کے طریق یہ ہیں۔ کہ (۱) نعمائے الٰہی کی طرف توجہ دلائی جائے۔ اور (۲) سزاؤں سے خوف دلایا جائے۔ کیونکہ ایام اللہ سے مراد خاص انعامات یا خاص سزاؤں کے ایام ہوتے ہیں۔

ؔ ذکرھم بایام اللہ کے دو معنے

آج کل کے تعلیم یافتہ اس پر بہت زور دیتے ہیں کہ خوف سے جو ایمان پیدا ہو، وہ ایمان نہیں۔ حالانکہ یہ تعلیم فطرت کے خلاف ہے۔ دنیا کا بہت سا حصہ ایسا ہے۔ جو

ع ۱۳ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ۝ وَاِذْ تَاَذَّنَ

اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے (تمہارے لئے) بڑا (بھاری) امتحان تھا ۵ اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب

رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ

تمہارے رب نے (انبیاء کے ذریعے) اعلان کیا تھا۔ کہ (اے لوگو) اگر تم شکر گزار بنے تو میں تمہیں (اور بھی) زیادہ دونگا۔ اور اگر تم نے ناشکری

اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ۝ وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا

کی تو یاد رکھو کہ) میرا عذاب یقیناً سخت (ہوا کرتا) ہے ۵ اور موسیٰ نے (اپنی قوم سے یہ بھی) کہا تھا۔ (کہ) اگر تم اور جو دوسرے

خدا تعالیٰ کی گرفت اور سزا پر زور دئے جانے کی وجہ

نیکی کیطرف پہلا قدم خوف سے اٹھتا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کی گرفت اور سزا پر زور نہ دیا جائے۔ تو یہ طبقہ بالکل نیکی سے محروم رہ جائیگا۔ کامل ہدایت وہ نہیں۔ جو صرف کاملوں کے لئے ہو کامل ہدایت وہ ہے جس میں ادنیٰ حالت کے انسانوں کے لئے بھی علاج موجود ہو۔

یسومونکم

ذبح کے معنی لغت میں ہلاک کرنے کے آتے ہیں۔

فرعون بنی اسرائیل کے بچوں کو دریا میں ڈلوا دیتا تھا۔

کہ حل لغات۔ يَسُوْمُوْنَكُمْ۔ سَامَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور سَامَ فُلَانًا الْاَمْرَ کے معنے ہیں كَلَّفَهٗ اِيَّاهُ یعنی کسی کو بامشقت کام کرنے کا حکم دیا وَاَكْثَرُ مَا يُسْتَعْمَلُ فِي الْعَذَابِ وَالشَّرِّ۔ اس کا اکثر استعمال عذاب اور دکھ کے معنوں میں ہوتا ہے (اقرب) اَلسَّوْمُ اَصْلُهُ الذِّهَابُ فِي ابْتِغَاءِ الشَّيْءِ سوم کے اصل معنے کسی چیز کی تلاش میں جانے کے ہیں۔

یسومونکم سے مراد ذلت آمیز سلوک ہے۔

فَهُوَ لَفْظٌ لِمَعْنًى مُرَكَّبٍ مِنَ الذِّهَابِ وَالْاِبْتِغَاءِ پس سوم کا لفظ در اصل مرکب معنے رکھتا ہے۔ یعنی کسی جگہ جانا۔ اور کسی چیز کو تلاش کرنا۔ اور بعض دفعہ صرف جانے کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ جیسے سَامَتِ الْاِبِلُ۔ کہ اونٹ چرنے کے لئے گئے اور کبھی صرف ابتغاء کے جیسے يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کہ وہ تمہیں سخت عذاب دینا چاہتے تھے۔ (مفردات)

یذبحون

يُذَبِّحُوْنَ۔ ذَبَحَ سے ہے۔ اور الذَّبْحُ کے معنے ہیں اَلْهَلَاكُ۔ مار دینا۔ ہلاک کرنا (تاج) اور يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ کے معنے ہوں گے۔ کہ وہ تمہارے بیٹوں کو مار دیتے تھے۔

البلاء

البلاء۔ بلاء کے معنے اصل میں امتحان کے ہونے ہیں لیکن امتحان چونکہ کبھی انعام کے ذریعہ سے اور کبھی سزا کے ذریعہ سے لیا جاتا ہے۔ اس لئے بلاء کے اندر دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں بلاء انعام بھی اور بلاء تکلیف بھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ (اعراف ع ۲۱)

تفسیر۔ ذبح کے معنے ہلاک کرنے کے بھی لغت میں ہیں۔ اور چونکہ بائبل میں لکھا ہے۔ کہ فرعون بنی اسرائیل کے بچوں کو دریا میں ڈلوا دیا کرتا تھا۔ اس لئے ذبح کرنے کی بجائے ہلاک کرنے کے معنے زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ تورات کی کتاب خروج میں لکھا ہے۔" اور فرعون نے اپنے سب لوگوں کو تاکید کر کے کہا۔ کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو۔ تم اُسے دریا میں ڈال دو۔ اور جو بیٹی ہو جیتی رہنے دو۔" (باب ۱ آیت ۲۲)

يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ سے مراد وہ ذلت آمیز سلوک ہے جو فرعون بنی اسرائیل سے کرتا۔ مثلاً بھاری ٹیکس۔ بیگار وغیرہ لکھا ہے۔" انہوں نے ان پر خراج کے لئے محصل بٹھلائے۔ تاکہ انہیں اپنے سخت کاموں کے بوجھوں سے ستائیں۔ اور انہوں نے فرعون کے لئے خزانے کے شہر توم اور رعمسیس بنائے۔" (خروج باب ۱ آیت ۱۱) نیز لکھا ہے۔" انہوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے انکی زندگی تلخ کی" (خروج باب ۱ آیت ۱۴)

بلاء کے معنی امتحان کے ہیں خواہ بذریعہ عذاب لیا جائے یا بذریعہ انعام۔ چونکہ بنی اسرائیل کی آزمائش لڑکوں کے قتل سے اور لڑکیوں کو بچا کر کی گئی تھی اس لئے بلاء کا لفظ استعمال کیا گیا۔ جو دونوں قسم کے معنوں پر دلالت کرتا ہے۔

شہ حل لغات۔ تَاَذَّنَ الرَّجُلُ۔ اَقْسَمَ۔

تاذن سے

اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ

لوگ) زمین میں رہ بستے) ہیں سب (کے سب) بھی کفر اختیار کر لو تو (اس میں خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں ہو سکتا کیونکہ) اللہ (تعالیٰ) یقیناً بے نیاز (اور

حَمِيْدٌ ۝ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

بہت ہی تعریفوں والا ہے ۹ کیا جو لوگ تم سے پہلے تھے یعنی نوح کی قوم اور عاد اور

قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۛ

ثمود اور جو ان کے بعد ہوئے - ان کی (نسبت) دلوں کو ہلا دینے والی خبر تمہیں نہیں پہنچی (وہ ایسے نابود ہوئے اور مٹائے گئے کہ)

تاذَّنَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں قسم کھائی۔ تَاَذَّنَ الْاَمْرَ (متعدی) اَعْلَمَهٗ کسی معاملہ کی اطلاع دی اور بتلایا۔ اَلْاَمِيْرُ فِي النَّاسِ نَادٰی فِيْهِمْ يُهَدِّدُ وَيَنْهٰی۔ تَاَذَّنَ الْاَمِيْرُ کے معنے ہیں کہ امیر نے لوگوں میں حاکمانہ اعلان کیا (اقرب) وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ کے معنے ہوں گے۔ کہ اس وقت کو یاد کرو۔ کہ جب تمہارے رب نے اعلان کیا اور اس بات کی اطلاع دی۔ كَفَرَ- كَفَرَ نِعْمَةَ اللّٰهِ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ كُفْرَانًا کے معنے ہیں۔ جَحَدَهَا وَسَتَرَهَا یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار اور ان کی ناشکری کی۔ اور ان کو ظاہر نہ کیا۔ وَهُوَ ضِدُّ الشُّكْرِ۔ کفر کا لفظ شکر کے مقابل بولا جاتا ہے۔ وَفِي الْكُلِّيَاتِ اَلْكُفْرُ تَغْطِيَةُ نِعَمِ الْمُنْعِمِ بِالْجُحُوْدِ اور کلیات میں کفر کے یہ معنے لکھے ہیں۔ کہ محسن کی نعمتوں کا انکار کرتے ہوئے ان پر پردہ ڈالنا اور ان کا اقرار نہ کرنا۔ (اقرب) پس اِنْ كَفَرْتُمْ کے معنے ہوں گے۔ کہ اگر تم میری نعمتوں کی ناشکری کرو۔ شکر تم۔ شکر کی تشریح کے لئے دیکھو ابراہیم ۵۔

تفسیر۔ اس آیت میں ایک عظیم الشان قانون بتایا ہے۔ کہ تمام ترقیات شکر کے ساتھ وابستہ ہیں۔ شکر کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بیان کیا گیا ہے۔ احسان ماننا اور محسن کی ثنا کرنا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر اسی طرح سے ہوتا ہے۔ کہ انسان اس کی دی ہوئی چیز کو عمدگی کے ساتھ اور برمحل استعمال کرے۔ جب کوئی شخص کسی کی دی ہوئی چیز کو استعمال نہ کرے۔ تو اسکی تعریف کرنا صرف لفظی ثنا ہوگی۔ شکر نہ ہوگا۔ شکر کیلئے ضروری ہے کہ صحیح استعمال اور صحیح مصرف بھی ہو۔ یہ قانون تمام ترقیات کا گر ہے۔ اگر علم کا صحیح استعمال کیا جائے گا۔ تو علم ضرور بڑھیگا۔ آنکھ۔ ہاتھ۔ ناک۔ کان غرض ہر عضو جس کا صحیح استعمال کیا جائے وہ ضرور ترقی پذیر ہوتا ہے۔ یہ ایک عام قانون ہے۔ اس میں ہندو مسلم یا عیسائی کی کوئی تمیز نہیں۔ مسلمان مال کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔ وہ گر رہے ہیں۔ مگر ہندو اس کا صحیح استعمال کرنے کی وجہ سے ترقی کر رہے ہیں۔

روحانیات کا بھی یہی حال ہے۔ قرآن کریم ہی کو دیکھو مسلمان اس کا صحیح استعمال کرتے تھے۔ تو نہ فلسفہ اور عقلیات اور نہ عیسائیت اور یہودیت وغیرہ مذاہب۔ اسلام کے مقابلہ کی تاب لا سکے۔ مگر آج وید۔ توراۃ اور انجیل ہر ایک اپنے آپ کو آگے آگے پیش کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف علوم عقلیہ اس پر حملہ آور ہیں کبھی اسلام کفر کو کھاتا تھا۔ آج کفر اسلام کو کھا رہا ہے جب مسلمان ہی اسلام کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ کہ اس کا یہ حکم بھی ناقابل عمل ہے اور وہ بھی۔ تو اس کا باقی کیا رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھ دے کہ اپنے عیب کو اسلام کی طرف منسوب نہ کریں۔ عمل تو وہ خود صحیح طور پر نہیں کرتے لیکن نتیجہ کی خرابی کو قرآن کریم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

تَاَذَّنَ

شکر میں صحیح استعمال اور صحیح مصرف کا ہونا ضروری ہے

كَفَرَ

مسلمانوں پر ادبار کی وجہ

شَكَرْتُمْ

تمام ترقیات شکر کے ساتھ وابستہ ہیں۔

۹ حل لغات۔ غَنِيٌّ۔ غنی میں سے صفت مشبہ ہے غَنِيَ اور غَنِيَ فُلَانٌ غِنًى وَغَنَاءً کے معنے ہیں۔ ضِدُّ فَقُرَ اَيْ كَثُرَ مَالُهٗ وَكَانَ ذَا وَفْرٍ۔ کہ مالدار ہو گیا۔ اور ہر چیز کثرت سے

لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ

اللہ تعالیٰ کے سوا (اب) انہیں کوئی (بھی) نہیں جانتا۔ (جب) ان کے پاس ان کے رسول (ہمارے) روشن نشان لے کر آئے

بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فِيْۤ اَفْوَاهِهِمْ وَ

تو انہوں نے ان کی بات نہ مانی اور کہا کہ جس (تعلیم) کے ساتھ تمہیں بھیجا گیا ہے۔ اس

قَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِيْ شَكٍّ

کا (تو) ہم انکار کر چکے ہیں۔ اور جس بات کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو اس کے متعلق ہم

مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ قَالَتْ رُسُلُهُمْ

ایک بے چین کر دینے والے شک میں (پڑے ہوئے) ہیں ۱۰ ان کے پیغمبروں نے (انہیں) کہا

میسر آگئی۔ غنی بہٖ عَنْ غَيْرِهٖ اَلْكَفٰى بِهٖ یعنی اس چیز کے میسر آ جانے سے دوسروں کی مدد کا محتاج نہ رہا۔ اَلْغَنِيُّ اَلْمُكْتَفِيْ مِنَ الرِّزْقِ ضرورت کے مطابق رزق والا۔ وَهُوَ غَنِيٌّ عَنْهُ

النبأ

ای مُسْتَغْنٍ هُوَ غَنِيٌّ عَنْهُ کے معنے ہیں۔ اس سے بے نیاز (اقرب) علاوہ ازیں غَنِیٌّ کے معنے ہیں عَدَمُ الْحَاجَاتِ حاجات کا نہ ہونا (مفردات) پس غنیؒ کے معنے ہوں گے۔ ایسی ذات جسے کسی قسم کی حاجت نہ ہو۔ یعنی بے نیاز۔

تفسیر حضرت موسیٰ فرماتے ہیں۔ کہ یہ جو خدا تعالیٰ بار بار نبیوں کے ذریعہ ہدایت بھیجتا ہے۔ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا کو کوئی ضرورت ہے۔ اس کو کوئی ضرورت نہیں۔ وہ تمہارے فائدہ کے لئے بھیجتا ہے۔ ورنہ وہ تو بے احتیاج ہستی ہے۔ اس آیت میں اس سوال کا جواب آ جاتا ہے جو آج کل کے تعلیم یافتہ کیا کرتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ کا کلام بھیجنا اس کے محتاج ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ فرماتا ہے۔ کہ غنی کو دوسرے کی کیا احتیاج ہو سکتی ہے۔ ہاں چونکہ وہ حمید ہے اس لئے ڈوبتوں کو بچاتا ہے۔ اس میں یہ نکتہ بتایا۔ کہ ہر کام اپنی احتیاج سے نہیں کیا جاتا۔ بلکہ کبھی کام دوسرے کی احتیاج کو دور کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ جو لوگ خود غرض ہیں۔ وہ اپنے پر

الید

خدا تعالیٰ کا کلام بھیجنا اس کے محتاج ہونے کی دلیل نہیں

قیاس کر کے خیال کر لیتے ہیں۔ کہ جو بھی کام کیا جائے۔ احتیاج ہی کے سبب ہوتا ہے۔ حالانکہ احتیاج اور احسان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

۱۰ حل لغات ۔ اَلنَّبَأُ اَلْخَبَرُ ۔ نبا کے معنے ہیں خبر ۔ يُقَالُ اَتَانِيْ نَبَأٌ مِّنَ الْاَنْبَاءِ چنانچہ اتانی نبا من الانباء کا محاورہ انہی معنوں کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کہ میرے پاس ایک خبر آئی۔ وَقَالَ فِي الْكُلِّيَاتِ النَّبَأُ وَالْاَنْبَاءُ لَمْ يَرِدَا فِي الْقُرْاٰنِ اِلَّا لِمَا لَهٗ وَقْعٌ وَ شَانٌ عَظِيْمٌ ۔ اور کلیات میں النبأ کے متعلق یہ لکھا ہے۔ کہ قرآن مجید میں اس کا استعمال ایسے واقعہ اور خبر پر ہوتا ہے جو عظیم الشان اور دل ہلا دینے والی ہوتی ہے۔ (اقرب) پس اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا کے معنے ہونگے۔ کیا تمہارے پاس دل ہلا دینے والی خبر نہیں پہنچی۔ اَلْيَدُ ۔ اَلْكَفُّ ۔ يَدٌ کے معنے ہیں ہتھیلی۔ اَوْ مِنْ اَطْرَافِ الْاَصَابِعِ اِلَى الْكَتِفِ نیز يَد کا استعمال انگلیوں کے پوروں سے لیکر کندے تک کے لئے بھی ہوتا ہے۔ اس کی جمع اَيْدٍ اور يُدِيٌّ اور جمع الجمع اَيَادٍ ہے۔ اور ایادی کا اکثر استعمال نعمت اور احسان پر ہوتا ہے۔ اور يَد کے کئی اور معنی بھی ہیں۔ مثلاً اَلْجَاهُ ۔ عزت ۔ اَلْوَقَارُ ۔ وقار۔

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَدْعُوْکُمْ

(کہ) کیا تمہیں (اللہ تعالیٰ) کے متعلق کوئی شک ہے۔ جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنیوالا ہے۔ وہ تو تمہیں بلا رہا ہے

لِیَغْفِرَ لَکُمْ مِّنْ ذُنُوْبِکُمْ وَیُؤَخِّرَکُمْ اِلٰۤی اَجَلٍ

تاکہ وہ تمہارے (فائدہ کے) لئے تمہارے گناہوں میں سے بعض بخش دے۔ اور ایک مقرر میعاد تک تمہیں

یُقَال لہٗ یدٌ عند الناس۔ چنانچہ جب لہٗ یدٌ عِنْدَ النَّاسِ کا فقرہ بولتے ہیں۔ تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے۔ کہ فلاں شخص کو لوگوں کے ہاں عزت و رتبہ حاصل ہے۔ اَلطَّرِیْقُ۔ طریق۔ اَلْقُوَّۃُ وَالْقُدْرَۃُ۔ طاقت۔ وَالسُّلْطٰنُ۔ - وَالْوِلَایَۃُ۔ غلبہ یُقَالُ مَالَکَ عَلَیْہِ یدٌ ای ولایۃٌ۔ چنانچہ مالک علیہ ید میں ید کے لفظ سے مراد ولایت ہی ہے۔ اَلْمِلْکُ۔ ملکیت۔ الجماعَۃُ۔ جماعت۔ الغِیاث۔ فریادرسی۔ اَلنِّعْمَۃُ وَالْاِحْسَانُ تَصْطَنِعُہٗ۔ نعمت و احسان جو کسی پر کی جائے وھَذا فی یدِیْ ای مِلْکِی ھٰذا فِی یَدِی کے معنے ہیں۔ کہ یہ چیز میری ملکیت ہے۔ اور الامرُ بِیَدِ فُلانٍ کہہ کر یہ مراد لیتے ہیں۔ اَیْ فِی تَصَرُّفِہٖ کہ معاملہ فلاں کے تصرف میں ہے۔ ویدَ الرِّیْحِ سُلْطَانُھَا۔ اور جب ید کا لفظ ریح کی طرف مضاف ہو۔ تو اس کے معنے ہوتے ہیں۔ ہوا کی تیزی و تندی۔ (اقرب) پس یَد کے مختلف معنوں کے لحاظ سے رَدُّوْٓا اَیْدِیَھُمْ فِیْۤ اَفْوَاھِھِمْ کے مختلف معانی ہوں گے۔ اوّل منکرینِ انبیاء نے اپنے ہاتھ اپنے مُنہ کی طرف لوٹا دئے۔ یعنی حیرت زدہ ہوگئے (۲) انہوں نے اپنے ہاتھوں کو اپنے مونہوں پر رکھا۔ اور نبیوں کو کہا۔ کہ بولو مت۔ خاموش ہوجاؤ (۳) منکرین نے نبیوں کے احسانوں کو ان کے مونہوں پر دے مارا۔

مُرِیْبٌ۔ اَرَابَ سے اسم فاعل ہے۔ اور اَرَابَ زَیدًا کے معنے ہیں اَقْلَقَہٗ وَاَزْعَجَہٗ۔ کہ زید کو کسی معاملہ نے بے چینی اور گھبراہٹ میں ڈال دیا (اقرب) اور مُرِیْب کے معنی ہوں گے۔ بے چین کر دینے والا۔ گھبراہٹ میں ڈالنے والا۔

تفسیر۔ لَا یَعْلَمُھُمْ اِلَّا اللّٰہُ سے نکلتا ہے۔ کہ غیر قوموں میں بھی نبی آتے رہے۔ عاد اور ثمود کے بعد تو ابراہیمی نسل شروع ہو گئی تھی۔ اور ابراہیمی نسل کے انبیاء کا ذکر قرآن مجید اور تورات میں موجود ہے۔ پس مِنْ بَعْدِھِمْ سے مراد ابراہیمی نسل کے سوا دوسری نسلیں ہیں۔ جن کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ یعنی کتب سماویہ جو ایک حد تک محفوظ ہیں۔ ان میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ابراہیمی زمانہ میں بھی غیر قوموں میں نبی آرہے تھے۔ بعض تاریخوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیم کا زمانہ اور ثمود کا زمانہ برابر چل رہے تھے۔ اگر یہ درست ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ اسی وقت سے ہی غیر قوموں میں نبی آرہے تھے۔

(حاشیہ: سب قوموں میں نبی آتے رہے۔)

رَدُّوْٓا اَیْدِیَھُمْ کے متعلق مفسرین میں بہت کچھ اختلاف ہوا ہے۔ اور زیادہ مشکل لفظ فی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اگر علیٰ آتا۔ تو معنے صاف تھے۔ رَدَّ فِیْہِ چونکہ نئی قسم کا محاورہ ہے۔ اس لئے مختلف معانی کئے گئے ہیں۔ بعض نے اس کے معنے یوں کئے ہیں (۱) کہ "منکرین انبیاء نے اپنے ہاتھ اپنے مُنہ کی طرف لوٹا دئے"۔ یعنی وہ انبیاء کی باتیں سُن کر حیرت سے انگشت بدندان ہوگئے۔ اور انہوں نے اس کو عجیب بات سمجھا۔ کسی کی بات سُن کر اس طرح مُنہ پر ہاتھ رکھنا استہزاء اور تمسخر کا ایک طریق ہے۔ ہمارے ملک میں عورتوں میں اس کا بہت رواج ہے۔ غالباً مُنہ پیٹ لینے کا اشارہ اس میں پایا جاتا ہے۔ (۲) بعض نے فی کے معنے علیٰ کے کئے ہیں۔ جو لغتہً درست ہیں۔ اس صورت میں یہ معنے ہوں گے۔ کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو اپنے مونہوں پر رکھا۔ اور کہا۔ کہ بولو مت خاموش ہوجاؤ۔ یہ عام دستور بھی ہے۔ خاموش کرانے کے لئے مُنہ پر ہاتھ رکھا جاتا ہے۔

(حاشیہ: رَدُّوْا اَیْدِیَھُم کے معنوں میں مفسرین کا اختلاف)

(حاشیہ: مُرِیْب)

(حاشیہ: فی بمعنے علیٰ)

مُّسَمًّى ؕ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ

تاخیر دے۔ انہوں نے کہا (کہ) تم (تو) ہماری ہی طرح کے انسان ہو۔ تم چاہتے ہو

اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا

کہ جس چیز کی ہمارے باپ دادا پرستش کرتے چلے آتے ہیں اس سے ہمیں ہٹا دو۔ پس (اگر

بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ○ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ

اس معاملہ میں تم حق پر ہو۔ تو) ہمارے پاس کوئی روشن نشان لاؤ ۵؎ ان کے پیغمبروں نے انہیں کہا (کہ یہ سچ ہے کہ)

نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى

ہم تمہاری (ہی) طرح کے بشر ہیں۔ لیکن (ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ) اللہ (تعالٰے) اپنے بندوں میں سے

میرے نزدیک اس مشکل کو حل کرنے کے لئے لفظ یدٌ کے اور معنوں کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ لغت میں لکھا ہے۔ کہ ید کے معنے نعمت اور احسان کے بھی ہوتے ہیں۔ ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ انہوں نے نبیوں کے احسان کو ان کے منہ پر دے مارا۔ اور کہا۔ کہ اپنی تعلیم تم اپنے گھر لے جاؤ۔ ہم نہیں سنتے۔ گویا نبیوں کی تعلیم کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اور کہا کہ ہم اسے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اُردو میں بھی اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ایک فارسی جملہ عطاء تو بلقاء تو بولا جاتا ہے۔ آیت کا اگلا حصہ بھی انہی معنوں کی تائید کرتا ہے۔ فرماتا ہے۔ وَقَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ۔ انہوں نے کہا۔ کہ ہم اس تعلیم کا انکار کرتے ہیں جس کے ساتھ تمہیں بھیجا گیا ہے۔ اور ہمیں اس تعلیم سے جس کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو۔ اضطراب میں ڈالنے والے شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔

ید کے معنی احسان کے بھی ہوتے ہیں

آیت کا اگلا حصہ بھی احسان کے معنوں کی تائید کرتا ہے۔

فاطر کا لفظ پیدائش کی ابتدا کے متعلق اشارہ کرتا ہے۔

فاطر

۵؎ حل لغات۔ فاطر۔ فَطَرَ سے اسم فاعل ہے اور فَطَرَ الشَّيْءَ يَفْطُرُهٗ فَطْرًا کے معنی ہیں شَقَّهٗ۔ اس چیز کو پھاڑ دیا۔ اَلْعَجِيْنَ۔ اِخْتَبَزَهٗ مِنْ سَاعَتِهٖ وَلَمْ يُخَمِّرْهٗ۔ جب آٹے کے متعلق یہ لفظ استعمال ہو۔ تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں۔ کہ گوندھتے ہی روٹی پکالی۔ اور خمیر نہ ہونے دیا۔ فطر الامرَ اِخْتَرَعَهٗ۔ کوئی چیز بنائی۔ وَابْتَدَعَهٗ۔ بغیر نمونہ کے بنائی۔ وَاَنْشَاَهٗ۔ اور اسے پیدا کر کے نشوونما دی۔ پس فَاطِر السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے معنے ہوں گے۔ آسمان اور زمین کو بغیر نمونہ کے بنانے والا۔ (اقرب) گویا فاطر کا لفظ پیدائش کی ابتداء کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اَلْمُسَمّٰى۔ المعلومُ اَلْمُعَيَّنُ۔ مقرر، معین (اقرب) اور اجل مسمّٰی کے معنے ہوں گے۔ مقررہ میعاد۔ اَلسُّلْطَانُ۔ اَلْحُجَّةُ۔ سلطان کے معنے ہیں دلیل۔ التَّسَلُّطُ۔ قبضہ وقدرة الْمَلِكِ۔ بادشاہ کی طاقت (اقرب) تو فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ کے معنے ہوں گے۔ ہمارے پاس کوئی روشن نشان اور دلیل لاؤ۔ یا اپنی طاقت کا اظہار کرو۔

تفسیر:۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قال ابن عباس كُنْتُ لَا اَدْرِيْ مَا هُوَ فاطر السّمٰوٰتِ حَتّٰى اَتَانِيْ اَعْرَابِيَانِ يَخْتَصِمَانِ فِيْ بِئْرٍ فَقَالَ اَحَدُهُمَا اَنَا فَطَرْتُهَا اَيْ اَنَا ابْتَدَأْتُهَا (اقرب) ابن عباس کہتے ہیں۔ کہ فاطر کے معنے پوری طرح مجھ پر نہ کھلے تھے۔ لیکن

مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ

جس پر چاہتا ہے (خاص) احسان کرتا ہے۔ اور یہ بات ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ اللہ (تعالیٰ)

بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

کے حکم کے سوا تمہارے پاس کوئی نشان لائیں۔ اور مومنوں کو اللہ (تعالیٰ) پر ہی توکل

ایک دفعہ میرے پاس دو اعرابی ایک کنوئیں کے بارہ میں جھگڑتے ہوئے آئے۔ اور ان میں سے ایک نے کہا کہ اَنَا فطرتُھا میں نے اس کنوئیں کو پہلے بنانا شروع کیا تھا۔ تب اس لفظ کے معنی مجھے معلوم ہوئے۔

ابن عباس کی اس روایت سے معلوم ہوا کہ فاطر کا لفظ پیدائش کی ابتدا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور قرآن شریف نے پیدائش کے چار مراتب بیان فرمائے ہیں۔

۱۔ خلق کا وہ مرتبہ جس سے پہلے کسی قسم کا کوئی وجود موجود نہ تھا۔

۲۔ خلق کا وہ مرتبہ جب مادہ تو تھا۔ مگر اس سے آگے کوئی چیز متشکل ہونی شروع نہ ہوئی تھی۔

۳۔ خلق کا وہ مرتبہ جب اجتماع کے ذریعہ سے مادہ کے اندر مختلف قسم کی طاقتیں پیدا ہونی شروع ہوئیں۔ اور قوانین تیار ہونے لگے جس کی تکمیل کا نام قانونِ قدرت ہے۔

۴۔ خلق کا وہ مرتبہ جبکہ ان قوانین کے مطابق خلق میں تحرک شروع ہوا۔ یعنی نسل اور ولادت وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ جیسے انسان سے انسان کا پیدا ہونا۔ غلہ کا غلہ سے نکلنا۔

فطور کا لفظ چونکہ ایک چیز کے دوسری چیز سے نکلنے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے فاطر کے لفظ سے پیدائش کے دوسرے مرحلہ کو بیان کرنا مقصود ہے۔

انبیاء کہتے ہیں۔ کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے کہنے پر وعظ کرتے ہیں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ تو کیا تم کو اللہ کے متعلق شک ہے کہ وہ الہام بھیج سکتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ شک ہے تو بالکل غلط ہے کیونکہ وہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس کی نسبت یہ امید رکھنا کہ وہ مخلوق کو پیدا کر کے روحانی ہدایت کے بغیر چھوڑ دے گا عقل کے خلاف ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ خیال کرنا بھی کہ وہ جسمانی زمین و آسمان تو پیدا کریگا۔ مگر روحانی زمین و آسمان کی پیدائش کو نظر انداز کر دیگا عقل کے بالکل خلاف ہے۔

يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ ابھی ایک سوال باقی تھا۔ اور وہ یہ کہ کفار کہہ سکتے تھے کہ ہمیں یہ تو شک نہیں۔ کہ خدا تعالیٰ ہمیں ہدایت کی طرف بلا سکتا ہے یا نہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں۔ کہ وہ بڑی شان والا ہے۔ اس کی شان کے خلاف ہے۔ کہ ہم جیسے حقیر وجودوں کو بلائے۔ (یہ خیال اب بھی تعلیمیافتہ طبقہ میں پھیلا ہوا ہے) تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ بڑی شان والے کی شان کے خلاف تو یہ امر ہوتا ہے۔ کہ وہ چھوٹوں کو اپنی مدد کیلئے بلائے نہ یہ کہ وہ چھوٹوں کی مدد کے لئے خود آئے۔ یہ فعل تو اس کی شان کے عین مطابق ہے۔ ہمارا یہ تو دعویٰ نہیں۔ کہ خدا تعالیٰ تم کو اس لئے بلاتا ہے۔ کہ تم سے کوئی فائدہ اٹھائے۔ بلکہ ہمارا تو یہ دعویٰ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہمیں اس لئے تمہاری طرف بھیجا ہے۔ کہ تا تمہاری احتیاج کو دور کرے اور تمہارے گناہوں کو معاف کرے۔ اور تمہیں ایک نئی زندگی عطا کرے۔ اس بیان کا یہ اعتراض نقل کیا کہ اگر ایسا ہوتا۔ تو خدا تعالیٰ کوئی اپنی شان کے مطابق پیغامبر بھیجتا۔ نہ کہ ہمارے جیسے ایک انسان کو بھیج دیتا۔ تم تو ہماری ہی طرح کے ایک بشر ہو۔ تم کو خدا نہیں بھیج سکتا تھا۔ پس معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم یہ سب باتیں محض ہم پر حکومت کرنے کے لئے بنا رہے ہو۔ تاکہ ہمیں اپنے آباء کی اطاعت سے ہٹا کر اپنی فرمانبرداری میں لگاؤ۔ سو اگر ہمارا یہ شبہ غلط ہے۔ تو نشانات کے ذریعہ سے اس امر کو ثابت کرو۔ کہ تم ہم سے بالا ہستی ہو۔

پیدائش کے چار مراتب

پہلا مرتبہ

دوسرا مرتبہ

تیسرا مرتبہ

چوتھا مرتبہ

فاطر کے لفظ سے دوسرے مرتبہ کو بیان کیا گیا ہے

الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَ

رکھنا چاہیئے ۵۱۲ اور ہمیں (ہُوا) کیا ہے کہ ہم اللہ (تعالیٰ) پر توکل نہ کریں۔ حالانکہ

قَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ

اس نے ہمارے (مناسب حال) راستے ہمیں دکھائے ہیں۔ اور جو دُکھ تم نے ہمیں دے رکھا ہے اس پر ہم یقیناً صبر کرتے چلے جائینگے

ع ۱۴ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ وَقَالَ

اور بھروسہ کرنے والوں کو تو اللہ (تعالیٰ) پر ہی بھروسہ کرنا چاہیئے - ۵۱۳ اور جن

۵۱۲ تفسیر۔ اس پر اللہ تعالےٰ کے رسولوں نے جواب دیا کہ بے شک ہم تمہاری ہی طرح کے آدمی ہیں۔ لیکن یہ تو سوچو۔ کہ جسے بھی خدا تعالےٰ چنتا۔ آخر وہ اس کی مخلوق میں سے ہی ہوتا۔ اور اس کی دی ہوئی طاقتوں کے ساتھ ہی آتا۔ آیا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کا شریک یا غیر مخلوق تو ہو نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ایسی کوئی ہستی ہے ہی نہیں۔ اور جب بہر حال اس نے مخلوق ہی میں سے ہونا تھا۔ تو اس پر کیا اعتراض کہ اس نے انسانوں کو اس کام کے لئے کیوں چنا۔ اپنے بندوں میں سے جسے اس نے چاہا چن لیا۔ تم اس کے اختیارات کو محدود کرنے والے کون ہو۔

هدٰنا سبلنا میں عظیم الشان نکتہ

باقی جو تم ہم سے ایسی دلیل کا مطالبہ کرتے ہو۔ کہ ہم اپنی فضیلت تم پر ثابت کریں۔ تو یہ مطالبہ ہمارے دعاوی کے خلاف ہے۔ ہم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا۔ کہ ہم بشر سے بالا ہیں۔ بلکہ بشر رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور صرف یہ دعویٰ کیا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمارے ہاتھ پر نشان دکھاتا ہے۔ اور ہمارا اس کی مدد پر انحصار ہے۔ یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ کہ ہم خود کوئی معجزہ دکھاتے ہیں۔ اور جو اصولِ دین ہم پیش کرتے ہیں۔ ان کے رو سے تو وہ شخص مومن ہی نہیں کہلا سکتا۔ جو اپنی ذاتی فضیلت کو پیش کرے وہ تو کافر ہے مومن نہیں۔

انبیاء بشریت سے بالا نہیں ہوتے

۵۱۳ حل لغات۔ هَدٰىنَا۔ ھدی کی تشریح کے لئے دیکھو رعد ۵۲۸

هَدٰنا

تفسیر۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طاقتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد ہم تو وہم بھی نہیں کر سکتے۔ کہ خدا تعالیٰ ہماری تائید اور مدد کا محتاج ہے۔ بلکہ اس کی قدرت کو دیکھ کر ہم نے تو ان طاقتوں کو بھی جو اس نے ہمیں دوسرے انسانوں کی طرح دے رکھی ہیں۔ اسی کے سپرد کر دیا ہے۔

هَدٰىنَا سُبُلَنَا سے یہ بتایا۔ کہ نبی کی فضیلت ذاتی فضیلتوں کے سبب سے نہیں ہوتی۔ بلکہ اس امر میں ہوتی ہے۔ کہ وہ انسان کی احتیاج کو ثابت کر کے آسمانی مدد کی ضرورت کو ثابت کرتا ہے۔ ان الفاظ میں یہ عظیم الشان نکتہ بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ شریعت ان امور کو بیان کرتی ہے۔ جو انسان کے اپنے فائدہ کے لئے ہوتے ہیں۔ یہ مضمون سُبُلَنَا (ہمارے راستے) کے الفاظ سے نکلتا ہے۔ یعنی وہ راستے جن کی ہمیں اپنی ترقی کے لئے ضرورت ہے۔ نہ کہ خدا کو ان کی ضرورت ہے۔

دوسرے سُبُل کا لفظ جمع رکھ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ اس تعلیم میں انسان کی مختلف ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ اور اپنے وقت کے لحاظ سے یہ مکمل شرائع ہیں۔

وَلَنَصْبِرَنَّ کے لفظ سے اپنی کمزوری کا مزید اقرار کیا ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ بجائے اپنی فضیلت اور طاقت کا دعویٰ کرنے کے ہم تو اقرار کرتے ہیں۔ کہ ظاہری سامانوں کے لحاظ سے تم ہم پر غالب ہو۔ اور ہم جانتے ہیں۔ کہ تم ہم کو ہر قسم کے دکھ دو گے۔ مگر ہم چونکہ خدا تعالےٰ کے حکم سے کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم ان دُکھوں کو پوری طرح برداشت کریں گے۔ اور ثابت کریں گے۔ کہ اپنی برتری اور فائدہ ہمارے مدنظر نہیں ہے۔ پھر وَعَلَى اللّٰهِ

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ

لوگوں نے کفر اختیار کیا۔ انہوں نے اپنے (اپنے زمانہ کے) پیغمبروں سے کہا کہ ہم تمہیں ضرور اپنے ملک سے

اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ

نکال دیں گے یا تم (مجبور ہو کر) ہمارے مذہب میں واپس آجاؤ گے (تو ان تکلیفوں سے بچ سکوگے) جس پر ان کے رب نے

رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ

ان پر وحی نازل کی (کہ) ہم ان ظالموں کو یقیناً ہلاک کر دیں گے ۱۴ اور ان (کی ہلاکت) کے بعد اس

الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَ

ملک میں ضرور تمہیں آباد کر دیں گے یہ (وعدہ) اس کے حق میں ہے جو میرے مقام سے ڈرے اور

فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ کہہ کر یہ بھی بتا دیا ہے۔ کہ ہر شخص کو دوسرے کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ کوئی شخص اکیلا اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتا تو جب سہارا لینا ہی ضروری ہے۔ اور ہر شخص کو سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے تو پھر معمولی سہارا کیوں تلاش کریں۔ کیوں نہ خدا تعالےٰ پر ہی توکل کریں۔ تا باقی سب سہاروں سے آزاد رہیں۔

اس آیت سے علاوہ اور سبقوں کے مومن کو یہ سبق بھی حاصل کرنے چاہئیں۔

۱۔ مومن کی شان یہی ہے کہ وہ صبر سے زیادہ کام لے۔ غصہ کم کرے مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ صبر اور غیرت میں فرق ہے اپنی ذات کے متعلق صبر سے کام لینا چاہیئے۔ اور دین کے کاموں کے متعلق غیرت سے مگر ناجائز غیرت نہ ہو۔ جائز غیرت ہو۔

۲۔ توکل کے متعلق تصوف کا یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ دنیا میں انسان سہارے تو ہمیشہ ڈھونڈتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ خدا پر توکل نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالےٰ پر کامل یقین لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا لیکن نبی چونکہ اس کی شفقتوں کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ اس لئے وہ اور ان کے پیرو نہایت خوشی سے خدا پر توکل کرتے ہیں۔ اور اصل کام نبیوں کا یہی ہوا کرتا ہے کہ وہ خدا کے متعلق یقین پیدا کر کے لوگوں کو متوکل بنا دیں ؞

۱۴ حل لغات

لَتَعُوْدُنَّ ..... عاد سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور عَادَ اِلٰی كَذَا وَلَهٗ کے معنے ہیں صَارَ اِلَيْهِ۔ اس کی طرف ہو گیا۔ وَرَجَعَ۔ اس کی طرف لوٹا۔ وَقِيْلَ اِرْتَدَّ اِلَيْهِ بَعْدَ مَا كَانَ اَعْرَضَ عَنْهُ۔ اور بعض عَادَ کے معنے یہ کرتے ہیں۔ کہ کسی چیز سے منہ پھیرنے کے بعد اور اُسے ترک کرنے کے بعد پھر اس کی طرف رجوع کیا۔ وَالْعَرَبُ تَقُوْلُ عَادَ اِلَیَّ مِنْ فُلَانٍ مَكْرُوْهٌ۔ اَیْ صَارَ مِنْهُ اِلَیَّ۔ اور جب عرب لوگ عَادَ اِلَیَّ مِنْ فُلَانٍ مَكْرُوْهٌ کا محاورہ بولتے ہیں۔ تو اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کہ مجھے فلاں سے تکلیف پہنچی (اقرب)

اَلْمِلَّةُ۔ اَلشَّرِيْعَةُ اَوِ الدِّيْنُ۔ شریعت اور دین کو ملت کہتے ہیں۔ وَقِيْلَ الْمِلَّةُ وَالطَّرِيْقَةُ سَوَاءٌ۔ بعض کہتے ہیں کہ ملت اور طریقہ ہم معنے لفظ ہیں۔ وَهِيَ اسْمٌ مِنْ اَمْلَيْتُ الْكِتٰبَ ثُمَّ نُقِلَتْ اِلٰی اُصُوْلِ الشَّرَائِعِ بِاعْتِبَارِ اَنَّهَا يُمْلِيْهَا النَّبِيُّ۔ اور ملت اسم ہے جو املیتُ الکتاب کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ پھر وہ شریعت کے اصول کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ کیونکہ شریعت کے اصول نبی لکھاتا ہے۔ وَقَدْ تُطْلَقُ عَلَی الْبَاطِلِ كَالْكُفْرِ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ۔ اور کبھی یہ لفظ جھوٹے مذہبوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ کے محاورہ سے ظاہر ہے۔ وَلَا تُضَافُ

توکل علی اللہ سب سہاروں سے آزاد کر دیتا ہے

مومن اپنی ذات کے متعلق صبر اور دینی کاموں کے لئے غیرت سے کام لیتا ہے

خدا تعالیٰ پر توکل نہ کرنے کی وجہ کامل یقین سے محرومیت ہے۔

انبیاء کا اصل کام یقین اور توکل پیدا کرنا ہے۔

اِلَی اللّٰہِ وَلَا اِلٰٓی اُحَادِ الْاُمَّۃِ - اور یہ اللہ کی طرف منسوب نہیں ہوتا - اور نہ امت کے کسی فرد کی طرف۔ یعنی دین اللہ تو کہہ سکتے ہیں۔ مگر ملّۃ اللہ نہیں کہہ سکتے - اسی طرح قوم کی ملّت کیلئے زید یا بکر کی ملّت کا لفظ نہیں بولیں گے - (اقرب) پس لَتَعُوْدُنَّ

باطل پرست اقوام مذہب کو سیاسی اختلاف کا باعث بنالیتی ہیں۔

فِیْ مِلَّتِنَا کے معنے ہوں گے (۱) ہماری ملّت میں آجاؤ (۲) ہمارے مذہب کو اختیار کرو - (۳) ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ۔

تفسیر - جبکہ کفار نبیوں اور ان کی جماعتوں سے لڑ رہے ہوتے ہیں - اور کامیابی کے دعویٰ پر ناراض ہو رہے ہوتے ہیں - ان کے دلوں میں ایک باریک خواہش پائی جاتی ہے - کہ یہ ہماری طرف جھکیں - اور ہماری تھوڑی سی دلجوئی کریں - تاکہ اُن کا دعویٰ برتری کا ٹوٹ جائے - اور ہماری بھی کچھ عزت بنی رہے۔

اپنی عزت قائم رکھنے کیلئے کفار کی ایک دلی خواہش

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی کفار آپ کے چچا کے پاس آئے - اور کہا کہ اگر یہ ذرہ بھی نرمی کردے - تو ہم سب مخالفت چھوڑ کر اس سے صلح کر لیں گے - لیکن آپ نے صاف فرما دیا - کہ یہ لوگ سورج کو دائیں اور چاند کو بائیں بھی لا کھڑا کریں - تو میں یہ بات نہیں مان سکتا - اس پر مخالفوں نے آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات پر اور آپ کے صحابہ پر ایسا حملہ شروع کیا کہ جسے آخری حملہ کہنا چاہیئے - جس کا اختتام ہجرت پر ہوا - اس قسم کے واقعات ہر نبی کو پیش آتے ہیں - اور اس آیت سے پہلے کی آیات میں کفار کی اس خواہش کیطرف بھی اشارہ کیا گیا تھا - تبھی بار بار توکل کا لفظ استعمال کیا گیا تھا اور کہہ دیا گیا تھا کہ ہم تمہاری تمام ایذاؤں کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں - اس پر کفار نے سمجھ لیا کہ اب یہ لوگ کسی ایسی صلح پر تیار نہیں - جس میں ہماری بھی کچھ عزت رہ جائے - اور انہوں نے وہی دھمکی ان کو دی - جو رسول کریم صلعم کو بعد میں کفار مکہ نے دی - یعنی اب ہم بھی صلح پر تیار نہیں - یا تو پوری طرح ہمارے مذہب میں شامل ہو گے - یا ہم تم کو اپنی زمین سے نکال دیں گے۔

صلح کی خواہش پوری نہ ہونے پر کفار کا آخری حربہ

لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ میں دو اشارے

لَتَعُوْدُنَّ کے تین معنی

زمین سے نکال دینے کے معنے صرف جلاوطن کر دینے کے نہیں ہیں - بلکہ مار دینے کے بھی ہیں - درحقیقت یہ ایک کامل بے تعلقی کا اعلان ہے - یعنی جب تم اپنے دعویٰ کے متعلق کسی معقول سمجھوتہ پر آنے کے لئے تیار نہیں - تو ہمارا تمہارا یکجا رہنا ناممکن ہے۔ آخر یہ ہمارا ملک ہے - ہم اکثریت میں ہیں - اگر تم ہماری مرضی کے تابع نہیں رہ سکتے - تو پھر ہمارے ملک میں رہنے کا بھی تمہیں کوئی حق نہیں۔

زمین سے نکال دینے کے معنے مار دینے کے بھی ہیں۔

عجیب امر ہے کہ ہمیشہ باطل پرست اقوام اپنی طاقت پر ناز کرتی ہیں - اور یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ یا تو عقائد بھی ان کی مرضی کے مطابق بدلے جائیں - یا ان کے ملک سے لوگ نکل جائیں - آجکل احمدیوں کے متعلق دوسرے مسلمانوں کا ایک حصہ یہی رویّہ اختیار کر رہا ہے - ہر جگہ احمدیوں کو دُکھ دیا جا رہا ہے اور صاف کہا جا رہا ہے کہ یا احمدی توبہ کریں - ورنہ ہندوستان سے نکل جائیں - ان کو ہمارے ملک میں رہنے کا کوئی حق نہیں اور لطیفہ یہ ہے کہ بعض ہندو مصنف یہی امر مسلمانوں کے متعلق لکھ رہے ہیں - گویا بلاوجہ اختلاف کی خلیج کو وسیع کیا جا رہا ہے - اور مذہب کو سیاسیات کے میدان میں گھسیٹا جا رہا ہے۔

لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ - اس جگہ لَنُهْلِكَنَّكُمْ نہیں فرمایا بلکہ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ فرمایا ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ان میں سے ایمان لانے والے تھے - اس لئے فرمایا کہ جو لوگ ظلم پر قائم رہیں گے - ان کو ہی ہم ہلاک کریں گے۔

لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ سے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ تم جو کہتے ہو کہ چونکہ ہمارا ملک ہے اگر ہماری بات نہ مانو گے - تو ہم تم کو نکال دیں گے - تو اس طرح خود اپنے خلاف فتوے لگاتے ہو - کیونکہ زمین تو خدا کی ہے - پھر وہ کیوں تمہارے فتویٰ کے مطابق تم کو ہی ہلاک نہ کرے۔

یہاں جو فرمایا ہے - اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا تو یا تو (۱) عَادَ بمعنی صار ہے - یعنی ہو گیا - کیونکہ نبی تو بچپن سے ہی شرک سے محفوظ ہوتا ہے - پس آیت کے یہ معنے ہوں گے - کہ ہماری ملّت میں آجاؤ - ہمارے مذہب کو اختیار کر لو - یا (۲) چونکہ مومن بھی اس کے ساتھ ہی مخاطب تھے - اور مومن فی الواقعہ پہلے ان لوگوں کے ہم مذہب تھے - اس لئے کثرت مخاطبین کے لحاظ سے 'لوٹ آؤ' کے الفاظ استعمال کئے گئے - یا (۳)

خَافَ وَعِيْدِ ○ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ

(نیز) میرے وعید سے ڈرے ۞ۡ اور انہوں نے (اپنی) فتح کے لئے دعا کی اور (نتیجہ یہ ہوا کہ) ہر ایک سرکش (اور)

عَنِيْدٍ ○ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ

حق کا دشمن ناکام رہا ۞ۡ اس (دنیوی عذاب) کے بعد (اس کے لئے) جہنم (کا عذاب مقدر) ہے اور (وہاں) اسے تیز گرم پانی

لَتَعُوْدُنَّ کے الفاظ کفار نے اس لئے استعمال کئے۔ کہ گو نبی خدا تعالےٰ کے فضل سے بچپن سے ہی شرک سے محفوظ ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ مشرکوں میں پیدا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے عرفاً وہ ان کی قوم کا ایک فرد سمجھا جاتا ہے۔ اس کو مدنظر رکھ کر کفار نے لوٹ آؤ کے الفاظ استعمال کئے۔

۞ۡ حل لغات

اَلْمَقَامُ۔ مَقَام مصدر ہے اور اسم زمان اور اسم مکان بھی ہے۔ یعنی قیام کی جگہ یا قیام کا زمانہ۔ نیز مقام کے معنے ہیں۔ اَلْمَنْزِلَةُ۔ رتبہ۔ درجہ۔ شان (اقرب) پس ذَالِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ کے یہ معنے ہونگے۔ کہ یہ اس کے لئے ہے۔ جو میرے رتبہ اور میرے مقام اور میری شان سے ڈرے۔ وَعِيْد۔ وَعَدَ کا مصدر ہے۔ اور وَعَدَ عِدَةً وَوَعْدًا اچھے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور وَعَدَ وَعِيْدًا بُرے معنوں میں۔ اور وعدہ کے وقت وعدہ نہ پورا کرنا تو کذب کہلاتا ہے لیکن وعید میں تخلف کرم کہلاتا ہے اور اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اور وعید کے معنے ہیں۔ اَلتَّهْدِيْدُ۔ دھمکی (اقرب)

تفسیر۔ پہلی آیت میں بھی اور اس آیت میں بھی اللہ تعالےٰ نے متکلم مع الغیر کے صیغہ کو استعمال کیا ہے۔ جو کہ جمع کے معنے دیتا ہے۔ حالانکہ ہلاک کرنے والی اور جگہ دینے والی تو صرف اللہ تعالےٰ کی ذات ہے۔ جو واحد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس جگہ قبضہ اور تصرف کا اظہار کرنا مقصود ہے۔ چونکہ جماعت میں قوت اور طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ جہاں قرآن کریم میں قبضہ اور تصرف بتانا مقصود ہوتا ہے۔ اور اسے نمایاں کرکے دکھانا ہوتا ہے۔ وہاں جمع کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے اور جہاں استغناء کا اظہار مقصود ہوتا ہے یا قبضہ اور تصرف پر زور دینا مقصود نہیں ہوتا۔ وہاں واحد کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض صوفیاء نے یہ بھی لکھا ہے جس کام کو اللہ تعالےٰ ملائکہ کے توسط سے کرتا ہے۔ اس کے لئے جمع کا صیغہ استعمال فرماتا ہے۔ اور جس کام کو خالص امر سے کیا جاتا ہے۔ وہاں مفرد کا صیغہ استعمال فرماتا ہے۔

(حاشیہ: جمع کے صیغہ کے استعمال کے متعلق صوفیوں کا خیال)

ذَالِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ سے اس طرف اشارہ کیا۔ کہ یہ غلبہ اور کامیابی کا وعدہ اس کیلئے ہے جو میرے درجہ کو سمجھتا ہو۔ اور میرے مالک ہونے پر یقین رکھتا ہو۔

(حاشیہ: المقام)

ان کی طرف سے وعید یہی تھا۔ کہ اے مومنو ہم تم کو اپنی زمین سے نکال دیں گے گویا وعید اپنی ملکیت سے نکالنے کا تھا۔ ان کے جواب میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ ہم ان کو تباہ کرکے اپنے رسول کو ان کی جگہ قائم کر دیں گے۔ اور پھر فرمایا۔ کہ یہ وعدہ ہمارا اس کو ہی ملے گا۔ جو میرے مقام اور مرتبہ سے اور میرے انذار سے خوف رکھتا ہوگا۔ گویا وعدہ کے پورا ہونے کے لئے یہ شرط ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت نبی کی جماعت کے دل میں ہو اور اس کے عذاب سے وہ خائف ہوں۔ پس وہ لوگ غلطی پر ہیں۔ جو صرف امت میں سے کہلا کر الٰہی وعدوں کے امیدوار رہتے ہیں ؛

(حاشیہ: وعید)

(حاشیہ: الٰہی وعدہ کیلئے رائج ہونے کیلئے اللہ کی عظمت اور اس کا خوف لازمی ہے)

۞ۡ حل لغات

اِسْتَفْتَحُوْا۔ اِسْتَفْتَحَ سے جمع کا صیغہ ہے۔ اور اِسْتَفْتَحَ الْبَابَ کے معنے ہیں فَتَحَهٗ دروازہ کو کھولا اِسْتَفْتَحَ الشَّيْءَ بِكَذَا اِبْتَدَأَهٗ اس کو شروع کیا اور اِسْتَفْتَحَ فُلَانٌ کے معنے ہیں طَلَبَ الْفَتْحَ وَاسْتَنْصَرَ اس نے فتح طلب کی اور مدد چاہی۔ وَمِنْهُ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا اَيْ اِنْ طَلَبْتُمُ الظَّفَرَ۔ یعنی ان تستفتحوا کے معنے ہیں۔ اگر تم مدد چاہو نیز هُوَ يَسْتَفْتِحُ عَلٰى بِفُلَانٍ کا فقرہ بھی ان معنوں میں

(حاشیہ: استفتح)

(حاشیہ: اس آیت میں جمع کا صیغہ قبضہ و تصرف کے ظاہر کرنے کے لئے ہے۔)

صَدِيدٍ ۙ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ وَيَأْتِيهِ

پلایا جائے گا ؎ وہ اسے تھوڑا تھوڑا کرکے پیئے گا اور اسے آسانی سے نہیں نگل سکے گا اور ہر جگہ

وعدہ کے بعد دعا کی ضرورت

استعمال کرتے ہیں یعنی وہ میرے خلاف مدد چاہتا ہے۔ (اقرب)

خابؑ خَابَ - يَخِيبُ - خَيْبَةً - لَمْ يَظْفَرْ بِمَا طَلَبَ خاب کے معنے ہیں۔ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہُوا۔ كَفَرَ۔ کفر کیا۔ اِنْقَطَعَ اَمَلُهُ۔ اس کی امید ٹوٹ گئی۔ خَابَ سَعْيُهُ۔ اى لَمْ يَنْجَحْ اور خاب سعیہ کے معنے ہیں۔ اس کی کوشش ناکام گئی (اقرب)

جبّار جبّار۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے اور اس کے معنے ہوتے ہیں۔ بڑا مصلح اور لوگوں کی حاجات پوری کرنے والا۔ جب جبّار غیر اللہ کی صفت ہو۔ تو اس کے معنے ہوتے ہیں كُلُّ عَاتٍ مُتَمَرِّدٍ۔ سرکش۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے والا۔ وَالَّذِى يَقْتُلُ عَلَى الْغَضَبِ جسے غصہ کی حالت میں قتل سے بھی دریغ نہ ہوتا ہو (اقرب)

عَنَدَ عَنَدَ عَنِ الطَّرِيْقِ وَالْقَصْدِ کے معنے ہیں مَالَ وَعَدَلَ۔ راستہ یا ارادہ کو ترک کر دیا۔ اس سے اِدھر اُدھر ہوگیا۔ اور عَنِيْدٌ کے معنے ہیں۔ اَلْمُخَالِفُ لِلْحَقِّ الَّذِى يَرُدُّهُ وَهُوَ يَعْرِفُهُ۔ حق کا ایسا مخالف۔ جو اس کو باوجود سمجھنے کے ردّ کرتا ہو (اقرب)

پس خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ کے معنے ہوں گے ہر حق کا مخالف سرکش اپنی کوششوں میں ناکام رہا۔ اس کی امیدیں ٹوٹ گئیں۔ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہُوا۔

استفتحوا کی ضمیر انبیاء اور کفار دونوں کی طرف راجع ہو سکتی ہے۔

تفسیر:۔ وَاسْتَفْتَحُوا الخ کی ضمیر دونوں طرف پھر سکتی ہے۔ نبیوں کی طرف بھی اور کفار کی طرف بھی اور سیاق و سباق کے لحاظ سے بھی دونوں ہی معنے ہو سکتے ہیں۔ جب کفار نے کہا۔ کہ ہم تم کو اپنی زمین سے نکال دیں گے۔ تو لازماً نبیوں اور اُن کے اتباع نے دعا مانگنی ہی تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں کفار کے شر سے محفوظ رکھے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ خدا تو پہلے وعدہ کر چکا ہے۔ کہ وَلَنُسْكِنَنَّكُمْ۔ کہ ہم مومنوں کو ہی جگہ دیں گے تو پھر دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ جن باتوں کا خدا تعالیٰ وعدہ کرتا ہے۔ ان کے لئے زیادہ دُعا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر وعدہ کے بعد انسان محروم رہ جائے۔ تو یہ امر اس کی سخت بدقسمتی پر دلالت کرے گا۔ وعدہ کے بعد دعا کی ضرورت قرآن کریم کی ایک اور آیت سے ثابت ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ (آل عمران ع ۲۰) پس مومن کو اس پر اتکال نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ بلکہ اگر وعدہ ہو تو تدبیر اور دعا سے اور بھی زیادہ کوشش کرنی چاہیئے۔ تا اسکی غلطی سے خدا تعالیٰ کے کلام پر کوئی حرف نہ آئے۔ انبیاء ہمیشہ موعود امور کیلئے دعا اور تدبیر سے کام لیتے چلے آئے ہیں۔ اور یہ انکی کمزوری نہیں بلکہ طاقت کی دلیل ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ میں ہی فتح مکہ کا

فتح مکہ کے وعدے کے باوجود آنحضرتؐ کا دعا اور تدبیر سے کام لینا

وعدہ کیا گیا تھا جیسا کہ فرمایا لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ (قصص ع ۹) لیکن باوجود اس کے آپ اس کیلئے دعا بھی کرتے رہے۔ اور تدبیر کرتے رہے۔ بیس کے قریب جنگیں آپ نے اس مقصد کیلئے کیں اگر وعدہ کے بعد تدبیر ناجائز ہے۔ تو پھر چاہیئے تھا۔ کہ آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھ جاتے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ پس یہ اصل کہ وعدہ کے بعد تدبیر یا دعا ناجائز ہے جاہلوں کا بنایا ہُوا ہے۔ اور دین سے جہالت کے سبب سے گھڑا گیا ہے۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے۔ وَاسْتَفْتَحُوا کی ضمیر کفار کی طرف بھی پھر سکتی ہے۔ اس صورت میں آیت کے یہ معنے ہونگے کہ کفار فتح کے لئے کوششیں کرتے ہیں اور فتح کی خواہش کرتے ہیں مگر اگلے جملہ میں فرمایا کہ یہ عجب بیوقوف ہیں۔ ان کے سامنے پہلے مثالیں موجود ہیں کہ نبیوں کے مخالف ہمیشہ ناکام اور نامراد ہوتے رہے ہیں۔ مگر باوجود اس کے پھر یہ امید رکھتے ہیں کہ ہم نبی کے مقابل کامیاب ہو جائیں گے۔

ودائہ

؎ حل لغات

وَرَآئِهٖ:۔ وراء کے لفظ کے معنے آگے اور پیچھے دونوں کے ہیں بطور اکثر زمانہ کے

الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ

(اور ہرطرف) سے اس پر موت آئے گی اور وہ مرے گا نہیں اور اسکے علاوہ

وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ۝ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

بھی (اسکے لئے) ایک سخت عذاب (مقرر) ہے ۱۸ جن لوگوں نے اپنے رب (کے احکام) کا انکار

بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ

کیا ہے اُن کے اعمال اس راکھ کی طرح ہیں جسے ایک تیز آندھی

الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا

والے دن ہوا تیزی سے (اڑا) لے گئی ہو۔ جو کچھ انہوں نے (اپنے مستقبل کیلئے) کمایا ہے اس میں سے کوئی حصہ (بھی) ان کے ہاتھ

متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور آگے اور پیچھے دونوں معنوں میں اس لئے استعمال ہوتا ہے۔ کہ کبھی فرض کر لیا جاتا ہے۔ کہ گویا زمانہ انسان کے پیچھے چلا آرہا ہے۔ اور کبھی یہ فرض کیا جاتا ہے۔ کہ انسان اس کی تلاش میں چلا جارہا ہے۔ پس دونوں معنوں میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی اس چیز کے متعلق بھی کہ جو پیچھے سے اس کو آملے گی۔ اور اس چیز کے متعلق بھی کہ جس کو یہ جاکر آگے مل جائے گا۔ اور کبھی اس کے معنے سواء کے بھی ہوتے ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ یعنی سواء ذالک نیز کبھی یہ ظرف مکان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے (اقرب)

اَلصَّدِيْد: مَاءُ الْجُرْحِ الرَّقِيْقُ الْمُخْتَلِطُ بِالدَّمِ قَبْلَ اَنْ تَغْلُظَ الْمِدَّةُ۔ پتلی خون آلود پیپ جو پیپ کے گاڑھا ہونے سے پہلے زخم سے نکلتی ہے۔ وَقِيْلَ هُوَ الْقَيْحُ الْمُخْتَلِطُ بِالدَّمِ اور بعض اس کے معنے صرف خون آلود پیپ کے کرتے ہیں۔ خواہ گاڑھی ہو خواہ پتلی۔ وقیل الْحَمِيْمُ اُغْلِيَ حَتّٰى خَثُرَ۔ اور بعض اسکے معنے گرم پانی کے بھی کرتے ہیں۔ کہ جو ابل ابل کر گاڑھا ہو جائے (اقرب)

تفسیر:- اس کے آگے جہنم ہوگی یعنی ایک لمبے عرصہ تک اس کا واسطہ جہنم سے پڑیگا۔ اور صدید یعنی گرم پانی پینے سے مراد گرم پانی بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اس دنیا میں بھی گرم پانی سے علاج کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ جہنم میں بھی گرم پانی کی شکل میں کوئی روحانی علاج مقرر ہو۔ اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔ کہ حصول مدعا کے ذرائع سامنے ہونگے۔ لیکن انہیں استعمال نہیں کر سکیں گے جس طرح تیز گرم پانی پانی تو ہے۔ لیکن پیا نہیں جا سکتا۔ اس لئے پیاسے کو اسے دیکھ کر اور تکلیف پہنچتی ہے۔ اگر زخموں کا دھوون سمجھا جائے۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ دنیا میں بھی ان کے کاموں کا موجب اُنکے ناپاک شہوات ہوتے تھے جو گویا اندرونی زخموں کا دھوون ہیں۔ کیونکہ شہوت قلب کی خرابی کا نتیجہ ہے۔ اگلے جہان میں وہی متمثل ہو کر زخموں کے دھوون کی شکل میں سامنے آئینگے۔ دھوون کے معنی بھی علاج کو مدنظر رکھتے ہوئے چسپاں ہو سکتے ہیں کیونکہ آجکل سب سے بہتر علاج ویکسین اور سیرم اور بیکٹیریوفیج ہیں۔ اور ان علاجوں میں بیماری کے ہی مختلف اجزاء اور کیڑوں کے لعابوں سے علاج کیا جاتا ہے۔ پس ہو سکتا ہے کہ علاج بالمثل کی طرف اشارہ ہو۔ کہ انکے گناہوں اور گندوں کے فاسد مادوں سے ہی انکا علاج کیا جائیگا۔ یا یہ کہ انکے گند انکے سامنے رکھدئے جائینگے جن سے انکو گھن آئیگی۔ اور اس طرح انہیں گند سے نفرت ہو جائیگی جیسا کہ سائیکو انیلسس والے کرتے ہیں۔ جو ایک نیا طریق

گرم پانی پینے سے مراد

زخموں کے دھوون سے مراد

۱۸ حل لغات

يَتَجَرَّعُهٗ۔ تَجَرَّعَ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور تَجَرَّعَ الْمَاءَ کے معنے ہیں۔ اِبْتَلَعَهٗ قَلِيْلًا بَعْدَ شَيْءٍ۔ اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے حلق سے اتارا۔ ومنہ

الصدید

يتجرعه

عَلٰی شَیْءٍ ۰ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ ○ اَلَمْ

نہیں آئے گا یہی پرلے درجہ کی تباہی ہے ۱۹ (اے مخاطب)

تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط

کیا تونے دیکھا نہیں کہ اللہ (تعالےٰ) نے آسمانوں اور زمین کو حق (و حکمت) کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

فِی الْقُرْاٰنِ - یَسْتَقِی مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍ یَتَجَرَّعُهٗ اور آیت مذکورہ میں یتجرعہٗ کے معنے یہی ہیں۔ کہ اس کو گلے سے بڑی مشکل سے تھوڑا تھوڑا کرکے اتارے گا۔ تَجَرَّعَ الْغَیْظَ کَظَمَهٗ۔ غصہ کو دبایا (اقرب)

یُسِیْغُ

یُسِیْغُ: اَسَاغَ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور سَاغَ (و اَسَاغَ کا مجرد ہے) کے معنے ہیں۔ سَاغَ الشَّرَابُ فِی الْحَلْقِ۔ هَنَاَ وَسَلَسَ وَسَهُلَ مَدْخَلُهٗ فِیْهِ۔ کہ پانی راس آیا۔ اور حلق سے بآسانی نیچے اتر گیا۔ (پس اَسَاغَ کے معنے ہوئے۔ آسانی سے اتارا لیکن کبھی اساغ لازم بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے) اَسَاغَ الطَّعَامُ اِسَاغَةً کے معنے ہیں سَهُلَ مَدْخَلُهٗ فِی الْحَلْقِ وَسَاغَ لَهٗ دُخُوْلُهٗ فِیْهِ۔ کھانا گلے میں آسانی سے اتر گیا۔ (اقرب) پس فلا یکاد یسیغہٗ کے معنے ہوں گے۔ کہ اسے حلق سے آسانی سے نہیں اتار سکیگا۔ وہ اس کے لئے فائدہ مند ثابت نہ ہوگا۔

جنت کے لئے باب اور دوزخ کے لئے مکان کا لفظ استعمال کرنے میں حکمت

من ورائہ عذاب غلیظ سے مراد

غَلِیْظ

غَلِیْظٌ - ذُو الْغِلَاظَةِ۔ سختی والا۔ خِلَافُ اللَّیِّنِ وَالسَّلِسِ۔ نرمی اور سہولت کے مخالف معنے دیتا ہے۔ اَمْرٌ غَلِیْظٌ شَدِیْدٌ صَعْبٌ۔ سخت مشکل امر۔ عَذَابٌ غَلِیْظٌ اَیْ شَدِیْدُ الْاَلَمِ۔ سخت دردناک عذاب۔ (اقرب)

عَاصِف

تفسیر:- وَیَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ۔ اس سے بتایا ہے۔ کہ جس طرح مومنوں کو جنت میں ہر دروازہ سے سلام آئے گا۔ اسی طرح کفار کو ہر طرف موت کا سامنا ہوگا۔ یعنی قسم قسم کے گند جو وہ کرتے تھے۔ موت کی شکل میں ان کے سامنے آئیں گے۔ مگر فرمایا کہ وہ اس موت سے مریں گے نہیں۔ کیونکہ اصل غرض ان کی اصلاح ہے۔ آخر سلامتی پہنچ جائیگی۔ کیونکہ انسان سلامتی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ موت نہ پہنچے گی کیونکہ انسان موت کے لئے نہیں پیدا کیا گیا (سوائے پہلی موت کے)

جنت اور دوزخ کے ذکر میں (جنت کا ذکر سورۂ رعد میں آیا تھا دیکھو آیت ۲۴، ۲۵) ایک یہ فرق بھی رکھا ہے۔ کہ جنت کے متعلق تو باب کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اور دوزخ کے لئے مکان کا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ سلامتی باہر سے آتی ہے یعنی خدا تعالےٰ کی طرف سے۔ اور موت یعنی ہلاکت انسان اپنے لئے خود پیدا کرتا ہے۔ پس سلامتی کے لئے تو فرمایا۔ کہ دروازوں سے آئے گی۔ اور ہلاکت کے لئے فرمایا۔ کہ اندر سے ہی ہر کونہ سے نکل پڑے گی۔

ومن ورائہ عذاب غلیظ سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اس عذاب کے بعد اور عذاب آئیں گے۔ مثلاً خدا تعالےٰ سے دوری ندامت حسرت وغیرہ اور یہ بھی کہ یہ عذاب ایک دفعہ ہی کر ہٹ نہ جائے گا۔ بلکہ لمبا چلتا جائے گا۔

۱۹ حل لغات

:- عَاصِفٌ۔ عَصَفَ سے اسم فاعل ہے۔ اور عَصَفَ الزَّرْعَ یَعْصِفُ عَصْفًا کے معنے ہیں۔ جَزَّهٗ قَبْلَ اَنْ یُدْرِكَ۔ کھیتی کو پکنے سے پہلے ہی کاٹ لیا۔ الرِّیْحُ تَعْصِفُ عَصْفًا وَعُصُوْفًا۔ اِشْتَدَّتْ۔ ہوا کے لئے جب عَصَفَ کا لفظ استعمال ہو۔ تو اس کے معنے ہوتے ہیں۔ ہوا تیزی سے چلی۔ عَصَفَ فُلَانٌ عِیَالَهٗ کَسَبَ لَهُمْ۔ اپنے اہل وعیال کیلئے کمایا عَصَفَتِ الْحَرْبُ بِالْقَوْمِ ذَهَبَتْ بِهِمْ وَاَهْلَکَتْهُمْ۔ لڑائی نے قوم کو تباہ و برباد کر دیا اور عَصَفَ الدَّهْرُ بِهِمْ بھی انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍۙ۝۲۰ وَّ

اگر وہ چاہے تو تمہیں ہلاک کر دے اور (تمہاری جگہ پر) کوئی (اور) نئی مخلوق لے آئے ۲۰؎ اور

کہ زمانے نے ان کو ہلاک کر دیا۔ اَلنَّاقَۃُ بِرَاکِبِھَا کے معنے ہیں اَسْرَعَتِ السَّیْرَ کَاَنَّھَا الرِّیْحُ۔ اونٹنی اپنے سوار کو تیزی سے لے کر چلی۔ گویا کہ وہ ہوا ہے۔ اَلشَّیْءُ مَالَ۔ چیز کے متعلق آئے تو اس کے معنے جھکنے کے ہوتے ہیں۔ اَلرَّجُلُ اَسْرَعَ آدمی کے لئے یہ لفظ آئے۔ تو اس کے معنے جلدی کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور عَاصِفٌ کے معنے اَلْمَائِلُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی ہر چیز کا مائل حصہ۔ یَوْمٌ عَاصِفٌ کے معنے تَعْصِفُ فِیْہِ الرِّیْحُ کے ہیں۔ یعنی وہ دن جس میں ہوا بہت تیزی سے چلے۔ اور یہاں اسم فاعل کا صیغہ بمعنی اسم مفعول استعمال ہوا ہے۔ اور اس کی جمع عَوَاصِفُ آتی ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ کَفَرُوْا بِرَبِّھِمْ سے مراد یہ نہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار کیا۔ کیونکہ وہ لوگ تو اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتے تھے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار یا اس کی طاقتوں کا انکار ہے۔ بہت سے لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ کو مانتے ہیں۔ لیکن اس کا دخل دنیا میں نہیں مانتے۔ جیسے کہ اس زمانہ کے مغربی تعلیم پائے ہوئے لوگ ہیں۔ انہی سے ننانوے فی صدی بلکہ زیادہ اگر خدا تعالیٰ کو مانتے بھی ہوں۔ تو بھی اس امر کو نہیں مانتے۔ کہ وہ اس دنیا کے معاملات میں کوئی دخل دیتا ہے۔ اس لئے ان کے سب کام دنیا یا نفس کے لئے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے یا اس کے خوف کے سبب سے نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں کی نسبت فرماتا ہے کہ ان کے اعمال کوئی روحانی فائدہ نہیں دیتے روحانیت یا آخرۃ کے لحاظ سے وہ ایسے ہی بیکار ہیں جیسے کہ وہ راکھ جس پر آندھیوں کے موسم میں تیز آندھی چلی ہو۔ جیسے متواتر اور شدید آندھی کے سبب سے اس راکھ کا نام و نشان تک بھی باقی نہیں رہتا اسی طرح ان لوگوں کے اعمال آخرت کے لحاظ سے باطل ہوتے ہیں کیونکہ جو کام دنیا کیلئے کیا گیا ہو اس کا فائدہ دنیا تک ہی محدود رہ سکتا ہے اور یہ بالکل انصاف کے مطابق ہے۔ کیونکہ عمل کا طبعی نتیجہ تو وہ ہے جو اس کے بعد قاعدہ کے طور پر مترتب ہوتا ہے۔ اور وہ نتیجہ کافر و مومن ہر شخص کو مل جاتا ہے۔ جو شخص غریبوں کی خبرگیری کرتا ہے۔ غرباء اس کی خدمت کرتے اور بوقت ضرورت اس کیلئے جان تک دیدیتے ہیں جو سچ بولتا ہے۔ لوگ اس کا اعتبار کرتے ہیں۔ اور ہزاروں مواقع پر اس اعتبار کی وجہ سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے پس جب طبعی نتیجہ انسان کو مل گیا۔ پھر اس کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ لیکن جو شخص نیکی خدا تعالیٰ کیلئے کرتا ہے اس کے ظاہری عمل کے ساتھ ایک اور عمل اخلاص باللہ کا بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اور ظاہری نتیجہ کے نکلنے کے باوجود اس عمل کے صلہ کا وہ مستحق رہ جاتا ہے۔ اور اسی کو اخروی ثواب کہتے ہیں۔ یہ ثواب چونکہ عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ عمل کے ساتھ کے اخلاص باللہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مستحق وہی شخص ہو سکتا ہے جس کے اعمال اپنے ساتھ ابتغاءً لوجہ اللہ کا عمل بھی رکھتے ہوں یعنی نیک کام کے ساتھ خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول کی خواہش بھی شامل ہو۔ اور جس کے عمل کے ساتھ یہ امر نہ ہو۔ اس کا بس اتنا ہی بدلہ تھا جو اُسے دنیا میں مل گیا۔

دوسرے معنے آیت کے یہ ہیں۔ کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں کوشش کرتے ہیں۔ ان کی کوششیں ضائع ہو جائیں گی بیکار ہونگی کیونکہ مسبب الاسباب تو اللہ تعالیٰ ہے۔ تمام اسباب اسی نے پیدا کئے۔ پھر وہ ان اسباب کو کس طرح کامیاب کر سکتا ہے۔ جو خود اس کے دین کے خلاف ہوں۔ مگر اس امر کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ عارضی خوشیاں اللہ تعالیٰ اپنے دین کے دشمنوں کو بھی پہنچا دیتا ہے۔ اور عارضی اور وقتی فتوحات انہیں بھی ملتی رہتی ہیں۔ جن کا مقصد ایک تو نصرت الٰہی کو چمکا کر دکھانا ہوتا ہے۔ دوسرے اس وقفہ سے نیک لوگوں کے لئے توبہ کا موقعہ بھی مہیا کیا جاتا ہے۔

ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ۔ یعنی اس سے زیادہ ہلاکت کیا ہوگی کہ انسان محنت کرے لیکن اس کا پورا فائدہ نہ اٹھائے۔ یا وہ محنت اُلٹی اس کے خلاف پڑے۔

دنیا کیلئے کئے ہوئے عمل کا فائدہ دنیا تک ہی محدود رہ سکتا ہے

خدا کے لئے نیکی کرنیوالے کو دگنا فائدہ۔

کفروا بربھم کی مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں و طاقتوں کا انکار ہے۔

عارضی خوشی منکرین حق کو پہنچ سکتی ہے

اللہ کی طاقتوں کے منکروں کو اعمال فائدہ نہیں دیتے

۲۰؎ حل لغات:- اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ۔ یُذْھِبْکُمْ

مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا

یہ بات اللہ (تعالیٰ) کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے ۵۲۱ اور وہ سب اللہ (تعالیٰ) کے حضور آ کھڑے ہونگے۔

فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا

تب (ان میں سے) کمزور (سمجھے جانے والے) ان سے جو تکبر کیا کرتے تھے کہیں گے (کہ) ہم تو

لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ

تمہارے پیچھے چلنے والے تھے۔ پس کیا تم اللہ (تعالیٰ) کے عذاب میں سے (اس وقت) کچھ بھی ہم پر

اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ

سے دور کرسکتے ہو۔ وہ (جواب میں) کہیں گے۔ کہ اگر اللہ (تعالیٰ) ہمیں ہدایت دیتا۔ تو ہم بھی تمہیں ہدایت

سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ

دیتے (لیکن اب کیا ہوسکتا ہے) ہمارا بے صبری دکھانا یا ہمارا صبر کرنا (اس وقت) ہمارے لئے یکساں ہے (اور) ہمارے لئے

عزیز ۲

الذہاب۔ المضی۔ ذہاب کے معنے ہیں۔ چلے جانا۔ وقال اِنْ يَّشَا يُذْهِبْكُمْ كِنَايَةٌ عَنِ الْمَوْتِ۔ آیت اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ میں ہلاک کرنیکے معنے مراد ہیں یعنی اگر وہ چاہے تو تمہیں ہلاک کردے (مفردات)

۵۲۱ پر عمل سے دنیا کی پیدائش کو بیکار کرنے والوں کی سزا۔

۵۲۱ دنیا میں کمزور اقوام کا ترقی کرنا اور زبردست کا زیردست ہونا ناممکن امر نہیں

۵۲۱ دوسرے لوگوں کو انکی جگہ دینے سے مراد نبیوں کی جماعتیں ہیں

تفسیر:- یعنی دنیا کی پیدائش بیکار نہیں۔ پس ایسے لوگ جو اپنے عمل سے اسے بے کار بنا رہے ہیں۔ انہیں خدا تعالیٰ اس دنیا پر کب حکومت دے سکتا ہے۔ کیونکہ ان کا وجود تو پیدائش عالم کی غرض کو باطل کر رہا ہے۔ پس انہیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ وہ خطرہ کے مقام میں ہیں۔ اور یہ بھی انہیں نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ انہیں کوئی شخص اپنے مقام سے ہٹا نہیں سکتا۔ کیونکہ ان کا کوئی قائم مقام نہیں ہوسکتا۔ خدا تعالیٰ ایسا کرسکتا ہے۔ کہ انہیں ہلاک کرکے دوسرے لوگوں کو ان کی جگہ لے آئے۔ دوسرے لوگوں سے اس جگہ نبیوں کی جماعت مراد ہے۔ اور صرف یہ بتانا مقصود نہیں۔ کہ وہ ایسا کرسکتا ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کو ایسا نہ سمجھیں کہ ان کا قائم مقام نہیں مل سکتا۔ ان کا بہتر قائم مقام تیار ہو رہا ہے۔

۵۲۱ حل لغات:- عَزِيْزٌ۔ يُقَالُ عَزَّ عَلَيَّ كَذَا۔ اَيْ صَعُبَ۔ عَزَّ عَلَيَّ كَذَا کے معنے ہیں کہ یہ کام مجھ پر مشکل ہوگیا (مفردات) وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ کے معنے ہوں گے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں۔

تفسیر:- دنیا کا عجب حال ہے۔ جب کوئی قوم کمزور ہوتی ہے۔ تو کہتی ہے کہ اب ہمارا بڑھنا ناممکن ہے۔ اور جب کوئی قوم ترقی کر جاتی ہے۔ تو کہتی ہے۔ کہ اب ہمارا ہلاک ہونا ناممکن ہے۔ حالانکہ لوگ ہر زمانہ میں دیکھتے ہیں۔ کہ کمزور اقوام ترقی کر گئیں۔ اور زبردست، زیردست ہوگئیں۔ اس آیت میں اسی غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے۔ ہزاروں دفعہ اللہ تعالیٰ نے گری ہوئی قوموں کو ترقی دی ہے۔ اور ہزاروں دفعہ ترقی یافتہ قوموں کو قعر مذلت میں گرایا ہے۔

مَّحِيۡصٍ ۝ وَقَالَ الشَّيۡطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الۡاَمۡرُ اِنَّ ع ۳ ۹ ۱۵

بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے ۲۲ اور جب تمام معاملہ کا فیصلہ کیا جا چکیگا۔ تو شیطان (لوگوں سے) کہے گا (کہ)

اللّٰهَ وَعَدَكُمۡ وَعۡدَ الۡحَقِّ وَوَعَدۡتُّكُمۡ فَاَخۡلَفۡتُكُمۡ ؕ

اللہ (تعالیٰ) نے یقیناً تم سے اٹل وعدہ کیا تھا۔ اور میں نے (بھی) تم سے (ایک) وعدہ کیا تھا۔ پھر میں نے وہ تم سے (کیا ہوا وعدہ) پورا

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ اَنۡ

نہ کیا۔ اور میرا تم پر کوئی تسلط نہ تھا ہاں میں نے تمہیں

دَعَوۡتُكُمۡ فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِيۡ ۚ فَلَا تَلُوۡمُوۡنِيۡ وَ

(اپنے خیالات کی طرف) بلایا اور تم نے میرا کہا مان لیا۔ اس (لئے اب) مجھے ملامت نہ کرو۔ بلکہ

لُوۡمُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصۡرِخِكُمۡ وَمَاۤ اَنۡتُمۡ

اپنے آپ کو ملامت کرو۔ (اس وقت) نہ میں تمہاری فریاد سن سکتا ہوں اور نہ تم

۲۲ حل لغات ۔ مُغۡنُوۡنَ ۔ اَغۡنٰی سے ہے۔ اور اَغۡنٰی عَنۡهُ کے معنے ہیں۔ اَجۡزَاَہٗ۔ اس سے کفایت کی۔ اس کی تکلیف خود اٹھا کر اس کو بچا لیا۔ اور جب مَا يُغۡنِيۡ عَنۡكَ هٰذَا بولا جائے۔ تو اس سے یہ معنے مراد ہوتے ہیں۔ مَا يُجۡدِيۡكَ۔ کہ یہ بات تجھے کوئی فائدہ نہیں دے سکتی (اقرب) پس هَلۡ اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا کے معنے ہونگے۔ کہ کیا تم ہمارے عذاب اٹھا کر ہم کو عذاب سے بچا سکتے ہو۔ یا ہمیں کچھ فائدہ دے سکتے ہو۔ مَحِيۡصٌ ۔ حَاصَ يَحِيۡصُ کا مصدر ہے۔ اور حَاصَ مَحِيصًا کے معنے ہیں۔ عَدَلَ وَحَادَ۔ بچاؤ کر کے ایک طرف ہوگیا۔ اَلۡمَحِيۡصُ ۔ اَلۡمَحِيۡدُ۔ ایک طرف بچاؤ کی جگہ۔ بچاؤ اَلۡمَهۡرَبُ۔ بھاگنے کی جگہ (اقرب) مَا لَنَا مِنۡ مَّحِيۡصٍ کے معنے ہوں گے۔ ہمارے لئے بھاگنے کی کوئی صورت نہیں۔ کوئی بچاؤ کی صورت نہیں۔

تفسیر :- اس آیت میں ماضی کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں لیکن ترجمہ مستقبل کا کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ گو لفظاً ماضی کے صیغے استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن مراد آئندہ زمانہ سے ہے کیونکہ یہاں ذکر عذاب کا ہے اور عذاب آئندہ آنے والا تھا۔ ابھی تک آیا نہ تھا۔ ماضی کے صیغے اس امر پر زور دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے استعمال کئے ہیں کہ وہ دن ضرور آئے گا اور یہ نظارہ منرور دنیا کو دیکھنا پڑے گا عربی کا محاورہ ہے۔ کہ جب کسی مستقبل کے امر کے یقینی ہونے پر زور دینا ہو۔ تو ماضی کے صیغے استعمال کئے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ اردو میں بھی اس قاعدہ کا وجود ملتا ہے۔ اگر کسی شخص کی آمد کی انتظار ہو۔ اور کوئی شخص گھبراہٹ کا اظہار کرے۔ تو منتظر شخص کے رشتہ دار یا دوست کہہ دیتے ہیں۔ بس جی وہ آ ہی گیا ہے یعنی اب اس کے آنے میں کوئی دیر نہیں اور اس کا آنا یقینی ہے۔

مطلب آیت کا یہ ہے۔ کہ جب خدا تعالیٰ کا منشاء تباہ کرنے کا ہو گا۔ سب اس کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے یعنی ان کی اندرونی کمزوریاں اور باطنی نقائص ظاہر ہونے لگیں گے۔

اَغۡنٰی ۔ مَحِيۡصٌ ۔ کسی امر کے یقینی وقوع پذیر ہونے کے لئے ماضی کے صیغے استعمال کئے جاتے ہیں۔ آیت کے لفظ ماضی کے ہیں اور معنے مستقبل کے

بِمُصْرِخِيَّ ۚ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ

میری فریاد سن سکتے ہو۔ تم نے جو مجھے (اللہ تعالٰے کا ایک شریک بنا رکھا تھا میں (تمہاری) اس (بات) کا پہلے سے

قَبْلُ ۚ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَ

انکار کر چکا ہوں۔ (اس قسم کا شرک کرنیوالے) ظالموں کے لئے یقیناً دردناک عذاب (مقدر) ہے۔ ۲۳؎ اور

اُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ

جو لوگ ایمان لاتے ہونگے۔ اور انہوں نے (نیک اور) مناسب حال عمل کئے ہونگے انہیں ان کے رب کی اجازت سے ایسے باغوں میں

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ

جنکے (سایوں کے) نیچے نہریں بہتی ہونگی داخل کیا جائیگا۔ (اور) وہ اپنے رب کی اجازت سے اس میں (ہمیشہ) بستے رہیں گے۔

قوموں کی تباہی کے متعلق یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قومیں اس قدر اپنی کمزوریوں کی وجہ سے تباہ نہیں ہوتیں جس قدر کہ ان کمزوریوں کے ظاہر ہونے کے سبب سے۔ جب تک انکی کمزوریاں پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ باوجود کمزوریوں کی موجودگی کے وہ بڑھتی جاتی ہیں کیونکہ لوگ ان سے مرعوب ہوتے ہیں جب انکی کمزوریاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ تو پھر باوجود پورا زور لگانے کے وہ گرنا شروع ہو جاتی ہیں۔ گویا کام اتنا کام نہیں آتا جس قدر کہ نام۔ اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔ کہ اللہ تعالٰے ان کے عیب کو ظاہر کر دے گا۔ ورنہ خدا تعالٰے تو ہر بات کو ہر وقت ہی جانتا ہے۔

قومیں کمزوریوں کی وجہ سے اتنی ہلاک نہیں ہوتیں جتنی کمزوریاں ظاہر ہونے سے

فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا یعنی جب قوم گرنے لگے گی تب کمزور طاقتوروں سے کہیں گے کہ اب ہماری حفاظت کرو۔ کہ ہم تو تمہارے پیچھے اور تمہارے کہنے پر چلتے تھے۔ مگر طاقتور کہیں گے کہ ہمیں خود کوئی راستہ نہیں ملتا۔ ساری تدبیریں بے کار جا رہی ہیں۔ ہم تمہاری مدد کیا کریں۔ اس لئے صبر ہی کرو۔ اس میں پھر قومی تباہی کا ایک سبب بتایا ہے جس قوم نے زندہ رہنا ہوتا ہے۔ وہ گرتے گرتے بھی کوشش کو جاری رکھتی ہے۔ مگر جس قوم نے ہلاک ہونا ہوتا ہے۔ وہ صبر کر کے خاموش ہو جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے اور اپنی حالت پر راضی ہو جاتی ہے۔ حالانکہ صحیح صبر کا یہ مقام نہیں۔ صبر تو بُری حالت سے بچنے کا نام ہے۔ نہ کہ اس پر راضی ہو جانے کا۔

قومی تباہی کا ایک سبب

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ عذاب سے پہلے لوگ ایک دوسرے کو جرم کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ڈرو نہیں۔ ہم ذمہ وار ہیں۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تو پھر تم کو کسی کا کیا ڈر۔ لیکن جب خدا کا عذاب آتا ہے۔ تو پھر کوئی بھی ساتھ نہیں دیتا۔ یہی حال دنیوی جرائم کا ہے بعض لوگ کسی کو قتل کا مرتکب بنا دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں ہم تمہیں بچائیں گے۔ لیکن جب وہ مجرم پکڑا جاتا ہے۔ تو پھر بھلا کون ہے جو یہ کہے کہ مجھے پکڑ لو۔ اس وقت کوئی اپنے آپ کو اس کی جگہ پیش نہیں کرتا۔

۲۳؎ حل لغات

الحق

اخلفتکم

الحق کے لئے دیکھیں حل لغات سورۃ رعد ۵؎۔ اَخْلَفْتُكُمْ۔ اَخْلَفَهٗ مَا وَعَدَهٗ کے معنے ہیں۔ قَالَ شَيْئًا وَلَمْ يَفْعَلْهُ۔ کسی بات کے کرنے کا وعدہ کیا۔ اور پھر اُسے پورا نہ کیا۔ فُلَانًا وَجَدَ مَوْعِدَهٗ خُلْفًا۔ اَخْلَفَ فُلَانًا کے معنے ہیں۔ کہ اس کے وعدوں میں اختلاف پایا (یعنی جھوٹے وعدے ہوتے

ہیں کہ کسی کبھی کبھی) اَخْلَفَ الْغَیْثُ. اَبْطَأَ فِی النُّزُوْلِ ثُمَّ نَقَصَ بارش پہلے اترتی ہوئی معلوم ہوئی پھر نہ اتری۔ اَخْلَفَ الدَّوَاءُ فُلَانًا اَضْعَفَهٗ۔ دوائی نے کمزور کر دیا۔ (اقرب) پس اَخْلَفْتُکُمْ کے معنے ہوں گے کہ میں نے تم سے وعدہ کرکے اُسے پورا نہ کیا (۲) میں نے تمہیں جھوٹے وعدے دے دے کر غافل رکھا اور کمزور کر دیا۔

اَلْمُصْرِخُ :۔ اَصْرَخَ سے اسم فاعل ہے۔ اور اَصْرَخَ فُلَانًا کے معنے ہیں۔ اَغَاثَهٗ و اَعَانَهٗ۔ اس کی فریادرسی اور اس کی مدد کی۔ اور جب یہ محاورہ بولیں۔ اِسْتَصْرَخَنِیْ فَاَصْرَخْتُهٗ۔ تو اس کے معنے ہوں گے۔ اِسْتَغَاثَ بِیْ فَاَغَثْتُهٗ۔ کہ اس نے میری مدد چاہی۔ اس پر میں نے اس کی مدد کی۔ وَقِیْلَ الْهَمْزَةُ لِلسَّلْبِ۔ بعض کہتے ہیں کہ اَصْرَخَ کا ہمزہ سلب کے لئے ہے اور اَصْرَخَ کے معنی ہیں۔ اَزَلْتُ صُرَاخَهٗ۔ یعنی اس کی چیخ وپکار اور فریاد کو دور کر دیا (اقرب) اور چونکہ یہ مصیبت دور کرنے سے ہوتا ہے۔ اس لئے اَصْرَخَ کے معنے مدد کرنے کے ہو گئے۔ پس آیت مَآ اَنَا بِمُصْرِخِکُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِیَّ کے معنے ہونگے نہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں اور نہ تم میری مدد کر سکتے ہو (۲) نہ میں تمہاری چیخ وپکار کو دور کر سکتا ہوں۔ نہ تم میری چیخ وپکار کو دور کر سکتے ہو۔

تفسیر:۔ شیطان یا شیطانی لوگ عذاب کے وقت اپنے آلۂ کار سے برارت ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا تجھ پر کیا زور تھا۔ تمہارے اپنے اندر گند تھا۔ اس لئے تم نے ہماری بات مانی اگر تمہارے اندر نیکی ہوتی اور تم نہ مانتے۔ تو ہم کیا تم کو مجبور کر سکتے تھے۔

اور یہ بات درست بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ شیطان یا اس کے اظلال جو دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انھیں انسان پر کوئی اختیار نہیں۔ وہ تو ایک ذریعہ ہیں انسانی کمزوری کے اظہار کا۔ جس طرح فرشتے ذریعہ ہیں اس کی اچھی طاقتوں کے اظہار کا۔ گمراہ کرنے والا خود انسان کا نفس ہے۔ شیطان کا کام صرف اشارہ کرنا ہے۔ جیسے فرشتے نیکی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شیطان بدی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کی مثال تو اُستاد کی سی ہے۔ کہ وہ شاگرد کے سامنے امتحان کے وقت مشکل سوال پیش کرتا ہے۔ لیکن کوئی نہیں کہتا۔ کہ استاد نے شاگرد کو فیل کیا۔ فیل تو طالب علم اپنی کمزوری کے سبب سے ہوتا ہے۔ استاد تو صرف اس کی لیاقت کے معیار کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح فرشتے انسان کی نیکی کے معیار کو اور شیطان بدی کے معیار کو ظاہر کرتے ہیں۔ نہ کہ نیک یا بد بناتے ہیں۔

(حاشیہ: المصرخ۔ فرشتے انسان کی نیکی کے معیار کو اور شیطان بدی کے معیار کو ظاہر کرتا ہے)

فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَکُمْ۔ یعنی تم نے ہمیشہ خدا تعالےٰ کے وعدے پورے ہوتے دیکھے۔ مگر انہیں قبول نہ کیا۔ میری طرف سے تمام جھوٹے ہی وعدے ہوتے اور تم نے ان کو مان لیا۔ تو بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے۔

اِنِّیْ کَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَکْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ یہ لطیفہ ہے کہ شیطان توحید کا دعویدار ہے اور کہتا ہے کہ تم مجھے خدا تعالےٰ کا شریک بناتے تھے اور میں منکر تھا اور یہ ہے بھی درست۔ وہ شیطان جو انسانی کمزوریوں کو ظاہر کرنے پر متوکل ہے۔ وہ تو اپنا فرض ادا کر رہا ہے اور خدا تعالےٰ کا جلال اس کے سامنے ہے۔ وہ شرک کس طرح کر سکتا ہے۔ شرک تو تب پیدا ہوتا ہے۔ جب انسان شیطانی تحریک کو اپنے اندر لے کر اُسے نافرمانی کی شکل میں ڈھال دیتا ہے۔ سنکھیا جب تک انسان کے پیٹ میں نہیں جاتا۔ ایک قیمتی دوا ہے۔ جب انسان اس کا غلط استعمال کرتا ہے۔ تو وہ زہر قاتل بن جاتا ہے یہی مثال شیطان کی ہے۔ انسان کے اندر داخل ہونے سے پہلے وہ ایک امتحان کا سوال ہے اور کچھ بھی نہیں۔

(حاشیہ: مصرخ میں ہمزہ سلب کا بھی ہو سکتا ہے۔ شیطان کا دعویٰ توحید۔ شیطان یا شیطانی لوگوں کا عذاب کے وقت اپنی برادت ظاہر کرنا۔)

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ پھر شیطان دوزخ میں کیوں جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ شیطان کی نسبت آتا ہے۔ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ۔ مجھے تو نے (یعنی اللہ تعالےٰ نے) آگ سے پیدا کیا ہے۔ پس جو چیز آگ سے پیدا ہے۔ آگ میں جانا اُس کے لئے عذاب تو نہیں۔ ایک انگارہ کو اگر چولہے میں ڈال دو۔ تو اُسے کیا عذاب ہے۔ صوفیاء کا عام طور پر اسی طرف رجحان ہے۔ کہ شیطان کے اظلال تو عذاب پائیں گے۔

(حاشیہ: شیطان کا دوزخ میں جانا)

رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۝ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ

اور ان (جنتوں) میں ان کی (ایک دوسرے کیلئے یہ) دعا ہوگی (تم پر) سلامتی (ہو) ۵۲۴ (اے مخاطب) کیا تو نے دیکھا نہیں (کہ)

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ

اللہ (تعالیٰ) نے کس طرح ایک پاک کلام کی حالت جو ایک پاک درخت کی طرح ہے ۔ (اور) جس کی جڑھ (مضبوطی کے ساتھ) قائم

اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا

ہے ۔ اور اس کی (ہر ایک) شاخ آسمان (کی بلندی) میں (پہنچی ہوئی) ہے ۔ کھولکر بیان کیا ہے ۔ وہ ہر وقت اپنے

كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ

رب کے اذن سے اپنا (تازہ) پھل دیتا ہے ۔ اور اللہ (تعالیٰ) لوگوں کے لئے (انکی ضرورت کی) تمام باتیں بیان کرتا

لیکن خود شیطان نہیں۔ کیونکہ وہ تو ایک امتحان لینے والی طاقت ہے۔ اور فرض ادا کر رہی ہے۔

الاذن

۵۲۴ حل لغات

اَلْاِذْنُ کے معنے ہیں۔ اَلْاِجَازَةُ۔ اجازت۔ اَلْاِرَادَةُ۔ ارادہ۔ اَلْعِلْمُ۔ علم (اقرب)

التحیہ

اَلتَّحِيَّةُ کے معنے ہیں۔ اَلسَّلَامُ۔ سلامتی۔ اَلْبَقَاءُ۔ بقاء اَلسَّلَامَةُ مِنَ الْاٰفَاتِ۔ آفات سے سلامتی۔ اَلتَّحِيَّةُ مِنَ اللّٰهِ۔ اَلْاِكْرَامُ وَالْاِحْسَانُ جب اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ بولا جائے۔ تو اس کے معنے اکرام اور احسان کے ہوتے ہیں (اقرب)

مفسرین کے نزدیک باذن ربھم کے معنے

تفسیر:۔ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ کے مفسرین نے یہ معنے کئے ہیں۔ کہ جنت کا ملنا اس کی رحمت اور فضل سے ہے نہ کہ استحقاق سے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ کوئی بات بیان فرمائی۔ تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا۔ کہ یا رسول اللہ آپ تو اپنے اعمال کے زور سے جنت میں جائیں گے۔ اس پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں عائشہ میں بھی خدا کے فضل سے ہی جنت میں جاؤں گا (بخاری جلد ربع کتاب الرقاق) اصل بات یہ ہے۔ کہ ہمارے اعضاء اور قویٰ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں۔ پس ہمارے اعمال بھی اسی کے فضل سے پیدا ہوئے کیونکہ انہیں اسی کی دی ہوئی طاقتوں سے ہم بجالاتے ہیں پس اعمال کے بدلہ میں جو کچھ ملتا ہے۔ وہ محض فضل ہے۔ اس پر کسی کا حق نہیں۔

مومن جنت نہیں چاہتا خدا تعالیٰ کا قرب چاہتا ہے

۲۔ میرے نزدیک اس آیت کے ایک اور معنے بھی ہیں اور وہ یہ کہ مومن جنت نہیں چاہتا۔ وہ تو صرف خدا تعالیٰ کا قرب چاہتا ہے۔ وہ اگر جنت میں رہے گا۔ تو صرف خدا تعالیٰ کے حکم سے رہیگا۔ ان معنوں کی ایک حدیث سے بھی تائید ہوتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نیک اعمال کرنیوالے تین قسم کے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو جنت کی خاطر نیک عمل کرتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو جہنم سے بچنے کیلئے نیک اعمال کرتے ہیں اور بعض ایسے ہیں۔ جو محض خدا تعالیٰ کی خاطر نیک اعمال کرتے ہیں۔ پس ایسے لوگوں کے لئے جنت ایک زائد چیز ہے نہ کہ مقصود

تحیتھم فیھا سلام کے تین معنے۔

تحیتہم فیہا سلام (۱) انکی دعا آپس میں سلام ہوگی یعنی وہ آپس میں ایک دوسرے کو سلام کہیں گے (۲) یا یہ کہ ہر ایک دوسرے کے شر سے کُلّی طور پر محفوظ ہوگا (۳) ان کو وہاں بہترین تحفہ سلام کا ملیگا یعنی ملائکہ کی طرف سے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکو سلامتی کے تحفے ملیں گے یعنی ملائکہ تقویٰ کی باریک طاقتوں کو ابھاریںگے اور اللہ تعالیٰ ان پر خاص فضل نازل کرے گا۔

لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ○ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ

ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۲۵ اور بُری بات کا حال

۲۵ حل لغات:۔ ضَرَبَهٗ بِيَدِهٖ کے معنے ہیں اَصَابَهٗ وَصَدَمَهٗ بِهَا۔ اس کو ہاتھ سے مارا۔ ضَرَبَ بِالسَّوْطِ کے معنے ہیں جَلَدَهٗ۔ اس کو کوڑے سے مارا (اقرب)

اَلْمَثَلُ کے معنے ہیں۔ اَلشِّبْهُ وَالنَّظِيْرُ۔ مشابہ۔ اَلصِّفَةُ بیان۔ اَلْحُجَّةُ۔ دلیل۔ يُقَالُ اَقَامَ لَهٗ مَثَلًا اَیْ حُجَّةً اقام لہ مثلًا کہہ کر مثل سے مراد دلیل لیتے ہیں۔ اَلْحَدِيْثُ عام بات۔ اَلْقَوْلُ السَّائِرُ۔ ضرب المثل۔ اَلْعِبْرَةُ۔ عبرت۔ اَلْاٰيَةُ۔ نشان (اقرب)

اور ضَرَبَ لَهٗ مَثَلًا کے معنے ہیں وَصَفَهٗ وَقَالَهٗ وَبَيَّنَهٗ۔ مثل کو بیان کیا۔ اور اچھی طرح سے واضح کیا۔ پس ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کے معنے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی مثال کو خوب کھول کر بیان کر دیا ہے۔ تاکہ کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آجائے

طَيِّبَةٌ:۔ طَابَ میں سے صفت مشبّہ کا صیغہ ہے اور طَيِّبٌ کا مؤنث ہے۔ اور طَابَ الشَّيْءُ يَطِيْبُ طَابًا وَطِيْبًا وَطِيْبَةً وَطِيْبَانًا کے معنے ہیں۔ لَذَّ وَزَكٰى وَحَسُنَ وَحَلَا وَجَلَّ وَجَادَ۔ کوئی چیز لذیذ۔ پاکیزہ۔ خوبصورت۔ شیریں شاندار۔ خوشبودار بڑی ہو گئی۔ اور طَابَتِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں۔ اَكْلَأَتْ زمین گھاس سے ہری بھری ہو گئی۔ طَابَتِ النَّفْسُ اِنْبَسَطَتْ وَانْشَرَحَتْ۔ جی خوش ہو گیا۔ اور طَابَ الْعَيْشُ لِفُلَانٍ کے معنے ہیں فَارَقَتْهُ الْمَكَارِهُ۔ تکالیف دور ہو گئیں۔ طَابَتْ نَفْسِيْ عَلَيْهِ کے معنے ہیں وَافَقَهَا۔ کہ میرے دل نے اس سے موافقت کی۔ اور طَيِّبٌ کے معنے ہیں۔ ذُوالطِّيْبَةِ۔ پاکیزگی والا (اقرب) پس کلمة طیبة کے معنے ہوں گے۔ ایسا کلام جو اعلیٰ ہو۔ برکت والا ہو۔ عمدہ ہو۔ خوشی پیدا کرنے والا ہو۔ فطرت انسانی کے موافق ہو۔

تفسیر:۔ یہ آیت ان آیات میں سے ہے جن کی تفسیر کر کے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے نہ صرف ان آیات کو حل کر دیا ہے۔ بلکہ دوسری آیات کے لئے حل کرنے کا گر بھی ہمارے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ مگر پیشتر اس کے کہ میں اس کی تفسیر کروں کلمة طیّبة کا اعراب بتا دینا چاہتا ہوں۔

ضَرَبَهٗ

کلمة طیبة کی ترکیب کے متعلق نحویوں کا اختلاف

نحویوں نے کلمة کا اعراب دو طرح بیان کیا ہے۔ بعضوں نے كَلِمَةً کو مثلًا کا بدل قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے ترجمہ یوں ہوگا۔ کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے اک مثال۔ یعنی کلمہ طیبہ کی۔ یہ معنے ابو البقاء نے کئے ہیں

ضَرَبَ مثلًا کے ساتھ استعمال ہو کر دو مفعول چاہتا ہے۔

ابن عطیہ اور زمخشری کہتے ہیں کہ ضرب جب مثلًا کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ تو یہ بھی جَعَلَ کی طرح دو مفعول چاہتا ہے۔ اس بناء پر انہوں نے كلمةً کو مفعول اوّل قرار دیا ہے اور مثلًا کو مفعول ثانی اور كشجرة کو مبتدا محذوف کی خبر بنایا ہے۔ یعنی هِيَ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ۔ تو ان کے نزدیک ترجمہ یہ ہوا کہ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح کلمہ طیبہ کو مثالی طور پر واضح کر کے بیان کیا ہے کہ وہ ایک شجرہ طیبہ ہے جس کی جڑھ قائم ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں یا بلندی میں پھیلی ہوئی ہیں۔

طَيِّبَةً

کلمہ طیبہ سے مراد ایسا نور فطرت و شبہ سے پاک کلام ہے

اب میں اس آیت کی تفسیر بیان کرتا ہوں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی حقیقت بیان کی ہے۔ یعنی اس کلام الٰہی کی جو تازہ اور پاکیزہ ہو نور انسانی دستبرد سے پاک ہو اور اس کا موقعہ یہ تھا۔ کہ پہلی آیات میں شیطانی راہوں پر چلنے والوں کے لئے تباہی کا ذکر فرمایا تھا اور ایمان لانے والوں کے لئے جنات اور انعامات کا۔ اس ذکر سے قدرتی طور پر انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں وہ راہ اختیار کروں۔ جو عذاب سے بچانیوالی اور نعمتوں کا وارث بنانے والی ہو۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا ہے۔ کہ اس سورۃ میں یہ ذکر موجود ہے۔ کہ مختلف اوقات میں

خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ

بُرے درخت کی طرح ہے۔ جس کو زمین پر سے اکھاڑ (کر پھینک) دیا

اللہ تعالےٰ کی طرف سے نبی آتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض نبی بعض کے کلام کو منسوخ کرنے والے تھے۔ پس جب خدا تعالےٰ کا بعض کلام بعض دوسرے کلام کو منسوخ کر دیتا ہے۔ تو انسان کس طرح معلوم کرے کہ فلاں خدائی کلام تو تازہ اور مصفّٰی ہے۔ اور فلاں تازہ اور مصفّٰی نہیں۔ یا کس طرح معلوم کرے کہ فلاں تعلیم تو خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے اور دوسری نہیں۔ کوئی ایسا معیار چاہیئے جس سے تازہ اور قابلِ عمل کلام دوسرے منسوخ شدہ کلام سے اور انسانوں کے بنائے ہوئے اصولوں سے ممتاز ثابت ہو۔ سو وہ معیار اس آیت میں بیان کیا گیا ہے جس کے ذریعہ سے انسان بسہولت اس کلام الٰہی کی صداقت کو معلوم کر لیتا ہے۔ جو تازہ بتازہ اور اپنے زمانہ کے لئے قابل عمل ہوتا ہے۔

تازہ اور مصفّٰی کلام الٰہی کے پہچاننے کا معیار

فرماتا ہے۔ كَلِمَةً طَيِّبَةً یعنی تازہ محفوظ اور نہ بگڑے ہوئے کلام الٰہی کی مثال شجرہ طیبہ کو سمجھ لو۔ کہ (۱) وہ طیب ہو۔ یعنی ظاہری صورت اچھی ہو (۲) اس کی جڑھ مضبوط گڑی ہوئی ہو (۳) اس کی شاخیں آسمان میں پھیل رہی ہوں (۴) اور وہ اپنا پھل ہر وقت دے رہا ہو (۵) اور یہ پھل دینا اللہ تعالےٰ کے اذن کے ماتحت ہو۔

شجرہ طیبہ اور کلمہ طیبہ کی پانچ علامات میں مشابہت

سچا کلام الٰہی کی وسعت ہوتی ہے اور انسانی فطرت کی سب ضرورتوں کو پورا کرتا ہے

یہ پانچ علامات ہیں۔ جو ایک تازہ اور ملاوٹ سے پاک کلام میں ہونی چاہئیں۔ اگر یہ علامات کسی کلام میں پائی جائیں تو وہ اس زمانہ کے لئے قابل عمل ہے اور اس زمانہ کے لوگوں کے لئے ہدایت نامہ ہے لیکن اگر یہ اور کسی کتاب یا کلام الٰہی کہلانے والے صحیفہ میں نہ پائے جائیں۔ تو وہ یا تو منسوخ شدہ کلام الٰہی ہے یا انسانی بناوٹ ہے۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے منزل نہیں ہے۔

کلام کے طیب ہونے کا مطلب

اب میں الگ الگ سب علامتوں کو لیتا ہوں۔ پہلی علامت یہ بتائی ہے کہ وہ طیب ہو۔ طیب کے معنے ہیں۔ (ا) بُرائی عیب اور نقصان سے محفوظ شے (ب) خوبصورت (ج) جو طیب والا ہو۔ اور طیب کے معنے ہیں (۱) لذیذ (۲) پاکیزہ (۳) خوبصورت (۴) شیریں (۵) شاندار (۶) خوبیوں میں بڑھا ہوا۔ پس خدا تعالےٰ کی طرف سے قابل عمل کلام وہ ہے۔ جو اچھے درخت کی طرح ضرر اور نقصان سے محفوظ ہو۔ یعنی اس میں ایسی باتیں نہ ہوں۔ جو انسانی روح یا انسانی شرافت یا انسانی احساسات وجذبات کے خلاف ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ خوبصورت ہو اور اس میں دلکشی اور جذب کے سامان ہوں۔ تیسرے اس پر عمل کرنے والا لذت اور سرور حاصل کرے چوتھے اس میں حلاوت ہو۔ پانچویں وہ شاندار ہو۔ چھٹے وہ دوسروں سے خوبیوں میں بڑھا ہوا ہو۔

دوسری علامت یہ بتائی ہے۔ کہ اس کی جڑھ مضبوط ہو۔ درخت کی جڑھ کے مضبوط ہونے سے ایک تو یہ مراد ہوتی ہے کہ درخت زندہ ہے۔ اور زمین سے غذا لے رہا ہے۔ اسی طرح تازہ کلام الٰہی ہر وقت اللہ تعالےٰ سے اپنی غذا لے رہا ہوتا ہے۔ جو کلام منسوخ ہو جاتا ہے۔ اس کے مضامین کی وسعت ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اس لئے منسوخ ہوتا ہے کہ اب وہ بنی نوع انسان کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا لیکن جو کلام قائم ہوتا ہے۔ وہ انسانی فطرت کی سب ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور جو ضرورت بھی انسان کو پیش آتے۔ جھٹ اس کلام سے اُسے مل جاتی ہے۔ گویا وہ ایک ایسے درخت کی طرح ہے جو زمین سے غذا لے رہا ہے اور اس سے تازہ مطالب جو زمانہ کی ضرورت کے مطابق ہوتے ہیں۔ ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔ کہ وہ مطالب اس میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ لیکن وقت پر ان کا ظاہر کرنا اور ضرورتوں کا اس سے پورا کرنا۔ یہ خدا تعالےٰ کے تازہ فضل سے ہی ہوتا ہے۔ پس ایک رنگ میں یہ ہر وقت غذا لیتے رہنے کے مترادف ہے

۲۔ جڑھ کی مضبوطی سے ایک مراد اس کے تنے کی مضبوطی کے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ صدمہ سے جھکتا نہیں۔ یہ بھی سچے کلام کی ایک علامت ہے کہ وہ اعتراضوں اور نکتہ چینیوں سے متأثر نہیں ہوتا بلکہ جس قدر بھی اس پر بوجھ ڈالو وہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور ہر قسم کے اعتراضوں کو اور جرح کو برداشت کر لیتا ہے۔

۳۔ تیسرے معنی جڑھ کی مضبوطی کے یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنی جگہ سے ہلتا نہیں۔ ان معنوں کی رُو سے کلمہ طیبہ کی یہ علامت ہوگی کہ اس کے اصول ایسے پختہ ہوتے ہیں کہ زمانہ کے اختلاف سے بدلتے نہیں۔ زمانہ بدلتا جاتا ہے۔ مگر اس کی تعلیم نہیں بدلتی۔ اور اپنی جگہ مضبوطی سے قائم رہتی ہے جب بھی کسی کلام کو بدلنے کی ضرورت محسوس ہو۔ سمجھ لو کہ اب وہ کلام خدا تعالےٰ کا تازہ کلام نہیں رہا۔ ایک سُوکھا ہُوا درخت ہے جس کی جڑھیں اکھڑ گئی ہیں۔

۴۔ وہ لمبی عمر والا ہو۔ کیونکہ جن درختوں کی جڑھیں لمبی زمین میں جاتی ہیں۔ وہ لمبی عمر پاتے ہیں۔ کلام الٰہی کی بھی یہ علامت ہے۔ کہ وہ لمبی عمر والا ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ آج نازل ہُوا اور کل منسوخ ہو گیا۔ کلام الٰہی سے مراد کلام الٰہی کا اصولی حصّہ ہے۔ ورنہ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض جزوی امور ابتلاء اور آزمائش کی غرض سے بدلائے جائیں۔ مگر یہ امور کبھی بھی اصولی تعلیم میں سے نہیں ہوتے۔ اصولی تعلیم کبھی جلد نہیں بدلتی۔ جیسے تورات کہ گو قرآن کریم نے اسے منسوخ کیا۔ مگر یہ دو ہزار سال بعد ہُوا۔ درمیان میں نبی آتے رہے۔ مگر ان کی بعثت کی غرض تورات کو منسوخ کرنا نہ تھی۔

۵۔ اس کے ماننے والی اور اس پر عمل کرنے والی ایک جماعت ہو۔ جن کے اندر وہ پرورش پا کر بڑھے اور ترقی کرے کیونکہ جس طرح درخت زمین میں اپنی جڑھیں پکڑتا ہے۔ کلام الٰہی مومنوں کے دلوں اور اعمال میں جڑھیں پکڑتا ہے۔ اگر اس پر عمل کرنے والی کوئی جماعت نہ ہو۔ تو اس کے آثار اور نتائج ظاہر نہیں ہو سکتے۔ پس مومنوں کی جماعت کلام الٰہی کیلئے بمنزلہ زمین ہوتی ہے۔ اور اَصۡلُهَا ثَابِتٌ کے یہ معنے ہیں کہ وہ ایمان لانے والوں کے قلوب پر ایک گہرا اثر ڈالتا ہے اور ان کے اندر مضبوطی سے جڑھیں پکڑ لیتا ہے۔ یعنی وہ اس پر عمل کرتے ہیں اور اس کے کمالات کو ظاہر کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔

سچا کلام اعتراضات سے متاثر نہیں ہوتا

۶۔ اس کا منبع ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی حیوان کی طرح اپنی غذا مختلف جگہوں سے نہیں لیتا۔ بلکہ درخت کی طرح ایک ہی جگہ سے یعنی اللہ تعالےٰ سے غذا لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ انسانی کلام اور تعلیمات مختلف جگہوں سے خوشہ چینی کرتے ہیں۔ کچھ رسم و رواج سے لیا۔ کچھ فلسفہ سے۔ کچھ طبعیات سے۔ کچھ رائج الوقت اصول سے۔ اور اس وجہ سے ان تعلیمات میں باہمی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف الٰہی کلام ایک ہی منبع سے نکلا ہُوا ہوتا ہے جڑھیں اس کی گہری ہوتی ہیں۔ یعنی ہر معاملہ پر گو بحث کرتا ہے۔ لیکن سب تعلیمات ایک ہی اصل کے ماتحت ہوتی ہیں۔ اور ان میں اختلاف نہیں ہوتا۔ اور نیز یہ کہ تازہ الٰہی کلام انسانی امداد کا محتاج نہیں ہوتا۔ سب غذا یعنی اس کی زندگی کا سامان جس سے مراد دلائل و براہین ہیں۔ اپنی جڑھ سے ہی لیتا ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ سے۔ جہاں سے وہ آیا ہے۔

سچے کلام کے اصول پختہ اور غیر متبدل ہوتے ہیں

سچا کلام لمبی عمر پاتا ہے

تیسری علامت یہ بتائی تھی۔ کہ اس کی شاخیں آسمان میں ہوتی ہیں۔ اس سے اس امر کی طرف اشارہ ہے۔ کہ

آسمان میں شاخیں ہونے سے مراد

۱۔ اس پر عمل کر کے انسان خدا تعالےٰ تک پہنچ سکتا ہے۔ کیونکہ جس درخت کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہوں جو شخص اس پر چڑھے گا۔ لازماً آسمان تک پہنچ جائے گا۔ جو استعارۃً الہامی کتب میں اللہ تعالےٰ کے قرب کا مقام قرار دیا گیا ہے۔

(۲) وہ تفصیلات شریعت کو مکمل طور پر بیان کرے۔ کیونکہ آسمان میں شاخوں کے پھیلنے سے شاخوں کی بہتات اور کثرت بھی مراد ہو سکتی ہے۔ پس کلام الٰہی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ معنے ہوں گے۔ کہ اس کلام میں ہر انسانی ضرورت کے متعلق تعلیم موجود ہو۔ اور اخلاقی اور مذہبی کوئی ایسا مسئلہ نہ ہو۔

سچے کلام پر عمل کرنے والے مومنوں کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔

جس پر اس میں بحث نہ ہو۔ گو اس نے روحانی آسمان کو اپنے پھیلاؤ سے ڈھانپ لیا ہو۔

سچے کلام کی تعلیم اعلیٰ اخلاق پر مبنی ہوتی ہے۔

۳- تیسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی تعلیم اعلیٰ اخلاق پر مبنی ہو کیونکہ اونچی شاخوں سے مراد ایک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی تعلیم ادنیٰ اخلاق اور ادنیٰ امور پر مشتمل نہ ہو۔ بلکہ اعلیٰ مقاصد اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم پر مشتمل ہو۔

سچے کلام سے ہر فطرت کے آدمی فائدہ اٹھاتے ہیں

۴- چوتھی بات فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر فطرت کے آدمی اس سے فائدہ اٹھا سکیں کیونکہ جس درخت کی شاخیں خوب پھیلی ہوئی ہوں۔ اس کے سایہ کے نیچے بہت سے آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ پس اس میں کلام الٰہی کی اس صفت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ اس کے سلسلہ میں بہت سے لوگ آسکتے ہیں۔ یعنی مختلف فطرتوں اور مزاجوں کے لوگوں کو وہ آرام دینے کا موجب ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں سچے کلام کی سب علامتیں پائی جاتی ہیں۔

چوتھی علامت یہ بتائی ہے۔ کہ وہ ہر وقت اپنے پھل دے رہا ہو۔ اس سے یہ مراد ہے۔ کہ زندہ کلام الٰہی کی (۱) یہ علامت ہوتی ہے۔ کہ وہ ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا کرتا رہتا ہے جو اس کے پھل کہلا سکتے ہیں۔ یعنی وہ اس کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں۔ اور انہیں کلام کے اعلیٰ ہونے کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

سچے کلام سے دائمی نجات حاصل ہوتی ہے۔

۲- دائمی نجات اس سے حاصل ہو۔ کیونکہ جس طرح تؤتی اکلھا سے یہ مراد ہے۔ کہ ہر وقت کامل انسان پیدا کرتا ہے اسی طرح یہ بھی کہ انسان ہمیشہ اس سے پھل کھاتا ہے۔ اور ہمیشہ پھل تبھی کھا سکتا ہے۔ جبکہ ہمیشہ کی پاکیزہ حیات انسان کو حاصل ہو۔

طیبہ کے لفظ میں خوبیوں کی طرف اشارہ

پانچویں علامت شجرہ طیبہ کی یہ بتائی۔ کہ وہ اپنے پھل باذن ربها دیتا ہے۔ یعنی اس کے اعلیٰ پھل طبعی نہیں ہوتے بلکہ قوت الٰہی سے ہوتے ہیں۔ کلام الٰہی کے درخت کو اس طرح عام درخت سے ممیز کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ عام درخت تو قوانین طبعیہ کے ماتحت پھل دیتا ہے۔ لیکن شجرہ طیبہ ایک ایسا درخت فرض کیا گیا ہے۔ کہ جو پھل تو دے۔ لیکن وہ پھل خاص حکم کے ماتحت ظاہر ہوں۔ ان کا ظہور الٰہی منشاء کے ماتحت ہو۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ کلام الٰہی کے نتائج صرف طبعی نہیں ہوتے۔ بلکہ شرعی بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً سچ بولنا ہے۔ اس کا ایک طبعی پھل ہوگا کہ لوگوں میں سچے آدمی کا وقار بڑھے گا۔ لیکن اس کا ایک پھل شرعی ہوگا کہ ایسا انسان خدا تعالیٰ کے خاص فضلوں کا وارث ہوگا۔ نماز ہے۔ اس کا ایک ظاہری پھل تو یہ ہوگا۔ کہ اطاعت اور نظام قومی کی تعلیم ہوگی۔ لیکن ایک اس کا شرعی پھل ہوگا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت ایسے شخص کو حاصل ہوگی۔ اور وہ اس کا قرب پائے گا۔

یہ علامات شجرہ طیبہ کی جو قرآن کریم نے بیان کی ہیں۔ تازہ کلام الٰہی کی جو مصفّٰی اور زندہ ہو۔ ایسی بیّن تشریح کر دیتی ہیں کہ سچے اور جھوٹے کلام میں فرق کرنے میں کوئی مشکل ہی باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ جب ہم ان علامات کی روشنی میں قرآن کریم کو دیکھتے ہیں۔ تو ہر علامت اس میں ایسے حیرت انگیز طور پر پائی جاتی ہے کہ بلید سے بلید آدمی بھی اس امر کو تسلیم کرنے سے رک نہیں سکتا کہ یہ کلام اپنے اندر بے نظیر خوبیاں رکھتا ہے۔ اور فوق العادت طاقتیں اس میں پائی جاتی ہیں۔ اس حد تک کہ نہ کوئی انسانی کلام اور نہ سابقہ آسمانی کتب اس سے ان امور میں برابری کر سکتی ہیں۔

ایک مختصر تفسیر میں ان امور کی تفصیلات بیان کرنے کا تو موقعہ نہیں مل سکتا۔ لیکن اختصاراً میں ان امور کو قرآن کریم پر چسپاں کر کے بتاتا ہوں۔ کہ یہ سب علامات قرآن کریم میں ایسے اعلیٰ اور اکمل طور پر پائی جاتی ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

سب سے پہلے میں طَيِّبَةٍ کے لفظ میں جن خوبیوں کی طرف اشارہ ہے انہیں لیتا ہوں۔ طَيِّبَة کا لفظ جس چیز کے لئے بولا جائے۔ اس کے لئے شرط ہے۔ کہ اس میں ظاہری یا باطنی کوئی نقص نہ ہو۔ کوئی ضرر نہ ہو۔ اب ہم قرآن کریم

کو دیکھتے ہیں۔ تو اس کے اندر ہمیں یہ بات غیر معمولی طور پر نظر آتی ہے۔ کہ باوجود اس کے کہ اس میں ایسے مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ جو نہایت نازک ہیں۔ لیکن پھر بھی اس کی زبان نہایت اعلیٰ اور تہذیب کے انتہائی نقطہ پر قائم رہتی ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات۔ حیض و نفاس کا ذکر۔ عورت و مرد کی جذباتی زندگی۔ یہ سب ہی کچھ اس میں بیان ہے لیکن ایسے عمدہ طریق سے کہ نازک سے نازک طبیعت اس سے صدمہ محسوس نہیں کرتی۔ اس کی زبان ایسی صاف ہے۔ کہ نہ ثقیل الفاظ ہیں نہ پیچیدہ بندشیں، نہ شاعرانہ تخیلات۔ بلکہ ہر مضمون کو خواہ کس قدر مشکل ہو۔ وہ اس عمدگی سے اور ایسے سادہ لفظوں میں ادا کرتا ہے۔ کہ نہ کانوں پر اس کی عبارت گراں گزرتی ہے۔ اور نہ دماغ اس سے پریشان ہوتا ہے۔ تعلیم ایسی سادہ اور لطیف ہے۔ کہ اس پر عمل کر کے کسی نقصان کا خطرہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔

دوسرے معنے طیّبۃ کے یہ ہیں۔ کہ اس کا موصوف خوبصورت ہو۔ ان معنوں کی رُو سے بھی قرآن کریم سب کُتب سے ممتاز نظر آتا ہے۔ اس کا ظاہری حسن ایسا نمایاں ہے۔ کہ کوئی کتاب اس کے مقابلے ٹھہر ہی نہیں سکتی۔ الفاظ کی خوبی۔ بندش کی چستی۔ محاورہ کا برمحل استعمال۔ عبارت کا تسلسل۔ مضمون کی رفعت۔ معانی کی وسعت۔ ایک سے ایک بڑھ کر خوبیاں ہیں۔ کہ انسان نہیں کہہ سکتا۔ کہ اُسے سراہے یا اس کی تعریف کرے۔ اُنہی عربی الفاظ سے وہ بنا ہے۔ جو ہزاروں لاکھوں اور کتب میں استعمال ہوتے ہیں۔ مگر کیا مجال کہ کوئی اور کتاب اس کے قریب تک پہنچ سکتی ہو۔ عرب اپنے خیالات کی نزاکت اور اپنے ادب کی بلندی اور اپنے ذخیرہ الفاظ کی کثرت کی وجہ سے سب دنیا کے لوگوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اور عرب قوم ادب کی اس قدر دلدادہ ہے کہ زور اور زر اور علو شان جیسی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی اشیاء بھی اُن کے نزدیک ادب کے مقابلہ پر ہیچ ہیں۔ وہ اپنے شاعروں کو پیغمبر اور اپنے ادیبوں کو دیوتا سمجھنے والے لوگ جن میں ادب اور ادیب کو ترقی کرنے کا بہترین موقعہ مل چکا تھا

نازک ترین مضامین پر مشتمل ہونے کے باوجود قرآن مجید کی زبان نہایت اعلیٰ اور شستہ ہے

جب قرآن کریم کو دیکھتے ہیں۔ تو زبانوں پر مہر لگ جاتی ہے۔ اور آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ نزول قرآن کریم کا زمانہ ان کا بہترین ادبی زمانہ تھا۔ یا تو عرب کے چوٹی کے ادیب قریب میں ہی گذر چکے تھے یا ابھی زندہ موجود تھے۔ وہ جب قرآن کریم کو سنتے ہیں۔ تو بے اختیار اس کے سحر ہونے کا شور مچا دیتے ہیں۔ مگر وہی لفظ جو اس کے جھوٹا ہونے کے ثبوت کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اسی نے ظاہر کر دیا۔ کہ عرب کا متفقہ فیصلہ تھا۔ کہ قرآن کریم کا حسن انسانی قوت تخلیق سے بالا تھا۔ انسانی دماغ نے بہتر سے بہتر ادبی مقالات بنائے تھے مگر اس جگہ اُسے اپنے عجز کا اعتراف کئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ فَسُبْحَانَ اللّٰہِ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ۔

قرآنی مضامین کی وسعت، بلندی اور تاثیر حیرت انگیز ہے

اس کے مضامین کا بھی یہی حال ہے۔ ان کی بلندی۔ ان کی وسعت۔ ان کی ہمہ گیری۔ ان کا انسانی دماغ کے گوشوں کو منور کر دینا۔ انسانی قلوب کی گہرائیوں میں داخل ہو جانا۔ نرمی پیدا کرنا تو اس قدر کہ فرعونیت کے ستونوں پر لرزہ طاری ہو جائے۔ جرأت پیدا کرنا تو اس حد تک کہ بنی اسرائیل کے قلوب بھی ابراہیمی ایمان محسوس کرنے لگیں۔ عفو کو بیان کرے تو اس طرح کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی انگشت بدنداں ہو جائیں۔ سزا کی ضرورت کو ظاہر کرے تو اس طرح کہ موسیٰؑ کی روح بھی صَلِّ علیٰ کہہ اٹھے غرض بغیر اس کے مضامین کی تفاصیل میں پڑنے کے ہر انسان سمجھ سکتا ہے۔ کہ وہ ایک سمندر ہے جس کا کنارہ نہیں۔ ایک باغ ہے، جس کے پھلوں کا خاتمہ نہیں۔ آج تک اُس کے حسن کو دیکھ کر لوگ یہ کہتے چلے جاتے ہیں۔ کہ یہ کلام بہت سے لوگوں نے مل کر بنایا ہے۔ مگر کیا یہ خود اقرارِ حُسن نہیں۔

قرآن مجید کا ظاہری حُسن بے مثل ہے

قرآن مجید کی غیر معمولی لذت

طیّب کے تیسرے معنے لذت کے ہیں۔ قرآن کریم کی لذت کو دیکھو۔ تو غیر معمولی ہے۔ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو دیکھو وہ اپنے مذہب پر عمل کر کے بیزار نظر آتے ہیں لیکن قرآن کریم پر عمل کرنے والا کبھی اس سے بیزار نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ مزہ اس سے اٹھاتا ہے۔ غرض اس میں کچھ ایسی لذت ہے کہ جو اس کا مزہ حقیقی طور پر چکھ لیتا ہے۔ پھر

اسے چھوڑنے کا نام نہیں لیتا۔

قرآن مجید میں پاکیزگی پر سب کتابوں سے زیادہ زور دیا گیا ہے

طیّب کے چوتھے معنے پاکیزگی اور نموّ کے ہیں۔ قرآن کریم اس میں بھی بے مثل ہے جس قدر پاکیزگی کی تعلیم پر قرآن کریم میں زور ہے اور کسی کتاب میں نہیں۔ ظاہری پاکیزگی کو دیکھو تو یہ قرآن کریم ہی ہے جو اسے مذہب کا جزو قرار دیتا ہے۔ قرآن کریم سے پہلے ظاہری صفائی اور رُوحانیت آپس میں مخالف چیزیں سمجھی جاتی تھیں مسیحی راہب اپنی غلاظت پر فخر کرتے تھے ہندو سادھو اپنی بھبوت اور چپکی ہوئی جٹاؤں پر نازاں تھے مگر

قرآن کریم نمو میں بھی سب کتابوں سے آگے بڑھا ہوا ہے۔

قرآن کریم نے پاکیزگی کے اصول کو کیسا واضح کیا، اس نے کس طرح دنیا کی توجہ اس طرف پھیری کہ صاف جسم سے صاف رُوح پیدا ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ طیبات کا استعمال رُوح کو گندہ نہیں بلکہ پاک کرتا ہے اگر خدا تعالیٰ کا ولی ہی اس کی اچھی چیزوں کو پھینک دیتا ہے تو دوسرے انکی صحیح قدر کو کب پہچان سکتے ہیں۔ ہاں طیب چیزوں کا طیب صورت میں استعمال کرنا ضروری ہے۔ یَآ اَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (المؤمنون ۴) اے رسولو پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اس کے نتیجہ میں نیک اور مناسب حال عمل کرو۔ کہہ کر قرآن کریم نے جسم اور روح کے درمیان ایک ایسا رشتہ ظاہر کیا ہے۔ کہ کتابوں کی جلدیں کی جلدیں اس کے بیان کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔

قرآن کریم لذیذ ہونے کے علاوہ شیریں بھی ہے۔

طیب کے پانچویں معنے شیریں کے ہیں۔ قرآن کریم نہ صرف لذیذ ہے بلکہ شیریں ہے۔ لذت صرف انسانی رغبت پر دلالت کرتی ہے مگر شیرینی اس کی مناسبت پر بھی دلالت کرتی ہے۔ قرآنی تعلیم میں کوئی تیزی نہیں، کوئی حدت نہیں۔ نازک سے نازک دماغ اس کو بلا تکلیف کے قبول کرتا اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

قرآنی مضامین ایسے شاندار ہیں کہ کوئی کتاب ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

چھٹے معنے طیّب کے شاندار کے ہیں۔ قرآنی مضمون ایسے شاندار ہیں کہ کوئی کتاب اس میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اس طرح تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ وہ اس کی دنیا پر حکومت کو اس خوبی سے ظاہر کرتا ہے۔ وہ اس کے تصرف کو اس عمدگی سے ثابت کرتا ہے۔ کہ قرآنی مضامین کو پڑھ کر انسانی رُوح وجد میں آجاتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان سب دنیوی علائق کو توڑ کر آسمان کی طرف پرواز کرنے لگ گیا ہے۔ کونسی کتاب ہے جو اس امر میں اس کے سامنے آسکتی ہے۔ کونسا کلام ہے جو اس حُسن میں اس کا مقابلہ کر سکتا ہے؟

ساتویں معنے طیّب کے خوبیوں میں بڑھے ہوئے ہونے کے ہیں۔ اوپر کے مطالب سے ہر شخص معلوم کر سکتا ہے۔ کہ قرآن کریم ہر کتاب پر خواہ وہ الہامی ہو خواہ انسانی۔ اس قدر فوقیت رکھتا ہے کہ وہ کتب کسی اور عالم کی معلوم ہوتی ہیں اور قرآن کریم کسی اور عالم کا۔

دوسری علامت کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کی یہ بتائی گئی تھی کہ اَصْلُھَا ثَابِتٌ اس کی جڑھ مضبوط ہے اور اس علامت کی تشریح میں میں نے چھ باتیں بتائی تھیں۔ جن کو اگر قرآن کریم کے متعلق دیکھا جائے تو وہ سب کی سب اس میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔

اوّل قرآن کریم ایک زندہ کتاب ہے یعنی جس طرح زندہ درخت جس کی جڑھیں زمین میں پھیل کر ہر وقت غذا لے رہی ہوتی ہیں تازہ رہتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی تازگی قائم ہے۔ اور ہر وقت تازہ معانی اس سے ملتے ہیں تیرہ سو سال سے لوگ اس کی تفاسیر لکھتے چلے آئے ہیں اور بعض نے تو سو سو جلدوں کی تفسیریں لکھی ہیں مگر باوجود اس کے۔ اس کے مطالب ختم نہیں ہوئے۔ اب بھی اس میں سے نئے نئے مطالب نکل رہے ہیں۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک نلکی ہے جس کے ایک طرف بیٹھا ہوا کوئی شخص دوسری طرف خزانہ لڑھکا رہا ہے۔ کتنا ہی غور کرو کوئی سا سوال کرو۔ نئے مطالب کھلتے جاتے ہیں۔ اور ہر سوال کا جواب ملتا جاتا ہے۔ قرآن کریم خود فرماتا ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور اس وجہ سے ہم جانتے ہیں۔ کہ اس کے دل میں

کیا کیا شبہات پیدا ہوتے ہیں اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ (ق ع ۲) الٰہی کلام جب تک دنیا کے لئے قابلِ عمل ہے۔ ایک تازہ درخت کی طرح ہونا چاہیئے۔ یعنی وہ ہر وقت اپنے منبع سے غذا حاصل کر رہا ہو جس طرح درخت بظاہر وہی نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر تازہ رس حیات کا زمین سے آتا رہتا ہے۔ اسی طرح کلام وہی رہتا ہے لیکن اس کے تازہ مطالب حسبِ ضرورت کھلتے رہتے ہیں۔ اور ان کی طرف ذہن کا پھرانا اللہ تعالیٰ اپنے اختیار میں رکھتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ یعنی اس کلام کو سوائے ان کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے پاک کیا ہو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے (واقعہ ع ۳)

مضبوط جڑھوں والے درخت کی دوسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ صدمات سے جھکتا نہیں۔ حوادث کا مقابلہ مضبوطی سے کرتا ہے۔ کلام وہی مضبوط جڑھ والا کہلا سکتا ہے جو ہر زمانہ کے اعتراضوں کی برداشت کر سکے اور ان کا جواب اس کے اندر موجود ہو۔ قرآن کریم میں یہ خوبی بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اس کے اصول ایسے واضح ہیں کہ اس کے جھکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ نہ اسے بدلانے کی کسی کو اجازت ہے۔ اور نہ خود اس کے اپنے الفاظ اس کے معانی کو بدلنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس کے اندر تبدیلی کی کوشش کرنیوالا قرآن کریم کو توڑ دیگا مروڑ نہیں سکے گا۔ جس طرح عمارت میں سے چند اینٹیں نکال لی جائیں تو وہ گر جاتی ہے۔ اسی طرح اس کی تعلیم کو کوئی بدلنا چاہے تو وہ سب کی سب ناقص ہو جائے گی۔

اسی طرح روحانی طور پر بھی ممکن نہیں کہ قرآن کریم کے بعض ٹکڑوں کو کوئی اختیار کرے اور بعض کو چھوڑ دے۔ یا سب کو چھوڑے گا یا سب کو اختیار کریگا ورنہ کوئی فائدہ نہ اٹھائیگا۔ چنانچہ اس وقت مسلمان بعض قرآن پر عمل کر رہے ہیں اور بعض کو چھوڑ رہے ہیں لیکن اس سے انہیں فائدہ کوئی نہیں پہنچ رہا بلکہ غیر مسلم ان سے زیادہ ترقی کر رہے ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن کریم دب کر نہیں رہنا چاہتا۔ جو اسے دبانے کی کوشش کرے وہ نقصان اٹھائے گا۔ ہاں اسے بالکل چھوڑ کر دوسرے مذہب کو اختیار کر لے۔ گویا قرآن کریم کی جڑھ کو اپنے دل سے اکھاڑ پھینکے تو پھر بیشک وہ دنیوی طور پر ترقی کر سکے گا۔

اسی طرح یہ امر بھی ثابت ہے کہ قرآن کریم تبدیلیٔ زمانہ سے متاثر نہیں ہوتا۔ کوئی علم نکلے۔ کوئی ایجاد ہو اکی تعلیم پر کوئی حملہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید کے زندہ کتاب ہونے اس کے نئے نئے مطالب کھلتے رہتے ہیں

تیسری خصوصیت مضبوط جڑھ والے درخت کی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی جگہ کو چھوڑتا نہیں۔ یہ معنے بھی قرآن کریم میں بدرجہ اعلیٰ پائے جاتے ہیں۔ قرآن کریم کے اصول ایسے پختہ ہیں کہ وہ کبھی بدلتے نہیں۔ یہ نہیں کہ تعلیم کا ایک حصہ اور اصول پر مبنی ہو اور دوسرا حصہ دوسرے اصول پر۔ جیسے انجیل میں توحید اور تثلیث یا کفارہ اور رحم متضاد اصول پر مذہب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ آریہ مذہب میں ایک طرف خدا تعالیٰ کو دیالو کرپالو کہا گیا ہے۔ تو دوسری طرف روح اور مادہ کو انادی۔ حالانکہ یہ دونوں تعلیمیں متضاد اصول پر قائم ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی سب تعلیم مقررہ اصول پر قائم ہے۔ توحید ہے تو اس کے باریک سے باریک احکام اسی کے گرد چکر کھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو رحمٰن اور رحیم قرار دیا گیا ہے تو تمام تفصیلی تعلیمات ان صفات کے تابع ہیں۔ یہ نہیں کہ توحید کی تعلیم دی ہو۔ اور تفصیلات شرک پر مبنی ہوں۔ رحیم قرار دیا ہو اور جزئیات عدم رحم پر دلالت کرتی ہوں۔

قرآن کریم کے اصول پختہ اور غیر متبدل ہیں۔

قرآن کریم میں ہر زمانہ کے اعتراضوں کا جواب موجود ہے

چوتھی خصوصیت مضبوط جڑھ کے درخت کی یہ ہوتی ہے۔ کہ اس کی عمر لمبی ہو جس قدر جڑھیں مضبوط ہوں۔ درخت لمبی عمر پاتا ہے۔ قرآن کریم پر تیرہ سو سال گذر چکے ہیں۔ اب تک اس کی تعلیم قابلِ عمل ہے۔ اور قابلِ عمل رہے گی۔ جو کتب خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتیں۔ وہ آج لکھی جاتی ہیں۔ اور کل ان کے خلاف انہی کے ماننے والے کہنے لگتے ہیں اور اس پر سے عمل اٹھ جاتا ہے لیکن قرآن کریم پر برابر عمل ہو رہا ہے بلکہ جو لوگ اسے چھوڑ رہے تھے۔ اب پھر اس کی تعلیم کی طرف واپس آرہے

قرآنی تعلیم تاقیامت قابلِ عمل رہے گی

یورپین تہذیب کے دلدادہ قرآن کریم کی تعلیم کی خوبی کے قائل ہو رہے ہیں

ہیں۔ یورپین تہذیب کے دلدادہ اب پھر اس کی ظاہری خوبصورتی کا تلخ تجربہ کر لینے کے بعد دوبارہ قرآن کریم کی ٹھوس تعلیم کی خوبی کے قائل ہو رہے ہیں۔ سؤر کی حرمت۔ شراب کی ممانعت۔ کثرت ازدواج کی اجازت۔ طلاق۔ عورت اور مرد کے اختلاط میں حزم و احتیاط۔ ورثہ وغیرہ بیسیوں امور ہیں۔ کہ جن میں قرآنی اصول کی برتری کو دنیا پھر تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ اور اس طرح قرآن کی عمر جو ہمارے نزدیک تو ناقابل میت ہے۔ دشمنوں کے نزدیک بھی لمبی ہوتی نظر آتی ہے۔

قرآن کریم پر عمل کرنے والے لوگ ہر زمانہ میں ملتے رہے ہیں

پانچویں خصوصیت مضبوط جڑھوں والے درخت کی یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ اچھی مٹی میں اُگتا ہے یعنی ایسا درخت کبھی معمولی زمین میں نہیں اُگ سکتا۔ کیونکہ جب تک جڑھوں کے پھیلنے کے لئے عمدہ مٹی دور تک نہ ملتی ہو۔ جڑھیں دور تک پھیل نہیں سکتیں۔ اسی طرح کلام الٰہی بھی اپنے حسن کو تبھی ظاہر کر سکتا ہے جب ایسی قوم اس کی حامل ہو جو اس سے مناسبت رکھتی ہو اور اسے اپنے دلوں میں جگہ دینے کو تیار ہو۔ اسی کی طرف قرآن کریم میں یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (فاطر ع) عمل صالح ایمان کو ترقی دیتا ہے یعنی درخت تو ایمان ہے لیکن وہ عمل صالح کے بغیر بڑھتا نہیں۔ پس گو کلام الٰہی کیسا اعلیٰ ہو۔ جب تک اس کے ساتھ عمل شامل نہ ہو۔ اس کی خوبی ظاہر نہیں ہوتی۔ پس ضروری ہے کہ کلام الٰہی ایسے دلوں میں جگہ پکڑے جو اس کی تعلیم کے نشو و نما کے لئے موزون ہوں اور جن میں دُور دُور تک اس کی جڑھیں پھیل سکیں۔ جب تک یہ بات کسی کلام کو میسر نہ ہو وہ قائم نہیں رہ سکتا۔ قرآن کریم کو یہ بات بدرجۂ اتم حاصل ہے۔ جب یہ ظاہر ہوا تب بھی ایک ایسی جماعت اسے میسر ہوئی جنہوں نے اس کا درخت اپنے دلوں میں لگایا۔ اور اپنے خون سے اس کی آبیاری کی اور اس کے بعد سے لے کر آج تک یہ بات اسے میسر ہے۔ وید۔ تورات۔ انجیل سب کتب پر ایک وقت میں لوگ عمل کرتے تھے۔ مگر آج ان پر عمل کرنے والے تلاش کرنے سے بھی شاید ہی ملیں۔ لیکن قرآن کریم پر عمل کرنے والے لوگ ہر زمانہ میں ملتے رہے ہیں۔ اور جب بھی ان لوگوں میں کمی آتی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اور لوگ پیدا کرتا رہا ہے جو اس پر عمل کرنے والے تھے۔ اور اس طرح اس کی جڑھیں مضبوطی سے گڑی رہی ہیں اور اس کا حسن ہمیشہ لوگوں کی نظروں کے سامنے رہا ہے۔ باقی کتب میں اگر حسن بھی ہے تو ان کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کسی درخت کے حسن کو اس کا بیج ہتھیلی پر رکھ کر بیان کیا جائے۔ اور قرآن کریم کا حسن اس کے خوبصورت درخت سے جو ہر وقت اُگا ہوا ہے۔ دکھایا جا سکتا ہے اور قیاس سے حسن معلوم کرنا اور آنکھوں سے دیکھ کر معلوم کرنا برابر نہیں ہو سکتا۔

انسانی کتب کے بالمقابل قرآن کریم کی تعلیم سب کی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

چھٹی خصوصیت مضبوط جڑھوں والے درخت کی یہ ہوتی ہے کہ اس کا منبع ایک ہوتا ہے یعنی وہ حیوان کی طرح مختلف جگہ سے غذا نہیں لیتا۔ اس خصوصیت میں بیشک کمزور درخت بھی شامل ہے لیکن یہ مقابلہ حیوانات سے ہے نہ کہ دوسرے درختوں سے۔ گویا دوسری الہامی کتب خواہ وہ قرآن کریم کی طرح شاندار نہ ہوں۔ اس امر میں ایک حد تک اس سے مشابہ ہوں گی لیکن انسانی کلام نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کی تعلیم سب کی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ انسانی ہاتھ کا اس میں دخل نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ نشو و نما حاصل نہیں کیا بلکہ یکدم ایک ہی شخص کے دل پر اُسے نازل کیا گیا ہے۔ وہ زمانہ کی رَو کی ترجمانی نہیں کرتی کہ اُسے صدیوں کے فلسفہ کا خلاصہ کہا جائے۔ جیسا کہ اچھی انسانی کتب کا حال ہے بلکہ وہ اکثر امور میں زمانہ کی رَو کا مقابلہ کرتی اور ان کے خلاف چلتی ہے۔ اور اپنے لئے ایک بالکل نیا راستہ بناتی ہے جس سے صاف نظر آتا ہے۔ کہ وہ اپنی غذا ایک ہی جگہ سے لیتی ہے اور درخت سے مشابہ ہے۔ برخلاف انسانی کتب کے کہ وہ حیوان کے مشابہ ہوتی ہیں اور انتخاب اور استفادہ اور تجسس پر ان کی بنیاد ہوتی ہے اور گو مصنف ایک نظر آتا ہے لیکن اس کا علم ماخوذ ہوتا ہے ہزاروں انسانوں کے تجربہ سے سوائے ان لوگوں کے کہ جو

قرآن کریم پر اپنی تصنیفات کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی تصنیفات قرآن کریم کا عکس ہیں۔ اس سے جدا نہیں۔

تیسری علامت شجرۃ طیبۃ کی یہ بیان فرمائی تھی کہ فرعھا فی السماء اس کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ آسمان میں شاخیں پھیلنے کے سات معنے میں نے اوپر بیان کئے ہیں اور ان معانی کے رو سے بھی قرآن کریم ایک ممتاز کتاب نظر آتی ہے۔ اس کے اس امتیاز میں کوئی اس کا شریک نظر نہیں آتا۔

پہلی خصوصیت فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ کی میں نے یہ بتائی تھی کہ اس پر چڑھ کر انسان آسمان تک پہنچ سکیگا۔ یہ خصوصیت قرآن کریم میں واضح طور پر پائی جاتی ہے بلکہ اس میں اس کے ساتھ کوئی اور کتاب شریک ہی نہیں۔ کیونکہ کوئی کتاب اس کی دعوی دار نہیں۔ کہ اس پر عمل کر کے انسان خدا تعالے تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس کا مدعی ہے کہ اس کی تعلیم پر عمل کر کے انسان آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ یعنی قُربِ الٰہی اُسے حاصل ہو جاتا ہے۔ اور وہ آسمانی امور کو بچشم خود دیکھ لیتا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے عاملین میں سے ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جو اس امر کے مدعی تھے کہ قرآن کریم کے ذریعے انہیں روحانی صعود حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ وہ خدا تعالے تک جا پہنچے۔ اور اس کے خاص فضلوں کو انہوں نے حاصل کیا۔

دوسری خصوصیت فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ کلام الٰہی کی تعلیم اعلیٰ اخلاق پر مشتمل ہوتی ہے۔ کیونکہ اونچا درخت بلند خیالی اور وسعت اخلاق پر بھی دلالت کرتا ہے۔ یہ امر بھی قرآن کریم میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی اخلاقی تعلیم ایسی اعلیٰ ہے اور درخت کی شاخ کی طرح اس طرح ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف گئی ہے کہ کسی اور کتاب میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ بعض کی اخلاقی تعلیم نہایت ادنیٰ ہے جس طرح زمین پر گری ہوئی شاخ۔ اور بعض کی اعلیٰ تو ہے لیکن اس کا جڑھ سے تعلق نہیں۔ وہ ایسی ہے۔ جیسے کسی تاگا سے کسی شاخ کو بلندی میں لٹکا دیں۔ سو وہ بلند تو ہو جائے گی۔ لیکن اس پر کوئی چڑھ نہیں سکیگا لیکن قرآن کریم کی اخلاقی تعلیم

قرآن کریم کی اخلاقی تعلیم ہر طبقہ کے لوگوں کے لئے ہے۔

ایسی ہے جس پر ہر طبقہ کا آدمی عمل کر سکتا ہے۔ ادنیٰ آدمی چڑھ سے چڑھ کر اوپر جا سکتا ہے اور اوپر پہنچا ہوا آدمی اس کے اوپر اور ترقی کر سکتا ہے۔ اسکی اس خوبی پر بعض لوگ معترض ہوتے ہیں۔ مثلاً سزا کی تعلیم پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اس طرح ادنےٰ اخلاق سکھلائے گئے ہیں حالانکہ نہیں دیکھتے۔ کہ ادنیٰ اخلاق والے انسانوں کی اصلاح اس کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ کچھ لوگ سزا سے ملتے ہیں۔ کچھ عفو سے۔ پھر کچھ عدل کے مقام پر ہوتے ہیں۔ کچھ احسان کے اور کچھ ایتاء ذی القربیٰ کے۔ جو مذہب ان امور کو اپنی تعلیم میں شامل نہیں کرتا۔ وہ لوگوں کو یا اعلیٰ اخلاق سے محروم کر دیتا ہے۔ یا انسانوں میں سے ایک حصہ کو نجات سے محروم کر دیتا ہے۔ غرض اس خصوصیت میں بھی قرآن کریم ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

قرآنی تعلیم پر عمل کرنے سے قرب الٰہی حاصل ہو جاتا ہے

تیسری خصوصیت فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ کے ماتحت یہ ہے کہ اس کی شاخیں بہت ہوں کیونکہ جس درخت کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہوں گی۔ وہ نہ صرف اونچی ہوں گی بلکہ بہت کثرت سے بھی ہوں گی۔ (یاد رہے کہ الی السماء نہیں فرمایا۔ فی السماء فرمایا ہے جس سے بلندی کے علاوہ پھیلاؤ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے) اس خصوصیت میں بھی قرآن کریم کو ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔

قرآن کریم کی تعلیم اس قدر مطالب پر حاوی ہے۔ کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

اس کی تعلیم اس قدر مطالب پر حاوی ہے۔ کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک مختصر سی کتاب ہے۔ اناجیل سے بھی چھوٹی۔ لیکن اس کے اندر اس قدر مطالب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہ اس سے ہزاروں گُنے زیادہ حجم کی کتب میں وہ مضامین نہیں ملتے عبادات ہیں۔ تو ان کی ہر شاخ اس میں تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ معاملات ہیں۔ تو ان کی ہر شاخ اس میں تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ علم الاخلاق۔ تمدن۔ سیاست۔ اقتصادیات۔ پیشگوئیاں۔ الٰہیات۔ قضاء۔ تصوّف۔ علم المعاد۔ علم کلام اور ان سب علوم کے فلسفے اور تفصیلات قرآن کریم میں موجود ہیں۔ اور ایسے کامل طور پر موجود ہیں۔ کہ اس کے بعد کسی اور کتاب کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ (اس کے لئے دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتاب اسلامی اصول کی فلاسفی اور

آئینہ کمالات اسلام اور میری کتاب احمدیت یعنی حقیقی اسلام وغیرہ)

چوتھی خصوصیت فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ کے ماتحت یہ ہے کہ اس کا سایہ وسیع ہو کیونکہ جس درخت کی شاخیں بلند اور پھیلی ہوئی ہوں۔ اس کا سایہ بھی بہت وسیع ہوتا ہے۔ پس کلمہ طیبہ وہ ہے جس کے سایہ میں بہت سے آدمی بیٹھ سکیں یعنی وہ ہر فطرت کے انسانوں کے لئے تسلی دینے کا موجب ہو یعنی جس طرح اخلاق کے ہر درجہ کے لوگوں کو بلندی کی طرف پہنچائے۔ اسی طرح ہر فطرت کے انسان کے لئے بھی اس میں تسلی کا سامان موجود ہو۔

ہر فطرت کے انسان کے لئے قرآن کریم میں تسلی کا سامان ہے۔

قرآن کریم میں یہ صفت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ انسانی مزاج مختلف قسم کے ہوتے ہیں کوئی انسان کسی طاقت اور میلان کو لے کر آتا ہے۔ کوئی کسی طاقت اور میلان کو کامل کتاب میں سب کے لئے آرام کا سامان موجود ہونا چاہیئے اور قرآن کریم میں ایسا ہی ہے۔ کسی طبعی تقاضے کو ضائع نہیں کیا گیا۔ کچلا نہیں گیا۔ باقی تمام مذاہب میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بشریت کے تقاضوں کو گناہ قرار دے کر ان کے کچلنے پر سارا زور لگایا گیا ہے لیکن

قرآن کریم بشری تقاضوں کو انسانی تکمیل کے ذرائع قرار دیکر ان کی اصلاح پر زور دیتا ہے

قرآن کریم نے بشریت کے تقاضوں کو انسانی تکمیل کے ذرائع قرار دے کر ان کی اصلاح پر زور دیا ہے جس طرح گاڑی چلانے کے لئے نہ جانور کو ذبح کرنے والا کامیاب ہو سکتا ہے۔ نہ اُسے آزاد چھوڑ دینے والا۔ بلکہ وہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ جو بیلوں اور گھوڑوں کو سدھا کر اس کے آگے جوتے۔ قرآن کریم بھی بشری تقاضوں کو سدھا کر ہر فطرت کے انسان کے لئے آرام کا سامان پیدا کرتا ہے۔ وہ نرم مزاج انسان کو نرمی سے روکتا نہیں۔ نہ سخت مزاج کو سختی سے۔ بلکہ انہیں اپنے طبعی تقاضے کے صحیح موقع پر استعمال کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ نہ تو کھانے کو گناہ قرار دیتا ہے نہ پینے کو نہ شادی کو نہ مال و دولت کمانے کو نہ مکان بنانے کو بلکہ ہر امر میں اقتصاد اور مناسب حد کو قائم رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اسوجہ سے ہر فطرت کی اصلاح اس کے ذریعہ سے ہو جاتی ہے۔ اور کوئی شخص نہیں جو اس کے سایہ میں بیٹھ نہ سکے۔

قرآن کریم دائمی نجات دیتا ہے

چوتھی علامت شجرۂ طیّبۃ کی یہ بتائی گئی تھی۔

کہ وہ ہر آن اپنے پھل دیتا ہے۔ اس علامت کے ماتحت کلام الٰہی کی ایک تو یہ خصوصیت معلوم ہوتی ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ پھل دیتا ہے۔ یعنی اس میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں۔ جو اس کی اعلیٰ تعلیم کے مظہر ہوں۔ اس لئے تُؤْتِی الْاُکُلَ نہیں فرمایا بلکہ اُکُلَھَا فرمایا یعنی درخت کی طرف ضمیر پھیر کر اس کی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا۔ کہ وہ پھل اپنے اندر درخت والی خوبیاں رکھتے ہوں۔ جو خواص اس درخت میں ہوں۔ وہی ان پھلوں میں ہوں۔ وہ طیّب بھی ہوں۔ وہ مضبوط جڑھ پیدا کرنے کی طاقت بھی رکھتے ہوں اور آسمان میں پھیل جانے کی طاقت بھی یہ خاصیت بھی قرآن کریم میں پائی جاتی ہے بلکہ اس وقت صرف اس میں پائی جاتی ہے۔ یعنی اس پر عمل کرنے والے لوگ اس کے ذریعہ سے ایسے اعلیٰ مقامات تک پہنچتے ہیں۔ کہ گویا مجسم قرآن ہو جاتے ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْاٰنُ میں (مجمع البحار) یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اگر دیکھنا چاہو۔ تو قرآن کریم دیکھ لو۔ جو تعلیمات قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں اور جو اعلیٰ صفات اس میں بیان کی گئی ہیں۔ وہ سب کی سب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں موجود ہیں اور اسی کی طرف اشارہ ہے مَا اَنَا اِلَّا کَالْقُرْاٰنِ وَسَیَظْھَرُ عَلٰی یَدَیَّ مَا ظَھَرَ مِنَ الْفُرْقَانِ کے الہام میں۔ جو اس زمانہ کے قرآنی پھل حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعود علیہ السلام پر ہوا جس کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ میں قرآن کی طرح ہوں۔ اور جو کچھ اس سے ظاہر ہوا۔ مجھ سے بھی ظاہر ہوگا۔ یعنی تعلیم قرآنی میرے وجود میں دنیا کو نظر آئے گی۔ اس الہام میں گویا تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کا مصداق ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

دوسری خصوصیت تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍ کے ماتحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ دائمی نجات دے اور یہ مفہوم اس سے پیدا ہوتا ہے۔ کہ جس کے دل میں کلام الٰہی داخل ہو کر ایک درخت بنیگا۔ اگر وہ شخص دائمی زندگی نہ پائے گا۔ تو درخت ہمیشہ پھل کس طرح دیگا۔ گو یہ مفہوم آئندہ کے متعلق ہے۔ اور اس کا اس دنیا میں ثبوت دینا ناممکن ہے۔ لیکن کم سے کم یہ بات تو ظاہر ہے۔ کہ صرف الہامی کتب ہی دائمی نجات کا وعدہ دیتی ہیں۔ انسانی کتب دائمی نجات کا وعدہ نہیں دیتیں۔ اور نہیں دے سکتیں کیونکہ دائمی زندگی ابدی زندگی والی ہستی ہی دے سکتی ہے اور وہ

الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

گیا ہو (اور) جسے دکمیں بھی) قرار (حاصل) نہ ہو ۵۲۶ جو لوگ ایمان لاتے ہیں انہیں اللہ (تعالیٰ) اس قائم رہنے والی

بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ

(اور پاک) بات کے ذریعہ سے (اس) ورلی زندگی میں (بھی) ثبات بخشتا ہے - اور آخرت (کی زندگی) میں بھی بخشیگا)

صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے پس وہی کلام دائمی زندگی کا دعویٰ پیش کرسکتا ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے کا مدعی ہو - اور اس دعویٰ میں بھی قرآن کریم سب دوسری کتب سے بڑھا ہوا ہے ہمیشہ کی زندگی کا مضمون جس وضاحت سے اور جس طرح با دلائل قرآن کریم میں بیان ہوا ہے اس کا دسواں حصہ بھی دوسری کتب میں نہیں۔ اگر ہے تو کوئی شخص پیش کرکے دکھا دے۔

پانچویں خصوصیت:- اس آیت میں کلمہ طیبہ کی یہ بیان فرمائی ہے۔ کہ وہ بِاِذْنِ رَبِّهَا پھل دے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ اس کے نتائج طبیعی نہ ہوں بلکہ طبیعی نتائج سے بالا ہوں طبیعی نتائج صرف اس قدر ثابت کرسکتے ہیں کہ اس کتاب نے قوانین قدرت کا اچھا نقشہ پیش کیا ہے لیکن یہ ثابت نہیں کرتے کہ وہ کتاب کسی ایسی ہستی کی طرف سے ہے۔ جو طبعیات پر حاکم ہے یہ امر اس کتاب سے ثابت ہو سکتا ہے۔ جو علاوہ طبیعی نتائج کے فوق الطبیعی نتائج بھی پیدا کرے مثلاً ایک کتاب میں حکم ہے کہ فلاں شے کھاؤ فلاں نہ کھاؤ۔ اس کا طبیعی نتیجہ تو یہ ہوگا۔ کہ اگر کھانے والی شے مفید ہے۔ تو کھانے والے کو طاقت حاصل ہوگی۔ اور اگر مضر ہے - تو اس سے بچنے سے اس کی صحت اچھی رہے گی۔ انسانی کتاب کا اثر یہاں تک ختم ہو جائے گا۔ لیکن الٰہی کتاب اس سے اوپر تک ہمیں لے جائے گی۔ کیونکہ اس کے احکام پر عمل کرنے سے ہم ایک زائد فعل بھی کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اس عمل کو کرتے ہیں۔ اور اس طرح ہمارا طبیعی فعل مذہبی بھی ہو جاتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اگر کتاب آسمانی ہے۔ تو اس کے طبیعی نتائج کے علاوہ فوق الطبیعی نتائج بھی نکلیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی ایسی علامات ظاہر ہوں کہ جو طبیعی نتائج سے ممتاز اور علیحدہ ہوں - اس امر میں بھی قرآن کریم دوسری کتب سماویہ سے غایت اعلیٰ اور اکمل ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جس طرح فوق الطبیعی نشانات آپ کیلئے اور آپ کے اتباع کیلئے ظاہر ہوئے - وہ دوسری مثال نہیں رکھتے - اور آپ کے بعد بھی قرآن کریم پر سچے طور پر عمل کرنے والے لوگوں کے ساتھ نشانات الٰہیہ کا سلسلہ اس طرح وابستہ چلا آیا ہے کہ ہر عقلمند اس سے بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ کہ قرآن کریم کے ساتھ کسی ایسی ہستی کا تعلق ہے۔ جو طبیعی قوانین پر حاکم ہے۔ اور جس پر خوش ہوتی ہے - اس کے لئے غیر معمولی سامانوں سے نصرت کے سامان پیدا کر دیتی ہے۔ اس وقت بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانی سلسلہ احمدیہ جن کی برکت سے اس آیت کے اس قدر وسیع مطالب کھلے ہیں۔ اس باذن ربھا والے نتائج کی تازہ مثال ہیں۔ اور آپ کے بعد آپ کی جماعت سے بھی اللہ تعالیٰ کا یہی سلوک ہے اور اسی سلوک کے ماتحت باوجود شدید مخالفت کے روز بروز ترقی کر رہی ہے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ اس آیت میں جو مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ وہ وہمی نہیں بلکہ تم خود تجربہ کرکے دیکھ لو اپنی ذات میں ان امور کا مشاہدہ کر لوگے جو اس میں بیان ہوئے ہیں۔

۵۲۶ حل لغات: خَبِيْثَةٌ۔ خَبِيْثٌ کا مؤنث ہے۔ اور اَلْخَبِيْثُ کے معنے ہیں اَلنَّجَسُ پلید گندی چیز - اَلرَّدِيُّ - اَلْمُسْتَكْرَهُ۔ ایسی ردی چیز جس سے نفرت پیدا ہو۔ اور انسان اسے قبول نہ کرے کُلُّ حَرَامٍ ہر حرام شے کو خبیث کہتے ہیں۔

حاشیہ: باذن ربھا کے الفاظ کو قرآن کریم کے فوق الطبیعی نتائج کی طرف اشارہ

حاشیہ: حضرت مسیح موعود قرآن مجید کے باذن ربھا والے نتائج کی تازہ مثال ہیں

حاشیہ: خبیثہ

تاج العروس میں ہے۔ کہ خبیث ہر بُری چیز کے لئے بطور صفت
کے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کلامٌ خَبِیْثٌ یعنی بُرا کلام وغیرہ
وَالْحَرَامُ السُّحْتُ یُسَمّٰی خَبِیْثًا۔ ہر قسم کے حرام کو خبیث کہتے
ہیں۔ اَلْمَالُ الْحَرَامُ وَالدَّمُ وَمَا اَشْبَہَھُمَا مِمَّا حَرَّمَہُ اللّٰہُ
حرام مال اور خون اور جو اُن کے مشابہ ہو جس سے اللہ تعالیٰ نے
بچنے کا حکم دیا ہے۔ اس کو بھی خبیث کہتے ہیں۔ وَیُقَالُ فِی الشَّیْءِ
الْکَرِیْہِ الطَّعْمِ وَالرَّائِحَۃِ خَبِیْثٌ مِثْلُ الثُّوْمِ
وَالْبَصَلِ وَالْکُرَّاثِ وَلِذٰلِکَ قِیْلَ مَنْ اَکَلَ مِنْ ھٰذِہِ
الشَّجَرَۃِ الْخَبِیْثَۃِ فَلَا یَقْرَبَنَّ مَجْلِسَنَا۔ یعنی بدمزہ
بدبودار چیز کو خبیث کہا جاتا ہے۔ جیسے لہسن۔ پیاز۔ گندنا وغیرہ۔
اسی وجہ سے حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔
کہ جو خبیث پودوں یعنی لہسن پیاز وغیرہ سے کچھ کھائے
وہ ہماری مجلس کے قریب نہ آئے (اقرب) پس کلمۃ خبیثۃ
کے معنے ہوں گے۔ (۱) گندہ اور بُرا کلام جسے انسان سُن نہ
سکے (۲) ایسا کلام جسے سُن کر نفرت پیدا ہو (۳) ایسا کلام
جس سے اللہ تعالیٰ نے بچنے کا حکم دیا ہے۔ (۴) ایسا کلام
جس سے اعلیٰ نتیجہ نہ نکلے۔ (۵) ایسا کلام جس میں اچھی اور
بُری تعلیم ملی ہوئی ہو۔ وہ فرد کے لئے فائدہ بخش۔ مگر قوم کے
لئے مضر ہو۔

جھوٹے مذہب کی علامات

کلمۃ خبیثۃ کی صفات

اجتثت

اِجْتُثَّتْ کے معنے ہیں اِقْتُلِعَتْ۔ اس کو جڑھ سے
اکھیڑ دیا۔ اور مثل کلمۃٍ خبیثۃٍ کشجرۃٍ خبیثۃٍ
اِجْتُثَّتْ میں اجتثت کے یہی معنے مراد ہیں یعنے
اُسْتُؤْصِلَتْ جڑھ سے اکھاڑ گیا (اقرب) پس کلمۃ
خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ اجتثت کے معنے ہوں گے
کہ وہ بُرا کلام جو دیرپا نہیں۔ اور اعتراض پر اپنی جگہ پر قائم
نہیں رہ سکتا اور جلدی اس کا اثر باطل ہو جاتا ہے۔

قرار

قَرَارٌ۔ قَرَّ کا مصدر ہے۔ اور قَرَّ فِی الْمَکَانِ قَرَارًا
کے معنے ہیں ثَبَتَ وَسَکَنَ۔ کسی جگہ پر ٹھہرا۔ اور قرار
کے معنے ہوئے۔ کسی جگہ ٹھہرنا۔ نیز قرار کے معنے ہیں مَا قُرَّ
فِیْہِ۔ جس میں ٹھہرا جائے۔ اَلْمُسْتَقَرُّ جائے قرار (اقرب)

پس مَا لَھَا مِنْ قَرَارٍ کے معنے ہوں گے۔ اس کے لئے کوئی ثبوت
اور سکون نہیں۔ اس کے لئے کوئی ٹھہرنے کی جگہ نہیں مراد
یہ ہے کہ بُری تعلیم کسی ملک میں قائم نہیں رہ سکتی۔ اور اس کے
اصول بدلنے کی ہر وقت ضرورت ہوتی ہے۔

تفسیر:۔ شجرۃ طیبۃ کے مقابلہ میں جو باتیں
جھوٹے مذہب کے متعلق پیش کی گئی ہیں۔ یہ ہیں:۔
(۱) اس کی شکل کروہ ہو (۲) اعلیٰ اور فاسد تعلیموں کو ملا
کر پیش کرتا ہو (۳) اعلیٰ نتائج نہ نکلیں۔ یعنی اس پر چل کر کوئی
آدمی ایسے پیدا نہ ہوں۔ جو خدا تعالیٰ تک پہنچ سکیں۔ جیسے
بہائی مذہب ہے۔ کہ اسے ظاہر ہوتے قریباً نوّے سال ہو گئے
ہیں۔ (یعنی باب کے دعویٰ سے لے کر اس وقت تک) لیکن ایک
شخص بھی ایسا نہیں کہ جس نے کہا ہو کہ اس تعلیم پر چل کر مجھ سے
خدا تعالیٰ کلام کرتا ہے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو آئے
ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے مگر ان کے پیروؤں میں سے سینکڑوں
گنائے جا سکتے ہیں۔ جو خدا تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔

اجتثت کے لفظ سے کلمۃ خبیثۃ کی صفات بتائی
گئی ہیں۔
(۱) یہ کہ اس کلام میں سطحی مسائل پر بحث ہو روحانی امور
پر نہ ہو۔ بلکہ ایسی باتیں ہوں جن کو عام طور پر لوگ جانتے ہیں۔
(۲) اس کی تعلیم دیرپا نہ ہو۔ بہائی تعلیم کا یہی حال ہے کہ
بہاء اللہ نے لکھا۔ دو شادیاں تک جائز ہیں۔ عباس نے
اسے تبدیل کر دیا۔
(۳) اس کی تعلیم اعتراضات کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ذرہ سے
اعتراض سے اس کے پیروؤں کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے بہائی
تعلیم کا یہی حال ہے۔ وہ لوگ کبھی ایک مقام پر کھڑے نہیں رہ
سکتے۔ ہر اعتراض پر اپنی جگہ بدل لیتے ہیں۔
(۴) جلدی اس کے اثر کو باطل کر دیا جائے۔ دیرپا تعلیم
تو وہ ہے۔ کہ لمبے زمانہ تک اس کا اثر رہے اور جلدی باطل
ہونے والی وہ ہے کہ جلدی ہی قلوب اس سے پھرنے شروع
ہو جائیں۔ اس کی مثال کے طور پر اسلامی زمانہ کے اول حصہ میں

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۝ ع ۴ / ۱۶

اور ظالموں کو اللہ (تعالیٰ) ہلاک کرتا ہے - اور اللہ (تعالیٰ) جو چاہتا ہے کرتا ہے ۵۲۷

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا

(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں (کی حالت) کو (غور کی نظر سے) نہیں دیکھا جنہوں نے ناشکری سے اللہ (تعالیٰ) کی نعمت کو بدل ڈالا۔

مسیلمہ وغیرہ کی تعلیم کو پیش کیا جا سکتا ہے اور اس زمانہ میں بہائی مذہب کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ خود اس کے اتباع اسکی تعلیم پر عمل نہیں کرتے۔ آج تک کسی ایک گاؤں میں بھی کوئی ایسی جماعت نہیں پائی جاتی۔ جو بہائی تعلیم پر عمل کرتی ہو۔

(۵) تازہ امداد اس کو نہ ملتی ہو۔ یعنی وحی الٰہی کا سلسلہ اس میں جاری نہ ہو۔

(۶) اس کے فروع بلند نہ ہوں۔ یعنی اعلیٰ درجے کے اخلاق پر حاوی نہ ہو اور ہر قسم کی ضرورت ہائے انسانی پر اس میں بحث نہ ہو

"مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ" (۱) وہ کسی ملک میں قائم نہ رہ سکے۔ یعنی اس کو ایسا موقعہ ہی نہیں دیا جاتا۔ کہ اس کا تجربہ کر کے دنیا کوئی نتیجہ نکالے۔ بغیر تجربہ ہی وہ مر جاتی ہے۔

(۲) اس کے اصول کو بدلنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ اسلام نے شروع سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہا۔ اور بعد میں کوئی تبدیلی اس میں نہ ہوئی۔ لیکن جو جھوٹا مذہب ہوگا۔ اس میں اصول کو ہمیشہ بدلنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر بہائیوں کو دیکھ لو۔ ایران میں جاؤ۔ تو وہاں بہائیت کی تعلیم اور رنگ میں پیش کی جاتی ہے۔ کیونکہ وہاں شیعہ ہیں۔ سُنّی ممالک میں اسی مذہب کی تعلیم اور رنگ میں پیش کی جاتی ہے۔ امریکہ میں جا کر اصول بالکل مختلف کر دئے گئے ہیں۔ اسی طرح انگلستان میں وہ باتیں پیش کی جاتی ہیں۔ جن کو وہاں کے لوگ قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔ چنانچہ جب میں انگلستان گیا۔ تو بہائیوں میں سے ایک عورت نے میرے ساتھ گفتگو کی۔ میں نے کہا بہاء اللہ نے کون سی نئی بات پیش کی ہے۔ اس نے کہا کہ بہاء اللہ نے کہا ہے۔ کہ ایک ہی عورت سے شادی کرنی چاہیئے۔ میں نے کہا کہ اُس نے خود دو بیویاں کی ہوئی تھیں پہلے اس نے انکار کیا۔ پھر کہا کہ وہ دعوی سے پہلے کی بات ہے۔ میں نے کہا جب وہ نعوذ باللہ خدا تھا۔ تو پھر پہلے اور پیچھے کا تو سوال ہی نہیں۔ عالم الغیب ہستی کے لئے پہلے پیچھے کوئی معنے نہیں رکھتا۔ اس کو پہلے ہی علم ہونا چاہیئے تھا۔ کہ میں آگے چل کر کیا تعلیم دینے والا ہوں۔ نیز اس نے دعوی کے بعد اپنے بیٹے عباس کو دو بیویاں کرنے کی اجازت دی۔ کیونکہ اس کے ہاں اولاد نہ تھی۔ اس پر اس عورت کے کان میں ایک ایرانی بہائی عورت نے جو ایران کی تھی چپکے سے کہا۔ کہ دوسری بیوی کو بہاء اللہ نے بہن بنا لیا تھا۔ اور یہی بات اس انگریز عورت نے دوہرا دی۔ اس پر میں نے کہا کہ بہاء اللہ کے دعوی کے بعد دونوں عورتوں سے اولاد ہوئی ہے۔ کیا بہن کے ہاں اولاد پیدا کی گئی تھی۔ اس پر وہ حیران ہو کر اپنی دوست سے پوچھنے لگی۔ کہ کیا دعوی کے بعد دوسری عورت کے ہاں اولاد ہوتی رہی ہے؟ اور جب اس نے کہا کہ ہاں۔ تو مجلس میں سب ہنس پڑے۔ کہ ابھی تو بہن قرار دیا تھا۔ اور ابھی اُس کے ہاں اسی زمانہ میں اولاد کا ہونا بھی تسلیم کر لیا۔ غرض بہائی لوگ ہر ملک میں جا کر علیحدہ قانون بناتے ہیں۔ یہی حال عیسائیت کا ہے چنانچہ انکی مشنری کتب میں کھلے طور پر بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔ کہ ہر قوم کے آگے کس رنگ میں مسیح علیہ السلام کو پیش کرنا چاہیئے شروع مسیحیت میں بھی روم والوں نے جب مطالبہ کیا کہ سبت ہفتہ کی جگہ اتوار کو ہو۔ تو مسیحیوں نے انکی خاطر ہفتہ کی بجائے سبت اتوار کو قرار دیدیا۔ اس کے بالمقابل اسلام کو دیکھو۔ شروع سے لیکر اس وقت تک سب تعلیم ایک جگہ پر قائم ہے۔ نہ کم کرنے کی ضرورت ہوئی نہ زیادہ کرنے کی:

(حاشیہ: ۲ — مالها من قرار کی ایک مثال)

(حاشیہ: ۱ — مالها من قرار کے دو معنے)

۵۲۷ حل لغات: يُثَبِّتُ: ثَبَّتَ کا

(حاشیہ: ۲ — يُثَبِّتُ)

وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ○ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا

(اور آپ بھی ہلاک ہوئے تھے اور اپنی قوم کو (بھی) ہلاکت کے گھر میں (لا) اُتارا ۲۸ یعنی جہنم میں وہ اس میں داخل ہونگے

وَبِئْسَ الْقَرَارُ○ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا

اور وہ جگہ (رہنے کے لحاظ سے) بہت بری ہے۔ ۲۹ اور انہوں نے اللہ (تعالیٰ) کے ہم رتبہ اور مخالف (شریک) بنالئے ہیں۔ تا (لوگوں کو) اسکی راہ

عَنْ سَبِيْلِهٖ ۗ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ○

سے برگشتہ کریں۔ تو (انہیں) کہہ دکہ (اچھا یہ) عارضی فائدہ اٹھالو (پھر اس وقت کو یاد کروگے) کیونکہ (ایک دن) تمہیں یقیناً دوزخ کی آگ کیطرف جانا ہوگا ۳۰

مضارع ہے جس کا مجرد ثَبَتَ ہے۔ اور ثَبَتَ الامرُ عِنْدَ فُلانٍ کے معنے ہیں۔ تَحَقَّقَ وَ تَاَكَّدَ۔ کوئی امر کسی کے نزدیک یقینی طور پر ثابت ہوگیا۔ ثَبَتَ فُلانٌ عَلَى الامرِ۔ دَاوَمَهٗ۔ کسی کام پر دوام اختیار کیا۔ وَ اَثْبَتَهٗ وَ ثَبَّتَهٗ۔ جَعَلَهٗ ثَابِتًا فِی مَکَانِہٖ لَا یُفَارِقُهٗ۔ اور اَثْبَتَهٗ اور ثَبَّتَهٗ کے معنے ہیں اس کو اس کی جگہ پر ایسے طور پر ثبات بخشا اور مضبوط رکھا۔ کہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ سو ثَابِتٌ کے معنے ہوں گے اپنی جگہ پر مضبوط رہنے والا (اقرب) پس يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ کے معنے ہوں گے۔ کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ قائم رہنے والی اور مضبوط بات کے ذریعہ سے ثبات اور اپنی جگہ پر مضبوط رہنے کی طاقت بخشتا ہے۔ یُضِلُّ: اَضَلَّ سے مضارع ہے اور اَضَلَّ کے معنے ہیں اَھْلَکَهٗ اسے ہلاک کیا (اقرب)

ثبت

بوار

یضل

تفسیر:۔ وہ قول جو ثابت ہے وہ وہی ہے۔ جو کلمہ طیبہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اس کی تائید کے لئے اللہ تعالیٰ الہام نازل کرتا ہے۔ اس کو ثابت اس لئے کہا۔ کہ آج ان کو اور کل ان کے بھائیوں کو حاصل ہوگا اور کبھی یہ سلسلہ نہ ٹوٹے گا۔ اور پھر اس وجہ سے بھی ثابت کہا۔ کہ اس کا اثر یہاں پر بھی اور آخرت میں بھی ہوگا۔ لیکن اس کے خلاف جھوٹے مدعیوں کا کلام مرنے کے بعد کوئی فائدہ نہیں دیتا۔

القرار

انداد

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ

ظالم وہ ہیں جو کلام الٰہی میں عِوَج چاہتے اور اس کے راستہ میں روکیں ڈالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرے گا سے یہ مراد ہے۔ کہ قرآن کریم کی اشاعت اور اس کے دنیا میں قائم ہو جانے کے متعلق اور اس کے مخالفوں کی تباہی کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے۔ اُسے اللہ تعالیٰ پورا کرکے دکھا دے گا۔

۲۸ حل لغات:۔ بَوَار:۔ بَارَ يَبُوْرُ کا مصدر ہے۔ اور بَارَ کے معنے ہیں هَلَكَ۔ ہلاک ہوگیا۔ بَارَ السُّوْقُ وَالسِّلْعَةُ۔ كَسَدَتْ۔ سامان یا بازار کا بھاؤ گر گیا۔ بَارَ الْعَمَلُ۔ بَطَلَ۔ کام باطل ہوگیا بَارَ الارضُ بَوْرًا لَمْ تُزْرَعْ زمین میں کسی قسم کی کھیتی نہ بوئی گئی۔ بَارَ زَيْدٌ عَمْرًا جَرَّبَهٗ وَ اخْتَبَرَهٗ۔ زید نے عمر کا امتحان لیا۔ وَمِنْهُ كُنَّا نَبُوْرُ اَوْلَادَنَا بِحُبِّ عَلِيٍّ۔ اور انہی معنوں میں یہ قول ہے جس کے معنے ہیں۔ ہم اولاد کا امتحان لیا کرتے تھے کہ وہ حضرت علی سے کتنی محبت رکھتے تھے۔ اَلْبَوَارُ۔ اَلْهَلَاكُ۔ ہلاکت۔ اَلْكَسَادُ۔ کسی چیز کی مانگ نہ ہونا (اقرب) پس دَارَ الْبَوَارِ کے معنی ہوئے۔ ہلاکت کا گھر

تفسیر:۔ خدا کی نعمت کو کفر سے بدلنے کا یہ مطلب ہے کہ خدا نے تو ان پر انعام کیا تھا۔ انہوں نے یہ بدلہ دیا۔ کہ احسان فراموشی سے کام لے کر اس احسان کا یعنی کلمہ طیبہ کا انکار کرکے قوم کو ہلاک کر دیا۔

۲۹ حل لغات:۔ القرار کیلئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۲۶

تفسیر:۔ یعنی کلمہ طیبہ کا انکار لازماً تباہی میں ڈالتا ہے اور وہ تباہی بھی جلا دینے والی تباہی ہوتی ہے۔

۳۰ حل لغات:۔ اَنْدَاد۔ نِدٌّ کی جمع ہے۔ اور

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ

(اے رسول) میرے ان بندوں سے جو ایمان لا چکے ہیں کہہ کہ وہ (اُن سے) اس دن کے آنے سے

يُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ

پہلے جس میں نہ کوئی بیع (وشراء) ہوگی۔ اور نہ (ہی) کوئی گہری دوستی - نماز کو عمدگی سے ادا کیا کریں اور جو کچھ ہم نے

اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ۝ اَللّٰهُ الَّذِيْ

انہیں دیا ہے اس میں سے پوشیدگی میں (بھی) اور ظاہر میں (بھی ہماری راہ میں) خرچ کیا کریں ۱۳۵ اللہ (تعالیٰ) وہ (ہستی)

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ

ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور بادلوں سے پانی اتار کر اس کے ذریعہ سے تمہارے

مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ

لئے پھلوں (کی قسم) سے رزق پیدا کیا ہے - اور

سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ

اس نے کشتیوں کو بلا اجرت تمہاری خدمت پر لگا یا (ہوا) ہے تا کہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلیں - اور

نِدٌّ کے معنے ہیں اَلْمِثْلُ - مثل - ہم رتبہ - وَلَا يَكُوْنُ اِلَّا مخالفًا - لفظ نِدّ کا استعمال صرف اس نظیر کے لئے ہوتا ہے - جو مخالف ہو - - اور مَالَہٗ نِدٌّ کے معنے ہوں گے مَالَہٗ نظیرٌ کہ اس کا کوئی مثل ہم رتبہ نہیں (اقرب)

تفسیر:- انہوں نے خدا تعالیٰ کے مخالف شریک بناتے ہیں سے یہ مراد نہیں - کہ وہ واقعہ میں خدا کے مخالف ہیں یا یہ کہ مشرک انہیں خدا تعالیٰ کے مخالف قرار دیتے ہیں - بلکہ اس کا مطلب یہ ہے - کہ ان بتوں کا وجود ہی خدا کی شان کے مخالف ہے - اگر ان کو مانا جائے - تو پھر خدا خدا نہیں رہتا - مطلب یہ کہ کلمہ طیبہ کو چھوڑ کر کن لغو باتوں کے پیچھے پڑے ہوتے ہیں -

۱۳۵ حل لغات

خِلَالٌ:- خُلَّۃٌ کی جمع خِلَالٌ ہے - اور خُلَّۃٌ خَالَّ سے ہے - خَالَّہٗ مُخَالَّۃً وَ خِلَالًا وخَلَالًا کے معنے ہیں صَادَقَہٗ وَآخَاہُ - اس سے دوستی کی - اور اس کا بھائی بنا - اَلْخُلَّۃُ اَلْمَحَبَّۃُ وَالصَّدَاقَۃُ لَا خَلَلَ فِيْهَا - ایسی محبت اور دوستی جس میں کوئی خلل نہ ہو (اقرب)

تفسیر:- اگر مومن شجرہ طیبہ یا الہامی کلام کے فوائد کو جلد لانا چاہتے ہیں - تو انہیں کہہ دو - کہ وہ نمازوں کو ہمیشہ اور باشرائط ادا کیا کریں - اور اپنے مالوں کو چھپ چھپ کر اور ظاہرا بھی خرچ کیا کریں - اس حکم سے میرے نزدیک یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جو شخص ایک نماز بھی جان بوجھ کر چھوڑتا ہے - وہ نمازی نہیں کہلا سکتا ؀

ایک نماز جان بوجھ کر چھوڑنے والا نمازی نہیں کہلا سکتا -

سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ

دریاؤں (اور نہروں) کو (بھی) اس نے بلا اجرت تمہاری خدمت پر لگا رکھا ہے - اور اس نے سورج اور چاند کو (بھی) بلا اجرت تمہاری خدمت

الْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝

پر لگا رکھا ہے درآنحالیکہ وہ بلا وقفہ (اپنا مفوضہ) کام کرتے ہیں اور اس نے رات اور دن کو (بھی) بلا اجرت تمہاری خدمت پر لگا رکھا ہے ۳۲

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۚ وَاِنْ تَعُدُّوْا

اور جو کچھ (بھی) تم نے اس سے مانگا اس نے تمہیں دیا ہے - اور اگر تم اللہ (تعالیٰ) کے

نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ

احسان گننے لگو تو اُن کا شمار نہیں کر سکو گے - انسان یقیناً بڑا ظالم (اور)

۳۲ حل لغات - دَآئِبَيْنِ :- دَأَبَ يَدْأَبُ دَأْبًا فِي عَمَلِهٖ - جَدَّ وَتَعِبَ وَاسْتَمَرَّ - کام میں محنت کی - اور لگاتار کام کیا (اقرب) دائبٌ کے معنے ہیں - محنت سے اور لگاتار کام کرنے والا - اور دَآئِبَيْنِ اس کا تثنیہ کا صیغہ ہے پس دائبین کے معنے ہوں گے - کہ وہ دونوں بلا وقفہ اور متواتر کام کرنے والے ہیں -

دَآئِبَيْنِ

تفسیر :- ان دو آیات میں نعمتوں کا ذکر کرکے اور اپنے احسانات یاد کرا کے اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ ہم نے یہ تمام چیزیں تمہاری خاطر پیدا کی ہیں - اگر تم بجائے ان سے کام لینے کے بیوقوفی سے انہیں پوجنے لگو گے تو نعمت کی ناقدری کی وجہ سے وہ نعمتیں تم سے چھین لی جائیں گی - دوسرے یہ بتایا ہے کہ جب یہ نعمتیں ہماری ہیں تو جو ہمارے کلمہ سے تعلق رکھتے ہیں ہم انہی کو ان سے متمتع کریں گے چنانچہ دیکھ لو کس طرح یہ سب چیزیں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں لگ گئیں - دن بھی ان کے ہو گئے اور راتیں بھی - سمندر بھی ان کے اور جہاز بھی ان کے - ان دونوں آیتوں سے پہلے لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا فرمایا تھا - ان امور کا تعلق ان دونوں آیتوں سے یہ ہے - کہ اقامت صلوٰۃ شرک کے مخالف ہے - گویا پہلے سے ہوشیار کر دیا - کہ نعمتیں ملنے والی ہیں ایسا نہ ہو - کہ شرک کرنے لگو - پھر وَيُنْفِقُوْا کا حکم دے کر اس امر سے ہوشیار کیا - کہ جس طرح بعض نعمتوں کو انسان خدا بنا لیتا ہے اور بعض کو ذاتی ملکیت سمجھ لیتا ہے - تم یاد رکھنا کہ خدا تعالیٰ نے ان سب کو تم سب کیلئے مسخر کیا ہے اس لئے نہ تو ان کو خدا بنانا اور نہ دوسرے بندوں کو محروم کرکے ان پر اپنا واحد قبضہ جمانا - بلکہ خدا تعالیٰ کی سب مخلوق کو ان میں شریک کرنا - اور سب کو حصہ دینا - کیونکہ خدا تعالیٰ نے وہ نعمتیں سب انسانوں کے لئے پیدا کی ہیں - نہ کہ کسی خاص گروہ کے لئے - سب بندوں کا اس میں حصہ ہے - پس تم ان کو دوسروں میں بانٹتے رہنا ؎

دونوں آیات میں نعمتوں کا ذکر کرکے مومنوں کو ایک نصیحت

كَفَّارٌ ۝ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا ۵ ع ۱۷

بڑا ناشکر گزار ہے ۵۳۳ اور (اے مخاطب اس وقت کو یاد کر) جب ابراہیم نے (دعا کرتے ہوئے) کہا تھا (کہ) اے میرے رب اس جگہ کو

۵۳۳ تفسیر:- مِنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ۔ اگر اس کو ماضی کے معنوں میں مانا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ جس بات کا انسانی فطرت تقاضا کرتی تھی۔ وہ سب کا سب خدا تعالےٰ نے مہیا کر دیا۔ زبانی سوال مراد نہیں۔ کیونکہ زبانی سوال تو کبھی رد بھی کر دئے جاتے ہیں۔ مگر تقاضائے فطرت کبھی رد نہیں کیا جاتا۔ انسان میں اگر تاثر کی طاقت رکھی ہے۔ تو ساتھ ہی تاثیر کرنے والی چیزیں بھی پیدا کر دیں۔ اور اگر اس میں تاثیر کا مادہ رکھا ہے تو اس کے اثر کو قبول کرنے والی چیزیں بھی بنا دی ہیں۔ آنکھ دیکھنے کے لئے بنائی ہے تو اس کے لئے روشنی کے سامان اور خوبصورت نظارے بھی پیدا کئے۔ کان سننے کے لئے بنائے تو اس کے لئے ہوا اور خوش الحان اور سریلی آوازیں بھی پیدا کیں۔ مرد میں تولید کا مادہ پیدا کیا۔ تو اس کے قبول کرنے کے لئے عورت بھی پیدا کر دی۔ غرض ہر تقاضائے فطرت کا جواب پیدا کیا ہے اور یہی اس آیت کے معنے ہیں۔

(۲) ماضی بمعنی مضارع بھی ہو سکتی ہے۔ جب یہ یقین دلانا ہو کہ جس امر کا وعدہ ہے۔ اُسے تم پورا ہوا ہی سمجھو۔ تو مضارع کی جگہ ماضی کا صیغہ بھی لے آتے ہیں۔ اس صورت میں آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ اے مومنو تم نے جو خدا سے خواہش کی ہے۔ کہ وہ ایسے علاقے تم کو دے۔ جن میں قرآن کریم کی تعلیم استوار ہو اور جڑھ پکڑے۔ وہ قبول ہو گئی۔ اور سُن لو۔ کہ آسمان و زمین کی کل چیزیں تمہارے سپرد کی جائیں گی۔ اور دنیا میں تمہارے لئے سہولتیں اور آسائشیں بہم پہنچائی جائیں گی۔

مومن بحیثیت جماعت خدا تعالےٰ سے یہی مانگا کرتا ہے۔ کہ دین کی اشاعت ہو۔ اور دین کی ترقی کے رستے میں کوئی روک نہ رہے۔ اور یہ سورۃ بھی مکی ہے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے راستہ میں سخت مشکلات تھیں۔ مومن دعائیں کرتے تھے۔ کہ کوئی ایسا علاقہ ہو۔ جہاں ہم آزادی سے اسلام کی تعلیم کو رائج کر سکیں۔ تو ان کے جواب میں فرمایا۔ کہ بے شک ایسے علاقے مسخر کر دئے جائیں گے۔ جن میں تم آسانی کے ساتھ اسلامی تعلیم کو قائم کر سکو گے۔

(من كل ما سألتموه کا مطلب)

(جس بات کا انسانی فطرت تقاضا کرتی تھی وہ سب خدا تعالیٰ نے مہیا کر دیا۔)

اب پھر اسلام پر ایسا زمانہ آگیا ہے۔ کہ اس کی تعلیم پر کلی طور پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اور بعض علاقوں میں تو اس کے لئے سب راہیں مسدود ہیں۔ جیسے روس کا علاقہ ہے۔ تبلیغی لحاظ سے بھی میں سمجھتا ہوں۔ سچائی کی تبلیغ اس وقت کہیں بھی نہیں ہو سکتی۔ علماء امراء۔ آقاؤں بادشاہوں اور غلاموں وغیرہ نے اپنی ضرورتوں کے مطابق دین کو بدل دیا ہے۔ ان حواشی کو علیحدہ کر کے سچے اسلام کی تبلیغ کسی ملک میں بھی نہیں ہو سکتی۔ پس ہر مخلص مومن کو چاہیئے کہ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ پر عمل کرے۔ اور خدا سے دعا کرے تا وہ تبلیغ اسلام کے لئے آسانیاں میسر فرمائے اور اسلام کے قیام کے سامان پیدا کرے۔ اور یہ دعائیں انہی لوگوں کی قبول ہوں گی جو اقامۃ صلوٰۃ کرنے والے ہوں گے۔ جو لوگ نمازیں باقاعدہ اور بلا سخت معذوری باجماعت ادا نہیں کرتے۔ ان کی دعا کم سُنی جاتی ہے۔

(من كل ما سألتموه میں ماضی بمعنے مضارع)

اسی طرح یہ دعا انہی کی سنی جائے گی۔ جو اخلاص سے اسلام کے لئے مالی قربانیاں کرنے والے ہوں گے۔

جماعت احمدیہ بے شک چندے دیتی ہے۔ لیکن صحابہؓ والا انفاق اور تھا۔ وہ تو کوشش کر کے اپنے اوپر غربت لاتے تھے۔ جب تک اسی طرح انفاق نہ ہو ترقی ممکن نہیں ہوا کرتی۔ اسی وجہ سے پہلی آیت میں جہاں خرچ کا حکم دیا ہے۔ وہاں سِرًّا کو پہلے رکھا ہے۔ یہ بتانے کے لئے کہ اصل انفاق وہ ہے۔ جو طبعی ہو۔ اور اس میں کسی شہرت وغیرہ کا خیال نہ ہو

(جماعت احمدیہ کو ایک نصیحت)

الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ؕ

امن والی جگہ بنا - اور مجھے اور میرے بیٹوں کو اس بات سے دور رکھ کہ ہم معبودان باطلہ کی پرستش کریں - ۳۴ ۵

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ

اے میرے رب انہوں نے یقیناً بہت سے لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے - پس جس نے

جو انفاق طبعی ہوگا - ظاہر ہے کہ اس کے لئے طبیعت کو ابھارنا نہیں پڑے گا بلکہ اس کے ظہور کو بعض دفعہ روکنے کی ضرورت محسوس ہوگی - پس وہی انفاق اس آیت کے ماتحت ہے جو طبعی ہو نہ یہ کہ نفس پر خرچ کرنا تو طبعی ہو اور خدا کے راستہ میں خرچ کرنے کے لئے دوسرے کے کہنے کی ضرورت ہو۔

جب احمدیہ جماعت میں یہ مادہ پیدا ہو جائے گا اور انہیں اپنے آپ پر خرچ کرنے کے لئے تو نفس پر بوجھ ڈالنا پڑے گا اور دین کی راہ میں خرچ کرنا طبعی تقاضا نظر آئیگا تب ان کے لئے ترقیات کے رستے کھلیں گے۔

اصنام

لِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا - یہ مراد نہیں - کہ ان احسانات کی ظاہری گنتی نہیں کر سکتے - یہ تو ایک موٹی بات ہے - انسان اگر اپنے جسم کی نعمتوں کو ہی شمار کرنا چاہے تو وہ بھی بے حد و بے قیاس ہیں - پس اس سے مراد آئندہ کے افضال ہیں یعنی اللہ تعالےٰ کی بے شمار نعمتیں تم پر ہوں گی - مختلف قسم کے احسان تم سے وہ کرے گا - اور اتنے فضل تم پر نازل ہوں گے - کہ تم احاطہ بھی نہ کر سکو گے۔

لن تعدوا نعمة اللہ سے مراد آئندہ کے افضال ہیں

لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ کہہ کر یہ اشارہ کیا ہے - کہ اگر ان نعمتوں کے باوجود لوگ اسلام سے غفلت برتیں گے - تو وہ ظلوم بھی ہوں گے اور کفار بھی - ظلوم اس طرح کہ ایک نئی اور پاک دنیا جو اسلام کے ذریعہ اللہ تعالےٰ قائم کرے گا - وہ اس کے تباہ کرنے والے ہوں گے - اور کفار اس لئے کہ ان گنت احسانات کے بعد وہ اللہ تعالےٰ سے ناشکری کا معاملہ کرنے والے ہوں گے۔

ظلوم کفار سے مراد -

۳۴ ۵ حل لغات - وَاجْنُبْنِي - جَنَبَهٗ جَنْبًا دفعہ - اسکو دور کیا - جَنَبَ زَيْدًا الشَّيْئَ: نَحَّاهُ عَنْهُ - اس نے زید کو کسی چیز سے ایک طرف رکھا - وَمِنْهُ فِي الْقُرْآنِ وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ - اى نَحِّنِيْ وَاِيَّاهُمْ کہ مجھے اور میری اولاد کو شرک سے ایک طرف رکھیو (اقرب) یعنی اے خدا جب تو نے ہمیں طہارت بخشی ہے - تو مجھے اور میری اولاد کو ہمیشہ اس پر قائم رکھیو۔

واجنبنی

اَلْاَصْنَام - اَصْنَام صَنَمٌ کی جمع ہے - اس کے معنے ہیں - اَلْوَثَنُ - بت - وَهُوَ صُوْرَةُ تِمْثَالِ اِنْسَانٍ اَوْ حَيَوَانٍ يُتَّخَذُ لِلْعِبَادَةِ - یہ انسان یا حیوان کے اس مجسمہ پر بولا جاتا ہے - جو عبادت کی خاطر بنایا جاتا ہے - كُلُّ مَا عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ - ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا عبادت کی جائے یہ مُعَرَّب ہے - (یعنی لغت والے کے نزدیک یہ لفظ عربی زبان کا نہیں بلکہ دوسری زبان سے مانگا ہوا ہے) لیکن عربی زبان میں صنم کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں - صَنِمَتِ الرَّائِحَةُ - خَبُثَتْ - ہوا بدبودار ہو گئی - اَلْعَبْدُ قَوِيَ - طاقتور ہو گیا - صَنَمَ الرَّجُلُ - صَوَّتَ - آدمی نے آواز نکالی - الصَّنَمَةُ - قَصَبَةُ الرِّيْشِ کٹھا - پور - سرکنڈا - اَلدَّاهِيَةُ - مصیبت (اقرب)

تفسیر :- یہ بتا چکنے کے بعد کہ پہلے انبیاء بھی بے سامان تھے - لیکن اللہ تعالےٰ نے ان کی مدد کی - اور وہ غیر مرئی اسباب سے کامیاب ہوئے - اسی طرح اب محمد رسول اللہ صلعم غیر مرئی اسباب سے جن میں سے ایک مثال کلمہ طیبہ کی تمثیل سے مستنبط دلائل ہیں، کامیاب ہوں گے - اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے - کہ اس رسول کی کامیابی کی بنیاد تو ہزاروں سال پہلے

تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ

میری پیروی (اختیار) کی وہ (تو) مجھ سے (تعلق رکھتا) ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو (اس کے متعلق بھی میری یہی عرض ہے کہ) تو یقیناً بڑا ہی بخشنے والا (اور)

سے رکھی گئی ہے۔ خصوصاً ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ سے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ کہ مکہ والوں کو الہامی کتاب کی نعمت سے متمتع کرنا ضروری تھا۔ اور انہیں شرک کی ظلمت میں پڑا رہنے نہیں دیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ اس بارہ میں حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے وعدہ کر چکا ہے۔ اور وہ وعدہ خلاف نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم کو دعا کرتے وقت علم تھا کہ مکہ میں شرک پھیلے گا۔

اس دعا سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ اس امر کا علم رکھتے تھے۔ کہ مکہ کے علاقہ میں شرک پھیلنے والا ہے تبھی تو انہوں نے دعا کی۔ کہ خدایا مجھے اور میری اولاد کو شرک سے ایک طرف رکھیو۔ ورنہ جس وقت دعا کی گئی تھی۔ مکہ میں شرک کا نام و نشان نہ تھا۔ صرف حضرت اسمٰعیلؑ کا گھر آباد تھا۔ یا وہ لوگ بستے تھے۔ جو ان کے تابع تھے۔

موازنۂ مذاہب والوں کے خیال کا رد

اس دعا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ توحید اور شرک کے دور دنیا پر آتے رہتے ہیں۔ اور موحد قومیں مشرک ہو جاتی ہیں۔ اور مشرک موحد ہو جاتی ہیں۔ اور توحید کے اعلیٰ مقام پر پہنچی ہوئی قوم کی نسبت بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اب وہ شرک کے اثر سے محفوظ ہو گئی ہے۔ اس تعلیم سے اس خیال کا رد ہوتا ہے۔ جو موازنۂ مذاہب والے لوگ پیش کرتے ہیں۔ یعنی توحید شرک سے ترقی کرتے کرتے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ توحید کے بعد شرک اور شرک کے بعد توحید کے دور آتے رہتے ہیں۔ اور ہمیشہ توحید کا دور شرک کے دور سے پہلے ہوتا ہے اس اصل کے ماتحت توحید کو الہامی اور شرک کو تنزل کا ایک مقام تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ برخلاف موازنۂ مذاہب والوں کے اصول کے۔ کہ ان کے نزدیک اللہ تعالےٰ کا خیال خوف اور حیرت سے پیدا ہوا۔ اور شرک سے ترقی کرتے ہوئے توحید کے نقطہ تک پہنچا۔ بظاہر یہ اختلاف معمولی معلوم ہوتا ہے

آنحضرتؐ کی کامیابی کی بنیاد ہزاروں سال پہلے سے رکھی گئی۔

مگر اسی اختلاف کے نتیجہ میں مذہب نے کہا۔ کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور موازنۂ مذاہب والوں نے کہا۔ کہ انسان نے خدا کو پیدا کیا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کا خیال انسانی دماغ کی ایجاد ہے۔ اور اس کی تکمیل انسانی فلسفہ کی تکمیل سے ہوئی ہے۔

اس آیت پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا ابراہیم شرک کر سکتے تھے؟ اگر نہیں تو انہوں نے یہ دعا کیوں کی۔ کہ خدایا! مجھے شرک سے بچا۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ انسانی طاقتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو خِلْقَةً اسے اللہ تعالےٰ نے دی ہیں۔ ان کے متعلق وہ دعا نہیں کرتا۔ مثلاً یہ نہیں کہتا۔ کہ خدایا میرا ایک ہی سر رہے، دو نہ ہو جائیں۔ دوسری وہ طاقتیں ہیں۔ جو انسان کو کسباً یا وہباً ملتی ہیں۔ یعنی وہ انہیں آپ ترقی کر کے حاصل کرتا ہے۔ یا خدا تعالےٰ کا خاص فضل دوسرے انسانوں سے ممتاز کر کے اسے عطا کرتا ہے۔ ایسی طاقتوں میں چونکہ تنزل کا امکان ہوتا ہے۔ ان کے لئے دعا جاری رکھی جاتی ہے خواہ اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہی کیوں نہ ہو۔ کہ وہ اس انعام سے اُسے متمتع رکھے گا۔ کیونکہ اس دعا میں درحقیقت اس امر کا اقرار ہوتا ہے۔ کہ یہ نعمت میری ذاتی نہیں۔ بلکہ خدا تعالےٰ سے بطور انعام حاصل ہوئی ہے۔ اسی اصل کے ماتحت انبیاء نبوت کے انعامات کے متعلق بھی دعائیں لگے رہتے ہیں جیسے حضرت ابراہیم کی یہ دعا ہے۔ یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔ یا استغفار اور توبہ کا انبیاء سے صدور ہے۔ ان نکتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگوں نے انبیاء کے استغفار اور توبہ سے دھوکا کھایا ہے۔ اور یہ سمجھ لیا ہے کہ گویا وہ گنہگار تھے۔ حالانکہ ان کے استغفار اور توبہ کے یہ معنے ہوتے ہیں۔ کہ جس مقامِ طہارت پر وہ ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک موہبت ہے۔ اور اس کے جاری رکھنے کے لئے وہ دعا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کا تسلسل اللہ تعالیٰ کے

انبیاء کا استغفار

رَّحِيْمٌ ۝ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ

بار بار رحم کرنے والا ہے ۝۳۵ اے میرے رب میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے معزز گھر کے پاس ایک وادی

غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا

جس میں کوئی کھیتی (بھی) نہیں (ہوتی لا) بسایا ہے - اے میرے رب (میں نے ایسا اس لئے کیا ہے)

لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ

تا وہ عمدگی سے نماز ادا کیا کریں - پس تو (نیک) لوگوں کے دل

تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ

ان کی طرف جھکا دے - اور انہیں (تازہ) پھلوں (کی قسم) سے (بھی) رزق دیتا رہ - تا کہ وہ

فضل سے ہی ہوتا ہے -

اسی بناء پر قرآن کریم میں بار بار وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ آتا ہے - یعنی باوجود کمال کے انسان کو اللہ تعالےٰ پر سہارا رکھنا چاہیئے - کیونکہ وہ کمال خدا تعالےٰ پر سہارے سے ہی حاصل ہوتا ہے - اور اس سہارے کا اقرار کرتے رہنا اپنے لئے اور دوسروں کیلئے ہدایت کا موجب ہوتا ہے -

باوجود کمال کے انسان کو اللہ تعالےٰ پر سہارا رکھنا چاہیئے -

۳۵ تفسیر :- محبتِ الٰہی کا کیسا پاک مظاہرہ ہے حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں - میری اولاد اگر شرک نہ کریگی تب تو وہ میری اولاد ہے - ورنہ نہیں - اس آیت سے یہ بھی مستنبط ہے کہ بہت سے گناہوں کا باعث اولاد کی محبت بھی ہوتی ہے - حضرت ابراہیمؑ نے ہمیں سبق دیا ہے - کہ اولاد کی محبت اس حد تک ہونی چاہیئے جس سے وہ بگڑ نہ جائے - ایسی محبت جو اولاد کو خراب کر دے محبت نہیں دشمنی ہے جسمانی آرام سے روحانی اور اخلاقی درستی کا خیال مقدم رہنا چاہیئے - اگر اولاد باوجود کوشش کے درست نہ ہو - تو ایک وقت ایسا آسکتا ہے - کہ اس سے قطع تعلق کرنا ضروری ہو - کیونکہ جب ان کو معلوم ہو - کہ ماں باپ ہماری غلطی سے چشم پوشی کرتے ہیں - تو وہ غلط راہ پر چلتے جاتے ہیں - لیکن جب ان کو معلوم ہو - کہ ہماری غلطی پر مناسب گرفت ہوتی ہے - تو ان کی اصلاح ہوتی جاتی ہے - اس لئے ہمیں چاہیئے - کہ اولاد کی محبت پر خدا کی محبت غالب رکھیں - کہ یہ خدا تعالےٰ کی ہی خوشنودی کا موجب نہیں - بلکہ اپنی اولاد کی حفاظت کا بھی ذریعہ ہے

حضرت ابراہیمؑ کی محبت الٰہی کا مظاہرہ

اولاد کی محبت اس حد تک ہونی چاہیئے جس سے وہ بگڑ نہ جائے

وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ پہلے عرض کیا تھا کہ میری اولاد میں سے اگر کوئی شرک میں پڑ جائے - تو وہ میری اولاد سے نہیں - مگر نبی میں رحم بھی ہوتا ہے - اولاد کو اولاد نہ سمجھنا اور خدا کی محبت کو ترجیح دینا اور چیز ہے - اور ان کے لئے خدا سے رحم کی درخواست کرنا اور چیز ہے - پس حضرت ابراہیمؑ دعا کرتے ہیں - کہ اول تو میری اولاد کو شرک سے بچائیے - لیکن اگر ان میں سے کوئی میرے طریق کے خلاف کرے - تو میں تو اُسے یہی کہوں گا - کہ وہ میری اولاد نہیں - مگر تو چونکہ غفور رحیم ہے - اس لئے تیرے غفور رحیم ہونے سے میں یہی امید کرتا ہوں - کہ تو ان کے گناہ بخشیو - اور ان کی ترقی کے سامان پیدا کرتا رہیو - اس میں یہ بتایا - کہ اولاد سے ناراضگی کا یہ مطلب نہیں - کہ اُن سے دل بھی سخت کرلے - بلکہ سزا ظاہری ہو - دل میں ان کے لئے دعا

يَشْكُرُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا

(ہمیشہ تیرا) شکر کرتے رہیں ۳۶؎ اے ہمارے رب جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ہم ظاہر کرتے ہیں۔ تو

نُعْلِنُ ۝ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ

یقیناً (سب) جانتا ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ) سے کوئی چیز نہ زمین میں چھپی رہ سکتی ہے۔

کرتا رہے۔ اور ان کی اصلاح مدنظر رکھے۔ نہ کہ انکی تباہی چاہے۔

۳۵؎ حل لغات:۔ اَلْوَادِی کے لئے دیکھیں سورۂ رعد ۱۸؎

اَفْئِدَةً:۔ فُؤَادٌ کی جمع ہے اور اَلْفُؤَادُ کے معنے ہیں۔ اَلْقَلْبُ لِتَوَقُّدِهٖ۔ دل اور قلب کو فواد اس کی احساس کی تیزی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ وَقِيْلَ لِتَحَرُّكِهٖ۔ اور بعض نے قلب کو فواد کہنے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ وہ حرکت کرتا ہے۔ کیونکہ فَادَ کے اصل معنی حرکت کرنے کے ہیں۔ وَقِيْلَ هُوَ بَاطِنُ الْقَلْبِ اور بعض کے نزدیک فواد دل کے اندرونی حصہ کا نام ہے۔ وَقِيْلَ غِشَاؤُهٗ۔ اور بعض کے نزدیک دل کے اوپر کے پردہ کا۔ وَقَالَ جَمَاعَةٌ مِنَ الْمُفَسِّرِيْنَ يُطْلَقُ الْفُؤَادُ عَلَى الْعَقْلِ اور مفسرین کی ایک جماعت کے نزدیک فواد کے معنے عقل کے ہیں (اقرب)

تَهْوِيْ:۔ هَوَى سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور هَوَتِ الْعُقَابُ کے معنے ہیں اِنْقَضَّتْ عَلٰى صَيْدٍ اَوْ غَيْرِهٖ۔ باز اپنے شکار پر لوٹ پڑا۔ هَوَتْ يَدِيْ لَهٗ امْتَدَّتْ وَارْتَفَعَتْ۔ هَوَتْ يَدِيْ لَهٗ کے معنے ہیں۔ کہ میرا ہاتھ لمبا ہوا۔ اور بڑھا۔ اَلزِّمَامُ هَوَتْ۔ ہوا چلی۔ اَلنَّاقَةُ بِرَاكِبِهَا اَسْرَعَتْ۔ اونٹنی اپنے سوار کو لے کر تیزی سے چلی۔ اَلشَّيْءُ هَوْيًا وَهُوِيًّا۔ سَقَطَ مِنْ عُلْوٍ اِلٰى اَسْفَلَ۔ کوئی چیز اوپر سے نیچے کو گری (اقرب) پس تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ کے معنے ہونگے (۱) کہ لوگوں کے دل ان کی طرف شوق سے بڑھیں (۲) ایسے مائل ہوں۔ جیسے کوئی چیز گر کر تیزی سے آتی ہے (۳) ان کے دل ہر وقت ان کی طرف مائل رہیں۔

اَلثَّمَرَاتُ:۔ اَلثَّمَرَةُ۔ حِمْلُ الشَّجَرِ۔ درخت کا پھل۔ اَلنَّسْلُ۔ نسل۔ اَلْوَلَدُ۔ لڑکا۔ اَلثَّمَرَةُ مِنَ اللِّسَانِ طَرَفُهٗ وَعَذَبَتُهٗ۔ زبان کی شیرینی۔ یعنی عمدہ کلام۔ ثَمَرَةُ الْقَلْبِ۔ اَلْمَوَدَّةُ۔ دوستی۔ خلوصُ الْعَهْدِ۔ خالص عہد۔ پس وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ کے معنے ہوں گے (۱) کہ ان کو ظاہری پھلوں سے رزق عطا کر (۲) ان کے خلوص دل سے کئے ہوئے اعمال ضائع نہ ہوں۔ بلکہ پھل دار ہوں۔ (اقرب)

تفسیر:۔ اس آیت میں حضرت ابراہیم اپنی نیت کو خدا کے سامنے پیش کر کے اس کے فضل کو طلب کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نیتوں کو دیکھنے والا ہے۔ وہ کبھی کسی اچھے عمل کو جو نیک نیتی سے کیا گیا ہو ضائع نہیں کرتا۔ پس وہ اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں۔ کہ تیری مقدس عبادت گاہ کی خدمت اور آبادی کے لئے میں نے اپنی اولاد کو یہاں چھوڑا ہے۔ اور اس نیت سے یہاں چھوڑا ہے۔ کہ وہ تیرے ذکر کو بلند کریں۔ اور یہ جانتے ہوئے چھوڑا ہے کہ اس جگہ دنیوی آرام کا کوئی سامان نہ موجود ہے نہ ہو سکتا ہے پس اب میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ ایک تو جس مقصد کیلئے میں نے ان کو یہاں رکھا ہے، وہ پورا ہو۔ لوگ ان کی طرف توجہ کریں۔ اور ان کی تبلیغ اور ان کے وعظ میں اثر ہو۔ اور یہ تیری عبادت قائم کرنے میں کامیاب ہوں۔ دوسرے ان کی جسمانی حالت کی درستی کا بھی خیال رکھ۔ اور باوجود اس کے کہ انہیں میں ایسے علاقہ میں چھوڑ رہا ہوں کہ گھاس کی پتی بھی وہاں نظر نہیں آتی۔ تو اعلیٰ سے اعلیٰ پھل بھی ان تک پہنچا۔ تاکہ انہیں معلوم ہو جائے۔ کہ جو خدا تعالیٰ کے لئے قربانی کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ اُسے دنیا میں بھی ضائع نہیں کرتا۔

الثمرات — الوادی — افئدة — حضرت ابراہیم کی اپنی نیت کو خدا کے سامنے پیش کر کے دعا — تهوی

حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا اثر

اس دعا کا اثر دیکھو کتنا وسیع ہوا ہے۔ آج سب دنیا مکہ والے کے نام پر قربان ہے اور دل آپ ہی آپ اس کی تعلیم کی طرف جھکے جا رہے ہیں۔ اور اب تو مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت سے اور بھی ترقی کے سامان پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ تو دینی حصہ کی دعا کا حال ہے۔ باقی رہا دنیوی حصہ سو وہ عجیب طرح پورا ہو رہا ہے۔ اس بے آب و گیاہ علاقہ میں ہر قسم کے اور عمدہ سے عمدہ پھل میسر ہیں۔ میں نے ایسے اچھے انگور اور انار مکہ میں کھائے ہیں۔ کہ نہ ہندوستان میں نہ شام میں نہ اٹلی اور فرانس میں ویسے نظر آئے۔ دنیا بھر کا پھل وہاں جاتا۔ اور ابراہیمی دعا کی قبولیت کا ثبوت دیتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا حضرت نبی کریمؐ کے وجود میں پوری ہوئی۔

افئدۃ من الناس میں مِنْ بعضیہ نہیں بلکہ زائدہ ہے۔

اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ کے متعلق بعض علماء نے کہا ہے کہ اس میں مِنْ بعضیہ ہے۔ یعنی کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف متوجہ ہوں۔ مگر یہ درست نہیں۔ دعا کرنے والا کبھی تھوڑی چیز نہیں مانگتا۔ پس یہاں مِنْ بعضیہ نہیں۔ بلکہ زائدہ ہے۔

حروف زائدہ معنوں میں زور پیدا کرنے کیلئے آتے ہیں۔

حروف زائدہ تاکید کے لئے آتے یعنی وہ معنوں میں زور پیدا کر دیتے ہیں۔ یعنی جو مفہوم بغیر حروف زائدہ کے پیدا ہوتا تھا۔ اس میں ان کے ذریعہ سے قوت اور طاقت پیدا کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ افئدۃ من الناس میں سے مِنْ کو اڑا دیا جائے۔ تو افئدۃ الناس رہ جائے گا۔ اور اس کے معنے "لوگوں کے دل" کے ہوں گے۔ چونکہ ال خصوصیت اور کمال کے لئے بھی آتا ہے اور یہی اس جگہ مراد ہے۔ پس اس جملہ کے معنے ہوئے "کامل اور خاص لوگوں کے دل"۔ مِنْ نے داخل ہو کر ان معنوں میں اور زور پیدا کر دیا۔ اور مراد یہ ہوئی۔ کہ مکہ والوں کی طرف جھکنے والے دل نہایت پاک اور نہایت کامل لوگوں کے دل ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ کی خواب کی تعبیر

یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ حروف زائدہ سے مراد لغو اور بے کار زائد حروف نہیں۔ بلکہ ان سے مراد معنوں میں زیادتی کرنے والے حروف ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان کے معنے تاکید کے ہوتے ہیں۔

وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔

ظاہری پھلوں کے علاوہ یہ مراد بھی ہو سکتی ہے۔ کہ ان کی عبادات اور ان کی قربانیاں ضائع نہ ہوں۔ بلکہ ان کے اعلیٰ نتائج نکلتے رہیں۔

میرے نزدیک یہ دعا آنحضرت صلعم کے لئے ہے۔ آپؐ سے پہلے تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ کا مفہوم کب پورا ہوا۔ آپؐ سے پہلے صرف عرب لوگ ہی مکہ جاتے تھے۔ مگر اب آنحضرت صلعم کے بعد تمام جہان کے لوگ وہاں دوڑے چلے جاتے ہیں۔ پس میرے نزدیک اس دعا میں ایسے رسول کی دعا کی گئی تھی۔ جو سب دنیا کی طرف مبعوث ہو۔ اور جس کی آواز کو سن کر سب دنیا کے لوگ مکہ میں حج کے لئے جمع ہوں۔ اور مکہ کو توحید کا مرکز بنا کر شرک اور مشرکوں سے پاک کر دیا جائے۔

میرے نزدیک حضرت ابراہیمؑ نے جو یہ خواب میں دیکھا تھا۔ کہ وہ حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کر رہے ہیں۔ اس کی تعبیر یہی تھی کہ وہ انہیں ایک دن ایک غیر ذی زرع وادی میں چھوڑ جائیں گے۔ ایسی جگہ پر چھوڑنا ان کو اپنے ہاتھ سے ذبح ہی کرنا تھا۔ حضرت ابراہیم نے زمانہ کے رواج کے مطابق اس کی تعبیر غلط سمجھی تھی۔ کیونکہ اس زمانہ میں لوگ انسانوں کی قربانی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کا یہی منشاء ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کر دیا جائے۔ لیکن دراصل اس کی تعبیر یہی تھی کہ وہ ان کو ایک غیر ذی زرع وادی میں چھوڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فوراً ہی خواب کی تعبیر نہ سمجھائی۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انسانی قربانی کا منسوخ قرار دینے والا بنائے۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیمؑ اپنی خواب کو لفظاً لفظاً پورا کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ تو اس نے انہیں بتا دیا کہ تمہارا اخلاص بھی ظاہر ہو گیا اور یہ حکم بھی قائم ہو گیا۔ کہ آئندہ انسان کو بغیر جنگ یا بغیر قصاص کے قتل نہ کیا جائے گا۔ آئندہ انسانی قربانی یہ ہوگی یعنی انسان اپنے وقت۔ اپنے علم۔ اپنے مال کو قربان کر کے خدا تعالےٰ کا قرب حاصل کرے گا۔ نہ کہ اپنے گوشت کو قربان کر کے۔ پس تم ظاہر میں رد بلا کے طور پر بکرے کی قربانی کر دو۔

وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ

اور نہ آسمان میں۔ ۵۳۷ ہر ایک قسم کی) تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہے (وہ اللہ) جس نے (مجھے)

عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ

بڑھاپے کے باوجود مجھے (دو بیٹے) اسمٰعیل اور اسحاق عطا کئے ہیں۔ میرا رب یقیناً خوب (ہی) دعائیں سننے

الدُّعَآءِ ۝ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ

والا ہے۔ ۵۳۸ (اے) میرے رب مجھے اور میری اولاد میں سے (ہر ایک کو) نماز کو عمدگی سے ادا

اور حقیقت میں اپنے بچہ کی ایک تلخ قربانی کے لئے تیار ہو جاؤ جو آئندہ پیش آنے والی ہے۔

۵۳۷ تفسیر:۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ فعل نہایت نیک نیت کی بناء پر تھا ضمناً اس میں بائبل کے ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ بائبل میں ہے۔ کہ حضرت سارہؓ ناراض ہو گئی تھیں۔ اس لئے ان کو خوش کرنے کیلئے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ اور اُن کی والدہ کو جنگل میں چھوڑا تھا۔ یعنی ایک نبی نے اپنی ایک بیوی کی رضامندی کے لئے بعض بے گناہوں پر ظلم کیا۔ قرآن کریم اس امر کا جو حضرت ابراہیم کے نام پر دھبہ ہے۔ خود حضرت ابراہیم کے مُنہ سے دفعیہ کرواتا ہے اور ان کی مذکورہ بالا دعا نقل کر کے بتاتا ہے۔ کہ یہ بیان بائبل کا غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس دُعا کا مطلب یہ ہے کہ اے رب تُو تو جانتا ہے۔ کہ میری نیت ان کو جنگل میں چھوڑنے سے کیا ہے۔ میں ایسا کسی دنیوی غرض کی وجہ سے نہیں کر رہا بلکہ محض تیری خوشنودی کے حصول کے لئے اپنے بیوی بچوں کو اس جنگل میں چھوڑے جا رہا ہوں۔

مَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ میں مِنْ کا جو لفظ آیا ہے۔ اس کا مفہوم اس جگہ "بھی" کے لفظ سے ملتا ہے یعنی کوئی چیز بھی اللہ سے پوشیدہ نہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس فقرہ کو اس لئے دوہرایا ہے کہ جس طرح ابراہیمؑ نے فرمایا تھا کہ اے اللہ تو میری نیت کو خوب جانتا ہے اسی طرح اللہ نے بھی ان کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا کہ مَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ۔ بے شک ہم بھی اس کی نیت سے واقف ہیں۔ اور جانتے ہیں۔ کہ اس کا یہ فعل بیوی کی رضا حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ ہماری رضاء حاصل کرنے کے لئے تھا۔

حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل کو خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے جنگل میں چھوڑا۔

۵۳۸ حل لغات:۔ وَهَبَ لَهٗ مَالًا۔ اَعْطَاهُ اِيَّاهُ بِلَا عِوَضٍ۔ بغیر بدلہ کے اُسے مال دیا۔ (اقرب)

تفسیر:۔ جیسا کہ اوپر کی آیات سے ظاہر ہے۔ اس جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر کے اس حصہ کا ذکر ہے جبکہ وہ خانہ کعبہ کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ کیونکہ جو دعائیں اس جگہ مذکور ہیں۔ وہ اس وقت کی ہیں (دیکھو سورۃ بقرہ ع ۱۵)

اس پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ پھر اس موقعہ پر اولاد کے ملنے کا ذکر اور اس پر الحمد للہ کہنے سے کیا مراد ہے۔ اور اس کا کیا موقعہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس موقعہ پر اولاد کے ملنے پر الحمد للہ نہیں کہہ رہے۔ بلکہ اس بات پر الحمد للہ کہہ رہے ہیں۔ کہ وہ اپنی زندگی میں عبادت قائم کرنے کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ ان کو محض اس بات کی خوشی ہے۔ کہ وہ اپنی اولاد کے ذریعہ سے خدا کی عبادت کی بنیاد رکھ چلے ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ

اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الحمد للہ کہنے کا مطلب

ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ○ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ

کرنے والا بنا (اے) ہمارے رب (مجھ پر فضل کر) اور میری دعا (بھی ضرور) قبول فرما ۵۳۹ (اے) ہمارے رب جس دن حساب

حضرت اسحاقؑ بھی وقف تھے۔ کیونکہ ان کو بھی دعا میں شامل کیا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے ایمان کا یہ آیت ایک بےمثل ثبوت پیش کرتی ہے۔ بڑھاپے کی اولاد بڑا لڑکا بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑ کر آتے ہیں۔ جہاں میٹھے پانی اور خوراک تک کا پہنچنا مشکل ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی باتوں پر اس قدر یقین ہے۔ کہ جب دنیا کی نگاہ میں انہوں نے اپنے بیٹے کے مستقبل کو تباہ کر دیا۔ وہ نہایت جوش و خروش سے اللہ تعالیٰ کے شکریہ میں لگے ہوتے ہیں۔ کہ سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق دئے۔ اور میرے حق میں میری دعاؤں کو سنا گویا انہیں اس بڑھاپے میں بھی اولاد کی خواہش تھی۔ تو صرف اس لئے کہ وہ اللہ کی راہ میں قربان ہو اور اس کے دین کو دنیا میں قائم کرے۔ سو اسمٰعیل کی قربانی سے یہ مقصد پورا ہو گیا۔ اپنے پیارے اور بڑے بیٹے کو اس طرح جنگل میں چھوڑ دینے کے بعد جبکہ خطرات سامنے نظر آ رہے تھے۔ اولاد کی پیدائش اور کامیاب زندگی پر خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا صرف ابراہیمؑ اور اس کی قسم کے لوگوں کا ہی کام ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْھِمْ وَارْفَعْ دَرَجَاتِھِمْ۔

حضرت ابراہیمؑ کا اقامت صلوٰۃ کی دعا کرنے کا مطلب

اقامت صلوٰۃ شخصی بھی ہو سکتی ہے اور قومی بھی۔

اس جگہ قومی اقامت صلوٰۃ مراد ہے

۵۳۹ حل لغات

مقیم

مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ: مُقِیْمٌ اَقَامَ سے اسم فاعل ہے جو قَامَ کا مجرد ہے۔ کہتے ہیں قَامَ الْاَمْرُ اِعْتَدَلَ۔ معاملہ درست ہو گیا۔ عَلَی الْاَمْرِ۔ دَامَ وَثَبَتَ۔ یعنی کسی چیز پر دوام اور ثبات اختیار کیا۔ اور اَقَامَ السُّوْقَ کے معنے ہیں۔ نَفَقَتْ۔ بازار بارونق ہو گیا۔ اور اَقَامَ الصَّلٰوۃَ کے معنے ہیں۔ اَدَامَ فِعْلَھَا۔ نماز پر دوام اختیار کیا۔ اَقَامَ لِلصَّلٰوۃِ کے معنے ہیں۔ نَادٰی لَھَا۔ نماز کے لئے پکارا۔ اَقَامَ اللّٰہُ السُّوْقَ۔ جَعَلَھَا نَافِقَۃً۔ بازار کو بارونق بنا دیا۔ (اقرب)

پس رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ کے معنے ہوں گے۔ کہ ہمیں ایسا بنا دے۔ کہ نماز کا رواج دینے والے ہوں۔ اور لوگوں کو اس کی طرف لانے والے ہوں۔ اور نماز کی طرف لوگوں کو پکارنے والے ہوں۔

حضرت نبی کریمؐ کے متعلق دعا اور پیشگوئی۔

تفسیر:۔ حضرت ابراہیمؑ نبوت کے مقام پر پہنچ چکے ہیں اور اولاد بھی ہو چکی ہے۔ پھر وہ جوان ہے۔ اور پھر اس کو دین کے لئے وقف بھی کر چکے ہیں پھر کیوں کہتے ہیں۔ رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ۔ کیا آپ کو اس بات میں کہ آپ نماز کی پابندی کرتے رہیں گے کوئی شبہ تھا۔

اس سے آپ کی مراد یہ نہ تھی۔ کہ میں نماز کو قائم نہ رکھ سکونگا بلکہ اس طرف اشارہ تھا۔ کہ میرے ذریعہ اور میری اولاد کے ذریعہ سے دنیا میں نماز قائم رہے۔ اِقَامَۃُ الصَّلٰوۃِ شخصی بھی ہو سکتی ہے۔ اور قومی بھی۔ اس جگہ قومی مراد ہے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا یہ مطلب ہے۔ کہ میری کوششوں میں ایسا اثر دے۔ کہ ہمیشہ میرے ذریعہ سے ایک نماز گذاروں کی جماعت قائم رہے۔ اور اسی طرح میری اولاد میں سے بھی ہمیشہ ایسے لوگ ہوتے رہیں جو میرا اتمام ثابت رہیں۔ اور لوگوں کو عبادت الٰہی کی طرف لاتے رہیں۔ اور وہ بھی اپنی کوششوں میں کامیاب رہیں۔ اس طرح تا قیامت میں نمازوں کا قائم رکھنے والا بن جاؤں۔ یہ مقام عام مُقِیْمُ الصَّلٰوۃِ سے بہت بڑھ کر ہے۔ کیونکہ وہ شخص صرف اپنی نماز کو قائم کرتا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام دنیا کی نماز قائم کرنے کے لئے دعا کر رہے ہیں۔

دراصل یہ بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق دعا اور پیشگوئی ہے۔ کہ جس طرح میرے ذریعہ سے نمازیں قائم ہوتی ہیں۔ اسی طرح آئندہ بھی میری اولاد سے ایک شخص نمازوں کا قائم کرنے والا پیدا ہو ؎

لِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ ع ۶ / ۱۸

بھی نیز اس دن مجھے اور میرے والدین کو اور تمام مومنوں کو بخش دیجیو۔ ۴۰

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۥ

اور (اے مخاطب) یہ ظالم جو کچھ کر رہے ہیں۔ اس سے تو اللہ (تعالےٰ) کو بے خبر ہرگز نہ سمجھ۔

۴۰ حل لغات۔ اِغْفِرْلِیْ: غَفَرَ الشَّیْءَ غَفْرًا کے معنے ہیں۔ سَتَرَہٗ۔ اس کو ڈھانپ لیا۔ اَلْمَتَاعَ فِی الْوِعَاءِ: اَدْخَلَہٗ وَسَتَرَہٗ۔ سامان کو برتن میں داخل کیا اور اس کو ڈھانپ دیا۔ الشَّیْبَ بِالْخِضَابِ: غَطَّاہُ۔ سفید بالوں کو خضاب سے ڈھانپا۔ اَللّٰہُ لَہٗ ذَنْبَہٗ غَفْرًا: غَطّٰی عَلَیْہِ گناہوں پر پردہ ڈالا۔ اَلْاَمْرَ بِغُفْرَتِہٖ۔ اَصْلَحَہٗ بِمَا یَنْبَغِیْ اَنْ یُصْلَحَ بِہٖ معاملہ کی اصلاح مناسب طریقہ سے کی۔ (اقرب)

پس غفر کے لفظ میں ڈھانپنے کے معنے پائے جاتے ہیں۔ اور اغفرلی کے معنے ہونگے (۱) مجھے ڈھانپ لے۔ مجھ پر پردہ ڈال دے۔ یعنی میرا وجود مٹا کر اپنا وجود میرے ذریعے ظاہر کر۔ (۲) میری بشریت کو الوہیت کی چادر سے ڈھانپ لے۔ یعنی میری کوششوں کے نتائج تیری شان کے مطابق نکلیں (۳) میرے تمام کاموں کی عمدہ طریقوں سے اصلاح فرمادے۔ یعنی میرے تمام کام درست ہو جائیں۔ اور میری اولاد کی کمزوریاں کو ڈھانپ کر ان کو ترقی کے منازل کی طرف لے جا۔

تفسیر:۔ نبی خدا کے فضل سے معصوم ہوتا ہے پھر نبی کا یہ کہنا۔ کہ اغفرلی اس کا کیا مطلب؟ دراصل غیر عارف انسان کی نظر محدود ہوتی ہے۔ اس کی نظر انسان تک ہی جاتی ہے۔ اور انسان تک ہی تسلی پا جاتی ہے۔ مگر عارف کی نظر اُوپر جاتی ہے اور بلند ہوتی جاتی ہے وہ سمجھ لیتا ہے۔ کہ بندے کی اللہ تعالےٰ کے مقابلہ میں کیا ہستی ہے۔ سورج کے سامنے ایک ذرہ کی کیا حیثیت ہے۔ کیونکہ آخر انسان اُسی کی مخلوق ہے۔ اس کی زندگی بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوتی ہے۔ اور ہدایت بھی اُسی کی طرف سے آتی ہے۔ غالب

^۱ غفر

نے کیا ہی عمدہ کہا ہے ؎

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پس نبی چونکہ عارف ہوتا ہے۔ وہ اپنی ہستی کو دیکھتا ہے اور جانتا ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں۔ وہ میں نہیں۔ بلکہ خدا ہی کر رہا ہے۔ اس لئے وہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ میرے وجود کو زیادہ سے زیادہ مخفی کر دے اور اپنے وجود کو زیادہ سے زیادہ ظاہر فرما۔ گویا اغفرلی کے اس صورت میں یہ معنے ہوتے ہیں کہ اے خدا تجھے میری ہی محبت کا واسطہ ہے کہ اپنا پردہ مجھ پر ڈال دے۔ یعنی میرا وجود مٹا کر تیرا وجود میرے ذریعہ سے ظاہر ہونے لگے اور یہ امر ظاہر ہے کہ بندہ کے ذریعہ سے جس قدر اللہ تعالےٰ کا وجود ظاہر ہوگا۔ اسی قدر وہ اپنے نیک مقاصد میں کامیاب ہوگا۔

^۲ اغفرلی سے مراد

ہاں جب دوسروں کے لئے یہ لفظ آئے۔ تو اس وقت اُن کے حسب مراتب اس لفظ کے معنے ہوں گے۔ ایک اعلیٰ درجہ کا مومن یہ لفظ استعمال کرے گا۔ تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ کمزوریاں جو حصول کمال سے محروم کرتی ہیں۔ اُن سے مجھے بچالے۔ درمیانی درجہ کے مومن کے لئے یہ لفظ استعمال ہوگا۔ تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ میری خطاؤں کو ڈھانپ کر مجھے اعلیٰ ترقیات کی توفیق دے۔ اور عام مومن یہ لفظ استعمال کرے۔ تو یہ مطلب ہوگا کہ میرے قدم کو ایمان پر استقلال سے قائم رکھ۔ میرے گناہ مجھے کہیں لے نہ ڈوبیں اور ایک متلاشی حق یہ لفظ استعمال کرے۔ تو اس کے یہ معنے ہوں گے۔ کہ میرے گناہ مجھے ہدایت پانے سے

^۳ انبیاء کا استغفار کرنے کا مطلب

^۴ غفر کے لفظ کے معنے حسب مراتب بدلتے ہیں

اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ

وہ انہیں صرف اس دن تک ڈھیل دے رہا ہے جس دن (ان کی) آنکھیں (فیصلہ کے انتظار میں) کھلی ہوئی ہونگی ۱۴۱ؔ

مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ

(وہ اپنے سروں کو اُوپر اٹھائے ہوئے خوف زدہ ہو کر دوڑتے آ رہے ہونگے۔ (اور) ان کی نظریں (لوٹ کر) واپس

محروم نہ کر دیں۔ اس لئے میرے گناہ معاف کر۔ اس لفظ کا استعمال مختلف مواقع کے لحاظ سے ایسا ہی ہے جیسے جبّار کا لفظ ہے کہ جب اللہ تعالےٰ کے لئے آتا ہے۔ تو اس کے معنے مصلح کے ہوتے ہیں اور جب یہی لفظ بندے کے لئے آتا ہے تو اس کے معنے سرکش اور قانون شکن کے ہوتے ہیں۔

تَشْخَصُ

یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کی نسبت فرماتا ہے اَللّٰهُ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ۔ تو جب اللہ تعالےٰ اُن کو چن لیتا ہے۔ تو پھر ان میں گناہ کہاں سے آ سکتا ہے۔ جب وہ دنیا سے الگ کر کے خدا تعالےٰ کے قرب میں بٹھا دئے گئے۔ تو پھر ان کے پاس شیطان کہاں سے آئے گا۔ شیطان تو خدا تعالیٰ کے نام سے بھی بھاگتا ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ فرمایا ہے۔

شیطان کا تسلط اللہ تعالیٰ کے بندوں پر نہیں ہوتا

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ۔ میرے بندوں پر یقیناً تجھے کوئی تسلط حاصل نہیں پس جب قانون یہ ہے۔ کہ جو ادنیٰ عبودیت کے مقام پر ہو اللہ تعالیٰ اُسے بھی شیطان کے تسلط سے محفوظ رکھتا ہے۔ تو انبیاء اللہ جو اللہ تعالیٰ کی خاص حفاظت میں ہوتے ہیں۔ ان کے پاس شیطان کا گذر کیسے ہو سکتا ہے۔

آیت یوم الحساب والی دعا کا مطلب

يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ۔ یہ حساب اس دنیا میں بھی ہوتا ہے۔ اور اگلے جہان میں بھی ہوگا۔ دعا کا مطلب یہ ہے کہ جب اعمال کے نتیجے نکلنے لگیں۔ اس وقت میری بشریت کو اُلوہیت کی چادر سے ڈھانپ لینا۔ میری بشری کمزوری پر پردہ ڈالنا میری کوششوں کے نتائج میری طاقتوں کے مطابق نہ نکلیں۔ بلکہ تیری شان کے مطابق نکلیں۔ اگر قیامت کا دن مراد لیا جائے۔ تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اس دن مجھ سے وہ سلوک کیجیو۔ جو تیری شان کے مطابق ہو۔ نہ کہ وہ جو میرے اعمال کے مطابق ہو۔ اور میرے والدین اور مومنوں سے بھی اُن کے درجے کے مطابق غفران کا معاملہ کیجیو۔

۱۴۱ حل لغات

تَشْخَصُ۔ شَخَصَ سے مضارع ہے۔ شَخَصَ الشَّيْءُ شُخُوْصًا کے معنی ہیں اِرْتَفَعَ۔ بلند ہوئی شَخَصَ بَصَرُهٗ۔ فَتَحَ عَيْنَيْهِ وَجَعَلَ لَا يَطْرِفُ مَعَ دَوَرَانٍ فِي الشَّخْمَةِ۔ اور شخص بصرہٗ کے معنے ہیں اپنی آنکھوں کو کھولا۔ اور ایک جگہ ٹکٹکی لگا کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اور کسی اور طرف نہ دیکھ سکا۔ اَلْمَيِّتُ بِبَصَرِهٖ وَبِبَصَرِهٖ۔ میت نے جان کندن کے وقت نظر اوپر اٹھا لی شَخَصَ مِنْ بَلَدٍ اِلٰى بَلَدٍ۔ ایک شہر سے دوسرے شہر کو گیا۔ الرَّجُلُ سَارَ فِي ارْتِفَاعٍ۔ بلندی کی طرف چڑھا شَخَصَ السَّهْمُ۔ اِرْتَفَعَ عَنِ الْهَدَفِ۔ تیر نشانہ سے اونچا گیا (اقرب) پس تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ۔ کے معنے ہوں گے۔ کہ اس دن اُن کی آنکھیں اُوپر اٹھیں گی۔ (۲) نظریں چڑھ جائیں گی (۳) پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ وہ آنکھ جھپک نہیں سکیں گے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ۔ اور تو ہرگز اللہ تعالےٰ کو غافل مت سمجھ اس سے جو ظالم کرتے ہیں۔ یا ان کے عمل سے۔ غافل کے یہ معنی نہیں۔ کہ واقف نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے۔ کہ یہ مت سمجھو۔ کہ ان کو جب اللہ تعالےٰ سزا نہیں دیتا۔ تو ان کی طرف توجہ ہی نہیں ہے۔ غافل دو طرح ہو سکتا ہے (۱) بیخبری سے (۲) توجہ نہ کرنے سے۔ تو فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ ان کو بے سزا نہیں چھوڑے گا۔

اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ۔

طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ۝ۭ وَاَنْذِرِ النَّاسَ

نہیں آئیں گی - اور ان کے دل (امیدوں سے) خالی ہوں گے ۴۲؎ اور تو لوگوں کو اس دن سے ڈرا

يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا

جب ان پر وہ (موعود) عذاب آئیگا۔ اور جن لوگوں نے ظلم (کا شیوہ اختیار) کیا ہوگا (اس وقت) کہیں گے

صرف ان کو ڈھیل دے رہا ہے۔ اس دن کے لئے کہ جس دن لوگوں کی نظریں چڑھ جائیں گی۔ یا پھٹی کی پھٹی رہ جائینگی اور وہ آنکھ نہیں جھپک سکینگے جب انسان پر حیرت کا وقت آتا ہے تو وہ آنکھ جھپک نہیں سکتا۔ مطلب یہ کہ خدا تعالیٰ انکو درمیانی ڈھیل دے رہا ہے۔ اس دن تک جس دن اُن پر آخری عذاب آئیگا۔ اسوقت تک ان کو ڈھیل دیگا۔ (اس آیت کی تفسیر اگلی آیت کے ساتھ دیکھیں)

۴۲؎ حل لغات

مُهْطِعِيْنَ :- اَهْطَعَ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے۔ جس کا مجرد هَطَعَ ہے۔ کہتے ہیں۔ هَطَعَ الرَّجُلُ - اَسْرَعَ مُقْبِلًا خَائِفًا - خوف زدہ ہوکر تیزی سے دوڑتا ہوا آیا۔ اَقْبَلَ بِبَصَرِهٖ عَلَى الشَّيْءِ فَلَمْ يَرْفَعْهُ عَنْهُ - کسی چیز پر ٹکٹکی لگاکر دیکھتا رہا - اور وہاں سے نظر کو نہ ہٹایا - اور اَهْطَعَ الْبَعِيْرُ کے معنی ہیں مَدَّ عُنُقَهٗ وَصَوَّبَ رَاْسَهٗ - اونٹ نے گردن کو لمبا کیا - اور سر کو اٹھایا - اَسْرَعَ وَاَقْبَلَ مُسْرِعًا خَائِفًا لَا يَكُوْنُ اِلَّا مَعَ الْخَوْفِ - اور اَهْطَعَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں - خوف زدہ ہوکر جلدی سے آیا - (خوف کا ہونا ضروری ہے) وَقِيْلَ نَظَرَ بِخُضُوْعٍ - اور بعض کہتے ہیں - کہ اس کے معنے عاجزی کی نظر سے دیکھنے کے ہیں - (اقرب) پس مُهْطِعٌ کے معنے ہوں گے (۱) خوف زدہ ہوکر دوڑنے والا - (۲) عاجزی سے دیکھنے والا (۳) سر اوپر اٹھانے والا - مُهْطِعِيْنَ اس کی جمع ہے -

مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ : اَقْنَعَ رَاْسَهٗ - نَصَبَهٗ - سر کو سیدھا اٹھایا - وَقِيْلَ لَا يَلْتَفِتُ يَمِيْنًا وَّشِمَالًا وَجَعَلَ طَرْفَهٗ مُوَازِيًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ - اور بعض نے اَقْنَعَ کے یہ معنے کئے ہیں - کہ اپنے سر کو اٹھاکر بالکل سیدھا رکھے - اور دائیں بائیں نہ موڑے - اَقْنَعَ الصَّبِيَّ کے معنے ہیں - وَضَعَ اِحْدٰى يَدَيْهِ عَلٰى فَاْسِ قَفَاهُ وَجَعَلَ الْاُخْرٰى تَحْتَ ذَقْنِهٖ وَاَمَالَهٗ اِلَيْهِ فَقَبَّلَهٗ - بچے کے سر کے پچھلی طرف ہاتھ رکھ کر اور دوسرا ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اُسے اپنی طرف پھیرا اور اُسے بوسہ دیا - اَقْنَعَ حَلْقَهٗ وَفَمَهٗ - رَفَعَهٗ لِاسْتِيْفَاءِ مَا يَشْرَبُهٗ مِنْ مَاءٍ اَوْ لَبَنٍ اَوْ غَيْرِهِمَا - اس نے اپنے منہ کو اونچا کیا - تاکہ پانی وغیرہ پوری طرح پی سکے - بِيَدَيْهِ فِي الصَّلٰوةِ رَفَعَهُمَا فِي الْقُنُوْتِ - اپنے ہاتھوں کو نماز میں قنوت کے لئے اُٹھایا - رَاْسَهٗ وَعُنُقَهٗ رَفَعَهٗ وَشَخَصَ بِبَصَرِهٖ نَحْوَ الشَّيْءِ لَا يَصْرِفُهٗ عَنْهُ - اپنے سر کو اٹھایا اور نظر ایسے طور پر کسی چیز پر جمائی - کہ اس سے ہٹ نہ سکے (اقرب) مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ میں اُن کی حیرانگی اور خوف زدہ ہونے کو ظاہر کیا گیا ہے - کہ ان کی حالت ایسی ہوگی - کہ وہ اپنے سر بلند کرکے آنحضرتؐ کے لشکر کو دیکھ رہے ہوں گے - ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائینگی - اور وہ سخت خوفزدہ ہوکر بھاگیں گے -

مهطعین

اَلْهَوَاءُ :- اَلشَّيْءُ الْخَالِيْ - خالی چیز - اَلْجَبَانُ الْخَلُوْ قَلْبُهٗ عَنِ الْجَرَاءَةِ - بزدل پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ اس کا دل جرأت سے خالی ہوتا ہے - (اقرب)

الھواء

وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ - ان کے دل امیدوں سے خالی ہونگے ان کے دل بیٹھے جارہے ہوں گے - بزدلی ان پر چھائی ہوگی - اور مقابلہ نہ کرسکیں گے -

مُقْنِعٌ

رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ

(کہیں) ہمارے رب ہمارے معاملہ کو کسی (اور) قریب میعاد تک (کیلئے) پیچھے ڈالدے ۔ ہم تیری (طرف سے آئی ہوئی) دعوت کو قبول کرینگے - اور

تفسیر :- یہ بتاکر کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے ایک ایسے نبی کے لئے دعا کی تھی - جو دنیا میں اللہ تعالےٰ کی عبادت کو قائم کرے - مکہ اس کا مرکز ہو اور شرک سے اس کی تعلیم پاک ہو - اب اللہ تعالےٰ کفار مکہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے - اور فرماتا ہے کہ بے شک ان کو ڈھیل ملی ہے لیکن اس کی یہ وجہ نہیں کہ ہم ان کے اعمال سے ناواقف ہیں بلکہ اس کی وجہ اور ہے - اس وجہ کو لفظاً اس جگہ نہیں بتایا - کیونکہ اوپر کے رکوع سے وہ وجہ ظاہر ہو چکی ہے اور وہ بھی ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے کہ اے میرے رب اگر میری اولاد مشرک ہو - تو میرا ان سے کوئی تعلق نہیں - ہاں آپ بڑے بخشنے والے مہربان وجود ہیں - اگر آن سے ترقی کا برتاؤ کریں تو آپ کی شان کے مطابق ہے - یہ دعا علاوہ ان کی ہدایت کی خواہش کے اس ڈھیل کا موجب ہو رہی تھی - مگر جو لوگ ازلی شقی تھے - وہ اس سے اُلٹے مغرور ہو رہے تھے لیکن کب تک انہیں ڈھیل دی جاسکتی تھی - ایک دن اصل دعا اپنا رنگ لائے گی - اور مہلت سزا میں بدل جائیگی -

(حاشیہ: آنحضرت صلعم کے ذریعہ عذاب کی خبر)
(حاشیہ: مکہ میں لشکر اسلام کا داخل ہونا)
(حاشیہ: کفار کو ڈھیل حضرت ابراہیم کی دعا کی وجہ سے مل رہی تھی)

اس جملہ کو عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ سے ختم کیا ہے - یہ نہیں کہا کہ جو تیرے مخالف کرتے ہیں - یا مکہ والے کرتے ہیں - اس سے اول یہ بتانا مطلوب ہے - کہ خواہ کتنی ہی ڈھیل ملے - ظالم آخر اپنے کیفر کردار کو پہنچ ہی کر رہے گا - دوم محمد رسول اللہ صلعم اور صحابہؓ کے دل کو تسلی دینا مقصود ہے - کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ ظالم ہیں - اور مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں - ہم عدم توجہ کی وجہ سے ان کی طرف سے غافل نہیں ہیں - مسلمانوں کے مظلوم ہونے کا خیال ہے - لیکن ابراہیمؑ کی وہ دعا کہ اے اللہ میں تجھ سے بھی امید کرتا ہوں - کہ میری اولاد غلطی کرے - تو تو ان سے غفور رحیم کا سلوک کرے گا - ہمیں عذاب میں جلدی کرنے سے روک رہی ہے -

(حاشیہ: عذاب کی پیشگوئی کا اپنی علامتوں سمیت پورا ہونا)

اس اظہار کے بعد کہ کیوں عذاب میں دیر ہو رہی ہے - عذاب کی خبر بھی دے دی - اور اس کے متعلق بعض حالات بھی اشارةً بتادئے - یعنی وہ یکدم آئے گا - یہ لوگ سخت گھبرا جائیں گے - حیرت سے سر اٹھا کر عذاب کو دیکھینگے نظر کو ادھر اُدھر نہ ہٹا سکیں گے - دل گر رہے ہوں گے - جب مکہ فتح ہوا - تو بعینہٖ یہی حال کفار کا ہوا - جب صلح حدیبیہ کے بعد مکہ والوں نے عہد شکنی کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر چڑھائی کی - تو آپ نے ایسا انتظام فرمایا - کہ کسی کو علم نہ ہوا کہ اسلامی لشکر مکہ پر حملہ آور ہوا ہے - ابوسفیان دو دن پہلے ہی مدینہ سے روانہ ہوا تھا - جہاں سے وہ ایک ناکام سفیر کی حالت میں لوٹا تھا - ابھی وہ مکہ میں داخل نہ ہوا تھا کہ اسلامی لشکر جلد جلد منزلیں طے کرتا ہوا مکہ کے قریب پہنچ گیا - ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے دُور سے جب لشکر دیکھا - تو حیران رہ گئے کہ یہ لشکر کس کا ہے - کبھی کہتے فلاں قبیلہ ہے اور کبھی کہتے فلاں ہے انہیں یہ خیال ہی نہ آتا تھا کہ یہ لشکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو سکتا ہے - چنانچہ جب طلائع (یعنی لشکر کے آگے چلنے والا حصہ) آئے - تو ان کو پتہ لگا - کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگئے ہیں - تب وہ حیران رہ گئے - وہ حیران کھڑے تھے - کہ حضرت عباسؓ نظر آئے - وہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے آگے آئے (وہ بچپن سے اس کے دوست تھے) دیکھتے ہی کہا - ابوسفیان میرے پیچھے سوار ہو جاؤ - ورنہ مارے جاؤ گے - اس نے لیت و لعل کرنی چاہی - تو انہوں نے ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا - اور اپنے پیچھے گھوڑے پر چڑھا لیا - اور ان کو لے کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خیمے کی طرف روانہ ہوئے - آپ کے خیمہ کے پاس پہنچ کر زور سے

نَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ

(تیرے) رسولوں کی پیروی کریں گے۔ (جس پر انہیں جواب ملیگا کہ کیا ابھی اتمام حجت کی کوئی کسر باقی ہے) اور کیا تم نے پہلے قسم (پر قسم) نہیں کھائی تھی کہ

ابوسفیان کو دھکا دیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔ کہ حضور یہ مسلمان ہونا چاہتا ہے۔ ابوسفیان گھبرا گیا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم حیران ہوئے۔ حضرت عباس رضی نے ابوسفیان کی گھبراہٹ کو دیکھ کر کہا۔ ابھی اپنے دین کا جھوٹا ہونا ظاہر نہیں ہوا۔ ہلاکت میں مت پڑ اور مسلمان ہوجا۔ اور ابوسفیان کا ہاتھ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھایا۔ آپ نے اس خیال سے کہ شائد یہ حضرت عباس رضی کے کہنے پر بیعت کرنا چاہتا ہے۔ کچھ تردد کیا۔ لیکن جب اُسے مُصر دیکھا۔ اس کی بیعت لے لی۔ ابوسفیان نے کہا یارسول اللہ! میں اب مسلمان ہوا ہوں۔ مکہ والوں کا سردار ہوں۔ مجھے کچھ اعزاز دیا جائے۔ آپ نے فرمایا۔ جو تمہارے گھر میں داخل ہوگا۔ اُسے امان دی جائے گی۔ اس نے کہا۔ میرا گھر بہت چھوٹا ہے۔ فرمایا۔ جو کعبہ میں داخل ہو اُسے امان دی جائے گی۔ اس نے کہا وہ بھی چھوٹا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے گا۔ اُسے امان دی جائے گی۔ ابوسفیان نے کہا۔ بس اب ٹھیک ہے اور دوڑ کر مکہ والوں کو آپ کے حملہ آور ہونے اور مذکورہ بالا امان دینے کا اعلان کیا۔ مکہ والے جو اپنے آپ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے کہیں زیادہ طاقتور سمجھتے تھے۔ ان کے دلوں کی اس وقت کی حالت کا اندازہ کرنا آسان کام نہیں۔ اپنی حکومت کو پائیدار اور غیر متزلزل سمجھنے والوں نے جب اپنے سردار کے منہ سے جو ایک نیا معاہدہ کرنے مدینہ گیا تھا۔ یہ اعلان سُنا ہوگا۔ کہ مکہ والو! اپنے اپنے گھروں میں گھُس کر دروازے بند کر لو۔ کہ محمد (رسول اللہ) جسے تم نے دس سال پہلے تنہا مکہ سے نکالا تھا۔ اس کا عظیم الشان لشکر چند فرسنگ پر سُرعت سے مکہ کی طرف کو رُخ کئے چلا آرہا ہے۔ اس لئے فوراً اپنے دروازوں کو بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ کہ اب اس سے تمہارے لئے کوئی امان کی صورت نہیں۔ تو ان کا کیا حال ہوا ہوگا۔ یقیناً ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہوں گی۔ اُن کے سر بلند ہو ہو کر اس راستہ کو دیکھ رہے ہوں گے جس پر سے اسلامی لشکر بڑھا چلا آرہا تھا۔ اور دنیا کا اور کوئی مسئلہ ان کی توجہ کو اپنی طرف نہ کھینچ سکتا ہوگا۔ اور اُن کے دل اندر ہی اندر بیٹھے جاتے ہوں گے۔ جب وہ دروازے بند کر کے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے ہوں گے۔ اور جھروکوں اور کواڑوں کے سوراخوں سے اسلامی لشکر کو مکہ کی گلیوں میں کوچ کرتے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے۔ ان کی اس وقت کیا حالت ہوگی۔ اس کا نقشہ ان قرآنی الفاظ سے زیادہ اور کون سے الفاظ کھینچ سکتے ہیں۔

[1] ابوسفیان کا آنحضرت کی صداقت کو دیکھ کر ایمان لانا

مکہ والوں کے لئے کیسی تلخی تھی۔ اس خیال میں کہ وہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جسے انہوں نے تاریکی میں جب کہ سب مکہ کے دروازے بند تھے۔ مکہ سے نکلنے پر مجبور کیا تھا۔ اب دن کے وقت مکہ میں داخل ہو رہا تھا۔ اور اب بھی مکہ کے دروازے بند تھے۔ وہ دروازے جو ہجرت کے دن اس لئے بند تھے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ان میں پناہ نہیں مل سکتی تھی۔ فتح مکہ کے دن اس لئے بند تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ذریعہ سے مکہ والوں کو پناہ دی تھی۔ اللّٰھم صل علیٰ محمد و بارك وسلم۔

[2] مکہ میں آنحضرت کا لشکر داخل ہونے کے وقت اہل مکہ کی حالت۔

یہ صرف خدائی تصرف تھا۔ کہ آپ کے آنے کا مکہ والوں کو پتہ نہ لگا۔ حالانکہ آپ اس راستہ سے آئے تھے۔ جو آمد و رفت کا ایک عام راستہ تھا۔ جہاں سے مکہ والوں کو فوراً خبر پہنچ سکتی تھی لیکن انکو خبر نہ ہوئی۔ اور اس طرح یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔

[3] کفار کو آنحضرت کے لشکر کی آمد کا پتہ نہ لگنا خدائی تصرف تھا۔

قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۝ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ

تم پر کسی طرح کا زوال نہیں (آنے کا) ۵۴۳ حالانکہ تم نے ان لوگوں کے گھروں کو اپنا گھر بنایا ہوا ہے

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ

جنہوں نے (تم سے پہلے) اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اور تم پر یہ بات خوب روشن ہو چکی تھی۔ کہ ان کے

فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ۝ وَقَدْ

ساتھ ہم نے کیسا معاملہ کیا تھا اور ہم تمام باتیں تمہارے لئے کھول کر بیان کر چکے ہیں ۵۴۴ اور یہ (لوگ)

مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ۗ وَاِنْ كَانَ

اپنی (ہر ایک) تدبیر عمل میں لا چکے ہیں۔ اور ان کی (ہر) تدبیر اللہ (تعالیٰ) کے ہاں (لکھی ہوئی اور محفوظ) ہے (بھولی نہیں) اور گو ان کی تدبیر

مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۝ فَلَا تَحْسَبَنَّ

ایسی (ہی کیوں نہ) ہو کہ اس کے نتیجہ میں پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائیں (لیکن یہ نبی کو کوئی نقصان نہیں کر سکتے) ۵۴۵ پس (اے مخاطب) تو اللہ (تعالیٰ)

عِندَ اللّٰهِ مَكْرُهُم کے دو معنے

۵۴۳ تفسیر: - یہ اُخروی عذاب کا ذکر ہے۔ جہاں بھی قرآن کریم میں دنیوی عذاب کا ذکر ہوتا ہے۔ تو اس کے ساتھ آخرت کے عذاب کا بھی ضرور بیان ہوتا ہے۔ کیونکہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب کے لئے دلیل ہوتا ہے۔

ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَال

۵۴۴ حل لغات: - ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ - تمہارے لئے ضروری امور کھول کر بیان کر چکے ہیں۔ دیکھو ابراہیم ۲۵

تفسیر: - اکثر قومیں ان علاقوں میں بستی ہیں۔ جہاں پہلے دوسری اقوام بس چکی ہیں۔ اور باوجود طاقت و قوت کے الٰہی آواز کا انکار کر کے عذاب پا چکی ہیں۔ مگر افسوس کہ پھر بھی لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ اور خدا تعالیٰ کے عذاب کو خود چکھنا چاہتے ہیں۔

مکرہم میں مکر کی اضافت مفعول کی طرف بھی ہو سکتی ہے

۵۴۵ حل لغات: - الجبل کیلئے دیکھو رعد ۵۳۲

الجبل

تفسیر: - وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ - اور انہوں نے اپنی تدبیریں کی تھیں۔ جو کچھ ان کے بس میں تھا۔ انہوں نے کیا۔

وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ - اللہ تعالیٰ کے پاس ان کا مکر ہونے کے دو معنے ہیں۔

اوّل - ہر تدبیر کا نتیجہ خدا تعالیٰ ہی نکالتا ہے پس ان کے مکر نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔ وہ ان کی تدبیروں کو ضائع کر دیگا۔

دوم - ان کا مکر خدا تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے یعنی یہاں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نقصان پہنچانے کے لحاظ سے تو ضائع ہو گیا ہے۔ لیکن خود ان کو نقصان پہنچانے کے لحاظ سے ضائع نہیں ہوا۔ خدا تعالیٰ کے پاس موجود ہے۔ وہ اس کی سزا ضرور دے گا۔

مَكْرُهُمْ میں مکر کی اضافت مفعول کی طرف بھی ہو سکتی ہے۔ کہ ان کے مکر کی سزا جو اللہ تعالیٰ نے انکو دینی ہے۔ اس کے پاس محفوظ ہے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت یوں ہوگی "مَكْرُهُ الَّذِيْ يَمْكُرُ بِهِمْ"

وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ - ان کا مکر ایسا تھا کہ اس سے پہاڑ اُڑ جائیں جبل کے معنے پہلے آ چکے ہیں۔ کہ پہاڑ کا واحد

اللّٰہَ مُخْلِفَ وَعْدِہٖ رُسُلَہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ

کو اپنے رسولوں سے اپنے وعدہ کے خلاف (معاملہ) کرنیوالا ہرگز نہ سمجھ۔ اللہ تعالیٰ یقیناً غالب (اور بُرے کاموں کی حقیقی)

ذُوانْتِقَامٍ ؕ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ

سزا دینے والا ہے ۵۴۶ (اور وہ دن ضرور آنیوالا ہے) جس دن اس زمین کو زمین کے سوا (کچھ اور) بنا دیا جائے گا۔

وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ وَتَرَی

اور آسمانوں کو بھی (کسی اور صورت میں بدل دیا جائیگا) اور یہ (لوگ) اللہ تعالیٰ کے جو واحد (اور ہر ایک چیز پر کامل غلبہ رکھنے والا ہے سامنے ہونگے

الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ ۝

اور اس دن تُو ان مجرموں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھے گا ۵۴۸

سَرَابِیْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰی وُجُوْهَهُمُ

اُن کے کُرتے (گویا) تارکول کے ہوں گے۔ اور (دوزخ کی) آگ اُن کے مونہوں کو ڈھانپ

لئے آدمی کو کہتے ہیں۔ اور محاورہ میں مشکلات کے لئے بھی آتا ہے یعنی گو انکی تدابیر ایسی تھیں۔ کہ بظاہر ان مشکلات کو دُور کر سکتی تھیں جو انکو آگے پیش آنیوالی تھیں۔ مگر چونکہ خدا کی تدبیر کا مقابلہ تھا۔ وہ ناکام رہے۔ یا یہ کہ پہلے جو قرآن کے متعلق بتایا تھا۔ کہ اس سے پہاڑ یعنی بادشاہتیں اُڑادی جائینگی۔ انکی تدبیروں کے متعلق فرماتا ہے۔ کہ خواہ کتنی ہی مضبوط ہوں پہاڑ اُڑانے والی تو نہیں۔ پھر قرآن کریم پر کس طرح غالب آسکتی ہیں۔ کہ وہ تو پہاڑوں کو بھی اُڑا دینے والا ہے۔ پہلی صورت میں اِنْ بمعنی 'گو' اور دوسری میں اِنْ بمعنی نہیں سمجھا جائیگا۔

۵۴۶ حل لغات۔ عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَامٍ:۔ اِنْتَقَمَ نقم مزید ہے اور نَقَمَ منہ یَنْقِمُ و نَقِمَ وَیَنْقَمُ نَقَمًا کے معنے ہیں۔ عاقبہ۔ اسکو سزا دی۔ نَقَمَ علیہ امرہٗ وَمِنہ کذا۔ اَنْکَرَہٗ عَلَیْہِ۔ اس کی بات کو ناپسند کیا۔ عَابَہٗ۔ اسکی وجہ سے اس پر عیب لگایا۔ کَرِهَهٗ اَشَدَّ اَنْکَرَهٗ لسُوْءِ فعلہٖ۔ اس شخص کو اس کے بُرے کام کے باعث نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اِنْتَقَمَ منہ۔ عاقبہ۔ اس کو سزا دی (اقرب) ذوانتقام کے معنے ہوئے۔ کہ بُرے کاموں کی سزا دینے والا۔

۵۴۷ تفسیر:۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگلے جہان کے نعماء اس دنیا کی نعمتوں سے بالکل الگ ہیں۔ کیونکہ یہاں فرمایا ہے۔ کہ زمین و آسمان بدل کر دوسرے زمین و آسمان قائم کئے جائیں گے۔ اگر اگلے جہان بھی اسی قسم کے میوے وغیرہ ہونے تھے تو زمین و آسمان کو بدلنے کی کیا ضرورت ہے۔ پس اس دنیا کی نعمتوں کو اس دنیا کی نعمتوں پر قیاس کرنا بالکل خلاف عقل ہے۔

۵۴۸ حل لغات۔ مُقَرَّنِیْنَ:۔ قُرِنَتِ الْاُسَارٰی مُقَرَّنِیْنَ فی الحبال ای جُمِعَتْ۔ قیدیوں کو رسیوں میں ملا کر اکٹھا باندھا گیا۔ وشُدِّدَ لکثرۃ ومنہٗ مُقَرَّنِیْنَ فی الْاَصْفَادِ۔ اور تشدید تکثیر اور مبالغہ کے لئے لائی جاتی ہے۔ جیسے قرآن مجید میں مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ میں مُقَرَّنِیْن تشدید کے ساتھ آیا ہے (اقرب) اَلْاَصْفَادُ کا مفرد اَلصَّفَدُ ہے۔ اور اَلصَّفَدُ کے معنے ہیں اَلْعَطَاءُ بخشش۔ الوَثَاقُ۔ باندھنے کی چیز۔ زنجیر۔ رسّہ وغیرہ بَرَزَ۔ یَبْرُزُ بُرُوْزًا خرج نکل کر سامنے آیا (اقرب)

ا؎ اِنْ کَانَ مَکْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ کے ودیعنی
۲؎ مُقَرَّنِیْنَ
ا؎ ذوانتقام
۲؎ الاصفاد

اَلنَّارُ ۝ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

رہی ہوگی (یہ اس لئے ہوگا) تا اللہ (تعالیٰ) ہر شخص کو جو کچھ اس نے (اپنے لئے) کیا ہوگا اس کا بدلہ دے۔ اللہ (تعالیٰ) یقیناً (بہت)

سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَ

جلد حساب لے لینے والا ہے ۵۲؎ یہ (ذکر) لوگوں کے (نصیحت حاصل کرنے کے) لئے کافی ہے اور اس بات کیلئے (بھی) کہ انہیں (آنیوالے)

لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ ع ۷ / ۱۶

عذاب سے پورے طور پر) ہوشیار کیا جائے۔ اور (اس لئے (بھی) کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ صرف ایک ہی معبود ہے اور اس (بات) کے لئے (بھی) کہ عقل والے (لوگ) نصیحت (حاصل کریں)

تفسیر:۔ اس جگہ سوال ہو سکتا ہے۔ کہ قیامت کے دن رسیوں میں باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اگلے جہان کی زندگی اس جہان کی ظل ہوگی چونکہ ان لوگوں نے یہاں پر بداعمال ایک دوسرے کی شہ اور مدد پر کئے تھے اس لئے اس کا نظارہ اس رنگ میں دکھایا جائیگا کہ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ رسیوں میں باندھا جائیگا مطلب یہ کہ بُرا اتحاد طاقت اور عزت کا موجب نہیں ہوتا۔ بدی پر جو اتحاد ہو۔ وہ کمزوری اور ذلت کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن بیوں کے مخالف اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اور تقویٰ کے خلاف جتھا بندی کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ اس جتھا بندی کے ذریعہ سے ہم طاقت اور عزت حاصل کر رہے ہیں حالانکہ بدی پر جتھا بندی ایسی ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص قیدی کے ساتھ ہتھکڑی میں اپنے ہاتھ بھی بندھوا دے۔ بیشک قیدی پہلے ایک تھا پھر دو ہو جائینگے لیکن اس کی طاقت زیادہ نہ ہوگی۔ بلکہ کمزوری پیدا ہوگی کیونکہ دو آدمیوں کا ایک ہتھکڑی میں بندھنا زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انبیاء کے دشمنوں کو زنجیروں میں اکٹھا باندھ کر آشکار کریگا۔ اور انہیں بتائیگا۔ کہ تمہارے جتھے ایسے ہی تھے۔ جیسے قیدیوں کو اکٹھا ایک زنجیر میں باندھ دیا جائے۔

رسیوں میں باندھنے کا مطلب

۵۱؎ حل لغات - سَرَابِيْلُهُمْ: سَرَابِيْل۔ سِرْبَال کی جمع ہے۔ السربالُ۔ القَمِيْصُ۔ سربال کے معنی ہیں۔ قمیص۔ وقیل۔ الدِّرْعُ۔ اور زرہ کو بھی سربال کہتے ہیں۔ وقیل کلّ ما لُبِسَ اور بعض نے اسے عام رکھا ہے۔ کہ ہر وہ چیز جو پہنی جائے سربال ہے (اقرب)

البلاغ ۲

سرابیل ۱

القَطِرَانُ: سَيَّالٌ دُهْنِيٌّ يُؤْخَذُ مِنْ شَجَرِ الْاَبْهَلِ وَالْاَرْزِ وَنَحْوِهِمَا (اقرب) قطران ایک قسم کا سیال تیل کی قسم کا مادہ ہوتا ہے جو عرعر یا دیار وغیرہ درختوں سے نکالا جاتا ہے جس میں جل اٹھنے کا مادہ ہوتا ہے۔

القطران ۱

تفسیر:۔ اس آیت کا یہ مطلب ہے۔ کہ ان کا لباس سوا آگ کے اور کچھ نہ ہوگا۔ یہ فقرہ ایسا ہی ہے۔ جیسے کہہ دیں۔ کہ مٹی کا تیل چھڑک کر انہیں جلا دیا جائیگا۔ لباس چونکہ حفاظت کے لئے ہوتا ہے اس کا یہ مفہوم بھی ہے۔ کہ ان کا کوئی محافظ نہ ہوگا۔ بلکہ جن کو وہ محافظ سمجھتے تھے۔ وہ پھر اُن کے دشمن اور مخالف ثابت ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہوں میں لکھا ہے۔ کہ مشرک جن کو خدا بناتے ہیں۔ قیامت کے دن وہ اُن سے بیزاری ظاہر کریں گے۔

۵۰؎ تفسیر:۔ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ یعنی جو اس نے اعمال کئے تھے۔ ان کے مطابق اس کو ان کا بدلہ مل جائے۔ اور اللہ تعالیٰ یقیناً حساب لینے میں جلدی کرنے والا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جلدی عذاب دیتا ہے۔ کیونکہ خود اس نے فرمایا ہے۔ کہ میں ڈھیل دیتا ہوں۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ حساب بہ سریعٌ۔ جب حساب لینے لگتا ہے۔ تو جلدی لے لیتا ہے۔

۵۱؎ حل لغات:۔ البلاغُ۔ اَلْكِفَايَةُ۔ جو چیز کافی ہو (اقرب)

تفسیر:۔ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ۔ یہ لوگوں کیلئے پیام ہے۔ یعنی اس پیام کے ذریعے لوگوں پر حجت پوری کی جاتی ہے۔

وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ۔ قرآن کریم ایک انذار ہے۔ اس کے ذریعہ لوگوں کو ہوشیار کیا جاتا ہے۔ جو غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔ انکو وہ بتاتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ ایک ہے۔ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اور جو سمجھ چکے ہیں انہیں وہ ہمیشہ استقلال سے صداقت پر قائم رکھنے کیلئے ہوشیار کرتا رہتا ہے۔ تاکہ وہ روز بروز ہدایت میں بڑھتے رہیں۔ قرآن کریم بھی ایسی ایک کتاب ہے۔ کہ جسکی آیات ایک ہی وقت میں دونوں کام کرتی ہیں۔ گمراہوں کو ہوشیار کرتی رہتی ہیں اور سمجھنے والوں کو ترقی کیطرف توجہ دلاتی رہتی ہیں۔

اس آیت نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ قرآن کریم ایک تخریبی تعلیم نہیں کہ اپنے سے پہلے مذاہب کو یا ان کے پیروؤں کو تباہ کرنے پر بس کرے۔ بلکہ وہ تخریبی ہونیکے علاوہ تعمیری بھی ہے۔ اگر وہ دنیا کو ان تعلیموں سے محروم کرتا ہے جن پر وہ پہلے چل رہی تھی۔ تو وہ اُنکی جگہ ایک ایسی تعلیم بھی پیش مہم

مہم کرتا ہے۔ جسے عقل تسلیم کرتی ہے۔ اور فہم قبول کرتا ہے۔ اسی طرح اگر اسکے ذریعہ سے پہلا نظام حکومت تباہ کیا جائیگا تو ساتھ ہی ایک ایسا نظام قائم بھی کیا جائیگا جو پہلے سے بہتر ہوگا۔

کلیدِ مضامین

جلد سوم

اشاریہ جلد سوم

کلیدِ مضامین

مرتبہ: سید عبدالحی ایم اے

آ

تعلیم اور عقائد

اِقامتِ صلوٰۃ

اللہ جلّ جلالہٗ

صفاتِ باری تعالیٰ

ایمان

ب

بادشاہت

باطل

بالشویک

بائیبل

پ

پیشگوئی

پیشگوئیوں کے اُصول

آنحضرتؐ کے متعلق پیشگوئیاں

قرآن کریم کی پیشگوئیاں

ث

حدیث

سورۃ فاتحہ

سورۃ توبہ

سورۃ یونس

سورۃ ہود

سورۃ یوسف

ش

ض

ط

ظ

ع

انبیاء کے مخالفین پر عذاب

عرب (قوم)

عربی زبان

خصائص

عربی لغات

غ

فضیلت

فکر

فلسفہ

فنا

ق

قانون

قبلہ

قرآن کریم

نزول و ترتیب

اعتراضات کے جوابات

مثل لانے کا مطالبہ

قومی ترقی

انبیاء اور اقوام

ک

گ

مُحسن

مُحکَم

مذہب

مُردہ

مسلم / مسلمان

خصوصیات

اسوۂ حسنہ

فضیلت اور افضلیت

وحی والہام

مخالفین انبیاء

اسماء

ب

ڤ

گ

ل

م

محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

مقام

ن

مقامات

حَلّ اللغات

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

تفسیر

تفسیر ابن جریر ۱۰۲، ۱۰۳

تفسیر ابن کثیر ۱۹، ۲۰، ۱۰۱

تفسیر بحر محیط لابنِ حیان اُندلسی ۷۱، ۱۸۸، ۲۶۲

تفسیر جلالین ۳۰۶

تفسیر دُرِّ منثور ۱، ۲۵۷، ۲۶۵

روح المعانی ۱۹، ۲۷۹، ۳۸۱

فتح البیان ۲۵۵

مجمع البحار ۳۱۸، ۴۷۴

حدیث

جامع صحیح بخاری ۴۸، ۴۹، ۲۲۳، ۲۸۲، ۴۶۴

سنن ابی داؤد ۱، ۱۰۱

مسندِ احمد بن حنبل ۴۴۴

مشکوٰۃ المصابیح ۳۳۰

سنن بیہقی ۲۶۵

کُتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام و خلفائے سلسلہ

آئینۂ کمالاتِ اسلام از حضرت مسیح موعود علیہ السلام ۴۷۴

اسلامی اصول کی فلاسفی 〃 ۴۷۳

چشمۂ معرفت از حضرت مسیح موعود علیہ السلام ۲۳

خطبہ الہامیہ 〃 ۲۰

مِنَنُ الرحمٰن 〃 ۲۷۶

احمدیت یعنی حقیقی اسلام
مصنفہ حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۴۷۴

اسلامیات

ارض القرآن مصنفہ سید محمد سلیمان ندوی
۲۱۹، ۲۲۵

تمدّن عرب ۲۱۸

حلی الایام فی خلفاء الاسلام ۵۱

الشفا قاضی عیاض ۴۸

العرب قبل الاسلام ۲۰۳

الفاروق علامہ شبلی ۴۴۰

فتوح الشام مصنفہ ابو اسماعیل ۲۱۸

کلیات ابی البقاء ۸۵، ۱۴۳، ۳۱۲

مغنی اللبیب لابن ہشام ۲۶۱، ۳۰۷

ھادی الارواح الی بلاد الافراح
لابن القیم ۲۵۶

ہندو مذہب

بھگوت پران ۲۰۰

ستھاپتھا برہمنا ۲۰۰

مہابھارت ۲۰۰

کُتب اہلِ کتاب

بائیبل عہد نامہ قدیم وجدید ۵

سفر یاشیر (یہود کی کتاب) ۱۹۹

طالمود (یہودی احادیث کا مجموعہ) ۱۹۹، ۲۲۹، ۳۰۲

طالمود مرتبہ ایچ پولانیو ۲۹۴

مدراش اغادہ ۱۹۹

کُتب مستشرقین

ریورنڈ وہیری کا ترجمہ قرآن کریم ۶

برنکمنز نوٹس آن اسلام
BRINKMAN'S NOTES ON ISLAM ۷۶، ۲۷۷

ینابیع الاسلام مصنفہ پادری سینٹ کلیر ٹسڈل ۶

متفرق

ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ۲۱۹

لغت اور دائرۃ المعارف

اقرب الموارد ۱۲، ۸۶

تاج العروس ۱۳، ۱۶۹

قاموس المحیط ۱۲۵

لسان العرب ۳۴۹

جیوش انسائیکلوپیڈیا ۱۲۶، ۲۲۹، ۲۹۲، ۲۹۳

انسائیکلوپیڈیا بیلیکا ۱۹۹

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا ۲۴۷